خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
ماھنامہ
سسپنس ڈائجسٹ
مئی 2014
نگران اعلیٰ
معراج رسول
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
www.paksociety.com

جلد44 • شمارہ05 مئی 2014 • زرسالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •

خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر215 کراچی74200 • فون:(021)35895313 فیکس(021)35802551 E-mail:jdpgroup@hotmail.com

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول مقام اشاعت: گراؤنڈ فلورC-63 فیزII ایکسٹینشن ڈیفنس مین کورنگی روڈ کراچی75500

پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

انشائیہ

جون ایلیا

راکھ یا دھواں

"ابھی کی بات ہے کہ میں آسمان کی نیلگونی میں کھویا ہوا تھا اور میں اور میرا خیال، دونوں شمال زمردیں کی طرف پرواز کررہے تھے۔ ہم دھول اور دھویں کی نامہربانی سے بہت اوپر، بہت اوپر تیر رہے تھے۔"

"سچ مچ!"

"ہاں ہاں، سچ مچ۔ کیا میں تجھ سے جھوٹ بولوں گا، اپنے آپ سے۔ اپنے اندر کے یار سے، اپنے اندر کے جوڑی دار سے؟ حد کردی تو نے بھی۔"

"اچھا تو پھر ہوا کیا؟ تو اور تیرا خیال شمال زمردیں کی طرف پرواز کررہے تھے تو پھر......؟"

"میں نے ایک آواز کو گنگناتے ہوئے سنا۔ نہ جانے وہ مغرب کی آواز تھی یا مشرق کی، شمال کی تھی یا جنوب کی۔ وہ گنگنا رہی تھی۔

"ہم محبت میں سانس لیتے ہیں تو فضا میں خوشبو پھیل جاتی ہے۔ ہم محبت سے دیکھتے ہیں تو پیڑوں کے پیلے پتے ہرے ہوجاتے ہیں اور اپنی چونچ سے اپنے بال و پر کو کھجاتے ہوئے پرندے دھوپ جلی منڈیروں سے اڑتے ہیں اور گھنے پیڑوں کی ٹہنیوں پر جھول کر اور جھوم کر چہچہانے لگتے ہیں۔

"وہ آواز گنگنا رہی تھی۔ محبت موسم بدل دیتی ہے، لو چل رہی ہو تو کیا ہوتا ہے؟ یہ ہوتا ہے کہ احساس اور خیال کی جھلسی ہوئی سمتوں میں، بھیگی ہوئی ہوا بہنے لگتی ہے۔"

"پر کیا، ایسا ہوتا بھی ہے؟"

"تو اور کیا! ایسا ہی تو ہوتا ہے۔ اور اسی کو بھلا دیا گیا ہے۔"

"کیسے؟"

"محبت کو۔ محبت کو یکسر بھلا دیا گیا ہے۔ کیا نہیں بھلایا گیا ہے؟ دلوں میں کھوٹ ہے اور کیسی! کینے ہیں اور کتنے! میں کہتا ہوں کہ اگر ایسا ہی رہا تو سب کے سب یار راکھ ہوجائیں گے یا دھواں۔ میں، ہاں میں کہتا ہوں کہ تم سب راکھ ہوجاؤ گے یا دھواں۔ تم نیچے کا بھی گھاٹا ٹھہرو گے اور اوپر کا بھی۔

"تم کتنے برے بولنے والے اور کتنے برے سننے والے ہو۔ تم زہر بولتے ہو اور زہر سنتے ہو۔ تم سے تو زبان بھی پناہ مانگتی ہے اور کان بھی۔ تمہاری زبان دلداری سے اور تمہارے کان غم گساری سے محروم ہیں۔ تم تو اب بس وہی کچھ کہتے ہو جو کہنے کے لیے ہے ہی نہیں۔ سو اب تم بس وہی کچھ سنتے ہو جو سننے کے لیے ہے ہی نہیں۔ وائے ہو تم پر کہ تمہاری صبحیں اور دوپہریں بداندیشی کی ہوس میں جوتے چٹخاتی ہیں۔ تمہاری شامیں بے حسی کو آنکھ مارتی ہیں اور تمہاری راتیں بدانجامی کا پہلو گرم کرتی ہیں۔

"پھر ایسا آخر کب تک ہوتا رہے گا؟ ایسا آخر کب تک ہوتا رہے گا۔ تم آخر کب تک دلوں کی ویرانی اور خیالوں کی گراں جانی میں دن گزارتے رہو گے؟ کیا اس طرح دن گزارنے سے تمہاری الجھنیں دور ہوجائیں گی؟ کیا اس طرح زندگی بسر کرکے تمہیں سکون ملتا ہے، کیا تم چین سے ہو؟ ہاں، یہ سوال تو مجھے خوب سوجھا۔ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بتاؤ، کیا تم سچ مچ چین سے ہو؟

"جھوٹ بولنے کی نہیں ٹھہری اور پھر اس کا کوئی حاصل بھی نہیں ہے۔ جھوٹ بول کر اور پھر خود اپنے آپ سے جھوٹ بول کر نہ اپنے حلق سے لقمے اتارے جاسکتے ہیں، نہ اچھو لگے بغیر پانی کے گھونٹ لیے جاسکتے ہیں اور نہ گہری نیند سویا جاسکتا ہے۔ سنو، جھینپو مت! میں تمہارے اندر سے بول رہا ہوں۔ مجھ سے جھینپو مت۔ میں، تم ہوں۔ میں تم سب کے اندر کا تم ہوں۔ تم چین سے نہیں ہو۔ میں چین سے نہیں ہوں۔ ہم چین سے نہیں ہیں۔"

ایک خط
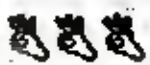
محترم قارئین
السلام علیکم!

مئی 2014ء کا دلچسپ شمارہ اور گرم ہواؤں کی آمد ساتھ ساتھ آپ کے پاس..... عہد حاضر کو اگر صرف آلام و مصائب کا نام دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ موسم کی گرمی تو قابل برداشت ہے لیکن تباہ کن حالات کا تسلسل تو دراز سے دراز تر ہوتا جارہا ہے..... اس کا کوئی اختتام بھی ہے کہ نہیں..... اگر اجتماعی اعمال پر نظر ڈالنے کے بجائے ہم انفرادی طور پر صرف ایک لمحے کے لیے اپنی جانب بھی ایک پُرفکر نظر ڈالیں کہ جانے انجانے میں ہم سے بھی تو کہیں کچھ غلط سرزد نہیں ہو رہا تو بہتر ہوگا۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ ”عنقریب لوگوں پر ایسا زمانہ آنے والا ہے کہ آدمی پروا نہیں کرے گا کہ حرام مال لے رہا ہے یا حلال۔“ اس کے علاوہ مختلف جگہوں پر قیامت کی نشانیوں میں کہا گیا ہے کہ جب تم دیکھو کہ لوگ نمازیں ترک کرنے اور امانت ضائع کرنے لگیں، سود کھانے، ناپ تول میں کمی، جھوٹ اور غیبت کو حلال سمجھنے، معمولی بات پر خون ریزی کرنے لگیں، ظلم و طلاق اور زنا کھانی موت اور والدین کے ساتھ بدسلوکی عام ہو جائے تو سمجھو قیامت بہت قریب ہے۔ دیکھا جائے تو یہ وہ باتیں ہیں جن پر عمل کرنے کے لیے نہ تو حکومتی اداروں کی ضرورت ہے اور نہ ہی سیاسی بازی گروں کے جلسے جلوس کی، بحران پر عمل کرنے یا ترک کرنے نے ہماری انفرادی زندگی اور معاشرے پر کیا اثر پڑ سکتا ہے اس کا ادراک کرنا ہمارے لیے چلینج بنا گزر رہا ہے۔ قیامت سے پہلے قیامت کا آنا انسان کے لیے بہت بڑی آزمائش ہے اور ان معاملات میں تربیت کا بہت عمل دخل ہے۔ کیا ہم اپنی اولاد کی تربیت صحیح خطوط پر کر رہے ہیں۔ کیا اعلیٰ تعلیمی درس گاہوں میں داخل کرا کے ہم اپنی ذمہ داریاں پوری کر دیتے ہیں..... نہیں..... اصل تربیت گاہ تو بچے کا اپنا گھر اور ماں کی گود ہے۔ اس سلسلے میں کہیں ہم کسی غفلت کا شکار تو نہیں ہو رہے۔ اپنا تجزیہ کرنے کے لیے کیا ہمارے پاس ایک لمحے کی بھی فرصت نہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر غلطی کی ابتدا کسی معمولی سطح سے ہوسکتی ہے تو غلطیوں کی اصلاح کا آغاز بھی اسی سطح سے کیا جاسکتا ہے..... کیا خیال ہے آپ کا..... اتنی گمبھیر گفتگو کے بعد ایک خوشگوار بات بھی آپ سے شیئر کرنا چاہتے ہیں۔ کراچی کے پسماندہ علاقوں سے بے سروسامانی کے عالم میں گلی کوچوں میں کھیلنے والے باہمت کھلاڑیوں نے اسٹریٹ چلڈرن فٹبال ورلڈ ٹورنامنٹ میں جو حال ہی میں برازیل میں کھیلا گیا تیسری پوزیشن لے کر پاکستان کا نام روشن کردیا اور ثابت کردیا کہ اگر حالات سازگار ہوں تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے..... اور اس کے ساتھ ہی چلتے ہیں اپنی اس شگفتہ محفل میں جہاں دلچسپ نوک جھوک جاری ہے۔

✠ **محمد صفدر معاویہ**، تحصیل و ضلع خانیوال سے محفل کی زینت بنے ہیں ”اپریل کا شمارہ پشاور کے خوشگوار موسم میں 19 کو مل گیا جہاں پر گرمی آئی تو پھر بارش نے موسم کو ٹھنڈا کردیا۔ پہلے کچھ شادی کی مصروفیات اور کچھ آپ کے رویے سے دلبرداشتہ ہوگیا تھا کہ ہر بار ہمارا تبصرہ آپ کی ٹوکری کی نذر ہوگیا۔ ایک بار پھر قلم اٹھانے پر مجبور ہوئے۔ سرورق کی ماڈل اپنی خوب صورتی کو ظاہر کرتے ہوئے بہار کی آمد کا پتا دے رہی ہے۔ انشائیہ میں جون ایلیا کا انداز گفتگو تلخ حقیقت کو عیاں کرتا نظر آیا۔ آپ کا اداریہ پڑھا آپ بے حس حکمرانوں کو جگاتے نظر آئے کہ خدا کے لیے شرم کرو کہ انسان بھوکوں مر رہا ہے۔ وزیراعلیٰ سندھ صاحب چکن کریم بون لیس کے مزے اڑاتے رہے کیا ان کو یاد نہیں کہ ہم نے سب سے بڑے حاکم کو روزِ محشر حساب دینا ہے کہ زندگی میں حکمرانی دی تو میری مخلوق کے ساتھ تو نے کیا کیا۔ محفل میں آئے تو مِیر سے مقصود علی صاحب اچھے تبصرے کے ساتھ کرسی صدارت پر قبضہ جمائے بیٹھے تھے مبارکاں جی۔ اشفاق شاہین، سعدیہ بخاری، ارم بتول، سوہا جی۔ اچھے تبصرے اور محفل والوں کو رگڑا دیتی نظر آئیں۔ مہرین ناز، اعجاز احمد، راحیل علی ڈوگر۔ الفاظ کا بہترین چناؤ کرتے ہیں تبصرے میں۔ لالہ قیصر اقبال محفل میں اپنی آمد کی خبر چٹ پٹے تبصرے میں دیتے نظر آئے۔ محفل میں باقی سب کے تبصرے بھی نہایت ہی اچھے تھے۔ اس دفعہ پس زنداں پڑھنے پر بہت مزہ آیا، کہانی نے اپنی گرفت میں لے لیا حجاب کے ساتھ کیا بنے گا اور ہادی کا کیا ہوگا اور ارم کیا گل کھلائے گی؟ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ ماروی میں اب بہت تیزی آگئی ہے، نہایت ہی دلچسپ قسط تھی۔ اب دیکھتے ہیں کہ مراد کہاں تک بھاگتا اور کامیاب ہوتا ہے اور محبوب نے سچے عاشق ہونے کا ثبوت دیا۔ حساب دشمناں میں لیاقت نے نہایت لرزہ خیز انداز میں جیدا کے دشمنوں سے بدلہ لیا اور ملک صاحب کی کیا بات ہے کس طرح ملزم کو دبوچ لیا۔ آبلہ پا..... زینب، احمد علی، عاصم شمشیر، نور جہاں آذر اور صائمہ کے کرداروں پر لکھی ایک بہترین کہانی تھی شمارہ میں باقی سب کہانیاں بھی بیسٹ تھیں۔ محفل شعر و سخن کا چناؤ بہترین تھا عالم باطن میں شیخ حسینؒ کے واقعات پڑھ کر دلی سکون حاصل ہوا۔“

✠ **صوبیہ اقبال**، راولپنڈی سے چلی آرہی ہیں ”22 مارچ کی رم جھم برستی بارش میں پوسٹ مین انکل نے اپریل کا شمارہ ہمارے ہاتھوں تک پہنچایا۔ سرورق کی لڑکی اپنی طرف توجہ دلانے میں ناکام رہی تو نگاہ ٹھہری انشائیہ خسارہ پر۔ بے شک انسان ترقی کی منازل طے کرتا جارہا ہے مگر انسانوں کے اس انبوہ میں خود انسان بے قیمت ہوگیا ہے۔ محفل میں مقصود علی وننگ سیٹ پر نظر آئے، مبارک باد بھائی۔ ارم بتول، آپ نے بھی ورلڈ کے ایوارڈ یافتہ پو تگے کو کھری کھری سنا کر دل خوش کردیا۔ متین سلطان نے کا نمات مریم کا خوب راز فاش کیا۔ ویسے ہوسکتا ہے بچاری کو بڑھاپے میں جوانی کے دن یاد آتے ہوں؟ فوزیہ تبسم سسٹر،

یہ زدیا آنٹی کو ہر اہرا دکھا کر ”اس چیز“ کی مثال تو نہیں دی آپ نے؟ بشریٰ افضل آنٹی، سعدیہ بچاری تو خود چاہتی ہیں کہ ان کے ساتھ زیادتی ہو۔ آپ خود کو ہلکان نہ کریں۔ ماریہ فاروق، ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ پس زنداں میں حجاب کا کردار کھلتا جارہا ہے۔ ہادی کا عشق کیا رنگ لاتا ہے تو ساتھ ساتھ ارم کے پردے بھی گلزار کی مدد سے ہٹ جائیں گے۔ ماروی، زبردست قسط۔ دیکھیں مرینہ کی مراد کے لیے تگ و دو کیا رنگ لاتی ہے۔ آخری صفحات پر آبلہ پا میں جہاں شمشیر اپنے انجام سے دوچار ہوا وہاں زینب کو اس کے ہر سوال کا جواب بھی مل گیا۔ حساب دشمناں میں لیاقت نے جیدا کے دشمنوں کا قلع قمع کر کے نہ صرف احسان کا بدلہ اتارا بلکہ حق دوستی بھی ادا کیا۔ محفل شعر و سخن میں عرفان احمد کا انتخاب پسند آیا۔“

✠ **فوزیہ تبسم**، خانیوال سے تبصرہ کررہی ہیں ”اپریل کا سسپنس 20 مارچ کی ایک سہانی صبح کو ہمارے خوب صورت ہاتھوں کی زینت بنا۔ سرورق کی خاص بات لڑکی کے ہاتھ پر لگی مہندی اچھی لگی۔ انشائیہ میں انسان کا عروج مگر انسانیت زوال پذیر نظر آئی۔ آپ کے خط میں مقصود علی کا کہانیوں پر جامع تبصرہ اول قرار پایا، مبارک باد۔ اشفاق شاہین بھائی خوش آمدید کہنے کا بہت شکریہ۔ سعدیہ بخاری صاحبہ کہیں آلو، پیاز کا بزنس تو شروع نہیں کردیا ہے؟ ارم بتول ویلڈن ڈیئر، سوہا جی! آپ بھی اپنے چہرے سے پردہ ہٹا دیں۔ مہرین ناز لگتا ہے آپ کے بھائی صاحب کہیں تنہائی میں بیٹھ کر اپنا منہ نوچ رہے ہیں۔ ارے سوری وہ تو B/L میں بیٹھے ہیں۔ شوکت بھائی، شبانہ سے پوچھ تو لیا ہوتا، ہوسکتا ہے اس چیز کی ضرورت شبانہ جی کو خود زیادہ ہو۔ پہلی کہانی زیر و زبر میں رمان کا کردار اچھا لگا مگر اس کا انجام افسردہ کرگیا۔ پس زنداں کی تیسری قسط خوب رہی۔ ہادی اور حجاب کو مزید قریب آنے کا موقع ملا۔ دوسری طرف ارم بھی اپنا رنگ دکھا رہی ہے۔ حساب دشمناں میں جیدا کا بچا ہوا حساب اس کے دوست لیاقت نے پورا کیا۔ ماروی میں محبوب چانڈیو کی مشکلات تو دوسری طرف مرینہ کی ضد اور انا کیا رنگ دکھاتی ہیں۔ عالم باطن میں شیخ حسینؒ کے حالات و واقعات دل کی آنکھوں سے پڑھے۔ آخری کہانی آبلہ پا میں زینب کا کردار، شمشیر کا انجام اور آخر میں زینب اور عاصم کا ملاپ اچھا لگا۔ محفل شعر و سخن میں اس دفعہ اچھا انتخاب پڑھنے کو ملا۔“

✠ **اشوک کمار**، میر پور ماتھیلو سے تبصرہ کررہے ہیں ”میں M.B.A. فائنل کا اسٹوڈنٹ ہوں، عرصہ 2 سال سے سسپنس ڈائجسٹ کا سالانہ خریدار ہوں۔ نصابی کتابوں کے علاوہ صرف سسپنس ہی میری اسٹڈی میں شامل ہے۔ پچھلے تین چار ماہ سے خط کی محفل میں ایسی رونقیں دیکھیں جو پہلے نظر نہ آئی تھیں۔ انشائیہ اور اداریہ قابل توجہ و ستائش ہوتے ہیں۔ اپنی محفل میں آنے کا حوصلہ مجھے مہرین ناز کے بولڈ اور منفرد تبصرے پڑھ کر ہوا۔ وہ سرورق کی جس انداز میں عکاسی اور تعریف کرتی ہیں وہ ڈاکرانکل کے لیے خراج تحسین ہوتا ہے۔ کیونکہ کسی بھی رائٹر اور مصور کی تعریف اس کے کام میں نکھار لاتی ہے۔ صدارت پر آنے والے تبصرے پرفیکٹ ہوتے ہیں لیکن کبھی کبھی کچھ فقرے اوور ہو جاتے ہیں۔ مقصود علی صاحب کو صدارت مبارک اس بار تبصرہ صدارت کے قابل ہی تھا۔ اشفاق صاحب آپ کے تبصرے میں کچھ خاص بات نظر نہیں آئی۔ سعدیہ بخاری جی آپ ایک نائس خاتون ہیں آپ لوگوں کو ان کی اوقات یاد دلا دیتی ہیں۔ ارم بتول اور سوہا جی آپ کے تبصرے زبردست ہیں، زورِ قلم اور زیادہ۔ اعجاز احمد راحیل صاحب آپ بہت نیک انسان ہیں جو مہرین جی آپ کو اتنی اہمیت دیتی ہیں۔ علی جگر بڑے جی دار بندے ہو آپ! السیلی آپ کا نام ہی کافی ہے اس محفل میں۔ متین سلطان یہ مہروکس کا نک نیم ہے؟ قیصر اقبال آپ کے لیے ایک ہمدردانہ مشورہ ہے کہ آپ اپنے پاس ایمبولینس کا نمبر Save کرلیں کسی وقت بھی ضرورت پیش آسکتی ہے۔ ماروی یہ محی الدین نواب کی خوبی ہے کہ وہ کہانی کے ٹیمپو کو تسلسل سے لے کر چلتے ہیں، بہترین کاوشوں پر مبارکباد۔ طاہر جاوید مغل کی پس زنداں پڑھی، دلچسپ اور معلومات سے سجی خوب صورت تحریر ہے۔ آبلہ پا روبینہ رشید صاحبہ کی تحریر شاہکار ہوتی ہے۔ زینب بہت باہمت اور ارادوں کی پکی لڑکی ثابت ہوئی۔ ضیا تسنیم بلگرامی صاحبہ کی عالم باطن میں شیخ حسینؒ کے ایمان افروز حالات و واقعات پڑھے۔ ایمان کو جلا ملی۔ حساب دشمناں اور ملک صفدر حیات اپنی ذہانت اور محنت سے ماجھا ساجھا کے قتل کی اصل وجہ کو سامنے لائے۔ منظر امام کی سوانح نے کوئی خاص تاثر نہیں چھوڑا۔ ہاں البتہ ثمر عباس کی غلط فہمی کچھ اچھی لگی۔ کہانیاں کافی پرانی تھیں۔ محفل شعر و سخن میں زاہد چوہدری، عاصم اقبال، قیصر اعوان، ماجد ثاقب اور مہرین ناز کے اشعار بہت پسند آئے۔“

✠ **قیصر اقبال گچھ**، بکول ضلع بھکر سے محفل کی زینت بنے ہیں ”بارشوں کا موسم، سردیوں کا رخصت ہونا، پھر پلٹ آنا، موسموں کی اس حسین آنکھ مچولی میں ماہ اپریل کا سسپنس 20 مارچ کو ملا۔ بارش نے شاید سرورق کی لڑکی کے میک اپ پر بھی اثر ڈالا۔ تبھی تو لڑکی کا چہرہ دھلا دھلا سا نظر آرہا ہے۔ فہرست کو ایک نظر دیکھ کر انشائیہ خسارہ سے عبرت کا سامان حاصل کیا۔ بے شک ادھوری سچائیوں کے فتنے نے انسانیت کی صورت بگاڑ کر رکھ دی ہے۔ آپ کے خط میں جہاں صحرائے تھر کی خشک سالی اور بچوں کی اموات ایک کھلی حقیقت ہے، وہاں کرکٹ کی شکست ایک اور دھچکا ہے۔ محفل میں صدارت کی کرسی مقصود علی نے سنبھالی۔ مبارک باد آپ کا حق بنتا ہے۔ سعدیہ بی بی! کیا کریانہ اسٹور کا کھوکھا کھول لیا ہے جو آلو، پیاز، لہسن کی ہانک لگا رہی ہو۔ بیاری سعدیہ! کہیں لوگ بخاری کو پنساری نہ کہنے لگیں؟ ارم بتول نے حق کا ڈنکا بجا کر اپنے ہم علاقہ محمد جاوید کی خوب مٹی پلید کی۔ سوہا جی! بہت شکریہ۔ مگر بھینس کے آگے بین بجا کر بین کی توہین نہ کرو۔ علی ڈوگر بھائی! جس کا منہ اور زبان کالی ہو تو اس کے الفاظ خود بخود کالے ہوتے جائیں گے۔ فوزیہ صاحبہ و بیگم، ہارون رشید برادر! اصلاح کرلیں کہ بچے تنگ نہیں ہوتے۔ تنگ کرتے ہیں بلکہ ناک میں دم کردیتے ہیں۔ ماریہ فاروق ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ آغاز پس زنداں سے کیا، جہاں جلال کے عزائم ارم کے لیے کھل کر سامنے آئے، وہاں ہادی بھی گلزار کو اپنی طرف مائل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ نواب صاحب کی ماروی میں مرینہ اپنی تگ و دو میں مصروف ہے تو مراد اور محبوب کی دیوانگی بھی عروج پر ہے۔ محبوب کا مراد کی جگہ لینا عشق کی انتہا ہے۔ عالم باطن میں شیخ حسینؒ کے ایمان افروز واقعات ساتھ ساتھ مریدوں کو دیے گئے خطابات سے معلومات میں اضافہ ہوا۔ ملک صاحب کی حساب دشمناں میں جہاں قانون کی غفلت سے عابدہ کی موت نے جیدا کو مجرم بنایا، وہیں لیاقت نے بھی دوستی کا حق ادا کر کے ساجھا اور ماجھا کو کیفرِ کردار تک پہنچایا۔ آخری کہانی روبینہ رشید کی آبلہ پا ایک بہترین کہانی۔ زینب کی حالات کی تہ تک پہنچنے کی جستجو، عاصم کا ہر پل ساتھ نبھانا، آگ سے بچانا اور شمشیر کی ہلاکت، سب کچھ بہترین۔ تاریخ کے اوراق سے الیاس سیتاپوری کی زیر و زبر میں عضدالدولہ کا رمان سے عشق، ابوجعفر کی سازشیں تو پھر رمان کی دجلہ کی

لہروں میں افسردہ کردینے والی موت ہمیں بھی افسردہ کرگئی۔ کاشف زبیر کی بے خبر میں نقاب پوش باس بے نقاب ہوا تو نام کی مدد سے کیتھی کی بھی خلاصی ہوگئی۔ تنویر ریاض کی رقیب میں اسٹارس کا رقیب ربنا اللہ راستے سے ہٹ کر اس کے لیے راستہ صاف کرگیا۔ بابر نعیم کی یادداشت سے ماضی کی گرہیں کھلیں تو غلط فہمی میں ثمر عباس نے کہانی کو اس کے منطقی انجام تک پہنچا کر غلط فہمی کا شکار ساعدہ کو حقیقت کا آئینہ دکھا دیا۔ محفل شعروسخن میں بہترین اشعار پڑھنے کو ملے۔ کترنیں بھی اچھی تھیں۔ آخر میں ننکانہ صاحب سے میرے بہت ہی پیارے بھائی اور دوست محمد افضل کھرل سے گزارش ہے کہ بھیا جلدی سے سسپنس کی محفل میں حاضری دو۔"

☒ **ملک رحمت** میانوالی سے شریک محفل ہیں "سب سے پہلے تو ہمارے خط کو شامل اشاعت کرنے کا بہت بہت شکریہ۔ اس بار سسپنس 17 تاریخ کو موصول ہوا۔ سرورق پر نظر ڈالی تو پھر نظر ہٹانا ہی بھول گئی۔ لگتا ہے حسین گرل دن میں تارے تلاش کررہی ہے۔ ذاکر انکل نے گردن ذرا لمبی بنادی۔ اس کے بعد خطوط کی محفل جو کبھی کبھی تو مچھلی بازار لگتا ہے میں اترے ہوئے۔ مقصود علی کو کرسی صدارت کی مبارکباد اور مقصود علی کیا آپ کے خیال میں آپ کے خط کو فریم کراکے رکھنا چاہیے تھا؟ سعدیہ بخاری لگتا ہے آپ کو چشمہ مل گیا جو حاضر ہوگئی ہیں۔ آپ نے صنف وجاہت کو شاید کبوتروں کی خوب صورتی دیکھ کر کبوتروں سے تشبیہ دی ہے۔ آپ واقعی کھلے ذہن ودل کی مالک ہیں۔ ویسے آپ کی صنف کی بلیک کیٹ تو کبوتروں کی دشمن ہیں اب صنف وجاہت کو بچ کے رہنا ہوگا ان سے۔ کہانیوں میں پہلے میں صفدر حیات صاحب کو پڑھتا ہوں تو اس بار بھی وہی روٹین رہی۔ اس واقعے نے تو لرزا کر رکھ دیا۔ اتنا ظلم اتنی سفاکی وہ بھی کسی کی دشمنی کا بدلہ اگر اس کے اپنے دشمن ہوتے تو پتا نہیں کیا کیا کرتا پس زنداں بہت پسند آرہی ہے۔ ماروی اب رنگ بدلنے لگی ہے۔ ویسے بھی مجھے نواب صاحب کی ہر تحریر پسند آتی ہے۔ کاشف زبیر کی اسٹوری بھی اچھی تھی۔ 70 نمبر نیا آئیڈیا تھا۔ آخری صفحات کچھ زیادہ متاثر نہ کرسکے کہانی بس سو سو تھی بور نہیں کیا۔ مجموعی طور پر رسالہ بہترین تھا۔"

☒ **منشی محمد عزیز میمن**، لڈن ضلع وہاڑی سے چلے آرہے ہیں "ویسے تو آپ خوب صلہ دیتے ہیں محبتوں کا کہ خط تو در کنار نام تک نہیں تھا نہ شعر تھا۔ (کبھی کبھی ایسا بھی ہوجاتا ہے) اس وقت حالت یہ ہے کہ گزشتہ منگل سے بیمار پڑا ہوں۔ سسپنس چھوٹے بھائی نے ساجد سے لاکر دیا۔ بڑی امید تھی کہ خط اور شعر شامل ہوگا کیونکہ انیس فروری کو رجسٹری سے بھیجا تھا لیکن جب سسپنس کھولا تو ساری امیدوں پہ پانی پھر گیا۔ (اب تو سارا پانی خشک ہوگیا ہوگا......؟) سرورق والی محترمہ کا میاں اس نئی نویلی دلہن کو چھوڑ کر سسپنس پڑھنے میں مگن ہے اور وہ بیچاری اکیلی ہاتھوں میں مہندی لگائے، غمگین گانے سن رہی ہے، مجھے چھوڑ کر اکیلا......خط لکھنے کا مقصد اپنا غصہ آپ کو بتانا کہ دیکھیے مجھے غصہ مت دلایا کریں، ورنہ میں کہیں منہ کر جاؤں گا۔ اس شخص کی طرح جو کنویں میں گر گیا تو دھمکی دینے لگا کہ مجھے باہر نکالو ورنہ میں کہیں منہ کر جاؤں گا۔ اس مرتبہ بیماری کی وجہ سے صرف رقیب اور حساب دشمناں پڑھی ہیں بڑی مشکل سے۔ اسٹارس نے اپنے رقیب سے جان چھڑوا ہی لی تھی، حساب دشمناں ایک غیرت مند جوان کی داستاں جس نے دوست کی بے عزتی کا بدلہ بڑی سنگدلی کے ساتھ لیا۔ مقصود علی صاحب! مبارکباد قبول فرمایئے کہ آپ کے سو سے چل گئے۔ اشتیاق شاہین! آپ کے خط نے مجھے بھی دوبارہ خط لکھنے پر مجبور کردیا ورنہ میں تو ناراض ہو چلا تھا مدیر اعلیٰ صاحب سے۔ مہرین ناز جی! یہ اعجاز احمد راحیل والا کیا چکر ہے؟ لو جی، بلیک کیٹ کہاں غائب ہوگئی ہیں۔ اب ایک الجھن چلی آرہی ہیں۔ شاید آئندہ ماہ الجھن بھی ان کے ہمراہ ہو۔ انکل جی! ایک مشورہ ہے کہ ہر ماہ ایک بہترین خط پر انعام دیا کریں جو کہ مزاح اور تبصرے سے بھرپور ہو۔ اس سے مقابلہ بازی کی فضا پیدا ہوگی۔"

☒ **اعجاز احمد راحیل**، ساہیوال سے تبصرے کے ساتھ حاضر ہوئے ہیں "19 مارچ کی ایک خوشگوار سی شام کو سندیسۂ بہار میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ سرورق پر موجود محبوبہ دلنواز عہد رفتہ کی بھول بھلیوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ انشائیہ میں جون ایلیا صاحب ہمیں ایک حقیقت سے روشناس کرانے نظر آئے۔ بلاشبہ ہم اپنے حسن عمل سے اس خسارے سے بچ سکتے ہیں۔ بہاروں کے اس موسم میں صحرائے تھر میں کیسی خزاں کی بہتیں ڈیرے ڈالے بیٹھی ہیں۔ تلخ حقائق کو اجاگر کرتا اداریہ اشک بار کرگیا۔ حیدرآباد سے اپنی بہت ہی پیاری دوست مہرین ناز کا خوب صورت لفظوں کے کنول سے سجا ہوا تبصرہ قابل تعریف وتوصیف ہے۔ آپ کا سر پرائز بہت اچھا لگا۔ مقصود علی کو مبارکباد، علی پور سے ارم بتول کا انداز تحریر بے حد پسند آیا۔ لاہور سے سوہا جی، سوبیہ، حوریہ اور گل جیسی ناقص العقل ہستیوں کو عقل استعمال کرنے کا مشورہ بے سود ہے۔ علی ڈوگر، سید اکبر شاہ اور دلاور مین نے بھی دل کھول کر لکھا۔ انکل رمضان پاشا جی آتے رہا کریں......الیلی، بشریٰ افضل کے تبصرے بھی قابل داد ہیں۔ سسپنس کے افق پر ماہتاب بن کر جگمگانے والے عظیم قلم کار محبتوں کے نقیب طاہر جاوید مغل صاحب کی دل میں اتر جانے والی تحریر پس زنداں کا تیسرا حصہ بھی اپنا آپ منوانے میں کامیاب رہا۔ حجاب اب کچھ کچھ بادی پر اعتماد کرنے لگی ہے۔ بینش کا سانحہ دل پہ گہرا اثر چھوڑ گیا۔ بادی کے کیمرے میں ارم کا حجاب کی تصویر دیکھنا اچھا شگون نہیں ہے۔ محی الدین نواب بلاشبہ ایک مستند لکھاری ہیں۔ ماروی ان کی یادگار تحریر ثابت ہوگی۔ محبوب چانڈیو از دی گریٹ، مراد مرینہ کے لیے لوہے کا چنا ثابت ہوا ہے۔ روبینہ رشید کی آبلہ پا، ناقابل فراموش تحریر ہے۔ مصنفہ نے اول تا آخر کہانی میں سسپنس برقرار رکھا ہے۔ زینب نے اپنا کردار خوب نبھایا ہے۔ ابتدائی صفحات پر الیاس سیتاپوری محبتوں کے درمیان سازشوں کا احاطہ کرتی تحریر زیر وزبر لے کر آئے۔ معتضد الدولہ اور ربان کا عشق قابل رشک ہے۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ عورت کو اپنی زندگی میں خود پہ حاوی نہیں کرنا چاہیے۔ ملکہ صاحبہ کی ڈائری سے حسام بٹ اس دفعہ ایک نصیحت آمیز تحریر حساب دشمناں لے کر آئے، بے شک خدا کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔ دولت کے ہوس میں مبتلا کرداروں پر مبنی کاشف زبیر کی بے خبر کافی دلچسپ رہی، امجد رئیس کی 70 نمبر، مجرم چاہے جتنا بھی چالاک ہو غلطی ہوہی جاتی ہے گورڈن کا ہن کو برنس نے اپنی ذہانت سے قابو کیا۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی خوب صورت تحریر، عالم باطن میں تیغ حسین جیسے صاحب کشف بزرگ کے بارے میں کافی معلومات ملیں۔ بے شک اللہ پاک اپنے نیک بندوں کو کرامات عطا کردیتا ہے۔ منظر امام کی سوا سیر یاسیت بھرے لمحات کے لیے اکسیر ثابت ہوئی۔ کہانی کے اینڈ پہ بے اختیار ہنسی آگئی۔ ثمر عباس کی غلط فہمی اچھی لگی اپنوں کے درمیان پیدا ہونے والی غلط فہمیوں کو دور کردینا چاہیے۔ محفل گلستان میں سب دوستوں کے منتخب اشعار اچھے لگے۔ خاص طور پر مہرین ناز، ماہین فاطمہ اور رمضان پاشا کے چنے گئے

پھول زیادہ پسند آئے۔ ماہ اپریل کا شمارہ ذہن کو تازگی بخش گیا۔"

☒ **تفسیر عباس بابر**، اوکاڑہ سے بھرپور تبصرے کے ساتھ محفل کی زینت بنے ہیں "آج کا کام کل پر چھوڑتے ہوئے...... غیر حاضری کا دورانیہ طویل ہوکر کافی مہینوں پر محیط ہوتا چلا گیا کچھ ناگزیر وجوہات، مصروفیات اور عہد ناگوار سے نبرد آزما زندگی کے گوناگوں مسائل سے جو نہی کچھ فرصت میسر ہوئی ہے۔ ہم در یا پر پلکوں سے دستک دے کر اذن باریابی کے بہ دل سے ملتمس ہیں۔ یاد رکھنے والے احباب کی ممنون نوازش اور بھول جانے والوں سے کیا گلہ کہ عہد حاضر کے تلخ تقاضوں، سفاک رویوں اور عالم نفسانفسی کا یہی تقاضا ہے۔ موجودہ ملکی حالات کے تناظر میں کچھ کہنے یا لکھنے کی تاب...... دل بے تاب میں ہرگز نہیں ہے۔ ہاں مگر افسوس، غم اور قلق ہے ان قافلوں کا جو کہ بے حس اور بینائی سے محروم رہنماؤں کی زیر قیادت، مہنگائی، مفلسی، لوڈشیڈنگ، فرقہ واریت اور لاقانونیت کی دلدلوں کی عمیق گہرائیوں میں جا ٹھہرے ہیں۔ ارمان ہے ان بے تعبیر خوابوں، ناکام حسرتوں اور ادھوری امیدوں کا۔ جن پر تلخ حالات اور گردش ایام کے سخت پہرے ہیں۔ ستم بالائے ستم ہے کہ زوال ویاس کے بادل ابھی تک گہرے ہیں۔ دعا ہے رب دو جہاں سے کہ وطن عزیز کے زوال وابتلا......کا خاتمہ بالخیر ہو۔ آمین۔ سسپنس نے حسب معمول کافی تاخیر کے بعد درشن دیے خیر وہ کیا ہے کہ ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی ہوگا۔ دیدہ زیب رنگوں سے مزین سرورق۔ ذاکر صاحب کے کمال فن کا نادر ونایاب نمونہ۔ دوشیزۂ سرورق یقیناً گزرے وقت کی تلخ وشیریں یادوں میں، محو وگمن ہیں۔ جون ایلیا کا تکلیف دہ تجزیہ۔ خسارہ دعوت فکر دے گیا گویا کہ ہم پاکستان کی بنیاد وابتدا سے لے کر اب تک سراسر خسارے میں ہیں۔ آپ کے خط میں اداریے کا اداریہ ہمیشہ خاصے کی چیز ہوتا ہے۔ مسند صدارت پر کراچی سے مقصود علی کی تفصیل وتمہید اور گفت وشنید بھی پسند آئی۔ اٹک سے سعدیہ بخاری کی چٹکی چپڑی باتیں بھی خوب رہیں۔ مہرین ناز اور اعجاز احمد راحیل کا اشتراک لمحہ فکریہ ہے۔ مستند تبصرہ نگار محترمہ بشریٰ افضل کی آمد نیک شگون ہے۔ گمشدہ احباب میں ماہا ایمان، تصویر النعین اور حمیرا رضا کا طویل غیاب باعث تشویش ہے۔ آغا فرید احمد خان آف سکھر کی صحت وتندرستی کے لیے تہ دل سے دعا ہے۔ ابتدائی صفحات پر مرحوم الیاس سیتاپوری کی خزینہ کتب تواریخ سے نادرونایاب تحریر وتحقیق زیر وزبر نے معلومات میں گراں قدر اضافہ کیا۔ آخری صفحات کا توشۂ خاص روبینہ رشید کے سحر انگیز قلم کا شاخسانہ آبلہ پا نہایت منفرد ومعیاری اور دلچسپ ترین تحریر ثابت ہوئی۔ زینب احمد نے تلخی ایام کا مقابلہ حسن عزم صمیم کے ساتھ کیا، قابل داد ہے۔ نور جہاں نے مکروہ مقاصد کی تکمیل کے لیے منفی راستہ اختیار کیا۔ کہانیوں کے مغل اعظم طاہر جاوید مغل کی پراثر ودل نگار اور سحر انگیز تحریر پس زنداں محبتوں کے سفیر کا ایک اور شاہکار بادی ایک منفرد اور حجاب ایک مظلوم کردار، جلال اور ارم کے لیے یقیناً قدرت کا عتاب وعدل عنقریب لازم ہے۔ کاشف زبیر کی بے خبر، بے حسی، مفاد پرستی اور خود غرضی کی مکروہ سازش، نہایت حمدہ پلان اور کیتھی کی ذہانت قابل داد۔ محی الدین نواب کی ماروی کا پانچواں حصہ۔ کہانی اور کرداروں میں کچھ حقیقی رنگ ہو تو قلب وذہن متاثر ہوتے ہیں ورنہ...... الجھن تو بہرحال ہوتی ہی ہے۔ اب یہ بات تو ناقابل قبول وبرداشت ہے کہ کوئی آدمی کاغذ کے جہاز پر بیٹھا دنیا گھوم رہا ہے۔ خیر...... ملک صفدر حیات کے تھانے سے ایک اور قصہ حساب دشمناں، مکافات عمل اور قوانین قدرت کی عبرت آموز دلیل، بے شک وہی ہے جو نظام کائنات کا مالک ومختار ہے۔ رقیب عشق کی رقابتوں کا یہ قصہ بھی خوب رہا۔ بابر نعیم کی یادداشت نے بھی متاثر کیا۔ منظر امام کی سوا سیر، بوجھل لمحوں کے لیے اکسیر قلب ثابت ہوئی۔ ثمر عباس کی غلط فہمی نے بھی بور نہیں کیا۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی عالم باطن نے ایمان تازہ کیا۔ بزم شعروسخن میں قارئین کا بہترین انتخاب قابل داد رہا۔" (اتنے خوب صورت اور جامع تبصرے کا شکریہ)

☒ **ادریس احمد خان**، ناظم آباد کراچی سے تشریف لائے ہیں "سسپنس کا بے تابی سے انتظار کرتے ہیں۔ سسپنس کی دید ہوتے ہی گویا عید ہوجاتی ہے۔ سرورق کی نازنین مہ جبیں آنے والے خوش کن نظاروں میں محو ہے۔ اندر جون ایلیا کے انشائیے میں پہنچے۔ جہاں صراط مستقیم پر چلنے والوں کے لیے پر آشوب دور نظر آتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ سچ کی راہ پر چلنے والوں کے لیے ہر دور مصائب کا دور ہوتا ہے۔ اداریے میں نئی بہار کے غنچوں وشاخوں پر کھلی کونپلیں اپنی بہار دکھا رہی ہیں۔ ناموں کی محفل میں مقصود علی سرفہرست نظر آرہے ہیں، مبارکباد۔ خط تحریر کرتے وقت کیلنڈر پر نظر پڑ رہی ہے جہاں ایک روز بعد 23 مارچ کے عدد جگمگا رہے ہیں۔ افسوس کا مقام ہے کہ ہر سال 23 مارچ کی تاریخ آتی ہے اور دبے پاؤں گزر جاتی ہے اور ہم بے حسی کی تصویر بنے گزرتے لمحوں کو دیکھتے دیکھتے بھول جاتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ ہمارے اسلاف نے کتنی قربانیوں، انتھک محنت اور اغیار کی دشمنانہ چالوں کے بعد اس عظیم وپاک وطن کو حاصل کیا تھا۔ اندر کہانیوں میں سب سے پہلے پس زنداں پڑھی جو اپنی گوناگوں دلچسپیوں کی وجہ سے بہت ذوق وشوق سے پڑھتے ہیں۔ جس کے ہر ہر لفظ سے محبتوں کے دیس ونیس کی تصویر اپنے سامنے محسوس کرنے لگتے ہیں۔ وہ دیس جو خوشبوؤں کا شہر ہے، جو محبتوں کا شہر ہے۔ یقیناً پس زنداں آغاز کی طرح انجام بھی خوب صورت ہوگا حالانکہ حقیقتوں اور کہانی میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ دوسری کہانی محی الدین نواب کی ماروی تھی جس میں دلچسپی کا عنصر کم ہوتا جارہا ہے مگر تحریر ایک مقبول لکھاری کی ہے۔ تو ایک ایک سطر پڑھنا بھی ہے۔ تیسری کہانی الیاس سیتاپوری کی زیر وزبر ایک تاریخی کہانی تھی جو زبردست تھی اور عبرت ناک بھی تھی۔ کاشف زبیر کی بے خبر جس میں کیتھی کو مجرموں، نمک حرام بینک کے ملازموں نے اپنے ناپاک عزائم کا شکار بنایا۔ اس کی نیکی نیتی کام آگئی۔ یادداشت بھی بہتر تھی۔ محفل شعروسخن میں اچھے اور معیاری اشعار نے مزہ دیا۔ اقوال زریں کترنیں بھی اپنا آپ منوانے میں کامیاب رہیں۔ 70 نمبر میں مجرم چھوٹی سی بھول پر پکڑا گیا ہر مجرم یہ سمجھتا ہے کہ اس نے واردات کا کامیاب منصوبہ بنایا ہے مگر مجرم کتنا ہی چالاک ترین ہو کہیں نہ کہیں داؤ میں آہی جاتا ہے۔ منظر امام کی سوا سیر نے ہونٹوں پر ہنسی کا سبب بنایا۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی عالم باطن نے ایمان کی جلا بخشی۔ اللہ کے ولیوں کے حالات وواقعات پڑھ کر ایمان کو گویا تازگی عطا ہوتی ہے۔ ثمر عباس کی غلط فہمی ایک سبق آموز کہانی تھی جس سے یہ تاثر ملا کہ بہو کا لفظ خصوصاً عورت کے لیے ایسا ہے جیسا کہ کڑوا گھونٹ۔ چاہے بہو ساس وسسرال کے گھر والوں کے لیے کتنی ہی پرخلوص ہو مگر ہمیشہ بہو کو شک کی نظر سے ہی دیکھا جائے گا۔ غلط فہمی کی وجہ سے ساعدہ نے بہو کو غرق دریا کردیا۔ آبلہ پا آخری صفحات کی خوب صورت کہانی تھی۔"

✠ **شوکت شہر یار،** گورنمنٹ کالونی، اوکاڑہ سے چلے آرہے ہیں ”اس مرتبہ اپریل کا شمارہ 18 تاریخ کو ملا۔ سرورق پر ایک پرسوچ حسینہ کو دیکھ کر بے اختیار مہرین نازکی یاد آ گئی۔ محفل میں حاضری دی تو مقصود علی کو کرسیٔ صدارت پر براجمان پایا۔ سعدیہ بخاری مسلسل 2 ماہ کی غیر حاضری کے بعد تشریف لائیں۔ ویلکم۔ ارم بتول نے محفل میں دعا کا دار اعری دی اور سب کے چھکے چھڑا دیے۔ سیدا کبر شاہ آپ کو مہرین نازکی کون سی بات سے راحت ملی ہے؟ ماریہ فاروق آپ کو بہن کی شادی مبارک ہو۔ کہانیوں میں سب سے پہلے پس زنداں پڑھی، جو آہستہ آہستہ اپنے عروج کی جانب گامزن ہے۔ کاشف زبیر کی بے خبر ایک الجھی ہوئی تحریر تھی۔ ماروی اس مرتبہ بمیرا کی سازش کا شکار ہو گئی ہے، اب دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ مختصر کہانیوں میں رقیب، یادداشت، 70 نمبر، سواسیر، غلط فہمی، عالم باطن اچھی تحریریں تھیں۔ اس دفعہ کترنیں شاندار تھیں سیدا کبر شاہ، ریاض بٹ کے چٹکلے اچھے تھے۔ محفل شعر و سخن میں محمد امجد ریاض، متین سلطان، زاہد چودھری، عاطف شاہین، سیدا کبر شاہ، مہرین ناز اور احمد خان توحیدی کے اشعار اچھے تھے۔ مجموعی طور پر اس ماہ کا شمارہ شاندار تھا۔“

✠ **حسیب احمد چناٹ،** الگذی کرک سے حاضر محفل ہیں ”ماہ اپریل کا شمارہ 20 تاریخ کو ملا۔ کل پاک بھارت ناکرا بھی ہے۔ اس ماہ کا ٹائٹل متاثر کرنے میں ناکام رہا۔ پھر خطوط کی محفل میں آ گئے۔ میرا نام تو بلیک لسٹ میں بھی نہیں تھا۔ مقصود علی ٹاپ پر تھے۔ محترم مبارکاں جلی بھائی یہاں پر سب ایسا ہی ہوتا ہے پہلے سوسے کھانے کو ملتے ہیں پھر خالی پلیٹ ملتی ہے مطلب نام بلیک لسٹ میں ہوتا ہے۔ مہرین باجی انداز پسند کرنے کا شکریہ، میرے لیے اسپیشل دعا کرنا۔ کیونکہ 24 اپریل سے میرے سیکنڈ ایئر کے ایگزام شروع ہو رہے ہیں۔ بشریٰ باجی سالگرہ کی مبارکباد دینے کا شکریہ۔ ہمارا تو کبھی کبھار تبصرہ لگ جاتا ہے پیسے یہ میری اٹھارویں سالگرہ تھی۔ سحر امام کی کہانی ہمیں ہمیشہ ہنسانے پر مجبور کرتی ہے۔ ماروی میں مرینہ نے مراد کو آزاد تو کروالیا۔ لیکن مراد کے دل میں اپنی جگہ نہیں بنائی کیونکہ رشتے جذبات سے بنتے ہیں زبردستی نہیں۔ پس زنداں نے بھی زور پکڑ لیا ہے۔ ارم حجاب کو گھر سے آؤٹ کرنے کے لیے ہی آئی ہے۔ ملک صاحب کی حساب دشمناں بھی ایک سنسنی خیز داستان تھی۔ باقی شمارہ زیر مطالعہ ہے۔“

✠ **زویا اعجاز،** لاہور سے محفل میں شریک ہیں ”اپریل کا شمارہ 18 مارچ کو اس وقت ہاتھ میں آیا جب امتحانات کی مصروفیات نے بے حد الجھا رکھا تھا لہٰذا ڈائجسٹ کا مطالعہ فراغت کے لیے موقوف کرنے کو ترجیح دی۔ ٹائٹل پر براجمان محترمہ 80 کی دہائی کی ایسی ہیروئن کی طرح پوز کرتی ہوئی بالکل نہیں جچ رہی تھیں۔ جون ایلیا کے لکھے ہر لفظ میں معاشرے کا اصل رنگ جھلکتا ہے۔ تھر کی پکار نے ہر پاکستانی کا دل غمگین اور آنکھیں نم کردی ہیں مگر اقتدار کے ایوانوں کو جانے کب یہ پکار خواب غفلت اور عیش و طرب سے جگا پائے گی؟ عوام قحط اور بدحالی کا شکار ہے اور حکومت ورلڈ ریکارڈ کے لالی پاپ کھلا رہی ہے سب کو۔ ایڈیٹر صاحب ایشیا کپ میں شکست پر ملول نظر آئے مگر عوام کے حوصلے ورلڈ ٹی ٹوئنٹی کے لیے اب بھی جوان ہیں۔ محفل پر نظر دوڑائی تو اپنا نام اس بار بلیک لسٹ میں چمکتا نظر آیا۔ کمال کرتے ہو پانڈے جی۔ 23 تاریخ کو موصول ہونے والا تبصرہ آپ نے بلیک لسٹ کردیا۔ اس غیر جمہوری اور غیر آئینی اقدام کی وضاحت تو کیجیے۔ (کبھی کبھی دل بڑا کر کے دوسروں کو بھی جگہ دینی چاہیے) علی ڈوگر! ہمیں قدرت نے آل ریڈی اس دولت سے مالا مال کررکھا ہے۔ آپ اس حوالے سے کافی ضرورت مند دکھائی دیتے ہیں تو یہ دولت بقدر ضرورت آپ کو بھی فراہم کی جاسکتی ہے۔ فوزیہ تبسم! بھلا آپ کو ہم نے اس قابل کب سمجھا ہے کہ آپ سیانی بی بن کر ہمیں مشورہ دیں۔ آپ اپنے مفت مشورہ سینٹر کی جانبداری کہیں اور جا کے چکائیے۔ ارم بتول خالہ! آپ کا مرض آپ کو ہی مبارک ہو جی۔ آپ کی کی گئی غلطیاں ہم کیسے دہرا سکتے ہیں۔ مہرین ناز! ہم اڑتی چڑیا کے پر گن لینے والوں میں سے ہیں۔ کہانیوں میں روبینہ رشید کی آبلہ پا اسٹوری آف دی ڈے رہی۔ تھرل اور سسپنس سے بھرپور قدرے طویل اس کہانی نے آخری صفحات کا بھرپور حق ادا کیا نور جہاں کو ہمارے عذیر روزیر دیمون مانٹنڈ نے آغاز میں ہی مجرم قرار دے دیا تھا۔ پس زنداں میں کافی دہشت از بام ہوئے مگر جانے کیوں لگتا ہے حجاب نے بینش کے حوالے سے کچھ پہلو ہادی سے پوشیدہ رکھے ہیں۔ ماروی کی یہ قسط ختم ہونے پر شکر کا کلمہ ادا کیا۔ حساب دشمناں میں کافی لرزہ خیز واردات کا احوال سامنے آیا۔ زیر و زبر میں کافی مقامات پر تشنگی محسوس ہوئی۔ ریحان جیسی زیرک عورت کا سب کچھ جانتے بوجھتے ابو جعفر پر اندھا اعتماد اسے لے ڈوبا۔ بے خبر ہے؟ آغاز نے ہی تجسس میں جکڑ لیا۔ عالم باطن میں ہمارے پسندیدہ صوفی شاعر شاہ حسین کی زندگی کے کچھ مزید پہلوؤں سے آگاہی ہوئی مگر مادھو لال والا قصہ ابھی بھی تشنہ لگا۔ سواسیر کے انجام نے کافی محظوظ کیا۔ رقیب، غلط فہمی اور 70 نمبر بھی اچھی رہیں۔ اشعار میں سوہا جی کا انتخاب بہترین تھا۔“

✠ **مظہر سلیم،** رحیم یار خان سے چلے آرہے ہیں ”سسپنس ڈائجسٹ کے ورق پلٹتے ہیں تو قلب و نظر کی مدارات کے مرحلے تواتر کے ساتھ شروع ہوجاتے ہیں۔ سطر سطر، صفحہ در صفحہ تشنگی بڑھتی چلی جاتی ہے اور لفظ در لفظ روح کی تسکین کا سامان بہم ہوتا رہتا ہے۔ اپریل کا سسپنس ڈائجسٹ مارچ کو ہاتھوں کی زینت بنا۔ حسب سابق جون ایلیا کے انشائیے سے مطالعہ کا آغاز کیا۔ انشائیے میں جون ایلیا صاحب نے جن نکات کی طرف توجہ دلائی وہ قابل غور ہیں۔ سچ ہے کہ نفرتوں کی گرم بازاری اور محبتوں کی قحط سالی میں دکھی انسانیت کے دکھ اور بھی بڑھ گئے ہیں۔ ”آپ کے خط“ میں تھر کے موجودہ حالات کے تناظر میں آپ کے اداریے نے سوچ کے در وا کردیے نہ جانے حکمران کب ایسے مسائل کو اپنی ترجیحات میں شامل کریں گے۔ انسانیت کی اکھڑتی سانسیں اور آہ و بکا سے ان کے دل کیوں موم نہیں ہوتے۔ محفل یاراں میں مقصود علی کا تبصرہ اعزازی قرار پایا، مبارکاں جناب...... اس بار کافی نئے نام سامنے آئے۔ مہرین ناز آپ خطوط میں نوک جھونک پر محظوظ ہونے کے بجائے مگرمچھ کے آنسو بہاتے ہوئے کوڑے کے تخریبی سوچوں کے جوہڑ میں کیوں اتر جاتی ہیں؟ لیلیٰ دوسروں کو مشورہ دینے سے بہتر ہے اپنی اصلاح کریں۔ طاہر جاوید مغل صاحب کا نام کہانی کے لیے پسندیدگی کی سند ہوتا ہے۔ متنوع موضوعات، طرفہ خیالات، محبت میں رچے بسے جذبات، زندگی پر محیط رویے، معاشرتی مسائل کا ادراک اور ان کا پراثر اظہار، گویا سسپنس کے صفحات پر زندگی سانس لیتی محسوس ہوتی ہے۔ پس زنداں ایک شاہکار کہانی، ہادی کی حجاب میں غیر معمولی دلچسپی کسی خاص جذبے کا تاثر دیتی ہے...... محی الدین نواب رسالوں کی دنیا کے نواب جب معاشرتی مسائل پر لکھتے ہیں تو معاشرے کے ایسے ایسے رویوں کو اپنے طنز کا نشانہ بناتے ہیں جو اجتماعی ناسور کی شکل اختیار کرچکے ہیں۔ حشمت جلالی جیسے مکروہ کردار کی شناخت کو ایسے

سامنے لاتے ہیں کہ قاری اس کردار سے نفرت محسوس کرنے لگتا ہے۔ ملک صفدر حیات کی ڈائری سے اس بار حساب دشمناں کے عنوان سے کہانی سامنے آئی۔ قدرت کے انتقام کی عبرت اثر روداد میں ساجھا اور ماجھا کے دہرے قتل کا مرتکب شخص ”لیاقت یک چشم“ زیادہ دیر تک قانون کی نظروں سے اوجھل نہ رہ سکا اور آہنی زیور اس کا مقدر ٹھہرا۔ اولیائے کرام کے سلسلے میں شیخ حسین کے ایمان افروز واقعات پڑھ کر قلب منور ہوا...... آخری صفحات کی سوغات ”آبلہ پا“ میں روبینہ رشید کے قلم کی جولانیاں عروج پر نظر آئیں۔ زینب کی آبلہ پائی کی روداد نے بہت متاثر کیا۔ صاحب تحریر طویل عرصے بعد آخری صفحات پر جلوہ افروز ہوئیں اور چھا گئیں۔“

✠ **بشریٰ افضل،** بہاولپور سے محفل میں شریک ہیں ”20 مارچ کو سسپنس ملا۔ صنف نازک سوچتی اور بڑے اسٹائل سے ماتھے پر مہندی لگے ہاتھ چوڑیوں بھرے بازو، گلے میں لاکٹ بڑے دلبرانہ انداز سے انتظار کی گھڑیاں گزرنے کے انتظار میں ہے۔ قابل ذکر بات آنکھوں کے کاجل نے آنکھوں کی خوب صورتی کو بڑھا دیا ہے۔ جون ایلیا کا (خسارہ) پڑھا وہ دنیا کی نفرتیں ختم کرتے کرتے خود ابدی نیند سو گئے ہماری قوم کی نفرت ختم ہوئی۔ اپنی محفل میں پہنچے انکل کی باتیں بھی کھری کھری ہوتی ہیں اگر لوگ سمجھنا چاہیں گے۔ مقصود علی کو کرسیٔ صدارت مبارک ہو، شکر کریں کہ رسید تو ملی گئی نا! یہ بھی ان کا بڑا پن ہے۔ سعدیہ بخاری کا تبصرہ بہت خوب صورت تھا۔ سوہا جی میں آپ کی بات سے متفق ہوں ٹیچر کا احترام کرنا ہر طالب علم پر فرض ہے۔ رقیب میں ارسلا ہی اپنے شوہر کے ساتھ مخلص نہیں تھی شوہر کے سامنے ہی اس کی دلداری میں کوئی کسر نہ چھوڑی تو خدا نے خود ہی اس کو سزا دے ڈالی۔ یادداشت، میں برائن کی بیوی اور بیٹی نے بڑے صبر سے کام لیا۔ بیٹی کی کوشش سے شوہر کی یادداشت واپس آئی۔ 70 نمبر، زبردست تحریر تھی مزہ آ گیا۔ محفل شعر و سخن کو انجوائے کیا۔ اشعار ایک سے بڑھ کر ایک۔ بے خبر، کیتھی واقعی بے خبر تھی۔ نام اگر اس کا ساتھ نہ دیتا تو اس کو سزا ضرور پینک والے دلواتے۔ کیتھی نے اپنے طور پر انکوائری بھی اچھے انداز میں کی۔ عالم باطن، میں ایسے ایمان افروز واقعات نے ہمارے باطن کو بھی روشنی بخشی۔ غلط فہمی میں سائدرہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اس کا ازالہ بھی کردیا۔“

✠ **ابرار وارث،** سدلیانوالی سے تبصرہ کررہے ہیں ”سسپنس اس دفعہ 23 مارچ کو ملا۔ سب سے پہلے خطوط پر سرسری سی نظر ماری اور اپنا خط سب سے آخر میں نظر آیا۔ دل بہت خوش ہوا اور ایک خط میرے ہم جماعت عاطف شاہین کا تھا وہ بھی میری وجہ سے سسپنس کی سلسلہ وار کہانیوں کا ایک بار پڑھتے ہی دیوانہ ہوگیا ہے۔ عاطف مبارک ہو آپ کا خط بھی شائع ہوگیا ہے اور اس کے بعد اپنے من پسند رائٹر طاہر جاوید کی پس زنداں پڑھی۔ یہ قسط کافی تہلکہ خیز تھی خاص طور پر حجاب کی کزن بینش اور اس کے بیٹے ارسلان کی موت سے میرے تو آنسو نکل آئے اتنی دردناک موت۔...... اس کے بعد ماروی پڑھی اور پتا ہی نہ چلا کب ختم ہوئی ایک تیز رفتار قسط تھی۔ مراد نے اس دفعہ بہت سمجھداری دکھائی اور اکیلے ہی مرینہ کے چنگل سے بھاگ کھڑا ہوا۔ چودھری حشمت کا داؤ اسی پر الٹا ہوگیا رابعہ بیگم نے سمجھداری کا ثبوت دیا۔ دونوں سلسلہ وار کہانیاں شروع ہی میں خوب مقابلے پر ہیں اور ایک سے بڑھ کر ایک۔ ملک صفدر حیات کی حساب دشمناں پڑھی۔ اتنے بھیانک انداز میں اقدام قتل، کیسا سفاک قاتل تھا جو نام بدل بدل کے ہر جگہ رہ رہا تھا مگر بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی کے مصداق پکڑا گیا۔ آخری صفحات پر طویل ناول پڑھنے کو ملا۔ روبینہ رشید نے بہت اچھا لکھا۔ آبلہ پا نام کی طرح بہت پیارا ناول تھا۔ بے چاری زینب نے اپنی شناخت پانے کے لیے کیا کیا نہ کیا اور خود بھی آگ میں جلنے سے بڑی مشکل سے بچی۔ روبینہ رشید جی شمشیر اور نور جہاں کا تھوڑا واضح کر کے انجام دکھاتیں ان کے بارے کچھ بتایا ہی نہیں کہ نور جہاں کہاں گئی۔ کاشف زبیر انکل کی بے خبر پڑھی۔ کیتھی بے چاری اپنے ہی دفتر میں ہونے والی سازشوں سے بے خبر رہی یہ تو اچھا ہوا کہ اسے یاد آ گیا آخری دن اپریل کا تھا جب اس نے ویٹر کو دیکھا تھا۔ ٹام کی صورت میں کیتھی کو زندگی کا بہترین ساتھی مل گیا۔ لالچ کے ہاتھوں مجبور سارا دفتر ہی پولیس کے ہتھے چڑھ گیا ویلڈن۔ کترنوں میں عاطف عمیر کا چٹکلہ پسند آیا۔ زاہد چودھری، محمد عماد، عاطف شاہین اور رمضان پاشا کے شعر بہت پسند آئے۔ آخر میں ایک دفعہ پھر رب تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمارے سسپنس کے اسٹاف کو ہمیشہ خوش رکھے اور ان کو ہر آزمائش میں کامیاب کرے جو اتنے تلخ حالات و واقعات کو ہم تک بہت ہمت و مردانگی سے پہنچا رہے ہیں۔“ (بہت بہت شکریہ......)

✠ **لیلیٰ،** کراچی سے محفل میں شریک ہیں ”سلام بنت حوا و ابن آدم، اپریل 2014ء کے حسین و رنگین شمارے میں اپنی موجودگی، دل و دماغ کو عجیب سا سرور دے گئی۔ سسپنس اداریہ قدر دان و قابل ستائش ہے۔ ہم انشائیہ اور اداریہ کی دل سے قدر کرتے ہوئے دل والوں کی محفل میں داخل ہوئے۔ جناب مقصود صاحب کو مبارک باد سعدیہ جی ڈیئر کیا بات ہے آپ کی...... ارم بتول آپ نے تو تن کے رکھ دیا سب کو، اعجاز احمد اینڈ مہرین ناز کی جوڑی تو اس محفل میں نمبرون رہی۔ سوہا جی آپ تو ہمیں نگری نگری پھرا مسافر لگتی ہیں۔ قیصر اقبال اولڈ بوائے تو الہڑ مٹیار کی طرح سرسوں کے کھیتوں میں ناک کھجاتے پھر رہے تھے۔ فوزیہ بی بی جلاپا چھوڑو اور اپنی لیپا پوتی کی طرف توجہ دو۔ سسٹر گل کلاں آپ کہاں بے مروتیاں کرتی پھر رہی ہو۔ سید محی الدین آپ آج کل کون سے دوروں سے دو چار ہیں؟ علی ڈوگر، حوریہ اور مقدس کا تبصرہ ان کے ناموں کا متضاد تھا۔ اعجاز آرائیں آپ کی اتنی اچھی سوچ اور جیل، یہ بات سمجھ نہیں آئی۔ نادر سیال ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ ماریہ فاروق اپنی منگنی کے لڈو کب کھلا رہی ہو تاکہ آپ بھی اکیلی نہ رہو۔ شوکت شہر یار دیسی انڈوں کا حلوہ بھی کافی ٹیسٹی ہوتا ہے۔ بشریٰ افضل، ہم بہنوں کی وجہ سے تو اس محفل میں رنگ ہیں ورنہ...... یہ بھائی لوگ......؟ طاہرہ گلزار، بے جذبہ جنون تو ہمت نہ ہار۔ روبینہ رشید کی آبلہ پا میں زینب کی پوری زندگی آبلہ بن گئی مگر دھن کے پکے لوگ منزل پا ہی لیتے ہیں۔ ماروی میں سب میم (م) کے گرد گھوم رہا ہے۔ محبوب، مراد، مرینہ، ماروی کیا کہنے نواب صاحب کے۔ پس زنداں میں طاہر جاوید مغل صاحب، ہمیں ”ویٹس“ کی کر رہے ہیں، بہت اچھے جی بہت اچھے۔ تاریخی اسٹوری زیر و زبر میں ساری برائی زبان پہ آئی۔ ملک صفدر حیات کی حساب دشمناں میں لیاقت کی کچی اور کھری باتیں اس کہانی کا نچوڑ تھیں، اللہ پاک نے تمام بندوں کو یکساں پیدا کیا ہے۔ سحر امام نے سواسیر میں بتایا کہ سیانا کوا ہمیشہ بیٹ پر بیٹھتا ہے۔ محفل شعر و سخن نے دل و دماغ کو جلا بخشی۔“

✠ **مہرین ناز**، حیدرآباد سے تبصرہ کررہے ہیں ”19 مارچ 2014ء کی دوپہر میں جان بہاراں، لازوال داستانوں کا مجموعہ سسپنس ڈائجسٹ ملا تو ایک خوشگوار سا احساس ہوا۔ سرورق ذاکر انکل کی محنت اور بھرپور توجہ کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ فہرست کی ترتیب پر نظر پڑی تو دل خوش ہوگیا۔ انشائیہ خسارے میں پڑا ہے تو اداریہ پھولوں کی خوشبو سے معطر ہے۔ یہ پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا کی مہربانی ہے کہ تھر کے مظلوم لوگوں کو زندہ رہنے کا کچھ آسرا ملا۔ صدر مقصود علی صاحب کو چنا گیا، تبصرہ اچھا ہے مبارک باد۔ سعدیہ بخاری آپ کی محفل میں واپسی اچھی لگی، تبصرہ بھی کافی تگڑا ہے، اورک پیازوالی بات پہ بے اختیار ہی ہنسی آگئی۔ برادر ولاور آپ کا مخلصانہ مشورہ اچھا لگا شکریہ، ارم بتول آپ جیسی بولڈ لڑکیوں کی اس محفل میں ضرورت ہے۔ شوکت بھائی ہم سے تو بڑے بڑے منہ کی کھا کر گئے ہیں۔ یہ تو ایک معمولی بات تھی۔ الیلی جی آپ کا تبصرہ بھی الیلا لگا۔ علی ہما اس محفل میں آپ کا ساتھ مجھے حوصلہ دیتا ہے۔ ثمین سلطان لگتا ہے تم زردے پہ ہری مرچ کا اچار ڈال کر کھانے کے عادی ہو۔ فوزیہ شکریہ تمہیں کچھ تو نظر آیا۔ ابتدائی صفحات پر الیاس سیتاپوری زیر و زبر کے ساتھ نظر آئے، بلاشبہ علم نجوم کی اپنی ایک اہمیت ہے، عضدالدولہ زمان کے عشق میں مبتلا ہوکر فرائض زندگی کو نظر انداز کرتا رہا۔ کاشف زبیر کی بے خبر، سبق آمیز تحریر ہے اس میں کوئی شک نہیں جس کا دین ایمان دولت بن جائے تو وہ ہمیشہ خسارے میں رہتے ہیں کیتھی کا کردار اچھا لگا۔ غلط فہمی میں ثمر عباس نے بتایا کہ ظاہر و باطن میں بہت فرق ہوتا ہے۔ طاہر جاوید مغل کی پس زنداں نے سسپنس کے صفحات پر اپنا ڈیرا جمالیا ہے حجاب کی زندگی میں مزید مشکلات آرہی ہیں۔ جلال دوسری شادی کے چکر میں ہے۔ محی الدین نواب کی ماروی بہتر سے بہترین کی طرف گامزن ہے۔ محبوب چانڈیو کا عشق اس کو جیل تک لے گیا مراد جیسا سید حاسادا بندہ مریبہ جیسی بہترین لڑکی کو بھی چونا لگا گیا۔ ملک صفدر حیات کی حساب دشمناں بے مثل تحریر ثابت ہوئی۔ عالم باطن میں ضیا بلگرامی صاحب نے شیخ حسین کے حالات و کرامات پر روشنی ڈالی۔ آبلہ پا، روبینہ رشید کی ایک قابل داد اسٹوری ہے زینت جیسے لوگ زندگی کے سفر میں بہت مشکلات کا سامنا کرتے ہیں۔ محفل شعروسخن نے بھی دل خوش کیا، زبردست اشعار و قطعات تھے۔ محمد امجد ریاض، اعجاز احمد راحیل، راجکماری، الیلی، رمضان پاشا، اظہر حسین اور ثمین سلطان کے منتخب اشعار بے حد اچھے لگے۔ اپریل کا سسپنس ہمارا دل جیتنے میں کامیاب رہا۔“

✠ **بلقیس خان**، واہ کینٹ سے محفل کی زینت بنی ہیں ”سسپنس ڈائجسٹ 20 مارچ کو ہاتھ آیا۔ سرورق اچھا تھا۔ سچی بات ہے انشائیہ اور اداریے سے اکثر صرف نظر کرتی ہوں کہ اتنی جگہ کہاں ہے دل دانعدار میں۔ مگر اس دفعہ دل کو مزید جلایا۔ اداریے کو پڑھا آپ کی بہترین تجزیہ نگاری کو دل میں سراہا۔ تھر والوں کے لیے دعائیں، ایشیا کپ ہار چکے کوئی بات نہیں اب آسٹریلیا سے جیت چکے ہیں خدا مزید کامیابیاں دے۔ محفل میں پہنچے، بڑے ناموں کو بلیک لسٹ میں دیکھ کر احتجاجاً واک آؤٹ کیا۔ طاہر جاوید مغل کی پس زنداں ہمیشہ کی طرح گرفت میں لینے اور قاری کے دل و دماغ پر چھا جانے والی تحریر ثابت ہوئی ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے جو غلط ہے اس کو اگر غلط نہیں سمجھتے تو کم از کم اس کی حوصلہ افزائی تو نہ کریں۔ حجاب کو رائٹر کی خوش گماں سوچ نے اچھی لڑکی دکھایا ہے، وہ اچھی لڑکی ضرور ہوگی مگر بند کمرے میں نامحرم سے تنہا ملنا ہرگز اچھی بات نہیں ہے گھر میں نقاب میں رہنا اور باہر آزادانہ گھومنا کسی ایکشن کا ری ایکشن ہے۔ کاشف زبیر کی بے خبر تجسس سے بھرپور سنسنی خیز تحریر تھی۔ رقیب بھی اچھی رہی، حسام بٹ کی حساب دشمناں میں لیاقت کا کردار کمال کا رہا۔ بابر نعیم کی یادداشت ابتدا میں دلچسپ تھی ابتدا غیر متاثر کن تھا۔ 70 نمبر سوچ کے گھوڑے دوڑا دینے والی تحریر ثابت ہوئی۔ سوا سیر منظر امام کی دلکش کہانی تھی۔ روبینہ رشید کی آبلہ پا ہمارے سیاستدانوں کی چالبازیوں، بداعمالیوں اور بدکرداریوں کا احاطہ کرتی ہوئی عمدہ تحریر تھی۔ مگر کچھ چیزیں حقیقت کے خلاف لگیں۔ جیسے دھمکیوں کے باوجود اکیلے گھر میں زینب کا رہنا اور ماں باپ کو یادداشت میں تدر کھنا جبکہ شمشیر کو نہ بھولنا۔ الیاس سیتاپوری کی زیر و زبر ابھی زیر مطالعہ ہے۔“

✠ **محمد جاوید شبیر بربرہ**، علی پور، مظفر گڑھ سے حاضر ہیں ”اپریل کا شمارہ معمول سے دو دن پہلے مل گیا۔ جون ایلیا کا خسارہ حقیقت پر مبنی تھا۔ اداریہ میں انکل کی کھری کھری باتوں نے جسم کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ حکمرانوں کی نااہلی تھر میں دیکھی جارہی ہے اس کے علاوہ ہمارے پڑوس میں جو جتوئی کے تھانہ میٹ میر ہزار میں جو واقعہ ہوا ہے۔ اس نے پوری انسانیت کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ اس کے بارے میں مختصر عرض کردوں آمنہ بی بی جو بیٹ میر ہزار کی رہائشی تھی، گیارہویں کلاس کی طالبہ تھی ہر کلاس میں نمایاں پوزیشن لے کر پاس ہوئی تھی۔ اس کے قریبی رشتہ دار نے زیادتی کا نشانہ بنانے کی کوشش کی اس نے قانون کا سہارا لیا۔ اس معصوم کو کیا خبر تھی کہ یہ کوئی یورپ کا تھانہ نہیں ہے یہ جنوبی پنجاب کے تھانے ہیں۔ پولیس نے مقدمہ درج کیا پھر بھاری رقم لے کر ملزم کو بری بھی کروادیا۔ ملزم کے بری ہونے کے بعد سیدھا آمنہ کے پاس گیا اسے گالیاں اور طعنے دیے کہ میرا کیا بگاڑا ہے یہ سن کر آمنہ نے پیٹرول کی کین لے کر تھانہ کے سامنے اپنے اوپر پیٹرول انڈیل کر خود کو آگ لگادی کہ اس انصاف سے بہتر ہے کہ موت کو گلے لگالیا جائے۔ جس سے وہ جھلس کر اسپتال میں دم توڑ گئی پھر میڈیا، وزیراعلیٰ کا دورہ افسران معطل وغیرہ وغیرہ پھر ایک اور خوفناک انکشاف ہوا کہ 150 مقدمات زیادتی کیس کے تھانہ میں ہیں جن کو ابھی تک انصاف نہیں دیا گیا۔ (اللہ خیر کرے) محمد جاوید علی پور اس دفعہ بلیک لسٹ میں نظر آئے۔ جاوید بھائی کبھی عرش پر کبھی فرش پر۔ ارم بتول صاحبہ اپنے شہر کے لکھاری پر اتنی کڑی تنقید نہیں کرنی چاہیے آخر وہ آپ سے سینئر ہیں اور پہلی دفعہ ہمارے شہر کو اعزاز حاصل کرایا ہے۔ زیر و زبر الیاس سیتاپوری کی بہترین تاریخی کہانی تھی۔ طاہر جاوید صاحب کی پس زنداں، رقیب، یادداشت، سوا سیر، آبلہ پا بہت زبردست تحریریں تھیں۔“

✠ **محمد ہمایوں سعید**، بنوں سے چلے آرہے ہیں ”منتظر نگاہوں والی میک اپ زدہ حسینہ چونکہ ہمیں آدھی آنکھ بھی نہیں بھائی لہٰذا معراج انکل اور عذرا آنٹی کی محبتوں سے سجائی ہوئی محفل کی جانب چل دیے۔ اداریے میں انکل نے تھرپارکر کی بے بسی اور حکمرانوں کی بے حسی پر پُراثر روشنی ڈالی اور جہاں تک ایشیا کپ کے فائنل میں شکست کی بات ہے تو جناب ہمارا فائنل تو انڈیا کے ساتھ تھا۔ جسے شاہینوں نے زمین بوس کر کے دل خوش کردیا۔ مقصود علی صاحب! خوب صورت چیزیں ہر ایک کو ہی پسند ہوتی ہیں لہٰذا آپ کی حیرانی بجا نہیں۔ سعدیہ جی چونکہ چور کی ڈاڑھی اور چورنی کے بالوں میں جھاڑ جھنکار ہوتی ہیں۔ اس لیے آپ اہل محفل کو امن کے پیامبر سمجھنے سے سراسر انکاری ہوں۔ ارم بتول جی! آپ کو پڑھے نہ لکھے محمد جاوید ایوارڈ یافتہ ہو گئے لگے مگر آپ کی پہلی انٹری کے ارشادات بھی آسکر کے لیے میرٹ پر نامزد ہو سکتے ہیں۔ مہرین ناز صاحبہ! آپ نے تو سسپنس کی 44 سالہ تاریخ کے

تمام ریکارڈ توڑ کر رکھ دیے جناب۔ ثمین سلطان جتنی آپ نے اپنی عمر بتائی تھی اس کو مدنظر رکھا جائے تو آپ کا تبصرہ آپ سے کم از کم 25 سال بڑا لگتا ہے۔ بشریٰ جی آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے، سعدیہ کے خلاف نہ سازشیں ہورہی ہیں نہ انگلی دیوار سے لگایا جارہا ہے۔ کاشف زبیر کی بے خبر میں بہت سے جھول تھے۔ پہلی بات اگر کیتھی سے پہلے ہی دن کام نکلوالیا گیا تھا تو ایک مہینے تک رکھنے کی وجہ؟ ملک صفدر حیات کا ڈوری کا سرا تمام کے چنگ تک پہنچنے کا انداز مجھے بہت پسند ہے۔ نمبروں کے گورکھ دھندے میں ابھی 70 نمبر بہت انٹرسٹنگ رہی۔ سوا سیر نہایت غیر متاثر کن رہی۔ خوب صورت جذبوں اور نازک رشتوں سے سجی پس زنداں کافی دلچسپ ہوتی جارہی ہے۔ حجاب کی زندگی طلاطم کی نذر ہوتی جارہی ہے۔ ارم کا کردار بہت ہی ناگوار لگتا ہے۔ بابر نعیم کی یادداشت مکمل طور پر غیر متاثر کن تھی۔“

✠ **محمد قدرت اللہ نیازی**، حکیم ٹاؤن، خانیوال سے تبصرہ کررہے ہیں ”اپریل 2014ء کا شمارہ جاذب نظر ٹائٹل کے ساتھ بنا تاخیر موصول ہوا۔ حسینہ بابر عباس کے تصور میں گم، محو استراحت نظر آئی۔ انشائیہ میں جون ایلیا سے بالکل متفق ہوں کہ آج خود ”انسان“ ناپید ہوگیا ہے۔ اداریہ میں انتظامیہ کی بے حسی کا ذکر تھا جو حقیقت پر مبنی ہے۔ پاکستان میں ہر سطح پر ٹیلنٹ موجود ہے مگر ”اخلاص“ کسی بھی سطح پر نہیں۔ محفل میں اپنا خط ڈھونڈنا چاہا تو ناکامی ہوئی جب تھوڑا غور کیا تو خود کو طاہرہ گلزار کی صدارت میں بلیک لسٹ میں اٹکا دیکھا۔ کرسی صدارت ہمیشہ کی طرح صنف وجاہت کے قبضہ میں نظر آئی۔ مقصود علی مبارک قبول فرمائیں۔ سعدیہ بخاری بھی اپنی ٹیم ثانی کے ساتھ موجود تھیں۔ سعدیہ بخاری، جاوید بلوچ نے ایک ہی تو کام کی بات کی جس کو آپ نے بے تکا کہہ دیا۔ ارم بتول! آپ نے آتے ہی بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا۔ اللہ آپ پر رحم فرمائے۔ اقلیم علیم سے آخری صفحات کے لیے کہانی کی فرمائش تو ہم بھی کرچکے ہیں چلو کسی اور نے بھی ساتھ دیا۔ سوہا جی! یہ عجب بحث شروع ہوگئی ہے کہ مرد حضرات لڑکی بن کر لکھتے ہیں آپ کے پاس کوئی دلیل ہے اس کی؟ اب آپ اپنا ہی خط ملاحظہ فرمالیں اس سے کیا سمجھا جائے کہ آپ نے بھی خواتین پر تنقید کی ہے تو کیا آپ بھی......؟ مہرین ناز! میں نے کب کہا کہ جو تعریف کے قابل ہوں ان کی تعریف نہیں کرنی چاہیے؟ آپ کے لیے ایک نصیحت کہ انسان کی پہلی وفاداری اس کے اپنے گھر اور رشتوں کے ساتھ ہونی چاہیے۔ علی ڈوگر! بلیک کیٹ کا اصل نام ہے ”کالی بلی“ تسلی ہوگئی اب؟ الیلی کی پہلی انٹری ہے شاید اور یہ تیور واہ بھئی واہ! خوش آمدید۔ راجا ثاقب! ادارہ نے انعام کا سلسلہ کئی سالوں سے ترک کردیا ہے بس انعام یہی ہے کہ کرسی صدارت پر تشریف فرما ہوجائیں۔ ابرار وارث! اس بار ڈاکٹر انکل نے بیوٹی پارلر والوں سے کہہ کر دوشیزہ پر کافی ”کام“ کروایا ہے۔ پس زنداں میں طاہر جاوید مغل ایک بار پھر دین و دنیا کے ضابطوں میں جکڑی ہیروئن لے کر آئے شاید اس حوالے سے طاہر جاوید صاحب کے ذہن میں کوئی خاص نظریہ موجود ہو۔ بہرحال کہانی بہت اچھی جارہی ہے۔ نواب صاحب ماروی کے لیے سب کو دوڑا دوڑا کر ہلکان کررہے ہیں بیشتر قارئین کو یہ کہانی بور کررہی ہے اور ہم دیوتا جیسی کاٹ اور تھرل کی امید رکھتے ہیں۔ روبینہ رشید کی آبلہ پا زبردست رہی۔ زینب کا کردار بہت متاثر کن رہا۔ امجد رئیس 70 نمبر لے کر آئے۔ گورڈن کا ہن کی چالاکی کو برنس نے ناکام بنادیا اور محض ایک کوڈ سے اس تک پہنچنے میں کامیاب رہا۔ ثمر عباس کی غلط فہمی میں سائدرہ کی غلط فہمی جولی کو لے ڈوبی۔ جب کسی شخص کے بارے میں انسان مخصوص ذہن بنالے تو اس کے ہر عمل کو وہ اسی تناظر میں دیکھتا ہے۔ سوا سیر میں منظر امام نے ایک قدیم لطیفے کو کہانی کی شکل دے ڈالی۔ عدرت جیسے کرداروں کے لیے ہی شاید کہا گیا ہے ”ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ“ تحریر ریاض کی رقیب زبردست رہی۔ مغرب کے مادر پدر آزاد معاشرے کی برائیوں کو آشکار کرتی یہ تحریر اچھی لگی۔ کترنیں اور اشعار بھی دلچسپی کا حامل رہے۔“

✠ **ساگر تلوکر**، چشمہ بیراج سے تشریف لائے ہیں ”سسپنس کا دیدار برستی بارش میں ہوا۔ ٹائٹل پر لڑکی کسی کی یاد میں کھوئی ہوئی تھی۔ جون ایلیا کا خسارہ پڑھا۔ ہم تو واقعی خسارے میں ہی جارہے ہیں۔ اداریہ پڑھا اپریل میں پھول تو کھلے ہوئے ہیں۔ مگر دل اداس رہتا ہے بارشوں کے موسم میں۔ پاکستان کرکٹ ٹیم انڈیا سے ہار گئی، بہت دکھ ہوا۔ اس دکھ کے بھلانے کے لیے منظر امام کی سوا سیر پڑھی۔ لیوں پر ہنسی تو لائی مگر بہت گہری کہانی تھی۔ پس زنداں مغل صاحب محبت پر ہمیشہ لکھتے ہیں اور میں محبت کرتا ہوں۔ اس لیے مغل میرے پسندیدہ قلم کار ہیں۔ ماروی پڑھتے ہوئے تو کسی بات کا احساس تک نہیں رہتا۔ ماروی پڑھتا ہوں تو فرحت آتی ہے۔ آبلہ پا نئی لکھاری کی تحریر تھی مگر بہت ہی شاندار۔ محفل شعروسخن بہت خوب صورت سجی ہوئی تھی۔“

✠ **انور یوسف زئی**، اسلام آباد سے تشریف لائے ہیں ”سسپنس اس بار بھی تاخیر سے ہی 19 مارچ کو ملا۔ لگتا ہے جلد حاصل کرنے کے لیے سالانہ خریدار بننا پڑے گا۔ سرورق بے حد جاذب نظر لگتا ہے۔ آپ کے خط میں کئی ماہ کی کاوش کے بعد اپنا نام دیکھ کر خوشی ہوئی۔ محفل کے سردار اس بار کراچی کے مقصود علی ٹھہرے۔ مبارک ہو۔ طویل بلیک لسٹ میں کئی جانے پہچانے نام دیکھ کر دکھ ہوا۔ بہرحال اب کہانیوں کی طرف۔ پہلی تاریخی کہانی الیاس سیتاپوری صاحب کی ”زیر و زبر“ ایک پُراثر تحریر تھی جس میں ایک نجومی کی پیش گوئی پوری ہوتی دکھائی گئی۔ اس شمارے کی آخری کہانی آبلہ پا بہترین کہانی قرار پائی مگر شاید کسی مغربی کہانی سے ماخوذ تھی؟ قسط وار کہانیوں میں مغل صاحب کی پس زنداں کا ٹیمپو اس بار بہت سست رہا۔ حجاب کے کردار کی پرتیں اب کھلتی جارہی ہیں اور ہادی کا عشق بھی بڑھتا جارہا ہے مگر اب اس کے کمرے میں حجاب کی وڈیو والی تصویر ایک نئی مصیبت لانے والی ہے۔ دوسری قسط وار کہانی نواب صاحب کی ماروی ان کی روایتی تحریروں میں سے ایک ہے جس میں کوئی جدت نہیں ملک صفدر حیات کی حساب دشمناں ایک اچھی کاوش تھی جس میں انہوں نے آخر کار مجرم کا سراغ لگا ہی لیا۔ ترجمہ شدہ کہانیوں میں سب سے بہتر کاشف زبیر کی بے خبر رہی۔ دیسی کہانیوں میں منظر امام کی سوا سیر ایک پُرلطف تحریر تھی۔“

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہوسکے۔

سید محی الدین اشفاق، فتح پور دلیہ۔ محمد جاوید، تحصیل علی پور۔ ذاکم علی گورچانی، واجل ضلع راجن پور۔ طاہرہ گلزار، پشاور۔ سید اکبر شاہ، اوگی مانسہرہ۔ رمضان پاشا، گلشن اقبال، کراچی

گردش دوراں کے اسیر

الیاس سیتا پوری

بچہ ہو یا بوڑھا یادوں کا ہالہ دونوں کو اپنے حصار میں قید رکھتا ہے یہ اور بات کہ بعض ایسے واقعات جو بچوں پر ستم بن کر بیت جاتے ہیں وہ انہیں بڑھاپے تک بھول نہیں پاتے... تاریخ کا دوسرا نام "یادداشتیں" ہے جو حافظے میں محفوظ رہ جاتی ہیں... ایسی ہی دلخراش یادوں سے جب پردہ اٹھتا ہے تو ماضی ہاتھ باندھے ورق ورق خود کو دہراتا ہے... وہ بچہ بھی اپنی یادوں میں قید دھندلے عکسوں کا تعاقب کرتے ہوئے نگر نگر گھومتا رہا حالانکہ اس کا گمشدہ ماضی تو خود سایہ بن کر اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا مگر... اسے ادراک نہ تھا اور جب اسے خبر ہوئی تو بہت دیر ہو چکی تھی... بنوامیہ کا دور اپنے حالات و واقعات کی وجہ سے تاریخ میں اس طرح رقم ہوا ہے کہ مٹائے نہ مٹ سکے گا۔ ترک اور عرب... دو مختلف تہذیب و تمدن کا ملاپ... اگرچہ مشکل ترین دور کی عکاسی کرتا ہے مگر چند ایسے یادگار لمحات کا نقش بھی دلوں پر بہت گہرا ہے جو اپنی یادوں کے ساتھ ساتھ رگوں میں لہو کی گردش تیز کر دیتے ہیں لیکن اس گردشِ دوراں کے اسیر وقت کی مدھر تال پر رفتہ رفتہ اپنی ہی کیفیت کی گہرائیوں میں ڈوبتے ابھرتے رہے... جبکہ اگلے دن کا ابھرتا سورج ان ڈوبے ہوئے لمحات کو تاریخ کا خوب صورت حصہ بنا گیا۔

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

بنوامیہ کو اپنے اقتدار کے قیام و بقا میں عربوں اور شامیوں کا مرہونِ منت ہونا پڑا تھا اور تقریباً اٹھاسی سال تک اموی ایوانِ خلافت انہی کے کاندھوں پر قائم رہا پھر ان کاندھوں میں ضعف کے آثار پیدا ہونے لگے۔ بنوعباس تاک میں تھے اور انہوں نے اپنی قوم کے مقابل ایرانیوں کو لا کھڑا کیا تھا۔ ان ایرانیوں کے تعاون و اشتراک سے بنو عباس نے بنوامیہ کے اقتدار کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ پہلے لواء اقتدار شام کے دمشق میں لہرا رہا تھا اب یہ عراق میں دریائے دجلہ و فرات کے کنارے بغداد میں اڑ رہا تھا۔ ابو مسلم خراسانی اور آلِ برمک کے مضبوط اور توانا کاندھے عباسیوں کو سہارا دیے ہوئے تھے۔ رفتہ رفتہ عباسی خود بھی اتنے مضبوط اور توانا ہو گئے کہ انہیں اپنے محسنوں کی ضرورت باقی نہیں رہی اور انہوں نے اپنے سرکش اور خودسر محسنوں کو، ان کے خاندانوں کے ساتھ نیست و نابود کر دیا

لیکن پھر بھی ایرانیوں کا اثر و نفوذ بغداد کے بازاروں اور گلی کوچوں میں بہ آسانی دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا تھا۔ ان کا یہ اثر و اقتدار مامون الرشید کے عہد تک قائم رہا لیکن مامون کے بعد جب اس کے ان پڑھ بھائی معتصم نے تختِ خلافت پر قدم رکھا تو اس نے پہلا فیصلہ یہ کیا کہ خلافتِ عباسیہ کو ایرانیوں کے اثرات سے پاک کرنا ہے، اس نے ایرانیوں پر ترکوں کو ترجیح دی اور سمرقند، فرغانہ اور ماوراء النہر کے دوسرے شہروں اور ترکوں کو خرید خرید کر بغداد میں بسانا شروع کر دیا۔ معتصم نے انہیں دیبا کے لباس، سونے کے پٹکے اور زیورات سے لاد کر ایرانیوں اور عربوں کی نظروں میں رشک و حسد کی چنگاریاں بھر دیں۔ جب یہ وحشی اور اجڈ ترک اپنے قیمتی اور زرریں لباس میں نخوت و تکبر سے سینے پھلائے اور گردنیں ٹیڑھی کیے ہوئے اپنے گھوڑے دوڑاتے تو بغداد کے مقامی لوگ خوف زدہ ہو کر راستہ

چھوڑ دیتے۔ یہ ترک گھبرائے اور خوف زدہ عربوں اور ایرانیوں کی پریشانی سے خوب خوب لطف اندوز ہوتے۔

چند چھوٹے چھوٹے بچے کتابیں بغل میں دبائے شہر کے کنارے کنارے مکتب جارہے تھے، ان کا بوڑھا دادا اپنے سر کو رومال دعقال سے چھپائے ان کے ساتھ چل رہا تھا۔ اس کے چہرے کی جھریاں اور ضعیفی کی کھال میں سمٹی، بھنچی آنکھیں زندگی اور دنیا سے کچھ بے تعلق سی نظر آتی تھیں۔ کسی کسی لمحے کسی اجڈ ترک کا گھوڑا سرپٹ بھاگتا ہوا جب ان بچوں کے پاس سے گزرتا تو ان کا دادا انہیں اپنی آڑ میں لے کر کچھ اس طرح سینہ سپر ہوجاتا گویا وہ بچوں کی طرف آنے والے منہ زور گھوڑے کو اپنے ہاتھوں سے دھکیل کر پرے کردے گا۔ جب گھوڑا گزر جاتا تو دادا میاں عباسی خلیفہ معتصم اور وحشی ترکوں کو برا بھلا کہنے لگتے۔ بوڑھے کو اپنے عرب ہونے پر فخر تھا اور وہ ترکوں کو مسلمان ہونے کے باوجود عربوں سے کمتر سمجھتا تھا۔ اس نے اپنے پوتوں سے کہا۔

"بچو! ذرا ہوشیاری سے چلو، یہ اجڈ ترک انسان اور جانور میں فرق نہیں کرتے۔" پھر خلیفہ معتصم کو برا بھلا کہنے لگا۔ "خدا معتصم پر خیر نہ کرے، عربوں کی جان پر کیا مصیبت مسلط کردی ہے۔ مصیبتیں جھیلنے کو عرب تھے اور جب لطف اٹھانے کا وقت آیا تو یہ ترک آگئے، میرا بس چلے تو انہیں دجلہ میں غرق کردوں۔"

ایک بچے نے اپنے پاس سے گزرتے ہوئے ترک کی طرف نفرت سے دیکھا اور تھوک دیا، بولا۔ "دادا جان! آپ نہ گھبرائیں، جب میں بڑا ہوجاؤں گا تو ان ترکوں کو نکال باہر کروں گا۔"

ترک، بچے کے حقارت آمیز سلوک سے مشتعل ہوگیا۔ اس نے اپنے سرکش گھوڑے کا رخ اس بچے کی طرف کردیا۔ دادا اس ترک کے برے ارادے کو بھانپ چکا تھا۔ ترک نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی وار اس بچے کو کچل دینا چاہا لیکن دادا نے پھرتی سے دھکا دے کر بچے کو ایک درخت کی آڑ میں گرادیا۔ اس کشمکش میں وہ بچہ تو بچ گیا لیکن بقیہ دو بچے اس ترک کے گھوڑے تلے کچلے گئے۔ ترک نے ایک خوف ناک قہقہہ لگایا اور دادا جان کو بلکتا اور بچوں کو تڑپتا چھوڑ کر چشم زدن میں غائب ہوگیا۔ اس دردناک منظر نے راہگیروں کو بھی متاثر کیا اور وہ دادا جان اور زخمی بچوں کے اردگرد جمع ہوگئے۔ مجمع بھنبھنا رہا تھا۔ ہر شخص اپنی اپنی کہہ رہا تھا۔ کوئی ترکوں کو گالیاں دے رہا تھا، کوئی معتصم کو برا بھلا کہہ رہا تھا اور کوئی بڑے میاں کو دلاسے دے رہا تھا۔ انہی میں ایک ہوش مند تھا۔ اس نے کہا۔

"لوگو! تم سب وقت کیوں ضائع کرتے، ان بچوں کی فکر کوئی نہیں کرتا۔"

اب وہ بچہ بھی اپنے زخمی بھائیوں کے پاس آچکا تھا جسے بچانے کی کوشش میں دادا جان نے ان دونوں کو زخمی کروادیا تھا۔ دونوں بچوں میں سے ایک کا سر گھوڑے کی ٹاپ سے بکھر چکا تھا اور دوسرے کا بایاں بازو الگ ہوگیا تھا۔ دادا نے زور شور سے رونا شروع کردیا۔ بچہ بھی زاروقطار رونے لگا۔ اچانک یہ مجمع ایک گھڑسوار کی طرف دوڑا، یہ گھڑسوار ایک ترک تھا۔ لوگوں نے اسے گھوڑے سے کھینچ کر زمین پر گرادیا اور نہایت بے دردی سے اس کی پٹائی شروع کردی۔ مجمع میں سے کسی نے آواز بلند کی۔

"بچے کا سر کچلا گیا ہے، اس کا بھی سر کچل دو۔"

لوگوں نے لکڑیوں اور پتھروں کی مدد سے ترک کا سر پاش پاش کردیا۔ شروع شروع میں تو وہ بہت چلّایا اور بڑی دردناک آوازیں نکالیں لیکن پھر اس کی آواز ڈوبتی چلی گئی اور وہ بے ہوش ہوکر رفتہ رفتہ موت کی آغوش میں چلا گیا۔

مجمع میں سے پھر کسی کی آواز سنائی دی۔ "ایک بچے کا بایاں بازو الگ ہوگیا ہے، اس کا بازو بھی الگ کردو۔"

کسی منصف مزاج نے مخالفت کی، بولا۔ "لیکن اس ترک نے تو ان بچوں کو نہیں کچلا تھا، پھر اس سے انتقام کیوں لے رہے ہو؟"

کئی آوازوں نے ایک ساتھ جواب دیا۔ "وہ بھی ترک تھا، یہ بھی ترک ہے، ترک کا انتقام ترک ہی سے لیا جائے گا۔"

اس حق گو نے پھر مخالفت کی۔ "لیکن یہ ترک تو مرچکا ہے۔ اب اس کا بازو الگ کرنے سے فائدہ؟"

مجمع میں سے ایک شریر نے اس حق گو پر لعن طعن کی، بولا۔ "یہ ترکوں کا دوست معلوم ہوتا ہے، ترکوں کا دوست ہمارا دشمن ہے، دوستو! یہ بھی جانے نہ پائے۔"

اور پھر وہاں ایسا شوروغل برپا ہوا اور ایسی خطرناک داروگیر شروع ہوئی کہ کچھ پتا نہ چلتا تھا کہ ان میں سے کون کس کا حریف ہے اور کون کس کا حلیف۔ عرب آپس میں ہی دست و گریباں تھے۔

دوسرے دن عید قرباں تھی۔ خلیفہ معتصم عید کی نماز پڑھ کر محل واپس جارہا تھا کہ حرشی کے چوک میں بچوں کا دادا آگے بڑھا اور معتصم کا راستہ روک لیا۔ معتصم کے ترک

محافظ آگے بڑھے اور اس بوڑھے کو قتل کردینا چاہا لیکن معتصم نے انہیں روک دیا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے بوڑھے کو قریب بلوایا اور دریافت کیا۔

"کیا بات ہے، تو کیا کہنا چاہتا ہے؟"

بوڑھے نے معتصم کو اس کی کنیت سے مخاطب کیا۔

"اے ابواسحاق!" ترک محافظوں میں سے کسی نے اسے پہچان لیا اور وہ اسے قتل کرنے کے لیے جھپٹا لیکن معتصم نے اسے ڈانٹ دیا۔

"کیا کرتا ہے، اسے بات پوری کرنے دے۔"

حملہ آور ترک ٹھٹک کر رک گیا، بوڑھا تند و تیز لہجے میں بولا۔ "ابواسحاق! خدا تجھے جزائے خیر نہ دے۔" پھر اس نے ترکوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تو نے ان وحشی جنگلیوں کو ہمارے درمیان بسا کر ہم پر ظلم ڈھائے ہیں۔ ان جنگلیوں نے ہمارے بچوں کو قتل، عورتوں کو بیوہ اور مردوں کو خون کے آنسو رونے پر مجبور کردیا ہے۔"

حملہ آور ترک نے بوڑھے کی تکذیب کی، غصے سے بولا۔ "امیرالمومنین! یہ جھوٹا ہے بلکہ کل اس نے ہمارے ایک آدمی کو مشتعل ہجوم سے قتل کروادیا۔ آپ اس مقتول ترک کے گھر جاکر دیکھیں تب آپ کو پتا چلے گا کہ اس نے کتنا ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ مقتول ترک کے بچوں نے قسم کھائی ہے کہ وہ اس بوڑھے سے اپنے مقتول باپ کا بدلہ لے کر رہیں گے۔"

بوڑھے نے دانت پیس کر جواب دیا۔ "مقتول ترک کے بچے مجھ سے کیا بدلہ لیں گے۔ میرے پوتوں نے تو قسم کھائی ہے کہ وہ ایک نہ ایک دن اس ظالم ترک کا پتا چلا کر اسے کیفر کردار تک ضرور پہنچائیں گے۔"

معتصم نے جواب دیا۔ "تم دونوں ایک دوسرے سے انتقام لینے پر مُصر ہو تو تمہیں کون روک سکتا ہے لیکن اللہ عفو اور احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔" پھر بوڑھے سے کہا۔ "تو میرے وزیر ابن زیات کے پاس چلا جا اور اس معاملے میں اس سے مدد حاصل کر۔" پھر ترک محافظ سے کہا۔ "اور تو بھی، میرا خیال ہے ابن زیات تم دونوں کے دلوں کی کدورت دور کردے گا۔"

بظاہر تو معتصم نے بوڑھے عرب کو اپنے وزیر ابن زیات سے ملنے کا مشورہ دے دیا تھا لیکن یہ باطن وہ ترکوں کی طرف سے فکرمند ضرور ہوگیا تھا۔ وہ اس مسئلے کو مستقلاً حل کرنا چاہتا تھا اور کچھ ہی دنوں بعد بغداد والوں نے یہ خوش خبری سنی کہ معتصم بغداد کے شمال میں تقریباً ساٹھ میل دور ایک نیا شہر بسا رہا ہے یہ نیا شہر ہی معتصم کا جدید دارالحکومت ہوگا۔ تمام ترک اور دوسرے عہدیدار بھی اس نئے شہر میں منتقل ہوجائیں گے اور بغداد والوں کا اجڈ ترکوں سے پیچھا چھوٹ جائے گا۔

اس نئے شہر کی تعمیر کے لیے معتصم نے تمام اسلامی شہروں سے کاریگروں اور فن عمارت سازی کے ماہروں اور مزدوروں کو یکجا کیا اور تعمیر کا کام شروع ہوگیا۔ ترکوں اور خراسانیوں کو خاص خاص جاگیریں دی گئیں۔ مصریوں کو بھی الگ جاگیریں عطا ہوئیں۔ تاجروں اور ارباب صنعت و حرفت کے لیے مخصوص بازار بنائے گئے۔ شہر میں مختلف قسم کے پھلوں کے درخت لگوائے اور ایک شاندار جامع مسجد بھی تعمیر ہوئی۔ اب تو ہر طرف سے لوگوں کی ریل پیل ہونے لگی۔ لوگوں نے اپنے مصارف سے عمارتیں بنوانا شروع کردیں۔ اس نئے شہر کا نام سرورمن رائی یعنی دیکھنے والے کی خوشی رکھا گیا پھر سرمن رائی (جس نے دیکھا خوش ہوگیا) کہا جانے لگا اور اب تاریخوں میں سامرا کے نام سے مشہور ہے۔

سامرا میں ترکوں کی بستی کا نام کرخ سامرا تھا۔ کرخ سامرا میں ترک شہسوار اس طرح گھوڑے دوڑاتے رہتے جس طرح کبھی بغداد میں دوڑایا کرتے تھے۔ ایک دن صبح ہی صبح کرخ سامرا کی اس شاہراہ پر جو معتصم کے قصر کی طرف جاتی تھی ترک گھڑسوار بے تحاشا گھوڑے دوڑا رہے تھے۔ یہیں ایک درخت کے سائے میں ایک عرب نوجوان بیٹھا ہوا گھڑسواری کا تماشا نہایت انہماک سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی مسیں بھیگ رہی تھیں اور اس کا بایاں ہاتھ غائب تھا۔ اسے دور ہی سے پہچانا جاسکتا تھا کہ وہ عرب ہے جو ترکوں کی بستی میں پہنچ گیا ہے۔ ترک گھڑسوار سینہ پھلائے انتہائی فخر و غرور کے ساتھ اس عرب نوجوان کے سامنے سے گزرتے رہے۔ کوئی کوئی ترک ازراہ شرارت و مذاق اپنے گھوڑے کا رخ اس عرب نوجوان کی طرف کردیتا اور ایسا لگتا گویا وہ اس عرب نوجوان کو کچل دے گا۔ یہ عرب بھی بچنے کے لیے درخت کے تنے کے پیچھے دبک جانے کی کوشش کرتا لیکن عین وقت پر ترک گھڑسوار گھوڑے کی لگام کھینچ لیتا اور گھوڑا اگلے دونوں پیر اٹھا کر، پچھلے دونوں پیروں پر کھڑا ہوکر ہنہنانے لگتا۔ گھوڑے کی ہنہناہٹ میں ترک سوار کی طنزیہ مذاق آمیز ہنسی بھی شامل ہوجاتی۔

جب یہ کھیل جاری تھا، عین اس وقت اس عرب نوجوان کو پیچھے سے کسی نے مخاطب کیا۔ "شریف عرب

نوجوان! تم ترکوں کی بستی میں کس سے ملنے آئے ہو؟"

عرب نوجوان نے گھبرا کر جواب دیا۔ "میں ملنے کسی سے بھی نہیں آیا۔" پھر اس نے اپنے غائب بازو کی طرف اشارہ کیا اور بولا۔ "میں ایک عیب دار انسان ہوں۔ اس نقص نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا۔ میں اپنی زندگی سے بے زار ہو چکا ہوں۔"

اس عرب نوجوان نے اپنے مخاطب کو ذرا غور سے دیکھا۔ یہ ایک ادھیڑ عمر ترک تھا۔ حسین، لمبا تڑنگا، پرکشش اور چست و چالاک سا جس کو دیکھ کر کوئی بھی شخص متاثر ہو سکتا تھا۔ یہ ترک، عرب نوجوان کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ اس نے پوچھا۔

"کیا تیرا یہ ہاتھ چوری کے جرم میں کاٹ دیا گیا؟"

عرب نوجوان کا شرم، غیرت اور غصے سے چہرہ سرخ ہو گیا۔ "مجھ پر شرمناک شبہ نہ کرو، معزز ترک! میں یمنی عربوں کے ایک نامور اور شریف قبیلے سے تعلق رکھتا ہوں۔"

ترک نے دریافت کیا۔ "تو یہاں کس سے ملنے آیا ہے؟"

"کسی سے بھی نہیں۔" عرب نوجوان نے جواب دیا۔ "مجھے تفصیلی بات کرنے کا موقع مل سکتا ہے؟"

ترک نے کہا۔ "بالکل، لیکن پہلے تو یہ بتا کہ تو باتیں یہیں کرے گا یا کہیں اور؟"

"کہیں اور کہاں؟"

ترک نے نہایت شفقت اور مہربانی سے کہا۔ "تو اگر خواہش کرے تو میں تجھے اپنے گھر بھی لے جا سکتا ہوں لیکن میرا خیال ہے تیرا گھر بار تو ضرور ہوگا۔ یعنی تو تنہا نہیں ہوگا، تیرا باپ کیا کرتا ہے؟"

عرب نوجوان نے جواب دیا۔ "فی الحال میں تنہا ہوں۔ میرا باپ عموریہ کی جنگ میں قتل ہو گیا اور میری ماں کا بہت پہلے انتقال ہو چکا ہے۔ میری دو بہنیں بھی ہیں جو یمن میں شادی شدہ زندگی گزار رہی ہیں۔ میں ان کے پاس رہ نہیں سکتا ظاہر ہے کہ ان حالات میں میرا کوئی گھر در نہیں۔"

ترک نے نہایت تیز عقابی نظروں سے عرب نوجوان کو گھورا، بولا۔ "تو بڑا مصیبت زدہ نظر آتا ہے مگر میں نے تیرا نام تو پوچھا ہی نہیں؟"

عرب نوجوان نے جواب دیا۔ "میرا نام منصور ہے اور میں اس سے بھی زیادہ مصیبت زدہ ہوں جتنا بظاہر نظر آتا ہوں۔"

ترک نے ازراہ ہمدردی کہا۔ "گو کہ تو عرب ہے اور عربوں اور ترکوں کی باہمی آویزش اور کشمکش نے دونوں کو ایک دوسرے کے خلاف متنفر اور متعصب کر رکھا ہے لیکن میں تجھے انسانی اور اسلامی جذبۂ ہمدردی سے اپنے ساتھ رکھ سکتا ہوں۔"

عرب نوجوان منصور نے کہا۔ "معزز رحم دل ترک! شکریہ لیکن یہ رہائش کے ساتھ ہی کیا میرے کام کا مسئلہ بھی حل ہو سکتا ہے؟"

ترک نے جواب دیا۔ "وہ بعد کی بات ہے بہرحال کوشش ضرور کروں گا۔"

اس کے بعد ترک نے منصور کو اپنے ساتھ لیا۔ ترک کا گھوڑا ایک درخت سے بندھا اپنے قدموں تلے بچھے ہوئے سبزے سے اپنی بھوک مٹا رہا تھا۔ چند شریر مکھیاں اس کے سر اور کانوں پر منڈلا منڈلا کر اسے تنگ کر رہی تھیں اور انہیں وہ سر اور کانوں کو ہلا ہلا کر بار بار اڑا دیتا تھا۔ کسی کسی لمحے وہ پورے جسم کو جھرجھری سے لرزش دے دیتا۔ ترک نے اپنے گھوڑے کے پیٹ کو تھپتھپا کر منصور سے پوچھا۔ "تو شاید یہاں تک پیدل ہی آیا ہے؟"

منصور نے جواب دیا۔ "ہاں، میں سامرا میں کرائے کے گھوڑے پر آیا تھا لیکن یہاں تک پیدل ہی آیا ہوں۔"

"بہت خوب!" ترک نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں گھوڑے پر بیٹھ جاتا ہوں تو میرے پیچھے بیٹھ جا۔" یہ کہتے ہوئے ترک اچک کر اپنے گھوڑے پر بیٹھ گیا اور بیٹھ جانے کے بعد ہاتھ کے اشارے سے منصور کو اپنے پیچھے بیٹھ جانے کا حکم دیا۔ منصور بھی بے چون و چرا پیچھے بیٹھ گیا۔ ترک نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور کرخ سامرا کی گنجان آبادی کی طرف سرپٹ بھاگنے لگا۔

☆☆☆

ادھیڑ عمر ترک جب اپنی شاندار حویلی میں داخل ہوا تو حویلی کے دربان اور بعض دوسرے لوگ ترک کے پیچھے بیٹھے ہوئے عرب نوجوان منصور کو نہایت حیرت اور تجسس سے دیکھ رہے تھے۔ حویلی کے اندر، صدر دروازے کے فوراً بعد راستے کے دونوں طرف چھوٹے چھوٹے سبزہ زار تھے اور ان کے بیچوں بیچ فوارے پانی اڑا رہے تھے۔ دونوں سبزہ زاروں پر مختلف عمروں کے لوگ دو دو، تین تین اور کہیں چار چار کی ٹکڑیوں میں بیٹھے بحث و مباحثوں میں الجھے ہوئے تھے۔ ادھیڑ عمر ترک کو دیکھتے ہی وہ اپنی اپنی جگہوں پر اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور بہت جلد ان کی نظریں

منصور پر جم گئیں۔ ان میں سے چند دوڑ کر ان دونوں کے پاس آ گئے۔ ادھیڑ عمر ترک نے پلٹ کر منصور کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔ "عرب نوجوان! اب گھوڑے سے اتر جاؤ۔"

اور اس اشارے کے بعد ہی وہ خود بھی گھوڑے سے نیچے آ گیا۔ منصور بھی کود کر نیچے اتر گیا۔ ایک کمتر درجے کے ترک بوڑھے نے گھوڑے کی راس پکڑ لی اور اسے لے کر ایک طرف روانہ ہو گیا۔ ادھیڑ عمر ترک نے منصور سے کہا۔

"منصور! تو میرا مہمان ہے، اب فکر نہ کر، تو یہ سمجھ لے کہ تجھے ایک پناہ گاہ مل گئی ہے۔ اب تو یہاں اس وقت تک رہے گا جب تک تیرا جی چاہے گا۔" پھر اس نے وہاں پر موجود دوسرے ترکوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ سارے ہی ترک ہیں اور میرے اپنے خاندان کے لوگ ہیں۔ میں ان سب کا سرپرست اعلیٰ ہوں۔ اب تو بھی میرے خاندان کا ایک فرد بن جائے گا۔" پھر ہنس کر کہنے لگا۔ "گویا ترک خاندان میں ایک عرب کا پیوند لگ جائے گا۔"

لیکن منصور اپنے ترک میزبان کی باتوں سے خوش نہیں ہوا، بولا۔ "میرے معزز میزبان! میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم مجھے سر چھپانے کی جگہ دے رہے ہو اور میری معاشی ذمے داریاں قبول کی ہیں لیکن کیا تمہارا انصاف پسند دل اس سچی بات کی تصدیق نہیں کرے گا کہ میں ایک عرب ہوں، حکمراں قوم کا ایک ذی عزت نوجوان اور تم لوگ سمرقند، بخارا اور فرغانہ کے رہنے والے، غلام خاندانوں کے کمتر لوگ پھر میں تمہارے خاندان کا ایک فرد کس طرح بن سکتا ہوں۔"

منصور کی باتوں نے ترک میزبان کی پیشانی پر ناگواری کی شکنیں ڈال دیں۔ منصور نے بھی اس ناخوشگوار کیفیت کو فوراً ہی محسوس کر لیا، بولا۔ "سچائی تلخ ہوتی ہے لیکن پھر بھی، مجھے افسوس ہے کہ میں نے ایسی بات کیوں کی جس سے میرے میزبان کو صدمہ پہنچا۔"

ترک نے فراخ دلی سے جواب دیا۔ "منصور، میری طرف سے تجھے اجازت ہے کہ جو جی میں آئے کہتا رہ لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ اس قسم کی دل آزاری سے کوئی انسان عزت و وقعت نہیں حاصل کر سکتا۔ اگر تو میرا مشورہ قبول کرے تو میں یہی کہوں گا کہ جن باتوں سے ترکوں اور عربوں میں نفرت اور حسد کی خلیج بڑھ رہی ہو، انہیں فوراً ختم کر دینا چاہیے۔" پھر بے پروائی سے بولا۔ "اور خود میں نے تمہیں اپنے ساتھ لا کر اور اپنے ساتھ رکھنے کا ارادہ کر کے بے جا تعصب کو اپنے دل سے کھرچ پھینکا ہے۔"

بظاہر تو ایسا محسوس ہوا گویا منصور اپنے دل میں شرمندہ ہے لیکن وہ شرمسار نہیں تھا۔ اس کے دل میں ترکوں کے خلاف نفرت اب بھی اسی طرح تھی۔ اس کا بس چلتا تو وہ اس وقت ان ترکوں کے درمیان سے نکل بھاگتا لیکن کچھ مجبوریاں تھیں جو اس کا دامن پکڑے ہوئے تھیں۔ ترک میزبان نے کہا۔

"میرا خیال ہے اس وقت تجھے آرام کرنا چاہیے۔ میں کسی حد تک تیرے مسائل سے واقف ہو گیا ہوں، جو کچھ نہیں جان سکا ہوں پھر معلوم کر لوں گا اور کوشش کروں گا کہ کسی طرح تیرے کام آ جاؤں۔"

ترک میزبان نے اسے ایک آراستہ مکان دے دیا۔ یہ مکان اس شاندار حویلی کے اندر ہی تھا جس میں اس ترک کے دوسرے بہت سے عزیز رشتے دار تھے۔ شام کو مغرب کی اذان کے ساتھ ہی اس کا مکان بقعۂ نور بن گیا۔ شمعوں اور قندیلوں کی روشنی میں گھر کی ایک ایک چیز دیکھی جا سکتی تھی۔ اس گھر کے در و دیوار خوشبو سے مہکے ہوئے تھے۔ ترک میزبان نے اس گھر کی دیکھ بھال اور منصور کی خدمت گزاری کے لیے دو غلام بھی بھیج دیے تھے اور یہ دونوں غلام ایرانی تھے۔ ان دونوں غلاموں نے خوشبویات چھڑک کر یا جلا جلا کر پورے گھر کو سحر زدہ سا کر دیا تھا۔

منصور نے نمازِ مغرب کے بعد ایک غلام سے پوچھا۔

"تیرا کیا نام ہے؟"

غلام نے جواب دیا۔ "فیروز۔"

منصور نے پوچھا۔ "خدا تجھے فیروز مند کرے اور زمانہ ابو سفاح اور ابو منصور جعفر جیسا عروج اور اقتدار عطا فرمائے۔ کیا تو نہایت راز داری سے یہ بتائے گا کہ یہ ترک کون ہے جس نے مجھے اپنا مہمان بنا لیا ہے؟"

غلام فیروز نے حیرت سے پوچھا۔ "کیا آپ سچ مچ اس شخص سے واقف نہیں ہیں؟"

منصور نے جواب دیا۔ "اگر واقف ہوتا تو یہ سوال کیوں کرتا۔"

فیروز نے کہا۔ "یہ ترک ایک نامور فوجی سردار ہے۔ اس کا نام ہے مستعین اور یہ نام بھی اس نے خود ہی اختیار کیا ہے، اس کا اصل نام شاید کوئی بھی نہیں جانتا۔ یہ جب یہاں آیا تھا تو امیر المومنین معتصم سے امداد و اعانت کا خواست گار

ہوا تھا۔ اسے وہ مدد حاصل ہوگئی بس یہ اسی وقت سے مستعین ہوگیا جس کے مستحق ہی مدد چاہنے والا کے ہیں۔"

منصور نے اپنے دل میں سوچا۔ واسطہ بڑے دلچسپ انسان سے پڑا ہے۔

رات کو عشا کے بعد ترک میزبان منصور کے پاس آیا، اس وقت اس کے ساتھ ایک ترک نوجوان بھی تھا۔ لمبا چوڑا، سرخ وسفید، وجیہہ حسین، ترک میزبان نے اپنے ساتھی نوجوان ترک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "منصور! میرے شریف مہمان! اس سے مل، یہ میرا بیٹا نافر ہے۔" پھر اپنے بیٹے سے کہا۔ "او نافر بیٹے! یہ نوعمر عرب منصور میرا مہمان ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میں نے اسے جتنی عزت دی ہے تو بھی دے۔"

نافر نے مسکرا کر جواب دیا۔ "بابا جان! ہم ترک فراخ دل واقع ہوئے ہیں اور ہم ہمیشہ یہی کوشش کرتے ہیں کہ عربوں کو ہماری ذات سے کوئی تکلیف نہ پہنچے لیکن عربوں سے ہمیں ہمیشہ ہی تکلیف پہنچتی رہتی ہے۔"

منصور نے کہا۔ "عربوں کی شکایت بجا ہے، یہ ملک عربوں کا ہے اور عرب جب یہ دیکھتے ہیں کہ ان کے ملک میں غیر عرب بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں اور ترک ان کے حقوق غصب کر رہے ہیں تو اس پر عربوں کی برہمی بالکل بجا ہے۔"

نافر نے جواب دیا۔ "امیر المومنین نے ہم ترکوں کو جن بلند مراتب پر فائز کیا ہے وہ بلاوجہ نہیں ہے۔ ہم نے جاں نثاریاں اور وفاداریاں عربوں سے زیادہ دکھائی ہیں اور ہمیں یہاں جو کچھ بھی ملا ہے، ہماری صلاحیتوں اور اہلیتوں کے عوض ملا ہے۔ اس پر کسی اور کو یا عربوں کو ملول نہیں ہونا چاہیے۔"

ترک سردار مستعین نے ناگواری سے اس بحث کو ختم کر دینا چاہا، بولا۔ "تم دونوں اس فضول بحث کو ختم کر دو اور منصور! تم یہ بتاؤ کہ میں کیسا ترک ہوں؟ اگر میں تجھے سہارا دے رہا ہوں اور ایک ہاتھ کی کمی کے باوجود میں تجھے کوئی عزت کی جگہ دلا دوں تو کیا میں تیری نظر میں ایک اچھا ترک نہیں ٹھہروں گا؟"

منصور نے جواب دیا۔ "میں تمام ترکوں کو برا نہیں کہہ رہا ہوں یقیناً ان میں کچھ اچھے بھی ہوں گے۔ ان اچھوں میں تم بھی شامل ہو لیکن یہ بھی ایک نہایت تلخ اور افسوس ناک حقیقت ہے کہ میرا بایاں ہاتھ......" وہ کچھ کہتے کہتے ایک دم رک گیا اور گریز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "خیر اس موضوع کو یہیں ختم کر دیا جائے تو بہتر ہے۔"

ترک سردار مستعین کے چہرے پر بے چینی کے آثار نمودار ہو کر فوراً ہی ختم بھی ہوگئے۔ اس نے اپنا منہ دوسری طرف کر لیا اور آہستہ آہستہ کہنے لگا۔ "ترکوں نے عربوں کے ساتھ زیادتیاں بھی کی ہیں لیکن عربوں نے بھی انہیں معاف نہیں کیا مگر اب ہمیں ان باتوں کو بھلا دینا چاہیے اور دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح مل جل کر رہنا چاہیے کہ ماضی کی تلخیاں دور ہو جائیں۔" پھر منصور کی طرف مسکرا کر دیکھا اور نہایت خوش مزاجی سے کہا۔ "میں نے اس پر عمل شروع کر دیا ہے اب یہ دیکھنا ہے کہ تو اس پر کہاں تک عمل کرتا ہے۔" پھر اپنے بیٹے نافر کی طرف دیکھا اور کہا۔ "نافر! تو اپنے ترک باپ کی پیروی کرے گا۔"

منصور نے نافر کی طرف دیکھا اور نافر نے منصور کی طرف۔ دونوں جذبۂ خیر سگالی کے اعلان میں پہل نہیں کرنا چاہتے تھے کیونکہ ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف بدستور کدورتیں موجود تھیں۔ ترک سردار مستعین ان دونوں کی خاموشی سے غمزدہ ہوگیا، بولا۔ "اچھا منصور! اب ہم دونوں واپس جائیں گے۔ میں دو ایک دن میں تجھے امیر المومنین کے وزیر محمد بن عبدالملک الزیات کے پاس لے جاؤں گا اور کوئی اچھا سا منصب دلانے کی کوشش کروں گا۔ وہ ایک عرب ہونے کے رشتے سے ضرور تیری مدد کرے گا۔"

ترک سردار مستعین اپنے بیٹے نافر کے ساتھ واپس گیا اور منصور کو اس سوچ میں چھوڑ گیا کہ ترک کیسے ہی کیوں نہ ہوں لیکن ترک سردار مستعین ان سب سے مختلف اور شریف ہے اور کم از کم اس کے لیے اس کو اپنی رائے بدلنا پڑے گی۔

منصور کو کئی دن اپنے مکان میں بند بند سا رہنا پڑا کیونکہ وہ اس ماحول میں بالکل اجنبی تھا اور اجنبی ہی رہنا چاہتا تھا۔ وہ ترکوں میں گھلنا ملنا پسند نہیں کرتا تھا۔ اس کے دونوں غلام اسے اکساتے کہ وہ ترک سردار مستعین کے خاندان والوں سے تعلقات بڑھائے اور ان میں گھل مل جائے لیکن منصور کا دل اس پر آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ اس درمیان ترک سردار اور نافر برابر آتے جاتے رہے اور اس سے مختلف موضوعات پر ہنس ہنس کر باتیں کرتے رہے اور انہی ملاقاتوں میں منصور نے یہ حیرت انگیز بات بھی محسوس کی کہ اب نافر میں پہلے دن جیسی سختی یا خشونت نہیں پائی جاتی تھی۔ اب وہ بھی کسی حد تک اپنے باپ ہی کی طرح نرم اور

خوش اخلاق ہو گیا تھا جو یقیناً منصور کے خیال کے مطابق مستعین کی نصیحتوں اور ہدایتوں کا نتیجہ ہو گا۔

ایک دن دوپہر کو فیروز نے اسے مطلع کیا کہ ترک سردار مستعین نے منصور کو اپنے گھر کی تقریب میں مدعو کیا ہے۔ یہ تقریب اس کی لڑکی کی صحت یابی کی خوشی میں منعقد ہو رہی ہے۔ منصور نے سوچا، اس تقریب میں یقیناً خود اس کے سوا سارے ہی ترک ہوں گے اور وہ ان سب میں خود کو تنہا اور اجنبی محسوس کرے گا اس لیے اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس تقریب میں ہرگز شامل نہ ہو گا۔

چنانچہ شام ہونے سے پہلے ہی منصور اپنے مکان میں بند ہو کر بیٹھ رہا لیکن مستعین بھی کوئی ایسا دیا ترک نہیں تھا۔ اس نے مغرب کی نماز منصور کے ساتھ ہی پڑھی اور دعا سے فارغ ہونے کے بعد کہا۔ ”منصور! میں تجھے لینے آیا ہوں۔“

منصور نے جواب دیا۔ ”کیا میرا اس تقریب میں شریک ہونا ضروری ہے؟“

”ہاں بہت ضروری ہے۔“ پھر ہنس کر کہا۔ ”مجھے تو پہلے ہی یہ شبہ تھا کہ تو ٹالنے کی کوشش کرے گا اس لیے میں خود آ گیا اور اب میں لے کر ہی جاؤں گا۔“

منصور نے جواب دیا۔ ”ساتھ چلنے میں کوئی حرج نہیں لیکن میں وہاں بالکل تنہا ہوں گا۔“

ترک سردار نے کہا۔ ”تو وہاں تنہا کیوں ہو گا۔ نافر تیرے ساتھ ساتھ رہے گا اور اس بات کی کوشش کرے گا کہ تو وہاں تنہائی محسوس نہ کرے اور میں خود بھی اس کوشش میں نافر کا ساتھ دوں گا۔“

بالآخر منصور مجبور ہو گیا اور اس تقریب میں شامل ہونے کی نیت سے تیار ہونے لگا۔

☆☆☆

رات کو ترک سردار کے محل کو روشنی کا گھر بنا دیا گیا۔ ایک بہت بڑے ہال میں مہمانوں کے لیے فرش بچھا دیا گیا جس پر سب بیچ کی جگہ چھوڑ کر مربع شکل میں بیٹھ گئے۔ ہال کے درمیان جگہ جگہ خشک اور تر میووں کے تسلے رکھ دیے گئے۔ یہاں مشروبات کا انتظام بھی کیا گیا تھا۔ پھلوں کے عرق کے ساتھ ہی کھجور کی نبیذ بھی رکھی ہوئی تھی۔ ترک مہمانوں کے ساتھ ان کے بچے بھی آئے ہوئے تھے اور وہ درمیان میں رکھے ہوئے پھلوں اور خشک میووں کو بڑی حریصانہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ انہی میں منصور بھی شامل تھا۔ اس کے ساتھ ہی نافر بھی بیٹھا ہوا تھا۔ ترک مہمانوں کی نظریں بار بار منصور کے کٹے ہوئے ہاتھ پر پڑ رہی تھیں اور شاید انہیں اپنے درمیان ایک عرب نوجوان کی موجودگی حیرت میں ڈالے ہوئے تھی۔

کافی دیر بعد خورد و نوش کا سلسلہ شروع ہوا۔ نافر، منصور کو اصرار کر کر کے کھلاتا پلاتا۔ شریک محفل لوگوں نے خوب خوب کھایا پیا۔ ادھر سے فارغ ہو جانے کے بعد رقص و موسیقی کا سلسلہ شروع ہوا۔ آزاد منش اجڈ ترکوں نے رقص و موسیقی سے خوب لطف اندوز ہونے کا مظاہرہ کیا۔ رات کے پچھلے پہر ترک سردار نے ایک غیر متوقع قدم اٹھایا۔ وہ منصور کے پاس پہنچا اور درخواست کی۔

”معزز عرب نوجوان! میں چاہتا ہوں کہ تو صحت یابی کی مبارک باد میری بیٹی کو خود ہی چل کر دے دے۔“

منصور کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے ترک سردار کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”کیا مجھ سے کچھ کہا؟“

”ہاں اور کس سے کہوں گا۔“ ترک سردار نے جواب دیا۔ ”میں تجھے اپنے خاندان کا ایک فرد سمجھنے لگا ہوں اس لیے کافی غور و فکر کے بعد میں نے یہ فیصلہ کیا کہ تجھے اپنی بیوی بچوں سے بھی ملوا دوں اور ان سب سے ملنے کا یہ ایک بہترین موقع ہے۔“

منصور کو شبہ گزرا کہ اس کا ایک ہاتھ چونکہ موجود نہیں ہے اس لیے شاید ترک سردار اپنے خاندان والوں میں اس کا مذاق اڑانا چاہتا ہے۔ اس نے بے دلی سے کہا۔

”ترک سردار! تمہاری نوازشیں یوں بھی میرے حال پر بہت زیادہ رہی ہیں، اب تم مجھے اپنے گھر والوں سے ملوانا چاہتے ہو۔“ پھر کچھ سوچ کر کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ ابھی ملنے ملانے کے تکلفات میں نہ پڑو۔ میں ایک پریشان حال عرب ہوں اور کچھ پتا نہیں کہ میں اس گھر میں کب تک ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ اس گھر سے میرا کل ہی آب و دانہ اٹھ جائے۔“

لیکن ترک سردار نہیں مانا، وہ منصور کو اسی وقت اپنے بیوی بچوں میں لے گیا۔ وہاں بھی مہمانوں کا خاصا ہجوم تھا۔ ترک سردار نے اسے ایک کمرے میں بٹھا دیا اور بولا۔ ”یہیں بیٹھ، میں ابھی انہیں بلا کر لاتا ہوں۔“

نافر بھی اس کے ساتھ ہی آ گیا تھا۔ منصور گھبرایا ہوا تھا۔ اس نے نافر سے کہا۔ ”نافر! میری سمجھ میں ایک بات نہیں آ رہی، وہ یہ کہ آخر تیرا باپ مجھ پر اتنا مہربان کیوں ہے؟“

نافر نے جواب دیا۔ ”اس کا جواب تو میرے پاس بھی نہیں لیکن جہاں تک میری سمجھ میں کوئی بات آئی ہے تو وہ یہ ہے کہ میرا باپ ذرا زیادہ رحم دل واقع ہوا ہے اور اسے تیرے حال پر کچھ زیادہ ہی رحم آ گیا ہے۔“ لیکن نافر کا بیان کیا ہوا جواز منصور کی سمجھ میں نہیں آیا۔

ذرا دیر بعد ترک سردار واپس آیا تو اس کے پیچھے پیچھے اس کی بیوی اور بیٹی چلی آ رہی تھیں۔ منصور احتراماً کھڑا ہو گیا اور اس نے سلام میں پہل کی۔ ترک سردار کے علاوہ دونوں نے ہی اجنبی انداز میں سلام کا جواب دیا۔

ترک سردار نے اپنی چالیس پینتالیس سالہ بیوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”عرب نوجوان! میرے طور طریقوں سے تو کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو تو بہتر ہے۔ یہ میری بیوی ہے۔ میں نے تجھے اپنا بیٹا بنا لیا ہے اس لیے تجھ پر واجب ہے کہ تو میری بیوی کو اپنی ماں تصور کر۔“

منصور نے ترک سردار کی بیوی کو ذرا غور سے دیکھا تو دل میں یہ اعتراف کیے بغیر نہ رہا کہ حسن اور دلکشی تو شاید ترکوں پر ختم ہو گئی ہے۔ اس چالیس پینتالیس سالہ عورت میں اب بھی بلا کی دلکشی موجود تھی۔ وہ انہی خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ ترک سردار کی آواز پھر سنائی دی، وہ اپنی بیوی سے کہہ رہا تھا۔ ”میرے دل اور گھر کی مالکہ! یہ منصور ہے، ایک عرب نوجوان، اس کا نام منصور ہے۔ میں اس کا غائبانہ ذکر کر چکا ہوں۔ یہ یمنی عرب ہے۔ اس کا باپ عموریہ کی جنگ میں مارا گیا، ماں کا انتقال اس سے بھی پہلے ہو چکا تھا۔ اب یہ اس دنیا میں تنہا ہے۔ اس کا ایک ہاتھ بھی کسی جنگ میں شہید ہو چکا ہے۔ اب یہ بے کار ہے کیونکہ اس کے ہاتھ کا یہ نقص اسے ہر جگہ مایوس کر رہا ہے۔ میں نے اس کی داستان سنی تو بہت متاثر ہوا اور اس بات کی ذمے داری قبول کر لی کہ اسے رہنے کو گھر بھی دوں اور کوئی کام بھی دلا دوں چنانچہ رہنے کو گھر دے چکا ہوں اور اب اس کا معاشی مسئلہ اور حل کرنا ہے۔“

اس تفصیلی تعارف پر نافر کو ہنسی آ گئی۔ منصور یہ سمجھ بیٹھا کہ یقیناً اس کے ساتھ کوئی مذاق ہو رہا ہے۔ اس نے نافر سے کہا۔ ”نافر! کیا تم مجھ پر اس لیے ہنس رہے ہو کہ میں ان دنوں زمانے کا ہدف بنا ہوا ہوں۔ تم لوگ طعن و طنز کے تیر چلانا تفریح کا ایک ذریعہ سمجھ رہے ہو۔“

نافر گھبرا گیا، جلدی جلدی کہنے لگا۔ ”نہیں، یہ بات نہیں ہے منصور بلکہ میں اس پر ہنس رہا ہوں کہ باوا جان نے تمہارا تفصیلی تعارف گھر میں پہلے ہی کروا رکھا ہے۔ میں تو اپنے باوا کے اس جذبۂ ہمدردی اور احساس ترحم پر مسکرا رہا ہوں جس نے انہیں بدحواس اور پریشان کر رکھا ہے۔“

ترک سردار نے نافر کو ڈانٹا۔ ”خبردار نافر جو تو نے دوبارہ کوئی ایسی ویسی بات کی۔ منصور میرا مہمان ہے اور میرا مہمان تیرا مہمان ہوا اور اب یہ ہمارا مہمان ہی نہیں، تیرا بھائی بھی ہے۔“

ترک سردار کی بیوی بہت خوش تھی، بولی۔ ”میں اس نوجوان عرب سے مل کر بہت خوش ہوئی اور میں اسے اپنا بیٹا ہی سمجھوں گی۔“ پھر اپنی بیٹی کا تعارف کروایا۔ ”اور یہ ہے میری بیٹی بوران۔ آج کی تقریب اسی کی صحت یابی کی خوشی میں منعقد ہوئی ہے۔“

منصور نے ترک سردار کی بیٹی بوران کی طرف دیکھا تو اس کے ہوش و حواس ہی جاتے رہے، کیا سارے ترک حسین ہوتے ہیں۔

ترک سردار نے کہا۔ ”میری بیوی جس طرح تیری ماں بن گئی ہے اسی طرح میری بیٹی بوران اب تیری بہن بن گئی ہے۔ یہ تیری بھائیوں جیسی عزت کرے گی اور تو ایک چھوٹے سے بھائی کی طرح بوران کا خاص خیال رکھے گا۔“

ترک سردار کی باتیں منصور کے دل پر چوٹ لگا رہی تھیں۔ اس کا دل بوران کو بہن بنانے پر آمادہ نہیں تھا۔

اس تعارف کے بعد سب ایک دوسرے کے روبرو بیٹھ گئے۔ منصور بار بار بوران کو دیکھ رہا تھا۔ آخر بوران نے شرما کر اپنی گردن جھکا لی۔ ترک سردار نے اسی وقت ان سب کو پھل پیش کیے۔ وہ ایک نہایت خوشگوار ماحول تھا۔ منصور، بوران کو بار بار دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ترک سردار نے کہا۔

”منصور! میرا خیال ہے کہ تو میری بیٹی بوران کو اپنی بہن تصور کرے گا۔ میں نے اپنی طرف سے وہ سب کچھ کر دیا جس کا میں کافی دنوں سے ارادہ کیے بیٹھا تھا اور آج بہت خوش ہوں۔“

نافر نے کہا۔ ”منصور! اب وقت آ گیا ہے کہ تم سب کے لیے کوئی مشترکہ کام کیا جائے۔ میرے باپ نے تجھے میرا بھائی قرار دیا ہے، کم از کم میں اس رشتے کا زندگی بھر احترام کروں گا لیکن شاید تیری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔ میری ماں، باپ اور خود بوران جستجو آمیز نظروں سے دیکھ دیکھ کر ہاں یا نہ میں تیرا جواب سننا چاہتے ہیں۔“

منصور نے کہا۔ ”میں کیا جواب دوں؟“

ترک سردار نے جواب دیا۔ ”یہ کہ تو آج سے بوران

کو اپنی بہن سمجھے گا۔"

لیکن منصور نے پھر خاموشی اختیار کر لی، ترک سردار اپنے متعلقین سمیت منصور کے جواب کا انتظار کرتا رہا۔ نافر نے کہا۔ "تو خاموش کیوں ہے؟"

منصور نے جواب دیا۔ "میں ایک ایسی بات کس طرح اپنی زبان سے ادا کروں جو غلط ہے، جھوٹ ہے۔"

بوران نے چونک کر منصور کی طرف دیکھا۔ ترک سردار، نافر اور اس کی ماں نے بھی گھبرا کر منصور کی طرف دیکھا۔ ترک سردار نے کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ بوران تیری بہن نہیں ہے لیکن اس کے باوجود اگر تو اسے اپنی بہن سمجھنے لگے گا تو یہ کوئی بری بات نہ ہوگی۔"

منصور نے اکتا کر کہا۔ "بوران میری بہن نہیں ہے، میں اسے کس طرح اپنی بہن کہہ دوں؟"

ترک سردار کی بیوی اور نافر کو منصور کے اس جواب نے بڑی تکلیف پہنچائی لیکن مفاہمت پسند ترک سردار نے انہیں سمجھایا۔ "تم لوگ اس عرب نوجوان کی باتوں سے خفا خفا نظر آ رہے ہو لیکن میرے خیال میں تمہیں رنجیدہ یا کبیدہ خاطر نہیں ہونا چاہیے کیونکہ جس لڑکی سے منصور واقف نہیں ہے، اسے وہ اپنی بہن فی الفور کیوں کہہ دے۔"

بوران اس ضدی اور صاف گو عرب نوجوان کو اچھی طرح دیکھنا چاہتی تھی لیکن ماں باپ اور بھائی کی موجودگی میں وہ ایسا نہیں کر سکی۔ اس کے سر پر رومال بندھا ہوا تھا جس میں سے سیاہ بالوں کی لٹیں نکل کر پیشانی پر بکھر گئی تھیں۔ منصور کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اس نے ترک سردار سے کہا۔

"کیا اب واپس نہ چلا جائے؟"

ترک سردار نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "ہاں اب واپس چلنا چاہیے۔"

منصور نے بوران کی ماں اور نافر کی طرف دیکھا جو اسے گھورنے میں مشغول تھے۔

جب وہ اپنے بستر پر سونے کے لیے لیٹا تو اسے یاد آیا کہ اس نے بوران کو اس کی صحت یابی کی مبارک باد تو دی ہی نہیں۔ اس کے ساتھ ہی اسے بوران کا شرمایا شرمایا چہرہ بطور خاص یاد آتا رہا۔ اسے اس پر بڑا غصہ آیا کہ ترک سردار، بوران کو اس کی بہن بنانے پر کیوں مصر تھا۔ اس نے آخر وقت تک بوران کو بہن نہیں کہا۔ یہ اس کے دل کی بات تھی۔ وہ ایک غلط بات نہیں کہنا چاہتا تھا لیکن اب بستر پر لیٹا وہ سوچ رہا تھا کہ اس نے جو کچھ کیا، کیا وہ سب صحیح تھا؟ کیا ترک سردار، نافر اور اس کی ماں کو اس کا یہ رویہ پسند آیا ہوگا؟ اور اس سلسلے میں خود بوران نے کیا سوچا ہوگا؟ وہ اس پر جتنا زیادہ سوچتا، پریشان ہو جاتا پھر وہ اپنے دل کی گہرائیوں میں ترکوں کا مقام تلاش کرتا تو پتا چلتا کہ وہاں ترکوں کے خلاف نفرت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اس کے ساتھ ہی ترکوں کا حد درجہ شریفانہ سلوک یاد آتا تو وہ بے چین ہو جاتا اور کوشش کرتا کہ ترکوں کے خلاف دل میں جو کدورت موجود ہے اسے نکال پھینکے لیکن ایسا کرنا اس کے اختیار میں نہیں تھا۔ اب تو اسے یہ شبہ بھی ہو گیا تھا کہ شاید دوسرے دن علی الصباح ترک سردار یا نافر اسے یہ حکم دینے حاضر ہوں کہ رات بوران کو بہن نہ کہنے کے جرم میں اسے گھر سے نکالا جا رہا ہے۔ اس آخری خیال اور تکلیف دہ خدشے نے اسے پریشان کر دیا اور وہ اپنے رویے پر پشیمان بھی ہوا اور پریشان بھی۔ اس نے افسوس کے ساتھ سوچا کہ اسے بوران کو بہن بنا لینا چاہیے تھا خواہ اس عمل میں اس کی منافقت ہی کیوں نہ شامل ہوتی۔ وہ رات گویا بڑی طویل رات تھی۔ اب اس نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ صبح ہوتے ہی ترک سردار سے مل کر یہ درخواست کرے گا کہ وہ منصور کو بوران کے روبرو لے چلے کیونکہ وہ غلطی سے جو کام رات نہیں کر سکا، اب کرنے کو تیار ہے۔

صبح چڑیوں کی چہچہاہٹ میں ترک سردار اس کے پاس آیا۔ اس وقت اذان کی آواز بھی صبح کے سناٹے کو لرزا رہی تھی۔ غلام فیروز نے وضو کے لیے پانی اس کے سرہانے لا کر رکھ دیا۔ منصور ادھ کھلی آنکھوں سے ترک سردار کو اپنے سامنے دیکھ کر خوف زدہ ہو گیا کیونکہ اس کی آمد منصور کی توقع کے مطابق تھی۔ اس کے دونوں کان ترک سردار کے اس حکم کو سننے کے لیے تیار تھے جس میں اس کے رخصت ہو جانے کا مفہوم شامل ہو۔

ترک سردار نے آہستہ سے کہا۔ "منصور! میں تجھے وزیر ابن الزیات کے پاس لے چلوں گا، تو وضو کر کے فجر کی نماز ادا کر لے۔"

یہ لب و لہجہ اور باتوں کا مفہوم اس کی توقع سے مختلف تھا۔ وہ چپ چاپ اٹھا، وضو کیا اور ترک سردار کے ساتھ فجر کی نماز پڑھی۔ اس نے زیر لب دعا میں خدا سے یہ خواہش کی کہ وہ اس کے دل سے ترکوں کے خلاف موجود کدورت دور کر دے۔ اسی دوران اسے بوران بھی یاد آئی اور جی چاہا کہ اس کے لیے بھی دعا مانگے لیکن پھر دل ہی دل میں شرما کے دعا مانگنے سے معذور رہا۔

ترک سردار، منصور کو لے کر جیسے ہی مکان سے نکلا۔ منصور نے کہا۔ "جناب والا! میں آپ کی جو خواہش رات پوری نہیں کر سکا تھا، پوری رات اس پر شرمسار اور نادم رہا۔ میں کہیں جانے سے پہلے آپ کے گھر چلنا چاہتا ہوں تاکہ جو رات نہیں کر سکا تھا، اسے اس وقت کر گزروں۔"

ترک سردار نے متجسس اور سوالیہ نظروں سے منصور کی طرف دیکھا، پوچھا۔ "کیا سچ مچ؟"

اس نے جواب دیا۔ "ہاں، سچ مچ۔ ترک سردار! میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔ میں منافق بھی نہیں بن سکتا۔ کل رات میرے دل میں بوران کے لیے بھائیوں جیسے جذبات نہیں تھے لیکن آپ لوگوں کے حسن سلوک نے صبح ہوتے ہوتے مجھے اس پر مجبور کر دیا ہے کہ میں بوران کو بہن بنا کر آپ سب کی خواہش پوری کر دوں۔"

ترک سردار نے نہایت دکھ سے کہا۔ "منصور! ایک عرصے سے میرے دل میں ایک کانٹا سا چبھ رہا ہے، میں نے بڑی کوشش کی کہ اس کانٹے کو نکال باہر کروں لیکن میں اپنی اس کوشش میں ناکام رہا۔ چنانچہ کل رات جب تو نے بوران کو بہن ماننے یا بنانے سے انکار کر دیا تو اس پر مجھے غصہ بھی آیا اور افسوس بھی ہوا لیکن اس وقت میں نے ضبط و تحمل سے اس لیے کام لیا کہ اس ضبط و تحمل میں میرے لیے سکون اور تسلی کا سامان موجود تھا......"

منصور نے بات کاٹ دی، بولا۔ "کل رات تک میرے دل میں ترکوں کے خلاف شدید نفرت موجود تھی اور اگر اس وقت آپ میرے پاس نہ آتے تو شاید غم و غصے کا یہ جذبہ مجھ میں اس وقت بھی موجود ہوتا لیکن اب میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ میرے دل میں غم و غصے کے ایستادہ برفیلے تودے پگھلتے جا رہے ہیں اور اس کا پانی میرے دل میں موجود کدورت کو دھوئے چلا جا رہا ہے۔"

ترک سردار کے چہرے پر بشاشت کی لہر سی دوڑ گئی، بولا۔ "عرب نوجوان! شاید تو یقین نہ کرے لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں عربوں سے دوستی کرنا چاہتا ہوں۔ میں تجھے اپنے خاندان کا ایک فرد بنانا چاہتا ہوں۔ اس لیے میں نے تجھے اپنی بیوی، بیٹی اور بیٹے سے ملایا تھا لیکن پھر معلوم نہیں کیوں تو نے میرا ساتھ نہیں دیا۔"

ترک سردار، منصور کو اسی وقت اپنے خاندان میں لے گیا۔ اس کی بیوی اور نافر صبح ہی صبح منصور کو اپنے گھر میں دیکھ کر حیران رہ گئے۔ بوران پر کیا اثر ہوا یہ وہی جانتی ہوگی۔ اس کا چہرہ کچھ متورم سا محسوس ہو رہا تھا اور اس میں ایک قسم کی وحشت سی پائی جاتی تھی جو یا تو شب بیداری کا نتیجہ تھی یا سو کر اٹھنے، زیادہ دیر نہ سونے کی وجہ سے تھی۔

ترک سردار نے اپنی بیوی سے کہا۔ "نوجوان عرب منصور اپنی رات والی غلطی پر پشیمان ہے اور اس نے ابھی ابھی یہ وعدہ کیا ہے کہ یہ بوران کو اپنی بہن بنا کر ترکوں کے لیے اپنے جذبہ خیر سگالی کا اظہار کرے گا۔"

بوران سامنے سے ہٹ گئی اور منصور ایک بار پھر کشمکش کا شکار ہو گیا۔ بوران کے سحر اثر حسن نے اس کی زبان سے قوت گویائی چھین لی اور اس کا دل انتہائی جبر اور کوشش کے باوجود بوران کو بہن کہنے پر آمادہ نہ ہوا۔ بوران کا سامنے سے ہٹ جانا اسے گراں گزرا۔ ترک سردار نے بیوی سے پوچھا۔

"یہ بوران کہاں چلی گئی، ذرا بلانا تو اسے۔"

لیکن ذرا دیر بعد جب وہ بوران کے پاس سے واپس آئی تو یہ خبر لے کر کہ۔ "بوران کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، اس کے سر میں درد ہے اس لیے اس معاملے کو دوسرے وقت کے لیے اٹھا رکھا جائے۔"

منصور کی جان میں جان آئی کہ خدا نے اس مکروہ معاملے کو ٹال دیا تھا۔

ترک سردار اسے لے کر معتصم کے وزیر محمد بن عبدالملک الزیات کے پاس پہنچا۔ ابن الزیات کا دربار کچھ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے سامنے کئی معزز شخصیتیں نہایت ادب سے بیٹھی تھیں اور ابن الزیات ان پر کوئی توجہ نہ دے رہا تھا۔ ترک سردار نے ابن الزیات کو سلام کیا تو اس نے سر اٹھا کر ترک سردار کو سرسری نظروں سے دیکھا اور زبان کے بجائے گردن ہلا کر سلام کا جواب دیا۔ اس کا طرز عمل ترک سردار کو نہایت گراں گزرا۔ وہ منصور کی نظروں میں شرمندہ ہو گیا تھا۔ اس نے دوسروں کی پروا کیے بغیر کہا۔

"ابن الزیات! اخلاق کی رسول اللہ ﷺ نے بڑی تعریف فرمائی ہے لیکن میں محسوس کر رہا ہوں کہ مسلمان اس قیمتی وصف سے محروم ہوتے جا رہے ہیں۔"

ابن الزیات نے ٹیڑھا منہ بنا کر جواب دیا۔ "ترک سردار! ذرا ادب سے بات کر، میں انتہائی مصروف آدمی ہوں، تو میرے پاس کیوں آیا ہے؟"

ترک سردار نے کہا۔ "اپنی خواہش تو اس وقت بیان کروں گا جب مجھے اس بات کا یقین ہو جائے کہ تو اسے خوش دلی اور اطمینان سے سنے گا۔ میں اپنی درخواست پیش کر کے شرمندہ نہیں ہونا چاہتا۔"

ابن الزیات نے سر نیچے کیے رکھا، بولا۔ ”میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میں نہایت معروف انسان ہوں۔ اگر میں ہر کس و ناکس کی درخواست پر غور کرنا شروع کردوں تو میں اپنے فرائض منصبی تباہ کر چکا۔“

ترک سردار نے کہا۔ ”ابن الزیات! زیادہ مغرور مت بنو اور یاد رکھو کہ کسی کا یکساں وقت نہیں رہتا۔“

”بس بس اپنی نصیحتیں رہنے دے اور آنے کی غرض وغایت بیان کر۔“

ترک سردار نے منصور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ابن الزیات! یہ عرب نوجوان تیری ہی قوم کا ایک فرد ہے اور اس کا ایک ہاتھ کسی لڑائی میں ضائع ہو چکا ہے، اسے میں تیرے پاس اس لیے لایا ہوں کہ تو اسے کوئی ایسا کام دے دے جس سے یہ باعزت زندگی گزار سکے اور ایک ہاتھ کی کمی نے اس میں جو ایک قسم کا احساس محرومی پیدا کردیا ہے، اس سے نجات حاصل کرلے۔“

ابن الزیات نے ایک بار پھر سر اٹھا کر منصور کی طرف دیکھا اور درشت لہجے میں کہنے لگا۔ ”ترک سردار! آخر یہ تم سب کو ہو کیا گیا ہے، اس منحوس نوجوان کو کون اپنے پاس رکھنا پسند کرے گا اور پھر یہ ایک ہاتھ سے کون سی خدمت انجام دے سکتا ہے۔“

ترک سردار نے جواب دیا۔ ”ابن الزیات! یہ نحوست کی بات تو کررہا ہے، کیا سپاہیوں کے میدان جنگ میں ہاتھ پیر نہیں کٹ جایا کرتے؟ جسے تو عیب کہہ رہا ہے یہ تو اس کی بہادری اور جنگ جوئی کا ایک روشن نشان ہے۔“

ابن الزیات نے حاضرین میں سے چند کو ڈانٹنا شروع کردیا۔ ایک دراز ریش اور گندم گوں عمر رسیدہ شخص سے کہا۔ ”تو یہاں کیا لینے آیا ہے؟ میں تجھے کئی بار منع کر چکا ہوں کہ میں امیرالمومنین سے تیری سفارش نہیں کرسکتا پھر کیوں تنگ کرتا رہتا ہے۔ اسی وقت دفعان ہوجا یہاں سے۔“

پھر دوسرے گول مٹول سے شخص سے مخاطب ہوا۔ ”کسی درباری امیر نے اگر تجھے ستار کھا ہے تو اس کا میری ذات سے کیا تعلق ہے؟“

اور ایک شخص کو تو مارنے کے لیے کھڑا ہوگیا۔ ”بس تیری عافیت اسی میں ہے کہ یہاں سے چلا جا۔“

ابھی چار آدمی باقی تھے جنہیں ڈانٹنا تھا کہ ابن الزیات کے آدمیوں نے گھبرائے ہوئے انداز میں اسے مطلع کیا۔ ”حضور والا! امیرالمومنین کے بیٹے واثق تشریف لا رہے ہیں۔“

ابن الزیات نے سب کو وہاں سے ہٹانا شروع کردیا۔ ترک سردار سے بھی چلے جانے کے لیے کہا لیکن وہ نہیں ہٹا۔ ابن الزیات طیش میں کھڑا ہوگیا اور ترک سردار سے کہا۔ ”ترک سردار! تھوڑی دیر کے لیے اگر تم کہیں اور چلے جاؤ تو بڑی مہربانی ہوگی۔“

ترک سردار نے جواب میں کہا۔ ”ابن الزیات! آخر یہ زلزلہ کیوں آگیا؟ کیا واثق کوئی خون خوار درندہ ہے جو ہر کوئی ان کے آگے پیچھے بھاگنے کی تیاری کررہا ہے۔“

ابن الزیات نے کہا۔ ”ترک سردار! میں تم سے بحث نہیں کرسکتا۔ واثق یہاں کیوں آرہا ہے میں جانتا ہوں اس لیے میں یہ کہہ رہا تھا کہ تم کچھ دیر کے لیے یہاں سے ٹل جاؤ، جب میں مناسب سمجھوں گا تم دونوں کو بلالوں گا۔“

لیکن ابھی یہ بحث جاری ہی تھی کہ واثق، ابن الزیات کے پاس آگیا۔ ابن الزیات نے بے نیازی اختیار کی اور اپنی جگہ بیٹھا رہا، منہ دوسری طرف کرلیا۔ ایسا لگتا تھا گویا معتصم باللہ کے بیٹے کی ابن الزیات کی نظر میں کوئی وقعت ہی نہیں تھی۔

واثق، ترک سردار سے بھی واقف تھا۔ دونوں میں علیک سلیک ہوئی۔ ابن الزیات اس علیک سلیک کو ناگواری سے محسوس کرتا رہا۔ واثق نے ابن الزیات سے کہا۔ ”ابن الزیات! میرے کام کا کیا ہوا؟“

ابن الزیات نے بے مروتی سے جواب دیا۔ ”تمہیں کچھ بھی نہیں ملے گا۔ امیرالمومنین نے سختی سے منع کردیا ہے۔“

واثق نے بے قراری سے کہا۔ ”ابن الزیات! یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ میں نے جس رقم کا مطالبہ کیا ہے وہ میری جائز ضرورت ہے۔ امیرالمومنین کو اس کی ادائیگی میں کیا تامل ہوسکتا ہے؟“

ابن الزیات نے بہت ہی زہریلے لہجے میں کہا۔ ”تمہیں امیرالمومنین پر اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں، وہ مقتدرِ اعلیٰ ہیں۔ امیرالمومنین فرماتے تھے کہ واثق سے کہہ دو اسے جو کچھ ملتا رہا ہے وہ کافی ہے مزید کی ہوس نہ کرے۔ ورنہ جو ملتا ہے اسے بھی بند کردیا جائے گا۔“ پھر ذرا زیادہ تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔ ”میں نے تم سے وہ بات تو کہی ہی نہیں جو امیرالمومنین نے کہی تھی حالانکہ انہوں نے غصے میں قسم دے کر مجھ سے کہا تھا کہ میں تم سے کہہ دوں کہ مقررہ رقم کے علاوہ کچھ طلب کرنا دریوزہ گری ہے اور امیرالمومنین کے

بیٹے کو دریوزہ گری زیب نہیں دیتی لیکن میں نے اسی وقت یہ کہہ دیا تھا کہ اس قسم کی بات میں نہیں کہہ سکوں گا۔“

واثق نے غصے میں کہا۔ ”او تیل بیچنے والے کے بیٹے! جو کچھ تجھے کہنا تھا کہہ دیا۔ میں امیرالمومنین کا بیٹا واثق دریوزہ گر ہوں۔ بخدا تو نے میرے دل میں نشتر اتار دیا ہے۔ تو نے اس ترک سردار کے سامنے مجھے ذلیل کیا ہے، میں تجھے معاف نہیں کروں گا۔“

ابن الزیات نے جواب دیا۔ ”مجھے تیل بیچنے والے کے بیٹے کہہ کر تم ذلیل کرنا چاہتے ہو حالانکہ میں نے خود ہی اسے اپنے نام کا جزو بنالیا ہے۔ میں ابن الزیات (تیل بیچنے والے کا بیٹا) ہوں کسی چور، ڈاکو یا مفسد کا بیٹا تو نہیں ہوں۔“

واثق نے جاتے جاتے کہا۔ ”ابن الزیات! میں اپنی اس بے عزتی کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔“

ترک سردار نے کہا۔ ”ابن الزیات! میرے لیے کیا حکم ہے؟ کیا میں جاؤں؟“

ابن الزیات نے رعونت سے کہا۔ ”ہاں تم سب دفعان ہوجاؤ، مجھے کسی کی پروا نہیں۔“ پھر بطورِ خاص واثق سے کہا۔ ”اگر تم سمجھتے ہو کہ امیرالمومنین کے بیٹے ہو اور میں تم سے ڈر جاؤں گا تو یہ تمہارا خیالِ خام ہے۔ تم جیسے چھتیس میری نازبرداری کیا کرتے ہیں۔ مجھے اپنی صلاحیتوں اور علم وفضل پر اعتماد ہے۔“

”تمہاری صلاحیتوں اور علم وفضل کو میں دیکھوں گا۔“ واثق باہر نکل گیا۔ اس کے پیچھے ہی ترک سردار بھی اٹھ کھڑا ہوا اور منصور کو لیے ہوئے واثق کے قریب پہنچ گیا۔ پیچھے سے آہستہ سے بولا۔ ”مستقبل کے امیرالمومنین! مجھے آپ سے ہمدردی ہے اور ابن الزیات کے ناروا سلوک کو افسوس کی نظر سے دیکھتا ہوں۔“

واثق نے مڑ کر دیکھا، پوچھا۔ ”تو یہاں کیا لینے آیا تھا؟“

ترک سردار نے منصور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں اس شریف عرب نوجوان کو ملازمت دلانے آیا تھا لیکن ابن الزیات نے کوئی توجہ ہی نہیں دی، کہتا ہے کہ ایک ہاتھ کا آدمی منحوس ہوتا ہے۔“

واثق نے کہا۔ ”ابن الزیات کا دماغ خراب ہوگیا ہے، جسے اللہ کو اگر منظور ہوا تو میں ٹھیک کروں گا۔“ پھر منصور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس شخص کو تو میرے سپرد کردے، یہ میری خدمت میں رہے گا۔“

ترک سردار کا مارے خوشی کے چہرہ دمکنے لگا۔ ایک ایسی خوشی سے، جو خلافِ امید اور مانگے بغیر ہی حاصل ہوگئی ہو۔ اس نے منصور سے کہا۔ ”لے اب تو کل کے امیرالمومنین کے ساتھ چلا جا۔“

منصور نے کہا۔ ”لیکن میں رہوں گا آپ ہی کے ساتھ۔“

ترک سردار نے جواب دیا۔ ”یہ میں کب کہتا ہوں کہ تو میرے ساتھ نہ رہ۔“

واثق نے کہا۔ ”اگر تو میری خدمت میں رہے گا تجھے اس کا موقع ہی کہاں ملے گا کہ اس ترک سردار کے ساتھ رہ سکے۔“

منصور نے ملتجیانہ نظروں سے ترک سردار کی طرف دیکھا۔ ترک سردار نے تسلی دی۔ ”میں تو خود بھی تجھے اپنے ساتھ ہی رکھنا چاہتا ہوں، تو اداس نہ ہو۔“ پھر واثق سے کہا۔ ”میں آپ سے درخواست کروں گا کہ اس شریف نوجوان کے سپرد کوئی ایسی خدمت کیجیے کہ یہ میرے ساتھ رہ سکے کیونکہ میں اسے اپنے ساتھ رکھ کر ایک عجیب سی حظ، ایک عجیب سی لذت محسوس کرتا ہوں۔“

واثق نے ہنس کر جواب دیا۔ ”اچھا، یہ ہفتے میں دو دن تمہارے پاس گزارے گا۔ اب تو تو خوش ہوا؟“

ترک سردار نے خوش ہوکر کہا۔ ”حضورِ والا کی نوازش، مہربانی، کرم گستری۔“ واثق، منصور کو اپنے ساتھ لے گیا اور ترک سردار اپنے گھر چلا گیا۔ جب یہ سب ہورہا تھا تو ابن الزیات کا جاسوس ان کے آس پاس موجود ان کی باتیں سننے کی کوشش کررہا تھا چنانچہ اسی وقت ابن الزیات اپنے آدمیوں سے کہہ رہا تھا۔

”یہ بے وقوف، احمقوں کی جنت میں رہنے والے لوگ، یہ بھی نہیں جانتے کہ مملکت عباسیہ میں امیرالمومنین کے بعد میری ذات سب سے اعلیٰ وافضل ہے۔ میں ایک اشارے میں زیروزبر کرسکتا ہوں۔“

☆☆☆

واثق محل میں داخل ہونے کے بعد تخلیے میں جا کر ابن الزیات کے ساتھ جو کچھ پیش آیا، اسے لکھتا رہا پھر منصور کو اپنے پاس بلا کر حکم دیا۔

”ابن الزیات نے میرے ساتھ جیسا نازیبا سلوک کیا ہے تو نے وہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سنا ہے، اب میں تجھے اس کا گواہ بناؤں گا۔ لے اسے پڑھ۔“

منصور پڑھنے لگا۔ ”آج میں، واثق اپنی وہ رقم حاصل کرنے کے لیے ابن الزیات کے پاس گیا تھا، جسے امیرالمومنین نے خود اپنی خوشی سے مجھے دینا پسند فرمایا تھا۔

تجھے یہ رقم ابن الزیات سے ملی تھی......"

واثق نے اسے روک دیا۔ "پوری تحریر مت پڑھ، بس یہ آخر کی چند سطریں پڑھ لے اور اس کے ایک طرف لکھ دے کہ یہ واقعہ میرے سامنے پیش آیا، میں اس کا عینی شاہد ہوں۔"

منصور نے پڑھا۔ "اگر میں خلیفہ بننے کے بعد ابن الزیات کو بری طرح قتل نہ کروں تو مجھ پر حج و صدقہ واجب ہو اور میرے لونڈی غلام آزاد ہوں۔" واثق نے اس کے نیچے اپنے دستخط کردیے تھے۔ دوسرے کنارے پر انگلی رکھ کر منصور کو حکم دیا۔

"تو یہاں لکھ دے کہ یہ واقعہ میرے سامنے پیش آیا، میں اس کا گواہ ہوں اور اس کے نیچے اپنے دستخط کردے۔"

منصور نے حکم کی تعمیل کردی۔ اس کے بعد واثق نے کہا۔ "ترک سردار سے بھی دستخط کرواتا ہیں۔ میں ابن الزیات کو کسی قیمت پر بھی معاف نہیں کروں گا۔"

منصور کو واثق نے ازراہِ ہمدردی رکھ لیا تھا۔ یوں اس کے ذمے کوئی خاص خدمت نہیں تھی۔ تیسرے دن واثق نے اس سے کہا کہ وہ ترک سردار کو بلا لائے۔ جب وہ ترک سردار کے پاس پہنچا تو وہ منصور سے مل کر بہت خوش ہوا۔ اس وقت نافر گھر میں موجود نہ تھا اور ترک سردار کی بیوی غسل کررہی تھی۔ بوران موجود تھی لیکن وہ بھی منصور کو دیکھ کر وہاں سے جانے لگی۔ ترک سردار نے اسے روک لیا۔ بولا۔ "بوران! میری خواہش تھی کہ تو منصور سے مغائرت نہ اختیار کر لیکن تو ہمیشہ میری مرضی کے خلاف کرتی ہے۔ اب میں تجھے حکم دیتا ہوں کہ تو یہیں موجود رہ۔"

بوران کچھ کہے سنے بغیر رک گئی، اس نے منصور کو اچٹتی سی نظروں سے دیکھا اور گردن جھکالی۔

ترک سردار نے پوچھا۔ "نافر کہاں چلا گیا؟"

بوران نے آہستہ سے جواب دیا۔ "وہ یہیں کہیں ہوگا۔"

ترک سردار نے کہا۔ "اچھا میں نافر کو تلاش کرکے لاتا ہوں تاکہ وہ گھر میں رہے اور میں امیر المومنین کے بھائی واثق کے پاس جاؤں۔"

وہ چلا گیا اور منصور، بوران کے پاس تنہا رہ گیا۔ بوران نے منصور کو مخاطب کیا۔ "میں جلدی میں تم سے ایک بات کہہ دینا چاہتی ہوں۔"

منصور نے اشتیاق سے جواب دیا۔ "کہو، میں سننے کو تیار ہوں۔"

بوران نے کہا۔ "میں بہن بننے پر ہرگز تیار نہیں، اس سے تم بھی اجتناب برتنا۔"

منصور نے جواب دیا۔ "میں خود بھی تمہیں بہن بنانے پر آمادہ نہیں ہوں لیکن تمہارے باپ کے اصرار پر میں مجبور ہوگیا تھا۔ اگر اب پھر کوئی ایسا موقع آجائے تو میں تم سے یہ درخواست کروں گا کہ تم سامنے سے ہٹ جانا، بات خود بخود ٹل جائے گی۔"

اس کے بعد خاموشی چھا گئی لیکن منصور کی تمنا تھی کہ بات کا سلسلہ جاری رہے۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، ترک سردار کی واپسی کا خطرہ بڑھتا جارہا تھا۔ اس کا خیال تھا بوران خود ہی سلسلۂ گفتگو جاری رکھے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ بوران نے ایسی چپ سادھی کہ پھر ایک لفظ بھی اپنی زبان سے نہیں نکالا۔ منصور اس انکشاف سے بہت خوش تھا کہ خود بوران بھی بہن بننے پر آمادہ نہیں۔

منصور نے بہ مشکل سوال کیا۔ "بوران! کیا تم ایک بات بتاؤ گی؟"

بوران نے جواب دیا۔ "پوچھو، ضرور بتاؤں گی۔"

منصور نے پوچھا مگر اس طرح گویا لفظوں کا پھندا پڑ رہا ہو۔ "بوران، ادھر میں تین دن سے تم لوگوں سے نہیں ملا، کیا تم میں سے کسی نے بھی مجھے یاد کیا تھا؟"

بوران ہنسنے لگی، بولی۔ "مجھے تو تم ذرا بھی یاد نہیں آئے۔ دوسروں کا حال میں جانتی نہیں۔"

منصور کے دل پر چوٹ لگی۔ بوران ہنستی رہی۔ منصور کے دل پر اس ہنسی نے اور زیادہ ستم ڈھایا، جل کر بولا۔ "ترکوں کے بارے میں میری شروع ہی سے بہت بُری رائے ہے۔ اگر میں تمہیں یہ بتادوں بوران کہ میں یہاں ترکوں کی بستی میں کیا لینے آیا ہوں تو تم سب میرے جانی دشمن ہوجاؤ گے۔"

بوران نے جواب دیا۔ "ایک طرف تو تم یہ دعویٰ کرتے ہو کہ تمہیں مجھ سے یا میرے خاندان سے بڑی دلچسپی ہے اور ہم سے یہ امید کرتے ہو کہ تمہاری عدم موجودگی میں ہم لوگ تمہیں یاد کریں اور دوسری طرف تم اپنی ترک دشمنی کا اعلان کرتے ہو۔"

بوران کی ماں غسل کرکے آچکی تھی۔ دونوں کی باتیں وہیں ختم ہوگئیں لیکن منصور ابھی اور باتیں کرنا چاہتا تھا۔ ماں نے آتے ہی سوال کیا۔ "ارے منصور! تو کب آیا؟" پھر بوران سے پوچھا۔ "اور سب کہاں چلے گئے؟ تو تنہا ہے۔"

بوران نے جواب دیا۔ "ابا، نافر کی تلاش میں گئے ہیں۔"

منصور نے کہا۔ "میں تھوڑی دیر پہلے آیا ہوں اور

ترک سردار کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ انہیں امیر المومنین کے بیٹے واثق نے بلایا ہے۔"

ماں نے پوچھا۔ "اب کیا تو وہیں رہے گا؟ میں نے تو یہ سنا تھا کہ تو یہیں ہمارے پاس رہے گا۔"

منصور نے جواب دیا۔ "ابھی تو مجھے وہیں رہنا پڑے گا۔" پھر نہایت کرب سے کہا۔ "ایک ہاتھ کی کمی نے میرے اندر ایک مجبوری یا کمزوری کا جو احساس پیدا کردیا ہے وہ میری امنگوں اور حوصلوں کو قتل کردیتا ہے۔" پھر ذرا خاموش رہ کر پرجوش لہجے میں بولا۔ "اگر مجھے انتقام کا موقع مل جائے اور یہ معلوم ہوجائے کہ میرا ایک ہاتھ کس نے ضائع کردیا تھا تو میں اس سے اتنا بھیانک انتقام لوں کہ لوگ اس سے عبرت حاصل کریں۔"

ماں نے حیرت سے سوال کیا۔ "لیکن جنگ میں بھی کچھ ممکن ہے، ہاتھ بھی کٹ سکتے ہیں، پیر بھی اور گردن بھی پھر اس نقصان کا کسی ایک شخص سے کس طرح انتقام لیا جاسکتا ہے؟"

منصور نے موضوع کو ٹالنے کے لیے کہا۔ "آپ کی بات درست ہے لیکن غلط میں بھی نہیں ہوں۔"

ماں اور بوران نے بیک وقت ایک ہی بات سوچی، منصور کسی شدید جذباتی دباؤ کی وجہ سے اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہے۔

☆☆☆

منصور نے ترک سردار کو واثق سے ملوادیا۔ واثق نے اس کی اثر انگیز پذیرائی کی۔ واثق کی کوشش یہ تھی کہ وہ امرائے عرب اور ترک سرداروں سے تعلقات خوشگوار رکھے۔ اس نے ترک سردار کو بھی ابن الزیات کے معاملے میں شاہد بنالیا لیکن جب ترک سردار واپس چلا گیا تو منصور نے جرأت سے جو بات کی وہ ترکوں کے خلاف تھی۔ اس نے واثق سے کہا۔

"میں ایک معمولی اور عام آدمی کی حیثیت سے آپ کو کوئی مشورہ تو نہیں دے سکتا لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ ہم عربوں کو ترکوں پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔"

واثق نے تعجب سے پوچھا۔ "کیا تو تمام ترکوں کے خلاف ہے اور اس ترک سردار کے خلاف بھی، جس نے تجھ پر احسان کیے ہیں اور تجھے میرے پاس تک پہنچایا ہے۔"

منصور روہانسا ہوگیا۔ جذباتی دباؤ نے اس کا حلق خشک کردیا تھا اور آواز پھنس پھنس کر نکل رہی تھی۔ اس نے بہ مشکل کہا۔ "اگر آپ ایک عرب ہونے کی حیثیت سے میری ترک دشمنی کا پس منظر سننا یا سمجھنا پسند فرمائیں تو میں عرض کردوں اور اس کے بعد آپ یہ فیصلہ فرمادیں کہ میں اپنے موقف میں کتنا صحیح یا غلط ہوں۔"

واثق نے حیرت اور تجسس کے ملے جلے لہجے میں اجازت دی۔ "تو سنا اپنا قصہ، میں بھی تو سنوں کہ تجھ پر ترکوں نے کیا ظلم کیا ہے؟"

منصور نے کہنا شروع کیا۔ "جب میں چھوٹا تھا اور بغداد میں رہا کرتا تھا۔ یہ ترک نئے نئے بغداد میں آئے تھے۔ سمرقند، فرغانہ اور بخارا جیسے غیر ترقی یافتہ علاقوں سے آنے والے ان وحشیوں نے بغداد جیسے ترقی یافتہ عروس البلاد میں قدم رکھا تو ان کا دماغی توازن ہی بگڑ گیا۔ یہ اجڈ ترک اپنے گھوڑوں پر سوار بغداد کے بازاروں اور گلی کوچوں میں مارے مارے پھرتے رہتے، ان کا اس حد تک دماغ خراب ہوگیا تھا کہ جب یہ اپنے گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے بھگاتے تو انہیں اس بات کا بھی خیال نہ رہتا کہ ان کے گھوڑوں کی زد میں کون آرہا ہے چنانچہ ان کے اس پاگل پن سے عربوں کی عورتیں، بوڑھے اور بچے بری طرح مجروح ہوتے رہے۔" پھر اس نے اپنے غائب بازو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "میرا یہ غائب ہاتھ بھی کسی ایسے ہی اجڈ ترک کے گھوڑے تلے روندے جانے کی نذر ہوگیا۔" اتنا کہہ کر وہ رونے لگا۔ واثق کے دل پر اس روداد کا خاص اثر ہوا۔ منصور نے اپنی داستان کا بقیہ حصہ بھی سنادیا۔ "اس دن میں اپنے دو بھائیوں اور دادا کے ساتھ مدرسے جارہا تھا۔ میرا ایک بھائی تو بھاگ کر بچ گیا تھا اور دوسرے کا سر گھوڑے کی ٹاپوں تلے کچلا گیا تھا۔"

واثق اس غمزدہ عرب نوجوان کی افسوس ناک داستان نہایت افسوس سے سنتا رہا پھر پوچھا۔ "تیرا وہ بھائی کہاں ہے جو کچلے جانے سے بچ گیا تھا؟"

منصور نے جواب دیا۔ "وہ بغداد میں موجود ہے۔ میرے دادا کا انتقال ہوگیا اور میں گھر والوں کو کچھ بتائے بغیر یہاں آگیا۔ میں نے اسی دن، جب یہ واقعہ پیش آیا تھا یہ عہد کرلیا تھا کہ بڑے ہوکر میں اس ترک کو ضرور تلاش کروں گا جس نے میرے بھائی کو کچل کر ہلاک اور مجھے ہمیشہ کے لیے ایک ہاتھ کا کردیا تھا اور جب وہ مل جائے گا تو میں اس سے اس کا انتقام لوں گا۔"

واثق نے پوچھا۔ "لیکن تو نے کبھی اس پر بھی غور کیا کہ تو ایک ایسے ترک کو پہچانے گا کس طرح، جس کی کسی نے شکل و صورت ہی نہ دیکھی ہو اور پھر یہ کہ ہوسکتا ہے کہ وہ ترک زندہ ہی نہ ہو، مرچکا ہو یا پھر یہاں موجود نہ ہو۔"

منصور نے جواب دیا۔ ”سب کچھ ممکن ہے اور یہ بھی ممکن ہے وہ زندہ ہو اور میری پہچان میں آجائے۔“

واثق نے کہا۔ ”بڑا مشکل کام ہے اور اب جبکہ تو میری خدمت میں رہے گا، ترکوں میں کس طرح اس شخص کو تلاش کرے گا، میری سمجھ میں تو یہ بات آتی نہیں......“

منصور نے جواب دیا۔ ”اسی لیے میں آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ میرے سپرد کوئی ایسا کام کیجیے کہ میں ترکوں میں رہ سکوں۔“

واثق نے کہا۔ ”میری طرف سے تجھے اس کی اجازت ہے کہ ترکوں میں بود و باش اختیار کر لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ ایک ایسی مہم میں اپنی نوجوانی اور زندگی کے قیمتی لمحات مت ضائع کر جس کے سر ہونے کا کوئی امکان نہیں۔“

منصور نے جذباتی آواز میں کہا۔ ”میں ایک شریف عرب ہوں اے مستقبل کے امیر المومنین! اس لیے میری نظر میں اپنی نوجوانی اور زندگی کے قیمتی لمحات سے زیادہ قیمتی اپنا عہد ہے اور میں اسے پورا کرنے کے لیے زندگی تک گنوا سکتا ہوں۔“

واثق نے کہا۔ ”ان باتوں کو تو خود بہتر سمجھتا ہے، میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ میری طرف سے تجھے اجازت ہے کہ تو ترکوں میں چلا جا اور اپنے مطلوبہ ترک کو تلاش کرتا رہ اور اگر اتفاق سے وہ مل جائے تو انتقام لینے سے پہلے اسے میرے علم میں ضرور لے آنا، ہوسکتا ہے کہ وہ کوئی قیمتی ترک ہو اور خلافت کو اس کی جان بہت زیادہ عزیز ہو۔“

منصور اسی دن ترک سردار کے گھر پر منتقل ہوگیا۔

☆☆☆

اس بار ترک سردار نے منصور میں یہ تبدیلی محسوس کی کہ وہ دوسرے ترکوں میں بھی گھلنے ملنے لگا ہے اور یہ بھی کہ وہ ترکوں میں کچھ تلاش کر رہا ہے۔ اس بار منصور نے ترک سردار سے یہ بھی کہا۔ ”ترک سردار! جب آپ مجھے اپنے خاندان کا ایک فرد بنانا ہی چاہتے ہیں تو پھر مجھے اپنے ہی گھر میں رہنے کی جگہ کیوں نہیں دیتے۔“

ترک سردار نے خوشی کا اظہار کیا، بولا۔ ”میں کب منع کرتا ہوں کہ تو میرے ساتھ میرے گھر میں نہ رہ۔ تو شوق سے میرے ساتھ ہی رہ، میرے لیے اس سے بڑی اور کون سی خوشی ہوسکتی ہے کہ تو میرے خاندان کا ایک فرد بن جائے۔“

منصور نے شاید پہلی بار اس ترک کی شرافت کا اثر اپنے دل کی گہرائیوں میں بری طرح محسوس کیا۔ اسے اس ترک کو ان ترکوں سے الگ کردینا پڑا جن کے خلاف اس کے دل میں نفرت پائی جاتی تھی۔

منصور اسی دن سے ترک سردار کے ساتھ ہی رہنے لگا۔ ایک ساتھ رہنے کی وجہ سے اسے بوران کو بہت زیادہ قریب سے اور بار بار دیکھنے اور بات کرنے کا موقع ملا اور یہ انکشاف ہوا کہ بوران کچھ ضرورت سے زیادہ مغرور واقع ہوئی ہے۔ وہ منصور سے بہت کم باتیں کرتی تھی۔

شام قریب تھی اور فضا میں پرندوں کے غول بسیرا لینے کے لیے شمالی سمت میں محو پرواز تھے۔ مغربی افق پر شفق پھول رہی تھی۔ کہیں کہیں ابر کے ٹکڑے ڈوبتے ہوئے سورج کی کمزور شعاعوں کی زد میں آکر دھویں زدہ نور کی شکل میں چمک رہے تھے۔ منصور شام کے دلکش مناظر میں کھویا ہوا اپنے ماضی میں سفر کررہا تھا۔ اس ماضی میں جس کی ایک راہ حال سے گزر کر مستقبل میں چلی جاتی تھی۔ اس راہ پر اس کا مطلوبہ ترک گامزن تھا اور منصور اس کا تعاقب کررہا تھا لیکن ان دونوں میں فاصلہ کچھ اتنا زیادہ تھا کہ منصور کو اپنے آگے اس کا ہلکا سا سایہ ہی دکھائی دے رہا تھا اور اس کی رفتار منصور سے اتنی زیادہ تیز تھی کہ اس کے تعاقب میں منصور کا وجود ہلا جارہا تھا۔ سانس پھولنے لگی تھی اور مایوسی غلبہ پاتی جارہی تھی۔ شاید اس ترک کو نہ پکڑا جاسکے۔ کیوں نہیں پکڑا جاسکتا؟ وہ اسے ضرور پکڑے گا اور اس سے انتقام لے کر رہے گا۔ اس نے ایک بار پھر آسمان کی طرف دیکھا، پرندوں کے غول بدستور محو پرواز تھے۔ اس نے ان پرندوں میں قابلِ رشک طمانیت اور سکون محسوس کیا اور آہستہ سے کہا۔

”اے کاش میں پرندہ ہوتا جو تعصب اور اپنی کشی کے مرتکب نہیں ہوتے۔“

سامنے والان میں بوران شمعیں جلارہی تھی۔ ترک سردار اور نافر بہت دیر سے غائب تھے اور بوران کی ماں وضو کرنے گئی ہوئی تھی۔ اسی وقت ایک خادمہ منصور کے پاس آئی اور مطلع کیا۔ ”مغرب کی اذان ہونے والی ہے۔ بوران فرمارہی ہیں کہ وضو کرلیجیے۔“ منصور چونک گیا اور فوراً ہی وضو کرنے چلا گیا۔

مغرب کی نماز سے فارغ ہوچکنے کے بعد خلاف توقع بوران اس کے قریب آگئی اور تکلیف دہ سوال کیا۔ ”کیا آپ نے امیر المومنین کے بھائی واثق کی ملازمت ترک کردی؟“

”نہیں تو۔“ منصور نے جواب دیا۔ ”میں اس وقت بھی واثق کا ملازم ہوں۔“

بوران نے پوچھا۔ ”لیکن آپ شب و روز تو یہیں موجود رہتے ہیں؟“

”ہاں یہ درست ہے لیکن میں باہر نکل کر ترکوں سے ملتا جلتا بھی رہتا ہوں۔“

بوران نے نہایت بامعنی بات کی۔ ”ہاں ہم سب جانتے ہیں کہ آپ ترکوں سے ملتے جلتے رہتے ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ آپ ان سے کس قسم کی باتیں کرتے ہیں۔ کسی نے باواجان کو یہ بتا رکھا ہے کہ آپ ہم ترکوں میں کس قسم کی جستجو فرما رہے ہیں۔“

منصور کے پورے جسم میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی لیکن ہوش و حواس قابو میں رکھے، بولا۔ ”بوران! کیا مجھے صاف گوئی کی اجازت ہے اور کیا میں تم سے یہ امید کروں کہ میری سچی باتیں تمہارے دل کو دکھ نہیں پہنچائیں گی؟“

بوران نے بے پروائی سے کہا۔ ”لمبی چوڑی تمہید کا فائدہ، جو کچھ کہنا ہے کہہ ڈالیے، میں کسی قسم کا وعدہ نہیں کرسکتی۔“

منصور نے جواب دیا۔ ”بوران! میں تمہارے خاندان کو مستثنیٰ قرار دے کر بار بار یہی کہوں گا کہ میں ترکوں سے نفرت کرتا ہوں، میں ان کی شکل دیکھ کر پاگل ہوجاتا ہوں۔“

”آخر کیوں؟ ان ترکوں نے آپ کو کون سا نقصان پہنچایا ہے؟“

منصور نے جواب دیا۔ ”جب میں کسی ترک گھڑ سوار کو گھوڑا دوڑاتے دیکھتا ہوں تو میرا دماغی توازن بگڑنے لگتا ہے اور اس وقت میرا یہ حال ہوتا ہے کہ میرا بس نہیں چلتا ورنہ میں انہیں قتل کردوں، گھوڑے سے گرا کر ہلاک کردوں۔ اس کے سوا اکثر میرا جی چاہتا ہے کہ میں گھوڑے پر سوار ہوکر ترکوں کے بچوں کو روندتا ہوا گزر جاؤں۔“

بوران حیرت اور خوف سے منصور کی شکل دیکھنے لگی، بولی۔ ”تو اندر سے آپ اتنے ظالم ہیں۔“

منصور نے جواب دیا۔ ”ظالم میں نہیں، ترک ہیں۔ میری یہ خواہش ایک قسم کی بازگشت ہے، جسے تم نہیں سمجھ سکتیں۔“

بوران نے کہا۔ ”میں نے آپ کی سچ بات تو برداشت کرلی، اب آپ میری حق گوئی کا وار سہیں۔“

منصور نے مسکرا کر کہا۔ ”میں تیار ہوں۔“

بوران نے کہا۔ ”آپ نے تو ترک دشمنی اور ترک عناد میں میرے خاندان کو مستثنیٰ قرار دے دیا تھا لیکن میں کسی کو بھی مستثنیٰ نہیں قرار دوں گی۔ میں آپ سمیت تمام عربوں سے نفرت کرتی ہوں اور آپ کا یہاں رہنا مجھے

بالکل پسند نہیں۔"

منصور کو اس صاف گوئی سے واقعی بڑا صدمہ پہنچا، کچھ دیر تک وہ بوران کے چہرے پر نظریں جمائے گویا رحم کی درخواست کرتا رہا۔

بوران نے کہا۔ "اگر آپ واقعی ہم ترکوں سے نفرت کرتے ہیں تو یہ بھی سن لیجیے کہ آپ جس امید میں اس گھر میں اقامت گزیں ہیں، وہ کبھی بھی پوری نہ ہوگی۔ میں ایک ایسے عرب نوجوان سے کس طرح محبت کرسکتی ہوں جس کا ایک ہاتھ ہی ندارد ہو اور پھر ایک ایسا عرب، جس کی رہائش اور کھانے وغیرہ کی ذمے داری باوا جان نے اپنے ذمے لے رکھی ہو۔"

بوران کی باتیں منصور کے دل پر بجلی بن کر گر رہی تھیں۔ نہایت غمزدہ آواز میں بولا۔ "اگر تم یہ چاہتی ہو کہ میں یہاں سے چلا جاؤں تو تمہیں خوش ہونا چاہیے کہ میں یہاں سے صبح شام ہی میں چلا جانے والا ہوں۔"

بوران نے اس طرح طنز کیا کہ منصور کو شرم سی آنے لگی اور اس سے یہ سبق ضرور لیا ہوگا کہ کسی کا احسان مند نہیں ہونا چاہیے۔

منصور نے نہایت ہیرا پھیری کے انداز میں کہا۔ "بوران! شاید تم یقین نہ کرو کہ میں تم لوگوں سے کتنی محبت کرتا ہوں۔"

بوران نے جواب دیا۔ "اور اس کے ساتھ ہی میں اس حقیقت سے بھی واقف ہوں کہ آپ میرے ترک بھائیوں سے شدید نفرت کرتے ہیں۔" منصور بوران کی شکل بڑی بے بسی سے دیکھنے لگا۔

دوسرے دن ترک سردار کے سامنے یہ مقدمہ پیش ہوا کیونکہ منصور نے جانے کی تیاری کرلی تھی اور ترک سردار نے منصور کے اس اچانک فیصلے کو ناگواری اور تعجب کی نظر سے دیکھا تھا۔ وہ منصور سے اس کے اس فیصلے کا پس منظر جاننا چاہتا تھا لیکن منصور، بوران کی شکایت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جب وہ پوچھتے پوچھتے عاجز آگیا تو ایک طرف سے اچانک بوران کی ماں آگئی اور اس نے اپنے شوہر کو مطلع کیا کہ۔

"ایک دن پہلے شام کو بوران اور منصور کی کچھ تلخ کلامی ہو رہی تھی۔ ہوسکتا ہے کہ اسی تلخ کلامی کی وجہ سے منصور نے گھر چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا ہو۔"

ترک سردار نے فوراً اپنی بیٹی کو طلب کرلیا اور اس کے سامنے منصور سے پوچھا۔ "کیا اس سے کوئی تلخی ہوگئی ہے؟"

منصور نے بوران کی طرف دیکھا اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "نہیں۔"

بوران نے منصور کو شرمندہ کیا۔ "عرب نوجوان! جھوٹ نہ بولیے۔ ہم دونوں خوب جانتے ہیں کہ آپ نے یہ گھر چھوڑنے کا اچانک فیصلہ کیوں کیا۔"

منصور نے مشتعل ہوکر ساری روداد ترک سردار کو سنادی پھر بولا۔ "بوران! میں اس لیے خاموش تھا کہ میں تجھ پر کوئی الزام نہیں لگانا چاہتا تھا لیکن میرے اس نیک جذبے کی تو نے کوئی قدر نہ کی اور مجھے جھوٹا کہہ دیا۔"

ترک سردار نے اپنی بیٹی کو ڈانٹا۔ "بوران! کیا اپنے مہمان کو یوں خوار کرنا شرافت کی بات ہے۔ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ کیا تمہیں منصور کے ساتھ اس طرح پیش آنا زیب دیتا ہے اور کیا منصور نے جو کچھ کہا ہے اس میں کچھ غلط بھی ہے؟"

بوران نے جواب دیا۔ "منصور نے جو کچھ کہا، درست ہے لیکن میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ منصور ہمارے گھر میں بیٹھ کر اور رہ بس کر جو ہمارے ہم قوم بھائی ترکوں کی مذمت کرتا رہتا ہے، اس میں یہ کس حد تک حق بجانب ہے۔"

منصور نے جوش میں کہا۔ "ہاں یہ بات میں ترک سردار کے سامنے بھی کہوں گا کہ مجھے اس گھر کے افراد کے علاوہ تمام ترکوں سے نفرت ہے اور مجھ میں یہ نفرت اس وقت تک موجود رہے گی جب تک میں اس دنیا میں موجود ہوں، زندگی کے آخری لمحوں تک، آخری ساعتوں تک۔"

ترک سردار کی پیشانی پر ناگواری سے بل پڑگئے، بوران سے کہا۔ "تو اندر جا۔" پھر اپنی بیوی سے کہا۔ "اور تو بھی، میں اس عرب نوجوان سے چند ضروری باتیں کروں گا۔"

وہ دونوں چلی گئیں تو ترک سردار نے منصور سے کہا۔ "عرب نوجوان! تجھ میں بلا کی عصبیت پائی جاتی ہے اور تو ہر کس و ناکس کے سامنے اپنے دلی خیالات ظاہر کرنے لگتا ہے۔ آخر تیری سمجھ میں یہ معمولی بات کیوں نہیں آتی کہ جس طرح تو عرب قوم کی محبت اپنے دل میں رکھتا ہے اسی طرح ہم ترکوں کو بھی یہ حق پہنچتا ہے کہ اپنی قوم سے محبت کریں۔"

منصور نے جواب دیا۔ "میں اس سے کب منع کرتا ہوں۔"

ترک سردار نے کہا۔ "پھر تو نے بوران کی باتوں کا برا کیوں مانا؟"

منصور نے کہا۔ "مجھے اس کی یہ بات بری لگی کہ اسے میرا اس گھر میں رہنا بالکل پسند نہیں۔"

اسی وقت بوران سامنے آگئی، بیچ میں بول پڑی۔ "بات کو توڑ مروڑ کے مت بیان کرو عرب نوجوان۔" پھر اپنے باپ سے کہا۔ "پوری بات یہ ہے باوا جان کہ اس نے مجھ سے

کہا میں ترکوں سے نفرت کرتا ہوں، اس نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ جب میں کسی ترک کو گھوڑا دوڑاتے دیکھتا ہوں تو میرا دماغی توازن بگڑنے لگتا ہے اور اس وقت یہ حال ہوجاتا ہے کہ اس ترک سوار کو ہلاک کردینے کو جی چاہتا ہے۔" پھر نہایت جوش میں کہنے لگی۔ "اس نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ یہ گھوڑے تلے ترک بچوں کو کچل کر لذت حاصل کرنے کا جویا رہتا ہے۔ اس کی یہ ساری خرافات اور دل آزاریاں میں کس طرح برداشت کرلیتی۔"

ترک سردار یہ ساری باتیں بڑے تحمل سے سنتا رہا، پھر بولا۔ "لیکن جب میں نے تجھے یہ حکم دیا تھا کہ تو اندر جا، پھر تو واپس کیوں آگئی۔ کیا تو اپنے باپ کی حکم عدولی کے نتیجے سے بھی واقف نہیں؟"

بوران نے جواب دیا۔ "اگر مجھے یہ ڈر نہ ہوتا کہ میری عدم موجودگی میں یہ عرب نوجوان غلط بیانی سے کام لے گا تو میں قطعی پاس ہی چھپ کر اس کی باتیں نہ سنتی۔"

ترک سردار نے کہا۔ "اچھا تو کہیں پاس ہی موجود رہ لیکن میرے سامنے سے چلی جا۔"

بوران پھر چلی گئی۔ ترک سردار نے شکایتاً منصور سے کہا۔ "اور تجھے بھی اپنی زبان قابو میں رکھنی چاہیے۔ تو نے جو کچھ کہا میں اسے بھی درگزر کرتا ہوں لیکن میں اب بھی یہی چاہتا ہوں کہ تو میرے ساتھ ہی رہ، کہیں اور مت جا۔"

منصور نے بوران کے بارے میں کچھ عرصے تک یہی رائے قائم کی تھی کہ وہ ایک خاموش طبع سیدھی سادی لڑکی ہے لیکن اب وہ ایک تیز طرار، جوشیلی اور غصہ ور ثابت ہو رہی تھی۔ وہ اس وقت بوران کے بارے میں معلوم نہیں کیا کیا سوچ رہا تھا۔

ترک سردار نے کہا۔ "پھر تو نے کیا فیصلہ کیا؟ میرے ساتھ ہی رہے گا یا کہیں اور چلا جائے گا؟"

منصور نے پوچھا۔ "کیا اس گھر میں میرا مزید رہنا تلخیاں زیادہ نہیں بڑھا دے گا؟"

ترک سردار نے جواب دیا۔ "یہ تلخیاں وقت کے ساتھ ساتھ کم ہوتی چلی جائیں گی۔ جب عرب اور ترک ایک عرصے تک مل جل کر مخلوط زندگی گزاریں گے تو یہ ترک بھی عرب کہلائیں گے۔" پھر پوچھا۔ "کیا عربوں اور ترکوں میں آپس میں شادیاں نہیں ہوں گی؟ اور اگر یہ شادیاں ہوں گی تو کیا ان دونوں کی اولادیں بھی ہماری تمہاری طرح سوچیں گی؟"

منصور نے کہا۔ "شاید نہیں لیکن کیا خود میں ترکوں

جنات اور ان کی اقسام

قرآن مجید میں جن پُراسرار مخلوقات کا ذکر ہوا ہے، ان میں جنات سرفہرست ہیں، مگر ان کی اہمیت یہ ہے کہ ان کے ذکر سے قرآن مجید میں ایک مکمل سورت "جن" کے نام ہی سے موجود ہے۔ روایات کے مطابق انسان کی آبادکاری سے پہلے زمین پر جن آباد تھے۔ جنات کے اجسام شفاف ہوتے ہیں اور یہ ہماری دنیا میں مختلف روپ دھار کر داخل ہوتے ہیں، کالے کتوں، کالی بلیاں، کالی چمگادڑوں اور سانپوں کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں اور بسا اوقات یہ انسانی روپ میں بھی سامنے آتے ہیں اور انسانوں کو ضرر بھی پہنچاتے ہیں، تاہم ان میں سب برے نہیں ہوتے، سورۃ "جن" کی گیارہویں آیت میں جنوں کی زبان سے یہ اعتراف ملتا ہے کہ ہم جنوں میں سے کچھ نیک ہیں اور کچھ بد۔

بعض علما نے جنات کی جو پانچ قسمیں بیان کی ہیں وہ یہ ہیں۔

☆ایک قسم "جان" کہلاتی ہے جو کہ نہایت ضعیف اور بزدل جن ہوتا ہے۔

☆ دوسری قسم "شیطان" کہلاتی ہے جو کہ بری ارواح ہوتی ہیں۔

☆ تیسری قسم "عفریت" کہلاتی ہے، یہ ایک طاقتور بدروح ہوتی ہے۔

☆چوتھی قسم "مرید" اس سے بھی زیادہ طاقتور بدروح ہوتی ہے۔

☆ پانچویں قسم "پریوں" کی ہے جنہیں نیک جن عورتیں کہا جاتا ہے۔

(معجم القرآن۔ ڈاکٹر غلام جیلانی برق)

مرسلہ۔ طالب حسین طلحہ،
ہائی سیکیورٹی زون، نیو سینٹرل جیل ملتان

میں شادی کرسکتا ہوں؟ کیا ترک مجھے قبول کرلیں گے؟"

ترک سردار نے بشاش لہجے میں جواب دیا۔ "ترک تجھے کیوں نہیں قبول کریں گے؟"

منصور نے اپنے غائب ہاتھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میرے اس نقص نے مجھ میں کمتری کا احساس پیدا کردیا ہے۔"

ترک سردار نے کہا۔ "میدانِ جنگ کا یہ عیب، عیب نہیں مردوں کے لیے ان کی عظمت کا نشان ہے۔"

منصور کی زبان سے اچانک نکل گیا۔ "لیکن بوران تو یہ کہتی ہے کہ میرا یہ عیب کسی بھی لڑکی کو مجھ پر مائل نہیں کرسکتا۔"

اسی وقت بوران پھر آگئی، تیز لہجے میں بولی۔ "عرب نوجوان! میں نے یہ نہیں کہا تھا، جو کہا تھا وہی دُہراؤ۔"

ترک سردار کو ہنسی آگئی، بولا۔ "بوران! تو بڑی شریر ہے۔ تو نے تو منصور کا بولنا دشوار کردیا ہے۔ اچھا بتا تو نے کیا کہا تھا اور منصور نے اس میں کتنی ترمیم کردی ہے۔"

بوران نے جواب دیا اور بے باکی سے جواب دیا۔ "میں نے تو یہ کہا تھا کہ تو جس امید میں اس گھر میں رہ رہا ہے وہ کبھی بھی پوری نہ ہوگی اور میں ایک ایسے عرب نوجوان سے کس طرح محبت کرسکتی ہوں جس کا ایک ہاتھ ہی ندارد ہو۔"

ترک سردار نے بوران کو ڈانٹ دیا۔ "لیکن بوران تجھے ایسی بات نہیں کہنی چاہیے تھی۔"

بوران نے جواب دیا۔ "جس طرح اپنے دل کی بات آزادی سے یہ عرب نوجوان کہہ رہا تھا، اسی طرح میں بھی اس کی غلط فہمی دور کردانے میں حق بجانب تھی۔"

ترک سردار نے دونوں کو مخاطب کیا۔ "اچھا اب یہ باتیں بند ہوجانی چاہئیں۔ جہاں تک شادی کا تعلق ہے، بوران کو اس کا اختیار حاصل ہے کہ اپنی مرضی کا اظہار کرے لیکن میں بوران کا باپ ہوں اور مجھے بھی اتنا اختیار حاصل ہے کہ اس کی شادی کسی بھی لولے لنگڑے تک سے کرسکتا ہوں۔"

منصور کے دل میں بوران کے لیے پھر امید کی کرن پیدا ہوگئی۔ بوران یہ کہتی ہوئی چلی گئی۔ "اسلام نے انسان کو انفرادی آزادی بھی تو عطا کی ہے۔ کیا میں اس سے محروم رکھی جاؤں گی؟"

ترک سردار نے منصور سے کہا۔ "تجھے اس نادان اور شریر لڑکی کی باتوں کا برا نہیں ماننا چاہیے۔ اس گھر میں تجھے میں لایا تھا اور میں ہی تجھے رکھنا چاہتا ہوں اور پھر بوران کی کسی بات پر گھر چھوڑ دینا میری سمجھ میں نہیں آتا۔"

منصور پھر مجبور ہوگیا لیکن دوسرے ہی دن یہ انکشاف ہوا کہ خود نافر بھی منصور کو اس حیثیت سے نہیں پسند کرتا، جس حیثیت میں بوران نے اسے مسترد کردیا تھا کیونکہ نافر ایک ترک نوجوان کی حیثیت سے عربوں سے اتنی ہی نفرت کرتا تھا جتنی منصور ترکوں سے لیکن اپنے اس جذبے کا وہ آزادی سے اظہار نہیں کرسکتا تھا۔

منصور، واثق سے ملتا رہا اور ترک سردار بھی واثق سے تعلقات استوار کیے رہا۔ وہ اپنا خالی وقت واثق کی درباراداری میں گزارنے لگا۔ خلیفہ معتصم کا وزیر ابن الزیات ایسے تمام آدمیوں سے حسد رکھتا تھا جو واثق سے ملتے جلتے رہتے تھے۔ ایک دن یہ افواہ گرم ہوگئی کہ معتصم کی طبیعت ناساز ہے۔

قریب دوپہر ایک گھڑسوار نے، منصور کو راستے میں روک لیا، پوچھا۔ "کیا منصور تیرا ہی نام ہے؟"

منصور نے جواب دیا۔ "ہاں منصور میرا ہی نام ہے۔"

گھڑسوار نے پوچھا۔ "اور تو وہی منصور ہے جو مستعین نامی ترک سردار کے ساتھ رہتا ہے اور واثق کی ملازمت میں ہے؟"

منصور نے جھنجلا کر جواب دیا۔ "ہاں، ہاں میں وہی منصور ہوں تو جس کی تفصیل بیان کررہا ہے۔ مجھ سے تیرا کام کیا ہے؟"

گھڑسوار نے پوچھا۔ "تو نے کبھی ابن الزیات سے ملازمت کی خواہش کی تھی؟"

"ہاں کی تھی پھر؟"

گھڑسوار نے خوش ہوکر کہا۔ "خدا تجھے جزائے خیر دے اور خوش حالی اور مسرتوں سے ہمکنار کرے، ابن الزیات نے تجھے یاد کیا ہے اور وہ تجھے کسی اعلیٰ منصب پر فائز کرنا چاہتے ہیں۔"

منصور نے تذبذب سے پوچھا۔ "مجھے ابن الزیات کے پاس کب جانا ہے؟"

گھڑسوار نے جواب دیا۔ "ابھی، اسی وقت۔ میں تجھے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

منصور، واثق کا گواہ تھا اس لیے ابن الزیات سے نہیں ملنا چاہتا تھا لیکن گھڑسوار نے اسے فکرمند دیکھ کر سمجھایا۔ "منصور! نادانی نہ دکھا اور چپ چاپ میرے ساتھ چلا چل کیونکہ ابن الزیات خلافت عباسیہ کا وزیر ہے اور ریاست کے اتنے بڑے آدمی کی دشمنی مول لینا اچھی بات نہیں ہے۔"

منصور نے بھی اسی میں عافیت سمجھی کہ ابن الزیات سے مل ضرور لینا چاہیے اور اس کے پیش کیے جانے والے منصب کو بعد میں مسترد بھی کیا جاسکتا ہے۔ وہ خاموشی سے گھڑسوار کے ساتھ ہولیا اور کچھ ہی دیر بعد وہ ابن الزیات کے روبرو پہنچ گیا۔ اس وقت ابن الزیات کئی آدمیوں میں گھرا بیٹھا تھا اور اس کے چہرے پر درشتی اور غصے کے آثار پائے جاتے تھے۔ وہ منصور کو دیکھتے ہی برس پڑا۔

"او ذلیل نوجوان! تجھے عربوں کے خلاف ایک ترک سردار سے ساز باز کرتے شرم نہیں آتی۔ میں تیری حرکات وسکنات اچھی طرح دیکھ رہا ہوں۔ ہوسکتا ہے اس ترک سردار کی لڑکی بوران نے تیرے دل پر قبضہ کرلیا ہو لیکن ایک لڑکی کی خاطر عربوں کے خلاف سازش کرنا یا اس سازش میں حصہ لینا بڑے افسوس کی بات ہے۔"

منصور نے جواب دیا۔ "میں نے کسی ایسی سازش میں حصہ نہیں لیا جو ترکوں نے عربوں کے خلاف تیار کی ہو اور رہی یہ بات کہ میں ترک سردار مستعین کے ساتھ رہ رہا ہوں، اس پر تجھے کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے کیونکہ جب میں نے تیرا سہارا لینا چاہا تھا تو تو نے میرا ہاتھ جھٹک دیا تھا اور تو جانتا ہے کہ اس وقت امیرالمومنین کے بیٹے واثق نے میرا ہاتھ پکڑلیا تھا۔"

ابن الزیات نے واثق کو بھی برا بھلا کہا، بولا۔ "خدا امیرالمومنین کو صحت یاب کرے۔ میں واثق کو بھی سمجھ لوں گا۔ میں جانتا ہوں کہ وہ میرا بدترین دشمن ہے۔"

منصور نے جواب دیا۔ "ابن الزیات! طاقت کے نشے میں اتنا بے قابو بھی نہیں ہوجانا چاہیے۔ میں کیا، پوری ریاست تیری طاقت اور اختیارات سے باخبر ہے لیکن تجھے بھی یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جو تجھ سے بھی زیادہ طاقت ور گزرے ہیں انہیں بھی خاک بسر ہونا پڑا ہے اور زمانے اور قسمت نے انہیں اتنا ہی خوار بھی کیا ہے جتنا خوش بختی نے انہیں سربلند کیا تھا۔"

"او یک دستی ذلیل وخوار نوجوان تو مجھے نصیحتیں کررہا ہے۔ بخدا! میں تیرا وہ حشر کروں گا کہ جو بھی تجھے دیکھے گا عبرت حاصل کرے گا۔ میں تجھے عبرت کا نمونہ کیوں نہ بنادوں؟" اس کے بعد وہ غصے میں اٹھا اور منصور کے علاوہ دوسرے موجود لوگوں کو بھی اپنے ساتھ چلنے کا حکم دیا، بولا۔ "تم لوگ میرے ساتھ آؤ تاکہ میں تم سب کو وہ جگہ دکھادوں جہاں ایک نہ ایک دن تم سب کو یکے بعد دیگرے فروکش ہونا ہے۔"

منصور اور دوسرے موجود لوگ ابن الزیات کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ ابن الزیات اپنے محل کے بالکل پچھلے حصے میں انہیں لے گیا۔ وہاں ایک گوشے میں ایک کنواں کھدا ہوا تھا۔ ابن الزیات نے ان سب کو حکم دیا۔ "تم سب باری باری اس کنویں میں جھانک کر دیکھو اور مجھے بتاؤ کہ تم نے اس میں کیا دیکھا۔"

باری باری سبھی نے اس کنویں میں جھانک کر دیکھا۔ یہ ایک آدمی کے قد سے ذرا زیادہ گہرا تھا اور اس میں چاروں طرف، دیواروں میں اوپر سے نیچے تک گولائی میں نوکیلی سلاخیں پیوست تھیں۔ سلاخوں کی نوکیں آمنے سامنے تھیں اور یہ لمبائی میں اتنی تھیں کہ اگر اس کنویں میں کسی آدمی کو کھڑا کردیا جاتا تو یہ بالکل اس کے جسم کے مقابل رہتیں۔

ابن الزیات نے سب سے سوال کیا۔ "تم سب نے اس میں کیا دیکھا؟"

ان سب نے جو کچھ دیکھا تھا، باری باری بتادیا۔

ابن الزیات نے کہا۔ "یہ ابھی نامکمل ہے، اس کی تیاری میں کچھ وقت اور لگے گا۔ ابھی اس کی نچلی سطح پر ایک چھوٹا سا چبوترہ بنانا ہے۔ اسے میں نے اپنے مخالفین کے لیے بنوایا ہے۔ میں جسے سزا دوں گا، اسے اس کنویں میں اتار دوں گا۔ وہ اگر دراز قد کا مستحق ہوگا تو وہ اس کنویں کے اندرونی چبوترے پر بیٹھ بھی سکے گا لیکن آرام نہیں کرسکے گا۔ اس کو پشت ٹکانے کا کوئی بھی سہارا حاصل نہ ہوگا اور اگر بدقسمتی سے اس نے اپنی پشت ٹکانی بھی چاہی تو اس کی نوکیلی سلاخیں اس کے جسم میں پیوست ہوجائیں گی اور میرے وہ مخالف، جو میری ذرا سی ہمدردی یا رحم کے مستحق نہیں ہیں انہیں اس میں کھڑا رکھا جائے گا۔ شب وروز چوبیس گھنٹے کھڑے رہیں گے یہاں تک کہ جب ان کی قوت برداشت رخصت ہوجائے گی تو وہ بے بس ہوکر ان سلاخوں پر گرجائیں گے اور یہ سلاخیں ان کا کام تمام کردیں گی۔ ان سلاخوں کو زہر میں بجھا کر تنور میں پوست کیا گیا ہے۔" سبھی خوف ودہشت سے کانپنے لگے۔ ابن الزیات کہتا رہا۔ "تم اسے کنواں کہو یا تنور..... یہ دونوں ہی حالتوں میں موت کا گھر ہے۔ میں اسے تنور ہی کہتا ہوں، موت کا تنور۔ ابھی اس جیسے مجھے معلوم نہیں کتنے تنور بنوانا ہیں۔ اب تم سب کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ میرے پاس سے رخصت ہوکر تمہیں میری مخالفت کرنا ہے یا میری دوستی حاصل کرنا ہے۔"

منصور کے علاوہ سبھی نے بیک آواز جواب دیا۔ "ہمیں تمہاری دوستی عزیز ہے۔"

ابن الزیات نے منصور کو قہر کی نظروں سے دیکھا، گرج کر بولا۔ ''تو تجھے میری دوستی نہیں درکار ہے؟''

منصور نے جواب دیا۔ ''میں تیری دشمنی بھی نہیں چاہتا۔''

ابن الزیات نے کہا۔ ''نہیں، یہ بات نہیں ہے، تو مجھ سے عناد رکھتا ہے۔ ابھی تو میں تجھ سے کچھ بھی نہ بولوں گا، ہاں امیر المومنین ذرا اچھے ہو جائیں پھر میں تیری خیریت معلوم کر دوں گا۔''

منصور نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ''دشمن اگر قوی تو نگہبان قوی تراست۔''

ابن الزیات نے غضب میں پاؤں پٹکنا شروع کر دیے، بولا۔ ''میں جانتا ہوں تو کس کے برتے پر اس طرح اکڑ رہا ہے، امیر المومنین کی علالت نے مجھے محتاط کر رکھا ہے اور میرا موت کا تنور بھی ابھی نامکمل ہے لیکن شاید اس میں اترنے والا تو پہلا بدنصیب ہوگا۔''

منصور نے ابن الزیات کے پاس سے واپس آتے ہی ساری باتیں واثق کے گوش گزار کر دیں۔ اس دن واثق بہت خوش تھا، اس نے منصور سے کہا۔ ''تو صبر سے کام لے اور دیکھ خدا کو کیا منظور ہے۔''

منصور نے کہا۔ ''اگر ابن الزیات کا کوئی علاج نہ ہوا تو یہ ہم میں سے کسی نہ کسی کو اسی موت کے تنور میں اتروا دے گا۔''

واثق نے جواب دیا۔ ''تو اس خبر سے خوش ہوگا کہ میرے امیر المومنین سے تعلقات خوش گوار ہو گئے ہیں۔ آج ہم سب امیر المومنین کے ساتھ دجلہ کی سیر کریں گے، میں تجھے بھی اپنے ساتھ لے چلوں گا کیونکہ ہمیں اپنے ساتھ چند خدمت گاروں کو لانے کی اجازت دے دی گئی ہے۔''

دریائے دجلہ میں بہت ساری کشتیاں رواں دواں تھیں۔ ان میں معتصم کی کشتی سب سے نمایاں تھی۔ اس کشتی میں معتصم کے بیٹوں کے علاوہ خاص خاص خدمت گار اور مغنی بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ دربار کا مشہور زمانہ سازندہ زنام بھی موجود تھا اور واثق کے ساتھ منصور بھی بیٹھا تھا۔ معتصم کشتی کو اپنی مرضی سے چلوا رہا تھا۔ آخر یہ کشتی ایک ایسی جگہ پہنچ گئی جہاں سے معتصم کے باغات اور محلات بہت صاف دکھائی دیتے تھے۔ معتصم انہیں نہایت حسرت و مایوسی سے دیکھتا رہا۔ چند دن پہلے تک ان باغات اور محلات میں اپنائیت سی محسوس ہوتی رہی تھی لیکن اب یہ اجنبی دکھائی دے رہے تھے۔ اب یہ غیر نظر آتے تھے۔ معتصم پر وحشت کا دورہ پڑ گیا۔ اس نے اسی حالت میں اپنی جیب سے ایک پرزہ نکالا اور زنام، سازندہ کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

''زنام! تم یہ کلام گا کر سناؤ شاید یہ میری آخری خواہش ہوگی، اس کے بعد شاید میں اس دنیا میں نہ رہوں۔''

زنام اور دوسرے موجود لوگ بھی زار و قطار رونے لگے۔ زنام نے کلام سنانا شروع کر دیا۔

''اے وہ گھر، جو ابھی ویرانے سے دوچار نہیں ہوا، تو ابھی تک ویرانی سے دوچار ہونے سے مستثنیٰ ہے۔

اے محلات و باغات! میں تمہاری ویرانیوں پر نہیں روتا بلکہ اس پر روتا ہوں کہ میں نے اپنی زندگی تمہاری گود میں گزاری اور افسوس کہ یہ زندگی ختم ہو جائے گی۔

ایک نوجوان جن چیزوں پر روتا ہے، ان میں سب سے میٹھی شے زندگی ہے اور غمزدہ کو تسلی دینا ضروری ہے۔''

اسی وقت کشتی میں معتصم کے پاس جو بھی موجود تھا اسے یقین ہو گیا کہ معتصم کا وقت پورا ہو چکا ہے۔

آخر وہ دن بھی آ گیا جب اس کے کان میں کسی شریر نے یہ خوش خبری سنائی۔ ''امیر المومنین تو انتقال فرمانے ہی والے ہیں۔'' واثق نے ڈانٹا تو کسی قدر خاموشی بھی آ گئی۔

آخر ایک دن معتصم کا انتقال ہو گیا اور عالموں نے معتصم کو مثمن (آٹھ آٹھ والا) قرار دیا۔ یہ عباس بن مطلب کی آٹھویں پشت پر تھا۔ خلیفہ بھی آٹھواں تھا۔ اس کی خلافت آٹھ سال آٹھ ماہ رہی۔ وہ شعبان میں پیدا ہوا تھا جو آٹھواں مہینا ہے۔ اس کے آٹھ لڑکے اور آٹھ لڑکیاں تھیں، اس نے آٹھ جنگیں لڑیں۔''

واثق حصول خلافت میں سرگرداں و پریشان تھا۔ واثق کو چند آدمیوں کی طرف سے یہ شبہ تھا کہ وہ اسے خلیفہ نہیں بننے دیں گے لیکن اس نے ان کی پروا نہیں کی۔ واثق خلیفہ بن گیا۔

کسی نے واثق کی خدمت میں ابن الزیات کے چند اشعار پڑھے۔ ان اشعار میں معتصم کا مرثیہ اور واثق کی مدح موجود تھی۔ واثق کے قریب ترکوں کا ہجوم تھا، ان میں ترک سردار مستعین بھی موجود تھا۔ اس نے ابن الزیات کے اشعار سنانے والے کو حکم دیا۔

''ذرا یہ اشعار بہ آواز بلند تو سنانا۔''

اس شخص نے اونچی آواز میں سنانا شروع کر دیا۔

''جب لوگ تجھے دفن کر کے پانی اور مٹی سے اپنے ہاتھ جھاڑ چکے تو میں نے کہا رخصت ہو چکا کیونکہ تو دنیا اور دین دونوں کے لیے بڑا اچھا مددگار تھا۔

خدا اس امت کی نگہبانی کرے گا جو تجھ (معتصم)

جیسے کو کھو کر ہارون (واثق) جیسے خلیفہ کو پیدا کرے۔''

ترک سردار نے زور سے کہا۔ ''یہ اس شخص کے اشعار ہیں جو منافق ہے اور جس نے ایک مرتبہ امیر المومنین کو بہت شرمندہ کیا تھا۔''

منصور نے کہا۔ ''اگر مجھے کچھ کہنے کی اجازت عطا ہو تو میں بھی کچھ کہوں۔''

واثق نے کہا۔ ''کہہ، کہہ کیا کہنا چاہتا ہے تو، ذرا میں بھی تو سنوں۔''

منصور نے کہا۔ ''ابھی چند دن پہلے ابن الزیات نے مجھے موت کا تنور دکھایا تھا۔ وہ اس قسم کے اور بہت سارے تنور بھی بنوانا چاہتا ہے۔ اس تنور میں چاروں طرف نوکیلی سلاخیں نکلی ہوئی ہیں۔ وہ اس تنور کو اپنے مخالفین کو دکھا کر ڈراتا اور دھمکاتا رہتا ہے۔''

واثق نے حکم دیا۔ ''ابن الزیات کو حاضر کیا جائے۔''

لیکن اسی دوران اس نے دس ایسے لائق آدمیوں کو جمع کر لیا۔ جن کی لیاقت مشہور تھی۔ واثق نے انہیں ایک مضمون سمجھا کر حکم دیا کہ وہ سب الگ الگ اپنے اپنے انداز میں اس مضمون کو تحریر کریں۔

ان سب نے ذرا دیر بعد جب اپنے اپنے لکھے ہوئے کاغذ واثق کی خدمت میں پیش کیے تو اس نے باری باری انہیں پڑھ کر منہ بنایا۔ اسے ان میں سے کسی ایک کی بھی تحریر پسند نہ آئی۔

واثق باتوں میں مشغول ہو گیا۔ کچھ دیر بعد اسے مطلع کیا گیا کہ ابن الزیات حاضر ہے، اجازت ہے تو پیش کر دیا جائے۔

واثق نے حکم دیا۔ ''حاضر کیا جائے۔''

واثق کا حاجب (سیکریٹری) اٹھا اور ابن الزیات کو بلا لایا۔ اس نے کپکپاتی آواز میں خلیفہ کو سلام کیا۔ واثق نے بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گیا لیکن وہ کانپ رہا تھا اور خوف نے اس کی آنکھوں کا نور چھین لیا تھا، اس نے ڈر کے مارے درباریوں کو بھی نہیں دیکھا۔

واثق نے اپنے خادم کو حکم دیا۔ ''میرا وہ عہد نامہ حاضر کر جس کا ابن الزیات سے تعلق ہے۔''

ابن الزیات کے رہے سہے ہوش بھی جاتے رہے۔ آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ واثق نے ترک سردار اور منصور سے بطورِ خاص کہا۔ ''اور تم دونوں ابھی یہیں رہنا کیونکہ میں نے اس عہد نامے میں تم دونوں کو شاہد بنا رکھا ہے۔''

ابن الزیات کی بے بسی اور خوف کو دیکھ کر درباری بہت خوش ہو رہے تھے کیونکہ ان میں ایک بھی ایسا نہ تھا جسے ابن الزیات سے کبھی نہ کبھی تکلیف نہ پہنچی ہو۔ کچھ دیر بعد خادم وہ عہد نامہ لے آیا، واثق نے یہ عہد نامہ ابن الزیات کے سامنے رکھ دیا اور حکم دیا۔

''اسے بلند آواز میں پڑھ کر سنا۔''

ابن الزیات کانپتی ہوئی آواز میں عہد نامہ پڑھنے لگا۔ درباریوں کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے۔

جب وہ عہد نامہ پڑھ چکا تو واثق نے درشت لہجے میں پوچھا۔ ''کیا تو نے اس دن میرے باپ کو وہ رقم دینے سے منع نہیں کر دیا تھا؟''

ابن الزیات میں انکار کی سکت ہی نہیں تھی، روتے ہوئے جواب دیا۔ ''امیر المومنین! میں تو آپ کا غلام ہوں، اگر آپ مجھے سزا دیں تو اس کا آپ کو پورا اختیار حاصل ہے اور اگر آپ اپنی قسم کا کفارہ ادا کر کے مجھے زندہ رکھیں تو یہ آپ کی شان کے زیادہ مطابق ہوگا۔''

واثق نے اپنے حاجب سے پوچھا۔ ''تو کیا کہتا ہے؟''

حاجب نے جواب دیا۔ ''امیر المومنین ہی کوئی فیصلہ فرمائیں گے۔''

واثق نے وہی مضمون جو دس لائق آدمیوں سے لکھوا چکا تھا، ابن الزیات کے حوالے کیا، بولا۔ ''اسے اپنے طور پر لکھ، میں تیری وہ لیاقت دیکھنا چاہتا ہوں جس نے میرے باپ معتصم کو تجھ پر فریفتہ کر رکھا تھا۔''

ابن الزیات نے ذرا سی دیر میں اس مضمون کو نہایت خوب صورت پیرائے میں لکھ ڈالا۔

واثق اسے پڑھنے لگا اور ابن الزیات کی نظریں واثق کے چہرے کا نہایت ذوق و شوق سے جائزہ لیتی رہیں۔ وہ واثق کے دل میں اتر کے اس کے ارادے کا پتا چلانا چاہتا تھا۔

مضمون پڑھ چکنے کے بعد واثق نے داد و تحسین کی نظروں سے ابن الزیات کی طرف دیکھا پھر حاضرین سے کہا۔ ''لوگو! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس شخص کو کس طرح قتل کروں جس کی تحریر اور اسلوب نگارش نے مجھے پہلے ہی قتل کر دیا۔ میں حیران تھا کہ میرے والد معتصم نے اس شخص کو اتنا عزیز کیوں رکھا تھا لیکن اب میں خود بھی اس کے مداحوں میں شامل ہو گیا ہوں۔'' پھر حاجب سے بطورِ خاص کہا۔ ''حکومت اس شخص کی محتاج ہے، میں کیا کر سکتا ہوں۔''

واثق کے اس فیصلے نے ابن الزیات کے مخالفین کو مایوس کر دیا۔ ترک سردار نے منصور سے سرگوشی میں کہا۔ ''بخدا میں اس کا قائل ہو گیا کہ تقدیر بھی کوئی چیز ہے

اور ہر شخص اپنی عمر عالم بالا سے لکھوا کر لایا ہے۔"

منصور نے مایوسی سے کہا۔ "اب تو یہ اپنے مخالفین سے اچھی طرح انتقام لے گا۔"

ابن الزیات ایک مرتبہ پھر اختیار و اقتدار کی کرسی پر متمکن ہوگیا۔ واثق کی نظر میں ترک سب سے زیادہ لائق اعتبار تھے۔ منصور یہ سوچ سوچ کر مایوس ہوتا چلا جارہا تھا کہ وقت اور زمانہ ترکوں کے موافق ہے اور شاید عربوں کا ستارۂ اقبال اس آب و تاب سے کبھی بھی طلوع نہ ہو سکے جیسا کہ دورِ بنوامیہ میں طلوع ہو چکا تھا۔ ترک سردار، واثق کے دربار میں پہلے سے زیادہ اثر رسوخ کا مالک بن چکا تھا۔ نافر اس سے لاتعلق رہنے لگا اور بوران اس سے بہت کم بات کرتی تھی۔

ماحول کی یکسانیت سے اکتا کر منصور نے ترک سردار سے اجازت طلب کی، بولا۔ "معزز ترک سردار! میں کچھ عرصے کے لیے سامرا سے باہر جانا چاہتا ہوں۔"

ترک سردار نے پوچھا۔ "باہر کہاں؟ کیا سامرا میں تیرا دل نہیں لگ رہا؟"

منصور نے جواب دیا۔ "دراصل میں یکسانیت سے عاجز آگیا ہوں اس لیے چاہتا ہوں کہ ذرا آب و ہوا بدل ڈالوں۔"

ترک سردار نے پوچھا۔ "کہاں، یمن جاؤ گے؟"

"ہاں، یمن جاؤں گا اور وہاں غالباً ایک سال تک رہوں گا۔"

ترک سردار نے افسوس سے کہا۔ "اگر تو جانا ہی چاہتا ہے تو میں تجھے نہیں روکوں گا لیکن اگر نہ جاتا تو بہتر تھا۔"

نافر بھی اس گفتگو میں شریک ہوگیا، پوچھا۔ "ایک دم یمن کا خیال کس طرح آگیا؟"

منصور نے جواب دیا۔ "میں ایک تو جلی انسان ہوں۔ واثق کے برسراقتدار آنے سے پہلے یہ سوچا کرتا تھا کہ شاید کسی دن معتصم کے بعد کوئی ایسا انقلاب آجائے کہ ریاست و خلافت میں عربوں کا عمل دخل زیادہ ہو جائے لیکن میں تو اب یہ دیکھ رہا ہوں کہ جو کچھ ہو رہا ہے، امید کے خلاف ہو رہا ہے اور تو اور ابن الزیات جیسا گناہ گار تک آزاد اور پہلے سے زیادہ اختیار و اقتدار کے ساتھ زندہ ہے۔"

نافر نے تند و تیز لہجے میں کہا۔ "تو یہ کیوں نہیں کہتا کہ یہاں تو جس مقصد سے آیا تھا، اس میں ناکامی ہوئی اس لیے واپس چلا جانا چاہتا ہے۔"

ترک سردار نے نافر کو تند و تیز گفتگو کرنے سے منع کیا۔ "میں نہیں چاہتا کہ جس شخص کو میں نے عزیز کی طرح اپنے ساتھ رکھا، اب اس کو بدمزگی سے رخصت کیا جائے۔"

منصور نے کہا۔ "نافر! میں واپس آؤں گا۔ اگر یہاں تک آنے میں میرا کوئی مقصد کارفرما تھا تو وہ عارضی طور پر چلے جانے سے مر نہیں جائے گا۔"

ترک سردار نے نافر کو ہٹا دیا، بولا۔ "نافر! تو یہاں سے چلا جا، میں اس سے خود ہی باتیں کرلوں گا۔"

نافر منہ بناتا ہوا چلا گیا۔ ترک سردار نے کہا۔ "اب تو، تو یہاں سے جا ہی رہا ہے۔ اب ہم ترکوں کے لیے بہترین دور آیا تھا۔ میں تجھے کسی اعلیٰ منصب پر فائز کروا سکتا تھا۔ تو اپنی خوش قسمتی سے واثق تک پہنچ گیا تھا لیکن جب واثق نے اقتدار سنبھالا تو دوسرے خوشامدی آگے بڑھ گئے اور تو سب سے پیچھے رہ گیا حالانکہ اگر تو چاہتا تو اس وقت نہایت اہم شخص ہوتا۔"

منصور نے سرد مہری سے کہا۔ "ترک سردار! کسی شخص کو اگر اس کی زندگی کا مقصد نہ حاصل ہو سکے تو وہ خوش نہیں رہ سکتا۔"

ترک سردار نے کہا۔ "اپنا مقصد مجھے بتا، میں شاید تیری مدد کر سکوں۔"

منصور نے کسی قدر تامل سے جواب دیا۔ "اپنا مقصد بتا تو سکتا تھا لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ سے میں اسی وقت تک قریب ہوں اور ہمارے تعلقات خوشگوار ہیں جب تک کہ میں خاموش رہتا ہوں۔"

ترک سردار نے کہا۔ "حالانکہ یگانگت کا تقاضا یہی تھا کہ تو مجھے اپنے اعتماد میں لیتا لیکن اگر کسی وجہ سے تو اپنے دل کا راز نہیں بتانا چاہتا تو تیری مرضی، میں مجبور نہیں کروں گا۔"

منصور نے انتہائی مایوسی سے کہا۔ "اور پھر میں نے اس گھر میں آپ کے سوا شاید کبھی کو خود سے بے زار دیکھا ہے۔"

ترک سردار نے ذرا بگڑ کر جواب دیا۔ "عرب نوجوان! تو جہاں اور جس خاندان میں بھی جائے گا وہاں بھی لوگ تجھ سے اچھی طرح نہیں پیش آئیں گے۔ جب میں تیری عزت کرتا رہا ہوں تو تجھے کسی اور کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔"

منصور خاموش رہا۔ ترک سردار کچھ دیر تک منصور کے جواب کا منتظر رہا، آخر خود ہی بولا۔

"میں ایک باپ اور ترکوں کا عزت دار سردار ہونے کے باوجود تجھ پر ایک انکشاف کر رہا ہوں، جو تجھے چونکا دے گا اور میری یہ بات جس کے علم میں بھی آئے گی چونک پڑے گا۔ یہاں تک کہ میرے گھر کے افراد بھی اسے ناپسند کریں گے۔"

منصور اس کی صورت دیکھتا رہ گیا۔ ترک سردار نے تکلیف دہ لہجے میں کہا۔ "افسوس کہ تو ضرورت سے زیادہ سرد واقع ہوا ہے اور ایسا کیوں ہے میں اس کا سبب تم سے زیادہ جانتا ہوں۔" پھر ذرا خاموش رہنے کے بعد کہنے لگا۔ "تو مجھ سے یہ پوچھ ہی سکتا تھا کہ میں کون سا انکشاف کرنے والا ہوں لیکن تو نے یہ بھی نہیں پوچھا۔ خیر، میں پھر بھی بتا رہا ہوں میں نے یہ محسوس کر کے کہ تو بوران سے محبت کرنے لگا ہے لیکن بوران تجھے ناپسند کرتی ہے، میں بوران کی تجھ سے شادی کر دینے پر آمادہ ہو گیا تھا۔"

منصور واقعی چونک پڑا اور حیرت اور اشتیاق سے ترک سردار کی صورت دیکھنے لگا۔

ترک سردار کہتا رہا۔ "لیکن تو نے یہ فیصلہ کر کے مجھے مایوس کر دیا ہے کہ تو یمن جا رہا ہے۔ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ تو پھر واپس بھی آئے گا یا نہیں، اس لیے بوران کی بابت کچھ کہہ بھی نہیں سکتا۔"

منصور بے لہجے میں بولا۔ "لیکن آپ بوران کو اس کی مرضی کے بغیر مجھ سے کیوں وابستہ کر دینا چاہتے تھے اور مجھ پر آپ کی غیر معمولی عنایات اور مہربانیوں کی وجہ کیا ہے؟"

ترک سردار نے جواب دیا۔ "تو یمن سے واپس آجا پھر اس کا سبب بھی بتا دوں گا۔"

اس موقعے پر بوران نے بھی اس سے بات کی، خلافِ معمول اس نے منصور سے خوش اخلاقی سے بات کی۔ اس نے کہا۔ "تو نے واپس جانے کا فیصلہ کر کے دانش مندی کا ثبوت دیا ہے۔ اس پر سب سے زیادہ میں خوش ہوں۔"

منصور نے جواب دیا۔ "اور میں بھی محض تجھے خوش کرنے کے لیے ہی یہاں سے جا رہا ہوں۔"

بوران نے پوچھا۔ "واپس آؤ گے؟"

منصور نے جواب دیا۔ "پہلے تو واپس آنے کا ارادہ تھا لیکن اب شاید واپس نہ آؤں۔"

"وہ کیوں؟"

"اس لیے کہ میری واپسی کو تو پسند نہیں کرتی۔"

بوران نے کہا۔ "میرا خیال اپنے دل سے نکال دے اور شوق سے واپس آجا۔" منصور نے کوئی جواب نہ دیا۔ دوسرے دن علی الصباح منصور نے سامرا کو چھوڑ دیا۔

☆☆☆

ابن الزیات کو جب یہ معلوم ہوا کہ منصور سامرا سے چلا گیا ہے تو اسے افسوس ہوا۔ وہ ترک سردار اور منصور کا اس دن سے دشمن ہو رہا تھا جس دن اس پر یہ انکشاف ہوا تھا کہ یہ دونوں ابن الزیات اور واثق کے معاملے میں شاہد تھے۔ وہ ان دونوں کے خلاف کسی موقعے کی تلاش میں تھا۔ جب ترک سردار کی زبانی اسے یہ معلوم ہوا کہ منصور یمن چلا گیا تو اسے ایک موقع ہاتھ آگیا۔ اس نے واثق کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ ترک سردار نے عرب نوجوان کے خلاف سازش کی ہے اور اپنی بیٹی بوران اور منصور کے معاشقے پر پردہ ڈالنے کے لیے منصور کو راہ سے ہٹا دیا ہے۔ واثق نے اس معاملے میں خاصی دلچسپی لے لی۔

ترک سردار نے ابن الزیات کو سمجھایا اور کہا۔ "ابن الزیات! تو لوگوں کے معاملات میں فضول دخل اندازی مت کر۔ تو ایک بار قتل ہوتے ہوتے بچ چکا ہے، میرا مشورہ مان اور لوگوں کی دشمنیاں مت مول لے۔"

ابن الزیات نے درشتی سے جواب دیا۔ "ترک سردار! کیا یہ بات غلط ہے کہ منصور تیری بیٹی بوران سے عشق کرتا تھا اور تو نے اسے غیرت و حمیت میں اپنی راہ سے ہٹا دیا ہے۔"

ترک سردار غصے میں بولا۔ "کیا تو یہ کہنا چاہتا ہے کہ میں نے منصور کو ہلاک کروا دیا ہے؟"

"میں یہ کہنا نہیں چاہتا بلکہ یہ ایک حقیقت ہے جسے تو نے لوگوں سے چھپا رکھا ہے۔"

"یہ غلط ہے۔" ترک سردار نے غصے میں کہا۔ "بلکہ میں تو بوران کی اس سے شادی کر دینا چاہتا تھا حالانکہ میں یہ بھی جانتا تھا کہ بوران اسے پسند نہیں کرتی تھی۔ میرے دل میں منصور کے لیے بڑی محبت تھی۔"

ابن الزیات نے ترش لہجے میں کہا۔ "یہ سراسر جھوٹ ہے۔ کیا تو وہ سبب بتائے گا جس کی وجہ سے تو بوران کو منصور سے وابستہ کر دینا چاہتا تھا؟"

ترک سردار نے جواب دیا۔ "افسوس کہ میں وہ سبب نہیں بتا سکتا۔"

ابن الزیات نے طنزیہ ہنستے ہوئے کہا۔ "تب پھر اس معاملے میں امیر المومنین کا فرمان بھی سن لے۔" اس کے بعد ابن الزیات اٹھا اور اپنے کاغذات کھنگالنے لگا۔ کچھ دیر بعد ایک پروانہ ترک سردار کے حوالے کر دیا۔ یہ فرمانِ خلافت تھا جو ترک سردار کے نام جاری کیا گیا تھا۔ اس میں ترک سردار کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ اپنے عرب مہمان منصور کو ابن الزیات کی خدمت میں حاضر کرے کیونکہ خلافت کو باوثوق ذرائع سے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ منصور کو قتل کیا جا چکا ہے۔ آخر میں ترک سردار کو یہ حکم بھی دیا گیا تھا کہ

جب تک منصور نہ مل جائے ترک سردار اپنی بیٹی بوران کی شادی نہیں کرسکتا۔

ترک سردار کو سکتہ سا ہوگیا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ وہ ابن الزیات کو کیا جواب دے۔

ابن الزیات نے سختی سے کہا۔ ”فرمانِ خلافت سن لیا، اب خبردار جو تونے بوران کی کسی سے شادی کی۔“

ترک سردار اداس اور مضمحل گھر پہنچا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ اب کیا کرے۔ اس نے سوچا کہ یمن جا کر منصور کو تلاش کیا جائے یا پھر اس کی واپسی کا انتظار کیا جائے۔ دونوں تجویزوں میں سے کوئی ایک بھی سمجھ میں نہ آتی تھی۔

اس واقعے کو کئی سال گزر گئے، منصور واپس نہیں آیا۔ اس دوران کئی ترک نوجوانوں نے بوران سے شادی کی درخواست کی لیکن ترک سردار بات ٹالتا رہا، یہاں تک کہ گھر کے سبھی لوگ ترک سردار کی اس انکاری روش سے تنگ آگئے۔ لوگ اس سے انکار کا سبب پوچھتے مگر وہ نہ بتا پاتا۔

اسی دوران بوران ایک ترک نوجوان پر مائل ہوگئی اور ان دونوں میں محبت اتنی زیادہ پروان چڑھی کہ دونوں کا ایک دوسرے کے بغیر جینا محال ہوگیا۔ ترک سردار اس عمل کو خاموشی سے دیکھتا رہا۔ اس کی حیثیت بڑی نازک تھی۔ وہ اگر دونوں کو منع کرتا تھا تو یہ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس امتناع کا سبب کیا بتائے اور اگر دونوں کو ان کے حال پر چھوڑتا تو اس کا انجام سمجھ میں نہ آتا تھا۔

آخر ایک دن ترک سردار کی بیوی نے بوران کی وکالت کی، بولی۔ ”جب بوران نے اس ترک نوجوان کو پسند کرلیا ہے تو تمہیں شادی کرنے میں کیا تامل ہے؟“

ترک سردار نے درشتی سے جواب دیا۔ ”تو بوران کو سمجھا دے کہ اس کی شادی نہیں ہوسکتی۔“

ماں نے بھی سختی اختیار کی، بولی۔ ”آخر بوران کی شادی کیوں نہیں ہوسکتی؟ مجھے بھی تو وہ سبب معلوم ہونا چاہیے۔“

ترک سردار نے جواب دیا۔ ”میں منصور کا انتظار کررہا ہوں جب تک وہ واپس نہیں آجاتا بوران کی شادی نہیں ہوسکتی۔“

ماں نے آگ بگولا ہوکر کہا۔ ”تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ تم اب بھی اس ٹھڈے نوجوان عرب پر مائل ہو۔ میں بھی بوران کی ماں ہوں اور اپنا یہ فیصلہ سنانے پر مجبور ہوں کہ منصور میری بیٹی کا شوہر نہیں بن سکتا۔“

”تو میری باتوں کا غلط مطلب مت لے۔ مجھے پہلے یہ نہیں معلوم تھا کہ منصور میرے خاندان کے حق میں اتنی بڑی مصیبت ثابت ہوگا۔“

ماں نے پھر بیٹی کی طرف داری کی۔ ”مجھے بوران کی خوشی عزیز ہے اور تم جو چاہو کرو، میں بوران کی شادی اس کے پسندیدہ ترک نوجوان سے ضرور کروں گی۔“

ترک سردار نے بیوی کو ڈانٹ دیا۔ ”تو مجھے پریشان نہ کر، میں نے جب یہ کہہ دیا کہ جب تک منصور واپس نہ آجائے، بوران کی شادی نہیں ہوسکتی تو تمہیں خاموش ہوجانا چاہیے۔“

ماں تو چپ ہوکر چلی گئی لیکن بوران، باپ سے بات کرنے آگئی، آتے ہی پوچھا۔ ”باواجان کیا آپ اب بھی اسی ٹھڈے سے لو لگائے ہوئے ہیں؟“

ترک سردار نے جواب دیا۔ ”نہیں تو بیٹی، یہ تونے کس طرح سمجھ لیا؟“

بوران نے سختی سے کہا۔ ”باواجان! میری شادی کسی سے بھی ہو لیکن یہ میرا اٹل فیصلہ ہے کہ میں اس ٹھڈے سے ہرگز شادی نہ کروں گی۔ مجھے اس سے نفرت ہے۔“

ترک سردار نے بوران کو اپنے برابر ہی بٹھا لیا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ”بیٹی بوران! میں تجھ سے بہت شرمندہ ہوں۔ تجھے نہیں معلوم کہ اس منصور نے مجھے کتنا پریشان کیا ہے۔ خدا کی قسم اب تو میں نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ میں تیری شادی کسی سے بھی کرسکتا ہوں لیکن اگر نہیں کرسکتا تو وہ منصور ہے۔ میں منصور سے تیری شادی اب تو کر ہی نہیں سکتا۔“

لیکن بوران کو اپنے باپ کی باتوں پر یقین نہیں آیا، بولی۔ ”باواجان! اب آپ کو منصور کا انتظار کیوں ہے؟“

ترک سردار نے جواب دیا۔ ”بوران! کچھ ایسی بات ہے جس کا میں تیرے سامنے ذکر نہیں کرسکتا۔“

پھر ترک سردار نے قرآن پاک ہاتھ میں لے کر قسم کھائی۔ ”تجھے یقین دلانے کے لیے میں قسم کھاتا ہوں کہ تو جس سے کہے گی تیری شادی اس سے کی جائے گی لیکن شادی اسی وقت ہوگی جب منصور مل جائے گا۔“

بوران باپ کے پاس سے ہٹ کر ایک گوشے میں جا کر آنسو بہانے لگی۔

☆☆☆

منصور نہیں آیا اور نہ واپس آنے کی امید ہی باقی رہی۔ بوران کی بے بسی اس سے دیکھی نہ جاتی تھی۔ کئی بار اس کے جی میں آئی کہ وہ اس معاملے میں امیرالمومنین سے رحم کی درخواست کرے لیکن ہمت نہ پڑی۔ آخر ابن الزیات ہی پر نظر پڑی کہ اس سے اس سلسلے میں سفارش کروائی جائے۔ خواہ رشوت ہی کیوں نہ دینی پڑے۔

جب وہ ابن الزیات کے پاس پہنچا تو ایک بار پھر یہ منظر دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ابن الزیات اپنے خوشامدیوں میں گھرا بیٹھا ہے اور اس کے سامنے امیرالمومنین خلیفہ واثق کا چھوٹا بھائی جعفر عام آدمیوں کی طرح کھڑا ہوا ہے۔ ابن الزیات نے خلیفہ کے بھائی جعفر کو ایک نگاہ غلط انداز سے دیکھا اور اپنے کاغذات میں مشغول ہوگیا۔ ترک سردار کو اس بے التفاتی سے بڑی وحشت سی ہوئی۔ کچھ دیر بعد ابن الزیات نے خلیفہ کے بھائی جعفر سے پوچھا۔

”کیا بات ہے، تو یہاں کیوں آیا ہے؟“

جعفر نے جواب دیا۔ ”مجھ سے امیرالمومنین ناراض ہوگئے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ تو امیرالمومنین سے میری طرف سے درخواست کر کہ وہ مجھ سے خوش ہوجائیں۔“

ابن الزیات نے اپنے حاشیہ نشینوں کی طرف دیکھتے ہوئے طنزاً کہا۔ ”حضرات! ملاحظہ فرمایا؟ اس نے پہلے تو اپنے بھائی کو ناخوش کردیا اور اب چاہتا ہے کہ امیرالمومنین اس سے دوبارہ خوش ہوجائیں۔“ پھر جعفر کو ڈانٹنا شروع کردیا۔ ”جا بھاگ جا اور خبردار جو پھر آنے کی کوشش کی۔“

جعفر نے کہا۔ ”ابن الزیات! تو امیرالمومنین کے مزاج میں بڑا رسوخ رکھتا ہے اس لیے اگر تو چاہے گا تو وہ مجھ سے راضی ہوجائیں گے۔“

ابن الزیات نے بدستور درشتی سے جواب دیا۔ ”میرے چاہنے یا نہ چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا، تو اپنی اصلاح کر اور ناراضی کی وجوہ دور کر، امیرالمومنین خود راضی ہوجائیں گے۔“

اس کے بعد ابن الزیات، ترک سردار کی طرف رجوع ہوا، پوچھا۔ ”تو یہاں کیا لینے آیا ہے؟“

ترک سردار نے جواب دیا۔ ”ابن الزیات! خدا کے غضب سے ڈر، کسی کے تو کام آجایا کر۔“ پھر جعفر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ امیرالمومنین کے بھائی ہیں، تو نے ان کا تو احترام کیا ہوتا۔“

ابن الزیات نے دھمکی دی۔ ”ترک سردار! تو نے ایک جرم تو پہلے ہی کر رکھا ہے۔ اب دوسرا یہ کررہا ہے کہ خلافت کے ان معاملات میں دخل دے رہا ہے جو تیری ذات سے تعلق نہیں رکھتے۔ میرا تیرے لیے یہ آخری مشورہ ہے کہ تو کسی بھی طرح منصور نامی عرب نوجوان کو حاضر کر، ورنہ تیرے خلاف بھی کوئی سخت کارروائی کی جائے گی۔“

ترک سردار اور جعفر ایک ساتھ واپس آئے۔ راہ میں جعفر نے کہا۔ ”مستعین! تو نے ابن الزیات کا رویہ دیکھا۔ کیا اسے میرے ساتھ اس طرح پیش آنا چاہیے تھا؟“

ترک سردار نے جواب دیا۔ ”جناب! میں کیا کہہ سکتا ہوں، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس نے ایک بار امیرالمومنین کے دورِ ولی عہدی میں ان سے بھی اہانت آمیز سلوک کیا تھا اور انہوں نے دو آدمیوں کی گواہی میں یہ عہد کیا تھا کہ جب وہ خلیفہ بنیں گے تو اس ابن الزیات کو قتل کردیں گے لیکن ہوا یہ کہ انہوں نے خلیفہ بننے کے ایک ماہ کے اندر اندر ابن الزیات کو اپنا وزیر بنا لیا۔“

جعفر نے پریشان ہوکر ادھر ادھر دیکھا، خوف زدہ آواز میں کہا۔ ”کہیں ہماری یہ باتیں ابن الزیات کے کانوں تک نہ پہنچ جائیں۔“

ترک سردار نے جواب دیا۔ ”میں اس سے نہیں ڈرتا کیونکہ میں اس حقیقت سے واقف ہوں کہ ہم ترکوں کے بل بوتے پر خلافتِ عباسیہ کی عمارت کھڑی ہے۔“

جعفر نے پوچھا۔ ”کیا تو میری مدد کرسکتا ہے؟“

ترک سردار نے پوچھا۔ ”کس کے خلاف؟“

جعفر نے گھبرا کر جواب دیا۔ ”کس کا نام لوں، شاید ابن الزیات کے خلاف۔“

ترک سردار نے کہا۔ ”لیکن مشکل یہ ہے کہ جب آپ برسرِ اقتدار آجائیں گے تو آپ بھی ابن الزیات ہی کو وزیر بنالیں گے۔“

ادھر یہ باتیں ہورہی تھیں اور دوسری طرف ابن الزیات واثق کو ایک خط لکھ رہا تھا۔

”یا امیرالمومنین! جعفر بن معتصم میرے پاس آئے تھے اور یہ درخواست کررہے تھے کہ میں امیرالمومنین سے ان کی سفارش کردوں کہ آپ ان سے راضی ہوجائیں۔ امیرالمومنین! میں حلفیہ عرض کررہا ہوں کہ اس وقت جعفر بن معتصم کی سج دھج بالکل ہیجڑوں جیسی تھی۔ ان کے لمبے لمبے بال گردن تک لٹک رہے تھے۔ اس کے علاوہ ترک سردار مستعین بھی اسی وقت حاضر ہوا تھا۔ اس نے ابھی تک منصور نامی عرب نوجوان کو حاضر نہیں کیا۔ جعفر بن معتصم، ترک سردار کے ساتھ ہی میرے پاس سے رخصت ہوئے تھے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ امیرالمومنین کے بھائی اس ترک سردار سے مل کر کوئی سازش نہ کررہے ہوں۔“

واثق نے ابن الزیات کو فوراً جواب دیا۔ ”جعفر کو اسی

وقت اپنے پاس بلا بھیج اور حجام کو بلوا کر اس کے بال کٹوا دے اور پھر کسی کو حکم دے کہ جعفر کے بالوں کو اس کے منہ پر کھینچ مارے۔ اس کارروائی سے پہلے ترک سردار کو بھی بلوانے اور مناسب ہوگا کہ یہ ساری کارروائی اس ترک سردور کے روبرو عمل میں لائی جائے اور اس دوران نہایت ہوشیاری سے ترک سردار کے چہرے کا جائزہ لیتا رہ اور جو کچھ اس کے چہرے پر محسوس کر، اس سے مجھے مطلع کر۔ ترکوں کے سلسلے میں ہماری روش اچھی طرح ذہن نشین کرلے۔ ہم ان سے بگاڑ نہیں پسند نہیں کرتے۔ ہاں تو اپنے طور پر اس سے منصور کی بابت پوچھ کچھ کرتا رہ لیکن سختی ہرگز نہ کرنا۔"

☆☆☆

جب بوران اور اس کی ماں کا دباؤ زیادہ بڑھا تو اس نے بدرجۂ مجبوری انہیں سب کچھ بتا دیا۔ دونوں کا صدمے سے چہرہ ستّ گیا۔ بیوی نے پوچھا۔ "اب کیا ہوگا؟"

ترک سردار نے جواب دیا۔ "میں کوشش کروں گا کہ امیرالمومنین اپنے اس فرمان کو واپس لے لیں۔"

بوران نے پوچھا۔ "کیا ہم اس عرب نوجوان کو تلاش کرکے حاضر نہیں کرسکتے؟"

ترک سردار نے جواب دیا۔ "میرا خیال تھا کہ وہ واپس ضرور آئے گا لیکن وہ نہیں آیا۔ میں اسے تلاش کروا کے حاضر بھی کرسکتا ہوں لیکن یہ ذرا پیچیدہ عمل ہے۔ میں مختلف ذرائع سے یہ کوشش کر رہا ہوں کہ امیرالمومنین کو ان کے فرمان کی منسوخی پر آمادہ کرلوں۔ اگر میں اس میں ناکام ہوگیا تو منصور کو ضرور تلاش کرواؤں گا۔"

انہی باتوں کے دوران ابن الزیات کا آدمی آگیا اور بتایا کہ وہ ترک سردار کو اسی وقت بلا رہا ہے۔ ترک سردار خوب جانتا تھا کہ ابن الزیات کا یہ بلاوا کوئی معنی رکھتا ہے۔ اس نے بیوی اور بیٹے نافر کو ہدایت کی کہ اگر اس کی واپسی میں دیر ہوجائے تو وہ فوراً ابن الزیات کے پاس آدمی بھیج کر خیریت معلوم کرلیں۔

جب ترک سردار ابن الزیات کے پاس پہنچا تو وہ بہت خوش دکھائی دیا۔ اس نے خوش اخلاقی سے کہا۔ "ترک سردار! تم آگئے، مجھے تمہارا بڑا انتظار تھا۔"

ترک سردار نے پوچھا۔ "خیریت تو ہے، کیا امیرالمومنین نے میرے بارے میں کوئی خاص ہدایت فرمائی ہے؟"

ابن الزیات نے جواب دیا۔ "ذرا دیر بعد یہاں ایک دلچسپ تماشا پیش آنے والا ہے۔ میں چاہتا ہوں، اسے تم بھی دیکھ لو کیونکہ اس قسم کے تماشے بار بار نہیں دکھائے جاتے۔"

ترک سردار کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ اس وقت کون سا تماشا دکھایا جائے گا۔ ابھی وہ اسی ادھیڑبُن میں مبتلا تھا کہ جعفر بہترین سواد (درباری پوشاک) پہنے داخل ہوا۔ درباری پوشاک کا رنگ سیاہ تھا اور یہ بالکل نئی تھی جعفر خوش تھا۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہی ابن الزیات سے کہا۔

"ابن الزیات! مجھے یقین تھا کہ تو میری امیرالمومنین سے سفارش ضرور کرے گا اور امیرالمومنین راضی ہوجائیں گے چنانچہ جیسے ہی تیرے فرستادے نے مجھے یہ بتایا کہ تو بلا رہا ہے تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی، ہاں اب بتا امیرالمومنین نے کیا کہا؟"

ابن الزیات نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "جعفر! ذرا انتظار کر ابھی تجھے معلوم ہوجائے گا کہ امیرالمومنین نے تیری بابت کیا حکم دیا ہے۔" اس کے بعد اس نے ایک خدمت گار کو حکم دیا۔ "جا، اور اسے فوراً لے آ۔"

خدمت گار فوراً چلا گیا۔ ابن الزیات ہنس ہنس کر جعفر سے باتیں کرنے لگا پھر اچانک بالوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "جعفر! تو نے زنانوں کی طرح یہ کاکلیں کیوں چھوڑ رکھی ہیں؟"

جعفر نے جواب دیا۔ "ابن الزیات! میں امیرالمومنین کا بھائی ہوں تجھے مجھ سے اس لب و لہجے میں بات نہیں کرنی چاہیے۔"

ابن الزیات نے کہا۔ "تو، تو لب و لہجے کی شکایت کر رہا ہے، میں اور کیا کچھ کرسکتا ہوں ذرا دیر بعد یہ بھی معلوم ہوجائے گا۔"

جعفر پریشانی سے ماحول کا جائزہ لینے لگا لیکن وہاں ایسی کوئی بات نہیں محسوس نہیں ہوئی جس سے ابن الزیات کے عزائم کا پتا چل سکتا۔ ترک سردار بھی پریشان، معاملات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

کچھ دیر بعد خدمت گار واپس آگیا۔ وہ تنہا نہیں تھا اس کے ساتھ ایک حجام بھی تھا۔

ابن الزیات نے حجام کو حکم دیا۔ "آگے بڑھ اور جعفر کا سر مونڈ دے۔"

جعفر نے گھبرا کر کہا۔ "ابن الزیات! تو یہ کیسا حکم دے رہا ہے۔ اپنے ہوش میں تو ہے؟"

ابن الزیات نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "میں بالکل ہوش میں ہوں۔ ہاں تو البتہ ہوش و حواس میں نہیں کہ زنانوں جیسی وضع قطع بنا رکھی ہے۔" پھر حجام کو سختی سے حکم دیا۔ "کھڑا منہ کیا دیکھتا ہے، میرے حکم کی تعمیل کر۔"

اس کے بعد اس نے جعفر کے سامنے واثق کی تحریر رکھ دی۔ "اسے پڑھ لے کہ یہ میرا نہیں امیرالمومنین کا حکم ہے۔"

جعفر نے بے بسی سے جواب دیا۔ "اگر یہ امیرالمومنین کا حکم ہے تو میں خاموشی سے اس کی تعمیل کروالوں گا۔"

ترک سردار کو ابن الزیات کی اس شرارت سے بڑا دکھ پہنچا۔

ابن الزیات نے خدمت گار کو حکم دیا۔ "تو حجام اور جعفر کے پاس ہی کھڑا رہ اور سارے بال جمع کرتا رہ۔"

جعفر نے انتہائی لجاجت سے درخواست کی۔ "ابن الزیات! میں بال منڈوانے میں ذرا سی بھی مزاحمت نہیں کروں گا لیکن میری نئی پوشاک پر بالاپوش تو ڈلوا دے۔"

ابن الزیات نے گویا جعفر کی بات سنی ہی نہیں۔ حجام کو بڑی سختی سے حکم دیا۔ "تو میرے حکم کی تعمیل کیوں نہیں کرتا۔ کیا تیری شامت تو نہیں آگئی۔"

حجام نے ابن الزیات کے حکم کی پوری پوری تعمیل کردی اور جعفر کے نئے درباری لباس پر ہی حجام نے اس کے بال مونڈ دیے۔ خدمت گار ان بالوں کو اکٹھا کرتا رہا، جب سر منڈھ چکا تو ابن الزیات نے خدمت گار کو حکم دیا۔

"ان بالوں کو جعفر کے منہ پر مار دے۔" خدمت گار نے یہ بال جعفر کے منہ پر کھینچ مارے۔

ابن الزیات اس کارروائی کے دوران ترک سردار کے چہرے پر نظریں جمائے رہا۔ ترک سردار مشتعل بھی تھا اور پریشان بھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جو شخص امیرالمومنین کے بھائی کو اتنا ذلیل کرسکتا ہے وہ ترک سردار کو کتنا خوار کرسکتا ہے۔ شاید اس سے کہیں زیادہ۔

ابن الزیات نے دونوں کو ایک ساتھ رخصت کیا۔ جعفر بہت زیادہ ملول تھا۔ راستے میں جعفر نے ترک سردار سے کہا۔ "معتصمین! تو یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے، میں تجھے عینی شاہد بنا رہا ہوں۔"

ترک سردار نے پوچھا۔ "ابن الزیات کے آدمی نے کن لفظوں میں بلوایا تھا؟"

جعفر نے جواب دیا۔ "جب ابن الزیات کے آدمی نے مجھے یہ بتایا کہ مجھے فوراً بلایا گیا ہے تو میں یہ سمجھا کہ اس نے امیرالمومنین کا دل میری طرف سے صاف کردیا ہوگا چنانچہ میں نے نئی پوشاک پہنی اور ابن الزیات کے پاس آگیا۔ میں یہاں خوش خبری سننے آیا تھا لیکن اس نے مجھے مونڈھ لیا۔"

ترک سردار نے گھر واپس جاکر جب پورا واقعہ گھر والوں کو سنایا، تو وہ سب خوف زدہ ہوگئے۔ اب ترک سردار کے سامنے بوران کے مسئلے کا ایک ہی حل رہ گیا تھا اور وہ تھا منصور کو تلاش کرکے سامرا لے آنا اور اسے ابن الزیات اور امیرالمومنین کی خدمت میں پیش کرکے گلوخلاصی حاصل کرنا۔

وہ تیاری کرکے یمن روانہ ہوگیا اور اپنے پیچھے گھر والوں کے لیے یہ ہدایت چھوڑی کہ وہ منصور کو لے کر ہی واپس آئے گا۔ اس کی عدم موجودگی میں نافر اس خاندان کا سربراہ ہوگا۔

☆☆☆

ترک سردار دو سال تک غائب رہا، اس نے یمن کا چپا چپا چھان لیا لیکن منصور کا کہیں پتا نہ چلا۔ نافر، بوران اور اس کی ماں اس کے انتظار سے تنگ آچکی تھیں اور ان کے دلوں پر اندیشوں اور وسوسوں کا کہر چھا چکا تھا۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اب ترک سردار کو کہاں تلاش کیا جائے۔ ابن الزیات الگ اس کے خاندان کو تنگ کر رہا تھا۔ نافر چوری چوری یہ فیصلہ کر رہا تھا کہ چھ ماہ کے اندر اندر اس کا باپ واپس نہ آیا تو وہ اپنے خاندان کو چوری سے لے کر ماوراء النہر چلا جائے گا اور وہاں کے کسی گمنام قریے میں کاشتکار بن کر زندگی گزار دے گا۔

اس دوران سامرا میں یہ افواہ گرم ہونے لگی کہ واثق مرض استسقاء میں مبتلا ہے اور اسے یہ مرض بہت تنگ کر رہا ہے اور شاہی اطبا اس کی زندگی سے مایوس ہوچکے ہیں۔ یہ افواہ ابھی گرم ہی تھی کہ ایک رات اچانک ترک سردار واپس آگیا۔ شمعوں کی روشنی میں اس کے اندر کی مایوسی چہرے پر دیکھی جاسکتی تھی۔ نافر، بوران اور ان کی ماں، تینوں ترک سردار سے کچھ پوچھنا چاہتے تھے لیکن ان میں سے کسی ایک میں بھی سوال کرنے کی ہمت نہ تھی۔

ترک سردار نے کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ تم سب مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہو۔" پھر پوچھا۔ "کیا وہ آیا تھا؟"

اس کی بیوی نے جواب دیا۔ "کیا تم نے اسے بھیجا تھا؟"

ترک سردار نے بڑی مایوسی سے کہا۔ "اگر وہ مجھے مل گیا ہوتا تو میں اسے اپنے ساتھ لے کر آتا۔" تینوں کے چہرے اتر گئے اور بوران وہاں سے ہٹ گئی۔

ترک سردار نے دریافت کیا۔ "میرے پیچھے کوئی خاص بات تو نہیں ہوئی؟"

نافر نے جواب دیا۔ "امیرالمومنین مرض الموت میں مبتلا ہیں اور ابن الزیات کی شرارتوں سے تنگ آ کر ہم نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ خاموشی سے ماوراء النہر کے کسی قریے میں کھیتی باڑی کرنے لگیں گے۔"

ترک سردار نے کہا۔ "اگر امیرالمومنین نہ رہے تو معلوم نہیں حالات کیا رخ اختیار کریں، بہرحال میں ایک بار پھر منصور کو ڈھونڈ نکالنے کی کوشش کروں گا۔"

نافر نے نفرت سے کہا۔ "نہیں، اب اس کی کوئی ضرورت نہیں، اب آپ گھر ہی میں رہیں جو کچھ ہوگا دیکھا جائے گا۔"

ماں نے پوچھا۔ "مگر بوران کا کیا ہوگا؟"

نافر نے جواب دیا۔ "ہم اس کی شادی کرکے سامرا سے ہٹادیں گے۔ اس کے بعد ہم پر جو بیتے گی جھیل لیں گے۔"

ترک سردار نے کہا۔ "یہ تیرا جذباتی فیصلہ ہے جس سے میں متفق نہیں ہوسکتا۔"

نافر نے غصے میں کہا۔ "تب پھر اب میں منصور کو تلاش کرنے جاؤں گا۔"

ترک سردار نے بے دلی سے پوچھا۔ "تو تلاش کرنے جائے گا مگر کہاں جائے گا؟"

نافر نے جواب دیا۔ "ہاں میں جاؤں گا اور کہاں جاؤں گا اس کا جواب تو ابھی میرے پاس بھی نہیں ہے۔"

اس بات چیت کے چوتھے دن نافر اچانک غائب ہوگیا۔ اپنے پیچھے اس نے اپنے باپ کے نام ایک خط چھوڑا تھا۔

"بابا جان! میں منصور کی تلاش میں جارہا ہوں۔ مجھ سے بہن بوران کی اداسی نہیں دیکھی جاتی۔ میں یا تو منصور کو پکڑ کر اپنے ساتھ لاؤں گا یا پھر ہمیشہ کے لیے گم ہوجاؤں گا۔ دعا کیجیے، خدا مجھے کامیاب کرے۔"

ترک سردار کے دل پر ایک گھونسا لگا۔ اس نے پہلی بار تلملا کر منصور کو برا بھلا کہا۔ "منصور! میں نے تیرے ساتھ بھلائی کی تھی پھر مجھے یہ سزا کس بات کی مل رہی ہے۔"

☆☆☆

سامرا ماتم کدہ بن گیا۔ واثق اطبا کے مشورے پر گرم تنور پر بیٹھ کر بھاپ لیا کرتا تھا۔ ایک دن زیادہ گرم تنور پر بیٹھ کر بھاپ لی تو بخار آ گیا اور اسی بخار نے اس کی جان لے لی۔

ابن الزیات نے کوشش کی واثق کا کمسن بیٹا خلیفہ بنادیا جائے لیکن ارکانِ مشورت نے مخالفت کی اور قرعۂ خلافت واثق کے بھائی جعفر کے نام نکل آیا۔ وہی جعفر جسے ابن الزیات نے کئی بار ذلیل کیا تھا اور آخری بار سر منڈوا کے بال اس کے منہ پر کھینچ مارے تھے۔ ارکانِ شوریٰ نے منتظم مشروبات بغا کو حکم دیا کہ وہ جعفر کو ارکان کے فیصلے سے مطلع کردے اور بلا لائے۔

بغا، جعفر کو تلاش کرتا ہوا محل کے اس حصے میں پہنچ گیا جہاں جعفر نیلے کپڑوں میں ملبوس ترک بچوں میں گھرا بیٹھا تھا۔

بغا نے کہا۔ "حضور والا کو ارکانِ شوریٰ نے طلب فرمایا ہے۔"

جعفر اسی وقت اس مجلس میں پہنچ گیا۔ مجلس کے ایک رکن احمد بن ابی داؤد نے مجلس کا فیصلہ سنایا۔

"قرعۂ خلافت آپ کے نام نکل چکا ہے میرے قریب آیئے تاکہ میں رسم خلافت ادا کردوں۔"

جعفر کو اپنے بھائی واثق کی موت کا اب بھی یقین نہ تھا، جواب دیا۔ "مجھے خوف ہے کہ واثق زندہ ہوں گے۔"

احمد بن ابی داؤد نے جعفر کو واثق کی میت پر کھڑا کردیا پھر وہاں سے واپس آ کر جعفر کو خلافت کا لباس پہنایا، عمامہ باندھا اور دونوں آنکھوں کے درمیان بوسہ دے کر ادب سے عرض کیا۔

"السلام علیکم یا امیرالمومنین ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔"

احمد بن ابی داؤد کے بعد دوسروں نے بھی اسی طرح سلام کیا۔ ابن الزیات نے بیعت نامۂ خلافت لکھا۔

ترک سردار کو اس تبدیلی نے کسی قدر خوش کردیا لیکن بعد میں اسے کچھ مایوسی ہونے لگی کیونکہ جعفر نے سریر آرائے خلافت ہونے کے بعد ابن الزیات کو اس کے منصب پر برقرار رکھا تھا۔ اس نے بارگاہِ خلافت میں حاضر ہوکر مبارک باد دی اور اشاروں میں جعفر کو یاد دلایا کہ ابن الزیات کے معاملے میں ترک سردار کو ایک مرتبہ شاہد بنایا تھا۔

جعفر نے کہا۔ "پہلے میں ایک عام آدمی تھا اب میں امیرالمومنین ہوں، عام اور خاص آدمیوں کی سوچ میں جو فرق ملتا ہے وہی فرق ایک عام جعفر اور خلیفہ جعفر کی فکر میں پایا جاتا ہے۔"

ترک سردار سمجھ گیا کہ اب جعفر کی فکر میں غیر متوقع فرق آچکا ہے۔ اس نے ابن الزیات کی مخالفت تو نہیں کی لیکن جعفر کے سامنے اپنا مسئلہ رکھ دیا اور درخواست کی۔ "مجھ پر سے منصور کی بازیابی کی پابندی دور کردی جائے تو بڑا کرم ہوگا۔"

جعفر نے ابن الزیات کو بلا کر اسے حکم دیا کہ ترک

سردار کو مزید تنگ نہ کیا جائے اور واثق کا فرمان چاک کردیا جائے۔ ابن الزیات نے اس حکم پر فوراً ہی عمل کیا اور ترک سردار نے خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ اسے ایسا لگا جیسے کئی سال سے پڑی ہوئی گلے کی رسی کو دور کردیا گیا ہو۔

اِدھر فرمانِ واثق چاک ہوا اُدھر نافر اپنے گھر میں اس طرح داخل ہوا کہ منصور اس کے ساتھ تھا۔ ترک سردار نے واپس آکر نافر اور منصور کو گھر میں جو دیکھا تو زیادہ خوشی نہیں ہوئی۔ نافر نے جوش میں کہا۔ ”آخر میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو ہی گیا اور اب منصور کو ابن الزیات اور امیرالمومنین کی خدمت میں پیش کرکے فرمان چاک کرواسکوں گا۔“

ترک سردار نے جواب دیا۔ ”اب اس کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ میں یہ کام ابھی ابھی کرواکے آیا ہوں۔“

اس کے بعد اس نے پوری روداد سنادی۔ نافر ہنس دیا، بولا۔ ”قسمت کی ستم ظریفی، بہرحال میں تو منصور کو تلاش کرلایا۔“

ترک سردار کچھ دیر حسرت و افسوس سے منصور کو دیکھتا رہا پھر ہنس کر کہا۔ ”تو نے مجھے بہت پریشان کیا منصور۔ میں تجھے دو سال تک یمن اور اس کے مضافات میں تلاش کرتا رہا۔“ پھر نافر سے پوچھا۔ ”یہ تجھے کہاں ملا؟“

نافر نے جواب دیا۔ ”بغداد میں۔“

”بغداد میں؟“ ترک سردار حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بولا۔

ترک سردار کی بیوی منصور کو دیکھ کر منہ بناتی ہوئی چلی گئی۔ بوران اسے چھپ چھپ کر دیکھ رہی تھی۔

نافر نے پوچھا۔ ”بوران کی شادی کب تک کردی جائے؟“

منصور کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی، وہ خوش فہمی میں مبتلا ہوگیا۔

ترک سردار نے منصور کے چہرے سے اس کی خوش فہمی کو سمجھ لیا بولا۔ ”میں دن تاریخ کا بہت جلد اعلان کردوں گا۔“ اس کے بعد منصور کو اشارے سے ایک طرف لے جانے لگا۔

نافر نے نفرت سے کہا۔ ”بابا جان! اب آپ کوئی غلطی نہ کر بیٹھیے گا۔ اس عرب نوجوان سے آپ جو بات کرنا چاہتے ہیں، یہیں میرے سامنے کیوں نہیں کرسکتے۔“

ترک سردار نے جواب دیا۔ ”نافر! تو مطمئن رہ میں کوئی ایسا کام نہ کروں گا جس سے مجھے تیرے سامنے شرمندگی اٹھانی پڑے۔“

اس کے بعد ترک سردار منصور کو ایک گوشے میں لے گیا اور اس سے کہا۔ ”منصور! اب وقت نہیں رہا، میں نے تیرا بہت انتظار کیا مجھے افسوس ہے کہ تو نے مجھ سے جھوٹ بولا۔ جب تو بغداد میں رہتا تھا تو یمن کیوں بتایا تھا؟“

منصور نے جواب دیا۔ ”ترک سردار! میں یہاں جس مقصد سے آیا تھا اس کا تقاضا تھا کہ میں اس قسم کی غلط بیانی سے کام لوں۔“

ترک سردار نے کہا۔ ”اچھا، اب تو اپنا مقصد مت بتا اور اسے میری زبان سے سن لے۔“ پھر ذرا دم لے کر کہنے لگا۔ ”میرا خیال ہے تیرا اندر دا ہاتھ کسی ترک گھڑسوار کے گھوڑے سے کچلا گیا تھا اور تو نے اس بارے میں اب جو کچھ مشہور کر رکھا ہے غلط ہے اور تو سامرا اس لیے آیا تھا کہ تو اس ترک کا کسی طرح پتا چلا کر انتقام لے لے۔“

منصور نے حیرت سے پوچھا۔ ”یہ سب کچھ آپ کو کس طرح معلوم ہوا؟“

ترک سردار نے جواب دیا۔ ”تو یہاں کے ترکوں میں گھس بیٹھ کر جس قسم کی کریدنے والی باتیں کیا کرتا تھا مجھے اس سے شبہ ہوا تھا، کیا میرا شبہ غلط تھا؟“

منصور نے نہایت کرب سے کہا۔ ”درست ہے۔“

ترک سردار نے کہا۔ ”اچھا، اب ایک بات اور بتا کیا تیرا تعلق بغداد کے اس گھرانے سے تو نہیں جس خاندان کے دادا کی موجودگی میں کسی ترک سوار نے ایک بچے کا بھیجا پاش پاش کردیا تھا اور دوسرے کا بازو توڑ دیا تھا؟“

منصور تڑپ گیا، آہستہ سے جواب دیا۔ ”وہ میرا دادا تھا اور مرنے والا میرا بھائی تھا۔ بازو میرا ہی ٹوٹ گیا تھا لیکن یہ ساری باتیں آپ کو کس نے بتائیں؟“

ترک سردار نے کہا۔ ”اگر میں اس گھڑسوار سے تجھے ملوادوں تو، تو اس سے کیسا سلوک کرے گا؟“

منصور نے جواب دیا۔ ”میں اس سے انتقام لوں گا۔“

ترک سردار نے کہا۔ ”میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ بوران کی شادی تجھ سے کردوں گا اس لیے کہ میں اپنے باطنی کرب کو اسی طرح تسکین دے سکتا تھا لیکن اب ایسا لگتا ہے کہ میں زندگی بھر اس کرب میں مبتلا رہوں گا۔“

منصور نے کہا۔ ”لیکن ترک سردار! آپ نے اس ظالم گھڑسوار کی نشاندہی نہیں کی؟“

ترک سردار نے کہا۔ ”اِدھر میری طرف دیکھ، وہ میں ہی ہوں اور......“

منصور کی ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ ترک سردار کہہ رہا تھا۔ ”اگر تو مجھے ہلاک کرکے، اپنے دل کو سکون پہنچا سکتا ہے تو میں حاضر ہوں۔“

منصور نے سر جھکالیا اور آہستہ آہستہ آنسو بہانا شروع کردیے۔

ترک سردار نے مزید کہا۔ ”اور تجھے یہ علم بھی ہوگا کہ اسی دن تیری قوم کے لوگوں نے ایک ترک گھڑسوار کو ہلاک بھی کردیا تھا۔ وہ ہلاک ہونے والا ترک کون تھا؟ کیا تو جانتا ہے؟“

منصور نے نفی میں گردن ہلائی۔ ترک سردار نے کہا۔ ”وہ نافر کا چچا تھا، میرا بھائی اور اس کی موت پر نافر نے یہ عہد کیا تھا کہ وہ اپنے چچا کا بدلہ ضرور لے گا۔“

منصور نے سوچا شاید ترک سوار تلافی مافات میں بوران کی شادی اب بھی اسی سے کرنے والا ہے، بولا۔ ”پھر اب کیا ارادہ ہے کیا بوران مجھے پسند کرلے گی؟“

ترک سردار نے جواب دیا۔ ”افسوس کہ اب ایسا نہیں ہوسکتا۔ تیری عدم موجودگی میں بوران نے ایک ترک نوجوان کو پسند کرلیا اور دو چار دن میں وہ دونوں شادی کرلیں گے۔“

منصور میں اب زیادہ باتیں کرنے کا حوصلہ نہیں رہ گیا تھا، باتوں کا سلسلہ فوراً بند کردیا، بولا۔ ”کیا میں آج ہی اسی وقت بغداد واپس چلا جاؤں؟“

ترک سردار نے جواب دیا۔ ”نہیں، تو ابھی چند دن اور رہ، ہوسکتا ہے کہ تلافی کی کوئی اور صورت نکل آئے۔“

ان انکشافات نے گھر والوں کو بہت پریشان بھی کیا اور حیرت زدہ بھی۔ بوران کی ماں نے مشورہ دیا۔ ”اب اسے ساتھ نہیں رہنا چاہیے کیونکہ کچھ پتا نہیں کہ اس میں کب جذبۂ انتقام بیدار ہوجائے۔“

لیکن ترک سردار کو منصور کی عرب شرافت پر اعتماد تھا، بولا۔ ”یہ عرب نوجوان دھوکے سے وار ہرگز نہ کرے گا، مجھے اس پر اعتبار ہے۔“

لیکن نافر نے سب کچھ جان لینے کے بعد اس سے اس طرح انتقام لیا کہ بوران کی شادی اس کی موجودگی میں کردی اور منصور کو شرمندہ کرنے کے لیے یہ اعلان کردیا کہ وہ اس طرح منصور سے اپنے مرحوم چچا کا انتقام لے رہا ہے۔

ترک سردار نے بیٹے کو ڈانٹا بھی لیکن منصور نے اسے روک دیا، بولا۔ ”نافر نے جو کچھ کیا، مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔“

منصور قسمت کے سارے وار ہنسی خوشی جھیلتا رہا، جب اس کا دل بہت زیادہ گھبرایا تو اس ظالم ماحول سے نکل کر دوسرے ظالم ابن الزیات سے ملنے چلا گیا۔ ابن الزیات عرب تھا اور اپنی قوم کا ظالم بھی اسے عزیز تھا لیکن جب وہ ابن الزیات کے گھر پہنچا تو پتا چلا، خلیفہ جعفر نے جو اب متوکل کہلاتا تھا ابن الزیات کو قید کردیا ہے۔

وہ بہ مشکل ابن الزیات کے قید خانے تک پہنچ گیا۔ ابن الزیات نے منصور کو پہلی نظر میں ہی پہچان لیا۔ کمزور آواز میں پوچھا۔ ”تو کب آیا؟“

منصور نے جواب دینے کے بجائے پوچھا۔ ”یہ آپ کا کیا حال ہے؟“

ابن الزیات نے جواب دیا۔ ”مصیبت یہ نہیں ہے کہ میں قید ہوں بلکہ یہ ہے کہ قید خانے کا عملہ مجھے سونے نہیں دیتا۔ جب بھی آنکھ لگتی ہے کوئی نہ کوئی آگے بڑھ کر میرے جسم میں سوئیاں چبھونے لگتا ہے۔ آج دو ہفتے گزرے کہ میں پلک تک نہیں جھپکا سکتا۔“

منصور نہایت افسوس سے ابن الزیات کی حالت پر غور کرتا رہا پھر ابن الزیات گویا خود سے باتیں کرنے لگا، وہ بڑبڑا رہا تھا۔ ”اے محمد! تو عافیت و آرام سے تھا، راحت و نعمت، اچھی سواریاں، عمدہ محل، اعلیٰ پوشاک غرض تجھے سب کچھ میسر تھا مگر تو نے قناعت نہ کی اور وزارت کے درپے ہوا۔ اب اپنے کرتوت کا مزہ چکھ۔“ منصور بغداد واپس چلا گیا، ترک سردار کو بتائے بغیر۔

ابن الزیات کو قید خانے سے نکال کر اسی کنویں میں ڈال دیا گیا جسے ابن الزیات نے اپنے دشمنوں کے لیے بنوایا تھا۔ سلاخوں والا تنور اور اس تنور میں اس کی موت واقع ہوگئی۔

لاش پر ابن الزیات کے دونوں بیٹے سلیمان اور عبیداللہ کچھ دیر کھڑے دیکھتے رہے۔ ان دونوں نے بھی باپ سے بڑی تکلیفیں اٹھائی تھیں، آخر ان دونوں نے لاش پر جھک کر بیک آواز کہا۔ ”الحمدللہ کہ اس فاسق سے نجات پائی۔“

☆☆☆

زمانے کا تغیر و تبدل جاری تھا، زمانہ کروٹیں لے رہا تھا۔ جعفر متوکل نے ترکوں کا زور توڑنے کے لیے انہیں معزول کرنا شروع کردیا۔ اس زد میں ترک سردار بھی آگیا۔ متوکل کے دل میں ترک سردار کانٹے کی طرح کھٹک رہا تھا۔ ترک سردار متوکل کی رسوائیوں، ذلتوں اور بے عزتیوں سے واقف تھا اس لیے وہ اس کانٹے کو کسی بھی طرح دور کردینا چاہتا تھا۔ خلیفہ کی نظریں کیا بدلیں کہ سامرا

کے در و دیوار ان کے دشمن ہو گئے۔ ترک سردار نے یہ فیصلہ کرلیا کہ اب وہ ماوراءالنہر واپس چلا جائے۔

اس دوران متوکل کی طرف سے پروانہ گرفتاری جاری ہو گیا لیکن چالاک ترک سردار اس سے پہلے ہی اپنے خاندان کے ساتھ راتوں رات بغداد روانہ ہو چکا تھا۔ ترک سردار اپنے بیٹے سے کہہ رہا تھا کہ ”منصور کے پاس لے چلو۔“

لیکن نافر یہ کہتا تھا کہ ”ہم سب خلافت کے معتوب ہیں اس لیے منصور ہمیں پکڑوا کر انتقام لے لے گا۔“

ترک سردار نے پورے اعتماد سے کہا۔ ”نافر! تو اس بھول میں مت رہ کہ ہم سب یہاں سے بہ آسانی نکل جائیں گے، کوئی بھی عرب ہمیں گرفتار کروا سکتا ہے پھر میں منصور کے پاس پناہ لے کر ایک جوا کیوں نہ کھیلوں۔ اگر اس نے ہمیں گرفتار کروا دیا تو اس طرح وہ اپنے سینے میں چھپائے ہوئے جذبۂ انتقام کو تسکین پہنچا لے گا اور اگر اس نے فرار ہونے میں ہماری مدد کی تو یہ ہماری خوش قسمتی ہو گی۔“

چنانچہ یہ لوگ بغداد روانہ ہو گئے۔ انہوں نے عام شاہراہ چھوڑ کر قبرستان سے ہو کر گزر جانا چاہا۔ تاروں کی روشنی میں یہ چند افراد کا قافلہ قبرستان سے آسیبی ارواح کی طرح گزر رہا تھا۔ ایک قبر کے پاس چند کتے آپس میں لڑ جھگڑ رہے تھے۔ اس قافلے کو اپنے سر پر دیکھ کر کتے بھاگ گئے۔ تاروں کی ہلکی روشنی میں کوئی سفید چیز پڑی دکھائی دی، کتے اس سفید چیز کے پاس لڑ جھگڑ رہے تھے۔ ترک سردار نے اسے جھک کر دیکھا، یہ کسی کی کفن میں لپٹی ہوئی لاش تھی۔ اس نے چھوٹی سی موم شمع جلا کر لاش کو غور سے دیکھا۔ کتوں نے لاش کا پیٹ چاک کر دیا تھا اور بازوؤں کا گوشت چٹ کر گئے تھے، چہرہ ابھی تک محفوظ تھا، یہ ایک شناسا چہرہ تھا۔ ترک سردار کی چیخ نکل گئی۔ ”آہ ابن الزیات! یہ تو ہے، خدا تجھے معاف کرے، میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں......“

اس نے نافر کی مدد سے ابن الزیات کی لاش کو دوبارہ اس کی قبر میں اتار کر اوپر سے مٹی ڈال دی۔

رات کے پچھلے پہر منصور نے ان سب کا خیر مقدم کیا اور جب اسے یہ معلوم ہوا کہ یہ سب خلافت کے معتوب ہیں تو وہ ذرا سی دیر کے لیے کسی سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے ان سب کو مہمان بنا کے چھپا لیا۔ یہ سب کئی دن تک امید و بیم میں مبتلا ذہنی اذیتیں جھیلتے رہے۔ منصور نے اپنے بوڑھے باپ کو ان ترکوں کے بارے میں سب کچھ صحیح صحیح بتا دیا، وہ ان مہمانوں کو خونخوار نظروں سے دیکھتا رہا۔ ترک سردار کو اب یقین ہو چکا تھا کہ منصور تو ان کی مدد کر سکتا تھا لیکن شاید منصور کا باپ انہیں معاف نہ کرے۔

خلافت کے خونخوار سپاہی ترک سردار اور اس کے خاندان کی بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ یہ روپوش خاندان موت و زیست کی اذیت میں مبتلا تھا۔ ایک دن دوسروں کی نظروں سے بچ کر بوران نے منصور سے پوچھا۔ ”کیا ہم سب گرفتار کر لیے جائیں گے؟“

منصور نے کوئی جواب نہ دیا۔

پھر ایک دن منصور اور اس کے بوڑھے باپ نے اپنے مہمانوں کو دجلہ کے اس پار پہنچا دیا، وہاں تاجروں کا ایک قافلہ کوچ کے لیے تیار کھڑا تھا اور اس قافلے میں کچھ غیر تاجر بھی شامل تھے۔ انہیں اس قافلے میں چھوڑتے ہوئے منصور کے بوڑھے باپ نے کہا۔

”اب تم سب نہایت اطمینان سے نکل جاؤ گے۔“

اور منصور بوران سے کہہ رہا تھا۔ ”تو نے چند دن پہلے مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا ہم سب گرفتار کر لیے جائیں گے؟ میں نے اس وقت تیرے اس شک و شبہے کے سوال کا جواب قصداً نہیں دیا تھا لیکن تیرے اس سوال نے مجھے دکھ ضرور پہنچایا تھا۔ میں ایک عرب ہوں اور عرب اپنے دشمنوں کو بھی پناہ دے کر ان سے دھوکا نہیں کرتے اور تجھ سے تو میں محبت بھی کر چکا ہوں۔“

نافر اپنی جگہ شرمندہ تھا کہ اس نے اس شریف نوجوان کو بوران کے معاملے میں کس قدر ذلیل کیا تھا۔ منصور کے سامنے اس کی نظریں نہیں اٹھتی تھیں لیکن منصور نے نافر کو گلے لگا کر بھائیوں کی طرح رخصت کیا۔

قافلہ روانہ ہو گیا، گرد و غبار اڑتا رہا اور صدائے جرس دیر تک سنائی دیتی رہی۔ منصور چلتے ہوئے قافلے پر نظریں جمائے حسین ماضی میں گم رہا جہاں بوران اس کے سامنے کھڑی بہن بننے سے انکار کر رہی تھی۔

ماخذات

تاریخ طبری، ابن جریر الطبری۔ تاریخ ابن خلدون، ابن خلدون۔ فتوح البلدان، بلاذری۔
تاریخ الخلفا، جلال الدین سیوطی۔ تاریخ اسلام، معین الدین ندوی
مسلمانوں کی سیاسی تاریخ، ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن۔ الفخری، ابن طباطیار

باہمت

کاشف زبیر

دشوار گزار رستوں پر ہی انسان کی ہمتوں کی آزمائش ہوتی ہے۔ جب جان لبِ دم ہو... جب زندگی اپنے انجام کی جانب گامزن ہو مگر اس اختتام سے قبل آغاز کے بے شمار کام ادھورے رہ جائیں تو آخری لمحات کا کرب بہت مضطرب کر دیتا ہے۔ وہ بھی اسی اضطراب میں مبتلا اپنی ہمت سے بڑھ کر بکھری ہوئی اس بساط کو سمیٹ لینا چاہتا تھا جس نے اس کی زندگی کے اوراق پریشان کر دیے تھے۔

سلگتے جسم و جاں کے آخری کربناک لمحات کا عبرت ناک قصہ

روبینہ ترانا ایک گاڑی میں سوار تھی۔ جس میں اس کے ساتھ ایک درجن نوجوان لڑکیاں اور عورتیں اور بھی تھیں، ان سب کی حالت تباہ تھی۔ کپڑے پھٹے ہوئے اور جسم زخموں سے چور تھے۔ وہ سب اپنی عزت گنوا چکی تھیں۔ ان کے گاؤں اور گھروں پر ٹوٹنے والے درندوں نے سب سے پہلے انہیں پامال کیا اور پھر انہیں ہاتھ پاؤں باندھ کر اس پک اپ گاڑی میں نامعلوم مقام کی طرف روانہ کر دیا۔ وہ کئی مہینوں سے سن رہے تھے کہ جنگ ان کے گاؤں کی طرف آ

رہی ہے۔ گاؤں کے بیشتر مرد پہلے ہی دشمن سے لڑنے کے لیے فوج میں بھرتی ہوکر جا چکے تھے۔ معدودے چند مرد اور نوجوان لڑکے تھے، وہ کسی حملہ آور کا مقابلہ کرنے کے لیے قطعی ناکافی تھے۔ آنے والے تعداد میں کہیں زیادہ اور پوری طرح مسلح تھے۔ عام ہتھیاروں کا اتنا بڑا انبار تھا کہ جب وہ قصبے میں داخل ہوئے تو ان کی گنیں گولیاں اگل اگل کر سرخ ہوگئی تھیں۔

روبینہ کو کچھ پتا نہیں چلا کہ باہر کیا ہو رہا ہے کیونکہ جیسے ہی دشمن گاؤں میں داخل ہوا اس کی ماں نے اسے ایک الماری میں کباڑ تلے چھپا دیا اور اس کی بڑی بہن کو لے کر خود باہر چلی گئی۔ اس نے اشارے سے روبینہ سے کہا کہ وہ اس جگہ سے باہر نہ نکلے ورنہ امکان ہے کہ دشمن اسے بھی لے جائے گا یا مار دے گا۔ روبینہ تقریباً سولہ سال کی خوب صورت اور صحت مند لڑکی تھی اس کے چہرے پر جوانی کی چمک کے بجائے بچپن کی معصومیت تھی۔ وہ گونگی اور بہری تھی اور یہ عارضہ اسے بچپن میں بخار کے بعد لاحق ہوا تھا۔ وہ دبکی بیٹھی تھی کہ اس نے ارتعاش محسوس کیا جیسے آس پاس دھماکے ہو رہے ہوں۔ پھر دشمن مکان میں گھس آئے وہ تلاشی لے رہے تھے اور چیزیں توڑ پھوڑ رہے تھے۔ اسے خوف آ رہا تھا، وہ جانتی تھی کہ دشمن عورتوں اور لڑکیوں کے ساتھ کیا سلوک کر رہے تھے۔

بالآخر وہ اس کمرے میں آئے اور انہوں نے یہاں بھی سامان الٹا پلٹا۔ ان میں سے کوئی الماری کی طرف نہیں آیا تھا مگر جب وہ واپس جا رہے تھے تو اچانک ایک دشمن رکا اور اس نے الماری کی طرف دیکھا شاید اس نے روبینہ کی موجودگی محسوس کرلی تھی، وہ اچانک الماری کی طرف آیا اور دروازہ کھولتے ہوئے روبینہ کو بالوں سے پکڑ کر باہر کھینچ لیا۔ وہ خود کو چھڑانے کے لیے مچلنے اور چلانے لگی مگر ان کے سامنے اس کی ایک نہیں چلی اور دو فوجی اسے بازوؤں سے تھام کر باہر لے آئے۔ یہاں چاروں طرف دشمن پھیلے ہوئے تھے۔ وہ گھروں میں گھس گھس کر لوگوں کو نکال رہے تھے اور ان کو بے دریغ قتل کر رہے تھے خاص طور سے مردوں کو، بوڑھے بچے کے امتیاز کیے بغیر مار رہے تھے۔ وہ بوڑھی عورتوں کو بھی قتل کر رہے تھے۔

لیکن جوان عورتوں اور لڑکیوں کو نہیں مار رہے تھے۔ انہیں پکڑ کر ایک طرف کیا جا رہا تھا۔ روبینہ کو سنائی نہیں دے رہا تھا مگر اس کی آنکھوں کے سامنے ایک قیامت تھی جو اس کے لوگوں پر ٹوٹی پڑ رہی تھی۔ لوگ اپنی جان بچانے کے لیے دیوانہ وار بھاگ رہے تھے مگر ان کے لیے کہیں امان نہیں تھی۔ جن عمارتوں سے آنے والی فوج کا مقابلہ کیا جا رہا تھا انہیں ٹینکوں اور توپوں سے نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ اچانک روبینہ نے اپنی ماں کو دیکھا وہ اس کی بہن کو اپنی پشت پر کیے اور کچن کی چھری آگے کیے دشمن کے سامنے سینہ سپر تھی۔ چار پانچ فوجیوں نے روبینہ کی ماں اور بہن کو گھیر رکھا تھا اور لطف اندوز ہو رہے تھے۔ دشمن فوج کا کمانڈر ان کی طرف متوجہ ہوا۔ کمانڈر تقریباً چالیس سال کا سخت چہرے اور گھٹے جسم والا شخص تھا، قصبے پر حملہ کرنے والی فوج کا کمانڈر وہی تھا اور بذات خود قتل عام کی کارروائی میں حصہ لے رہا تھا۔ اس نے روبینہ کی ماں کو دیکھا اور پھر اپنے ایک آدمی کو اشارہ کر کے آگے بلا کر کچھ کہا۔ وہ آدمی آگے بڑھا اور اس نے پستول سیدھا کیا تو روبینہ چلانے لگی۔ وہ بول نہیں سکتی تھی مگر چیخ تو سکتی تھی وہ خود کو اس فوجی سے چھڑانے لگی جس نے اس کا بازو تھام رکھا تھا۔

جو فوجی آگے آیا وہ گول گھٹے سر والا خوب صورت نوجوان تھا مگر اس وقت موت کا روپ دھار رکھا تھا۔ روبینہ کی ماں خوفزدہ ہوگئی اس نے چھری نیچے کرلی مگر جوان نے اپنا ہاتھ نہیں روکا، اس نے عورت پر لگاتار کئی فائر کیے اور وہ اپنے رنگین ہوتے لبادے کے ساتھ زمین پر ڈھیر ہوگئی۔ روبینہ اور اس کی بہن دھاڑیں مار کر رونے لگی تھیں۔ دشمن ہنس رہے تھے پھر وہ روبینہ اور اس کی بہن کو ایک عمارت میں لے آئے جہاں پہلے ہی پکڑی جانے والی جوان عورتیں اور لڑکیاں موجود تھیں۔ ان پر قیامت ٹوٹنا شروع ہوگئی تھی اور ان کی چیخوں سے مکان لرز رہا تھا مگر ان سنگ دل لوگوں پر ذرا اثر نہیں ہو رہا تھا، وہ اپنی درندگی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ روبینہ یہ سب دیکھ رہی تھی اچانک اس کا سر چکرایا اور پھر اسے ہوش نہیں رہا اسے ہوش اس وقت آیا جب اسے اٹھا کر گاڑی میں ڈالا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ کئی لڑکیاں اور عورتیں تھیں اور ان کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ وہ سب لٹ پٹ کر برے حالوں میں تھیں لیکن روبینہ ٹھیک تھی، اس کا لباس درست تھا اور جسمانی طور پر بھی ٹھیک تھی، اسے بے ہوشی نے بچا لیا تھا۔

پک اپ پہاڑی راستوں سے گزرتے ہوئے کئی گھنٹے بعد ایک قصبے میں داخل ہوئی۔ وہاں چرچ کی عمارت اور دوسری کچھ چیزوں سے روبینہ نے اندازہ لگایا کہ یہ دشمن کا قصبہ تھا۔ قصبہ ویران لگ رہا تھا، بہت کم چہل پہل تھی۔ جنگ نے اسے بھی متاثر کیا تھا۔ پک اپ قصبے کے آخر

میں رکی، اس کے ساتھ ایک فوجی جیپ میں کمانڈر اور اس کے چند ساتھی تھے۔ پک اپ کا شور سن کر مکان کا دروازہ کھلا اور ایک تنومند آدمی باہر آیا۔ اس نے لڑکیوں کا معائنہ کیا اور پھر درشت لہجے میں نیچے اترنے کو کہا۔ لڑکیاں سہم کر نیچے اتر آئی تھیں۔ کمانڈر نے اس سے کچھ بات کی کیونکہ اسے جلدی تھی اس لیے وہ لڑکیوں کو اس تنومند آدمی کے حوالے کر کے وہاں سے چلا گیا۔ لڑکیاں ایک ہی رسی سے بندھی تھیں اس لیے ان میں سے کوئی فرار بھی نہیں ہوسکتی تھی۔

روبینہ نے نظر اٹھا کر دیکھا یہ اس کے مکان جیسا تھا، دو منزلہ اور سب سے اوپر تکونی چھت میں دو چھتی تھی۔ وہ جانتی تھی اس مکان میں اندر خالی جگہ رکھی جاتی ہے تاکہ بند کمروں میں بھی ہوا کی آمد و رفت برقرار رہے۔ تنومند آدمی انہیں ہانک کر اس دو منزلہ مکان کے اندر لے آیا۔ مکان اندر سے گندا اور بدبودار تھا لیکن یہ بہت مضبوط لکڑی کا بنا ہوا تھا اور باہر آنے جانے کے لیے ایک ہی دروازہ تھا جس پر بہت مضبوط لاک لگا ہوا تھا۔ تنومند آدمی انہیں دھکیلتا ہوا گراؤنڈ فلور کے ایک بڑے کمرے تک لایا۔ یہاں قدیم وکٹورین انداز کا فرنیچر سجا ہوا تھا۔ آتش دان میں آگ جل رہی تھی۔ وہاں موجود میز کے پیچھے چرمی کرسی پر ایک سیاہ بالوں والا شخص موجود تھا۔ اس کے نقوش بتا رہے تھے کہ اس کا تعلق سرب نسل سے ہے۔ وہ سرد اور کاٹ دار نظروں سے لڑکیوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس نے اپنی زبان میں تنومند آدمی سے کچھ پوچھا۔ اس نے اسی زبان میں جواب دیا تو سیاہ بالوں والے کے تاثرات بگڑ گئے۔ وہ اٹھ کر سامنے آیا اور تنومند کو حکم دیا۔ اس نے چاقو نکالا تو لڑکیاں بے اختیار کراہنے اور لرزنے لگیں مگر اس نے صرف ان کے ہاتھوں کی رسیاں کاٹنے پر اکتفا کیا تھا۔

سیاہ بالوں والا کسی قسائی کی طرح ان کا جائزہ لے رہا تھا۔ خراشوں اور زخموں سے خون بہہ کر کپڑوں اور جسموں پر جم گیا تھا۔ اسی لیے اسے روبینہ کے صاف ستھرے ہونے پر کسی قدر حیرت ہوئی تھی۔ وہ تقریباً ساری خوب صورت اور نوعمر لڑکیاں تھیں البتہ ایک لڑکی کسی قدر بڑی اور شکل صورت کی خاص نہیں تھی۔ سیاہ بالوں والے نے اس کی طرف اشارہ کیا تو تنومند آدمی نے اسے آگے دھکیل دیا۔ وہ رونے لگی تھی، سیاہ بالوں والے نے اسے گھما کر اس کا رخ لڑکیوں کی طرف کیا اور پھر وہ بہت نرمی سے اس کے الجھے بال سنوارنے لگا اس نے انہیں جمع کر کے گردن سے ہٹایا اور اچانک ہی ایک چھوٹا چاقو اس کی گردن میں اتارا تو تمام لڑکیاں چیخ اٹھیں البتہ لڑکی کی چیخ نہیں نکلی تھی وہ ہاتھ سے خون کا فوارہ روکنے کی کوشش کرتے ہوئے فرش پر ڈھیر ہوگئی اور پھر اوندھے منہ گر کر ساکت ہوگئی۔ سیاہ بالوں والے نے سرد نظروں سے لڑکیوں کی طرف دیکھا اور ان کی زبان میں بولا۔

"میرا نام وکٹر ایمائل ہے اور تم یہاں میرے حکم کی تعمیل کرنے آئی ہو۔ جس نے حکم نہیں مانا اس کے ساتھ ایسا ہوگا۔ لے جاؤ انہیں۔" اس نے آخری جملہ تنومند شخص سے کہا۔ "ان سب کو ان کے کمروں میں پہنچا دو۔"

تنومند کا نام گارسیا نیروزکی تھا، لڑکیوں کو دھکیلتے ہوئے وہاں سے لے جانے لگا لیکن روبینہ ساکت کھڑی رہی، وہ وکٹر کو دیکھ رہی تھی۔ گارسیا نے اسے بھی بازو سے پکڑنا چاہا تو وکٹر نے اسے روک دیا۔ "نہیں! اسے رہنے دو۔ یہ میرے پاس رہے گی۔"

گارسیا نے شانے اچکائے اور بقیہ لڑکیوں کو لے کر وہاں سے چلا گیا۔ وکٹر روبینہ کے پاس آیا، اس نے غور سے اس کا معائنہ کیا اور پھر اس کی زبان میں بولا۔ "تمہیں کسی نے چھوا نہیں؟"

روبینہ لپ ریڈنگ کرسکتی تھی اس نے نفی میں سر ہلایا۔ وکٹر کا منہ بگڑ گیا اس نے غرا کر کہا۔ "زبان سے جواب دو۔"

تب روبینہ نے اشارے سے بتایا کہ وہ بول اور سن نہیں سکتی۔ وکٹر خلاف توقع خوش ہوگیا۔ "یہ تو اچھی بات ہے تم میرے بہت کام آؤ گی اور کسی کو اس بارے میں نہیں بتا سکو گی۔"

روبینہ اسے دیکھ رہی تھی اور وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ وہ اس سے کیا کام لینا چاہتا تھا اور وہ کسی کو اس بارے میں بتا بھی دیتی تو اسے کیا فرق پڑتا۔ اتنا تو وہ سمجھ گئی تھی کہ وہ درندوں کی بستی میں آگئی ہے۔ بلقان کا یہ خطہ صدیوں سے ان کا مسکن تھا۔ انہوں نے یہاں بہت سے دور دیکھے تھے اور ترکوں کے بعد انہیں بہت مشکلات سے گزرنا پڑا تھا۔ روبینہ کو مقامی سیاست کا بہت کم علم تھا۔ اس کی ساری دنیا اپنے گھر تک محدود تھی۔ اس کا باپ کاشت کار تھا اور ان کے پاس کئی مویشی بھی تھے۔ وہ بہت دولت مند نہیں تھے لیکن ان کی گزر اوقات اچھی ہوتی تھی۔ پھر جنگ شروع ہوگئی۔ روبینہ کو اتنا معلوم ہوا کہ کوسوو کے مسلمان اپنا الگ ملک چاہتے ہیں اس پر صدیوں سے ان کے ساتھ رہنے والے پڑوسی درندوں کی طرح ان پر ٹوٹ پڑے

تھے۔ مجبوراً ان لوگوں کو بھی ہتھیار اٹھانے پڑے تھے۔ روبینہ اور اس کی بہن مومینہ کا باپ از کر لڑنے چلا گیا۔ اب اس کی ماں ماری گئی تھی، مومینہ کا کچھ پتا نہیں تھا اور وہ خود اس خوفناک مکان میں تھی جہاں اس کے ساتھ نہ جانے کیا ہونے والا تھا۔

وکٹر اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ''ڈرو مت مجھ سے تمہیں کوئی نقصان نہیں ہوگا۔''

وکٹر نے اسے اوپری منزل پر سب سے آخر والا کمرا دیا تھا۔ اس کی کھڑکیوں پر شیشوں کی جگہ لکڑی کے تختے جڑے تھے اور ان میں کہیں کہیں سوراخوں سے باہر کا منظر نظر آتا تھا۔ وہاں لوہے کا ایک پلنگ تھا جس پر اسپرنگ والا گدا اور ایک کمبل تھا۔ فرش لکڑی کا تھا مگر صاف تھا جب کہ باقی گھر کا فرش بہت میلا تھا۔ وکٹر نے اسے بستر کی طرف دھکیلا اور اس بار بدلے لہجے میں بولا۔ ''تم یہاں رہو گی اور بلاضرورت باہر نہیں نکلو گی ورنہ تمہیں بھی ان لڑکیوں میں شامل کر دیا جائے گا۔''

روبینہ لرزنے لگی تھی وکٹر کے جانے کے بعد وہ سکڑ سمٹ کر بیڈ پر لیٹ گئی اور کمبل اپنے اوپر کر لیا وہ ماں کو یاد کر کے رو رہی تھی۔ اسے رہ رہ کر اس سخت چہرے والے کمانڈر کا خیال آ رہا تھا جس نے گول چہرے والے کو اس کی ماں کو شوٹ کرنے کا آرڈر دیا تھا۔ مومینہ ان لڑکیوں میں شامل تھی جنہیں گاؤں والے مکان میں لے جایا گیا تھا لیکن وہ ان لڑکیوں میں شامل نہیں تھی جو اس کے ساتھ یہاں آئی تھیں۔ پھر اسے اپنا باپ یاد آیا۔ وہ نہ جانے کہاں تھا اور اسے معلوم بھی تھا یا نہیں کہ اس کے خاندان اور گاؤں والوں پر کیا گزر رہی تھی۔ روبینہ کو نہیں معلوم تھا کہ کتنے لوگ بچ کر نکلنے میں کامیاب رہے تھے اور کتنے مارے گئے تھے۔ وہ روتی رہی اور گھر والوں کو یاد کرتی رہی۔ اچانک دروازہ کھلا اور گارسیا نے اندر جھانکا اور اسے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ وکٹر نے اسے بھی بتا دیا تھا کہ وہ گونگی بہری ہے اس لیے اب وہ اشاروں میں بات کر رہا تھا۔ روبینہ اٹھ کر باہر آگئی۔ گارسیا اسے ایک کمرے میں لے آیا، وہاں وکٹر ایک لڑکی کے پاس بیٹھا تھا وہ بستر پر دراز تھی اور کسی بھیڑ کی طرح سہمی ہوئی تھی۔ وکٹر کے ہاتھ میں ایک لکڑی کا باکس تھا۔ اس نے روبینہ کو پاس بلایا اور گھٹنوں کے بل لڑکی کے پاس بیٹھنے کو کہا۔ روبینہ نے حکم کی تعمیل کی تو وکٹر نے اسے بکس تھمایا، روبینہ نے اسے کھولا تو اس میں ترتیب اور سلیقے سے ایک ایک خانے میں سرنجیں، سفید پاؤڈر والی تھیلی، ایک چھوٹا لیکن گہرا دھاتی چمچ، ڈسٹل واٹر کی شیشی، ایک چمڑے کی ٹکڑی اور ایک لائٹر رکھا تھا۔ وکٹر نے اس کا سر اپنی طرف گھمایا اور بولا۔

''میں جو کہہ رہا ہوں وہ کرو۔''

روبینہ نے مجبوراً سر ہلایا وہ ڈر رہی تھی۔ اس نے وکٹر کی ہدایت کے مطابق چمڑے کا ٹکڑا کس کر لڑکی کے بازو پر باندھا پھر اس نے چمچ میں تھیلی سے تھوڑا سا سفید پاؤڈر نکالا اور اس میں کچھ ڈسٹل واٹر ڈال کر اسے لائٹر سے گرم کیا تو پاؤڈر پانی میں حل ہو گیا۔ پھر اس نے اسے سرنج میں بھرا اور سرنج کی سوئی لڑکی کی ابھر آنے والی نس میں داخل کر کے محلول انجیکٹ کر دیا۔ فوراً ہی لڑکی کی آنکھیں دھندلانے لگیں اور وہ منہ کھول کر گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ وکٹر اس کے کام سے خوش نظر آ رہا تھا کیونکہ اس نے جیسا جیسا کہا روبینہ نے ویسا ہی کیا تھا۔ پھر وہ اسے دوسری لڑکی کے کمرے میں لایا اور یہاں بھی یہی مشق دہرائی گئی۔ یکے بعد دیگرے روبینہ تمام کمروں میں گئی اور لڑکیوں کو ہیروئن کا انجکشن لگایا۔ کمروں میں آتے جاتے اس نے دیکھا کہ راہداریوں اور سیڑھیوں پر کئی لوگ موجود تھے وہ آپس میں گپ شپ کر رہے تھے اور شراب پی رہے تھے آخر میں وکٹر اسے سیڑھیوں کے نیچے کچن میں لایا اور ایک کیبنٹ کھول کر لکڑی کا بکس اس میں رکھ دیا۔ پھر اس نے روبینہ سے کہا۔

''اب تمہاری ذمے داری ہے تم سے جب کہا جائے گا تم ان لڑکیوں کو اسی طرح انجکشن دو گی۔ یہ ان کے لیے اچھا ہوگا کیونکہ اس طرح انہیں ملنے والی اذیت کی تکلیف کم محسوس ہوگی۔ میری بات سمجھ رہی ہو نا؟''

روبینہ نے سر ہلایا تو وکٹر نے دوبارہ کہا۔ ''اس کے علاوہ تم صفائی کرو گی اور سب کے لیے کھانا بناؤ گی۔''

اس بار بھی روبینہ نے سر ہلایا تو وکٹر نے اسے اوپر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ اوپر سیڑھیوں کی طرف آئی تو اس نے راہداریوں میں موجود افراد کو بھوکے کتوں کی طرح کمروں کی طرف جھپٹتے دیکھا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں آئی، اسے معلوم تھا کہ لڑکیوں کے ساتھ کیا ہو رہا ہوگا۔ وہ سن نہیں سکتی تھی مگر اس کی چھٹی حس اسے بتا رہی تھی کہ یہاں بھی وہی کھیل کھیلا جا رہا تھا جو اس کے گاؤں میں کھیلا گیا تھا اور جسے دیکھ کر وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ وہ بستر میں گھس کر لیٹ گئی۔ اس کے آنسو بہہ رہے تھے۔ آنے والے چند دنوں میں اسے اچھی طرح معلوم ہو گیا تھا کہ کب اسے کیا کرنا ہے؟ وہ صبح اٹھ کر سب سے پہلے بالٹی میں پانی اور صفائی کا

سامان لے کر لڑکیوں کے کمرے میں جاتی اور ان کے زخموں کی دوا ملے پانی سے صفائی کرتی تھی۔ پھر کچن میں آ کر ان کے لیے کھانا بناتی اور انہیں ان کے کمروں میں کھانا پہنچاتی۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ اس دو منزلہ مکان کی صفائی کرتی۔ یہ آسان کام نہیں تھا کیونکہ مکان بہت بڑا تھا۔ یہاں لوگوں کی آمد و رفت زیادہ تھی۔ یہ سب گندے ذہن اور گندے جسموں والے لوگ تھے۔

دوپہر کے بعد لوگوں کی آمد شروع ہو جاتی اور اس کا اصل کام شروع ہوتا تھا۔ وکٹر آنے والوں سے بھاری رقم وصول کرتا تھا اور پھر اس کے اشارے پر روبینہ تمام لڑکیوں کو ہیروئن کے انجکشن دیتی تھی۔ یہ مکان اصل میں ایک قحبہ خانہ تھا اور یہاں مجبور لڑکیوں پر ہوس کے مارے لوگ ظلم و ستم کے پہاڑ توڑتے تھے۔ مکان عام گاؤں سے ذرا ہٹ کر تھا اور یہاں ہونے والی سرگرمیوں کی خبر شاید دوسرے لوگوں کو نہیں تھی۔ ممکن ہے ہوتی تب بھی کوئی اعتراض نہ کرتا کیونکہ جن لڑکیوں کے ساتھ یہاں ظلم ہوتا تھا وہ سب دشمن قوم سے تعلق رکھتی تھیں۔ یہاں آنے والے زیادہ تر لوگ آس پاس کے رہنے والے تھے۔ ان میں فوجی بھی ہوتے تھے۔ روبینہ نے دیکھا کہ لڑکیوں والے کمروں کے تمام ہی بستر خون کے پرانے دھبوں سے بھرے ہوئے تھے۔ ان پر چادریں بدل دی جاتی تھیں اور جب وہ ایک حد سے زیادہ میلی ہو جاتیں تو ان کی جگہ دوسری چادر ڈال دی جاتی اور اتاری جانے والی چادریں مکان کی بھٹی میں ڈال کر جلا دی جاتی تھیں۔

پھر ایک صبح روبینہ معمول کے مطابق لڑکیوں کی صفائی کرنے کا سامان لے کر ایک لڑکی کے کمرے میں پہنچی تو وہ ساکت لیٹی رہی۔ روبینہ کے ہلانے پر بھی اس نے حرکت نہیں کی تو وہ گھوم کر اس کے سامنے آئی اور پھر اس کے منہ سے چیخ نکلی تھی لڑکی کی آنکھیں کھلی تھیں اور اس کے منہ سے خون بہہ رہا تھا اس نے شیشے کا گلاس چبا لیا تھا اور شیشے نے اس کا منہ کاٹ دیا تھا۔ اس کی چیخ سن کر گارسیا اندر آیا اور اس نے مردہ لڑکی کو دیکھ کر زیر لب کچھ کہا اور پھر باہر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک بڑی چادر لے کر آیا اور اسے بچھا کر لڑکی کی لاش اس پر گرا دی اور پھر اسے چادر میں لپیٹ کر کھینچتا ہوا وہاں سے لے گیا۔ روبینہ نے دیکھا کہ وہ اسے سیڑھیوں سے نیچے لے جا رہا تھا۔ اچانک کسی نے اس کے شانے پر ہاتھ مارا اس نے چونک کر دیکھا وہ وکٹر تھا جو اسے خشمگیں نظروں سے گھور رہا تھا، اس نے کہا۔

''جا کر اپنا کام کرو۔''

روبینہ جلدی سے آگے بڑھ گئی۔ دو گھنٹے بعد وہ فارغ ہو کر کمرے میں آئی اور بستر پر بیٹھ کر کھڑکی کے تختوں سے باہر دیکھنے لگی۔ مکان کے سامنے دور تک جنگل تھا۔ قصبہ بائیں طرف تھا۔ اچانک اس کی نظر سامنے دیوار میں لگی جالی پر گئی۔ یہ ایگزاسسٹ کی جالی تھی جو مکان کے اندرونی خلا میں کھلتی تھی روبینہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر اس نے اٹھ کر جالی کو پاس سے دیکھا یہ دو موٹے اسکروز سے جڑی تھی اور ان اسکروز کو انگلیوں سے بھی کھولا جا سکتا تھا۔ اس نے کوشش کی اور اسکروز کھول لیے پھر اس نے خلا میں جھانکا۔ یہ مکان کے بیچ میں تھا یہاں مکان کے ستون اور بیم تھے، لکڑیاں ایسی تھیں جو آڑی ترچھی ہو کر مکان کے اسٹرکچر کو مضبوط کر رہی تھیں، ان کے درمیان کہیں کہیں خلا تھے۔ روبینہ نے سوچا اور پھر دروازے کا لاک اندر سے لگا کر وہ خانے تک آئی اس کا جسم ہلکا اور چھریرا تھا اس لیے وہ آسانی سے اندر داخل ہو گئی۔ پتلا سا راستہ جا رہا تھا وہ اس کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگی۔ شاید اسے خیال تھا کہ ممکن ہے یہ راستہ اسے مکان سے نکلنے میں مدد دے۔ وہ آنے والے راستوں پر مڑتی رہی اور جہاں ایگزاسسٹ کی جالی تھی وہاں سے باہر دیکھتی رہی کہ وہ کس جگہ تھی۔

ایک گھنٹے کی کوشش کے باوجود اسے مکان سے نکلنے کی کوئی راہ نظر نہیں آئی تھی مگر وہ مایوس نہیں ہوئی کیونکہ اس نے ابھی پوری طرح خلا نہیں دیکھا تھا جو مکان کے اوپری حصے تک جا رہا تھا۔ اس کے بعد جب اسے موقع ملتا وہ اپنے کمرے کے ایگزاسسٹ کے راستے خلا میں داخل ہو جاتی تھی۔ یہاں سے وہ ہر کمرے تک رسائی حاصل کر سکتی تھی۔ اس نے یہ کیا کہ تمام خانوں کی جالیوں کے اسکروز رفتہ رفتہ کھول کر بند کر دیے اور یوں وہ رواں ہو گئے اب وہ جب چاہتی کسی بھی جالی کے اسکروز اندر سے بھی کھول سکتی تھی، اس کی پتلی لمبی انگلیاں اس کام میں بہت مددگار ثابت ہوتی تھیں۔ وہ اندر سے دو انگلیاں باہر نکال کر اسکروز کھول لیتی۔ ان ایگزاسسٹ سے وہ ہر جگہ جا سکتی تھی لیکن وہ کوشش کے باوجود مکان سے باہر جانے کا راستہ تلاش نہیں کر سکی تھی شاید راستہ نہیں تھا یا شاید پھر اسے ملا نہیں تھا۔ کیونکہ جتنا بڑا یہ مکان تھا اتنا ہی بڑا اس کا ایگزاسسٹ والا خلا تھا اس میں نیچے تہ خانے کی بھٹی سے آنے والے دھوئیں کے اخراج کے پائپ بھی گزر رہے تھے۔ اس میں پانی کی لائنیں بھی تھیں۔ کئی ایسی جگہیں تھیں جہاں سے وہ بھی نہیں گزر سکتی تھی وہاں خلا تاریک تھا اور اسے تاریکی میں جاتے ہوئے ڈر لگتا

تھا، اس کے پاس روشنی کے لیے کوئی چیز نہیں تھی۔

خلا میں جابجا مکڑی کے جالے لگے ہوئے تھے، مٹی اور گرد کی تہیں جمی تھیں۔ جب وہ اندر جاتی تو سر سے پاؤں تک مٹی میں اٹ جاتی تھی پھر اسے خود کو واش روم جا کر صاف کرنا پڑتا تھا ویسے اس نے اسکرٹ کے ساتھ لمبی اونی فراک پہن رکھی تھی یہ مٹی پکڑتی نہیں تھی اور جھاڑنے پر آسانی سے صاف ہو جاتی تھی اس کی ٹانگوں پر نائلون کے لمبے موزے تھے یہ بھی گندے نہیں ہوتے تھے صرف اس کا اسکرٹ میلا ہوتا تھا تو وہ اسے صاف کر لیتی تھی پھر اس نے یہ حل نکالا کہ خانے کی رفتہ رفتہ صفائی شروع کر دی۔ وہ ایک میلا کپڑا لے کر جاتی اور اس سے اپنا راستہ صاف کرتی اور پھر موقع پا کر کپڑا دھو لیتی تھی۔ شروع میں اسے چوٹیں بھی لگی تھیں کیونکہ خلا خطرناک موڑوں، لکڑیوں اور کیلوں سے بھرا پڑا تھا لیکن پھر وہ ان تمام مقامات سے اچھی طرح واقف ہو گئی اور اب وہ رات میں اس خلا میں سفر کر سکتی تھی لیکن وہ عام طور سے بہت صبح یا شام کے وقت ہی ایسا کرتی تھی۔ جب وہاں اوباشوں کا کوئی گروپ آتا اور وہ لڑکیوں کو نشے کا انجکشن دے کر آتی تو اس کے بعد دو سے تین گھنٹے اسے کوئی تنگ نہیں کرتا تھا۔ وہ اسی دوران میں خلا کی سیر کرتی، مختلف کمروں میں جھانکتی جہاں موجود لڑکیاں آنے والے مردوں کی ہوس کا نشانہ بن رہی ہوتی تھیں۔

وہ دیکھتی اور کانپ جاتی، اسے خیال آتا کہ جلد یا بدیر اسے بھی ایسے ہی حالات سے گزرنا پڑے گا۔ کبھی کبھی اسے حیرت ہوتی کہ وہ اب تک بچی ہوئی کیسے ہے۔ حد یہ کہ وکٹر نے بھی اسے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ وہ اس سے کام لیتا تھا اور اس کا خیال رکھتا تھا لیکن اس نے کبھی اسے اپنے کمرے میں نہیں بلایا۔ اس کے بجائے وہ کبھی موڈ میں ہوتا تو اسے مائی لٹل اینجل کہہ کر پکارتا۔ شاید اس کے گلے میں موجود اس لاکٹ کی وجہ سے جس پر فرشتے کی شبیہ تھی۔ یہ لاکٹ اسے اس کی ماں نے دیا تھا۔ جب وہ چند مہینے پہلے سولہ سال کی ہوئی تھی اس کی ماں نے اسے بتایا کہ اب وہ جوان ہے اور جب وہ اس کی شادی کر دیں گے تو وہ خود کئی بچوں کی ماں بنے گی، اس کا اپنا گھر اور اپنا خاندان ہو گا۔ لیکن اب اس کے پاس کچھ نہیں تھا اس کا خاندان بکھر گیا تھا اور خود وہ ایک قحبہ خانے میں قید تھی۔

وکٹر دونوں ہاتھوں سے کما رہا تھا۔ ہوس کار دوپہر سے پہلے ہی اس کے مکان کے پاس جمع ہونا شروع ہو جاتے تھے لیکن اندر آنے کی اجازت بس ان کو ملتی تھی جن کے پاس ادا کرنے کے لیے رقم ہوتی تھی اور یہ زیادہ تر اوباش ہوتے تھے جو آس پاس مسلمانوں کے گاؤں دیہات سے لوٹ مار کر کے آتے اور اس رقم سے عیاشی کرتے تھے۔ وکٹر نے کچھ اصول و قواعد بنائے ہوئے تھے۔ دھندا دوپہر تین بجے شروع ہوتا تھا۔ ہر آدمی کو ایک گھنٹا ملتا تھا اور پھر لڑکی کو گھنٹے آرام کا موقع دیا جاتا تھا۔ اس دوران میں روبینہ لڑکیوں کی صفائی کرتی۔ ہر بار وہ ان جسموں پر نئے زخم پاتی تھی۔ وہ روتی دھوتی تھیں، اس کے سامنے گڑگڑاتیں کہ وہ انہیں یہاں سے نکال دے لیکن انہیں معلوم نہیں تھا کہ روبینہ خود بھی یہاں قیدی تھی۔ جو یہاں سے نکلنے کی التجا نہیں کرتی تھیں ان کی خواہش ہوتی تھی کہ روبینہ انہیں ہیروئن انجکشن نہ دے۔ وہ جانتی تھیں کہ مسلسل نشہ اور ہوس کاروں کا ساتھ انہیں موت کی طرف لے جا رہا تھا۔ روبینہ یہ بھی نہ کر سکتی تھی۔

دوسرا دور چھ بجے ہوتا اور تیسرا اور آخری دور نو بجے ہوتا تھا اس کے بعد لڑکیوں کو کھانے کے ساتھ دوائیں دی جاتی تھیں تاکہ وہ آنے والے دن کے لیے تیار ہوں۔ انہیں خوراک اچھی دی جاتی تھی اس کے باوجود لڑکیاں مسلسل کمزور اور نیم جان ہو رہی تھیں۔ ایک مہینے میں تین لڑکیاں مر چکی تھیں اور ان کی لاشیں تنومند شخص اسی طرح چادروں میں لپیٹ کر کہیں لے جا چکا تھا۔ روبینہ کو علم نہیں تھا کہ ان لاشوں کے ساتھ کیا کیا جاتا تھا۔ دوسرے مہینے کے اختتام تک مزید دو لڑکیاں زندگی ہار گئی تھیں اور اب وہاں پانچ لڑکیاں تھیں اس کے بعد وہاں مزید لڑکیاں نہیں لائی گئی تھیں۔ یہ پانچ بھی برے حالوں میں تھیں اور اب وکٹر ہفتے میں دو دن انہیں مکمل آرام کا موقع دیتا تھا مگر روبینہ کو لگ رہا تھا کہ جلد یہ پانچوں بھی مر جائیں گی اور اس کے بعد شاید اس کی باری آئے گی۔ جب اسے یہ خیال آتا تو وہ کانپ جاتی تھی۔

کئی بار ایسا ہوا وہاں آنے والے عیاشوں نے وکٹر کو روبینہ کے عوض بہت بڑی رقم کی پیشکش بھی کی لیکن اس نے ہر بار یہ پیشکش ٹھکرا دی، کوئی زیادہ ہی سر ہوتا تو وکٹر کا جواب ہوتا کہ وہ اس کی محبوبہ ہے اس لیے وہ مجبور ہے۔ وکٹر کے دفتر میں جہاں روبینہ اور لڑکیوں کو پہلی بار پیش کیا گیا تھا ایک چھوٹی سی لیکن بہت مضبوط تجوری تھی یہ نمبروں سے کھلتی تھی اور روبینہ نے اس کا نمبر بھی معلوم کر لیا تھا کیونکہ کئی بار جب وہ ایگزاسٹ کے خانے سے وکٹر کے دفتر میں جھانک رہی ہوتی تھی تو اس نے تجوری کھولی تھی اور یہ رقم سے بھری ہوئی تھی۔ ہر دن اس رقم میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ روبینہ چاہتی تو

اس کی تجوری کھول سکتی تھی مگر اس نے کبھی ایسا سوچا ہی نہیں تھا۔ اس رقم کی اس کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں تھی۔ اس مکان میں وکٹر اور گارسیا کے سوا کوئی نہیں رہتا تھا، باہر کے سارے کام گارسیا کرتا تھا۔ وہ سامان لاتا اور جب باہر جاتا تو لڑکیوں کے کمرے باہر سے لاک کر جاتا تھا۔ وہ لڑکیوں پر کڑی نظر رکھتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ روبینہ کو کسی قدر چھوٹ تھی اس کے باوجود وہ اس پر بھی نظر رکھتا تھا۔

مکان کے عقبی حصے میں بھی ایک دروازہ ہوتا تھا لیکن اب اسے تختے لگا کر مستقل بند کر دیا گیا تھا۔ نیچے کی ساری کھڑکیوں پر لوہے کی گرلز تھیں اور اوپری کھڑکیوں پر لکڑی کے تختے بھی لگے تھے۔ یعنی فرار سے روکنے کا پورا انتظام تھا۔ حالانکہ وہاں کسی لڑکی میں فرار کی ہمت ہی نہیں تھی۔ اس طرف آتے ہوئے روبینہ نے محسوس کیا تھا کہ وہ دشمن کے علاقے میں بہت اندر تک آ گئے تھے، کیونکہ سڑکوں پر ان کی زبان کے بورڈ تھے اور چاروں طرف ان کی صورتوں کے لوگ دکھائی دے رہے تھے۔ پھر مختلف علاقوں میں جنگ چھڑی تھی اور اس دوران میں کسی کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ شاید محاذ جنگ یہاں سے بہت دور بھی نہیں تھا کیونکہ کبھی کبھی رات کی تاریکی میں روبینہ کو دور سے ہونے والے دھماکوں کی چمک دکھائی دیتی تھی۔

اب جو پانچ لڑکیاں بچی تھیں انہوں نے خود کو تقدیر کے سپرد کر دیا تھا۔ مزاحمت تو ان میں سے پہلے بھی کسی نے نہیں کی تھی لیکن وہ پُر امید تھیں کہ شاید ان کی فوج اس علاقے تک آ جائے اور وہ آزاد ہو سکیں لیکن اب ان کی امید اپنی چھ ساتھیوں کی طرح دم توڑ گئی تھی۔ وہ سمجھ گئی تھیں کہ اس قید خانے سے موت ہی آ کر انہیں آزاد کرا سکتی تھی۔ ان میں ایک لڑکی جس کا نام ساشا تھا وہی روبینہ سے بات بھی کر لیتی تھی، اسے پتا چل گیا تھا کہ روبینہ گونگی بہری ہے اس لیے ایک دن اس نے اچانک اشاروں کی زبان استعمال کی تو روبینہ حیران اور خوش ہو گئی تھی۔ اس نے جلدی سے پوچھا۔ ”تم اشاروں کی زبان جانتی ہو؟“

ساشا پھیکے انداز میں مسکرائی۔ ”میری ماں گونگی تھی میں نے اس کے لیے یہ زبان سیکھی تھی۔ میرا تعلق تیراسکا سے ہے۔“

”میرا زوبر سکو سے ہے۔“ روبینہ نے اپنے گاؤں کا نام بتایا۔ کیونکہ وہ اشاروں میں بات کر رہی تھیں اس لیے کسی کے سن لینے کا خطرہ نہیں تھا۔ جو آخری شخص ساشا کے پاس سے گیا تھا اس نے درندگی کی حد کر دی تھی۔ ساشا کا چہرہ اور ہونٹ خون آلود اور سوجے ہوئے تھے، اس کی کلائیاں اور رانیں زخموں سے بھرتی جا رہی تھیں اور نیچے بیڈ شیٹ خون کے دھبوں سے بھر چکی تھی۔ روبینہ یہ سب دیکھ کر دکھی ہو رہی تھی۔ اسے روتے دیکھ کر ساشا نے پیار سے اس کا چہرہ سہلایا اور اشاروں سے کہا۔ ”یہ ہمیں مسلمان اور دوسری نسل کا ہونے کی سزا دی جا رہی ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے میرے چھ گھر والے مار دیے گئے۔ میرے چار بھائی، میری ماں اور باپ کو ان درندوں نے مار دیا، میں لڑکی تھی اس لیے مجھے بے آبرو کرنے کے لیے یہاں لے آئے۔ مجھے معلوم ہے میں زیادہ دن زندہ نہیں رہوں گی۔ جلد موت مجھے میرے ماں باپ اور بھائیوں کے پاس لے جائے گی۔“

روبینہ کو ساشا سے انسیت محسوس ہو رہی تھی بعد میں اس نے سوچا تو اسے خیال آیا کہ ساشا کی صورت اس کی بہن مومینہ سے بہت ملتی تھی۔ مومینہ کا خیال آتے ہی اس کے اندر ہوک سی اٹھی تھی، نہ جانے اس کی بہن کہاں اور کس حال میں ہو گی زندہ بھی ہو گی یا اسے بھی ان چھ لڑکیوں کی طرح زیادتی کا نشانہ بنا کر مار دیا گیا ہو گا۔ جن دو دنوں میں لڑکیوں کو آرام دیا جاتا تھا اس دوران میں انہیں نہانے دھونے اور خود کو صاف کرنے کا موقع بھی ملتا تھا۔ لباس ان کے پاس وہی تھے۔ روبینہ انہیں دھو کر بھٹی کے پاس لٹکا کر سکھا دیتی تھی جب تک لڑکیاں گرم پانی سے اپنے زخموں اور دکھتے بدن کی سکائی کرتی تھیں۔ پانی کا ٹب تہ خانے میں تھا۔ یہاں روبینہ کو موقع ملتا تھا کہ وہ ساشا سے ذرا کھل کر بات کر سکے۔ ورنہ اوپر وہ صرف کام کے موقع پر یا صفائی کرتے اور کھانا دیتے ہوئے اس کے پاس جا سکتی تھی اور یوں اسے زیادہ وقت نہیں ملتا تھا۔

سردیوں کے آغاز کے ساتھ ہی ان کی کم بختی آ گئی تھی کیونکہ مکان کو گرم رکھنے کا نظام زیادہ بہتر نہیں تھا اور اوپر والی منزل تو بہت سرد ہو جاتی تھی۔ وہ اپنے کمبلوں میں بھی ٹھٹھرتی تھیں لیکن کس سے فریاد کرتیں، وکٹر کے نزدیک وہ دشمن قوم کی اور کمانے والی مشینیں تھیں۔ اگر ایک مشین ناکارہ ہو جائے تو اس کی جگہ دوسری مشین آ جاتی ہے۔ روبینہ کا کمرا اکھلا ہوا تھا اور کھڑکی سے بہت سرد ہوا اندر آتی تھی، اس نے اس پر کاغذ اور گتے لگا کر بند تو کیا تھا مگر پھر بھی جھریاں ہوا کرتی تھیں جب اسے زیادہ سردی لگتی تو وہ ایگزاسٹ والے خانے میں گھس کر بھٹی والے پائپ کے پاس بیٹھ جاتی۔ اس سے گرم ہوا گزرتی تھی اور روبینہ

اس سے گرمی حاصل کرتی تھی۔ پھر جب اسے سکون ہوتا تو واپس کمرے میں آکر سو جاتی تھی۔

دو دن کی چھٹی کے بعد جب پیر آیا تو وکٹر بہت خوش تھا کیونکہ فوجیوں کا ایک دستہ جو چھٹی گزارنے گھر جا رہا تھا وہ راستے میں کچھ وقت یہاں رکتا، ان کے پاس تنخواہ اور لوٹ کا مال تھا، اس لیے وکٹر کو امید تھی کہ آج بہت اچھا کاروبار ہو گا۔ اس نے لڑکیوں کو صبح سے تیار ہونے کا حکم دے دیا تھا۔ بیڈز پر نئی چادریں بچھائی گئی تھیں اور روبینہ سے کمرے بھی صاف کرائے گئے تھے۔ حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ روبینہ نے دیکھا تھا وہاں آنے والوں کو اس گندگی کی ذرا بھی پروا نہیں ہوتی تھی، انہیں اجڑی اور نوچی کھسوٹی لڑکیوں کی بھی پروا نہیں ہوتی تھی وہ تو بس اپنی حیوانیت کی تسکین کرنے آتے تھے۔ وکٹر نے اسے نیا سامان مہیا کیا تھا کیونکہ پرانا سامان ختم ہو گیا تھا۔ سرنجیں ناکارہ ہو گئی تھیں اور ہیروئن پاؤڈر ختم تھا۔ اسے ہر بار پانچوں لڑکیوں کو ڈوز دینا ہوتی تھی۔ دوپہر سے پہلے ہی بھوکے بھیڑیے وہاں آگئے تھے۔

وہ اپنے ساتھ قسم قسم کی شرابیں لائے تھے اور راہداریوں میں کھڑے آپس میں بے ہودہ مذاق کر رہے تھے۔ ان میں سے اکثر نے اپنی گندی وردیاں ہی پہن رکھی تھیں۔ ان کی تعداد زیادہ تھی اس لیے وکٹر نے اپنا دو گھنٹے وقفے والا اصول ختم کر دیا۔ یہ دن ان لڑکیوں کے لیے قیامت بن کر گزر رہا تھا۔ مگر شام تک وکٹر کی تجوری میں خاصی بڑی رقم کا اضافہ ہو گیا تھا۔ جب ان درندوں کے جانے کے بعد روبینہ لڑکیوں کے کمرے میں گئی تو ان کی حالت دیکھ کر اس کی روح تک لرز گئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے آنے والے سچ مچ بھیڑیے تھے، انہوں نے سب کو چیر پھاڑ کر رکھ دیا تھا۔ تین لڑکیوں کو تو ہوش ہی نہیں تھا اور ان میں سے ایک اٹک اٹک کر سانس لے رہی تھی، وہ تو بس آج رات کی مہمان ہی لگ رہی تھی۔ ساشا ہوش میں تھی لیکن حالت اس کی بھی خراب تھی جب روبینہ اس کے زخم صاف کر رہی تھی تو اس نے روبینہ کی کلائی پکڑ لی اور سرگوشی میں بولی۔

"میں مرجانا چاہتی ہوں پلیز میری مدد کرو... مجھے کوئی چیز لا دو۔"

کچن کی چھریاں روبینہ کے اختیار میں تھیں لیکن اگر وہ ان میں سے کوئی چھری ساشا کو لا دیتی تو بعد میں خود اس کا کیا ہوتا، وہ صرف سوچ سکتی تھی۔ وکٹر کا رویہ اس کے ساتھ کتنا ہی اچھا سہی وہ اس کی سفاکی سے روز اول سے واقف تھی، جب اس نے صرف ان کو ڈرانے کے لیے ایک لڑکی کی شہ رگ کاٹ دی تھی۔ وہ غصہ ور اور سخت آدمی تھا جب وہ روبینہ سے غصے میں بات کرتا تو وہ ڈر جاتی تھی۔ اس نے نفی میں سر ہلایا اور اشارے سے بولی۔ "میں ایسا نہیں کر سکتی ورنہ وہ مجھے مار دے گا وہ بہت سفاک آدمی ہے۔"

"تب مجھے انجکشن مت دو، میں اذیت برداشت کر کے مرجانا چاہتی ہوں۔"

روبینہ جانتی تھی یہ بھی ممکن نہیں تھا، وہ ساشا کو انجکشن نہ دیتی اور وکٹر کو پتا چل جاتا تب بھی اس کی خیر نہیں تھی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے اسفنج سے ساشا کے زخم صاف کرتی رہی۔ وہ اسے التجا آمیز نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ "پلیز۔" اس نے سرگوشی میں کہا۔

اچانک روبینہ نے اسفنج اور بالٹی ایک طرف رکھ دی اور ساشا کے ساتھ بیٹھ گئی اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ وہ رو رہی تھی اس کے آنسو اس کی بے بسی کا اقرار کر رہے تھے۔ ساشا اپنی تکلیف بھول کر بے قرار ہو گئی، وہ اس کے آنسو صاف کرنے لگی۔ "مت رو... ٹھیک ہے، سب ٹھیک ہے کچھ مت لاؤ... تم مجھے انجکشن دے دینا لیکن رو مت۔"

روبینہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر اس نے اپنے گلے سے فرشتے کی شبیہ والا لاکٹ اتارا اور اسے ساشا کے گلے میں پہنا دیا اور اشارے سے بتایا کہ یہ اس کی ماں نے اسے تحفظ کے لیے پہنایا تھا آج وہ ماں کی اس نشانی کو اس کے سپرد کر رہی ہے۔ وہ اس کے لیے اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ ساشا لاکٹ اور زنجیر مٹھی میں لے کر سسک سسک کر رونے لگی۔ روبینہ اسے پیار کرنے اور چپ کرانے لگی۔ اچانک دروازہ کھلا اور گارسیا نے اندر جھانکا۔ اس نے غرا کر کہا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے، اپنا کام کر کے باہر آؤ وقت نہیں ہے ابھی۔"

روبینہ جلدی سے بالٹی اور سامان اٹھا کر باہر آگئی ساشا نے لاکٹ اپنی مٹھی میں چھپا لیا تھا۔ اس رات وکٹر نے غیر متوقع طور پر روبینہ کو اپنے کمرے میں طلب کیا۔ وہ پی رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے جھلک رہا تھا کہ وہ نشے میں ہے۔ اس نے روبینہ کی طرف دیکھا اور بولا۔ "میری اینجل تم میرے لیے خوش قسمتی لے کر آئی ہو لیکن مجھے لگ رہا ہے اب میری خوش قسمتی کا دور ختم ہونے والا ہے کیونکہ ایوان آ رہا ہے۔"

روبینہ نہیں جانتی تھی کہ ایوان کون تھا اور اس کے آنے سے وکٹر کی خوش قسمتی کیسے ختم ہو جائے گی۔ وکٹر اس کے پاس آیا۔ "ایوان اچھا آدمی نہیں ہے درحقیقت اسی نے مجھے

دھندے پر لگایا ہے اور ایسا لگ رہا ہے وہ کل مجھ سے حساب لینے آئے گا۔ ممکن اس کے بعد میں یہاں نہ رہوں یا اس دنیا میں نہ رہوں۔ مجھے اپنی نہیں تمہاری فکر ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی جیکٹ کی جیب سے ایک چابی نکال کر اس کی طرف بڑھائی۔ "یہ اس گھر کے ہر تالے کو کھول سکتی ہے۔"

روبینہ نے چابی تھام لی مگر وکٹر نے اس پر گرفت کم نہیں کی اور بولا۔ "یہ اس وقت کے لیے ہے جب تم دیکھو کہ میں یہاں کا آقا نہیں رہا ہوں اس وقت تم یہاں سے فرار ہو سکو گی۔ اسے سنبھال کر رکھنا اور یاد رکھنا اگر اس سے پہلے بھاگنے کی کوشش کی تو تمہارے ساتھ ان لڑکیوں جیسا حشر ہو گا۔ تم مجھے دھوکا دے کر نہیں جا سکتیں۔"

روبینہ نے کوئی جواب نہیں دیا، وہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وکٹر اس کے ساتھ اتنا اچھا سلوک کیوں کر رہا ہے، وہ اچھا انسان نہیں تھا اور اب تک روبینہ نے اسے دوسروں سے جس طرح پیش آتے دیکھا تھا اسے وکٹر سے کسی اچھائی کی امید بھی نہیں تھی اس کے باوجود روبینہ سے اس کا رویہ حیران کن تھا۔ اس نے چابی اپنی جیب میں رکھ لی۔ وکٹر کی باتوں سے ایسا لگا جیسے وہ جلد یہاں سے کہیں چلا جائے گا۔ لڑکیوں کی حالت ویسے ہی خراب تھی اور وہ بچ بھی گئیں تو یہ لوگ انہیں مار دیتے۔ روبینہ کو خیال آیا کہ اس صورت میں اس کا کیا ہو گا؟ کیا وکٹر اسے ساتھ لے جائے گا اور ساتھ لے گیا تو کس حیثیت سے لے جائے گا۔ وہ اسے آزاد نہیں چھوڑ سکتا تھا کیونکہ وہ اس کے جرائم کی عینی گواہ تھی بلکہ وہ اس کے جرائم میں شامل تھی لیکن یہ بات اسے وکٹر کے خلاف جانے سے نہیں روک سکتی تھی، یہ بات وکٹر بھی سمجھتا تھا اس لیے امکان تھا وہ اسے ساتھ ہی رکھے گا۔ کہیں جانے نہیں دے گا۔

چابی لے کر روبینہ اپنے کمرے میں آگئی۔ ایک لمحے کو اسے خیال آیا کہ وہ چابی لے کر چپکے سے نکل جائے مگر پھر وہ گارسیا کا سوچ کر سہم گئی وہ رات میں دروازے کے سامنے کرسی رکھ کر سوتا تھا تا کہ کوئی لڑکی فرار نہ ہو سکے۔ وہ چوکس بھی بہت تھا اس کے ہوتے ہوئے چابی رکھنے کے باوجود روبینہ کا باہر نکلنا محال تھا۔ وہ سوچتے سوچتے سو گئی۔ پھر صبح اس کی آنکھ کھلی تو کچھ دیر اسے احساس نہیں ہوا پھر اسے محسوس ہوا کہ باہر کوئی آیا تھا، اس نے اٹھ کر کھڑکی کے رخنے سے جھانکا تو اسے مکان کے سامنے ایک فوجی کار دکھائی دی۔ اس سے چار پانچ افراد اتر رہے تھے۔ وہ اپنا اسلحہ اتار کر کار کی ڈکی میں رکھ رہے تھے اور پھر ایک شخص نے ڈکی بند کر کے لاک کر دیا۔ پھر وہ مکان کے داخلی دروازے کی طرف بڑھے اور اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ روبینہ اٹھ گئی یہ وہی لوگ تھے جن کا کل وکٹر نے ذکر کیا تھا۔ وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی تو وہ لوگ اندر آ چکے تھے اور روبینہ یہ دیکھ کر ایک لمحے کو رکی کہ ان میں وہ کمانڈر اور گول چہرے والا نوجوان بھی تھا جو اس کی ماں کے قاتل تھے۔ کمانڈر نے حکم دیا تھا اور گول چہرے والے نے اس کی ماں کو شوٹ کیا تھا۔ اب وہ یہاں وکٹر سے علیک سلیک کر رہے تھے۔ روبینہ نے وکٹر کے ہونٹوں پر غور کیا وہ کہہ رہا تھا۔

"ایوان تم کیسے آئے؟" وکٹر کا لہجہ سرد تھا۔

ایوان مسکرایا۔ اس نے گول چہرے والے کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ میرا چھوٹا پیارا بھائی ہے اور یہ میرے آدمی ہیں۔ ہم نے گزشتہ ہفتہ بہت سخت گزارا ہے، ہمیں آرام کا موقع کم ملا اور کام بہت زیادہ تھا۔"

"کیسا کام؟"

وکٹر کے سوال پر ایوان معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ "تم جانتے ہو صفائی کا کام... ابھی کچھ کام ہوا ہے لیکن بہت سارا باقی ہے۔ ایک دو دن یہاں آرام کر کے میں اور میرے آدمی دوبارہ کام پر جائیں گے۔ یہ بہت تھک گئے ہیں، میں چاہتا ہوں یہ تازہ دم ہو جائیں۔"

وکٹر نے نفی میں سر ہلایا۔ "میرا نہیں خیال کہ اب تمہیں مزید کام کا موقع ملے گا، تم جانتے ہو نیٹو والے یہاں آ چکے ہیں۔"

ایوان کا چہرہ یک دم تاریک ہو گیا، اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ "اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

"فرق پڑے گا نہیں، فرق پڑ چکا ہے۔" وکٹر نے کہا۔ "نیٹو فوج اور اس کے ساتھ دشمن ہمارے علاقے کے پاس پہنچ گئے ہیں اس کا مطلب ہے اب تمہارا واسطہ نہتے اور عام لوگوں سے نہیں بلکہ مرنے مارنے والے لوگوں سے پڑے گا۔" اس نے ایوان کے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ "کیا انہیں مسلح افراد سے نمٹنے کا تجربہ ہے؟"

وکٹر نے آئینہ دکھایا تو ایوان کا چہرہ بگڑ گیا اس نے غرا کر کہا۔ "یہ سب فضول باتیں ہیں اصل کام وہ ہے جو ہم یہاں کرنے آئے ہیں، مجھے یقین ہے تمہاری لڑکیاں میرے آدمیوں کو خوش کریں گی۔"

وکٹر کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اس نے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے لیکن تم لوگ یہاں رکو گے نہیں۔"

"اس کا فیصلہ ہم بعد میں کریں گے۔" ایوان نے کہتے ہوئے پہلی بار روبینہ کو دیکھا۔ "اوہ، یہ چڑیا یہاں ہے اسے ہم نے پکڑا تھا اور اس کی ماں کو گریگی نے شوٹ کیا تھا۔" اس نے اپنے بھائی کی طرف دیکھا۔ اس کے انداز میں بھائی کے لیے محبت تھی۔ وہ ہنس دیا اور روبینہ اس کے پاس سے ہوتی ہوئی اوپر جانے لگی تو گریگی نے اس کا بازو پکڑنا چاہا مگر روبینہ پھرتی سے کنی کترا کر نکل گئی۔ گریگی نے اس کے پیچھے جانا چاہا، وہ کچھ بیتاب ہو رہا تھا مگر وکٹر نے روک دیا۔

"نہیں، یہ اس کام کے لیے نہیں ہے۔"

"یہاں ہر لڑکی ایک ہی کام کے لیے ہے۔" ایوان نے سخت لہجے میں کہا۔

"اوکے، لیکن ابھی نہیں۔ اسے بہت سے کام کرنے ہوتے ہیں اگر یہ بھی دھندے پر لگ گئی تو وہ کام رہ جائیں گے۔" وکٹر نے مصالحانہ انداز میں کہا۔

"ٹھیک ہے لیکن اگلی بار یہ نہیں ہوگا۔" ایوان نے سر ہلایا، اس کی حریص نظریں اس وقت تک روبینہ پر جمی رہیں جب تک وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر نہیں چلی گئی۔ ایوان کے ساتھ چار افراد تھے اور یہ چاروں اس کے خاص آدمی تھے جن میں ایک اس کا بھائی بھی تھا۔ ایوان فوجی تربیت یافتہ تھا لیکن جنگ کے وقت وہ مشرقی یورپ اور روس کے درمیان ایک ریکٹ چلا رہا تھا، یہ ریکٹ وسط ایشیا سے غیر قانونی تارکین وطن کو مغربی یورپ پہنچاتا۔ جنگ کا سن کر اس نے فوج میں شمولیت اختیار کی۔ اس نے اپنے گروپ کے ساتھ مل کر مسلم علاقوں میں قتل و غارت گری اور لوٹ مار کی۔ اس نے لڑکیوں اور عورتوں کو اغوا کر کے قحبہ خانوں کو سپلائی کیا اور بھاری رقم کمائی تھی۔ وکٹر کو لڑکیاں اسی نے مہیا کی تھیں اور اس وقت ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اس سے حساب لینے آیا ہو۔ وکٹر فکرمند نظر آ رہا تھا، اس نے ایوان کے آدمیوں کی طرف دیکھا اور بولا۔ "لڑکیاں ہیں لیکن ان کی حالت ٹھیک نہیں ہے انہوں نے بہت مشکل دن گزارا ہے کل۔"

"تم فکر مت کرو۔" ایوان نے بے پروائی سے کہا۔ "وہ زیادہ سے زیادہ مرجائیں گی... اچھی بات ہے مرجائیں۔"

"ان سے میرا بزنس چلتا ہے۔" وکٹر نے کہا۔

"میں نے کہا نا فکر مت کرو، جلد یہاں تازہ مال آئے گا۔"

وکٹر نے گہری سانس لے کر گارسیا کی طرف دیکھا تو اس نے سر ہلایا اور ایوان کے آدمیوں کو لے کر اوپر کی طرف بڑھ گیا۔ ان کے جانے کے بعد وکٹر ایوان کو اپنے دفتر میں لایا۔ ایوان نے دفتر کا معائنہ کیا اور جا کر وکٹر کی کرسی پر بیٹھ گیا، مجبوراً اسے اس کے سامنے جگہ سنبھالنا پڑی تھی۔ ایوان کا انداز حاکمانہ تھا اور وکٹر بڑی مشکل سے اسے برداشت کر رہا تھا۔ اس نے ایوان کے لیے سرخ واڈکا کی بوتل کھولی اور گلاس میں ڈال کر اس کی طرف بڑھائی جسے وہ بغیر انتظار کے ایک گھونٹ میں ہی پی گیا، اس نے زحمت نہیں کی کہ وکٹر اپنے لیے بھی نکالے اور وہ اس کا ساتھ دے۔ ایوان کا رویہ ایسا تھا جیسے وہ اپنے کسی ادنیٰ ماتحت کے ساتھ ہو۔ مجبوراً وکٹر کو دوبارہ اس کا گلاس بھرنا پڑا۔ اس بار اس نے چسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ "مجھے امید ہے تم نے میری بھیجی کھیپ سے اچھا کمایا ہوگا۔"

"خاص نہیں۔" وکٹر محتاط ہو گیا۔

"واقعی؟" ایوان نے اسے شرارت سے دیکھا۔

"ہاں، جنگ کے دوران جا بہ جا ایسے قحبہ خانے کھل گئے ہیں اور اب گاہک زیادہ رقم نہیں دیتا اگر اس سے زیادہ مانگو تو وہ کہیں اور چلا جاتا ہے اس لیے کمائی خاص نہیں رہی۔"

ایوان نے نظریں گھما کر دفتر کا معائنہ کیا اور پھر اس کی نظر تجوری پر آ کر رک گئی۔ وہ معنی خیز انداز میں مسکرانے لگا۔ وکٹر کا چہرہ سخت ہو گیا تھا۔ "میری تجویز ہے کہ تم اور تمہارے آدمی رات سے پہلے رخصت ہو جائیں کیونکہ نیٹو اور دشمن کی فوج نزدیک ہے اگر وہ یہاں آگئے تو تمہاری وجہ سے میں بھی مشکل میں پڑ جاؤں گا۔"

"فکر مت کرو۔" ایوان نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ "میں تمہارے لیے کوئی مشکل نہیں چھوڑوں گا۔"

☆☆☆

روبینہ نے پانچوں لڑکیوں کو انجکشن دیدیا تھا۔ لیکن اسے ساشا پر بہت ترس آ رہا تھا اس کی حالت سچ مچ خراب تھی، وہ کھانس رہی تھی اور اس کا جسم ہر بار لرز اٹھتا تھا۔ بیڈ کی نئی چادر بھی خون سے بھر گئی تھی۔ ساشا رونے لگی، اس نے روبینہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "خدا کے لیے مجھے یہاں سے نکال دو۔"

اگر یہ کام روبینہ کے بس میں ہوتا تو وہ کر گزرتی لیکن یہ اس کے بس سے باہر تھا۔ ایک لمحے کو اس کی نظر ایگزاسٹ کے خانے کی طرف گئی لیکن ساشا اس سے بھی نہیں نکل سکتی تھی، ایک تو وہ بھاری جسم کی تھی اور دوسرے اس کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ چند قدم چل سکتی، خانے میں گھس کر وہ کیسے کہیں جاتی۔ روبینہ نے اس سے نظریں چراتے ہوئے اسے انجکشن دینا چاہا تو اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور نفی میں سر ہلانے لگی۔ اس بار روبینہ اس کی بات رد نہیں کر سکی تھی۔ اس نے انجکشن اپنی فراک کی جیب میں کیا اور خالی کر دیا۔ اسی لمحے دروازہ کھلا اور گارسیا نے اندر جھانک کر اسے اشارہ کیا کہ وہ جلدی کرے۔ روبینہ نے ساشا کے بازو سے اسٹرپ کھولی اور باہر آ گئی۔ جب وہ دوسری لڑکیوں کے کمروں میں آ جا رہی تھی تب اس کی نظر بار بار راہداری میں ساتھیوں سے گپ شپ کرتے ہوئے اور ہنستے ہوئے گریگی پر جاتی تھی یہی شخص تھا جس نے اس کی ماں کو قتل کیا تھا۔ مگر وہ اس کے خلاف کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ ایک کمزور لڑکی تھی جس کا کسی پر اختیار نہیں تھا۔ وہ خود ان لوگوں کے رحم و کرم پر تھی۔

اپنا کام کر کے اس نے سامان واپس کچن میں رکھا اور اوپر کمرے میں آ گئی۔ کمرا اندر سے لاک کر کے اس نے ایگزاسٹ کا خانہ کھولا اور اس کے اندر رینگ گئی۔ وہ اس کام کی اتنی ماہر ہو گئی تھی کہ اب کسی مچھلی کی طرح اس خلا میں آسانی سے تیرتی تھی۔ اس کا رخ وکٹر کے دفتر کی طرف تھا۔ کچھ دیر میں وہ جالی کے ساتھ تھی اور ان دونوں کی گفتگو سن رہی تھی۔ ایوان بتا رہا تھا کہ جلد یہاں نئی لڑکیاں آئیں گی اور بزنس دوبارہ چمک جائے گا اور وکٹر اس سے کہہ رہا تھا کہ یہ اس کا گھر ہے اور یہاں ہونے والا ہر فیصلہ وہی کرے گا۔ جواب میں ایوان نے اس پر پستول تان لیا تھا، اس نے کہا کہ وہ اسے شوٹ کر دے اور اس کی لاش جنگل میں پھینک دے تو اس گھر کا مالک کون ہوگا؟ وکٹر ڈر گیا تھا، وہ ایوان کو منانے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر ایوان نے توجہ دیے بغیر اسے وہاں سے جانے کا حکم دیا اور وکٹر اپنے دفتر سے نکل گیا۔

روبینہ پلٹی اور اب وہ رینگتی ہوئی ساشا کے کمرے کی طرف جا رہی تھی، اسے ساشا کی فکر تھی، وہ پہلے ہی نیم مردہ تھی اب اس کے ساتھ نہ جانے کیا ہو رہا تھا۔ کمرے کی جالی کے پاس آ کر اس نے ڈرتے ڈرتے اندر جھانکا اور پھر اس کا سانس رک گیا تھا۔ ایوان کے ساتھ آنے والا دیو قامت شخص ساشا کے پاس تھا۔ وہ اس کے پنجوں میں بے بس چڑیا کی طرح پھنسی ہوئی تھی اور اس کے کھلے منہ سے مسلسل چیخیں نکل رہی تھیں۔ اس کی آواز روکنے کے لیے دیو قامت آدمی نے اپنی کلائی اس کے گردن پر رکھ دی اور اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ غالباً دیو قامت کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس کا بے پناہ وزن اس کی کلائی پر آ رہا ہے اور لڑکی کا سانس رک رہا ہے یا اسے اندازہ تھا تب بھی اسے پروا نہیں تھی۔ جالی سے جھانکتی روبینہ کو لگا کہ ساشا بس کچھ دیر کی مہمان ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے تب اس کی نظر دیو قامت کے فرش پر پڑے کپڑوں پر گئی تھی۔

روبینہ نے سوچا اور انگلیاں باہر نکال کر جالی کے اسکروز کھولنے لگی۔ وہ خاموشی سے کام کر رہی تھی، اسے خوف تھا کہ دیو قامت کو پتا چل گیا تو وہ کچھ نہیں کر سکے گی۔ بہت احتیاط سے اس نے دونوں اسکروز کھولے اور جالی نیچے میز پر رکھ دی۔ پھر وہ کسی سانپ کی طرح رینگ کر خود بھی بے آواز میز پر اتر آئی۔ اس نے دیو قامت کی طرف دیکھا مگر وہ دنیا سے بے خبر تھا۔ روبینہ نے دیو قامت کی وردی کے ساتھ رکھا خنجر اٹھا لیا، یہ فوجی خنجر ریزر سے زیادہ تیز دھار تھا۔ روبینہ خنجر اٹھا کر آگے آئی، ساشا دیو قامت کے نیچے اس طرح چھپی تھی کہ اسے دیکھنے کے لیے روبینہ کو خاصا آگے آنا پڑا تھا۔ تب روبینہ نے دیکھا کہ ساشا کا منہ کھلا تھا اور اس کی آنکھیں ساکت ہو گئی تھیں۔ مگر دیو قامت کو اس کی پروا نہیں تھی۔

روبینہ کے منہ سے چیخ نکلی اور اس نے خنجر دیو قامت کی پشت میں گھونپ دیا۔ وہ کسی بھینسے کی طرح ڈکرایا اور کروٹ لے کر دوسری طرف گرا تھا۔ خنجر روبینہ نے واپس کھینچ لیا تھا اور وہ گھوم کر اس کی طرف آئی، اس بار اس نے دیو قامت کے منہ پر وار کیا اور خنجر اس کے کھلے منہ میں گھس کر ایک طرف گال سے نکل گیا۔ دیو قامت کی دھاڑ خون کی وجہ سے غراروں جیسی آواز میں بدل گئی۔ روبینہ نے خنجر نکالنے کی کوشش کی تو اس نے روبینہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ روبینہ نے زور لگا کر ہاتھ اور خنجر چھڑا لیا۔ وہ زخمی تھا اور بدحواس بھی، ورنہ روبینہ اس حالت میں بھی اس سے ہاتھ نہیں چھڑا سکتی تھی۔ اس نے ہاتھ کھینچا تو خنجر دیو قامت کا گال چیرتا ہوا باہر آ گیا۔ اس بار روبینہ نے خنجر اس کے سینے میں گھونپ دیا اور دیو قامت نیچے گر گیا۔ اسے چھوڑ کر روبینہ ساشا کے پاس آئی۔

پھر وہ رونے لگی کیونکہ ساشا کا جسم روح سے خالی ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور اس کا دیا ہوا فرشتے کی شبیہ والا لاکٹ ابھی تک اس کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ روبینہ نے اس کے ہاتھ سے لاکٹ نکالا اور انگلیوں سے اس کی آنکھیں بند کر دیں۔ اسی لمحے اسے احساس ہوا تو اس نے پلٹ کر دیکھا۔ دیو قامت خنجر لیے اس کے پیچھے کھڑا

تھا، اس نے ہاتھ گھمایا۔ روبینہ بروقت جھکی اور خنجر اس کے سر سے گزر گیا۔ خون میں اس کا پاؤں پھسلا اور وہ گری تو اٹھنے کے بجائے وہ دیو قامت کی کھلی ٹانگوں کے نیچے سے نکلی۔ اس نے گھومنا چاہا لیکن وہ بھی اپنے ہی خون میں پھسل کر گرا اور خنجر اس کے پیٹ میں اتر گیا۔ اس بار بھی اس نے غرارے نما دہاڑ ماری تھی۔ روبینہ خانے کی طرف لپکی اور اندر گھس کر اس نے جلدی جلدی جالی کے اسکروز لگانا شروع کردیے۔ اسی لمحے دروازہ بجنے لگا۔

☆☆☆

دوسرے کمروں میں مصروف اس کے ساتھیوں اور تنومند شخص نے دیو قامت کی آوازیں سن لی تھیں اور وہ دروازے پر دستک دے رہے تھے لیکن دروازہ اندر سے بند تھا۔ اندر سے اس کے دہاڑنے کی آوازیں آرہی تھیں مگر وہ دروازہ نہیں کھول رہا تھا۔ گریگی اور دوسرے دروازے کو ٹکریں مار رہے تھے۔ شور سن کر ایوان اور وکٹر بھی وہاں آگئے تھے۔ ایوان نے گرج کر پوچھا۔ ”کیا ہورہا ہے؟“

”آندرے اندر چلا رہا ہے لیکن دروازہ نہیں کھول رہا۔“ گریگی نے کہا۔ ایوان نے سنتے ہی حکم دیا۔

”دروازہ توڑ دو۔“

اس بار انہوں نے دروازہ توڑنے کی کوشش کی اور چند مشترکہ ٹکروں سے دروازے کا لاک کھل گیا وہ اندر گھسے اور رک گئے۔ زمین پر خون میں ڈوبا آندرے دم توڑ چکا تھا۔ اس کا چرا ہوا منہ بہت بھیانک لگ رہا تھا۔ فرش پر مشکل سے ہی کوئی ایسی جگہ تھی جہاں خون نہ ہو۔ ایوان خون کی پروا کیے بغیر اندر آیا۔ اس نے کمرے کا معائنہ کیا۔ جس وقت وہ اندر گھسے تھے اسی وقت روبینہ نے آخری اسکرو لگا کر انگلیاں اندر کھینچی تھیں۔ وہ اب جالی سے ایوان اور اس کے ساتھیوں کو دیکھ رہی تھی، وہ سب غصے سے پاگل ہورہے تھے۔ یہ حیران کن بات تھی کہ کمرا اندر سے بند تھا اور یہاں کوئی کھڑکی بھی نہیں تھی جس سے نکلا جاسکتا۔ دوسرے ساشا دم توڑ چکی تھی اور اس کی حالت بتارہی تھی کہ اس نے بستر پر ہی دم توڑا تھا، تو آندرے کو کس نے قتل کیا؟ اس کا اپنا خنجر اس کے پیٹ میں اترا ہوا تھا مگر باقی زخم وہ خود نہیں لگا سکتا تھا یقیناً کسی نے اسے مارا تھا۔ ایوان نے دہاڑ کر کہا۔ ”یہ کس نے کیا ہے؟... کون تھا یہاں؟“

وکٹر اور گارسیا گھبرائے ہوئے تھے۔ وکٹر نے کہا۔ ”مجھے نہیں معلوم، میں تو نیچے اپنے کمرے میں تھا۔“

”میں سیڑھیوں کے پاس تھا۔“ گارسیا نے بھی کہا باقی سب بھی کمروں میں تھے۔ اگر ان میں سے کوئی اس کام میں ملوث ہوتا تو یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ خون سے بچ جاتا۔ اچانک ایوان نے کوئی آواز سنی اور اس نے سب کو خاموش ہونے کا اشارہ کیا۔ وہ سب خاموش ہوگئے پھر سب نے سنا ایسا لگا جیسے کوئی لکڑی کے تختوں پر چل یا گھسٹ رہا ہے۔ ایوان نے آس پاس دیکھا اور پھر اس نے آواز کا مخرج تلاش کرلیا، اس نے جھٹکے سے ایگزاسسٹ کی جالی کھینچ لی اور بولا۔

”اس میں کوئی ہے۔“

”اس میں کوئی کیسے جاسکتا ہے؟“ وکٹر نے اعتراض کیا۔

”دیکھو تلاش کرو، مکان میں کون اپنی جگہ نہیں ہے۔“ ایوان نے حکم دیا تو وہ سب پھیل گئے۔ مختلف کمروں اور جگہوں پر جھانکنے لگے۔ روبینہ اس وقت نیچے جارہی تھی۔ وہ اس ایگزاسسٹ تک پہنچنا چاہتی تھی جو داخلی دروازے کے پاس [illegible] تھا، وہاں سے وہ نکل کر جالی کی مدد سے باہر جاسکتی تھی۔ اس نے جالی ٹوٹنے کا ارتعاش محسوس کرلیا تھا اور اب اوپر نیچے بھاگ دوڑ کی دھمک محسوس کررہی تھی۔ اس کی تلاش شروع ہوگئی تھی۔ ایوان اور وکٹر زور زور سے بات کرتے ہوئے سیڑھیوں سے نیچے آئے۔ ایوان اپنے آدمی کے مرنے پر دیوانہ ہورہا تھا اور وکٹر سے کہہ رہا تھا کہ اگر قاتل اس خانے سے باہر نہیں آیا تو وہ اس مکان کو آگ لگادے گا۔

”تم ایسا نہیں کرسکتے، یہ میرا مکان ہے۔“ وکٹر بولا۔ ایوان نے اس کا گریبان پکڑ کر کھینچا اور سرد لہجے میں بولا۔ ”اس وقت تم مکان کی نہیں اپنی فکر کرو، یہ قتل یہاں ہوا ہے اور تمہیں بھی اس کا جواب دینا ہوگا۔“

”میں... میں تم سے تعاون تو کررہا ہوں۔“ وکٹر نے گھبرا کر کہا۔

”اسی میں تمہاری بہتری ہے مجھے بہر صورت اپنے آدمی کا قاتل چاہیے۔“

اسی لمحے ان کے عقب میں فرش سے کچھ اوپر جالی والا خانہ کھلا۔ روبینہ سن نہیں سکتی تھی اس لیے اسے ان دونوں کی موجودگی کا یہاں علم نہیں ہوا تھا۔ وہ باہر آئی اور جب تک اسے وہ نظر آتے وہ نصف باہر آچکی تھی وکٹر کا رخ اسی کی طرف تھا۔ وہ روبینہ کو دیکھ کر چونکا اور اس کے تاثرات دیکھ کر ایوان چونکا، اس نے مڑ کر دیکھا اور پستول نکال لیا۔ خطرہ بھانپتے ہوئے روبینہ تیزی سے واپس اندر گئی اور

ایوان فائر کرتا اس کی طرف دوڑا، وہ دیواروں پر گولیاں برسا رہا تھا۔ وکٹر نے اسے روکا۔ "یہ کیا کر رہے ہو ساری دیوار تباہ کر دی۔"

"بکو مت۔" ایوان غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔ سوراخ بہت چھوٹا تھا، اس نے گردن اندر ڈال کر دیکھا تو اسے روبینہ اوپر جاتی دکھائی دی، اس نے ہاتھ اندر کر کے اندازے سے اس طرف فائر کیے لیکن گھسٹنے اور لکڑی چٹخنے کی آوازیں بہ دستور آتی رہیں' کوئی گولی روبینہ کو نہیں لگی تھی اس لیے وہ حرکت میں تھی۔ فائرنگ کی آواز سن کر ایوان کے دوسرے ساتھی دوڑے چلے آئے تھے۔ ایوان نے ان کا جائزہ لیا اور اپنے سب سے چھریرے ساتھی سے کہا۔ "اس خانے میں جاؤ، لڑکی اسی میں ہے۔"

وہ تربیت یافتہ فوجی تھا لیکن خانے میں جانے کا سن کر اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ وہ اپنے دیو قامت ساتھی کا حشر دیکھ چکا تھا۔ اس نے تھوک نگل کر کہا۔ "میں جاؤں...؟"

"ہاں تم۔" ایوان دہاڑا۔ "اس خانے کو بڑا کرو۔"

وہ سب پل پڑے تھے ذرا سی دیر میں انہوں نے خانے کے کنارے کی لکڑی توڑ کر اسے اتنا بڑا کر دیا کہ ان کا ساتھی اس میں جا سکے۔ اس نے اپنا پستول کمر میں اڑسا اور خانے میں گھس گیا۔ چھریرا ہونے کے باوجود اسے بہت مشکل پیش آ رہی تھی۔ وہ کسی طرح گھسٹ کر اوپر چڑھ رہا تھا۔ کیلوں اور لکڑی کے نوکیلے ٹکڑوں سے اسے گھروچے لگ رہے تھے اور اس کا لباس پھٹ رہا تھا۔ روبینہ کا رخ اوپر کی طرف تھا اس لیے وہ بھی اوپر ہی جا رہا تھا۔ آڑے ترچھے راستوں پر اسے روبینہ ٹھیک سے نظر نہیں آ رہی تھی۔ ایک موقع پر اس کی ذرا سی جھلک نظر آئی تو اس نے عجلت میں پستول نکال کر فائر کیا اس بار بھی گولی نشانے پر نہیں لگی تھی۔ جھٹکے سے اس کا ہاتھ پیچھے گیا تو اس کی کہنی کسی نوکیلی چیز سے لگی اور اس کے ہاتھ سے پستول نکل کر نیچے جا گرا۔ اس نے بے اختیار گالی دی، نیچے جانے کا وقت نہیں تھا اور وہ جا بھی نہیں سکتا تھا، وہ بری طرح پھنس گیا تھا اور اب اس کے پاس ایک ہی راستہ تھا کہ اوپر چڑھتا رہے اور لڑکی کو پکڑ لے۔

روبینہ مکان کے اوپری حصے میں جا پہنچی تھی' وہ کچھ اوپر بھی تھی لیکن ایک جگہ وہ ستانے کے لیے رکی، اسے یہ تو معلوم تھا کہ کوئی اور بھی اس خلا میں آ گیا ہے لیکن وہ کہاں ہے اسے یہ نہیں معلوم تھا۔ آدمی رینگتا ہوا اس کے پاس آ رہا تھا، یہاں ایک بڑا خلا تھا جو مکان کی بنیاد تک گیا تھا۔ اس نے اچانک روبینہ تک پہنچنے کی کوشش کی، یہاں تاریکی تھی روبینہ بھڑک کر پیچھے ہٹی اور فوجی کا جو ہاتھ اس کا پاؤں پکڑنے والا تھا وہ خلا میں لہرا گیا، اس کا توازن بگڑا اور وہ ایک طویل چیخ کے ساتھ خلا میں گر گیا۔ نیچے کئی نوکیلی لکڑیاں تھیں ان میں سے ایک اس کے جسم میں کھب گئی تھی۔ روبینہ نے جھانک کر دیکھا اور دوبارہ اوپر کی طرف بڑھنے لگی مگر پھر اسے خیال آیا اور اس نے رخ بدل کر پہلی منزل کی طرف کر دیا تھا۔

☆☆☆

ایوان اور وکٹر سیڑھیوں کے پاس تھے جب انہوں نے چھریرے سپاہی کی چیخ سنی۔ اس چیخ میں بسا موت کا کرب بتا رہا تھا کہ وہ بھی مارا گیا۔ اس کے علاوہ کوئی اندر جا بھی نہیں سکتا تھا۔ ایوان نے اپنے بال جکڑ لیے اور چلا کر بولا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے... یہ لڑکی کون ہے؟"

"تم نے بھیجی تھی۔" وکٹر نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "میں نے اسے دوسرے کاموں پر لگا لیا تھا۔"

"جھوٹ بولتے ہو تم۔" ایوان غرایا اور سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آیا۔ وکٹر اس کے پیچھے تھا۔

"تم کیا چاہتے ہو؟"

"میں اپنے آدمیوں کی اس قاتلہ کو اپنے ہاتھ سے مارنا چاہتا ہوں۔"

"وہ زیادہ دیر اس خلا میں نہیں رہ سکتی۔ جلد نکلے گی۔"

"میں انتظار نہیں کر سکتا۔" ایوان نے خطرناک لہجے میں کہا۔

"کیا کرو گے تم؟"

ایوان ایک کمرے میں آیا جہاں ایک لڑکی بے ہوشی کی حالت میں دیوار سے ٹکی بیٹھی تھی۔ ایوان نے پستول سیدھا کیا اور بلا توقف اسے گولی مار دی۔ وکٹر چلا اٹھا۔ "یہ کیا کیا تم نے؟"

"اگر تم خود کو اور اپنے بزنس کو بچانا چاہتے ہو تو اس لڑکی کو پکڑنے میں میرا ساتھ دو۔" ایوان نے سرد لہجے میں کہا۔

وکٹر کی حالت سے لگ رہا تھا کہ اس نے بڑی مشکل سے ایوان پر ٹوٹ پڑنے کی خواہش پر قابو پایا ہے، وہ گہری سانسیں لے رہا تھا اور بالآخر اس نے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے میں تمہارے ساتھ ہوں لیکن اب میرے مکان اور کسی لڑکی کو نقصان نہیں ہونا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے تم نیچے جاؤ اور میں اوپر دیکھتا ہوں۔" ایوان نے کہا۔

وکٹر سر ہلاتا ہوا نیچے آ گیا۔ وہ اپنے دفتر والے کمرے میں آیا اور اس نے ایک دراز کھولی اور اس میں رکھا ہوا پستول نکال کر اپنی پتلون کے عقب میں اڑس لیا، اسے لگ رہا تھا جلد اسے اس کی ضرورت پڑے گی۔ ایوان پاگل ہو رہا تھا، وہ اسے اور اس کے مکان کو بھی نقصان پہنچا سکتا تھا۔ اس دوران میں گریگی اور اس کا ساتھی باہر کھڑی گاڑی سے اپنا اسلحہ نکال لائے تھے، ان میں اسموک گرنیڈ بھی تھے۔ ایوان خوش ہو گیا۔ اس نے کہا۔ "یہ کام کی چیز ہے نا، اوپر سے لے کر نیچے تک ہر خانے میں گرنیڈ پھینک دو۔"

وہ سب حکم کی تعمیل میں لگ گئے۔ ایگزاسسٹ کی جالیاں توڑ توڑ کر اندر اسموک گرنیڈ پھینکنے لگے۔ ذرا سی دیر میں اندر اور کسی قدر باہر بھی دھواں بھرنے لگا تھا۔ روبینہ ابھی درمیان میں تھی کہ اس نے دھواں محسوس کر لیا، یہ حلق میں خراش ڈال رہا تھا۔ اس نے راستہ بدل دیا اور دوبارہ نیچے کی طرف جانے لگی اس بار اس کی رفتار تیز تھی۔ چند منٹ بعد وہ باتھ روم میں نکلی اس نے اپنی فراک کا ایک حصہ پھاڑ کر اسے پانی میں بھگویا اور منہ پر لپیٹ لیا پھر وہ وہاں سے نکل کر کچن میں آئی، ایک چھری اٹھائی اور کچن میں موجود ایگزاسسٹ کے خانے سے اندر داخل ہو گئی۔ اب دھواں بہت زیادہ تھا اور نظر بھی مشکل سے آ رہا تھا۔ وہ پھر اوپر کی طرف جانے لگی۔ اس دوران میں وکٹر دوبارہ ایوان کے پاس آیا اور اس نے پوچھا۔

"اسموک گرنیڈ سے آگ لگ سکتی ہے؟"

"اس کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔" ایوان نے کہا اور درشت لہجے میں بولا۔ "تم یہاں کیوں آئے ہو اگر وہ نیچے سے نکل گئی تو..."

وکٹر دوبارہ نیچے آ گیا۔ یہاں ایوان کا تیسرا ساتھی تھا۔ خود ایوان اور گریگی اوپر تھے۔ یہاں گارسیا بھی تھا۔ اچانک وکٹر نے ایوان کے ساتھی سے کہا۔ "میرا خیال ہے وہ رہی..." اس نے مخالف سمت میں اشارہ کیا اور ایوان کے ساتھی نے بے اختیار اس کی طرف دیکھا تو وکٹر نے پستول نکال کر اس پر دو فائر کیے۔ دونوں گولیاں اس کے سر پر لگیں اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ وکٹر نے جلدی سے پستول واپس اڑس لیا۔ فائرنگ کی آواز سن کر اوپر سے ایوان بھاگتا ہوا آیا اور اپنے ساتھی کو فرش پر مردہ پڑے دیکھ کر ساکت ہو گیا۔ وکٹر نے دونوں ہاتھ آگے کیے اور بے بسی سے بولا۔

"وہ کتیا اس خانے سے نکلی اور تمہارے آدمی کو شوٹ کر دیا، میں خالی ہاتھ تھا اس لیے کچھ نہیں کر سکا۔"

"اس کے پاس پستول کہاں سے آیا؟" ایوان نے پاؤں پٹخ کر کہا۔

"ممکن ہے اندر جانے والے آدمی کا پستول اس کے ہاتھ لگ گیا ہو۔" وکٹر نے وضاحت پیش کی۔

ایوان دانت پیس رہا تھا اور گالیاں دے رہا تھا، وہ قسمیں کھا رہا تھا کہ لڑکی اس کے ہاتھ آ گئی تو وہ اسے بہت اذیت دے کر مارے گا۔ پھر اس نے دہاڑ کر گارسیا کو اوپر جانے کا حکم دیا اور وکٹر سے کہا۔ "مجھ سے غلطی ہوئی، مجھے یہاں دو آدمی رکھنے تھے۔ اگر دوسرا مسلح شخص ہوتا تو وہ وار کر کے بچ نہیں سکتی تھی۔"

"مجھے اس کے انداز سے لگ رہا ہے کہ وہ تربیت یافتہ ہے۔ اس نے دو فائر کیے اور دونوں نشانے پر لگے۔" وکٹر نے لاش کی طرف دیکھا۔ ذرا سی دیر میں اس کے تہ خانے میں پانچ افراد زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے اور وکٹر سوچ رہا تھا کہ اسے فوری طور پر یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ وہ اتنی دولت کما چکا تھا کہ مغربی یورپ کے ملک میں مزے سے زندگی گزار سکتا تھا۔ مسئلہ ایوان سے اپنی جان اور دولت بچانے کا تھا، اسے یقین تھا ایوان اس کی دولت اور جان دونوں لینے آیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ روبینہ نے اس کا کام آسان کر دیا تھا لیکن وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اتنی تیز نکلے گی، اسی کے گھر میں اس نے آمد و رفت کے خفیہ راستے بنائے ہوئے تھے اور اسے کانوں کان خبر نہیں ہوئی تھی' شکر ہے وہ کسی راستے سے باہر نہیں نکل گئی۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ اسے خفیہ خانے کا اچھی طرح پتا تھا اور وہ بہت عرصے سے انہیں استعمال کر رہی تھی۔ ایوان نے کسی بھیڑیے کی طرح دانت نکوستے ہوئے کہا۔

"وہ کتنی ہی تربیت یافتہ کیوں نہ ہو ہمارا مقابلہ نہیں کر سکتی۔"

وکٹر نے اس کی طرف دیکھا تو وہ جھینپ گیا، وہ سمجھ گیا کہ وکٹر نے بغیر کہے کہہ دیا ہے کہ وہ اس کے تین آدمی پہلے ہی ہلاک کر چکی تھی اور اب وہ اور اس کا بھائی گریگی بچے تھے۔

"وہ کہاں ہے؟" وکٹر نے سوچا اور یہی خیال وہاں موجود ہر فرد کے ذہن میں تھا کہ روبینہ کہاں ہے؟

☆☆☆

روبینہ اس وقت دھویں سے بچتی اور راستہ ٹٹولتی ہوئی اوپر جا رہی تھی، دھواں اتنا بڑھ گیا تھا کہ براہ راست اسے آنکھوں میں لگ رہا تھا۔ مگر منہ پر گیلا کپڑا ہونے کی وجہ سے دھواں اس کے جسم میں نہیں جا رہا تھا۔ راستہ دیکھنے میں

دشواری کی وجہ سے وہ کسی قدر دیر سے اوپر اپنے کمرے تک پہنچنے میں کامیاب رہی لیکن فوری باہر نکلنے سے پہلے اس نے سن گن لی اور پھر سر باہر نکال کر دیکھا، کمرا خالی تھا، وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ جلدی سے باہر آئی اور منہ سے کپڑا ہٹا دیا۔ اس نے دروازہ اندر سے لاک کر کے اس کے ہینڈل تلے کرسی پھنسا دی۔ پھر وہ کھڑکی کے پاس آئی اور اس پر لگے کچھ کمزور تختے اکھاڑنے کی کوشش کرنے لگی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کوشش میں شور ہوگا اور باہر والے خبردار ہو جائیں گے مگر اس کے پاس فرار کے لیے یہی ایک راستہ تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ایوان اپنے آدمیوں کی ہلاکت پر پاگل ہو رہا ہوگا اور وہ اس کے ہاتھ آ گئی تو وہ اسے بلاتوقف ہلاک کر دے گا۔

اچانک اسے پیچھے حرکت کا احساس ہوا اس نے مڑ کر دیکھا، کوئی دروازہ بجا رہا تھا۔ روبینہ نے کوشش تیز کر دی اور ایک تختہ اکھاڑ دیا جیسے ہی اس نے دوسرا تختہ اکھاڑا، دروازہ ایک دھماکے سے کھلا اور گارسیا اندر داخل ہوا۔ روبینہ نے جلدی سے باہر نکلنے کی کوشش کی لیکن گارسیا نے جھپٹ کر اس کی ٹانگ پکڑ کر اندر کھینچ لی۔ اس نے روبینہ کو بستر پر گرا دیا اور قابو کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ روبینہ نے محسوس کیا کہ وہ اس کا لباس اتارنے کی کوشش کر رہا تھا یہی وجہ تھی کہ اس کی توجہ روبینہ کے ہاتھوں کی طرف نہیں گئی۔ روبینہ نے اچانک چھری سے اس کے چہرے پر وار کیا اتفاق سے چھری براہ راست آنکھ میں لگی اور گارسیا کے دماغ میں اتر گئی۔ وار مہلک ثابت ہوا تھا۔ وہ بے جان ہو کر روبینہ پر ہی اوندھے منہ گر گیا تھا۔

ایوان نیچے تھا جب اس نے شور سنا اور وہ تیزی سے اوپر کی طرف بھاگا، ساتھ ہی وہ چیخ چیخ کر گریگی کو نیچے کا خیال رکھنے کا کہہ رہا تھا۔ گریگی اس کے پاس سے گزر کر نیچے آ گیا۔ پہلی چیخ کے بعد گارسیا کی آواز اب رک گئی تھی لیکن ایوان نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ راہداری کے آخری کمرے سے آئی تھی، اسے علم نہیں تھا کہ یہ کمرا روبینہ کا ہے، دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس نے اسے کھولنے کی کوشش کی اور ناکامی کے بعد پیچھے ہٹ کر شانے سے بھرپور ٹکر ماری، دروازہ کھل گیا اور وہ اندر داخل ہوا۔ اس نے دیکھا کہ گارسیا اوندھے منہ بستر پر پڑا تھا اور وہاں کوئی نہیں تھا۔ فوراً ہی ایوان کی توجہ کھل جانے والی کھڑکی نے کھینچ لی اور وہ لپک کر اس کے پاس آیا، تختوں کے درمیان اتنی جگہ نہیں تھی کہ وہ باہر جھانک سکتا، اس نے ایک تختے پر لات ماری تو وہ ہلا اور

دوسری لات پر ٹوٹ کر باہر جا گرا، اب ایوان باہر دیکھ سکتا تھا۔ اس نے گردن نکال کر جھانکا تو نیچے پر اسے لڑکی کے ہاتھ دکھائی دیے اس نے پستول باہر نکالا اور اندازے سے فائر کیا لیکن جب نیچے دیکھا تو لڑکی کے ہاتھ غائب تھے۔ اسی لمحے اسے لڑکی کی جھلک دکھائی دی، وہ درختوں کے درمیان بھاگ رہی تھی۔ وکٹر بھی اس کے پیچھے کمرے میں آ گیا تھا، اس نے گارسیا کو سیدھا کیا اور گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ بھی مارا گیا تھا۔ وہ حیران ہوا کہ روبینہ کیا تھی، ایک گونگی بہری کمزور لڑکی نے کیسے بڑے بڑے سورماؤں کو چت کر دیا تھا۔

''چلو میرے ساتھ؟'' ایوان نے اس کا بازو پکڑا۔ ''وہ جنگل میں بھاگ گئی ہے۔''

وکٹر اس کے ساتھ نیچے آیا مگر اس نے جانے سے انکار کر دیا۔ ''جب تک مجھے کوئی ہتھیار نہیں ملے گا میں لڑکی کے سامنے جانا پسند نہیں کروں گا۔''

ایوان کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اس نے ایک مرنے والے سپاہی کا پستول اسے دیا اور بولا۔ ''لیکن کوئی خیال ذہن میں مت لانا۔''

وکٹر نے پستول لیا۔ ''تم فکر مت کرو، اب یہ میرا کا مسئلہ بھی ہے اس لڑکی کا مرنا بہت ضروری ہے۔''

ایوان نے دانت پیسے۔ ''وہ بچے گی نہیں... میں اسے اپنے ہاتھ سے ماروں گا۔''

وہ تینوں باہر آئے۔ مکان کے دائیں طرف جنگل تھا اور یہ خاصا گھنا تھا، وہ تیزی سے آگے بڑھے۔ ایوان نے لڑکی کو اسی طرف جاتے دیکھا تھا۔ ایک جگہ رک کر اس نے حکمت عملی بیان کی۔ ''لڑکی کو زندہ پکڑنا ہے، زخمی کر سکتے ہو لیکن اگر خطرہ ہو کہ وہ بھاگ جائے گی تو اسے قتل کر دینا۔ تم اس طرف جاؤ میں اس طرف سے جاتا ہوں۔'' ایوان نے وکٹر سے کہا۔ وکٹر سر ہلاتا ہوا آگے بڑھا تو ایوان نے اشارے سے گریگی کو کہا کہ وہ وکٹر پر نظر رکھے۔ گریگی جواب میں اشارے کے بعد وکٹر کے پیچھے روانہ ہو گیا۔ ایوان درختوں کے درمیان بھاگ رہا، اسے اس کام کا بہت تجربہ تھا، اس نے کئی دن اور راتیں جان بچا کر بھاگنے والوں کے تعاقب میں اسی طرح جنگلوں میں بھاگتے گزری تھیں اور اسے اس کھیل میں لطف بھی آتا تھا، اس کے اندر درندوں والی سفاکی اور خوشی بیدار ہو جاتی تھی۔

روبینہ بھاگ رہی تھی۔ شروع میں اس پر جوش غالب تھا حالانکہ وہ بلندی سے نیچے کچی زمین پر گری تھی اور اس

کمر دکھ رہی تھی۔ اس نے ایوان کو پستول باہر کرتے دیکھ لیا اور دیکھتے ہی نیچے سے ہاتھ چھوڑ دیے تھے۔ اگر وہ ایک لمحے کی تاخیر کرتی تو اسے گولی لگ سکتی تھی۔ نیچے گرنے کے بعد بھی وہ وقت ضائع کیے بغیر اٹھ کر بھاگی تھی۔ ابھی کچھ درندے باقی تھے اور وہ یقیناً اس کے پیچھے آتے۔ ان کے آنے سے پہلے وہ اس جگہ سے نکل جانا چاہتی تھی۔ مگر کچھ دیر بعد ہی اس پر تھکن غالب آنے لگی۔ وہ ہانپ رہی تھی اور بعض اوقات اس کا سر چکرانے لگتا تو وہ کسی درخت کا سہارا لے کر رک جاتی تھی۔ اسی طرح بھاگتے ہوئے وہ ایک ڈھلان پر آئی، یہاں اسے سنبھل کر اترنا پڑ رہا تھا۔ پھر ایک جگہ اس کا پاؤں پھسلا اور وہ لڑھکتی ہوئی نیچے تک آئی اور ایک جگہ کیچڑ میں جا گری۔ جب اس نے اٹھنا چاہا تو انکشاف ہوا کہ وہ گلی سڑی لاشوں کے درمیان گری تھی۔

ایک متعفن تالاب تھا جس میں کئی لاشیں پڑی تھیں اور یہ سب عورتوں کی لاشیں تھیں۔ بدبو سے دماغ پھٹ رہا تھا، وہ گرتی پڑتی اس تالاب سے باہر آئی۔ اس کا لباس سیاہ بدبودار کیچڑ میں لتھڑ گیا تھا۔ یہ ان لڑکیوں کی لاشیں تھیں جو اس کی ساتھی تھیں اور ماری گئی تھیں، ان کی بے کفن لاشیں یہاں پھینک دی گئی تھیں۔ تالاب سے نکل کر وہ لرزتی کانپتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ بھیگنے سے جسم سرد ہو رہا تھا اور اسے لگ رہا تھا جیسے ہر گزرتے لمحے اس کی توانائی زائل ہوتی جا رہی ہے۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ بے ہوش ہو جائے گی اور ایسا ہوتا تو اس کے پیچھے آنے والے اسے تلاش کر لیتے۔ اچانک اسے کسی نے آواز دی اور اس نے بھڑک کر چاقو نکال لیا۔ کچھ دور وکٹر کھڑا تھا، اس کے ہاتھ میں پستول تھا لیکن اس کا رخ روبینہ کی طرف نہیں تھا۔ وہ آگے آیا تو روبینہ نے چاقو اس کی طرف کر لیا۔ وہ نرمی سے بولا۔

''ڈرو مت، میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا، یہ دیکھو...'' اس نے پستول بیلٹ میں لگا لیا۔ ''مجھ پر اعتماد کرو، تمہیں مدد کی ضرورت ہے میں تمہیں حفاظت سے تمہارے گھر تک پہنچا دوں گا۔''

روبینہ لرز رہی تھی، اس کا چاقو والا ہاتھ کانپنے لگا تھا۔ وکٹر بدستور نرمی سے بات کر رہا تھا۔ اب تک وہ روبینہ کی مدد کرتا آیا تھا بے شک اس نے روبینہ سے کام لیا تھا لیکن ساتھ ہی اس نے اسے بچایا بھی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ روبینہ نرم پڑ گئی۔ اس کا چاقو والا ہاتھ جھک گیا اور جب وکٹر نے چاقو اس کے ہاتھ سے لیا تو اس نے مزاحمت نہیں کی تھی۔ وکٹر نے چاقو لے کر اسے بیلٹ میں اڑس لیا اور نرمی سے اسے ایک بازو میں لے کر خود سے لگا لیا۔ اس نے کہا۔ ''تم نے کئی آدمیوں کو مارا... تمہاری وجہ سے میری دو لڑکیاں ماری گئیں...'' کہتے ہوئے اس کا لہجہ بدل گیا۔ ''اور تم سمجھتی ہو میں تم سے پہلے کی طرح مہربانی سے پیش آؤں گا...'' اس نے بالوں سے پکڑ کر روبینہ کا سر اوپر کھینچا۔ اس کی چیخ نکل گئی تھی اسی لمحے دو سمتوں سے ایوان اور گریگی نمودار ہوئے، انہوں نے پستول تان رکھے تھے ان کو دیکھتے ہی وکٹر نے تیزی سے روبینہ کو آگے کر کے اپنا پستول نکال لیا اور ایوان کی طرف تان لیا۔ ایوان نے کہا۔

''لڑکی میرے حوالے کر دو۔''

''یہ تمہاری ہے۔'' وکٹر نے کہا۔ ''لیکن پہلے پستول ہٹاؤ سامنے سے۔''

''تم نے کیوں پستول تانا ہے؟''

''تم لوگوں کی وجہ سے۔'' وکٹر نے کہا۔

''ہم نے لڑکی کو دیکھ کر پستول نکالا ہے۔'' گریگی بولا۔ ''اسے چھوڑ دو۔''

''نہیں، پہلے تم دونوں پستول نیچے کرو۔'' وکٹر بولا، اس نے روبینہ کو گردن سے جکڑ رکھا تھا۔ وہ اس کے سینے تک آ رہی تھی اور نیم بیٹھی پوزیشن میں تھی۔ اسے اپنے شانے میں کچھ چبھا تو اس نے کن انکھیوں سے دیکھا یہ اس کا چاقو تھا جو وکٹر نے بیلٹ میں اڑس لیا تھا۔ ایوان اور گریگی نے اپنے پستول نیچے کیے تو روبینہ پر وکٹر کی گرفت نرم پڑ گئی۔ اسے موقع ملا تو اس نے اچانک چاقو نکالا اور وکٹر کی ران میں گھونپ دیا۔ اس کے منہ سے دہاڑ نکلی اور اس کے ہاتھ میں دبے پستول سے فائر ہوا۔ گولی گریگی کے سینے میں اتر گئی۔ ایوان چلایا۔

''نہیں...''

گریگی نیچے گر گیا تھا اور اس کے سینے سے خون ابل رہا تھا۔ ایوان نے وکٹر پر لگاتار کئی فائر کیے وہ جھٹکے سے پیچھے جا گرا۔ روبینہ پہلے ہی نیچے گر چکی تھی۔ اس لیے بچ گئی پھر وہ اٹھ کر بھاگی۔ ایوان کی توجہ اس کی طرف نہیں تھی، وکٹر کے گرتے ہی وہ گریگی کی طرف بھاگا تھا۔ گریگی اس کا ایک ہی بھائی تھا اور وہ اس دنیا میں اگر کسی سے محبت کرتا تھا تو وہ گریگی ہی تھا۔ گریگی اٹک اٹک کر سانس لے رہا تھا اور اس کے ہونٹوں سے خون کے بلبلے اٹھ رہے تھے۔ گولی دل سے ذرا اوپر لگی تھی اور وہ دم توڑ رہا تھا۔ ایوان رونے لگا۔ ''میرے بھائی... مرنا نہیں... میرے ساتھ رہو... میرے بھائی...''

گریگی نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس کی زبان نے ساتھ نہ دیا اور اس نے دم توڑ دیا۔ اس لمحے بے شمار بے گناہ

انسانوں کے قاتل ایوان کو پتا چلا کہ موت کتنی تکلیف دہ ہوتی ہے۔ خاص طور سے جب وہ اپنے کسی پیارے کی ہو۔ اس نے کریگی کا سر نیچے رکھ دیا اور اس کی کھلی آنکھیں بند کر کے اس کے ماتھے پر پیار کیا۔ پھر اس نے کریگی کا پستول بھی اٹھایا اور وکٹر کے پاس آیا اس کے سینے اور پیٹ کے سوراخوں سے خون ابل رہا تھا اور وہ بھی چند لمحوں کا مہمان ... لگ رہا تھا مگر ایوان نے ایک انتقامی جذبے کے ساتھ اس پر دونوں پستول خالی کر دیے اور پھر اس پر تھوک کر وہاں سے چل پڑا۔ اب اسے لڑکی کو تلاش کرنا تھا اور اسے موت کے گھاٹ اتارنا تھا۔

☆☆☆

روبینہ خالی ذہن اور خالی جسم کی کیفیت میں چلی جا رہی تھی، اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے، وہ کئی بار گری اور اٹھ کر دوبارہ چلنے لگی۔ وہ جنگل میں تھی لیکن ایک بار اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو اسے سامنے مکانات کی قطار دکھائی دی۔ ہر مکان کے سامنے چھوٹا سا باغ بھی تھا لیکن بیشتر باغ موسم اور دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے اجڑ رہے تھے۔ وہ سست قدموں سے ایک مکان کی طرف بڑھی جس کے آگے الگنی پر سوکھنے کے لیے کپڑے لٹکے ہوئے تھے۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ یہاں کون رہتا تھا۔ وہ سرب تھے یا کوسووین مسلم، اسے بس پناہ چاہیے تھی۔ اس نے دروازے پر دستک دی اور پھر بے ہوش ہو کر نیچے گر پڑی۔ اس کے بعد اسے لگا جیسے وہ خواب دیکھ رہی ہے کہ کوئی اسے کسی گرم جگہ لے گیا ہے، کسی نے اس کے گندے ہو جانے والے کپڑے اتارے اور پھر گرم پانی اور اسفنج سے اس کا جسم صاف کیا، اس کے بال دھوئے اور پھر اسے صاف ستھرا لباس پہنا دیا۔

اچانک اسے ہوش آیا، وہ ایک صوفہ کم بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی۔ یہاں سکون آمیز گرمی اور خاموشی تھی، اس کے جسم پر ہلکا اونی پاجامہ اور گرم سی شرٹ تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ دیکھا جہاں زخم تھا اس پر پٹی چپکائی گئی تھی۔ تو وہ خواب نہیں تھا، کسی نے سچ مچ اسے صاف کر کے دوسرا لباس پہنایا تھا۔ اس نے آس پاس دیکھا۔ سامنے آتش دان کے اوپر ریک پر خنزیر کے گلابی مجسمے رکھے تھے۔ اس کا دل ڈوبنے لگا، اس کا مطلب تھا وہ کسی سرب کے گھر میں تھی۔ ایک طرف میز پر فیملی کی تصاویر تھیں۔ وہ ابھی دیکھ رہی تھی کہ ایک عورت وہاں آئی۔ اس نے سوپ کا پیالہ اٹھا رکھا تھا۔ اس نے مسکرا کر روبینہ کو دیکھا اور پیالہ اس کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ اس نے سرب زبان میں پوچھا۔

"تم کیسی ہو؟"

روبینہ نے اشارے سے بتایا کہ وہ بول اور سن نہیں سکتی ہے۔ عورت نے افسوس کیا۔ "اوہ... میرا نام مونیکا ہے اور یہ میرا گھر ہے۔"

اس نے روبینہ سے سوپ پینے کو کہا، اس نے ہچکچاتے ہوئے پہلا چمچ لیا تو اسے احساس ہوا کہ وہ کس قدر بھوکی تھی۔ اس نے بے تابی سے سوپ کے گرم ہونے کی پروا کیے بغیر پورا پیالہ ختم کر دیا۔ مونیکا نے خالی پیالہ اٹھایا اور اشارے سے بولی کہ وہ اس کے لیے اور سوپ لاتی ہے۔ اس کے جانے کے بعد روبینہ اپنی جگہ سے اٹھی اور تب اس نے پہلی بار میز پر رکھی تصویروں کو غور سے دیکھا، اسے پتا نہیں چلا کہ باہر فون کی گھنٹی بج رہی تھی پھر مونیکا نے فون ریسیو کیا۔ "ہاں بات کر رہی ہوں... کیا...؟" اس نے کہا اور اس کے ہاتھ سے پیالہ چھوٹ کر نیچے گرا اور ٹوٹ گیا۔ پھر اس نے ٹوٹی آواز میں کہا۔ "کب... کس نے، کہاں؟"

روبینہ اس گفتگو سے بے خبر مونیکا کے ساتھ تصویر میں کھڑے مرد کو دیکھ رہی تھی یہ وہی دیو قامت شخص تھا جسے اس نے ساشا کے کمرے میں قتل کیا تھا۔ وہ اس عورت مونیکا کے ساتھ لگا کھڑا تھا اور صاف ظاہر تھا کہ وہ میاں بیوی تھے۔ روبینہ کے ہاتھ سے تصویر چھوٹ کر گری اور اس کا فریم ٹوٹ گیا۔ وہ گھبرا گئی، اس نے جلدی سے فریم اور ٹوٹا شیشہ وہاں بچھے فٹ میٹ کے نیچے کر دیا اسی لمحے مونیکا اندر آئی تو اس کے تاثرات عجیب ہو رہے تھے، اس نے ہاتھ پیچھے کر رکھا تھا اور اندر آ کر اس نے دروازہ اندر سے لاک کر دیا۔ روبینہ پیچھے ہٹی۔ مونیکا نے اشارے سے پوچھا کہ وہ کہاں سے آئی ہے۔ جواب میں روبینہ نے دروازے کی طرف جانے کی کوشش کی تو مونیکا نے اچانک ہاتھ آگے کیا، اس میں چھری تھی۔ روبینہ پیچھے ہٹ گئی۔ مونیکا ایک وحشیانہ چیخ کے ساتھ اس کی طرف جھپٹی اور اس کے سینے پر وار کرنا چاہا، روبینہ اچھل کر پیچھے گئی مگر چاقو اس کی آستین کاٹتا ہوا گزر گیا۔ روبینہ صوفہ کم بیڈ پر گری اور پھر پلٹ کر دوسری طرف گری۔ اسی لمحے مونیکا آ کر صوفے پر گری اور وہ بھی پلٹ کر روبینہ پر آئی۔ اس کا چاقو والا ہاتھ روبینہ نے تھام لیا۔ مونیکا زور لگا رہی تھی، اس وقت اس کے نرم نقوش بگڑ گئے تھے۔ اس کے منہ سے غراہٹیں نکل رہی تھیں، شوہر کی موت کی خبر اور اس کی قاتلہ کی اپنے گھر میں موجودگی نے اسے پاگل کر دیا تھا۔ روبینہ چاہتی بھی تو اسے نہیں بتا سکتی تھی کہ اس نے اس کے شوہر کو کن حالات میں موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ اگر وہ بتا سکتی تو مونیکا کہاں سنتی؟ اس وقت وہ بالکل پاگل اور جنونی ہو رہی تھی۔

روبینہ نے زور لگا کر اسے دھکا دیا اور پھر اٹھ کر بھاگی۔ مونیکا نے اس کا پاؤں پکڑا تو وہ منہ کے بل گری تھی۔ اس کا ہاتھ فٹ میٹ پر گیا اور اسے خیال آیا، اس نے نیچے ہاتھ ڈالا تو ایک شیشہ اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ مونیکا اس کے پیچھے آ رہی تھی۔ روبینہ نے پلٹ کر اندھا دھند ہاتھ چلایا، مونیکا چیخ مار کر پیچھے گئی، اس کا ہاتھ اپنے پیٹ پر تھا وہاں سے خون ابل رہا تھا، شیشے نے اس پیٹ کاٹ دیا تھا۔ وہ پیچھے ہٹی اور پھر لڑکھڑا کر نیچے گری تھی۔ روبینہ نکل کر بھاگی۔ گھر سے باہر آ کر وہ نظر آنے والی پہلی سڑک پر چل پڑی تھی۔ اسی لمحے دوسری طرف سے ایک کار آ کر مونیکا کے مکان کے سامنے رکی اور اس سے اتر کر ایوان اندر کی طرف بڑھا۔ اندر آتے ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ پھر اسے مونیکا کی لاش نظر آئی، اس کا جسم گرم تھا یعنی اسے مرے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ ایوان تیزی سے باہر کی طرف لپکا۔ اس نے کار اسٹارٹ کی اور سڑک پر نکل آیا۔

روبینہ نے کار کا ارتعاش محسوس کیا تو پلٹ کر دیکھا اور پھر تیزی سے بھاگی، اس نے ایوان کی کار پہچان لی تھی۔ اس سڑک پر کہیں جائے پناہ نہیں تھی پھر اسے بائیں طرف کسی فیکٹری نما عمارت کے آثار نظر آئے وہ اس طرف گھوم گئی۔ ایک چھوٹی دیوار کو پھلانگ کر وہ دوسری طرف آئی۔ کار اس طرف نہیں آ سکتی تھی اس لیے ایوان اس سے اتر کر اس کے پیچھے آنے لگا۔ روبینہ فیکٹری کی عمارت میں داخل ہوئی تو وہاں بڑے سے ہال میں کئی افراد کام کر رہے تھے، مشینیں چل رہی تھیں۔ روبینہ ایک مزدور کے پاس آئی۔ اسی دوران میں ایوان اندر گھس آیا، اسے دیکھ کر روبینہ سہم کر اس مزدور کے پیچھے ہوئی۔ ایوان نے بڑا سا فوجی چاقو نکالا اور غرا کر بولا۔ "سب یہاں سے باہر چلے جائیں فوراً۔"

مزدور دیکھ رہے تھے کہ وہ فوجی وردی میں تھا اور وہ سب سرب تھے اس لیے حکم کی تعمیل نہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ ایک ایک کر کے باہر جانے لگے۔ ایوان نے آخری آدمی سے کہا۔ "دروازہ باہر سے بند کر لینا۔"

جب آخری آدمی بھی باہر نکل گیا اور فولادی دروازہ آواز سے بند ہوا تو ایوان روبینہ کی طرف متوجہ ہوا لیکن وہ اس جگہ نہیں تھی۔ ایوان تیزی سے آگے آیا۔ یہاں بڑے سائز کی کئی مشینیں ساتھ ساتھ لگی تھیں اور ان کے درمیان اتنا خلا تھا کہ روبینہ جیسی لڑکی دوسری طرف نکل جاتی۔ ایوان نے پورا ہال گھوم کر دیکھ لیا مگر روبینہ کہیں نظر نہیں آئی۔ وہ اس جگہ سے دور نہیں گئی تھی اور یہاں سے غائب بھی نہیں ہو سکتی تھی، پھر وہ کہاں تھی؟ اس سوال کا جواب بھٹی کے اوپر لگے بڑے سائز کے فولادی پائپ سے آتی آواز سے ملا۔ روبینہ بھٹی کے راستے اس میں داخل ہو گئی تھی کیونکہ بھٹی بند تھی۔ ایوان کا غصہ بڑھنے لگا اور وہ سوچے سمجھے بغیر بھٹی کے راستے اس کے پائپ میں گھس گیا۔ اندر راکھ کی تہ سی جمی تھی لیکن اس کی وجہ سے پائپ اندر سے کھردرا ہو گیا تھا اور اس پر چڑھا جا سکتا تھا۔

ایوان جسیم تھا اس لیے اسے روبینہ کے مقابلے میں زیادہ مشکل پیش آ رہی تھی لیکن وہ کسی نہ کسی طرح آگے بڑھ رہا تھا۔ اوپر نکلنے والے آخری ایل سے مڑتے ہوئے وہ پھنس گیا اور پھر نکلنے کی کوشش میں ایسا پھنسا کہ واپس بھی نہیں جا پا رہا تھا۔ روبینہ اس دوران میں آگے نکل گئی تھی۔ ایوان کی آواز سن کر اس نے مڑ کر دیکھا اور پھر اسے پھنسے پا کر وہ واپس آئی۔ ایوان کے بالکل پاس آ کر اس نے اس کا معائنہ کیا اور اشارے سے بولی۔ "تمہیں میری ماں یاد ہے؟"

"ہاں۔" ایوان بولا۔ "میری مدد کرو، میں یہاں پھنس گیا ہوں۔"

اسی لمحے نیچے ہال میں شور سنائی دیا، ایوان نے چلّانے کے لیے منہ کھولا تھا کہ روبینہ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور پھر اس کی قمیص کی جیب سے رومال نکال کر اس کے منہ میں ٹھونس دیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں پہلے ہی پھنسے تھے اب منہ بھی بند ہو گیا تھا، وہ کسی صورت آواز نہیں نکال سکتا تھا۔ کارخانے میں کام کا آغاز ہو رہا تھا اور پھر کسی نے بھٹی میں آگ روشن کر دی۔ ایوان کی آنکھیں پھیل گئی تھیں، وہ مچلنے لگا لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ فوراً ہی نیچے سے تپش آنے لگی۔ روبینہ مسکرائی اور واپس پلٹ گئی۔ وہ اٹنی واپس گئی اور پھر چمنی سے باہر نکل گئی۔ ایوان محسوس کر رہا تھا تپش رفتہ رفتہ بڑھ رہی تھی اور کچھ دیر بعد وہ زندہ روسٹ ہو کر رہ جاتا۔ اس کی ناک سے آوازیں نکل رہی تھیں جنہیں اب کوئی نہیں سن سکتا تھا۔

روبینہ چمنی سے باہر نکلی اور اس نے سامنے دیکھا تو اسے ڈھلان کے پار ایک فوجی کیمپ دکھائی دیا جس پر نیٹو کا پرچم لہرا رہا تھا۔ اسے وہاں جانا تھا۔ وہ ترچھی چھتوں سے اترتی زمین تک آئی اور پھر وادی میں اترنے لگی۔ خوف بہت پیچھے رہ گیا تھا، آگے امید کھڑی تھی۔

پسِ زنداں

طاہر جاوید مغل

چوتھا حصہ

عکس منظر کا ہو یا پس منظر کا، بعض اوقات اتنا پُرکشش ہوتا ہے کہ سوچ کے انداز بدل جاتے ہیں مگر... یہ بھی حقیقت ہے کہ عکس بن کر تعاقب کرنے والے کبھی سائے کی ٹھنڈک نہیں دیتے۔ ان سے تنہائی دور ہوتی ہے اور نہ ہی اذیتوں میں کمی آتی ہے ایسے میں جب ہجر کا موسم طاری ہو اور پل پل دل پر بھاری ہو تو ان بھید بھرے لمحات میں کوئی دریافت کرتا ہے یا کسی کو برباد کرتا ہے۔ لیکن اس کا شمار دریافت کرنے اور تسخیر کرنے والوں میں ہوتا تھا کیونکہ اسے کٹھن کام کا جنون تھا جبکہ کسی انسان کو سمجھنا شاید دنیا کا مشکل ترین کام ہے اور اگر وہ انسان عورت ہو جو پہیلی بن کر جستجو بھڑکاتی ہے اور جو لفظوں میں بند ہو کر کتاب کی صورت کسی کے من میں گھر کر جائے تو کیسے ورق ورق کرکے لفظ بہ لفظ اسے کھوجنے کی لگن اس میں پیدا نہ ہو... مگر ایسا اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب آپ کی سوچ کے زنداں میں کوئی قید ہو جائے... وہ بھی منظر اور پس منظر کے درمیان الجھ گیا تھا... جو کچھ اس نے دیکھا اس کی تہ میں اترنا چاہتا تھا مگر... حدود وقیود کا حامی آگے بڑھنے سے قاصر تھا۔ ایسے میں بے بسی نے اسے آنسوئوں کے سمندر میں دھکیل دیا جہاں وہ تنکا تنکا بہتا رہا اور وحشتوں کے طوفان اسے اپنے گھیرے میں لیتے رہے لیکن یہ کسے معلوم تھا کہ چڑھنے والا سورج اپنے دامن میں کیا کچھ سمیٹ لایا ہے۔ بالآخر پتھر سے ٹکراتے ٹکراتے اسے یہ ادراک ہوا کہ جہاں عمل ہے وہاں کہیں ردِعمل بھی چھپا ہوا ہے... بس اسی فراست نے اسے مطمئن کردیا... یہ اور بات کہ اس اطمینان نے بہت سوں کا چین برباد کر ڈالا تھا۔

دیارِ غیر میں اپنوں سے دور کسی اپنے کی
تلاش میں سرگرداں محبتوں کی گرم
فرمائیاں اور رقیبوں کی
عنایتوں کی
داستان

ہادی کے کیمرے میں حجاب کی تصویر اور اس انداز کی۔ اسے یقین نہیں آیا۔ اس نے کیمرے کی اسکرین پر تصویر کو زوم ان کیا اور ششدر رہ گئی۔ یہ حجاب ہی کی تصویر تھی، لیکن حیران کن طور پر یہ تصویر پتلون اور شرٹ میں تھی۔ حجاب کے بال پونی ٹیل کی شکل میں بندھے تھے۔ یہ سائڈ پوز تھا، وہ ایک طرف جھکی ہوئی کچھ دیکھ رہی تھی۔

''اوہ گاڈ!'' ارم کے ہونٹ دائرے کی شکل میں سکڑ گئے۔

آصفہ، ارم کے ساتھ ہی بیٹھی تھی۔ اس دوران میں وہ بھی تصویر دیکھ چکی تھی اور اس کے چہرے پر بھی حیرت نظر آرہی تھی۔ ''یہ دیکھو بھئی، یہ کیا سین ہے؟'' آصفہ نے ماہ نور اور نادیہ کو متوجہ کیا۔

ارم نے جلدی جلدی کچھ مزید تصویریں دیکھیں۔ مزید کہیں حجاب کی تصویر نہیں تھی۔ ہادی ابھی تک بالکونی میں کھڑا بات کر رہا تھا۔ لگتا تھا کہ اس کی گفتگو اختتامی مراحل میں ہے۔ ارم نے اپنا شولڈر بیگ کھولا۔ اس میں سے اپنا قیمتی موبائل فون نکالا۔ ڈیجیٹل کیمرے کے ڈس پلے پر اس نے مطلوبہ تصویر کو اپنی ضرورت کے مطابق انلارج کرلیا۔

''یہ تو بڑی خاصے کی چیز ہے بھئی۔'' ارم نے کہا اور اپنے موبائل فون کے کیمرے کے ذریعے حجاب کی تصویر اپنے موبائل فون میں منتقل کرلی۔ رزلٹ بہت اچھا رہا۔

''یہ چپکے چپکے کیا چکر چل رہے ہیں ارم؟'' ماہ نور نے آنکھیں نچائیں۔

''مجھے کیا پتا۔'' ارم نے منہ بنا کر کہا۔

''لگتا ہے کہ جلال سے تمہاری شادی کو حجاب نے ہضم نہیں کیا۔ وہ ری ایکشن دینے کے موڈ میں ہے۔''

''ری ایکشن ساری ایکشن۔ یہ تو تہلکہ مچ جائے گا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اندر خانے کوئی گڑبڑ ہو بھی چکی ہے۔ جلال بھائی شاید اسی لیے حجاب کو میکے سے واپس گھر نہیں لائے بلکہ پرانی کوٹھی لے گئے ہیں۔'' آصفہ نے خیال ظاہر کیا اور سوالیہ نظروں سے ارم کو دیکھنے لگی۔

''مجھے تو کچھ پتا نہیں یار۔ ان سائڈ کیا کر رہے ہیں یہ لوگ۔'' ارم نے کہا۔

''اتنی بھولی نہ بنو۔ پتا تو بہت کچھ ہوگا تمہیں۔ بس ہم سے شیئر نہیں کر رہی ہو...... لیکن ایسی باتیں چھپتی نہیں ہیں جانِ من۔'' ماہ نور نے لقمہ دیا۔

''اچھا چپ ہو جاؤ۔ لگتا ہے وہ آرہا ہے۔'' ارم نے کہا اور کیمرا واپس شیشے کی تپائی پر رکھ دیا۔ اس کے ذہن میں کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔

☆☆☆

ایسی باتیں جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی ہیں۔ چہ میگوئیاں تو کافی ہاؤس والے واقعے کے بعد ہی شروع ہو گئی تھیں اور ان چہ میگوئیوں کو ہوا دینے میں پس پردہ ارم ہی کا ہاتھ رہا تھا۔ مگر اب تو کھلم کھلا باتیں کی جا رہی تھیں۔ روم میں راؤ خاندان کی تین چار فیملیاں رہائش پذیر تھیں، واہلہ خاندان کے بھی دو تین گھر تھے۔ ان سب لوگوں کے ہاتھ ایک نہایت دلچسپ اور سنسنی خیز خبر آ گئی تھی۔ خبر میں کچھ تو سنسنی کا مواد واقعی موجود تھا، بہت سا مرچ مسالہ بھی لگا لیا گیا تھا۔ برملا کہا جا رہا تھا کہ پاکستان سے آنے والے شاعر محمد ہادی کے ساتھ حجاب کا باقاعدہ معاشقہ چل رہا ہے۔ حجاب اپنی دوست ماریہ کی شادی کے بہانے اسی سے ملنے وینس گئی تھی۔ وہاں وہ دونوں خفیہ ملاقاتیں کرتے رہے۔ بعدازاں ہادی، حجاب کے پیچھے ہی پیچھے روم چلا آیا بلکہ جلال کے گھر تک بھی پہنچ گیا۔ یہاں ہوٹل واسکوڈے میں بھی وہ دونوں مسلسل ملتے رہے ہیں......

حجاب چونکہ الگ تھلگ ورس والے گھر میں تھی اور اس نے فون بھی بند کر چھوڑا تھا اس لیے وہ اس انتہائی تشویش ناک صورت حال سے بے خبر تھی۔ اسی بے خبری کے عالم میں وہ کل دل کڑا کر کے ڈرائیور کے ساتھ بازار بھی گئی تھی۔ اس نے ارم کے لیے کچھ کامدار سوٹ خریدے تھے، یہ اپنے گلے پر اپنے ہاتھ سے چھری چلانے والی بات تھی لیکن اس کا خیال تھا کہ اس کا یہ عمل جلال کے اشتعال کو کم کرنے میں مدد دے گا۔ ویسے بھی جو کام اب کرنا تھا وہ تو کرنا ہی تھا۔ پھر اس میں تاخیر اور ہچکچاہٹ سے فائدہ؟ پچھلے دو تین روز میں وہ بہت روئی تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ رو رو کر اس کا سر اور سینہ دونوں خالی ہو گئے ہیں۔ اب اس کے اندر ایک طرح کا ٹھہراؤ سا پیدا ہونے لگا تھا۔ وہی ٹھہراؤ جو اکثر و بیشتر ہاری ہوئی عورت کا سہارا بنتا ہے اور اسے بدترین حالات میں بھی زندگی کو جاری رکھنے کے راستے دکھاتا ہے۔

آج رات جلال آرہے تھے۔ حجاب نے خود کو بہ مشکل کمپوز کیا۔ فریش ہو کر لباس تبدیل کیا۔ اس کی ہدایت پر شریفاں نے سندھی بریانی بنائی اور جلال کے پسندیدہ سیخ کباب تیار کیے۔ شریفاں کچھ خاموش خاموش تھی مگر شام کے بعد تک حجاب کو اس کا اندازہ نہیں ہوا۔ آٹھ بجے کے قریب جب حجاب کھانے کی میز سجا رہی تھی اور جلال کے آنے میں آدھ پون گھنٹا باقی تھا، حجاب کو شریفاں کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی نظر آئی۔ وہ الماری میں سے چمچ نکالتے نکالتے رک گئی۔ ''کیا بات ہے شریفاں! کوئی مسئلہ ہے؟'' اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

وہ باقاعدہ سسکیاں لینے لگی۔ حجاب نے اسے اپنے ساتھ لگایا اور وجہ پوچھی۔ وہ پہلے تو خاموش رہی۔ پھر بولی۔ ''باجی! دوپہر کو میں نے آپا خانم کو فون کیا تھا، وہ تو سو رہی تھیں۔ کلثوم (ملازمہ) سے بات ہوئی۔ وہ بڑی پریشان کرنے والی باتیں بتا رہی تھی۔''

''پریشان کرنے والی؟ کیا مطلب؟''

''وہ...... آپ کے بارے میں بتا رہی تھی جی۔ مجھے ڈھاڈا دکھ ہوا ہے۔ ان لوکاں کو تو بس باتیں بنانے کا بہانہ چاہیے ہوندا ہے۔''

''مجھے کھل کر بتاؤ شریفاں۔ کیا باتیں بتا رہے ہیں؟''

وہ آنسو پونچھ کر بولی۔ ''مجھے تو اس کے پیچھے بھی اس بی بی ارم کا ہتھ ہی لگدا ہے جی۔ وہ ہتھ دھو کر آپ کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ اس نے باتیں مشہور کی ہیں جی، آپ کے اور...... ان ہادی صاحب کے بارے میں۔'' شریفاں کی آواز لرز رہی تھی۔

حجاب کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ منہ خشک ہونے لگا۔ وہ خود کو سنبھال کر بولی۔ ''مجھے تفصیل سے بتاؤ شریفاں۔''

''میرا دل کرتا ہے کہ منہ توڑ دوں ان سب کے۔ اللہ کرے ان کی زبان سڑے۔ کہتے ہیں آپ اور ہادی صیب پہلے سے ایک دوجے کو جانتے ہیں اور ہادی صیب آپ ہی سے ملنے کے لیے یہاں آئے ہوئے ہیں۔ ہادی صیب نے چھوٹے بھائی جان ظہیر کو بھی چکر دیا۔ انہوں نے چھوٹے بھائی جان کو اس طرح بے وقوف بنایا کہ وہ ان کو اپنے گھر میں ہی لے آئے۔ بعد میں وڈے بھائی جان کو شک ہوا تو انہوں نے ہادی صیب کو گھر سے نکال دیا۔ لیکن آپ دونوں...... پھر بھی باز نہیں آئے اور ہوٹل میں ایک دوجے سے ملتے رہے۔''

حجاب کا سر گھوم رہا تھا۔ ''کون کر رہا ہے یہ باتیں؟'' اس نے پوچھا۔

''سارے ہی کر رہے ہیں جی۔ مجھے تو لگدا ہے کہ وڈے بھائی جان تک بھی پہنچ گئی ہوں گی۔ یہ لوک کسی تصویر کی گل بھی کر رہے ہیں۔ آپ کی یہ تصویر ہادی صیب کے پاس سے ملی ہے۔ کہتے ہیں کہ بڑی بے ہودہ تصویر ہے۔ میں تو مر کر بھی ان باتوں پر یقین نہیں کر سکتی جی۔''

''تصویر...... کیسی تصویر؟'' حجاب کی آواز حیرت آمیز دکھ سے کپکپا رہی تھی۔

''مجھے کیا پتا جی۔ میرا تو دل ہول رہا ہے۔ آپ کے لیے بڑی مصیبت بن جائے گی۔ مارنے والے کا ہتھ پکڑا جاسکتا ہے، پر بولنے والی کی زبان کو کیسے پکڑا جائے۔ وہ تو کمپیوٹر کی گل بھی کر رہے ہیں...... کیا کہتے ہیں جی اس سڑن جوگے کو......؟ انٹرنیٹ۔''

''انٹرنیٹ؟''

''آہو جی۔ کہتے ہیں کہ آپ کا اور...... ہادی صیب کا معاملہ انٹرنیٹ پر شروع ہوا تھا۔ بڑھتے بڑھتے گل یہاں تک پہنچی ہے۔ باجی! آپ وڈے بھائی جان سے گل کریں فوراً اور ان باتوں کو روکیں جی۔ یہ کوئی معمولی گل ہے اس طرح کسی کو بدنام کرنا......''

حجاب کے ماتھے پر پسینا آ گیا۔ اسے لگا کہ اس کا دل ڈوب رہا ہے۔ اس نے کرسی کا سہارا لیا اور بیٹھ گئی۔ یہ سب کیا ہو رہا تھا۔ وہ پیچھے تو ہٹ گئی تھی، پسپا تو ہو گئی تھی۔ اب یہ لوگ اسے کہاں تک دھکیلنا چاہتے تھے۔ اسے سمجھ نہیں آئی کہ یہ جھوٹ کون تراش رہا ہے اور کس لیے؟ ظاہر ہے کہ شریفاں جھوٹ تو نہیں بول سکتی تھی۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں تو اس کی زبان تک آئی تھیں۔ اس کی نگاہوں میں اپنے ابو امی کے چہرے گھومے۔ وہ تو پہلے ہی حالات کی سنگینی سے ڈرے سہمے تھے۔ ابھی تو وہ یہ سوچ رہی تھی کہ ان تک جلال کی دوسری شادی کی خبر کس طرح اور کس انداز سے پہنچائے کہ انہیں کم سے کم دھچکا لگے (حالانکہ وہ اس معاملے سے یکسر بے خبر بھی نہیں تھے) اب یہ دوسری مصیبت کھڑی ہو گئی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ ابھی جلال کو فون کرے اور اسی سے اس بارے میں بات کرے۔ پھر اس نے گھڑی دیکھی۔ جلال اب پندرہ بیس منٹ میں پہنچنے والا تھا۔

وہ بے چینی سے برآمدے میں ٹہلنے لگی۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد جلال کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا اور حجاب کی بے چینی عروج پر پہنچ گئی۔

جلال اندر آیا تو حجاب نے السلام علیکم کہا۔ اس نے جواب دیا۔ اس کے چہرے سے کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل ہوا کرتا تھا۔ آج بھی چہرہ سنجیدہ تھا۔ کچھ کہا نہیں جاسکتا تھا کہ اس کے کانوں تک وہ باتیں پہنچی ہیں یا نہیں جو ابھی شریفاں نے بتائی ہیں۔

''چینج کریں گے؟'' حجاب نے پوچھا۔

"نہیں۔" جلال نے مختصر جواب دیا۔

"کھانا لگواؤں؟"

"نہیں، ابھی نہیں۔ میں ذرا ایک فون کرلوں۔"

وہ فون والے کمرے میں چلا گیا۔ لینڈ لائن پر کسی سے پانچ دس منٹ بات کی۔ پھر باہر آگیا۔ دونوں ڈائننگ روم میں ہی صوفوں پر بیٹھ گئے۔ ملازم باہر گیراج میں تھا۔ شریفاں کچن کی طرف جاچکی تھی۔ "میلانو میں کام ہو گیا؟" حجاب نے پوچھا۔

"ہوں۔" جلال نے مختصر جواب دیا۔ پھر ذرا توقف سے بولا۔ "تم کیا کرتی رہی ہو؟"

"آج تو گھر میں ہی رہی ہوں۔ کل تھوڑی دیر کے لیے بازار گئی تھی۔"

"بازار؟"

"ہاں کچھ شاپنگ کی تھی۔" حجاب نے کہا اور اٹھ کر الماری سے کامدار جوڑوں والے ڈبے اٹھا لائی۔

"یہ کیا ہے؟"

"کپڑے۔" حجاب نے جواب دیا اور ڈبے کھول کر جلال کو دکھانے لگی۔ جلال نے اٹھ کر دروازہ بند کیا اور حجاب کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔ "مجھے بتاؤ، کیا چاہتی ہو تم؟"

اس کا انداز دیکھ کر وہ پوری جان سے لرز گئی۔

"مم...... میں سمجھی نہیں جلال۔"

"تمہارا کیا خیال ہے؟ تمہارے سوا اس دنیا میں نرے احمق اور گدھے بھرے ہوئے ہیں۔"

"جلال...... پلیز...... مجھ سے اس لہجے میں بات نہ کریں۔ مم...... میں جانتی ہوں، میرے بارے میں باتیں بنائی جارہی ہیں اور......"

"تیرے بارے میں باتیں بنائی جارہی ہیں۔ تجھ پر الزام لگ رہے ہیں۔ سارے دشمن ہو گئے ہیں تیرے، بس ایک تو ہی پاک صاف رہ گئی ہے یہاں پر۔"

"آپ تحمل سے میری بات سنیں جلال۔"

وہ پھنکارا۔ "میں نے جو سننا تھا سن لیا ہے اور جو دیکھنا تھا وہ بھی دیکھ لیا ہے۔ یہ کیا کرتی پھر رہی ہے تو...... یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"میں نے کچھ نہیں کیا جلال!"

"کیا تو اس حرامزادے سے مل نہیں رہی؟ اس کے ساتھ وینس میں سیر سپاٹے نہیں کرتی رہی؟ تم دونوں کے انٹرنیٹ پر رابطے نہیں رہے ہیں؟"

"یہ غلط ہے جلال! یہ جھوٹ ہے۔" وہ لرز کر بولی۔

ایک زناٹے کا تھپڑ حجاب کے گال پر پڑا اور اس کے خوب صورتی سے سنوارے ہوئے بال اچھل کر اس کے چہرے پر آگئے۔ جلال نے ایک تصویر اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ "اور یہ بھی جھوٹ ہے...... یہ بھی فراڈ ہے؟"

حجاب نے دھندلائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ اس کی ریڑھ میں سرد لہر دوڑ گئی یہ پینٹ اور شرٹ میں اس کی تصویر تھی۔ پس منظر میں وینس کا ایک پل دکھائی دے رہا تھا۔

جلال دہاڑا۔ "یہ اس حرامزادے کے کیمرے سے ملی ہے جس کے ساتھ تو نے وینس میں اور پتا نہیں کہاں کہاں مستیاں کی ہیں۔ لعنت ہے تجھ پر اور لعنت ہے ایسے والدین پر جنہوں نے تیرے جیسی بیٹی پیدا کی۔ ڈوب مر شرم سے۔ ایک طرف یہ پردہ داریاں، یہ دین داریاں ہیں اور دوسری طرف یہ چھچھورے...... تو بہروپن ہے، ناپاک عورت ہے۔" اس نے بیٹھے بیٹھے زور سے ٹانگ چلائی جو حجاب کے سینے پر لگی۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی کھانے کی میز پر جا گری۔ کچھ دیر پہلے اس نے بڑی محنت سے جو میز سجائی تھی وہ درہم برہم ہوگئی۔ پلیٹیں گر کر ٹوٹ گئیں۔ گلاس فرش پر لڑھکتے نظر آئے۔ وہ اسے بے دردی سے مارنے لگا۔ وہ پکار رہی تھی۔

"جلال...... میں نے کچھ نہیں کیا۔ جلال میری بات سنیں۔"

یقیناً مار دھاڑ اور رونے چلانے کی یہ ساری آوازیں ملازمین تک بھی پہنچ رہی تھیں۔ ان میں سے کون اندر آنے اور مداخلت کرنے کی ہمت کرسکتا تھا۔ وہ یکسر جلال کے رحم و کرم پر تھی۔ اس نے ایک واکنگ اسٹک اٹھائی اور اس سے حجاب کو پیٹنے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ اسے، اس کے ماں باپ اور اس کے خاندان کو بدترین القابات سے نواز رہا تھا۔ یہ لمحے حجاب کے لیے قیامت سے کم نہیں تھے۔ کوئی اس کے جسم کو جیسے دہکی ہوئی سلاخوں سے داغ رہا تھا۔ وہ چلا تو رہی تھی مگر آواز جیسے اس کے سینے کے اندر ہی گونج رہی تھی۔ آخر چھڑی ٹوٹ گئی۔ جلال نے اسے گردن سے دبوچا اور دھکا دے کر دیوار سے دے مارا وہ لہراتی ہوئی کامدار جوڑوں کے ڈبوں پر جا گری۔ زرق برق لباس بکھرتے نظر آئے۔

وہ گرجا "حرامزادی! شاپنگیں کرتی پھر رہی ہے، اس یار کو دکھانے کے لیے۔ اس کو رجھانے کے لیے...... تیری جیسی عورت کو تو چوراہے میں سنگسار کرنا چاہیے۔"

حجاب کا گلا خشک ہو کر بند ہو چکا تھا۔ وہ یہ بھی نہ کہہ سکی کہ یہ شاپنگ اس نے اپنے لیے نہیں اس کی ہونے والی بیوی کے لیے کی ہے، اس کے حکم کے مطابق۔ وہ نیم جان سی

اوندھے منہ پڑی تھی۔ اس کی پشت پر انگارے دہک رہے تھے۔ جلال نے ایک اور ٹھوکر اس کے پہلو میں رسید کی اور گالیاں دیتا ہوا باہر چلا گیا۔

وہ تصویر چند فٹ کے فاصلے پر ٹوٹی ہوئی پلیٹوں اور گلاسوں کے پاس پڑی تھی۔ حجاب نے اشک بار نظروں سے تصویر کو دیکھا۔ یہ اسی کی تھی۔ وینس کی کسی گلی میں اتاری گئی تھی۔ اگر یہ ہادی کے کیمرے سے نکلی تھی تو یقیناً اس نے چوری چھپے ہی ایسا کیا تھا۔ ہادی کے لیے اس کا رنج اور طیش کچھ اور بڑھ گیا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ اس کے سامنے ہو اور وہ اس کا منہ نوچ لے۔

☆☆☆

ہادی ہوٹل داسکوڈے کے کمرے میں تھا۔ اس کی بے چینی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ حجاب سے اس کی آخری ملاقات تب ہوئی تھی جب جلال اسے کانی ہاؤس سے لے کر گیا تھا۔ اس کے بعد سے وہ اس کی شکل دیکھ سکا تھا نہ آواز سن سکا تھا۔ اسے کچھ خبر نہیں تھی کہ وہاں کیا صورت حال ہے۔ ہادی کے ذہن میں آتا تھا کہ شاید صورت حال اتنی خراب نہ ہو جتنی وہ سوچ رہا ہے۔ دو روز پہلے ارم اور اس کی کزنز وغیرہ یہاں آئی تھیں۔ وہ بھی بڑے ہلکے پھلکے موڈ میں باتیں کرتی رہی تھیں۔ ان کے رویے سے اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ حجاب کی طرف کسی طرح کی ناخوشگوار صورت حال موجود ہے۔ ظہیر کی طرف سے بھی کوئی "ایسا ویسا" رابطہ نہیں ہوا تھا۔ ہادی اپنے ذہن میں اس خوش فہمی کو جگہ دے رہا تھا کہ شاید اس دن جلال واقعی اتفاق سے کافی ہاؤس آپہنچا ہو اور یہ کہ شاید آج حجاب خود ہی اس سے رابطہ کرلے، یا کیا پتا خود ہی یہاں آن پہنچے۔ حجاب کو بھی پتا تھا کہ آج روم میں اس کا آخری دن ہے۔ کل اس نے فلورنس یا پیسا کا رخ کرنا ہے۔ سابقہ پروگرام کے مطابق آج حجاب نے آنا تھا اور ہادی کو الوداع بھی کہنا تھا۔ وہ صبح ہی نہا دھو کر تیار ہو گیا۔ پتا نہیں کیوں اسے یقین تھا کہ حجاب اس سے ملنے کا کوئی نہ کوئی راستہ ڈھونڈ ہی نکالے گی اور کچھ نہیں تو فون تو ضرور ہی کرے گی۔

ابھی تک اس نے روم سے جانے یا نہ جانے کا کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ وہ چلا گیا تو اس کا دل و دماغ یہیں رہ جائے گا۔ وہ اپنا خالی، مٹی کا جسم لے کر جائے گا، جس میں زندگی کی کوئی امنگ ترنگ نہیں ہوگی، بلکہ شاید زندگی ہی نہ ہوگی۔ کوئی اتنی جلدی کسی کے جسم و جاں پر قبضہ کرسکتا ہے، ہادی نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ اس نے عشق و محبت کے گداز جذبے کے بارے میں سیکڑوں شعر کہے تھے، ہزاروں صفحات بھر دیے تھے مگر عملی طور پر اس جذبے سے اس کا واسطہ پہلی بار پڑا تھا اور اتنی شدت سے کہ وہ دنگ تھا۔ اسے اپنے سامنے ایک بند گلی بالکل صاف نظر آرہی تھی۔ اس کا دماغ چلا چلا کر کہہ رہا تھا کہ سفر ناممکن ہے، آگے بڑھنے سے کچھ حاصل نہیں۔ رک جاؤ...... پلٹ جاؤ۔ دم گھٹ جائے گا، مر جاؤ گے۔ بند گلی راستہ نہیں دے گی، مگر سب جانتے بوجھتے بھی وہ بے ساختہ قدم اٹھاتا چلا جارہا تھا، کسی انہونی کی خواہش نے دل کے اندر کہیں گہرائی میں گھات لگا رکھی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی چلتے رہو، تم نے سنا نہیں کبھی کبھی دیواریں راستہ دیتی ہیں۔ تم نے سنا نہیں کبھی پتھر پگھلتے ہیں اور کیا تم نے سنا نہیں کبھی پانیوں میں دیے جل اٹھتے ہیں۔

اچانک اس کا جسم سنسنا اٹھا۔ دروازے پر مدھم دستک ہوئی تھی۔ "حجاب...... حجاب" اس کے دل نے دیوانہ وار پکارا اور دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئیں۔ دستک دوبارہ ہوئی۔ اس نے دروازے کے Peep Hole میں آنکھ لگائی اور مایوسی ایک لہر بن کر اس کے سینے میں دوڑ گئی۔ وہاں حجاب کا دیور ظہیر نظر آرہا تھا۔

اس نے خود کو کمپوز کرتے ہوئے دروازہ کھولا۔

"السلام علیکم ظہیر بھائی۔"

"وعلیکم السلام!" ظہیر نے کہا۔ آج پہلی بار ہادی اس کے فربہ چہرے پر گہری سنجیدگی دیکھ رہا تھا۔ دونوں صوفوں پر آبیٹھے۔ ظہیر نے سفید رومال نکال کر پیشانی سے پسینا پونچھا۔

"کیا حال ہے ظہیر بھائی؟"

"بس ٹھیک ہوں۔ ایک ضروری بات کہنے آیا ہوں تم سے۔"

"کہیے جناب!"

"پہلی بات تو یہ ہے ہادی...... کہ میں تمہاری طرف سے بے حد مایوس ہوا ہوں۔ تم ایک فن کار ہو۔ فن کار تو اتنا سخت دل اور بے حس نہیں ہوتا۔"

"میں سمجھا نہیں ظہیر بھائی؟"

"میرے خیال میں اب تم یہ "بھائی" کا لفظ بھی نہ ہی کہو تو بہتر ہے۔ تم نے جو کچھ کیا ہے، اس کے بعد اس کی گنجائش کم ہی نکلتی ہے۔" ظہیر کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

ہادی نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ جلال صاحب نے تمہیں کچھ بتایا ہے۔"

وہ بھڑک کر بولا۔ ”جلال صاحب نے نہیں بتایا...... پورا خاندان بتا رہا ہے۔ تھوتھو ہو رہی ہے تم پر...... اور ساتھ ہی مجھ پر بھی۔ میں تمہیں مہمان بنا کر گھر لے گیا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ اندر خانے کیا چکر چلے ہوئے ہیں یہاں۔“

”تم غلط فہمی کا شکار ہو رہے ہو ظہیر۔“

”پلیز خاموش ہو جاؤ۔ پلیز...... میرا منہ نہ کھلواؤ۔ ورنہ بات بہت بڑھ جائے گی۔“ وہ بلند آواز میں بولا۔

”مگر...... کچھ پتا تو چلے۔“

”تمہیں سب پتا ہے...... اور مجھے بھی پتا ہے۔ بس ان باتوں کو ڈھکا ہی رہنے دو تو بہتر ہے۔“ ظہیر نے بہت گمبھیر لہجے میں کہا۔ ”میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ بھائی جلال سخت غصے میں ہیں...... اگر غصے میں ان سے کوئی الٹا سیدھا کام ہو گیا تو مزید بدنامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ تمہارے حق میں اور شاید ہمارے حق میں بھی بہتر یہی ہے کہ تم فوراً روم سے چلے جاؤ۔ میں...... تمہیں کوئی دھمکی نہیں دے رہا۔ سمجھو، تمہارے خیر خواہ کی حیثیت سے تمہاری منت کر رہا ہوں...... اگر کہتے ہو تو...... تمہارے سامنے ہاتھ جوڑ دیتا ہوں...... یہ دیکھو۔“

آخر میں ظہیر کا لہجہ قدرے نرم ہو گیا اور اس میں گزارش کی جھلک آ گئی۔

ہادی کے اندر بھی ابال آتے آتے رہ گیا۔ وہ بھی ذرا سنبھلے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”ظہیر بھائی! آپ پریشان نہ ہوں۔ آپ جو کہتے ہیں ویسا ہی ہوگا۔ آپ اس طرح مجھے شرمندہ نہ کریں۔ آپ مجھے صفائی کا موقع نہیں دینا چاہتے نہ دیں، مگر میں اتنا ضرور کہوں گا۔“

”تم جو کہنا چاہتے ہو ہادی! میں سب سمجھ رہا ہوں۔ بس حالات اس وقت اتنے بگڑے ہوئے ہیں کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ غلطی چھوٹی ہے یا بڑی، میں نہیں کہہ سکتا مگر اس کا جو نتیجہ نکلا ہے وہ بہت بڑا ہے۔ میری ”ریکوئسٹ“ ہے تم سے کہ تم چلے جاؤ۔“

ہادی نے ایک بار پھر طویل سانس لی اور بولا۔ ”میں تو پہلے ہی سامان باندھ کے بیٹھا ہوا ہوں۔ وہ سامنے اٹیچی اور بیگ پڑا ہے۔ کل صبح دس بجے میں نے نکل جانا ہے پیسا کے لیے۔“

ظہیر نے ایک بار پھر سفید رومال سے اپنے چہرے کا پسینا پونچھا۔ ہادی کے پیک سامان کی طرف دیکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ”ٹھیک ہے ہادی! میں چلتا ہوں، امید ہے کہ تم اپنے وعدے کا پاس کرو گے۔“

”آپ بے فکر رہو۔“

ظہیر خدا حافظ کہتا ہوا تیزی سے باہر نکل گیا۔ جیسے ایک بگولا آئے اور چلا جائے۔

ہادی اپنی جگہ ساکت و جامد کھڑا تھا۔ اسے اپنی پیشانی پر پسینے کی نمی محسوس ہو رہی تھی۔ اسی دوران میں سیل فون کا میوزک بج اٹھا۔ ہادی نے فون اٹھایا، یہ شریفاں کا نمبر تھا۔ ”ہیلو۔“ شریفاں کی دبی دبی آواز سنائی دی۔

”ہیلو، شریفاں! کیا بات ہے؟“

شریفاں کچھ دیر خاموش رہی، پھر سرگوشی جیسی گلوگیر آواز میں بولی۔ ”صیب جی! یہ کیا ہو گیا ہے۔ میرا تو دل رو رہا ہے۔ باجی کی حالت میرے توں دیکھی نئیں جاندی۔“

”کیا ہوا ہے اسے؟“

”صیب جی، یہ پچھو کیا نئیں ہوا۔“

”کچھ پتا تو چلے۔“

وہ توقف سے بولی۔ ”وڈے بھائی جان نے باجی سے بہت زیادہ جھگڑا کیا ہے مارا ہے ان کو۔ وہ کل سے بھوکی پیاسی بس روندی جا رہی ہیں۔ یہ سب کیوں ہوا صیب جی؟ ایسا نئیں ہونا چاہی دا سی۔ چھوٹے منہ سے وڈی گل نئیں کرنی چاہندی۔ پر آپ کو کچھ سوچ لینا چاہی دا سی۔“

”شریفاں! مجھے لگتا ہے کہ بات کا بتنگڑ بنایا جا رہا ہے۔“

”بات ہے تو بتنگڑ بنا ہے ناجی۔ پوری برادری وچ باتیں ہو رہی ہیں۔ باجی کسی کو منہ دکھانے کے قابل نئیں رہیں۔ آپ پڑھے لکھے ہیں۔ جانتے ہی ہوں گے، عورت وچاری کی عزت شیشے سے زیادہ کچی ہوتی ہے اور یہ شیشہ ٹٹ گیا ہے باجی جی کے لیے۔“

ہادی نے کہا۔ ”شریفاں! مجھے نہیں پتا کہ تم لوگ کیا سوچ رہے ہو۔ سچ صرف اتنا ہے کہ حجاب میرے ساتھ تین چار دفعہ گھومنے کے لیے نکلی ہے۔ میں شہر دیکھنا چاہتا تھا اور وہ شہر کے بارے میں اچھی طرح جانتی ہے اور اس کے بارے میں کچھ لکھ بھی رہی تھی، اس کے علاوہ ہمارے درمیان کوئی تعلق واسطہ نہیں ہے۔ میں حجاب کے گھر والوں کے سامنے بڑی سے بڑی قسم کھا سکتا ہوں۔“

”آپ کے کہنے سے کچھ نئیں ہوگا صیب جی! گل بہت آگے نکل گئی ہے۔ یہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ آپ دونوں میں بہت پہلے سے جان پہچان ہے۔ آپ کمپیوٹر پر گل بات کرتے رہے ہیں اور آپ صرف باجی حجاب سے ملنے کے لیے ہی پاکستان سے ایتھے آئے ہیں۔ باجی شادی کے

بہانے دو بجے شہر گئی تھی تو آپ سے ملنے گئی تھی۔ انہوں نے کہیں سے باجی کی ایک فوٹو بھی ڈھونڈ لی ہے۔ یہ فوٹو آپ نے ہی اتاری ہوئی ہے۔“

”میں نے اتاری ہوئی ہے؟“

”ہاں جی، آپ کے کیمرے سے نکلی ہے وہ فوٹو۔ اس میں باجی کے سر پر چادر ہے نہ دوپٹا۔ انہوں نے پتلون پہنی ہوئی ہے۔ یہ سب بہت بھیڑا ہوا ہے صیب جی! پتا نئیں اب کیا بنے گا۔“

ہادی کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ حجاب کی ایک تصویر تو اس کے کیمرے میں موجود تھی۔ سیکڑوں دوسری تصویروں کے درمیان کہیں پڑی تھی۔ یہ تصویر حجاب کے گھر والوں تک کیسے پہنچی؟ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا...... پھر اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ اس کے ساتھ ہی پورے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی۔ تین چار دن پہلے ارم اور اس کی ساتھی لڑکیاں اس سے ملنے یہاں کمرے میں آئی تھیں۔ کہیں انہوں نے تو کیمرے سے چھیڑ چھاڑ نہیں کی تھی؟ اس نے تھوڑا سا سوچا اور اسے یقین ہونے لگا کہ ایسا ہی ہوا ہوگا۔ اس دن لاہور سے والدہ کی کال آ گئی تھی۔ وہ کال سنتا ہوا باہر بالکونی میں چلا گیا تھا۔ شاید آٹھ دس منٹ لگ گئے تھے۔ اس دوران میں ارم نے یا اس کی کسی ساتھی نے کام دکھایا تھا۔ کیمرے میں اس تصویر کو دیکھ کر کسی سیل فون وغیرہ میں محفوظ کر لیا گیا تھا۔ یہ سارے خیالات بس دو چار سیکنڈ میں اس کے ذہن سے گزر گئے۔ شریفاں ناراض لہجے میں کہہ رہی تھی۔ ”صیب جی...... وڈے بھائی جان غصے کے بڑے تیز ہیں۔ آپ کے ساتھ بھی کوئی مسئلہ ہو سکتا ہے۔ آپ کے لیے چنگا یہی ہے کہ اب یہاں سے چلے جائیں۔“

ہادی نے کہا۔ ”شریفاں! تم اس وقت درس والے گھر میں ہو؟“

”ہاں جی ادھر ہی ہوں۔“

”کیا تم ایک دفعہ...... صرف ایک دفعہ میری بات اپنی باجی سے کرا سکتی ہو؟“

”توبہ کریں جی! کیسی گل کر رہے ہیں آپ؟ میری چمڑی ادھڑ جائے گی۔ ویسے بھی میں آپ کو بتا دوں۔ باجی سے گل نہ کر کے آپ فائدے میں رہیں گے۔ وہ بھی بہت غصے میں ہیں۔ آپ سے بڑی سخت گل کریں گی۔“

”چلو سخت ہی کرے لیکن......“

”نئیں صیب جی۔“ اس نے تیزی سے بات کاٹی۔

''یہ اب نہیں ہوسکتا۔ میں تو بس اتنا کہنا چاہندی ہوں۔ آپ ساڈے علاقے کے ہیں۔ آپ کو دیکھ کر اپنا پنڈ اپنے لوک یاد آتے تھے۔ پر جو ہوا بہت برا ہوا۔ اب بہتر یہی ہے کہ آپ چلے جائیں یہاں سے۔''

اس سے پہلے کہ ہادی مزید کچھ کہتا، شریفاں تیزی سے بولی۔ ''اچھا کوئی اس پاسے آرہا ہے۔ میں بند کرتی ہوں۔ رب راکھا۔''

فون بند ہوگیا۔ ہادی سکتہ زدہ سا بیٹھا رہا۔ حالات اس کی توقع سے کہیں زیادہ خراب تھے اور یقیناً اس خرابی میں اس کا اپنا کردار بہت زیادہ تھا۔ حجاب کے بار بار کے انکار کے باوجود وہ اس سے ملنے پر اصرار کرتا رہا اور ایک طرح سے اس کو جذباتی داخلاقی دباؤ کا شکار کیا۔ تصویر والی غلطی بھی سراسر اس کی اپنی ہی تھی۔ اس نے چوری چھپے تصویر اتاری اور مزید غلطی یہ کی کہ...... کئی ہفتے گزرنے کے باوجود اسے کیمرے میں ہی رہنے دیا۔ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ کوئی اس طرح تصویر تک پہنچے گا۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

اسے اب جانے کا...... بھاگنے کا مشورہ دیا جارہا تھا۔ مگر وہ کیسے بھاگ سکتا تھا۔ وہ تو زنجیروں میں جکڑا گیا تھا۔ یہ زنجیریں عشق صادق کی ایسی دھات سے بنی تھیں جنہیں بھی کوئی پگھلا سکا ہے نہ توڑ سکا ہے۔ یہ دکھائی نہ دینے والی زنجیریں بہ ظاہر دھاگے سے کمزور ہوتی ہیں مگر اتنی مضبوط ہوتی ہیں کہ اپنے قیدی کو کھینچ کر موت کے منہ میں بھی لے جائیں تو وہ کسمسا نہیں سکتا۔ ہادی بھی یہاں سے جانے کا نہیں سوچ رہا تھا۔ وہ صرف اور صرف حجاب کی مصیبت کے بارے میں سوچ رہا تھا اور یہ سوچ رہا تھا کہ اس مصیبت کو کیسے کم کیا جاسکتا ہے۔ وہ کئی گھنٹے تک شدید قسم کی کشمکش میں مبتلا رہا۔ ذہن پر بھاری بوجھ تھا جو بڑھتا جارہا تھا۔ شام ہوئی اور پھر رات ہوگئی۔ کمرے میں بیٹھے بیٹھے دل گھبرانے لگا۔ اس کے سگریٹس بھی ختم تھے، وہ ہوٹل سے باہر نکل آیا۔ ابھی زیادہ وقت نہیں ہوا تھا۔ یہی ساڑھے دس گیارہ کا وقت ہوگا۔ اس نے سگریٹس لیے اور چہل قدمی کرتا ہوا آگے تک نکل گیا۔ ہوٹل کا عقبی علاقہ قدرے گنجان تھا۔ تنگ سڑکیں تھیں، چھوٹے چھوٹے ریستوران اور مساج گھر تھے۔ جہاں سیاحوں کی مٹھی چاپی کرکے انہیں ہلکا پھلکا کیا جاتا تھا اور ان کی جیب کو بھی۔ نوجوان اور کم سن اطالوی لڑکیاں اس کام میں ماہر تھیں۔

واپسی پر ہادی ذرا رستہ بھول گیا۔ وہ ایک تنگ نیم تاریک سڑک سے گزر کر ایک جانی پہچانی بلڈنگ کی طرف جارہا تھا۔ جب ایک ایجنٹ نما شخص نے اس کے قریب آکر پوچھا۔ ''رات گزارنے کے لیے کوئی ساتھی درکار ہے۔ بالکل جوان، حسین؟'' ہادی نے نفی میں سر ہلایا۔

اسی دوران میں عقب سے کسی جان دار شخص نے ہادی کی گردن کو اپنے بازو میں دبوچا اور گھما کر ایک دیوار پر دے مارا۔ وہ الٹ کر پتھروں کی سڑک پر گرا۔ دو تین اس پر جھپٹے۔ ہادی نے ٹانگ چلا کر ایک تو دور پھینک دیا۔ دوسرے نے اسے چھاپ لیا، پھر دو اور افراد اس کے ساتھ شامل ہوگئے۔ انہوں نے ہادی کو زوردار مکے اور ٹھوکریں رسید کیں۔ اس کی گھڑی کھینچ لی۔ جیب سے نقدی اور ٹریول چیک نکال لیے موبائل اندرونی جیب میں ہونے کی وجہ سے بچ گیا۔ ان میں سے ایک انڈین یا پاکستانی لگ رہا تھا۔ ایک ہٹے کٹے اطالوی نے لمبا چاقو نکالا اور ہادی کی گردن پر رکھتے ہوئے خوفناک لہجے میں کچھ کہا۔ پھر یکایک انہوں نے ہادی کو چھوڑا اور قریبی گلیوں میں گم ہوگئے۔ سارا واقعہ بہ مشکل بیس پچیس سیکنڈ کے اندر ہوگیا۔ خالی گلی میں بس دو تین افراد نے دور ہی سے یہ منظر دیکھا۔ ہادی خود ہی اٹھا۔ خود ہی کپڑے جھاڑے اور رومال سے اپنے ہونٹوں کا خون پونچھتے ہوئے چل دیا۔ ہوٹل زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ سیدھا ہوٹل پہنچا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ فرسٹ ایڈ کا کچھ سامان اس کے بیگ میں موجود تھا۔ اس نے خود چہرے کی چوٹوں کو ٹریٹ کیا اور کپڑے بدلے۔ بہ ظاہر روم کے کوچوں میں ہونے والی راہزنی کی ایک واردات لگ رہی تھی مگر...... یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ اس کے پیچھے کسی کا ہاتھ بھی ہوسکتا تھا۔ غنڈوں میں موجود ایشیائی باشندے کا چہرہ ہادی کی نگاہوں میں گھومنے لگا۔ پہلے اس نے ڈپٹی ہاشم کو فون کرنے کا سوچا لیکن پھر ارادہ ترک کردیا۔ بہرحال اگر اسے ڈرانے کی کوشش کی گئی تھی تو یہ پوری طرح ناکام ہوئی تھی۔ جہاں تک اس کے یہاں سے جانے کا تعلق تھا وہ یہ فیصلہ پہلے ہی کرچکا تھا۔

بہرحال وہ رات اس نے جیسے زہریلے کانٹوں پر لوٹتے ہوئے گزاری۔ اگلے روز صبح پانچ بجے وہ اپنے دوست احباب کو آگاہ کیے بغیر ہوٹل سے چیک آؤٹ کرگیا۔ اس نے اپنا سیل فون بھی آف کردیا تھا۔ بہ ظاہر وہ اس شہر کو چھوڑ رہا تھا لیکن اصل میں صرف علاقہ بدل رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے مسلسل رسنے والا خون اب بند ہوگیا تھا۔ دن نو بجے تک وہ روم سینٹرم کے گنجان علاقے میں ایک

غرابے نامی ہوٹل میں منتقل ہوچکا تھا۔ یہ درمیانے درجے کا ہوٹل صاف ستھرا تھا۔ کسی اسپینی باشندے کا تھا۔ عملہ بھی زیادہ تر اسپینش ہی تھا۔ ہادی کے دل و دماغ میں آگ سی بھڑکی ہوئی تھی۔ ارم کا چہرہ بار بار اس کے تصور میں آتا تھا اور نفرت کی ایک بلند لہر اٹھتی تھی۔ یہ عورت حجاب کی دشمنی میں بہت آگے نکل گئی تھی۔

دفعتاً گلزاری کا خیال ہادی کے ذہن میں آیا۔ اس نے سیل فون آن کیا۔ اس پر پہلے ہی گلزاری کا میسج آیا ہوا تھا۔ ''کال می۔''

ہادی نے اس کا نمبر ملایا۔ فوراً ہی گلزاری کی باریک آواز سنائی دی۔ ''ہیلو ہادی صاحب! آپ کہاں تھے۔ میں نے کافی فون کیے۔ آپ کے ہوٹل کے نمبر پر بھی کال کی۔ پتا چلا کہ آپ صبح سویرے نکل گئے ہیں۔ آپ کو تو دس گیارہ بجے جانا تھا شاید۔''

''ہاں، پروگرام تبدیل ہوا ہے۔''

''اب کہاں ہیں آپ؟''

''سمجھو روم کے آس پاس ہی ہوں۔ بعد میں بتاؤں گا۔ فی الحال تم بتاؤ۔ کیوں کال کررہے تھے؟''

''تگڑی نیوز ہے جی، ارم کے بارے میں۔ پچھلے سال ارم سے میری بہت کم ملاقات ہوئی ہے۔ اس دوران میں وہ کیا کرتی رہی ہے، اس کا کچھ کچھ کھوج اب مل رہا ہے۔ پچھلے سال وہ ایک آئرش یونیورسٹی سے ایف آئی اے کررہی تھی۔ لیکن پتا چلا ہے کہ اس نے اپنا آخری سمسٹر فریز کرادیا تھا۔ اس کی وجہ اس کی بیماری تھی، کم از کم یونیورسٹی کے ریکارڈ میں تو یہی بات بتائی گئی ہے۔ لگتا ہے کہ بیماری والی بات ٹھیک ہی ہے۔ کیونکہ ارم کی ایک دوست سے بھی اس کی تصدیق ہوئی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ چار پانچ ماہ یونیورسٹی سے غیر حاضر رہی۔ اس دوران میں ایک دو بار فون پر اس سے بات ہوئی تو وہ کافی کمزور محسوس ہورہی تھی۔ اسے سینے یا گلے کا کوئی انفیکشن تھا جس کے بارے میں اس نے کھل کر کچھ نہیں بتایا۔''

''تم سے بھی اس بارے میں کبھی کوئی بات نہیں ہوئی؟'' ہادی نے گلزاری سے پوچھا۔

''نہیں جی اور اسی سے مجھے شک پڑتا ہے کہ یہ کوئی گڑبڑ معاملہ تھا۔ میں اس کی پوری ٹوہ لگا رہا ہوں جی۔ بس ایک دو دن میں، میں کسی نتیجے پر پہنچ جاؤں گا۔''

''ایک دو دن کا مطلب ایک دو دن ہی ہو تو اچھا ہے...... سمجھو کہ ارجنٹ فیس کا کام ہے۔''

''آپ محبت سے بول لیتے ہیں بس یہ فیس ہی فیس ہے جی۔ یقین کریں آج کل مجھے کھانا پینا بھولا ہوا ہے۔ اب بھی آپ ہی کے کام پر نکلا ہوا ہوں۔ ایک کافی مہنگا کلب ہے۔ وہاں گھسنا پڑا ہے۔ وہ اطالوی لڑکا اسٹیل آیا ہوا ہے یہاں، جو یونیورسٹی میں ارم کے ساتھ دیکھا جاتا تھا۔ اس کا پورا نام اسٹیل نگی دوڈ ہے۔''

''خرچے وغیرہ کی فکر نہ کرو گلزاری، بس رزلٹ اچھا نکلنا چاہیے اور جلدی۔''

''آپ فکر ہی نہ کریں جناب عالی۔'' گلزاری نے سراپا عجز وانکسار بن کر کہا۔ وہ صحیح معنوں میں کرایے کا ٹٹو تھا۔ جتنا زیادہ بھاڑا، اتنی زیادہ وفاداری اور محنت۔

ہادی نے فون بند کردیا اور صوفے پر نیم جان سا ہوکر دراز ہوگیا۔ ارم کے بارے میں کئی سوال ذہن میں ابھر رہے تھے، لیکن یہ سارے سوال ایک گمبھیر پریشانی کے نیچے دب گئے۔ یہ حجاب کی پریشانی تھی، وہ سوچ رہا تھا۔ حجاب کہاں ہوگی، کس حال میں ہوگی۔ کیا گزر رہی ہوگی اس پر؟

☆☆☆

حجاب دو تین دن سے درس والے گھر میں خاموش پڑی ہوئی تھی۔ شریفاں بہت اصرار کرکے اسے ایک دو لقمے کھلا دیتی تھی۔ دوبارہ جلال کی شکل نظر نہیں آئی تھی۔ بس اس نے اتنا کیا تھا کہ مار پیٹ کے اگلے روز شریفاں کو فون کیا تھا اور اسے بتایا تھا کہ فلاں الماری میں فرسٹ ایڈ کی چیزیں پڑی ہیں، اگر حجاب کو کہیں مرہم پٹی کی ضرورت ہے تو کردے۔

حجاب کو ہرگز خواہش نہیں تھی کہ جلال خود یہاں آئے۔ بلکہ وہ تو گیٹ کے قریب کسی گاڑی کا ہارن سن کر بھی ڈر جاتی تھی کہ کہیں یہ جلال کی گاڑی نہ ہو۔ یہ کیسی ستم ظریفی تھی۔ ایک بیوی جس کو اپنے شوہر کے قدموں کی آہٹ کا انتظار ہونا چاہیے، اس آہٹ سے دہشت زدہ تھی۔ یہ بات اب اچھی طرح حجاب کی سمجھ میں آرہی تھی کہ اس گھر میں اس کی زندگی بدتر بلکہ بدترین ہوجائے گی۔ اگر وہ یہاں رہے گی تو بے حد حقیر صورت میں۔ تو پھر وہ کیا کرے؟ کس طرف جائے؟ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ ناقابل برداشت حبس بڑھتا جارہا تھا، اور تازہ ہوا کے لیے کوئی راستہ نہیں تھا۔ اگر اپنی جان لینا حرام نہ ہوتا تو شاید وہ اس بارے میں بھی سوچنا شروع کردیتی۔ ان تین دنوں میں اس کے ابو امی کی طرف سے بھی کوئی خبر نہیں تھی، کوئی رابطہ نہیں

ہوا تھا۔ پتا نہیں ان پر کیا گزر رہی تھی۔ کہتے ہیں کہ ٹوٹی ہوئی بانہیں گردن کی طرف ہی آتی ہیں۔ حجاب بھی غم کی انتہا کو چھو رہی تھی۔ اسے اپنوں کی ضرورت تھی۔ وہ انہیں اپنے دل کا حال بتانا چاہتی تھی۔ اسے پتا تھا کہ اب چھپانے کا مرحلہ گزر چکا ہے۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ ان کے سامنے اپنے سارے زخموں سے پردہ اٹھا دے اور پھر ان کے کندھوں پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

پہلے اس نے فون کرنا چاہا لیکن پھر ارادہ بدل دیا۔ صورت حال اتنی بگڑی ہوئی تھی کہ فون کرنا بے معنی سا محسوس ہوا۔ اس نے شریفاں کو بتایا کہ وہ امی کے گھر جا رہی ہے۔ ان کی طبیعت خراب ہے۔"

"کب تک آجائیں گی باجی؟"

"ابھی کچھ پتا نہیں۔"

ملازم ٹیکسی لے کر آیا۔ حجاب اس گھر کی طرف روانہ ہوگئی جو مصیبتوں سے بھری اس دنیا میں اس کا آخری سہارا تھا۔ اس کا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ کچھ خبر نہیں تھی کہ امی، ابو اور بھائی تک کیا باتیں پہنچی ہیں اور ان کے احساسات وخیالات کیا ہیں۔ وہ بس یہی دعا کر رہی تھی کہ امی ان سارے حالات سے بے خبر ہوں۔ ان کی طبیعت پہلے ہی بگڑی ہوئی تھی۔

دن کے گیارہ بجے تھے جب وہ گھر میں داخل ہوئی۔ ملازم نے سلام کیا اور خاموش کھڑا ہوگیا۔ "سب خیریت تو ہے نا؟" حجاب نے سہم کر پوچھا۔

"جی ہاں۔" اس نے مختصراً جواب دیا۔

"امی کہاں ہیں؟"

"اپنے کمرے میں ہیں جی۔ شاید سو رہی ہیں۔"

حجاب اندرونی حصے میں داخل ہوئی۔ کوئی دکھائی نہیں دیا۔ تپائی پر ایک شولڈر بیگ پڑا ہوا تھا، جس سے حجاب کو اندازہ ہوا کہ اس کی پھوپو بھی آئی ہوئی ہیں۔ ان کا نام زاہدہ تھا۔ حجاب دھڑکتے دل سے امی والے کمرے کی طرف گئی۔ دروازہ بند تھا۔ اس نے دروازہ کھولنا مناسب نہیں سمجھا۔ یقیناً پھوپو بھی اندر ہی موجود تھیں۔ وہ گھر کے ڈرائنگ روم میں سے گزر کر اسٹڈی والے کمرے کی طرف آگئی۔ "فیصل ...... فیصل کہاں ہو بھئی؟" اس نے چھوٹے بھائی کو پکارا۔

وہ تو نہیں آیا لیکن واش روم کی طرف سے ابو نمودار ہوگئے۔ حجاب نے ان کا چہرہ دیکھا اور دہل گئی۔ وہاں دنیا بھر کی سنجیدگی سمٹ آئی تھی۔ آنکھوں میں ایک ایسی بیگانگی تھی جس کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ وہ ٹھٹکتے ہوئے انداز میں ان کی جانب دیکھ رہی تھی جب وہ اچانک مڑے اور تیز قدموں سے اسٹڈی روم میں داخل ہوگئے۔ اپنے پیچھے انہوں نے دروازہ اتنی زور سے بند کیا کہ لگا، اس کے بالائی حصے کا شیشہ ٹوٹ جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اندر سے کنڈی چڑھا دی۔ جس طرح لوہا مقناطیس کی طرف کھنچتا ہے وہ اپنے ابو کی طرف لپکی۔ "ابو جی...... ابو جی!" اس نے کرب میں ڈوب کر کہا اور دروازے پر دباؤ ڈالا۔ وہ اندر سے بولٹ تھا۔ وہ رو دی۔ کسی ایسی بچی کی طرح جو چوٹ کھا کر آئی ہو اور اپنے باپ سے اپنا درد بیان کرنا چاہتی ہو۔ "ابو جان دروازہ کھولیں۔ پلیز ابو جان۔" اس نے کہا اور دستک دینے لگی۔

اندر یکسر خاموشی تھی۔ وہ ہولے ہولے دستک دیتی رہی اور پکارتی رہی۔ "ابو جی! دروازہ کھولیں۔ میری بات سنیں۔ ایک بار میری بات سن لیں۔" کوئی جواب نہیں آیا۔ آہ، ایسا تو کبھی نہیں ہوا تھا، جب جب اسے چوٹ لگی تھی، جب جب کوئی کھلونا ٹوٹا تھا، جب جب اسے کسی دکھ نے گھیرا تھا، اس نے اپنے ابو کو پکارا تھا۔ وہ تڑپ کر اس کی طرف آئے تھے، کبھی گود میں اٹھایا، کبھی سینے سے لگایا اور کبھی ماتھا چوما تھا۔ آج وہ ابو دروازہ کیوں نہیں کھول رہے تھے۔ اس کا جی چاہا کہ وہ ایک چھوٹی سی بچی بن جائے۔ ایسی معصوم زبان میں پکارے کہ اس کے ابو دروازہ کھول دیں۔

وہ ان کی ٹانگوں سے چمٹ جائے۔ ان سے کہے...... "ابو میرا کوئی قصور نہیں۔ پھر بھی مجھے مارا گیا ہے۔ ابو مجھے چوٹ لگی ہے...... مجھے درد ہو رہا ہے۔"

وہ اسے گود میں اٹھالیں، اسے پچکاریں۔ ان کے سینے سے لگ کر وہ سب کچھ بھول جائے۔ یکایک اسے اپنے عقب میں قدموں کی آہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ سامنے فیصل کھڑا تھا۔ وہ تیز سرگوشی میں بولا۔ "یہ کیا کر رہی ہیں باجی! ادھر امی کے کمرے تک آوازیں جا رہی ہیں، وہ ابھی ابھی سوئی ہیں۔"

حجاب دروازے کے سامنے سے اٹھی اور سسکتی ہوئی اپنے چھوٹے بھائی کے گلے لگ گئی۔ فیصل کے انداز میں گرمجوشی نہیں تھی۔ اس کے بازو بے جان سے رہے۔ وہ کراہی۔ "فیصل! میں بے قصور ہوں۔ مجھ پر الزام لگائے جا رہے ہیں۔ تم تو جانتے ہو تمہاری بہن کیسی ہے۔ کیا وہ ایسا کر سکتی ہے؟ بتاؤ کیا وہ کر سکتی ہے؟"

فیصل خاموش کھڑا رہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ اس نے بہ مشکل اتنا ہی کہا۔ "آپ کو ابھی یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ آپ کو پتا ہی ہے امی کی طبیعت کتنی خراب ہے۔"

"تو میں کہاں جاؤں فیصل! تم ہی بتاؤ کہاں جاؤں۔"

"میں آپ کو کیا بتاؤں، لیکن اگر امی کو ان حالات کی بھنک بھی پڑ گئی تو وہ زندہ نہیں رہ سکیں گی۔"

"اچھا، مجھے بتاؤ فیصل! کیا تم بھی ان باتوں پر یقین کرتے ہو جو میرے بارے میں کہی جا رہی ہیں......؟"

اس سے پہلے کہ فیصل جواب میں کچھ کہتا۔ سامنے دروازے میں پھوپو زاہدہ کی صورت نظر آئی۔ حجاب کو دیکھ کر ان کے چہرے پر لکیروں کا جال سا پھیل گیا۔ بچپن میں جب وہ اپنی بڑی بڑی سفید آنکھوں سے حجاب اور فیصل وغیرہ کو گھورتی تھیں اور کسی بات پر جھڑکتی تھیں تو وہ بالکل سہم جایا کرتے تھے، آج بھی حجاب کی کچھ یہی کیفیت ہوئی۔ انہوں نے سرسراتی آواز میں کہا۔ "کب آئی ہو تم؟"

فیصل نے کہا۔ "ابھی پانچ دس منٹ پہلے۔"

انہوں نے عینک کے پیچھے سے ایک تیز نگاہ حجاب پر ڈالی اور تحکم سے بولیں۔ "ادھر آؤ میرے ساتھ۔" اس کے بعد وہ فیصل سے مخاطب ہوئیں۔ "تم امی کے پاس جاؤ۔"

حجاب نے ایک نظر اسٹڈی کے بند دروازے کی طرف دیکھا اور پھر کسی معمول کی طرح پھپھو کے پیچھے چل دی۔ وہ اسے لے کر چھوٹی سیڑھیوں کی طرف آگئیں۔ سیڑھیوں کا دروازہ لاک تھا وہ اسے کھولنے لگیں۔ اسی دوران میں حجاب کی نگاہ سامنے کمرے میں گئی۔ یہ وہی، بینش کی دیوار گیر تصویر والا کمرا تھا۔ حجاب کی نگاہ تصویر پر پڑی۔ بینش جیسے اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ آج اس کی آنکھوں میں حجاب کو دکھ کی پرچھائیاں نظر آئیں۔ اس نے جیسے خاموشی کی زبان میں حجاب سے کہا۔ "تم نے اب سب کچھ دیکھ لیا نا حجب! یہاں چھوٹی سی جسارت کو بھی بغاوت کا نام دیا جاتا ہے۔ تم سے بھی شاید وہی غلطی ہوئی جو مجھ سے ہوئی تھی۔ تم نے بھی مار کھا کر پیچھے ہٹتے ہٹتے کہیں ذرا سے قدم جمانے چاہے اور یہی تمہارا ناقابل معافی گناہ بن گیا۔"

پھوپو اسے لے کر بالائی منزل کے ایک کمرے میں آگئیں اور دروازہ اندر سے بند کرلیا۔ وہ گرجیں۔ "اب کیا کرنے آئی ہو یہاں؟ ماں کی جان لینے آئی ہو؟ کوئی کسر رہ گئی تھی جو اب پوری کرنی ہے؟"

وہ بلک پڑی۔ "پھوپو! میں بے قصور ہوں۔ مجھ پر الزام لگائے جا رہے ہیں۔ آپ جانتی ہیں میں کیسی ہوں۔"

"ہم بھی یہی سمجھتے تھے کہ تمہیں جانتے ہیں۔ لیکن جو کچھ سامنے آرہا ہے اسے کیسے جھٹلائیں، کس منہ سے انکار کریں۔ تو نے کالک ملی ہے ہم سب کے منہ پر۔ تیرا باپ مسلسل رو رہا ہے تین دن سے۔ تیری ماں تیرے دکھ میں پہلے ہی پڑی ہوئی ہے بستر پر۔ اب اور کیا چاہتی ہے تو...... اور کیا چاہتی ہے؟" انہوں نے آخری الفاظ اتنے زور سے کہے کہ پورے کمرے میں گونج سنائی دی۔

وہ روتے ہوئے بولی۔ "پھوپو! اگر آپ بھی مجھے گناہ گار سمجھتی ہیں تو پھر اپنے ہاتھوں سے مجھے ختم کردیں۔ میری جان لے لیں۔ میں آپ سب کو اپنا خون معاف کرتی ہوں، پلیز پھوپو مار دیں مجھے۔"

"رونے چلانے سے جھوٹ سچ نہیں بن جائے گا۔ مجھے بتاؤ تم، کیا تم وینس میں اس لڑکے سے ملتی نہیں رہی ہو۔ کیا تم چوری چھپے یہاں ہوٹل میں اس کے پاس نہیں جاتی رہی ہو؟ تم نے نئی چادر خریدی، نئے جوتے اور بیگ لیا تاکہ کوئی تمہیں اس کے ساتھ دیکھ کر پہچان نہ سکے۔ تم نے اپنے شوہر کو دھوکا دیا، ہم سب کو دھوکا دیا۔ یہاں ماں سے کہہ کر جاتی تھیں کہ شاپنگ کے لیے جا رہی ہوں اور وہاں اس کے ساتھ ہوٹلوں میں کھانے کھاتی تھیں۔ کیا تم نے وینس میں ساری شرم حیا اتار کر پتلون اور شرٹ میں تصویریں نہیں بنوائی ہیں؟ کس کس بات کو جھٹلاؤ گی تم...... تمہاری کس کس بات پر پردہ ڈالیں گے ہم۔ تم نے ہمیں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔"

وہ صوفے سے اٹھ کر قالین پر بیٹھ گئی۔ اس نے پھوپو کے گھٹنوں پر سر رکھ دیا۔ ہچکیاں لیتے ہوئے بولی۔ "پھوپو، مجھ سے غلطیاں ہوئی ہیں۔ لیکن اتنی بڑی نہیں جتنی مجھے سزا دی جا رہی ہے۔ کسی نے میری بات سنی ہی نہیں۔ کسی نے مجھے صفائی کا موقع ہی نہیں دیا۔"

"کیا صفائی پیش کرے گی تو۔ کیا رہ گیا ہے تیرے پاس کہنے کو۔" پھوپو نے اپنے گھٹنے جھٹک کر اسے دور ہٹانے کی کوشش کی۔

وہ ان کے گھٹنوں سے چمٹے چمٹے بولی۔ "پھوپو! میں نے اس گھر میں بہت کچھ سہا ہے، جتنا آپ لوگوں کو پتا ہے اس سے دس گناہ زیادہ جھیلا ہے۔ کبھی اُف نہیں کی۔ لیکن پھوپو! میں کیا کروں۔ جو آخری ظلم مجھ پر ڈھایا جا رہا تھا وہ مجھ سے نہیں جھیلا گیا۔ مجھے خود اپنی ہی سمجھ نہیں آتی تھی کہ

مجھے کیا ہو رہا ہے۔ شاید مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن یہ مجھ سے ہوا ہے پھوپو، میں اپنی غلطی مانتی ہوں۔ لیکن مجھے اس غلطی پر مجبور کر دیا گیا۔ اس بندے نے مجھے دھکیل دھکیل کر دیوار کے بالکل ساتھ لگا دیا۔ اپنی سوچوں پر میرا اختیار ہی نہ رہا۔ آپ اسے جرأت کہہ لیں، مزاحمت کہہ لیں یا بغاوت...... مگر یہ ہوا مجھ سے۔ لیکن میں بڑی سے بڑی قسم کھا سکتی ہوں، میں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا جس کے لیے مجھے کسی کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔ میں ہادی صاحب کے ساتھ گھومی پھری ضرور ہوں لیکن یہ ایسا ہی ہے جیسے میں فیصل کے ساتھ گھوموں یا آپ کے ساتھ گھوموں۔ مرد تو سب کچھ کرنے کے لیے آزاد ہوتا ہے کیا عورت کے لیے اتنی سی رعایت بھی نہیں۔"

"لیکن تو کیوں گھومی پھری۔ کیا بن گئی تھی تیری جان پر؟ کیا ہمارے خاندان میں پہلے کبھی ایسا ہوا ہے۔ بغیر کسی کی اجازت کے تو ایک غیر مرد کے ساتھ خود کو نقاب میں چھپا کر پارکوں اور ہوٹلوں میں پھرتی رہی، کون قبول کرے گا اسے۔"

"پھوپو! جن دنوں میں وہیں گئی، ان دنوں مجھے پہلی بار پتا چلا تھا کہ جلال اور ارم میں تعلق ہے، مجھے یوں لگا تھا جیسے میرے لیے دنیا میں سب کچھ ختم ہو گیا ہے، اتنی گھٹن تھی پھوپو، اتنی گھٹن تھی کہ کیا بتاؤں۔ مجھے لگتا تھا کہ میری سانس رک گئی ہے اور میں تڑپ رہی ہوں، میرا دل چاہا کہ میں کچھ دنوں کے لیے سب کچھ بھول بھال جاؤں۔ کوئی اور لڑکی بن جاؤں کچھ اور ہو جاؤں۔ کھلی ہوا میں کھل کر سانس لوں۔ شاید بے موت مرنے سے بچ جاؤں۔ وہ جو تصویر آپ نے میری دیکھی ہے ان ہی دو تین دنوں میں اتاری گئی ہے۔ میں مانتی ہوں یہ میری غلطی تھی، میں کیا بتاؤں پھوپو! مجھے جب جب ارم اور جلال کے بارے میں کوئی بات پتا چلتی تھی، مجھے کچھ ہو جاتا تھا۔ میں جلال سے تو کچھ نہیں کہہ پاتی تھی مگر میرے اندر ایک شدید گھٹن پیدا ہو جاتی تھی۔ اس گھٹن سے نکلنے کے لیے میں ہاتھ پاؤں چلاتی تھی۔ وہ جو کہتے ہیں کہ ہر عمل کا ردِعمل ہوتا ہے، شاید یہ بھی ایک ردِعمل ہی تھا کہ میں چند بار ہادی صاحب کے ساتھ گھومنے پھرنے کے لیے نکلی۔ وہ بہت شریف بندے ہیں، میں امی ابو کی قسم کھاتی ہوں پھوپو! میرے اور ان کے درمیان کچھ نہیں ہے۔"

"کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ تمہارے واویلا کرنے سے وہ داغ دھل جائے گا جو تمہارے اور ہم سب کے چہروں پر لگا ہے۔ عورت کی عزت کتنی جلدی برباد ہوتی ہے یہ سب کو پتا ہے اور تمہاری عزت برباد ہو چکی ہے۔"

"کیوں برباد ہو چکی ہے پھوپو۔" وہ بلکی۔ "مجھے اتنی سزا دیں جتنی میں نے غلطی کی ہے۔ میں نے چوری کی ہے تو میرا ہاتھ کاٹ دیں، مجھے پھانسی تو نہ چڑھائیں۔"

"تو نے چوری نہیں کی۔ تو نے ڈاکا ڈالا ہے اور اس ڈاکے میں تجھ سے ہم سب کی عزت کا خون ہوا ہے۔" پھوپو نے بے حد دکھ سے کہا۔ "کیا تو ننھی سی بچی تھی۔ کیا تجھے نہیں پتا تھا کہ یہ مردوں کی دنیا ہے۔ یہاں عورتوں کی غلطیوں معاف کرنے کا رواج نہیں ہے۔ ان کو سزا دینے کے لیے بہانے ڈھونڈے جاتے ہیں اور تو نے تو ایک ایسا بہانہ دیا کہ جس سے کوئی انکار ہی نہیں کر سکتا۔ جب تجھے پتا تھا کہ تو جلال کو اس کے ارادے سے نہیں روک سکتی، پھر اپنے اندر بغاوت کے جراثیم کیوں پیدا ہونے دیے تو نے؟ جب تیرے پر ہی کٹے ہوئے تھے تو پھر کیوں پھڑپھڑائی؟ خود کو لہولہان کیا اور ہم سب کو بھی۔ تجھے پرلے درجے کا بے وقوف اور احمق نہ کہیں تو کیا کہیں ہم۔"

"میں جانتی ہوں، مجھ سے بہت برا ہوا پھوپو، لیکن اب بتائیں میں کیا کروں۔ میں پھر کہتی ہوں، اگر میرے مرنے سے کچھ بہتر ہو سکتا ہے تو میں اسی وقت جان دینے کو تیار ہوں۔"

"جان دینا آسان ہوتا ہے، زندگی جینا مشکل۔ اب یہ زندگی جیسی بھی ہے اس کا سامنا کر۔"

"مجھے راستہ بتائیں پھوپو۔ مجھے کچھ سجھائی نہیں دے رہا۔ اب اس گھر میں میرے لیے تکلیف اور ذلت کے سوا اور کچھ نہیں۔ شاید آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ مجھ سے بڑا بے وقوف کون ہے۔ جلال اب شادی بھی کرے گا اور مجھے جوتے کی نوک پر بھی رکھے گا۔ وہاں میرے ساتھ بہت برا ہونے والا ہے۔ میں ان دیواروں میں گھٹ کر مر جاؤں گی۔"

"اسی لیے تو کہہ رہی ہوں۔ مرنا آسان ہوتا ہے زندہ رہنا مشکل۔"

اسی دوران میں دروازے پر دستک ہوئی۔

"کون؟" پھوپو نے پوچھا۔

"میں ہوں فیصل۔" باہر سے مدھم آواز سنائی دی۔

پھوپو زاہدہ نے دروازہ کھولا۔ فیصل نے دھیمے لہجے میں کچھ کہا۔ پھوپو زاہدہ حجاب سے مخاطب ہو کر بولیں۔

"تیرے ابو بلا رہے ہیں مجھے۔ ابھی آتی ہوں، تو نیچے نہ آ جانا واویلا کرنے کے لیے۔"

دروازہ زور سے بند کر کے وہ نیچے چلی گئیں۔ حجاب کو لگ رہا تھا کہ وہ آسمان اور زمین کے درمیان معلق ہے۔ بالکل بے سہارا...... بے خانماں۔ سینے میں اس کا دل چڑیا کی طرح پھڑک رہا تھا۔ یہ در و دیوار جو بچپن سے اس کے ساتھی تھے ایک دم اجنبی لگنے لگے تھے۔ جیسے وہ بھی اس سے خفا ہو چکے ہوں۔ اس کا جی چاہا کہ نیچے چلی جائے۔ ابو کی ٹانگوں سے لپٹ جائے۔ مگر پھوپو حکم دے گئی تھیں یہیں رہنے کا۔

پھوپو کی واپسی دس پندرہ منٹ بعد ہوئی۔ ان کی سفید آنکھوں میں غم کی پرچھائیاں پہلے سے گہری تھیں اور بردبار چہرے کی لکیروں میں اضافہ ہو چکا تھا۔ انہوں نے دروازہ دوبارہ اندر سے بند کیا۔ ٹھہری آواز میں بولیں۔

"حجاب! کل شام جلال آیا تھا یہاں...... گھنٹا ڈیڑھ گھنٹا تمہارے ابو کے پاس بیٹھا رہا۔ اس نے بہت کچھ کہا جو ہمیں سننا پڑا۔ ہم اس کے سامنے بولنے کے قابل کہاں ہیں۔ قرضے کی وجہ سے پہلے بھی نہیں تھے، اب تو کوئی کسر ہی نہیں رہ گئی۔ تیرے ابو کے دل پر بڑا بوجھ ہے۔ مجھے تو ڈر ہے انہیں کچھ ہو نہ جائے۔"

"میرے ابو جی کو کچھ نہ ہونے دیجیے پھوپو۔ وہ پہلے ہی دکھوں کے مارے ہوئے ہیں۔" وہ ان کے گھٹنے پکڑ کر سسکنے لگی۔

اس نے پھوپو کے چہرے پر پہلی بار قدرے نرمی کے آثار دیکھے۔ ان کی سفید آنکھوں میں نمی سی تیر گئی۔ وہ بولیں۔ "بیٹی! میں تیری منت کرتی ہوں جو کچھ بھی ہے لیکن تو واپس اپنے گھر چلی جا۔ یہی ایک راستہ ہے جس سے ہماری رہی سہی عزت بچ سکتی ہے۔ میں جانتی ہوں تیرے لیے بہت مشکل ہو گا لیکن اگر ہم سب کی بھلائی چاہتی ہے تو یہ کر گزر۔"

"پھوپو لیکن......"

"لیکن سے آگے انکار شروع ہوتا ہے بیٹی! انکار نہ کر۔ یہ دیکھ...... میں تیرے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں، جو کچھ ہو چکا ہے اس کے بعد شوہر بیویوں کے منہ پر فوراً طلاق کے تین طمانچے مار دیتے ہیں۔ لیکن جلال تجھے اب بھی رکھنے کو تیار ہے۔ یہ موقع گنوا دیا تو بہت پچھتانا پڑے گا۔ جا کر اس کے پاؤں کو ہاتھ لگا لے اور اس کی چھت کی پناہ لے لے۔ یہی ہم سب کے حق میں بہتر ہے۔"

حجاب نے سر اٹھا کر پھوپو کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھیں اشکبار تھیں...... وہ دیکھتی رہی۔ پھر اس نے دل فگار لہجے میں کہا۔ "پھوپو، میرے ابو جی کیا کہتے ہیں؟"

"وہ بھی یہی کہتے ہیں بیٹی۔"

آنسو دھاروں کی طرح حجاب کی آنکھوں سے نکلے اور نیل زدہ رخساروں پر پھسلنے لگے۔ کچھ دیر کمرے میں گمبھیر خاموشی طاری رہی۔ پھر حجاب اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ پھوپو نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔ آہستہ آہستہ اس کی پشت پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔ وہ خاموشی سے ان کا کندھا بھگوتی رہی۔ کچھ دیر بعد شکست خوردہ آواز میں بولی۔ "ابو جی سے کہیں، ایک بار مجھ سے مل لیں۔"

"ابھی نہیں حجاب! ابھی وہ بہت پریشان ہیں۔ کچھ دن بعد میں خود ملواؤں گی تمہیں ان سے۔"

وہ ایک آہ بھر کر رہ گئی۔ پھر ہولے سے گویا ہوئی۔ "اچھا، مجھے ایک بار امی کی صورت تو دیکھ لینے دیں۔"

وہ ذرا تذبذب کے بعد بولیں۔ "چل تو ادھر بیٹھ۔ میں نیچے سے ہو کر آتی ہوں، پھر تجھے بتاتی ہوں۔"

وہ نیچے چلی گئیں۔ حجاب اپنے ہی گھر میں غیروں کی طرح سکڑی سمٹی بیٹھی رہی۔ اس کا گھر کون سا تھا؟ یہ والا؟ درس والا؟ یا کوئی بھی نہیں۔ کیا عورت کا اپنا گھر کوئی بھی نہیں ہوتا۔ کیا وہ زندگی کا بیشتر حصہ "اپنے گھر" کے بغیر ہی گزار دیتی ہے۔

چند منٹ بعد پھوپو آئیں اور اسے لے کر نیچے آ گئیں۔ ایک بار پھر کہیں کوئی دکھائی نہیں دیا۔ "وہ دوا کھا کر سوئی ہوئی ہیں۔ بس دروازے سے ہی دیکھ لو۔" پھوپو نے سرگوشی کی۔

کمرے کے دروازے کو نیم وا کر کے اس نے امی کو دیکھا۔ وہ کروٹ لے کر لیٹی تھیں۔ برسوں کی بیمار نظر آتی تھیں۔ گلوکوز کی ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ سائڈ ٹیبل پر دواؤں کی بھرمار تھی۔ اس نے اپنی سسکی بہ مشکل روکی۔ آنکھوں آنکھوں میں ماں کی پیشانی چومی اور پلٹ آئی۔

☆☆☆

درس والا گھر یا پرانا گھر اب ایک زنداں تھا اور وہ اس کی قیدی تھی۔ اس زنداں کا داروغہ کون تھا۔ شاید وہی شخص جو تین برس پہلے اسے بڑی شان سے بیاہ کر لایا تھا۔ زنداں تو بہرحال زنداں ہوتا ہے لیکن جب قیدی فرار ہونے کی کوشش کرتا ہے اور پکڑ کر دوبارہ زنداں میں ڈالا جاتا ہے تو اس کی سزائیں مزید کڑی ہو جاتی ہیں۔ حجاب سے

بھی تو یہی قصور ہوا تھا۔

حجاب نے خود کو درس والے گھر کی دیواروں تک محدود کرلیا۔ اس نے سیل فون مستقل طور پر بند کردیا تھا، لینڈ لائن فون کو ہاتھ نہ لگانے کی قسم کھالی تھی۔ سات آٹھ روز تک اسے کچھ خبر نہیں ہوئی کہ باہر کیا ہورہا ہے۔ جلال کے قدم بھی گھر میں نہیں پڑے تھے۔ نویں روز جلال گھر میں آیا۔ اس کے پاس کچھ کاغذات تھے۔ سپاٹ لہجے میں اس نے کچھ رسمی کلمات ادا کیے اور پھر کاغذات حجاب کے سامنے رکھ دیے۔ حجاب نے دھندلائی نظروں سے دیکھا۔ یہ دوسری شادی کا اجازت نامہ تھا۔ وہ فاتح تھا...... وہ مفتوح تھی۔ لڑائی ہار چکی تھی۔ اسے اپنا شہر فاتح کے حوالے کرنا تھا۔ اس نے خاموشی سے دستخط کردیے۔

تین روز بعد شریفاں ہی کی زبانی اسے پتا چلا کہ جلال نے ارم سے نکاح کرلیا ہے اور اب وہ اس گھر میں مسز جلال ہے۔ نکاح میں دونوں طرف کے بیس تیس افراد ہی شریک ہوئے تھے۔ کہا جارہا تھا کہ بعد میں کسی وقت ولیمے کی دعوت کی جائے گی۔ ارم نے اس گھر میں اپنے لیے وہی کمرا چنا تھا۔ جس کا چناؤ پہلے بھی حجاب کے دل کا خون کرتا رہا تھا۔ وہ شکست کے آداب جانتی تھی۔ اسے معلوم تھا اسے اب بہت کچھ جھیلنا پڑے گا۔

آٹھ دس روز بعد جب جلال کا کچھ ذاتی سامان درس والے گھر میں آیا تو حجاب حیران ہوئی۔ یہ جلال کے کپڑے تھے، اس کے جوتوں کے چند جوڑے، واش روم کا سامان اور اس طرح کی دیگر اشیا۔ سامان لانے والے ملازمین نے بتایا کہ رات کو جلال صاحب تشریف لائیں گے، کھانا بھی ادھر ہی کھائیں گے۔

نو بجے کے لگ بھگ جلال آگیا۔ اس کے موڈ کے بارے میں کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا۔ بہرحال وہ آگ بگولا یا تیخ پا نہیں تھا۔ کھانے کے بعد وہ دونوں کچھ دیر باغیچے میں چہل قدمی کرتے رہے۔ حجاب نے لرزتی آواز میں اسے شادی کی مبارک باد دی۔ جلال کی باتوں سے پتا چلا کہ اس نے ہفتے میں تین دن یہاں اور تین دن نئے گھر میں رہنے کا فیصلہ کیا ہے۔

وہ اس پر اعتراض کرنا چاہتی تھی۔ کہنا چاہتی تھی کہ اس کی نئی نئی شادی ہوئی ہے وہ اپنی نو بیاہتا بیوی کو وقت دے۔ لیکن اعتراض کرنے، بلکہ شاید بولنے کا حق بھی وہ کھو چکی تھی۔

جلال پورے تین دن درس والے گھر میں رہا، لیکن اس سے حجاب کو کوئی خوشی نہیں ملی۔ خوشی تو دور کی بات ہے وہ ایک عجیب سے درد بھرے تناؤ کا شکار رہی۔ وہ خود کو ایک بیوی سے زیادہ قیدی سمجھ رہی تھی...... ایک ایسی قیدی جسے کسی شرمناک جرم میں سزا ملی ہو اور جس کی نگاہیں جیل حکام کے سامنے ہر وقت جھکی رہتی ہوں۔ یہ کیا احساس تھا؟ یہ سوچیں تھیں۔ وہ اپنے اندر ہی جیسے لہولہان ہوتی رہتی تھی۔ اس نے وینس میں ہادی سے ملاقات کے حوالے سے اپنی صفائی میں جو کچھ کہا تھا وہ جلال نے خاموشی سے سن لیا تھا لیکن کیا اعتبار کیا تھا اس کے بارے میں وہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔

باہر کے حالات کی اسے کچھ خبر نہیں تھی۔ ایک دن جلال کے دو تین خشک جملوں سے بس اسے اتنا پتا چلا تھا کہ اس کی امی کی طبیعت اب بہتر ہے۔ ان کے ٹیسٹ بھی ٹھیک آئے ہیں۔

تین دن کے بعد جلال کی آمد بند ہوگئی۔ اب ایک بار پھر وہ تھی اور شریفاں تھی۔ حجاب نے شریفاں کو سختی سے ہدایت کر رکھی تھی کہ وہ باہر کی کوئی خبر اسے نہیں دے گی۔ اس نے شریفاں کا سیل فون بھی اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ اسے شک تھا کہ شاید ہادی کے پاس شریفاں کا نمبر موجود ہے اور وہ اس نمبر پر رابطے کی کوشش کرسکتا ہے۔ اب وہ ہادی کا خیال بھی ذہن میں لانا نہیں چاہتی تھی۔ اسے نفرت سی ہوگئی تھی اس کے تصور سے۔ نماز کے بعد بھی وہ باقاعدگی سے یہ دعا کرتی تھی کہ وہ یہاں سے جاچکا ہو اور اب کبھی پلٹ کر اپنی صورت نہ دکھائے۔ وہ اپنے آپ کو بھی کوستی تھی کہ ایک ہیجانی کیفیت کے زیر اثر وہ اپنی حدود کو بھول گئی۔ ہادی کے ساتھ گھومتی پھرتی رہی اور فراموش کرگئی کہ دل میں سچائی بھی ہو تو ظاہری عمل لوگوں کو انگلیاں اٹھانے کا موقع دیتا ہے اور مرد و زن کی بے جا قربت میں شر کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ہادی کا اس سے بار بار رابطہ کرنا، اس کے گھر تک پہنچ جانا اور فوٹوگراف کے حوالے سے اس کی غفلت یہ سب چیزیں حجاب کو دکھ دیتی تھیں اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتی تھی کہ شاید عورت کے معاملے میں سب مرد ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔ ان سب باتوں سے قطع نظر کسی وقت وہ خود بھی اپنا تجزیہ کرنے بیٹھ جاتی۔ اسے لگتا کہ اس کے دل و دماغ کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اس میں ایک اہم کردار بینش والے دردناک واقعہ کا بھی ہے۔ اس بے انصافی کے اثرات نے اندر ہی اندر اس میں جڑ پکڑی اور جب باہر کے حالات بھی دگرگوں ہوئے تو اس کے اندر

جراحت کی چنگاریاں چمک اٹھیں۔ وہی حقیقت کہ انسان کے اندر کے جذبے کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی طور اپنا اظہار ضرور کرتے ہیں۔

چوتھے روز جلال نے دوبارہ درس والے گھر آنا شروع کردیا...... اس مرتبہ بھی تین دن اس کے پاس رہ کر وہ واپس نئے گھر چلا گیا۔ یہ سب دھوپ چھاؤں کی سی کیفیت تھی۔ لیکن دھوپ بھی جلانے والی اور چھاؤں بھی۔ حسب توقع تین دن گزرنے کے بعد جلال کی آمد پھر شروع ہوگئی۔ وہ ہر وقت ڈری رہتی تھی کہ کہیں باتوں باتوں میں پھر کوئی نازک موضوع نہ چھڑ جائے۔ مگر شکر تھا کہ جلال ماضی قریب کی کسی بات کا ذکر نہیں کررہا تھا۔ اس مرتبہ وہ اس کے لیے کچھ چیزیں بھی لایا تھا۔ کچھ جوڑے کپڑوں کے تھے۔ ایک راڈو گھڑی تھی۔ اس مرتبہ وہ ہوٹل میں کھانا کھانے بھی گئے۔ یہ ساری دلکش باتیں تھیں، لیکن ان کے پیچھے جو وجہ تھی وہ بھی حجاب اچھی طرح جانتی تھی اور اس وجہ نے جلال کی ان مہربانیوں کو بالکل بے معنی کردیا تھا۔ وہ اپنے فلسفے کے مطابق اپنی دونوں بیویوں میں ''عدل'' کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بے شک اسے ایسا کرنا چاہیے تھا اور خدا کا حکم بھی یہی تھا مگر اس عدل کی بنیادی شرط ''محبت'' اس سارے عمل میں سے اوجھل تھی، اور یہی کمی اس سارے عمل کو کھوکھلا و بے معنی کرتی تھی۔ ایک دن حجاب نے ہمت کرکے کہہ دیا۔ ''آپ کہیں گھومنے پھرنے نہیں جائیں گے؟ میرا مطلب ہے، شادی کے بعد ارم کی خواہش ہوگی چند دن کہیں گزارنے کی۔''

''کیا مطلب؟''

''اسے لے جائیں کہیں۔''

''اس میں تمہارے مشورے کی ضرورت نہیں۔ مجھے جب جانا ہوگا، چلا جاؤں گا۔'' جلال نے خشک لہجے میں کہا۔ پھر اسے سرتاپا دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اور جو کپڑے میں لایا تھا، ان میں سے کسی کو چھوا تک نہیں تم نے، کیا پسند نہیں آئے؟''

''ن...... نہیں، ایسی بات تو نہیں۔''

''تو پھر کیا وجہ ہے؟''

وہ کہنا چاہتی تھی، وجہ یہی ہے کہ دل مرگیا ہے، لیکن ایسا کہنا ممکن نہیں تھا۔ وہ بولی۔ ''ٹھیک ہے۔ م...... میں ابھی پہن کر آتی ہوں۔''

''نہیں، اب ضرورت نہیں۔'' وہ جلے بھنے لہجے میں بولا اور اٹھ کر لان کی طرف چلا گیا۔

چوبیس پچیس روز بعد ہی وہ کھنچاؤ نمایاں ہونے لگا جس کا ہونا بالکل منطقی تھا۔ جب حجاب والے تین دن شروع ہوتے تھے تو پہلا دن تو قدرے بہتر گزرتا تھا، گھر میں اور بیڈروم میں بھی جلال کا موڈ قدرے بہتر رہتا تھا۔ لیکن دوسرے دن شام ہوتے ہوتے ایک طرح کی بیزاری جلال کے انداز میں نمایاں ہونے لگتی تھی...... وہ جیسے واپسی کی گھڑیاں گننے لگتا تھا۔ طبیعت میں جھنجلاہٹ سی آجاتی تھی۔ تیسرا دن وہ یکسر خراب موڈ میں گزارتا تھا۔ اگلے روز صبح سویرے اسے نکلنے کی بہت جلدی ہوتی تھی۔

وہ روم کا ایک خوشگوار دن تھا۔ ہلکی بارش کے بعد موسم نکھرا ہوا تھا۔ حجاب کے تین دن آج شروع ہوئے تھے۔ جلال رات نو بجے پہنچ گیا مگر آتے ہی اس کے فون کی بیل ہونے لگی۔ وہ فون...... سنتے ہوئے اوپر چھت پر چلا گیا۔ حجاب جانتی تھی یہ ارم کی کال ہوگی۔ یہ کال دس پندرہ منٹ سے پہلے ختم نہیں ہوگی۔ وہ پہلے بھی فون کرلیتی تھی مگر اب اس کی کالیں لمبی ہوتی جارہی تھیں۔ حجاب کو کیا اعتراض ہوسکتا تھا اور اگر ہوتا بھی تو، وہ کرنے کے قابل کہاں تھی...... ہاں، وہ آداب شکست جانتی تھی اور مانتی بھی تھی۔

جلال کا ''حکم'' تھا کہ آج کھانا باہر کھائیں گے، وہ تیار ہوجائے۔ ساڑھے نو بجے کے قریب وہ تیار ہونے کے لیے چلی گئی۔ جلال کا لایا ہوا ایک نیا سوٹ بڑی دیر تک ہاتھوں میں پکڑے کھڑی رہی۔ اسے لگا کہ یہ لوہے کا لباس ہے اور آگ کی طرح تپا ہوا ہے۔ خود پر جبر کرکے اس نے اسے پہنا پھر ڈریسنگ ٹیبل کی طرف آگئی۔ اس نے سوچا کاش کوئی ایسا میک اپ ہو جو اس کے چہرے کو چھپالے۔ خاص طور سے اس تاثر کو چھپالے جو زنداں کے داروغہ کو دیکھ کر نادم قیدی کے چہرے پر آتا تھا۔

وہ تیار ہوکر کمرے میں پہنچی تو جلال بستر پر نیم دراز تھا۔ ٹی وی دیکھتے دیکھتے وہ سو گیا تھا۔ لگتا تھا کہ ''پچھلے تین دن'' نے اسے کافی تھکا دیا ہے۔ وہ کافی دیر تک اس کے جاگنے کا انتظار کرتی رہی۔ پھر اس نے ڈرتے ڈرتے اسے کندھے سے ہلایا۔ ''جلال...... جلال!''

اس نے نیند میں بیزاری سے کچھ کہا اور کروٹ بدل لی۔ وہ دیر تک صوفے پر بیٹھی رہی، پھر کامن روم میں جاکر شریفاں سے باتیں کرنے لگی۔

شریفاں نے کہا۔ ''بھائی جان کے سر میں درد تھا، گولی بھی کھائی ہے انہوں نے۔ بارہ بجے کے قریب حجاب بھی نائٹی پہن کر بیڈروم میں چلی گئی اور بہت ہونے سے

جلال کے پہلو میں لیٹ گئی۔ وہ اسے جگانا نہیں چاہتی تھی۔

صبح جلال کا موڈ بہت خراب تھا۔ وہ حجاب سے پہلے ہی جاگ گیا تھا۔ جونہی حجاب اٹھی اور بازو اوپر اٹھا کر اپنے بالوں کو باندھنا شروع کیا، وہ اندر آ گیا۔ ہاتھ میں چائے کا کپ تھا۔ غصے سے بولا۔ ''کیا ہو گیا تھا رات کو۔ تم نے جگایا ہی نہیں۔''

''میں نے جگایا تھا جلال، آپ اٹھے نہیں۔''

''غلط کہہ رہی ہو تم۔'' وہ پھنکارا۔ ''سو ہی رہا تھا، مر تو نہیں گیا تھا۔ تمہارا ویسے ہی ارادہ نہیں تھا جانے کا۔ بہانے ڈھونڈتی ہو تم۔ سوگ منا رہی ہو تم، پتا نہیں کس کس پیارے کا۔''

''جلال! میں قسم کھاتی ہوں کہ......''

''قسم مت کھا......'' وہ گرجا۔ ''جھوٹی ہے تو، ہمیشہ جھوٹ ہی بولے ہیں تو نے۔ اب بھی جھوٹ بول رہی ہے۔ میں اندھا نہیں ہوں، سب دیکھتا ہوں، پرانے یارانے لہولہان کررہے ہیں تیرے دل کو۔''

''خدا کے لیے جلال! الزام مت لگائیں مجھ پر۔''

''اچھا یہ الزام ہے...... بہتان ہے۔'' وہ دانت پیس کر بولا پھر طیش میں آ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ''اُلّو کی پٹھی، حرامزادی! یہ بہتان ہے؟'' اس کا پہلا تھپڑ اتنا زوردار تھا کہ حجاب لڑھک کر قالین پر جا گری۔ اس کے بعد جیسے اسے کچھ ہوش ہی نہیں رہا۔ لاتیں، تھپڑ، گھونسے، اتنے تواتر سے اس کے جسم پر پڑے کہ وہ بھول گئی، جسم کے کون سے حصے کا دفاع کرے اور کون سا اس کی بے رحمی کے سامنے کھلا چھوڑ دے۔ اس کی نائٹی سامنے سے پھٹ گئی۔ زیریں لباس نظر آنے لگا، وہ گری ہوئی تھی۔ جلال نے اس کی گردن پر پاؤں رکھ دیا۔ اس کو لگا کہ سانس رک جائے گا اور وہ مر جائے گی۔ اس کا منہ بے ساختہ کھل گیا اور وہ سانس کے لیے تڑپنے لگی۔ یہی وقت تھا جب شریفاں روتی چلاتی اندر آئی اور جلال کے قدموں میں گر پڑی۔ اس کی ''دور افتادہ'' آواز حجاب کے کانوں میں پڑی۔ ''وڈے بھائی جان! ماف کر دیں، مر جائے گی...... ختم ہو جائے گی۔''

اس کی نگاہیں دھندلا رہی تھیں، بس اتنا پتا تھا کہ وہ سانس کے لیے تڑپ رہی ہے اور اس کی گردن پر ایک بے رحم پاؤں ہے۔ پھر وہ موت کے منہ سے پلٹ آئی۔ گردن پر سے دباؤ ختم ہو گیا۔ بچھڑی ہوئی ہوا دیوانہ وار سینے میں داخل ہو گئی اور اسے زندگی کی طرف واپس کھینچنے لگی۔ وہ بے تحاشا کھانستے ہوئے اٹھ بیٹھی۔ اسے ابکائیاں آئیں۔ معدہ

تو کل دوپہر سے خالی تھا ورنہ وہ سب کچھ الٹ دیتی۔ جلال کی گرجتی آواز اس کے کانوں کو مجروح کررہی تھی۔ ''تو ان چیزوں کے لائق ہی نہیں ہے۔ تجھے راس ہی نہیں ہے یہ عزت اور یہ آرام۔ تو بس ماتم کر، سوگ منا اپنے ہوتوں سوتوں کا۔'' اس نے زور سے ہاتھ مارا اور ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی آرائش کی اشیا چاروں طرف بکھر گئیں۔ پھر اس نے وارڈروب کھولی۔ اس میں سے نئے سوٹ نکال نکال کر قریبی برآمدے میں ڈھیر کر دیے۔ وہ جیسے غصے سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ اس نے پرفیوم کی ایک بڑی بوتل توڑ کر ان کپڑوں پر چھڑکی اور لائٹر سے آگ دکھا دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے شعلے بھڑکنے لگے۔ اس نے لیڈیز راڈو گھڑی، حجاب کا موبائل، چارجر اور اس طرح کی کئی چیزیں آگ میں پھینک دیں۔

شریفاں، چوکیدار طارق، ڈرائیور عثمان بٹ ڈرے سہمے کھڑے تھے۔ جلال نے ایک الماری میں سے کچھ پرانے کپڑے نکالے اور حجاب کے سامنے پھینکتے ہوئے دہاڑا۔ ''یہ پہن۔ اور اپنے منہ پر لعنت برسا کر بیٹھی رہ کمرے کے اندر۔ تو اسی لائق ہے...... تو اس قابل ہی نہیں ہے کہ تجھے کمرے سے نکالا جائے۔ تیرے جیسی بے اعتباری عورتوں کے لیے ہی حکم ہے کہ ان کو کمروں میں بند رکھا جائے۔ وہ پیار سے نہیں، مار سے سیدھی ہونے والی ہوتی ہیں اور اب میں تجھے کروں گا سیدھا...... میں کروں گا۔''

وہ پاؤں پٹختا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ برآمدے میں قیمتی کپڑوں میں ابھی تک چھوٹے بڑے شعلے حرکت کر رہے تھے۔

☆☆☆

ہادی غراب ہوٹل میں تھا۔ اسے ارم اور جلال کے نکاح کا علم ہو چکا تھا۔ اس کے دل کی حالت عجیب تھی۔ ملازمہ شریفاں سے حجاب کی حالت زار کا سن کر اس کا چین سکون غارت ہو گیا تھا۔ حجاب کا خیال تو پہلے بھی ایک پل اس سے جدا نہیں ہوتا تھا لیکن اب تو اسے حجاب کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہیں تھا۔ یہ دیوانہ کر دینے والی سوچیں تھیں۔ وہ کہاں ہو گی، کیا کر رہی ہو گی، اس کے بارے میں کیا سوچ رہی ہو گی؟ کیمرے میں رہ جانے والی تصویر بھی اس کے ذہن سے نکلتی نہیں تھی۔ یہ بڑی غلطی کی تھی اس نے۔ (ہوٹل واسکوڈے میں آخری رات پیش آنے والے سنگین واقعے کے بارے میں بھی اس نے ابھی تک کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا)

وہ یہاں سیر و تفریح کے لیے آیا تھا۔ جگہ جگہ گھومنا چاہتا تھا۔ دنیا کے عجائبات دیکھنا چاہتا تھا...... لیکن ہوا کیا تھا۔ وینس کی اس رات میں اس نے ایک لڑکی کو دیکھا تھا اور باقی سب کچھ بھول گیا تھا، اب اس کا ویزا ختم ہونے میں بہ مشکل دس دن بچے تھے۔ شیخو بھائی کے کہنے پر ڈپٹی انسپکٹر ہاشم کوشش کر رہا تھا کہ کسی طرح ویزے کی ایکس ٹینشن ہو جائے۔ اس کے لیے سفری کاغذات گم ہو جانے کو جواز بنایا جا رہا تھا۔

ابھی تک کوشش کے باوجود اسے حجاب کی کوئی خیر خبر نہیں ملی تھی۔ شریفاں کا سیل فون بھی مسلسل بند جا رہا تھا۔ حجاب کے والدین کے گھر جانا اب اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ پچھلی دفعہ بھی حجاب بہت ناراض ہوئی تھی۔ یہ بے خبری اور دوری ہادی کے دل و دماغ میں تہلکہ مچا رہی تھی۔ اسے ایک ایسے کرب کا احساس ہوتا تھا جس کا اسے کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا۔ تاہم ایک بات تھی۔ کرب کی اس بدترین صورتِ حال میں سے ایک چیز اچھی برآمد ہو رہی تھی...... اور یہ شاعری تھی۔ وہی شاعری جو کافی عرصے سے روٹھ چکی تھی، اب بڑے تواتر سے اس کے زخمی دل پر دستک دے رہی تھی۔ اس نے پچھلے دو تین ہفتوں میں کوئی ڈیڑھ درجن گیت لکھے تھے اور شیخو بھائی کو ارسال کیے تھے۔ شیخو بھائی اس صورتِ حال پر بے انتہا خوش تھے۔ وہ ایک البم کی ریکارڈنگ شروع کرانے والے تھے اور دوسرے کی کاغذی تیاری کر رہے تھے۔ ویسٹرن یونین کے ذریعے دو بھاری بھرکم رقوم بھی انہوں نے ہادی کو ارسال کر دی تھیں۔

اب بھی ہادی کے ہاتھ میں حجاب کا دیا ہوا پارکر قلم تھا۔ وہ ایک نظم مکمل کر رہا تھا۔ اس طویل نظم کا خلاصہ کچھ اس طرح تھا۔

میں نے جب پہلی بار اسے دیکھا تو وہ نہروں کا شہر تھا۔

وہ ایک طلسمی رات تھی۔

مجھے یہی لگا کہ میں ہزاروں برس سے اسے جانتا ہوں۔

ہزاروں سال سے میں اس کی روشن پیشانی پر۔

اور سحر انگیز مسکراہٹ پر گیت لکھ رہا ہوں۔

ہزاروں سال گزرنے ہیں جب سے وہ میرے سنہری سپنوں میں آ رہی ہے۔

محبت سے مسکرا رہی ہے۔

کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ کیا اس زندگی سے پہلے بھی کوئی زندگی موجود تھی؟

اگر تھی تو کیا میں وہاں پلٹ سکتا ہوں؟

جہاں میری طرح اس کے دل میں بھی پیار کا سمندر موجزن تھا۔

یہ بے خبری نہ تھی؟ یہ دوریاں نہ تھیں۔

ہادی جب بھی نظم، غزل یا گیت وغیرہ لکھتا تھا اس کی اندرونی تڑپ کچھ کم ہو جاتی تھی لیکن آج یہ نظم لکھ کر تڑپ کچھ اور بڑھ گئی۔ کیا مرض میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اسی وقت کمرے کے دروازے پر نازک سی دستک ہوئی۔ ”کم ان۔“ اس نے کہا۔

ایک اطالوی لڑکی نہایت چست منی اسکرٹ میں دروازے پر نظر آئی۔ وہ کافی حسین تھی۔ ”مے آئی کم ان سر؟“ وہ دلربا انداز میں بولی۔

”یس۔“ ہادی نے کہا۔

وہ حریم اندر آ گئی اور سراپا دعوت بن کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ وہ چپ تھی مگر اس کا سارا جسم پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ اس شب میں اور اس کمرے میں میری ساری رعنائیاں برائے فروخت ہیں۔ ان ہوٹلوں میں ایسی ”سچویشنز“ سے اکثر پالا پڑتا رہتا تھا۔

”کسی چیز کی ضرورت سر؟“

”نو تھینک یو، میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔“

”اوکے۔“ اس نے خوش دلی سے کہا اور الٹے قدموں پیچھے ہٹ کر دروازہ بند کر دیا۔

ہادی نے نیا سگریٹ سلگایا مگر اب سگریٹ سے بھی کوئی خاص فائدہ نہیں تھا۔ پتا نہیں دل و دماغ کی کیفیت کیا تھی کہ اس نے وہ کام کیا جو شاذ و نادر ہی کرتا تھا۔ اس نے روم سروس کے ذریعے الکحل کا آرڈر دے دیا۔ چند منٹ بعد باوردی ملازم شیمپین کی سفید بوتل لیے آن موجود ہوا۔ ساتھ میں روسٹ چکن کے پیس تھے۔ ہادی نے بوتل کھولی، آتشیں سیال گلاس میں انڈیلا...... لیکن پتا نہیں کیوں اسے ہونٹوں تک نہیں لے جا پایا۔ اسے یہ سب کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا اور اب تو بالکل نہیں لگ رہا تھا۔ اس کے ذہن میں رہ رہ کر حجاب کا چہرہ آ رہا تھا۔ جب وہ وینس کے ایک پارک میں اسے اپنی دوست بینش کی غم انگیز کہانی سنا رہی تھی۔ اس نے شراب کا ذکر بڑے نفرت انگیز انداز میں کیا تھا۔ فیروز کی شراب نوشی کا بتاتے ہوئے اس کی پیاری سی ناک پر کراہیت کی بہت سی سلوٹیں ابھر آئی تھیں۔

ہادی کچھ دیر سوچنے کے بعد بستر سے اٹھا اور واش روم میں جا کر بوتل واش بیسن میں الٹ دی۔

کچھ ہی دیر بعد وہ بے دم سا پھر بستر پر لیٹا تھا۔ بات صرف الکحل کی ہی نہیں تھی۔ پچھلے ایک دو ماہ میں بہت تبدیلیاں آئی تھیں اس میں۔ ہر وہ چیز جو حجاب کو بری لگتی تھی اسے بری لگنے لگی تھی۔ کسی وقت تو اسے یوں لگتا تھا کہ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں مثلاً بولنے، مسکرانے، اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے میں بھی حجاب کی پسند ناپسند کا خیال رکھنے لگا ہے۔ اس کا وجود جیسے غیر محسوس طور پر اس کے وجود میں گم ہو رہا تھا۔ یہ عشق کی پتا نہیں کون سی پرت تھی...... شاید وہی جب ”میں“...... میں نہیں رہتا تو ”تو“ بننا شروع ہو جاتا ہے۔ وہ لیٹا رہا اور سوچتا رہا۔ وہی بے مثال، روشن پیشانی، وہی جادو کی مسکراہٹ جو اسے ہر طرف سے گھیر لیتی تھی...... اور وہ ہزار سال سے اس مسکراہٹ کو جانتا تھا۔ یہ کیسا انوکھا جذبہ تھا۔ یہ کتنا طاقتور تھا۔ پوری کائنات کو اپنے مدار پر حرکت دے سکتا تھا۔ دیکھا جاتا تو ہادی کو کیا حاصل نہیں تھا۔ وہ ابھی دس منٹ کے اندر دنیا کی بہترین آسائشیں اور رنگینیاں اس کمرے میں موجود کر سکتا تھا۔ لیکن وہ لڑکی جو اس کی تھی بھی نہیں...... جو پتا نہیں کہاں بیٹھی تھی، اس کی تمام ڈوریاں اپنے ہاتھوں میں لے چکی تھی۔ وہ اس کے لیے کچھ بھی کر سکتا تھا۔ کچے دھاگے سے بھی کچی یہ ڈوریاں، دنیا کے مضبوط ترین بندھن کا روپ دھار چکی تھیں۔ یہ وہ ہادی رہا ہی نہیں تھا جو لاہور سے چل کر یہاں آیا تھا۔

ہادی کے ذہن میں جب جب حجاب کی بے بسی کا خیال آتا تھا، تب تب ارم کی ”کامرانیوں“ کا خیال بھی آتا تھا۔ حجاب کی محبت کے ساتھ ارم سے نفرت بھی اتنی ہی شدت سے ابھرتی تھی۔ اس کی عیار چمکیلی آنکھیں، ہادی کے سینے میں شعلے سے بھڑکا دیتی تھیں۔

اس وقت اس کی سوچ کا دھارا ارم کی طرف تھا جب فون کی بیل ہوئی۔ یہ اس کا نیا نمبر تھا جو صرف شیخو صاحب اور اس کے گھر والوں کو معلوم تھا یا پھر اٹلی میں گلزاری کو معلوم تھا۔ یہ گلزاری ہی کی کال تھی۔ اس کی آواز جوش سے لرز رہی تھی۔ ”ہادی صاحب! بڑی کڑاکے دار اطلاع ہے۔ ارم کے سلسلے میں مکمل بریکنگ نیوز مل گئی ہے۔“

”زبردست...... کیا معلوم ہوا؟“

”ایسے نہیں سر! ملاقات کا شرف بخشیے۔ کہاں ٹھہرے ہیں آپ؟“

گلزاری کے منہ سے جیسے رال ٹپک رہی تھی۔ ظاہر ہے تگڑی خبر کے بدلے وہ تگڑے انعام کی توقع کر رہا تھا اور انعام فون پر تو نہیں مل سکتا تھا۔

ہادی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے گلزاری، تم روم میں برائٹ اسکوائر پر پہنچ جاؤ۔ جانتے ہو نا؟“

گلزاری نے اثبات میں جواب دیا۔

ہادی بولا۔ ”مین روڈ پر کافی بڑا آئس کریم پارلر ہے...... سوزے کے نام سے۔“

”یس سر...... یس سر۔ میں سمجھ گیا۔“

”میں وہاں کھڑا ہوں گا۔ مجھے وہاں پہنچنے میں بیس پچیس منٹ لگیں گے۔“

”ٹھیک ہے جناب! میں آ رہا ہوں۔“ گلزاری نے کہا۔

قریباً ایک گھنٹے بعد وہ دونوں لبِ سڑک آئس کریم پارلر میں بیٹھے تھے۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ یہ ہفتے کی رات تھی، اس لیے روم چنچل حسینہ کی طرح چمک رہا تھا، تھرک رہا تھا اور جھوم رہا تھا۔

تمہید کے بعد گلزار نے انکشاف انگیز آواز میں کہا۔ ”ہادی صاحب! ارم نے قریباً ایک سال پہلے ایک پرائیویٹ کلینک ”وکٹوریہ فورزا“ سے ابارشن کرائی ہے۔ وہ پچھلے سال ستمبر کی چوبیس سے اٹھائیس تاریخ تک کلینک میں باقاعدہ داخل رہی ہے۔ میرے پاس ڈاکومینٹری ثبوت موجود ہیں۔“

اس نے دو تین پیپرز نکال کر ہادی کے سامنے رکھ دیے۔

ہادی نے پیپرز دیکھے۔ یہ واقعی زبردست انکشاف تھا۔ پیپرز انگلش میں تھے اس لیے ہادی کو سمجھنے میں دقت نہیں ہوئی۔ یہاں باقاعدہ ارم چودھری کا نام اور اس کے دیگر کوائف لکھے تھے۔ پری اور پوسٹ آپریشن ٹریٹمنٹ کا ریکارڈ بھی تھا۔ ان پیپرز کے مطابق ارم قریباً چار ماہ کی حاملہ تھی اور نکی وڈ نامی اطالوی بوائے فرینڈ کے ساتھ کلینک میں آئی تھی۔

گلزاری نے واقعی کارکردگی دکھائی تھی۔ مختلف کلیوز کا سہارا لے کر اس گمنام کلینک تک جا پہنچا تھا جہاں ایک سال پہلے ابارشن کرایا گیا تھا۔ درحقیقت یہی وہ بیماری تھی جس کا ذکر یونیورسٹی کے ریکارڈ میں بھی تھا۔ لیکن وہاں چھاتی اور گلے کے انفیکشن وغیرہ کی بات کی گئی تھی۔

ہادی نے ایک گہری سانس لی۔ پیپرز پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور دل ہی دل میں کہا ”اوکے مسز ارم جلال! تم سے حساب کتاب کرنے کا وقت آ گیا ہے۔“

☆☆☆

ارم کو دل کی مراد مل گئی تھی۔ ایک طرح سے اس نے حجاب کو شکست فاش دی تھی لیکن ابھی وہ سمجھتی تھی کہ فتح مکمل نہیں۔ فتح مکمل تو تب ہوتی جب جلال اسے اپنی زندگی سے بھی نکال دیتا، اسے طلاق دے دیتا۔ لگتا تھا کہ وہ اس حد تک جانے کو تیار نہیں۔ شاید وہی عورت کی ملکیت والا جذبہ...... زیادہ سے زیادہ عورتوں کو اپنے دائرہ اختیار اور "حق استعمال" میں رکھنا، کئی کئی عورتوں کا حرم بنالینا۔

خیر موجودہ صورت حال بھی کچھ ایسی بری نہیں تھی۔ ارم جانتی تھی کہ حجاب کی زندگی پھولوں کا نہیں، کانٹوں کا بستر ہے، کپڑوں کو آگ لگانے والے تازہ واقعے کے بعد تو حجاب کی زندگی مزید مشکل ہونے والی تھی۔ وہ جلال کی جوتی کی نوک پر آچکی تھی اور اب اس سے باغی لونڈی والا سلوک متوقع تھا۔ ارم کو گلزاری پر بھی بہت غصہ تھا۔ نجانے کیوں اسے شک تھا کہ ہوٹل واسکوڈے میں ہادی کی موجودگی والی بات گلزاری نے جان بوجھ کر چھپائی تھی۔ شاید وہ کسی لالچ میں آگیا تھا یا پھر ویسے ہی ڈر گیا تھا۔ پچھلے تین چار ہفتوں میں گلزاری سے ٹیلی فون پر بس ایک دفعہ اس کا رابطہ ہوا تھا اور وہ گلزاری کی باتوں سے مطمئن نہیں ہوئی تھی۔ مسز جلال بن جانے کے بعد وہ اپنے اردگرد کے جن لوگوں کو فکس کرنے کا ارادہ رکھتی تھی ان میں یہ گلزاری بھی شامل تھا۔

نو بج چکے تھے۔ جلال کے آنے میں تھوڑی ہی دیر باقی تھی۔ وہ نہا دھو کر کپڑے بدل چکی تھی۔ سرخ بنارسی ساڑی۔ طلائی بندے، ڈائمنڈ کا وزنی ہار اور کلائیوں میں پھولوں کے گجرے۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس کی نظر سنگ مرمر کے بڑے گل دان پر پڑی۔ چند ماہ پہلے حجاب یہ وینس سے لائی تھی اور بڑے اہتمام سے یہاں سیڑھیوں کے پاس سجایا تھا۔ اب ارم اسے یہاں سے ہٹا دینا چاہتی تھی۔ اس نے ایک ایک کر کے گھر میں سے ایسی بہت سی اشیا اٹھوا دی تھیں جو خاص حجاب نے رکھی تھیں۔ ایک خم دار صوفہ، کامن روم کا سنہری فون سیٹ اور وہلہ خاندان کے کسی استاد کاریگر کی بنائی ہوئی منقش تپائی جو ٹی وی لاؤنج میں بڑی شان سے رکھی گئی تھی۔ یہ گل دان بھی ارم کی نگاہوں میں کھٹکتا تھا، مگر اس کا خیال تھا کہ یہ جلال کو بھی اچھا لگتا ہے اور اگر اس نے ہٹانا چاہا تو شاید جلال روکے گا۔

سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے جیسے نفرت کی ایک بلند لہر ارم کے سینے سے اٹھی۔ شاید وہ اپنے آپ کو روک لیتی مگر کچھ غلطی "بے چارے گل دان" سے بھی ہوئی ارم کی ساڑی کا پلو گل دان میں رکھے "آرٹی فیشل" پلانٹ سے الجھ گیا۔ ارم کو تو جیسے بہانہ درکار تھا۔ اس نے پلو کو اتنی جھنجلاہٹ سے چھڑایا کہ گل دان کا گرنا لازم ٹھہرا۔ وہ چھ سات زینے تک لڑھکا اور پھر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

ملازمہ کلثوم اور آیا خانم تیزی سے اندر آئیں۔ اس وقت ارم بیٹھی گل دان کے ٹکڑے اکٹھے کر رہی تھی۔ "ہائے اللہ، چوٹ تو نہیں لگی میری بچی کو۔" آیا خانم نے دلار سے کہا۔ ارم نے نفی میں سر ہلایا۔ یہی وقت تھا جب جلال بھی آ گیا۔ چند لمحے سیڑھیوں کے نچلے سرے پر ساکت کھڑا رہا پھر چڑھ کر اوپر آ گیا۔ "اچھا چھوڑو ارم! ٹوٹنے والی چیز تھی ٹوٹ گئی۔ اب ہاتھ زخمی نہ کر لینا۔" وہ بولا۔

ملازمہ بھی ٹوکری لے کر آ گئی تھی۔ وہ ٹکڑے سمیٹنے لگی۔ ارم نے افسردہ لہجے میں بتایا کہ کس طرح اس کا پلو الجھا اور گل دان گر گیا۔

جلال اسے لے کر کمرے میں آ گیا۔ "تم نے نماز پڑھ لی؟" اس نے پوچھا۔

"جی ہاں۔" وہ سر پر پلو درست کر کے بولی۔ تب اس نے مصنوعی حیرت سے دیوار پر آویزاں کیلنڈر پر نظر ڈالی...... اور جلال کو دیکھ کر بولی۔ "آج تو آپ کو باجی حجاب کی طرف جانا تھا؟"

"نہیں، ادھر ہی رہوں گا۔" اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"لیکن کیوں جلال؟" وہ پیشانی پر سلوٹیں ڈالتے ہوئے بولی (حالانکہ ورس والی کوٹھی میں جو کچھ ہوا وہ سب اسے ڈرائیور شان کی زبانی معلوم ہو چکا تھا)

"بس کہہ دیا نا، نہیں جانا۔"

ارم نے شیروانی کے بٹن کھولنے میں اس کی مدد کی۔ وہ صوفے پر بیٹھ گیا تو وہ عقب میں کھڑی ہو کر اس کے کندھے دبانے لگی۔ وہ اس طرح جھکی ہوئی تھی کہ اپنے جسم کا بیشتر ہیجان خیز گداز جلال کے جسم میں منتقل کر رہی تھی۔

"ایک بات کہوں، برا نہ مانیے گا۔" وہ بولی۔

"کہو۔"

"آپ باجی کو اس طرح تنہا نہ چھوڑیں۔ انہیں آپ کی ضرورت ہے۔ وہ ٹوٹی ہوئی ہیں اور بندہ اندر سے ٹوٹا ہوا ہو تو کوئی غلطی بھی کر سکتا ہے۔"

"کیا خود پر تیل چھڑک لے گی وہ؟" جلال نے جھنجلا کر کہا۔

"نہیں جلال! میں اور بات کر رہی ہوں۔ میرا مطلب ہے کہ......" وہ جان بوجھ کر خاموش ہو گئی۔

جلال نے پلٹ کر قدرے غصے سے دیکھا۔ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہا ہو...... تمہیں پتا ہے، مجھے ادھوری بات پسند نہیں۔

وہ اس کے سینے کے بالوں پر ہاتھ چلاتے ہوئے کہنے لگی۔ "میں آپ کو پریشان کرنا نہیں چاہتی لیکن مجھے لگتا ہے کہ وہ یہاں سے گیا نہیں ہے۔ یہیں کہیں منڈلا رہا ہوگا۔ وہ کہیں، باجی سے دوبارہ ملنے کی کوشش نہ کرے۔ ہم اس کی دیدہ دلیری دیکھ ہی چکے ہیں۔ یہاں ہمارے گھر تک پہنچ گیا اور مہمان بن کر خدمتیں کراتا رہا، پھر باجی کے ماں باپ کے گھر پہنچ گیا...... مجھے نہیں لگتا وہ اتنی آسانی سے پیچھا چھوڑے گا۔ ایسے بندے اچھی بھلی عورت کی مت مار دیتے ہیں۔ مجھے پتا ہے پہلے بھی باجی کا اتنا قصور نہیں ہوگا۔ اسی نے انہیں ورغلایا...... اور اتنی بڑی مصیبت میں ڈالا ہم سب کو۔"

جلال بے چین سا اٹھ کھڑا ہوا۔ ارم کی طرف دیکھ کر بولا۔ "ظہیر کہہ رہا تھا وہ جا چکا ہے یہاں سے۔ شاید "پیسا" گیا تھا۔ اب تو اٹلی سے بھی دفع ہو چکا ہوگا۔"

پتا نہیں کیوں جلال! مجھے ایسا نہیں لگتا اور میں آپ کو ایک دوسری بات بھی بتا دوں۔ یہ جو شریفاں ہے نا یہ بھی ٹھیک نہیں ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ یہ جانتی ہے سب کچھ۔ باجی کی راز دار کی طرح ہے۔ ڈرائیور شان کل بتا رہا تھا کہ شریفاں کا فون آج کل اس کے پاس نہیں ہے۔ وہ اس نے باجی کو دیا ہوا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"وہ فون باجی نے اپنے پاس رکھا ہوا ہے۔ پتا نہیں کیوں؟" اس کے ساتھ ہی ارم نے دراز میں سے ایک پرانا سیل فون نکالا۔ اس میں ایک پرانی سم تھی۔ اس نے جلال کے سامنے ہی شریفاں کا نمبر پریس کیا۔ بیل جاتی رہی، مگر کسی نے اٹھایا نہیں۔ تیسری چوتھی کوشش پر دوسری طرف سے بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ "ہیلو کون؟" یہ حجاب کی آواز تھی۔ اسپیکر چونکہ آن تھا اس لیے یہ آواز جلال نے بھی سنی۔ ارم نے فون بند کر دیا۔ جلال کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

اس نے ارم سے فون لے کر دوبارہ نمبر پریس کیا۔ مگر اب فون بند ہو چکا تھا۔

ارم نے کہا۔ "میں آپ کو یقین سے کہتی ہوں جلال! یہ شریفاں ٹھیک نہیں ہے۔ باجی حجاب نے تو اسے بعد میں ورس والی کوٹھی میں بلایا ہے یہ پہلے ہی وہاں جانے کے لیے پھڑپھڑا رہی تھی۔ بڑا دل لگتا ہے اس کا باجی کے آس پاس۔"

جلال کا موڈ بری طرح غارت ہو چکا تھا۔ چائے پی کر وہ اسٹڈی میں چلا گیا۔ وہاں سے پندرہ بیس منٹ بعد نکلا تو کہیں جانے کے لیے تیار تھا۔ "ہائے اللہ۔ ابھی تو آئے ہیں اب کہاں جائیں گے۔" ارم سینے پر بنارسی پلو درست کر کے ادا سے بولی۔

"ذرا کام ہے۔" جلال نے مختصر جواب دیا اور دروازے کی طرف بڑھا۔

"دیکھیں، میری بات سنیں۔ باجی سے کوئی ایسی ویسی بات نہ کیجیے گا۔"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ چند قدم پیچھے گئی "کھانا تو گھر میں کھائیں گے نا جلال۔"

"شاید" اس نے کہا اور لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر نکل گیا۔ وہ بھنایا ہوا تھا۔

اس کے جانے کے بعد ارم نے ایک لمبی سانس لی اور لگژری صوفے پر نیم دراز ہو گئی اس کے ہونٹوں پر مستی خیز مسکراہٹ تھی۔

قریب ہی پلیٹ میں سیب اور سیاہ انگور پڑے تھے۔ اس نے انگور کا ایک چھوٹا سا گچھا اٹھایا اور لیٹے لیٹے ہی انگور کے دانے منہ میں گرانے لگی۔ دو چار منٹ ہی گزرے تھے کہ اس کے فون کی بیل ہوئی۔ نامعلوم نمبر تھا۔ ذرا تذبذب کے بعد اس نے کال ریسیو کر لی۔ "ہیلو کون؟" اس نے پوچھا۔

جواب میں ایک بھاری آواز سنائی دی۔ "آپ مجھے اچھی طرح جانتی ہیں۔ میں آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کے حق میں بہت بہتر ہوگا کہ آپ فون بند نہ کریں اور نہ اپنے اردگرد کسی کو اس کال کے بارے میں بتائیں۔"

"آپ...... ہیں کون؟" وہ ذرا غصے سے بولی۔ اسے آواز کچھ پہچانی سی لگ رہی تھی۔

"آپ کے آس پاس کوئی موجود تو نہیں؟"

"نہیں۔"

"میں محمد ہادی بول رہا ہوں...... مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ یہاں آپ کے لیے ایک مسئلہ ہے...... کافی سیریس مسئلہ۔"

ارم کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں۔

☆☆☆

حجاب ورن والے گھر میں تھی۔ وہ بس ایک دو کمروں تک ہی محدود رہتی تھی۔ اپنی سخت تذلیل کے بعد نوکروں چاکروں سے آنکھ ملانا اس کے لیے بہت مشکل تھا۔ صرف ایک شریفاں تھی جو اس کی دیکھ بھال کر رہی تھی اور اس کے درد کو محسوس بھی کرتی تھی۔ چند روز پہلے شریفاں کا موبائل فون حجاب نے اپنی تحویل میں لے کر بند کر دیا تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ کہیں ہادی اس نمبر پر رابطے کی کوشش نہ کرے۔ مگر اس سے شریفاں کے لیے بڑی مشکل ہوگئی تھی۔ پاکستان سے اس کی کال آتی رہتی تھی۔ گجرات میں اس کی بہن کے ہاں بچہ ہوا تھا اور بہن بیمار تھی۔ وہ گاہے بگاہے شریفاں سے رابطہ کرتی رہتی تھی۔ شریفاں کی درخواست پر حجاب شام کے وقت ایک دو گھنٹے کے لیے اس کا فون کھول دیتی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے بھی فون کھلا ہوا تھا جب اس پر کسی نامعلوم نمبر سے کال آئی تھی۔ شریفاں نہانے کے لیے باتھ روم میں گھسی ہوئی تھی۔ تیسری چوتھی کال پر حجاب نے فون اٹھایا اور ایک دو بار ہیلو کہا۔ مگر دوسری طرف سے کوئی بات کیے بغیر فون بند کر دیا گیا۔

کہیں یہ ہادی تو نہیں تھا؟ یہ سوچ کر حجاب کا دل دہل گیا۔ نفرت آمیز طیش کی ایک لہر اس کے سینے میں بلند ہوئی۔ اس نے تہیہ کیا کہ اب وہ کبھی کوئی کال ریسیو ہی نہیں کرے گی۔

اچانک شریفاں گھبرائی ہوئی سی کمرے میں داخل ہوئی۔ ”وڈی باجی! بھائی جان آئے ہیں۔“ اس نے پھنسی پھنسی آواز میں اطلاع دی۔

حجاب کے ہاتھ پاؤں میں چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ آج کل جلال کی آمد سے اس کی یہی کیفیت ہوتی تھی۔ میاں بیوی کا محبت اور احترام کا رشتہ، خوف اور تذلیل کے رشتے میں بدل چکا تھا۔ حجاب نے کھڑکی میں سے دیکھا۔ جلال کی ”ہمر“ جیپ پورچ میں کھڑی تھی۔ جلال اگلا دروازہ کھول رہا تھا۔ پچھلے دروازے سے ہٹی کٹی ملازمہ کلثوم نکلی اور ادب سے ایک طرف کھڑی ہوگئی۔ یہ پتا نہیں کیوں آئی تھی جلال کے ساتھ؟

شریفاں نے یونہی وقت گزاری کے لیے ٹی وی لگا رکھا تھا۔ حجاب نے کہا۔ ”شریفاں! ٹی وی بند کرو اور دیکھو کہ کمروں میں کوئی فالتو لائٹ آن نہ ہو۔“

”لائٹیں تو میں نے بند کر دی ہیں جی۔“ شریفاں نے کہا۔

”ایک نظر کچن میں دیکھ لو۔ کوئی چولہا کھلا نہ ہو۔“

حجاب نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔ جلال کو ایسی بے پروائیاں سخت ناپسند تھیں۔

شریفاں ٹی وی آف کر کے جلدی سے کچن کی طرف چلی گئی۔ دو تین منٹ بعد جلال آن وارد ہوا۔ اسے ایک نظر دیکھ کر ہی حجاب سمجھ گئی کہ آج پھر موڈ ابتر ہے۔ وہ بغیر کسی تمہید کے بولا۔ ”شریفاں کہاں ہے؟“

”کچن میں ہے شاید۔“ حجاب نے نظریں ملائے بغیر کہا۔

”شریفاں...... او شریفاں۔“ جلال نے گرج کر آواز دی۔

وہ دو سیکنڈ بعد ہانپتی کانپتی ہوئی سامنے تھی۔ بدقسمتی سے قریبی باتھ روم کی کوئی ٹونٹی کھلی تھی اور پانی گرنے کی آواز آرہی تھی۔ جلال گرجا۔ ”یہ پانی کیوں گر رہا ہے؟“

”مم میں بھول گئی تھی صیب جی۔“ شریفاں بوکھلا کر بولی اور پھر لپک کر باتھ روم کی ٹونٹی بند کر آئی۔ جلال اسی طرح تنا کھڑا تھا۔ ”کہاں رہتا ہے تمہارا دماغ آج کل؟“ وہ گرجا۔

”میں کچن میں تھی صیب جی......“

”کچن میں تھی یا اپنی سہیلی صاحبہ کے ساتھ بیٹھ کر ٹی وی پر کوئی لچر ڈراما دیکھ رہی تھی۔“

”سہیلی...... کون سہیلی جی؟“

”یہی جو تیرے سامنے کھڑی ہے۔ تیری ہم راز۔ تیری لنگوٹن۔“ جلال کا اشارہ حجاب کی طرف تھا۔

”جی......“ وہ ہکلا کر رہ گئی۔

وہ حجاب سے مخاطب ہوا۔ ”اس کا فون تم نے اپنے پاس رکھا ہوا ہے؟“

”فون......؟ ہاں جی...... وہ میں نے......“

ابھی حجاب کی بات ادھوری تھی کہ وہ پھر شریفاں سے مخاطب ہو کر گرجا۔ ”کیوں فون دے رکھا ہے تو نے اسے؟“

”میں نے تو نہیں دتا جی۔ اصل وچ...... اصل وچ......“

”اصل وچ تو شیطان کی بچی ہے۔ حرامزادی ہے تو۔ پوری حرامزادی ہے۔“ جلال گرجا۔

شریفاں سرتاپا لرز رہی تھی۔ مگر گالی اس سے برداشت نہیں ہوئی۔ اس کے چہرے کا رنگ پہلے کی طرح زرد نہ رہا۔ اس نے ہمت کر کے جلال کی طرف دیکھا۔ ”صیب جی! میں بے قصور ہوں۔ آپ ماں پیو کی گالی تو نہ دیں۔“

”بولتی ہے۔ آگے سے بولتی ہے۔ بدنسل، کتے کی بچی......“ جلال اس کی طرف بڑھا اور مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا۔ مگر پھر رک گیا۔ اس نے دائیں طرف جا کر ایک دروازہ کھولا اور دھاڑتے ہوئے ڈرائیور عثمان بٹ کو آواز دی۔ ”عثمان...... عثمان!“

چند سیکنڈ بعد عثمان بٹ ہاتھ باندھے سامنے کھڑا تھا۔ جلال نے شریفاں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ واپس جارہی ہے نئے گھر۔ ابھی جارہی ہے۔ اس کا سامان اٹھا کر گاڑی میں رکھو۔ جلدی کرو۔“

ڈرائیور عثمان بٹ نے ادب سے اثبات میں سر ہلایا اور اس کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ جہاں شریفاں کا مختصر سامان رکھا تھا۔ شریفاں سر جھکائے کھڑی تھی اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ سارا جسم لرز رہا تھا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر شاید سمجھ گئی کہ بولنے کا نتیجہ اس کے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔ وہ مڑی اور کمرے سے نکل گئی۔

اسی دوران میں حسب معمول جلال کے سیل فون پر کوئی کال آگئی۔ وہ کال ریسیو کرتا اور برہم لہجے میں کاروباری باتیں کرتا ہوا ٹیرس کی طرف چلا گیا۔ حجاب پتھر کا بت بنی کھڑی تھی۔ اس کی چھٹی حس، نئے حوادث کی آمد کی خبر دے رہی تھی۔ اس کے دل نے گواہی دی کہ ابھی کچھ دیر پہلے شریفاں کے نمبر پر جو کال آئی تھی، یہ سارا اسی کا شاخسانہ ہے۔

صرف دس منٹ بعد شریفاں سر جھکائے ورن والے گھر سے رخصت ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھیں مسلسل اشکبار تھیں۔

حجاب جانتی تھی کہ شریفاں کے بغیر اس گھر میں اس کا دم گھٹ جائے گا مگر وہ اسے روک نہیں سکتی تھی۔ اس کے لیے حکم جاری ہو چکا تھا اور اس حکم کو بدلا نہیں جاسکتا تھا۔

”رب راکھا باجی۔“ حجاب کے پاس سے گزرتے ہوئے شریفاں نے ہولے سے کہا۔ ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے دیکھا اور پھر مردہ قدموں سے سیڑھیاں اتر گئی۔

ابھی کچھ دیر پہلے شریفاں، جلال کے تھپڑ کی زد میں آنے والی تھی۔ بلکہ یہ ایک تھپڑ نہ ہوتا۔ یقیناً اس پر تھپڑوں اور ٹھوکروں کی بارش ہو جاتی۔ مگر عین وقت پر جلال نے اپنا ہاتھ روک لیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ پاکستان نہیں یورپ ہے۔ یہاں ملازم کو مارنا بہت مہنگا پڑ سکتا ہے۔ مار کھانے کے بعد شریفاں پولیس کو کال کر دیتی تو جلال کو لینے کے دینے پڑ جاتے۔ وہ اپنی ملازمہ کو تو نہیں مار سکا تھا لیکن اپنی بیوی کو مارنے میں اس کے سامنے کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ وہ اسے بے دریغ پیٹ لیتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اس کے شکنجے میں ہے۔ کہیں اس کی شکایت نہیں کرے گی۔ وہ ازدواجی رشتے کے ساتھ ساتھ معاشی پھندے میں بھی پھنسی ہوئی تھی۔

اور تھوڑی دیر بعد یہ بات ثابت بھی ہوگئی کہ حجاب کو مارنے اور اس کی تذلیل کرنے میں جلال کے سامنے کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ فون پر اپنی بات چیت وہ ختم کر چکا تھا اور اب غصے میں بھرا کامن روم کے صوفے پر بیٹھا تھا۔ حجاب اسے بتانا چاہتی تھی کہ شریفاں کا فون اس نے کیوں اپنے پاس رکھا تھا۔ لیکن بہت سی دیگر باتوں کی طرح یہ بات بھی اس کے گلے میں اٹک کر رہ گئی۔ اس کیفیت کی وجہ یقیناً جلال کا غیظ و غضب ہی ہوا کرتا تھا۔ جونہی شریفاں اور ڈرائیور عثمان بٹ رخصت ہوگئے، جلال اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔ حاکمانہ انداز میں حجاب سے بولا۔ ”چلو نیچے آؤ۔“ اس کے ساتھ ہی وہ سیڑھیاں اترنے لگا۔

حجاب کچھ بھی سمجھ نہ پائی تھی، پھر بھی جلال کے پیچھے جانا اس کے لیے ضروری تھا۔ وہ اس کے پیچھے ہی سیڑھیاں اترنے لگی...... پتا نہیں، وہ اسے کہاں لے جارہا تھا۔ سیڑھیاں اتر کر وہ گراؤنڈ فلور پر پہنچے۔ یہاں سے ایک کوریڈور نکلتا تھا۔ وہ چند قدم کوریڈور میں گئے۔ پھر حجاب کی رگوں میں خون جم سا گیا۔ وہ اسے بیسمنٹ میں لے جارہا تھا۔ پر کیوں؟

”چلو۔“ اس نے کہا اور نیچے جاتی سیڑھیوں کا دروازہ کھول دیا۔

”کیا بات ہے جلال......“ وہ روہانسی ہوگئی۔

”بتاتا ہوں...... نیچے چلو۔“ وہ پھنکارا۔

وہ لرز کر رہ گئی۔ مگر قدم آگے بڑھانے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ وہ اسے سیڑھیاں اتار کر بیسمنٹ میں لے آیا۔ یہاں ٹائلوں کا فرش تھا۔ درمیانے درجے کی آرائش بھی کی گئی تھی۔ فرنیچر ”پردے“ اے سی وغیرہ سب کچھ مہیا تھا۔ ہوا کی آمدورفت کا برا بھلا انتظام بھی موجود تھا۔

”اب تم یہاں رہوگی۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔

وہ پوری جان سے لرز گئی۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں جلال؟“

”تم ایک بے اعتباری عورت ہو۔ میں تمہیں آزاد

رکھنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ بہت بے عزتی سہہ چکا ہوں اب مجھ سے اور برداشت نہیں ہوگا۔'' وہ واپس جانے کے لیے مڑا۔

حجاب تڑپ کر بولی۔ ''لیکن اب نیا کیا ہوگیا ہے جلال...... آپ ایسا کیوں کررہے ہیں میرے ساتھ......؟''

وہ جاتے جاتے رک گیا۔ گھوم کر کہنے لگا۔ ''کنگھی کا ایک دندانہ ٹوٹے تو باقی دندانے ٹوٹتے زیادہ دیر نہیں لگتی۔ تم اب بے حیائی کی ہر حد تک جاسکتی ہو۔''

وہ سسک پڑی۔ ''جلال! ایسے الزام نہ لگائیں مجھ پر۔ مجھ سے ایک غلطی ہوئی ہے پر اتنی سزا تو نہ دیں۔ اس سے تو...... بہتر ہے کہ اپنے ہاتھوں سے مجھے ماردیں، میری جان لے لیں۔''

''چپ رہو۔'' وہ اتنے زور سے دہاڑا کہ بیسمنٹ کی دیواریں لرز گئیں۔ ''پھر وہی بات...... میں الزام لگا رہا ہوں تجھ پر۔ بہتان باندھ رہا ہوں تیری نیک سیرتی پر۔ بے حیا بے غیرت۔'' وہ شیر کی طرح اس پر جھپٹ پڑا۔

ایک بار پھر وہی کچھ ہوا جو چند دن پہلے اوپر کمرے میں ہوا تھا۔ اس پر تھپڑوں اور ٹھوکروں کی بارش ہوگئی۔

''جلال!'' وہ خوف اور غصے کی ملی جلی کیفیت میں چلّائی۔

اس کے چلانے نے جلال کو مزید بھڑکا دیا۔ اس نے حجاب کو اس کے بالوں سے پکڑا اور گھما کر دیوار پر دے مارا۔ وہ نیم جان ہوکر بستر پر گرگئی۔ وہ دہاڑا۔ ''تو ان آسائشوں ان نعمتوں کے قابل ہی نہیں ہے۔ بدقسمت ہے تو اور وہ بھی بدبخت ہیں جنہوں نے تجھے جنا ہے۔ نیچ ذات کے ہو۔ نیچ خون ہے تم لوگوں کا۔ چکی پیسنے اور گھاس کاٹنے والوں کی اولاد میں سے ہو۔ میں جانتا ہوں تیرے بڑوں کو اور اب تجھے بھی اچھی طرح جان گیا ہوں۔ تجھے آرام کی گرانی ہورہی ہے۔ پیسے کی ریل پیل نے تیرے پنڈے کو گرم کیا ہوا ہے، اس لیے عاشق ڈھونڈ رہی ہے۔ تیر کی طرح سیدھا کردوں گا تجھے، تیر کی طرح۔'' وہ پھنکارا۔

اس نے کمرے میں رکھا ہوا فریج کھولا۔ اس میں کھانے پینے کی کئی اشیا رکھی تھیں۔ جوسز، فروٹس، اسنیکس وغیرہ۔ اس نے یہ چیزیں نکال نکال کر فرش پر پٹخ دیں۔ بے کار کردیں۔ پھر وہ بپھرا ہوا ٹیلی فون سیٹ کی طرف گیا۔ اس کو نیچے پٹخ کر توڑ دیا۔ اس نے ساری درازیں کھول کر الٹ پلٹ کردیں۔ غالباً دیکھ رہا تھا کہ کوئی موبائل فون یہاں موجود نہ ہو۔ تب وہ حجاب کی طرف آیا۔ اس پر چڑھ دوڑا۔ اس کے قیمتی کپڑے پھاڑ دیے۔ ایک ایک تار جسم سے جدا کردیا۔ وہ عریاں ہوگئی اور رونے کے سوا کچھ نہ کرسکی۔ اس نے اس کے گلے سے ہار اور کانوں سے بندے بھی کھینچ کر پھینک دیے...... اور...... اس کے عریاں جسم پر تھوک کر باہر نکل گیا۔ زمین و آسمان حجاب کی نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔ وہ جیسے زہرناک ہواؤں میں معلق تھی۔ جلال کا لعاب دہن اس کے کندھے پر گرا تھا...... اور اب رینگتا ہوا سینے کی طرف آرہا تھا۔ اسے لگا یہ رقیق، لیس دار مادہ، ایک تیزاب ہے جو اس کو جھلساتا چلا جارہا ہے۔ اس نے عریانی چھپانے کے لیے بستر کی چادر اپنے گرد لپیٹ لی۔

چار پانچ منٹ بعد وہ پھر دندناتا ہوا بیسمنٹ میں داخل ہوا۔ اس نے کسی ملازمہ کا بوسیدہ جوڑا حجاب کے منہ پر مارا اور پھنکارا۔ ''تو اس کے قابل ہے...... بلکہ شاید اس کے قابل بھی نہیں ہے...... اب تو وہی پہنے گی جو میں پہناؤں گا اور وہی کھائے گی جو میں کھلاؤں گا۔ میں تیرے پنڈے کی گرمی کم کردوں گا۔ بالکل ٹھنڈی ٹھار اور نرم ہوجائے گی۔ کان میں ڈالنے کے قابل۔''

وہ غیظ و غضب میں کھولتا ہوا باہر نکل گیا۔ چند سیکنڈ بعد حجاب نے باہر سے دروازہ بولٹ ہونے کی آواز سنی۔ اسے یوں لگا جیسے سینے میں اس کی سانس پھنس گئی ہے۔ وہ جلال کو پکارنا چاہتی تھی مگر پکار بھی نہ سکی۔ اسی طرح ''بیڈشیٹ'' میں لپٹی کروٹ لیے پڑی رہی۔ گھٹنے پیٹ سے لگے ہوئے تھے۔ اس کے جسم پر انگارے سے دہک رہے تھے۔ یہ ان طمانچوں کے انگارے تھے جو جلال نے اس پر برسائے تھے۔ عریاں جسم پر انگاروں کی جلن کم نہیں ہوتی، مگر تیزاب کی جلن تو بہت زیادہ ہوتی ہے...... اور حجاب کے کومل بدن پر تیزاب بھی لعاب دہن کی صورت میں سرک رہا تھا۔ کچھ دیر بعد حجاب نے محسوس کیا کہ بیسمنٹ کے دروازے سے باہر جلال کسی سے باتوں میں مصروف ہے۔ غالباً یہ ملازمہ کلثوم ہی تھی۔ وہ درشت لہجے میں اسے حجاب کے متعلق کچھ ہدایات دے رہا تھا۔ الفاظ سمجھ میں نہیں آرہے تھے مگر آہنگ سے اندازہ ہورہا تھا کہ ہدایات بہت سخت ہیں۔

تو کیا وہ اسے یہاں بند کرکے چلا جائے گا۔ دو تین دن کے لیے یا چار پانچ دن کے لیے؟ ''اوہ خدایا!'' وہ کیسے رہ پائے گی۔ بند کمروں سے اسے ہمیشہ خوف آتا تھا۔ اس کا دم گھٹنے لگتا تھا۔ وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔ اپنے گرد بستر کی چادر درست کی اور لڑکھڑاتی ہوئی دروازے تک پہنچ گئی۔ اس نے

دونوں ہاتھوں سے دروازہ کھٹکھٹایا اور فریادی لہجے میں پکاری۔ ''دروازہ کھول دیں جلال۔ دروازہ کھول دیں۔''

وہ پکارتی رہی اور دروازہ کھٹکھٹاتی رہی مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ اس کی سانس واقعی رکنے لگی۔ وہ کھڑکی کی طرف لپکی...... لیکن کھڑکی نام کی کوئی چیز یہاں نہیں تھی۔ وہ پھر دروازے کی طرف آئی۔ جلال اور کلثوم کو پکارنے لگی۔ مگر سب بے سود رہا۔ وہ وہیں دروازے کے سامنے بیٹھ گئی۔ وقفے وقفے سے آواز دیتی رہی، دروازہ بجاتی رہی۔ اس کی آواز بیٹھ گئی تھی۔ پھر وہ بے دم سی ہوکر وہیں پھولدار ٹائلوں کے فرش پر لیٹ گئی۔ دروازے کے قریب لیٹنا اسے نسبتاً بہتر لگا۔ شاید دروازے کی درزوں میں سے تازہ ہوا اندر آرہی تھی۔

یہ اس کے ساتھ کیا ہورہا تھا۔ وہ کس دلدل میں پھنستی جارہی تھی۔ ایک چھوٹی سی جسارت کی اتنی بڑی سزا؟

☆☆☆

ہادی شاہدرہ کے علاقے میں ایک گمنام کیفے میں بیٹھا تھا۔ وہ ارم کا انتظار کررہا تھا اور اسے یقین تھا، وہ ضرور آئے گی۔ ٹیلی فون پر ہونے والی گفتگو کے آخر میں اس نے ارم کو ایک ایسا اشارہ دیا تھا جس نے اس کی سٹی گم کردی تھی۔ وہ یہ ہامی بھرنے پر مجبور ہوگئی تھی کہ کل دوپہر اس سے اس کیفے میں ملے گی۔

ہادی نے ایک بار پھر رسٹ واچ پر نگاہ دوڑائی۔ 12 بجے کا وقت تھا اب 12 بج کر 20 منٹ ہوچکے تھے۔ ہادی ہر طرح کی صورت حال کے لیے تیار تھا۔ اس کی درخواست پر ڈپٹی انسپکٹر ہاشم نے اپنے ایک ماتحت تھامس کو بھی اس کیفے میں بھیج دیا تھا۔ وہ سادہ لباس میں ہادی سے تیسری چوتھی میز پر موجود تھا اور چائے کی چسکیاں لے رہا تھا۔ وقت گزاری کے لیے ہادی نے شیخو صاحب کو فون کیا۔ انہوں نے اپنے مخصوص پنجابی لہجے میں اوپر تلے دو اچھی خبریں دیں۔ پہلی یہ کہ اٹالین سفارت خانے کی طرف سے ہادی کو ''ایمرجنسی ایٹے'' مل گیا تھا۔ دوسری اہم خبر یہ تھی کہ ہادی کے گانوں کے نئے لانچ ہونے والے البم نے سیل کا ایک نیا ریکارڈ قائم کردیا تھا۔ شیخو صاحب بہت خوش تھے اور مسلسل خوشی کا اظہار کررہے تھے......

قریباً ساڑھے بارہ بجے تھے جب ارم تیزی سے اندر داخل ہوئی۔ اس نے ایک نیلے رنگ کا اسکارف اوڑھ رکھا تھا جس میں سے بس چہرے کی ٹکیا نظر آتی تھی۔ ایک شال نے اس کے بالائی جسم اور لباس کو ڈھانپ رکھا تھا۔ پاؤں میں جوگر شوز تھے۔ ہال میں نگاہ دوڑانے کے بعد وہ سیدھی اس گوشے میں پہنچ گئی جہاں ہادی موجود تھا۔

دونوں میں رسمی کلمات کا تبادلہ ہوا اور پھر وہ آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ آج پہلی بار ہادی کو ارم کی آنکھوں کی چمک ماند نظر آئی۔ رنگ بھی کچھ پھیکا سا تھا۔ یہ آثار دیکھ کر اسے راحت محسوس ہوئی۔

''کیا پیئیں گی؟'' ہادی نے پوچھا۔

''ہادی صاحب، میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔'' وہ کڑے لہجے میں بولی۔

''ہاں، مجھے بھی لگتا ہے کہ آپ کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے، آپ کو جو کچھ کرنا ہے جلدی کرنا ہے۔ ورنہ آپ ایک بڑی مصیبت میں گرفتار ہوجائیں گی۔'' ہادی نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔

''آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟''

ہادی نے اطمینان سے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک لفافہ ارم کے سامنے رکھ دیا۔ اس میں ان تین عدد پرنٹس آؤٹ کی کاپیاں تھیں جو گلزاری نے پرائیویٹ کلینک وکٹوریہ فورٹا سے حاصل کیے تھے۔ پرنٹ آؤٹ دیکھنے کے بعد ارم کی حالت پتلی ہوگئی۔ اس کے ہاتھوں میں واضح طور پر کپکپاہٹ دکھائی دینے لگی۔ رنگ بھی مزید پھیکا پڑ گیا۔

''یہ...... سب کیا ہے؟'' وہ ہکلائی۔

''دیکھیں مسز ارم! آپ نے خود کہا ہے کہ آپ کے پاس زیادہ وقت نہیں۔ پھر اسے فضول باتوں میں ضائع مت کریں۔ میرے پاس ٹھوس ثبوت موجود ہیں۔ آپ کی وہ ازدواجی زندگی چند روز میں ختم ہوسکتی ہے جو آپ نے بڑی چالاکی سے ہتھیائی ہے......''

''تو تم مجھے بلیک میل کرنا چاہتے ہو؟'' وہ آپ سے تم پر اتر آئی۔

''میں بلیک میل کرنا ''چاہتا'' نہیں ہوں، کررہا ہوں اور یہ اوچھے ہتھکنڈے تم نے خود شروع کیے ہیں ارم چودھری! اس لڑائی میں تمہیں ہر اینٹ کا جواب پتھر سے ملے گا۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ لڑنے کا خیال دماغ سے نکال دو۔ کچھ اور سوچو۔'' ہادی نے زہریلے لہجے میں کہا۔

وہ یک ٹک ہادی کی طرف دیکھتی رہی پھر شاید سمجھ گئی کہ ہادی نرا شاعر ہی نہیں۔ ان لوگوں میں سے ہے جو بات کرتے ہیں تو اسے عملی جامہ بھی پہنا دیتے ہیں۔ ایک گہری سانس لے کر اس نے لرزاں آواز میں کہا۔ ''تو تم یہ سب حجاب کے لیے کررہے ہو۔ اس کے کہنے پر...... اس کی

خواہش کے مطابق؟"

"اس بے چاری کو ان باتوں کا پتا بھی نہیں۔ وہ ایسی ہوشیار چالاک ہوتی تو تمہارے پھندوں میں پھنستی ہی نہیں۔ جو کچھ تم نے اس کے ساتھ کیا ہے، کسی اور کے ساتھ کیا ہوتا تو وہ تمہاری جان لے لیتا۔" ہادی کے لہجے میں آگ تھی اور تپش پورے جسم میں پھیلتی محسوس ہو رہی تھی۔

اس کے لب و لہجے نے ارم کو ہلا دیا۔ اس نے اسکارف درست کرتے ہوئے خشک لبوں پر زبان پھیری۔ چند سیکنڈ تک الفاظ منتخب کرنے کے بعد بولی۔ "کیا چاہتے ہو تم؟"

ہادی نے اس کے ہاتھ سے کاغذات واپس لیتے ہوئے کہا۔ "سب سے پہلے تو یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حجاب کے خلاف ہر طرح کی سازشیں بالکل بند کر دو۔ ایک دم فل اسٹاپ ورنہ پچھتانے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔"

"میں نے کوئی سازش نہیں کی۔"

"میرے کیمرے سے حجاب کی تصویر نکال کر پورے خاندان میں پھیلانا، تمہاری سازش نہیں محبت تھی اور اس طرح کی "محبتیں" تم نے بہت کی ہیں حجاب سے۔ اب ان کا بدلہ چکانے کا وقت آ گیا ہے۔ میں پھر کہوں گا تم سے۔ اپنا وقت ضائع نہ کرو۔ تم سب کچھ جانتی ہو اور میں بھی۔ اب میرے اور تمہارے درمیان ایک نیا رشتہ وجود میں آیا ہے۔ تمہیں وہ کچھ کرنا پڑے گا جو میں کہوں گا۔"

وہ ذرا سنبھل کر بولی۔ "میں اس کے لیے زیادہ دور تک نہیں جا سکتی مسٹر ہادی! اگر مجھے دھکیل کر دیوار کے ساتھ لگاؤ گے تو پھر بہت کچھ ختم ہو جائے گا۔"

اس نے دلیری سے بات کی تھی مگر اس کی آواز کا کھوکھلا پن ہادی کو صاف محسوس ہوا۔ وہ اتنی بڑی بازی نہیں کھیل سکتی تھی جس کی پہلی چال میں ہی اسے جلال الدین کو کھونا پڑتا۔

ہادی سگریٹ سلگا کر زہریلے انداز میں مسکرایا۔ "میں تمہیں دھکیل کر دیوار سے لگاؤں گا ارم چودھری! اور اگر ضرورت پڑی تو تمہیں دیوار سمیت گرا بھی دوں گا۔ میں بڑے سے بڑا خطرہ مول لینے کو تیار ہوں۔ اگر یقین نہیں تو آزما کر دیکھ لو۔" ہادی کے سینے میں دھڑکن کے گولے پھٹ رہے تھے اور رگوں میں لہو کی جگہ آگ حرکت کرنے لگی تھی۔ اسے صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ ساری توانائی حجاب کی بے پناہ محبت کی بخشی ہوئی ہے۔ بے پناہ اور انوکھی محبت۔ جو کسی رکاوٹ کو نہیں مان رہی تھی۔ جو آگ اور برف کے سات سمندروں پر سے گزرنے کا حوصلہ اپنے اندر رکھتی تھی اور اس سے بھی بڑا حوصلہ اس "محبت" میں یہ تھا کہ وہ خود کو قربان کر کے بھی حجاب کا بھلا چاہتی تھی۔

اس محبت سے پیدا ہونے والی غیر معمولی توانائی نے ارم چودھری جیسی خرانٹ لڑکی کو دو چار منٹ میں ہی ... کر دیا۔ بالآخر وہ مری مری آواز میں بولی۔ "دیکھو ہادی صاحب! میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ میرا کوئی بدخواہ ان پیپرز کے ذریعے مجھے پھنسانے کی کوشش کر رہا ہے۔ بہرحال میں خواہ مخواہ کی ٹینشن اور جھگڑے سے بچنا چاہتی ہوں۔ آپ...... مجھ سے کیا چاہ رہے ہیں؟"

"فی الحال تو کچھ زیادہ نہیں چاہ رہا......"

وہ بات کاٹنے والے انداز میں کہنے لگی۔ "میں بار بار کسی تناؤ کا شکار ہونا نہیں چاہتی، نہ ہی بار بار آپ سے رابطہ کر سکتی ہوں۔ آپ...... کیا چاہتے ہیں، مجھے ایک ہی بار بتا دیں۔ اور...... اور اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ آپ ان پیپرز وغیرہ کو بنیاد بنا کر میرے لیے پھر کوئی پریشانی پیدا نہیں کریں گے۔"

"کوئی ضمانت نہیں۔" ہادی نے بے لچک لہجے میں کہا۔ "اگر کوئی ضمانت ہے تو وہ میں خود ہوں۔ تمہیں میری زبان پر یقین کرنا پڑے گا۔ ہاں اتنا میں بتا دیتا ہوں کہ اس یقین کی وجہ سے تم بھی پچھتاؤ گی نہیں اور ایک دوسری بات۔ کوئی شرط میرے سامنے نہ رکھو۔ تم مشروط بات کرتی ہو تو میرا میٹر گھومنے لگتا ہے۔ یہ سب کچھ اسی طریقے سے ہو گا جس طریقے سے میں چاہوں گا۔ میری سب سے پہلی اور اہم ترین ڈیمانڈ یہی ہے جو میں نے ابھی تمہیں بتائی ہے۔ حجاب کے خلاف اب کوئی اور کمینگی نہ دکھانا۔" ہادی نے آخری الفاظ ادا کیے تو اس کی انگلی ارم کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔

اس کے ہونٹ بے ساختہ کپکپائے لیکن وہ کچھ بولی نہیں۔ ماتھے پر پسینا تھا اور پوری طرح نروس نظر آ رہی تھی۔ ہادی نے دو کولڈ ڈرنکس منگوائے۔ وہ اپنے ہاتھوں کی کپکپاہٹ کو کنٹرول کرتے ہوئے چسکیاں لینے لگی۔ ... کے دروازے پر ایک شخص سیڑھیوں پر بیٹھا گٹار بجا رہا تھا۔ اس کی خوب صورت دھن سے متاثر ہو کر ایک لڑکی اور لڑکے نے رقص شروع کر دیا۔ وہ کچھ دیر اس کی طرف ... رہے۔ دھن ختم ہوئی تو لوگوں نے گٹارسٹ کے ہیٹ میں سکے وغیرہ پھینکے۔

ہادی نے نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "مجھے ایک بات بتاؤ ارم چودھری...... جہاں تک میں سمجھتا ہوں اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکی ہو۔ جلال اور حجاب

میں ٹھیک ٹھاک دوری پیدا ہو گئی ہے۔ میرے اندازے کے مطابق تو اس گھر میں رہنا اب حجاب کے لیے ناممکن ہوتا جا رہا ہے۔ شاید حجاب کے لیے یہ صورتِ حال ناقابلِ برداشت ہے۔ مگر پھر بھی وہ برداشت کر رہی ہے۔ اس کے والدین کی طرف سے بھی کوئی ردعمل ظاہر نہیں ہو رہا۔ وہ اتنا کیوں ڈر رہے ہیں جلال سے۔ کیا اس کے پیچھے کوئی بات ہے۔ کوئی خاص وجہ؟"

"وجہ تو سب کے سامنے ہے۔ اگر میں کہوں گی تو تمہیں غصہ لگے گا۔"

"لیکن مجھے لگتا ہے کہ اس کے علاوہ بھی کوئی بات ہے۔"

"سچی بات کہوں...... برا نہ ماننا...... حجاب نے جلال کا اعتماد ہی مجروح نہیں کیا ان کو مالی طور پر بھی لوٹا ہے۔"

"مالی طور پر؟"

"جی ہاں...... ان کے ابو انکل فیاض نے بہت پیسا کھایا ہے جلال سے۔ شادی سے پہلے بھی اور بعد میں بھی۔ واپسی کے لیے مسلسل جھوٹے وعدے کرتے رہے ہیں۔ جلال قانونی کارروائی کا ارادہ کر لیں تو چار دن کے اندر انکل فیاض پولیس کی کسٹڈی میں نظر آئیں گے۔"

ہادی کو ارم کی بات کا یقین نہیں آیا۔ اس نے تفصیل جاننا چاہی۔ پہلے تو وہ اِدھر اُدھر کی ہانکتی رہی، شاید اسے اندیشہ تھا کہ یہ راز افشائی اس کے لیے کوئی مشکل پیدا کرے گی۔ لیکن ہادی کے اصرار پر وہ بتانے پر آمادہ ہو گئی۔ اس کی باتوں سے ہادی پر انکشاف ہوا کہ نہ صرف حجاب کے والدین کا گھر گروی ہے بلکہ اس کے والد...... جلال کے پونے تین لاکھ یورو سے زیادہ کے مقروض ہیں اور مارک اپ ڈال کر یہ رقم اور بڑھ جاتی ہے۔

کسی کتاب میں پڑھا ہوا یہ فقرہ ہادی کے ذہن میں گھومنے لگا...... "داماد کے سامنے تو بیٹی والوں کے سر ویسے ہی جھکے ہوتے ہیں لیکن اگر بیٹی والے داماد کے مقروض بھی ہوں تو سر جھکانے والا یہ بوجھ کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔"

اس کے دل و دماغ میں ہلچل تھی۔ اب اسے اس سارے "دباؤ اور خوف" کی وجہ سمجھ زیادہ اچھے طریقے سے آنے لگی تھی جو جلال کے حوالے سے حجاب کے میکے میں موجود تھا...... وہ ابھی ارم سے کچھ اور سوال بھی پوچھنا چاہتا تھا مگر اس انکشاف کے بعد باقی سوال غیر اہم لگ رہے تھے۔

اس نے ویٹر کو بل کے لیے کہنے کے بعد ارم سے پوچھا۔ "مجھے ابھی تم سے کچھ اور ضروری باتیں کرنی ہیں۔ جلال آج کل کتنے بجے گھر لوٹتا ہے۔"

وہ گہری سانس لے کر بولی۔ "نو بجے کے قریب۔"

"اور جاتا کتنے بجے ہے؟"

"آٹھ بجے صبح۔" اس کے لہجے میں شکستگی تھی۔

"میں پرسوں صبح آٹھ اور رات نو بجے کے درمیان کسی بھی وقت تم سے فون پر رابطہ کروں گا۔ مجھے کوئی ایسا نمبر بتاؤ جو بالکل محفوظ ہو تمہارے لیے۔"

☆☆☆

حجاب کا برا حال تھا۔ پچھلے چوبیس گھنٹوں سے اس نے کچھ کھایا پیا نہیں تھا۔ رو رو کر اور پکار پکار کر اس کی آواز بیٹھ گئی تھی۔ اس نے کسی نوکرانی کا وہی بوسیدہ لباس پہن رکھا تھا جو جلال نے اسے مہیا کیا تھا۔ آج صبح اسے ناشتا دیا گیا تھا۔ یہ ناشتا لانے والی ہٹی کٹی کلثوم ہی تھی، تاہم اس نے "بیسمنٹ" کا دروازہ پوری طرح نہیں کھولا تھا۔ دروازے میں اندر کی طرح باہر کی طرف بھی "دروازے سے جھانکنے والی زنجیر" لگی ہوئی تھی۔ اس زنجیر کی وجہ سے دروازہ بہ مشکل چھ سات انچ تک ہی کھل سکا تھا۔ اس خلا میں سے کلثوم نے سوکھی روٹی، انڈے کا آملیٹ اور چائے کا کپ اندر کھسکا دیا تھا اور حجاب کی منت سماجت کی پروا کیے بغیر دروازہ فوراً بند کر دیا تھا۔ یہ ناشتا بارہ گھنٹے بعد بھی جوں کا توں پڑا تھا۔

"میں کیا کروں میرے اللہ...... یہ مجھے کن گناہوں کی سزا مل رہی ہے۔ مجھے معاف کر دے میرے مالک۔ مجھ پر رحم فرما۔ میرے ماں باپ پر رحم فرما۔" وہ تکیے میں سر دے کر گڑگڑائی۔

اسی دوران میں دروازے پر پھر آہٹیں سنائی دیں۔ وہ جلدی سے اٹھی اور دروازے کی طرف لپکی۔ اس بار بھی دروازہ پورا نہیں کھلا تھا۔ دوسری طرف کلثوم کا کرخت چہرہ دکھائی دیا۔ اس نے نیپکن میں لپٹی ہوئی روٹی، پانی کی بوتل اور سالن کی پلیٹ اندر کھسکا دی۔ اس میں آلو گوبھی کا سالن تھا۔ حجاب، کلثوم کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بلکی۔ "خدا کے لیے کلثوم! مجھے یہاں سے نکال لو۔ میری سانس بند ہو جائے گی۔ مجھ پر رحم کرو کلثوم۔"

وہ روکھے پن سے بولی۔ "میرے سامنے ہاتھ جوڑ کر مجھے گناہ گار کیوں کرتی ہو باجی، ہاتھ جوڑنے ہیں تو ان کے سامنے جوڑو جن کی عزت خراب ہوئی ہے آپ کی وجہ سے۔ جو لوگوں کے طعنے سن رہے ہیں۔"

"میں نے کچھ نہیں کیا کلثوم۔ میں بے گناہ ہوں۔ مجھ پر بہتان باندھے جا رہے ہیں۔ تم تو ایک عورت ہو۔ عورت

کو پہچانتی ہو۔ کیا تمہیں لگتا ہے، میں کچھ ایسا کر سکتی ہوں؟"
"کسی کے ماتھے پر کچھ نہیں لکھا ہوتا باجی...... آپ اس بندے سے ہوٹلوں میں ملتی رہی ہیں۔ ان کے کیمرے میں سے آپ کی غلط تصویریں نکلی ہیں۔"
"کوئی غلط تصویریں نہیں ہیں کلثوم۔ صرف بازار میں اتاری ہوئی ایک تصویر ہے، جو اس نے مجھے بتائے بغیر اتاری تھی اور کچھ نہیں ہے کلثوم...... کچھ بھی نہیں ہے۔" آخری تین چار الفاظ وہ اتنے زور سے بولی کہ اس کے گلے کی رگیں پھول گئیں۔ اتنی کوشش کے باوجود اس کی بیٹھی ہوئی آواز بہ مشکل کلثوم کے کانوں تک پہنچی ہوگی۔
"ماں باپ سے سگا اور کوئی نہیں ہوتا باجی! جب تمہارے ماں باپ کے پاس تمہاری صفائی نہیں ہے تو اور کسی کے پاس کیا ہوگی۔ سب کہہ رہے ہیں کہ تمہارے میکے والوں نے تمہیں دھکے دے کر گھر سے نکال دیا ہے۔"
"یہ سب غلط ہے...... سب جھوٹ ہے۔ رائی کے پہاڑ بنائے جا رہے ہیں۔ مجھے کسی نے دھکے نہیں دیے...... اور...... میں نے کوئی گناہ بھی نہیں کیا۔"
"باجی! تمہاری گناہ گاری یا بے گناہی کا فیصلہ تو تمہارے سر کے سائیں نے کرنا ہے۔ مجھے بتانے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ میں تو حکم کی بندی ہوں۔ میں تو بس اتنا کہہ سکتی ہوں کہ کھانا کھالو اور حوصلہ رکھو۔ پہلے بھی تو "حوصلے والے کام" کیے ہی ہیں نا تم نے۔"
"خدا کے لیے کلثوم! مجھے کوئی فون لا دو۔ میں جلال سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ وہ مجھے ویسے مار دیں...... اس طرح کمرے میں بند نہ کریں۔ میں گھٹ گھٹ کر مر رہی ہوں۔"
"میں ایسا نہیں کر سکتی۔ انہوں نے جب آنا ہے خود ہی آنا ہے۔" اس نے خشمگیں انداز میں کہا اور حجاب کے چہرے کے سامنے دروازہ جھٹکے سے بند کر دیا۔ حجاب ہذیانی انداز میں پھر چلانے لگی۔ دروازے پر دوہتھڑ مارنے لگی۔ اس کی بچی کھچی چوڑیاں بھی ٹوٹ گئیں۔ یہ کمرا جیسے تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی دیواریں موت کی پرچھائیوں کی طرح حجاب کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ وہ کھینچ کھینچ کر سانس لینے لگی۔ وہ ہمیشہ بند جگہوں سے خوف کھاتی تھی۔ بچپن میں ایک دفعہ والدہ نے کسی بات پر سرزنش کے طور پر اسے باتھ روم میں بند کر دیا تھا اور خود اپنے کام سے چھت پر چلی گئی تھیں۔ اس نے رو رو کر برا حال کر لیا تھا۔ بے ہوش ہونے کے قریب ہو گئی تھی۔ اس کی زبان پر صرف ایک ہی نام تھا۔ "ابوجی...... ابوجی۔" اور ابوجی نے اس کی پکار سن لی تھی۔
انہوں نے اسے باتھ روم سے نکالا تھا۔ گود میں اٹھایا تھا۔ اس واقعے کے بعد ابو کئی دن امی سے سخت خفا رہے تھے۔
آج ان جاں گسل لمحوں میں اسے نجانے کیوں پھر ابو جی یاد آئے۔ وہ دل ہی دل میں انہیں پکارنے لگی۔ "ابوجی...... میری مدد کو کوئی نہیں آ رہا۔ کوئی مجھے اس تاریکی سے نہیں نکال رہا۔ آج پھر میری جان پر بن گئی ہے ابوجی...... مجھے یہاں سے نکال لیں۔ ورنہ پھر کبھی میری صورت نہ دیکھ سکیں گے۔ آپ نے کبھی مجھے اتنا رونے نہیں دیا تھا۔ آج کیوں میرا رونا نہیں سن رہے۔ کیوں آپ بھی منہ پھیر کر کھڑے ہو گئے ہیں؟ اپنی بیٹی پر اعتماد نہیں رہا۔ اپنے خون پر شک کرنے لگے ہیں؟ ایسا نہ کیجیے ابوجی۔ آپ ہی نے تو کہا تھا آپ کبھی میری انگلی نہیں چھوڑیں گے۔ میں دادی اماں بن جاؤں گی تب بھی نہیں۔ میں ابھی دادی اماں نہیں بنی۔ ابھی ماں بھی نہیں بنی۔ ابھی میں نے جینا بھی شروع نہیں کیا۔ میں مر رہی ہوں۔ کیا آپ مجھے مرنے دیں گے۔ اسی طرح بے بسی سے......؟"
اچانک اسے محسوس ہوا کہ دروازے کی طرف آنے والے زینوں پر پھر آہٹ ہوئی ہے کوئی نیچے اتر رہا ہے شاید۔ کون ہو سکتا تھا۔ اس کے ابوجی؟ جو اپنے ناتواں جسم کو گھسیٹتے ہوئے یہاں پہنچ گئے تھے۔ اس کا بھائی فیصل جسے اپنی پیاری باجی کی پکار کھینچ لائی تھی، یا پھر ڈاکٹر انکل عطا جو اسے بیٹیوں کی طرح ہی چاہتے تھے...... یا پھر ماموں جو بیمار رہتے تھے۔ وہ سراپا سماعت بن گئی۔ وہیں لیٹی لیٹی امید بھری نظروں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ کوئی دروازے پر پہنچا۔ آہٹ ہوئی۔ پھر اندازہ ہوا کہ دروازے کو باہر سے مقفل کیا جا رہا ہے۔ تالا لگائے جانے کی آوازیں بڑی بے رحم تھیں۔ وہ ایک بار پھر دروازے پر پہنچ گئی۔ آہ و بکا کرنے لگی۔ مگر سننے والے کان تو شاید بہرے ہو چکے تھے۔ آنے والا سیڑھیاں چڑھ کر واپس چلا گیا۔
وہ گٹھڑی سی بن کر کروٹ کے بل پھر دروازے کے پاس ہی لیٹ گئی۔ سانس کی آمد و رفت مشکل سے مشکل تر ہوتی جا رہی تھی۔ ہاتھ پاؤں سن ہو رہے تھے۔ شاید وہ مر رہی ہے، اس نے سوچا۔ دماغ پر دھند چھانے لگی۔ اسے لگا کہ وہ فرش سے اٹھ کر آہستہ آہستہ ہوا میں معلق ہو رہی ہے۔ ایک تاریک اور سرد ہوا میں۔ اس پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ پتا نہیں وہ کب تک اسی طرح پڑی رہی۔ دل کے کسی دور دراز گوشے سے صدا آ رہی تھی، اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا۔

وہ غنودگی اور بیداری کی کوئی درمیانی کیفیت تھی۔ یہ خواب نہیں تھا۔ یا شاید جاگتی آنکھوں کا خواب تھا۔ اس کے غنودہ تصورات نے اسے ایک عجیب منظر دکھایا۔ اسے لگا کہ دروازے کا قفل کھلا ہے۔ پٹ وا ہوئے۔ اس کے ابو اندر داخل ہو گئے۔ سفید براق لباس میں۔ سفیدی مائل بال سلیقے سے پیچھے کی طرف جمے ہوئے، آنکھوں پر عینک کی چمک، دبلا پتلا سینہ مگر تنا ہوا اور شانے سیدھے۔ وہ مستحکم قدموں سے چلتے اس کے پاس آئے۔ جھک کر اس کا ماتھا چوما اور بڑی آسانی سے اسے گود میں اٹھا لیا۔ اسے اسی طرح اٹھائے اٹھائے وہ باہر نکلے۔ کلثوم دم بہ خود کھڑی رہی۔ جلال کے گارڈز نے بھی آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اسے لے کر گھر کے وسیع لان کی طرف بڑھے۔ وہاں سے لوگوں کی آوازوں کی بھنبھناہٹ سنائی دے رہی تھی۔ شاید سیکڑوں لوگ جمع تھے۔ ابو نے اس کے کان میں کہا۔ "جو کچھ دل میں ہے کہہ دو۔ بلند آواز سے کہہ دو۔ کسی سے ڈرنا نہیں۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ بوڑھا ہوں مگر بے ہمت نہیں ہوں میری بچی۔"
اور واقعی اس میں ایک عجیب توانائی بھر گئی۔ اس کے سینے میں مدتوں سے جکڑی ہوئی صدائیں اس کی آواز بن کر اس کے ہونٹوں سے نکلنے کے لیے بے تاب ہو گئیں...... ابو نے اسے اتارا اور وہ اپنے پاؤں پر چلتے ہوئے آگے بڑھنے لگی۔ وسیع لان کھچا کھچ بھرا تھا۔ ایک بہت بڑے سنہری اسٹیج پر ایک نورانی صورت والے بزرگ منقش کرسی پر بیٹھے تھے۔ ان کی سیدھی سفید ڈاڑھی ان کے سینے پر لہرا رہی تھی، ان کے پہلو میں جلال بھی ایک شاندار کرسی پر براجمان تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ڈیجیٹل تسبیح تھی۔ حجاب کی نظر ہجوم کی اگلی صف پر پڑی۔ یہاں اس کے اور جلال کے کئی عزیز و اقارب موجود تھے۔ دائیں طرف جلال کا بڑا بھائی فیروز بیٹھا تھا۔ سرخ و سپید صفاچٹ چہرہ، نیکر اور بنیان پہنے ہوئے، ہاتھ میں وسکی کا جام تھا، دونوں اطراف میں نیم عریاں لڑکیاں تھیں۔
ہجوم دیکھ کر حجاب ذرا سا ٹھٹکی۔ ابو نے اس کے کندھے پر تھپکی دی۔ "میں یہاں ہوں، تمہارے ساتھ ہوں...... جاؤ۔"
اس کے قدموں کی لرزش جاتی رہی۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر چبوترے پر آ گئی۔ سفید براق ڈاڑھی والے بزرگ نے کہا۔ "ہاں بیٹی! تم اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتی ہو؟"
"ہاں محترم بزرگ۔" وہ صاف توانا آواز میں بولی۔ "لیکن پہلے اس شخص کو اسٹیج سے اتاریں اور اس شخص کے برابر بٹھائیں جو اگلی صف میں دائیں طرف بیٹھا ہے۔"
"کیا مطلب؟ یہ تو جلال الدین ہیں۔ روم کی مسلم کمیونٹی کے ایک معزز شخص۔"
"لیکن میری شرط یہی ہے محترم بزرگ۔ میں تب ہی کچھ بولوں گی جب یہ اسٹیج سے اتر کر اپنے بھائی کے پاس بیٹھے گا۔"
کچھ بحث و تمحیص کے بعد جلال کو اسٹیج سے نیچے اترنا اور بھائی کے پہلو میں بیٹھنا پڑا۔
حجاب بلند آواز میں بولی۔ "محترم بزرگ! میرے شوہر جلال کو دوسری شادی کا حق تھا مگر عیاشی کا حق نہیں تھا۔ اس نے شادی کی رعایت کو صرف اور صرف اپنی عیش و عشرت کے لیے استعمال کیا ہے اور اس سلسلے میں ہر اسلامی ہدایت کو نظر انداز کیا ہے۔"
محترم بزرگ بولے۔ "لیکن بیٹی! اگر یہ شخص شادی کرنے کے بعد دونوں بیویوں میں مساوات برقرار رکھ رہا ہے تو پھر اعتراض کی گنجائش کم رہ جاتی ہے۔"
"یہی تو بات ہے محترم بزرگ۔" وہ دلیری سے بولی۔ "اس نے جن ہدایات کو نظر انداز کیا ہے ان میں یہ مساوات اور انصاف والی شرط بھی ہے۔ اس سے پوچھیں یہ دونوں بیویوں میں صرف برائے نام مساوات بھی کتنے دن قائم رکھ سکا ہے۔ اس سے پوچھیں میرے محترم۔ ایک مہینے کے اندر اندر اس نے اس مساوات کا حلیہ بگاڑ دیا۔ تین دن میری طرف تین دن دوسری بیوی کی طرف۔ یہ کتنے روز اس طریقے پر چل سکا ہے۔ بس اس کا ظرف ہی اتنا تھا۔ اس نے اس مساوات کی ایک جانب تھپڑ اور ٹھوکریں رکھ دیں اور دوسری طرف محبتیں اور نوازشیں۔"
"کیا ایسا ہوا جلال الدین؟" محترم بزرگ نے پوچھا۔
جلال نے کھڑے ہو کر کچھ کہنا چاہا لیکن اس کی آواز پھنس گئی۔ اس کے گلے میں کھانسی کا پھندا سا لگ گیا۔ وہ بولے بغیر بیٹھ گیا۔
حجاب بے باکی سے بولی۔ "یہ جھوٹا ہے محترم بزرگ، ہر لحاظ سے جھوٹا ہے۔ اس نے اپنی تفریح طبع کے لیے دوسری شادی کی ہے اور ہو سکتا ہے کہ تیسری بھی کرے، جس طرح اس کے پیر طریقت صاحب نے تین شادیاں کر رکھی ہیں۔ یہ منافق لوگ ہیں محترم بزرگ۔ ان کی زبان پر کچھ دل میں کچھ ہوتا ہے۔ میرے شوہر جلال کو ہی لیں۔ یہ

بار بار کہتا ہے کہ مومن کے لیے دنیا ایک قید خانہ ہے، اس کی اصل زندگی تو آخرت میں شروع ہوگی۔ اس کا اصل زندگی پر بھروسا نہیں ہے محترم بزرگ۔ اگر ہوتا تو پھر شاید اس کی موجودہ زندگی میں قید خانے کی زندگی والی جھلک ہوتی۔ اس سے پوچھیں محترم بزرگ۔ یہ کیسا قید خانہ ہے جس میں بہترین لذتیں اور راحتیں بھی موجود ہیں۔ بے شمار دولت بھی ہے اور مزید دولت کی شبانہ روز ہوس بھی ہے۔ اگر یہ قید خانہ ہے تو پھر اس دنیا کی نارمل زندگی کیا ہوگی؟"

محترم بزرگ نے جلال سے مخاطب ہوکر پوچھا۔

"کیا تم ایسی بات کہتے رہے ہو؟ اور اس حقیقت کو سمجھتے ہو کہ مومن کے لیے دنیا ایک قید خانہ ہے؟"

جلال نے کھڑے ہوکر بولنا چاہا مگر آواز ایک بار پھر گلے میں اٹک کر رہ گئی۔ شدید کھانسی کے سبب وہ دہرا ہوگیا اور بیٹھ گیا۔

حجاب کی آواز کچھ اور بلند ہوگئی۔ وہ گرج کر بولی۔

"یہ کہتا رہا ہے محترم بزرگ اور ایسی اور بھی بہت سی باتیں کہتا ہے جن پر عمل نہیں کرتا۔ اس کا دنیا دار بھائی فیروز بدنام ہے لیکن حقیقت میں شاید فیروز میں اور اس میں کچھ زیادہ فرق نہیں۔ فیروز شراب پیتا ہے، یہ شراب نہیں پیتا لیکن اسے دولت اور اختیار کا نشہ ہے۔ فیروز دنیا کے بہترین کھانے کھا کر کام و دہن کی لذت حاصل کرتا ہے، یہ بھی اس میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتا۔ بظاہر یہ حرام حلال کی تمیز رکھتا ہے لیکن گہرائی سے دیکھا جائے تو اسے بھی کوئی تمیز نہیں۔ فیروز جدید فیشن کے کپڑوں پر ماہانہ ہزاروں خرچ کرڈالتا ہے۔ یہ شلوار قمیص اور شیروانی ہی اتنی مہنگی بنواتا ہے کہ حساب برابر ہوجاتا ہے۔ فیروز نت نئی عورتوں کے ساتھ وقت گزارتا ہے، اس نے ایک خاص دائرے میں رہ کر یہ سہولت حاصل کرنے کا تہیہ کیا ہوا ہے، مجھے کہنے دیجیے کہ یہ اور اس جیسے لوگ نکاح کو آڑ بنا لیتے ہیں۔ فیروز دنیا میں گھومتا پھرتا ہے، سیر سپاٹے پر لاکھوں خرچ کرتا ہے۔ اس نے اور اس کے پیر صاحب نے تبلیغی دوروں کی آڑ میں یہ شوق پورا کیا ہوا ہے۔ آپ غور سے دیکھتے چلے جائیں میرے محترم بزرگ! آپ کو ان دونوں میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آئے گا اور دنیا...... دنیا پھر بھی اس بے چارے کے لیے ایک قید خانہ ہے...... یہ قیدی نہیں ہے بزرگوار! قیدی تو میں ہوں۔ یہ تو داروغہ ہے۔"

"داروغہ ہے؟ کیا مطلب؟"

"یہ اس قید خانے کا داروغہ ہے جس کو یہ گھر کہتا ہے اور جس کو بیوی کہتا ہے وہ قیدی ہے۔ اس جیسے لوگ نکاح کے بول پڑھوانے کے بعد اپنا حق سمجھتے ہیں کہ اپنی بیوی کو اپنی مرضی سے جینے پر مجبور کردیں۔ یہ چاہتے ہیں اس کا ماضی یکدم ناپید ہوجائے، اس کا حال اور مستقبل صرف صرف ان کے گرد گھومے۔ وہ روئے تو ان کے لیے، ہنسے تو ان کی اجازت سے۔ یہ قیدی اور داروغہ کا رشتہ نہیں تو کیا ہے محترم بزرگ! یہ مارتے ہیں اور رونے بھی نہیں دیتے۔ میں نے بھی بس تھوڑا سا رونے کی جسارت کی تھی۔ چند دن اپنے داروغہ کی مرضی کے بغیر کھلی ہوا میں سانس لیا تھا۔ میں مانتی ہوں یہ بھی میری غلطی تھی۔ لیکن میں گناہ گار نہیں ہوں جناب! میری یہ سزا نہیں ہے جو مجھے دی جارہی ہے...."

اچانک حجاب نے دیکھا کہ جلال اپنی جگہ سے کھڑا ہوا۔ وہ بول نہیں پا رہا تھا مگر اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ وہ دیوانہ وار حجاب کی طرف آیا۔ اسٹیج کی سیڑھیاں چڑھ کر حجاب پر جھپٹا۔ اس کے ہاتھ میں لمبے چمکدار پھل کا چاقو تھا۔ حجاب کے والد سینہ تان کر اس کے سامنے آگئے۔ بیٹی کے سامنے دیوار بن گئے۔ اسٹیج پر موجود لوگوں نے جلال کو روکنے کی کوشش کی مگر وہ طیش سے دیوانہ ہورہا تھا۔ اس کے مسلح گارڈز بھی اسٹیج پر چڑھ آئے۔ انہوں نے اس کی مدد کی۔ لوگ تتر بتر ہوگئے۔ جلال نے پہلا وار حجاب کے سینے پر کیا جو اس کے ابو نے اپنے کمزور جسم پر جھیلا۔ پھر دوسرا، پھر تیسرا وار ہوا۔ اس کے ابو گر گئے۔ دھکا لگنے سے وہ بھی کئی فٹ اونچے اسٹیج سے نیچے جا گری۔ اس کی سانس اکھڑنے لگی۔ اسے لگا وہ مر رہی ہے...... اوپر اسٹیج پر کہرام سا مچا ہوا تھا۔ جلال نیچے آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کسی بھی وقت وہ اسٹیج سے اتر کر اس کا پیٹ چاک کرسکتا تھا یا پھر اس کی گردن پر پاؤں رکھ کر اس کی سانس کی ڈور توڑ سکتا تھا۔ اس کے ابو نہیں تھے، اب اسے کس نے بچانا تھا۔ اب کوئی نہیں تھا...... کوئی نہیں تھا۔ لیکن یہ کیا تھا؟ اس نے ڈوبتی نظروں سے دیکھا۔ دور ایک سایہ سا حرکت کر رہا تھا۔ حجاب کو لگا وہ اس کی مدد کرنا چاہ رہا ہے۔ مدد کے لیے آرہا ہے۔ وہ کون تھا؟ وہ کون تھا؟

☆☆☆

ہادی سخت بے چین تھا۔ اسے کچھ معلوم نہیں ہو پارہا تھا کہ حجاب کہاں اور کس حال میں ہے۔ کوشش کے باوجود وہ شریفاں سے رابطہ نہیں کرسکا تھا۔ حجاب کے والدین کے گھر میں بھی اس کا فون سنا نہیں گیا تھا۔ فیصل نے کال ریسیو کی تھی اور اس کی آواز سنتے ہی فون بند کردیا تھا۔ گلزاری کی زبانی

ہادی کو صرف اتنا معلوم ہوا تھا کہ شریفاں کو ورس والے گھر سے واپس نئے گھر بھیج دیا گیا ہے اور ورس والے گھر میں چوکیدار کے علاوہ ایک نیا گارڈ بھی بھیج دیا گیا ہے۔

حجاب کے ساتھ جو کچھ بھی ہورہا تھا اس میں ہادی کا اہم کردار تھا۔ کبھی کبھی تو وہ عرق ندامت میں ڈوب جاتا تھا۔ اس کی غلطیوں میں تصویر والی غلطی بھی شامل تھی۔ وہ حجاب سے عشق کرنے لگا تھا...... یہ بڑا انوکھا سا عشق تھا اور وہ جانتا تھا کہ عشق صرف حاصل کرنے کا ہی نام نہیں ہے۔ عشق کسی کے لیے اپنی خواہشات کو یکسر قربان کرنے کا نام بھی ہے۔ حجاب کو مصائب سے نکالنے کے لیے وہ اپنی سی ایک کوشش کرنا چاہتا تھا۔ ایک بھرپور کوشش۔ اس کوشش کے لیے حوصلہ درکار تھا اور یہ حوصلہ حجاب سے ہوجانے والی والہانہ محبت، اسے مہیا کرچکی تھی۔ آج وہ ایک خاص ارادے کے ساتھ ہوٹل سے نکلا تھا۔

احتیاطاً اس نے ڈپٹی ہاشم ایرک کے ماتحت تھامس کو اپنے ساتھ لے لیا۔ تھامس ایک سفید ڈاٹسن گاڑی میں تھا اور وردی کے بجائے سادہ لباس میں تھا۔ یہ سہ پہر پانچ بجے کا وقت تھا۔ وہ جلال کے وسیع و عریض ڈپارٹمنٹل اسٹور پر پہنچے۔ ہادی براہِ راست جلال کے دفتر میں جاتا اور اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔ پروگرام یہی تھا کہ وہ اور تھامس علیحدہ علیحدہ اسٹور میں داخل ہوں گے۔ تھامس اسٹور کے گراؤنڈ فلور پر ونڈو شاپنگ کرتا رہے گا اور ہادی، جلال کے دفتر میں چلا جائے گا۔

مگر جب وہ اسٹور پہنچے، تو پروگرام تبدیل ہوگیا۔ ہادی نے دور ہی سے جلال کی دیوہیکل "ہمر" جیپ کو اسٹور سے نکلتے دیکھا۔ اسے اندازہ ہوا کہ زرق برق لباس میں ارم بھی اس کے پہلو میں بیٹھی ہے۔

"میرا خیال ہے ہمیں ان کے پیچھے جانا چاہیے۔" ہادی نے انگلش میں تھامس سے کہا۔

تھامس نے اپنا نیم گنجا سر اثبات میں ہلایا اور ڈاٹسن وہیں روک دی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ دونوں ایک محفوظ فاصلہ رکھ کر "ہمر" جیپ کے پیچھے جارہے تھے..... قریباً آدھ گھنٹے بعد وہ ایک قریبی ساحل پر موجود تھے۔ آفس ٹائم ختم ہوچکا تھا سمندر کے کنارے رش تھا۔ نیلی پیلی چھتریوں تلے لوگوں کا ہجوم دکھائی دیتا تھا۔ یہاں زیادہ تر فیملیاں ہی تھیں۔ ہادی اور تھامس پارکنگ کے قریب گاڑی میں ہی بیٹھے رہے۔ جلال اور ارم گاڑی سے نکل کر ریت پر چہل قدمی کرنے لگے۔ بحیرۂ روم کا نیلگوں پانی ڈوبتے سورج کی کرنوں میں چمک رہا تھا۔ ہادی دور سے ان دونوں کی چہل قدمی کا نظارہ کرنے لگا۔ ارم کے چہرے کا نچلا حصہ یعنی ٹھوڑی اور ہونٹ وغیرہ چادر کے نقاب میں تھے، باقی حصہ نظر آرہا تھا۔ وہ ایک چغہ نما لبادہ پہنے ہوئے تھی۔ وہ قدرے خاموش تھی مگر جلال اچھے موڈ میں دکھائی دے رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ ارم کا موڈ بحال کرنے کے لیے اسے یہاں لایا ہے (ارم کے موڈ کی خرابی کا تعلق غالباً اسی تہلکہ خیز ملاقات سے تھا جو کل اس کے اور ہادی کے درمیان شاتزا کے گمنام کیفے میں ہوئی تھی)۔

ان دونوں نے کولڈ ڈرنکس لیں اور چپس وغیرہ کھائے۔ کچھ دیر بعد ارم کا موڈ بھی بہتر نظر آنے لگا۔ ہمیشہ سنجیدہ نظر آنے والا جلال بات بات پر ہنس رہا تھا۔ کسی وقت وہ تھوڑی سی شوخی کا مظاہرہ کرتا تھا اور ارم کے پہلو میں چلتے چلتے اسے اپنے ساتھ بھی لگا لیتا تھا۔ اس دوران میں ارم کے پاؤں میں کوئی چیز چبھ گئی۔ وہ غالباً ننگے پاؤں تھی۔ وہ ریت پر بیٹھ گئی، جلال بھی بے تکلف بیٹھ گیا اور اس کا پاؤں گود میں رکھ کر اس کا تلوا دیکھنے لگا۔ ان لمحوں میں وہ کوئی عاشق نوجوان ہی دکھائی دیا۔

ہادی ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

جلال اور ارم کی واپسی سورج ڈوبنے سے چند منٹ پہلے ہوئی۔ ہادی اور تھامس کی گاڑی ایک بار پھر "ہمر" جیپ کے پیچھے تھی۔ جلال سے ملاقات کا آج تو کوئی امکان نظر نہیں آرہا تھا۔ قرائن سے یہی لگتا تھا کہ اب وہ دونوں سیدھے گھر جائیں گے، مگر ایسا ہوا نہیں۔ راستے میں ایک جگہ درختوں کے نیچے اچانک جلال نے گاڑی روکی۔ قریب ہی ایک اسلامک کلچرل سینٹر نظر آرہا تھا۔ یہ دراصل ایک ترک مسجد تھی لیکن اس کے مینار وغیرہ نہیں تھے۔ وہ مسجد کے اندر چلا گیا۔ یقیناً مغرب کی نماز ادا کرنے گیا تھا۔ ارم وہیں گاڑی میں بیٹھی رہی۔ ہادی نے چند لمحے سوچا پھر وہ بھی گاڑی سے نکل کر مسجد میں چلا گیا۔ بڑی خوب صورت جگہ تھی۔ قیمتی قالین بچھے تھے۔ جدید آڈیو سسٹم تھا۔ ایک جانب شیشے کے ایک چوکور کمرے میں کمپیوٹرز، سی ڈیز اور دینی کتب کا ذخیرہ دکھائی دے رہا تھا۔ باجماعت نماز تو ہوچکی تھی، جلال آخری صف میں کھڑا اپنی نماز پڑھ رہا تھا۔ اس کے انداز میں ٹھہراؤ کے بجائے عجلت اور بے دھیانی کی سی کیفیت دکھائی دیتی تھی۔

ہادی نے بھی وضو کرکے فرض ادا کیے۔ اسی دوران میں جلال باہر جانے کے لیے تیار نظر آنے لگا۔ اس نے ابھی

تک ہادی کو دیکھا نہیں تھا۔ ہادی قالین پر اس کے سامنے جا کر بیٹھ گیا تو وہ ششدر رہ گیا۔ اس نے آنکھیں سکیڑ کر ہادی کو دیکھا۔ جیسے یقین کرنے کی کوشش کر رہا ہو کہ یہ ہادی ہی ہے۔ "السلام علیکم جلال صاحب۔" ہادی نے مستحکم لہجے میں کہا۔

وہ سلام کا جواب دینا بھی بھول گیا۔ شیروانی کے براؤن کالر کے اوپر اس کا بھرا بھرا چہرہ سرخ ہوتا جا رہا تھا۔ عجیب انداز میں بولا۔ "تم...... ابھی تک گئے نہیں ہو یہاں سے؟"

"بس جانے ہی والا ہوں جلال صاحب! آپ سے ایک ملاقات کے لیے رکا ہوا تھا۔"

"ملاقات؟ کس لیے ملاقات؟" جلال کا چہرہ مزید سرخ ہو گیا۔

"میں جانتا ہوں، میری اس طرح کی بے وقت مداخلت آپ کو بری لگی ہے۔ میں اس کے لیے معذرت چاہتا ہوں۔ میں آپ کا زیادہ ٹائم نہیں لوں گا۔"

جلال نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے اپنے ہونٹ مضبوطی سے بھینچ رکھے تھے۔ آنکھوں میں ہیجانی سی کیفیت تھی۔ اس نے آلتی پالتی مار رکھی تھی۔ ہادی نے اس کے سامنے دوزانو بیٹھتے ہوئے کہا۔ "جلال صاحب! میں اللہ کے گھر میں بیٹھا ہوں، اللہ کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں آپ کی بیوی بالکل بے قصور ہیں۔ ان کی عزت پر کوئی چھوٹے سے چھوٹا داغ بھی نہیں ہے۔ ہاں اتنی غلطی ان سے ضرور ہوئی ہے کہ انہوں نے میرے ساتھ چند مونومینٹس کو وزٹ کیا۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے جلال صاحب...... کچھ بھی نہیں۔ میں...... آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں ان پر کوئی شک نہ کیجیے گا۔ میں ان کی صفائی میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔"

ہادی کے جسم میں لرزش تھی۔ جلال پتھر کا بت بنا بیٹھا رہا۔ اس نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔

ہادی نے کہا۔ "میں جانتا ہوں جلال صاحب! ایک تصویر کی بات کو آپ کے سامنے بہت بڑھا چڑھا کر بتایا گیا ہے۔ وہ تصویر میں نے ان کی بے خبری میں اتاری تھی۔ انہیں اس کی بالکل خبر نہیں تھی۔ یہ میری غلطی ہے میں اس کو تسلیم کرتا ہوں۔ آپ اس کے لیے مجھے جو سزا دینا چاہیں مجھے قبول ہے۔ لیکن خدارا! اس حوالے سے ان کو موردِ الزام نہ ٹھہرایئے گا۔ میں بس ایک دو روز میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ آپ کبھی میری صورت نہیں دیکھیں گے۔ اس حوالے سے تسلی رکھیے۔"

جلال اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ مجبوراً ہادی کو بھی کھڑا ہونا پڑا۔ جلال کے تیور اچھے نہیں تھے۔ اس نے کھردرے لہجے میں کہا۔ "تم کتنی بار یہاں سے جاؤ گے اور کتنی بار آؤ گے۔ دوسری بات مجھے یہ بتاؤ کہ میری بیوی کی صفائی دینے کے لیے تم سے کس نے کہا ہے۔"

"کسی نے نہیں کہا جلال صاحب! یہ میرے اندر کی سچائی ہے جو مجھے کھینچ کر......"

"بکواس بند کرو۔" جلال اتنے زور سے دھاڑا کہ مسجد کے در و دیوار لرز گئے۔ اِکا دُکا نمازی اب بھی مسجد میں موجود تھے، وہ چونک کر ان دونوں کی طرف دیکھنے لگے۔

"حرامزادے...... شیطان...... تیری جرأت کیسے ہوئی مجھ سے بات کرنے کی۔ تیری جرأت کیسے ہوئی۔" وہ دھاڑا اور نتائج سے بے پروا ہو کر ہادی پر پل پڑا۔ اس کا زوردار دھکا لگنے سے ہادی ایک ستون سے ٹکرایا اور اس کی آنکھوں میں تارے سے ناچ گئے۔ اس نے ہادی پر تھپڑ اور مکے برسانے کی کوشش کی۔ ہادی نے اپنا سر نیچے جھکا لیا۔ پھر بھی چند ضربات اس کو سہنا پڑیں۔ اس کا گریبان پھٹ گیا۔ لوگ بیچ میں کود پڑے۔ بپھرے ہوئے جلال کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگے۔ کسی نے پکار کر کہا۔ "یہ مسجد ہے بھائی صاحب! یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟"

جلال، ہادی کی طرف انگلی اٹھا کر گرجا۔ "تجھے کہا تھا نا چلا جا یہاں سے۔ تجھے کہا تھا نا۔ میں تیری جان لے لوں گا۔ میں تیری سانس کھینچ لوں گا۔"

ملی جلی آوازیں بلند ہوئیں۔ "یہ مسجد ہے، ایسا مت کریں یہاں۔"

جلال لپک لپک کر ہادی کی طرف آ رہا تھا۔ نمازیوں نے اسے سنبھالا ہوا تھا۔ اسی دوران میں ڈپٹی کا ماتحت تھامس بھی اندر آ گیا۔ اس نے ہادی کی طرف دیکھا، جیسے جلال کی طرف بڑھنے کی اجازت چاہ رہا ہو۔ "نہیں تھامس۔" ہادی نے کہا۔

کچھ لوگ ہادی کو گھیرے میں لے کر مسجد سے باہر لے آئے۔ ہادی کے منہ میں خون کا نمکین ذائقہ گھلا ہوا تھا۔ مسجد کے دروازے کے پاس اب بھی جلال کی دھاڑیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ بالکل "ہائپر" ہو رہا تھا۔ ہادی نے تھامس کو اشارہ کیا اور اس کے ساتھ ڈاٹسن گاڑی کی طرف آ گیا۔ اردگرد موجود لوگوں کا بھی ہادی کے لیے یہ مشورہ تھا کہ وہ گاڑی میں بیٹھ جائے۔ جھگڑے کی وجہ تو کسی کی سمجھ میں نہیں

آئی تھی مگر یہ ضرور پتا چل گیا تھا کہ یہ مزید خطرناک صورت اختیار کر سکتا ہے۔ چند سیکنڈ بعد ہادی اور تھامس وہاں سے رخصت ہو رہے تھے۔ "ہمر" جیپ کچھ فاصلے پر کھڑی تھی اور اس کے کھڑکیاں دروازے بند تھے۔ ہادی کے اندازے کے مطابق ارم اس جھگڑے سے بے خبر ہی رہی تھی۔

☆☆☆

رات کے دس بجے تھے۔ ہادی اپنے ہوٹل کے کمرے میں تھا۔ اس کے سینے میں ہلچل تھی۔ وہ جوابی طور پر جلال پر ہاتھ اٹھا سکتا تھا اور ایسا کرنے کی ہمت بھی رکھتا تھا لیکن نہ جانے کیوں اس نے ایسا کیا نہیں تھا۔ اسے یہ سب کچھ جھیلنا اچھا لگا تھا۔ حجاب کے حوالے سے لگنے والی ہر چوٹ اس کے تصورات میں ایک سنہری ستارے کی طرح چمکنے لگتی تھی۔

جلال سے ہونے والی اس سنگین ملاقات کے بعد یہ بات اچھی طرح ہادی کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ جلال اور حجاب کے معاملات "پوائنٹ آف نو ریٹرن" پر آ گئے ہیں۔ جلال میں کوئی معمولی سے معمولی لچک بھی ہادی کو دکھائی نہیں دی۔ اگر ایسا ہوتا تو شاید وہ اپنی "عزت بے عزتی" کو ایک طرف رکھ کر جلال کے شبہات دور کرنے کی ایک اور کوشش کرتا۔ جلال اس کی توقع سے زیادہ سنگلاخ اور کرخت ثابت ہو رہا تھا۔ وہ بہ ظاہر تو حجاب کو طلاق دینے پر آمادہ تھا مگر حقیقت میں اسے اپنی حبس بے جا میں رکھنے کا تہیہ کیے ہوئے تھا۔

ہادی کے ان خیالات کو اس وقت مزید تقویت ملی جب اگلی صبح اسے گلزار ی نے فون کیا۔ اس نے بتایا کہ کل اس کی ملاقات جلال کے ڈرائیور عثمان بٹ سے ہوئی ہے۔ بٹ کا کہنا ہے کہ درس والے گھر میں حجاب پر بڑی سختی ہو رہی ہے۔ دو تین دن پہلے اس سے ملازمہ شریفاں کا فون برآمد ہو گیا تھا۔ جلال نے پتا نہیں اس سے کیا مطلب لیا اور اس سے سخت مار پیٹ کی۔ ایک ملازمہ نے حجاب کے پھٹے ہوئے خون آلود کپڑے گھر کے غسل خانے میں دیکھے ہیں۔ کلثوم دن رات اس کی نگرانی کرتی ہے اور کسی کو اس سے ملنے کی اجازت نہیں۔

"اس کے گھر والوں کو بھی نہیں۔ میرا مطلب ہے میکے والوں کو؟" ہادی نے گلزار سے پوچھا۔

"وہ تو شاید ملنا ہی نہیں چاہتے۔ یا پھر ڈرتے ہیں۔ لگتا ہے کہ انہوں نے حجاب کو اس کے حال پر چھوڑ دیا ہے۔ اس کی والدہ کی طبیعت کافی خراب ہے۔ پھر بھی کسی نے اسے اس کی اطلاع نہیں دی۔ دینے کی کوشش ہی نہیں کی۔ بٹ کا کہنا ہے کہ کل رات درس والے گھر میں ایک اور گارڈ بھیج دیا گیا ہے۔ اب وہاں ایک چوکیدار اور دو گارڈز ہیں۔ شاید جلال صاحب کو کوئی خطرہ ہے۔"

ہادی سمجھ گیا کہ یہ اضافی گارڈ کل شام مسجد میں پیش آنے والے واقعے کے ردعمل کے طور پر بھیجا گیا ہے۔ حالات سنگین شکل اختیار کر رہے تھے۔

اب کوئی راست اقدام اٹھانے کی ضرورت مزید شدید ہو گئی تھی۔ اگلی صبح ہادی نے ڈاکٹر عطا سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ ڈاکٹر عطا صاحب، حجاب کے گھر والوں کے فیملی ڈاکٹر تھے اور حجاب فیصل وغیرہ انہیں ڈاکٹر انکل کہہ کر پکارتے تھے۔ چند دن پہلے ڈاکٹر عطا کے کلینک میں ہادی ان سے مل چکا تھا۔ اس نے ان سے نزلے بخار کی دوا لی تھی اور یہ بھی بتایا تھا کہ انکل فیاض نے اسے ان کا پتا بتایا ہے۔

ڈاکٹر عطا ہر لحاظ سے ہادی کو ایک نرم خو اور دانا بینا شخص لگے تھے۔ وہ ہادی کے ادبی ذوق سے بھی متاثر ہوئے تھے۔ آج ہادی ایک پروگرام لے کر ان کی طرف جا رہا تھا اور نہ جانے کیوں اسے یقین تھا کہ ڈاکٹر عطا اس کو اہمیت دیں گے۔

ڈاکٹر صاحب کا گھر کلینک کے ساتھ ہی واقع تھا۔ اتوار کے روز وہ صبح کے وقت چھٹی کرتے تھے۔ ہادی کو پتا تھا کہ وہ گھر میں ہی ہوں گے۔ ہادی نے ملازم کے ذریعے اپنے آنے کی اطلاع دی۔ قریباً دس منٹ بعد وہ عطا صاحب کے ساتھ ان کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا گرین ٹی پی رہا تھا۔ ان کی اطالوی وائف کو دس گیارہ بجے تک سونا تھا۔ عطا صاحب اکہرے بدن کے پچپن ساٹھ سالہ شخص تھے، عمر کے مقابلے میں صحت بہت اچھی تھی۔ ان کی بڑی بڑی آنکھوں میں نرم خوئی اور معاملہ فہمی کی جھلک بہت نمایاں نظر آتی تھی۔ اپنے طور اطوار سے وہ روشن خیال بھی لگتے تھے۔

چار پانچ منٹ کے اندر ہی ان کی باتوں سے ہادی کو اندازہ ہو گیا کہ وہ دلبلہ فیملی کی حالیہ مشکل سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ حجاب کس صورتِ حال سے گزر رہی ہے اور اس صورتِ حال میں ہادی کا جو کردار بیان کیا جا رہا ہے وہ اس سے بھی باخبر ہیں۔

اس سب کے باوجود وہ ان کے سامنے بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ ہادی کے حوالے سے وہ بدگمانیاں اور طیش ڈاکٹر عطا کے ذہن میں نہیں تھا جو انکل فیاض اور فیصل وغیرہ کے ہاں پایا جا رہا تھا۔ یا کم از کم یہ اس درجے کا نہیں تھا۔

ہادی نے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب! میں لمبی تمہید باندھنا نہیں چاہتا۔ آپ کے سامنے حلفیہ یہ بیان دیتا ہوں کہ میرے اور حجاب کے حوالے سے جو باتیں پھیلائی گئی ہیں ان میں ایک رائی کے دانے برابر بھی سچائی نہیں ہے۔ ہم دونوں اچھے دوستوں کی طرح چند بار ملے ضرور ہیں لیکن وہ بھی ایک فاصلے اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ۔"

وہ بڑی گہری نظروں سے ہادی کو دیکھتے رہے۔ ان کی نگاہیں جیسے ہادی کے اندر تک جا رہی تھیں۔ بہرحال حسبِ معمول دھیمے لہجے میں بولے۔ "کیا دونوں طرف ہی ایسا تھا؟"

"مم...... میں سمجھا نہیں جی۔"

"مجھے سو فیصد یقین ہے کہ تم حجاب کے متعلق جو کہہ رہے ہو وہ بالکل درست ہے لیکن کیا تم اپنے بارے میں درست کہہ رہے ہو۔ میرا مطلب ہے تمہارے دل میں حجاب کے لیے بس دوستی ہے؟"

ایک لمحے کے لیے وہ ٹپٹا گیا مگر پھر سنبھل کر بولا۔ "ڈاکٹر صاحب! حجاب میرے لیے ہمیشہ محترم رہی ہیں اور رہیں گی۔ میرے ذہن میں ان کے لیے کوئی نامناسب حوالہ آ ہی نہیں سکتا۔ یہ ناممکن ہے جناب۔"

وہ کچھ کہنا چاہتے تھے مگر پھر خاموش رہے۔ بس اسے دیکھتے رہے۔ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہے ہوں...... تم نے بات کو الفاظ کے غلاف میں لپیٹا ہے مسٹر ہادی! بہرحال آگے کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟"

ہادی نے چائے ختم کرنے کے بعد کہا۔ "ڈاکٹر صاحب! مجھے پتا نہیں کہ آپ میری اس بات کو کس انداز سے لیں گے، مگر میں پورے خلوصِ دل کے ساتھ اس مصیبت میں انکل فیاض کے ساتھ تعاون کرنا چاہتا ہوں۔"

"کس طرح کا تعاون؟"

"مالی تعاون ڈاکٹر صاحب۔ اور ایک بار پھر کہوں گا کہ پورے خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ۔ مجھے معلوم ہے کہ انکل فیاض اس وقت سخت مالی مشکلات میں ہیں۔ انہوں نے خالہ صوفیہ کے علاج اور فیصل کی شاپ کے لیے ایک بھاری قرض اٹھایا تھا، جو تا حال اتر نہیں سکا اور یہی قرض ہے جس کے سبب حجاب کی مصیبت میں بھی اضافہ ہوا ہے۔"

انہوں نے پھر اپنی آنکھیں ہادی کی آنکھوں میں گاڑ دیں۔ وہ گہرائی تک دیکھ رہے تھے۔ یہ فیصلے کا لمحہ تھا۔ آخر یوں لگا کہ ہادی کے اندر کی سچائی نے ان پر قرار واقعی اثر کیا ہے۔ وہ گہری سانس لے کر بولے۔ "کھل کر کہو، کیا کہنا چاہتے ہو؟"

وہ بولا۔ "ڈاکٹر صاحب...... پلیز...... میری بے لوثی پر شبہ نہ کیجیے گا۔ میں انکل فیاض کو قرضِ حسنہ کے طور پر کچھ رقم فراہم کرنا چاہتا ہوں۔ مگر مجھے معلوم ہے کہ وہ میرے حوالے سے بہت بدگمان ہیں۔ میری ایسی کوئی پیشکش انہیں قبول نہ ہوگی۔"

"ہوں۔" ڈاکٹر صاحب نے پُرسوچ انداز میں ہنکارا بھرا۔

"میں جانتا ہوں ڈاکٹر صاحب کہ انکل فیاض کے لیے رقم کا بندوبست کرنے کے سلسلے میں آپ بھی کوشش کر رہے ہیں۔ آپ کے ایک دو دوستوں نے تعاون کا وعدہ کیا ہے۔ آپ مجھے بھی ان میں شامل کر لیجیے۔ میں چاہتا ہوں کہ رقم کی فراہمی کے سلسلے میں میں سامنے نہ آؤں۔ یہ کام آپ کے توسط سے ہو جائے۔ آپ اس میں میرا کوئی ذکر نہ کریں اور میں اپنی بات دہراؤں گا۔ یہ قرضِ حسنہ ہوگا۔ وہ جیسے اور جب چاہیں اپنی سہولت کے مطابق لوٹا سکیں گے۔"

اگلے آدھ پون گھنٹے ڈاکٹر عطا اور ہادی کے درمیان اس معاملے میں تفصیلی گفتگو ہوئی۔ ہادی نے کہا کہ وہ اگلے پندرہ بیس روز کے اندر انہیں اپنے ذرائع سے قریباً 80 لاکھ روپیہ فراہم کر سکتا ہے۔

یوں لگتا تھا کہ ڈاکٹر عطا کی "معاملہ فہمی" نے ہادی کے دل و دماغ کو ٹٹول لیا ہے، وہ اس کی شرافت کے ساتھ ساتھ اس کے جذبے کی شدت اور سچائی کے بھی قائل ہو رہے ہیں۔ ان دونوں میں جلد ہی اعتماد کی فضا قائم ہو گئی۔ ڈاکٹر عطا نے ہادی کو قرضے کی مکمل تفصیل فراہم کی اور یہ بھی بتایا کہ کتنی رقم کا انتظام ہو چکا ہے۔ یہ دراصل پہلی قسط کا انتظام تھا جو قریباً 102800 یورو یعنی ایک کروڑ دس لاکھ روپے کے لگ بھگ بنتی تھی۔ لیکن اس میں بھی ابھی پینتیس چالیس لاکھ روپے کم تھے۔

ہادی نے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب! میں چاہتا ہوں کہ قسط کے بجائے پوری رقم ہی ان لوگوں کے منہ پر ماری جائے اور یہ معاملہ ختم کر دیا جائے۔ اس کے بعد سب کچھ حجاب پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ جلال سے Divorce چاہتی ہیں یا نہیں۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو ہادی مگر یہ کہنا آسان ہے، اس پر عمل خاصا مشکل ہے۔ میں نے تمہیں بتایا ہی ہے یہ مارک اپ وغیرہ ڈال کر سوا تین کروڑ روپے کے قریب بن جاتے ہیں۔ بہت کوشش کر کے ہم جو جمع کر سکے ہیں وہ پینسٹھ ہزار یورو یعنی ستر لاکھ کے لگ بھگ ہیں۔ اب اگر

تمہارے 80 لاکھ بھی جمع ہوجائیں تو یہ ڈیڑھ کروڑ کے قریب بن جائے گا۔ اس کے بعد بھی ہمیں لگ بھگ مزید ایک کروڑ اسی لاکھ کی ضرورت ہوگی۔"

ہادی نے تھوڑی ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "عطا صاحب! مجھے ایک بات بتائیں۔ یہ فیاض صاحب کا ذاتی معاملہ ہے لیکن اس حوالے سے ذہن میں سوال ضرور اٹھتا ہے۔ وہ جس مکان میں رہ رہے ہیں، میرے اندازے کے مطابق پاکستانی کرنسی میں چار، ساڑھے چار کروڑ کا تو ضرور ہے۔ کیا اسے بیچ کر کسی نسبتاً چھوٹے گھر میں رہنے کا خیال ان کے ذہن میں نہیں آتا؟"

ڈاکٹر عطا نے عینک کے شیشے صاف کرتے ہوئے کہا۔ "دراصل یہ مکان اکیلے فیاض کا نہیں ہے۔ اس میں پچاس فیصد حصہ فیاض کی بڑی بھاوج کا ہے اور وہ بڑی سخت گیر عورت ہے۔ وہ مکان فروخت کرنے پر راضی نہیں ہوئی۔ جب فیاض نے گھر کو گروی رکھا تھا تب بھی وہ بڑی مشکل سے تیار ہوئی تھی۔ وہ بھی اس لیے کہ تب اسے "رشتے داری" ہوجانے کی امید تھی۔ اس وقت تک فیاض کے بڑے بھائی بھی زندہ تھے۔"

"رشتے داری سے آپ کا کیا مطلب ہے؟"

"دراصل فیاض کی بڑی بھاوج خواہش رکھتی تھی کہ اس کی بیٹی کی شادی فیاض کے بیٹے فیصل سے ہوجائے۔ یہ فیاض کے لیے ممکن نہیں ہے اور نہ ہی شاید فیصل کے لیے۔ لڑکی نمرہ عمر میں بڑی ہے تقریباً اٹھائیس انتیس سال کی۔ ڈیل ڈول کی وجہ سے اس سے بھی زیادہ کی لگتی ہے۔ فیصل کو تو تم نے دیکھا ہی ہوگا۔ دونوں کا کوئی جوڑ ہی نہیں ہے۔ اس تنازعے کی وجہ سے دونوں گھرانوں میں کافی کھچاؤ ہے۔"

ہادی نے کہا۔ "ٹھیک ہے جناب! یہ بات تو سمجھ میں آرہی ہے لیکن اب جلال والے معاملے کا کیا کیا جائے۔ یہ بات تو اب تقریباً کلیئر ہے کہ حجاب اور جلال اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ حجاب علیحدہ ہوجانا چاہتی ہیں۔ یہ حقیقت بھی اب ہم سب جانتے ہیں کہ وہاں درس والے گھر میں حجاب بہت سختی کے دن گزار رہی ہیں۔ جلال انہیں کہہ چکا ہے کہ اگر وہ زیادہ تنگ ہے تو اس سے طلاق لے لے۔ اور یقیناً اب حجاب بھی یہی چاہتی ہوں گی۔ مگر انہیں یہ بھی اچھی طرح معلوم ہوچکا ہے کہ اس کے بعد ان کے گھر والے سخت مصیبت میں آجائیں گے۔ بات تو بالکل واضح ہے۔ حجاب کو آزادی اسی صورت میں مل سکتی ہے جب یہ قرض والا معاملہ ختم ہوگا۔"

"مگر کیسے؟؟ اہم سوال تو یہی ہے۔"

ہادی کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد پُرسوچ لہجے میں بولا۔ "آپ نے ابھی بتایا ہے کہ گجرات میں فیاض صاحب کی کچھ زمین ہے جو وہ بیچنا چاہ رہے ہیں...... اگر ہم کسی طرح اس کا کوئی گاہک پیدا کرسکیں تو صورتِ حال بہتر ہوسکتی ہے۔ آپ کا کیا اندازہ ہے، کتنے تک میں بک جائے گی وہ جگہ؟"

ڈاکٹر عطا بولے۔ "قیمت تو اس کی اسّی پچاسی لاکھ سے کم نہیں ہے، مگر فیاض ساٹھ ستّر تک بھی بیچنے کو تیار ہے۔ مسئلہ تو حقیقی خریدار کا ہے۔"

"عطا صاحب! آپ مجھے چھ سات روز کی مہلت دیں۔ میں اس سلسلے میں کوشش کرتا ہوں، آج کل میں جن کے لیے کام کر رہا ہوں، ہوسکتا ہے کہ وہ یہ رقبہ خریدنے پر آمادہ ہوجائیں۔ یا کسی اور کو آمادہ کرلیں۔"

"وہ بک بھی جائے گی ہادی، تو ہم زیادہ سے زیادہ 2 کروڑ دس بیس لاکھ تک پہنچ جائیں گے۔ میرا اندازہ تو یہی ہے کہ جلال کو اتنی بڑی رقم یکمشت ادا کرنا کافی مشکل کام ہے۔"

"مگر ہم ایک بھرپور کوشش تو کرسکتے ہیں عطا صاحب۔ آپ...... آپ مجھے ایک ہفتے کا ٹائم دیں۔ مجھے لگتا ہے کہ میں کچھ نہ کچھ کرسکوں گا۔ آپ بھی اپنے طور پر کوشش جاری رکھیے۔ ظاہر ہے کہ کچھ نہ کچھ فنڈ تو فیاض صاحب اور فیصل کے پاس بھی ہوگا۔ انشاءاللہ کوئی اچھی صورتِ حال سامنے آئے گی۔ مگر وہی پہلے والی گزارش میں ایک بار پھر آپ کے سامنے کرنا چاہتا ہوں۔ اس سلسلے میں میرا نام کہیں نہ آئے۔"

ڈاکٹر عطا اثباتی انداز میں خاموش رہے۔ یہ بات وہ بھی بڑی اچھی طرح سمجھ رہے تھے کہ جلال کے گھر میں حجاب کے لیے حالات دن بہ دن دگرگوں ہوتے جارہے ہیں اور اسے اس صورتِ حال سے نکالے جانے کی فوری اشد ضرورت ہے۔ اسے زبردستی نکالنا بے کار تھا اور اس نے نکلنا بھی نہیں تھا۔ وہ اپنے والدین کو مزید مشکلات میں ڈالنا نہیں چاہتی تھی۔ ان کی سلامتی و آسودگی کے لیے وہ بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار ہوچکی تھی۔ اب ایک ہی راستہ تھا۔ اسے اور اس کے والدین کو معاشی شکنجے سے نکالا جاتا۔

وہیں ڈاکٹر عطا صاحب کے پاس بیٹھے بیٹھے ہادی نے شیخو صاحب کو فون کیا۔ انہوں نے چھوٹتے ہی کہا۔ "اوئے قربان جاواں تیرے تے ہادی پیارے! ہلا کے رکھ دتا ہے تو نے مارکیٹ کو۔ مزہ آگیا تیری قسم۔ بس اب جلدی سے ایک البم کا میٹریل اور سٹ دے (چھیک دے) ہوائی ڈاک کے ذریعے۔ کوئی چودہ کے تیرہ گانے ہوجائیں۔"

"چلو شیخو بھائی! وہ بھی سٹ دیتا ہوں۔ پر آپ کو بھی کچھ پیسے اور سٹنے پڑیں گے۔ ضرورت آن پڑی ہے۔"

"اوئے کتنے پیسے...... پر فرمائش اتنی ہی کرنا جتنی میری پسلی ہے۔"

"آپ کی پسلی کافی بڑی ہے شیخو بھائی...... اور کافی سخت بھی ہے۔"

"اوئے اتنی سخت بھی نہیں ہے۔ پر میں کرلوں گا کچھ نہ کچھ۔ تو بس کوئی نئی چیز بھیج دے فٹافٹ۔ وہ کیا گانا لکھا تھا تو نے...... اک آخری فون کرلیں یارا...... ذرا ساجی اور مرلیں یارا۔ بس اس ٹائپ کی کوئی سپر ہٹ چیز لکھ بھیجتی ہے۔"

"ہوجائے گا شیخو بھائی! اس کے علاوہ ایک اور بات بھی ہے۔ گجرات کے علاقے میں زمین کا ایک ٹوٹا ہے۔ بڑی مناسب جگہ ہے۔ جلد ہی کسی نہ کسی اسکیم میں آجائے گی۔ سستے داموں مل رہی ہے۔ انویسٹمنٹ کرلیں۔ فائدے میں رہیں گے۔"

"یار ہادی! تو شاعر ہی رہ، پراپرٹی ڈیلر نہ بن۔ ورنہ مروا دے گا کہیں۔"

"شیخو بھائی! شاعر اور زمین کا گہرا تعلق ہے۔ ہر گیت غزل کی ایک زمین ہوتی ہے۔"

"ایک تو یار! تو ڈھاقیہ بڑا ہے۔ اچھا کس تھاں پر ہے یہ پلاٹ؟"

"یہ میں آپ کو شام کو بتاؤں گا۔ اور تھوڑی بہت ایڈوانس کی رقم بھی اپنے لیے۔"

"چلو پھر ٹھیک ہے، شام کو بات کریں گے۔" شیخو بھائی نے کہا۔

شیخو بھائی سے بات ختم کرکے ہادی پاکستان میں اپنے واقف پراپرٹی ڈیلر کا نمبر ملانے کی کوشش کرنے لگا۔ ایل ڈی اے اسکیم میں ہادی کا اپنا دس مرلے کا پلاٹ بھی تو تھا۔

☆☆☆

حجاب گھر کے نیم تاریک بیسمنٹ میں بند ہوکر رہ گئی تھی۔ ہر صبح یہ امید بندھتی تھی کہ وہ آج شام تک یہاں سے نکال لی جائے گی اور ہر شام یہ امید ٹوٹ جاتی تھی۔ یہاں اب اسے چھٹا دن تھا۔ یہ چھ دن چھ برسوں سے کم نہیں تھے۔ اس دوران میں اسے ایک بار بھی جلال کی شکل نظر نہیں آئی تھی۔ باہر کی دنیا سے اس کا واحد راستہ کلثوم ہی تھی۔

اب وہ بے بسی کی انتہا کو چھونے لگی تھی۔

یہ چھٹے روز کی شام کی بات ہے۔ حجاب وہیں دروازے کے پاس فرش پر ایک غالیچہ بچھائے لیٹی ہوئی تھی۔ اسے فاصلے سے گاڑی کا مدھم ہارن سنائی دیا۔ وہ چونک گئی۔ یقیناً یہ جلال کی "ہمر" جیپ ہی تھی۔ وہ یہاں آیا تھا۔ وہ ایک دم بے قرار ہوگئی۔ کچھ دیر اٹھ کر کمرے میں گھومتی رہی پھر دروازہ کھٹکھٹانے لگی۔ وہ ساتھ ساتھ کلثوم کو آوازیں دے رہی تھی۔ کلثوم تو جیسے بالکل بہری ہی ہوچکی تھی۔ اس کی کوئی منت سماجت سنتی ہی نہیں تھی۔ "کلثوم! ایک بار میری بات سن لو، صرف ایک بار...... کلثوم......"

اس کے اردگرد وہی سناٹا رہا جو آج کل دن رات اس کی جان کھا رہا تھا۔ وہ بے چینی اور ڈپریشن کی انتہا پر پہنچ گئی۔ وہ جلال کو آوازیں دینے لگی۔ "جلال...... جلال، میری بات سنیں۔ ایک بار میری بات سنیں۔" ساتھ ساتھ وہ دروازے پر دوہتڑ بھی مار رہی تھی۔ اس کے رونے چلانے کی آوازیں بیسمنٹ کی سنگلاخ دیواروں میں گونجنے لگیں۔

اور پھر بیسمنٹ کی سیڑھیوں پر بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ نیچے آرہا تھا۔ وہ بہ دستور اسے پکارتی رہی۔ دروازے کا لاک کھولا گیا۔ حسبِ معمول دروازہ چھ سات انچ تک کھلا اور دوسری طرف جلال کی صورت دکھائی دی۔ وہ شلوار قمیص اور ویسٹ کوٹ میں تھا۔ ہمیشہ کی طرح سیل فون اس کے ہاتھ میں تھا۔

وہ بے دم سی ہوکر گر پڑی۔ گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ "جلال! مجھے یہاں سے نکالیں۔ مجھے یہاں کیوں بند کردیا ہے...... کیوں کردیا ہے؟" وہ بلکتی سی آواز میں بولی۔

"اپنے سوال کا جواب ابھی تم نے خود ہی دے دیا ہے۔" جلال پھنکارا۔ "اس طرح چلاؤ گی تو پھر...... تمہارے منہ میں کپڑا بھی ٹھونسنا پڑے گا۔"

"میں کچھ نہیں کہوں گی جلال! اپنے ہونٹ سی لوں گی۔ لیکن پلیز مجھے اس طرح بند نہ کریں۔ میں گھٹ گھٹ کر مررہی ہوں۔"

"کچھ نہیں ہوگا تمہیں۔ میں جانتا ہوں بڑی سخت جان ہو اور اتنی ہی سخت دل بھی ہو۔ تمہاری جیسی عورتیں بہت کچھ جھیل سکتی ہیں۔"

"میں کیسی عورت ہوں۔ جلال! مجھے بتائیں...... میں نے کیا کردیا ہے۔ کیا آپ بھی دنیا کی باتوں میں......"

"بکواس بند کرو۔" وہ اتنے زور سے دھاڑا کہ دیواریں ہل گئیں۔ "اس بارے میں ایک لفظ منہ سے نہ

نکالنا۔ تمہیں پتا ہے...... تمہیں پتا ہے مجھ سے یہ جھوٹ برداشت نہیں ہوتا۔"

وہ سہم کر چپ ہوگئی۔ دروازے سے سر ٹکا کر سسکیاں لینے لگی۔ پھر آنسوؤں سے تر چہرہ اٹھا کر بولی۔ "پلیز...... مجھے اتنا تو بتادیں، امی کا کیا حال ہے۔ کہاں ہیں وہ؟"

وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔ "آنٹی کی طبیعت خراب ہوگئی تھی۔ انہیں اسپتال لے جانا پڑا تھا۔ مگر اب بہتر ہیں...... ہوسکتا ہے کہ ایک دو دن میں گھر آجائیں۔"

"پلیز جلال...... مجھے ایک بار ان سے ملادیں۔ میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ میں انہیں کچھ نہیں بتاؤں گی۔ ایک لفظ زبان سے نہیں نکالوں گی۔ آ...... آپ میرے ساتھ رہیے گا۔ میں بس پانچ منٹ ان کے پاس بیٹھ کر واپس آجاؤں گی۔"

"ابھی ایسی کوئی ضرورت نہیں۔ تم جہاں ہو بالکل ٹھیک ہو۔ تمہارے گوشت کی گری ذرا ٹھنڈی ہوجائے گی تو پھر دیکھیں گے۔"

اسے لگا اس کی سانس رک جائے گی۔ اس نے بیٹھے بیٹھے دروازے کی درز میں سے ہاتھ گزارا اور جلال کا پاؤں پکڑ لیا۔ سیاہ رنگ کی چمچماتی جوتی کو اپنے نازک ہاتھ میں تھامتے ہوئے بولی۔ "خدا کے لیے ایسا نہ کریں جلال! آپ جو کہیں گے میں وہی کروں گی۔ لیکن مجھے یہاں سے نکال لیں جلال۔"

وہ اپنی جگہ تنا کھڑا رہا۔ چہرے پر نرمی کی کوئی رمق نہیں تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک استہزائیہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ کٹیلے انداز میں بولا۔ "اسی لہجے میں بات کرو نا جیسے کیا کرتی تھیں۔ تمہارے اندر چنگاری تھی نا بغاوت کی۔ جو رہ رہ کر تمہارے اندر چنکارے مارتی تھی۔ اب چمکاؤ نا اسے۔ اب وہ کیوں نہیں بھڑک رہی، بتاؤ نا۔"

اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کے ریشمی بال مٹھی میں جکڑ لیے اور جھٹکا دے کر اس کا چہرہ اوپر اپنی طرف اٹھا دیا۔ وہ رونے کے سوا اور کچھ نہ کرسکی۔ جلال کی گرفت اتنی سخت تھی کہ اس کے بالوں کی جڑیں اکھڑنے لگیں۔ وہ آنسو بہاتے ہوئے بولی۔ "اف جلال! مجھے درد ہورہا ہے۔ پلیز چھوڑ دیں۔"

وہ اور زور سے پکڑتے ہوئے بولا۔ "میرے سوال کا جواب دو۔ اس چنگاری کا ذکر تم نے خود ہی کیا تھا اور میرا خیال ہے کہ وہ چنگاری تم جہیز میں اپنے ساتھ لے کر آئی تھیں۔ اب کہاں ہے وہ؟"

وہ تکلیف کی شدت سے بری طرح کراہنے لگی۔ اس کی گردن ایک طرف مڑی ہوئی تھی۔ اس کے لرزاں ہاتھ جلال کی کلائی پر تھے۔ جیسے وہ خود کو چھڑانے کی کمزوری کوشش کررہی ہو۔ اس میں اتنی سکت ہی نہیں تھی کہ جواب میں کچھ کہہ سکے۔ جلال نے ایک جھٹکا دے کر اس کے بال چھوڑ دیے اور پیچھے ہٹ کر دروازہ بند کرنا چاہا۔ حجاب نے تڑپ کر دروازے کا پٹ تھام لیا۔ "اسے بند نہ کریں۔ اسے کھلا رہنے دیں۔ خدا کے لیے ایسا نہ کریں۔" وہ دل فگار آواز میں بولی۔

جلال ماننے والا کہاں تھا۔ اس نے دروازہ بند کردیا۔ حجاب کا ہاتھ دونوں پٹ کے درمیان آگیا۔ وہ پٹ چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھی مگر جب جلال نے دباؤ بڑھایا اور اسے اپنی ہتھیلی کی ہڈیاں کڑکڑاتی محسوس ہوئیں تو اس نے تڑپ کر ہاتھ اندر کرلیا۔ اس کی کراہیں دلدوز تھیں۔ وہ کتنی ہی دیر اسی طرح کراہتی اور سسکتی رہی، پھر نڈھال سی ہوگئی اور دروازے کے پاس ہی غالیچے پر لیٹ گئی۔ اس نے اپنا منہ دروازے کی نچلی درز سے بالکل قریب کرلیا۔ ایسا کرنے سے اسے کچھ سکون ملتا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ وہ باہر کی روشنی اور ہوا کو محسوس کررہی ہے۔

☆☆☆

درحقیقت ہادی کے نئے گیتوں کے البم نے تہلکہ مچا دیا تھا۔ گلوکار بھی نیا تھا۔ موسیقار کے پچھلے ایک دو البم فلاپ گئے تھے۔ اس نئے البم کی اصل جان ہادی کے لکھے ہوئے بول ہی تھے۔ وہی بول جو اس نے کسی کے دیے ہوئے قلم سے لکھے تھے۔ وہ گیت تو خاص طور سے خاص و عام میں مقبول ہورہا تھا جس میں وینس کی ایک رات کا ذکر تھا؟ اور نہایت تابندہ پیشانی والی ایک لڑکی کا ذکر تھا جو نجانے کہاں سے آئی تھی اور صدیوں کا سفر طے کرکے اس تک پہنچی تھی اور وہ بھی زمانوں سے اس کا انتظار کررہا تھا، اس کی سحر انگیز مسکراہٹ پر گیت لکھ رہا تھا۔ دونوں روشنیوں سے جھلملاتے ایک رواں پانی کے کنارے ملے تھے۔ وہ اسے پہچان گیا تھا لیکن وہ اسے نہیں پہچانی تھی، یہ کیسا ملن تھا، یہ کیسی بے خبری تھی؟

ہادی ہوٹل کے کمرے میں تھا۔ آڈیو سسٹم پر یہی گیت دھیمی آواز میں پلے ہورہا تھا۔ ہادی کے سامنے کچھ کاغذات بکھرے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں کیلکولیٹر تھا۔ وہ حساب کتاب جوڑ رہا تھا۔ وہ لاہور سے روانہ ہوا تھا تو اس کے بینک اکاؤنٹ میں گیارہ لاکھ کے قریب موجود تھے۔ گھر میں

سیونگ سرٹیفکیٹس اور بانڈز وغیرہ کی شکل میں بارہ چودہ لاکھ روپیہ رکھا تھا۔ البم کی مقبولیت کے بعد اس کے بینک اکاؤنٹ میں تیزی سے رقوم کا اضافہ ہوا تھا۔ وہ تین ”البمز“ کے گیت لکھ چکا تھا۔ پہلا البم لانچ ہوگیا تھا اور معاہدے کے مطابق اس کی رائلٹی کی مد میں بھی کچھ رقم اس کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر ہوئی تھی۔ قریباً دس لاکھ شیخو صاحب ایڈوانس دینے والے تھے۔ یہ کل ملا کر 61 لاکھ کے قریب بن رہے تھے۔ پتا نہیں کیوں ہادی کو لگ رہا تھا کہ جو پینتیس چھتیس لاکھ روپیہ پاکستان سے آنے کے بعد ڈپازٹ ہوا ہے وہ اس کا ہے ہی نہیں۔ یہ حجاب کی امانت ہے۔ اس کی اصل حقدار وہی ہے۔ کیونکہ اس کی دی ہوئی توانائی سے اس کی تخلیقی قوت کے بند سوتے کھلے ہیں اور اسی کے دیے ہوئے قلم سے اس نے وہ الفاظ کاغذ پر اتارے ہیں جنہوں نے اس کے لیے آسائیوں اور کشائش کے دروازے کھولے ہیں۔

اس نے ساری جمع تفریق کرلی۔ اب اگر وہ لاہور میں اپنی ہنڈا گاڑی فروخت کردیتا تو وہ 80 لاکھ روپیہ تو قریباً پورا ہوجاتا تھا جس کا وعدہ اس نے ڈاکٹر عطا سے کیا تھا۔ مگر گاڑی فروخت کرنے سے لاہور میں والدہ اور بھائی کے لیے مشکلات پیدا ہوجاتیں۔ وہ ان کو ذرا سی پریشانی بھی دینا نہیں چاہتا تھا۔

اس سے بہتر تو یہی تھا کہ وہ اپنا ایل ڈی اے اسکیم والا پلاٹ بیچ دیتا۔ کوئی ایسا گاہک جو پوری رقم یکمشت ادا کردیتا۔ یوں اسے تیس بتیس لاکھ روپے مزید مل جاتے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ گاڑی کے بجائے پلاٹ فروخت کر دے گا۔

پتا نہیں، یہ کیسا جذبہ تھا۔ ہادی کو اپنا سب کچھ لٹا دینے پر آمادہ کررہا تھا۔ بس اس کے دل میں ایک ہی بات سمائی ہوئی تھی۔ حجاب کو کسی طرح معاشی شکنجے سے آزاد کرانا ہے۔

اس نے فون اٹھایا اور شیخو صاحب کا نمبر پریس کیا۔ وہ غالباً دوپہر کے بھاری بھرکم کھانے کے بعد دو گلاس لسی ڈکار چکے تھے اور اب دفتر میں ہی کچھ دیر سونے کی تیاری کررہے تھے۔ ”ہیلو“ ان کی پاٹ دار آواز سنائی دی۔

”کیا بنا شیخو بھائی؟“

”یار! اب بنے گا تو وہی جو تم بتاؤ گے۔ ہم تو تمہارے حکم کے بندے بنے ہوئے ہیں۔“

”نہیں، میرا مطلب ہے جو تھوڑا سا ایڈوانس مانگا تھا آپ سے؟“

”شہزادے! تھوڑا سا تو نہیں تھا وہ۔ بہرحال میں نے ٹرانسفر کردیا ہے تمہارے اکاؤنٹ میں۔ دس لاکھ۔“

”اور وہ جو انویسٹمنٹ کا مشورہ دیا تھا آپ کو؟“

”اوئے جگر گوشے! تم اس مسکین کو کہیں انویسٹ کرنے جوگا چھوڑو گے تو انویسٹمنٹ کرے گا نا۔“

”چھوڑیں شیخو بھائی! آپ تو اپنا کرتا اتار کر جھاڑیں تو آٹھ دس لاکھ ٹپک پڑتا ہے۔“

”تو آٹھ دس لاکھ میں تو نہیں ملے گا نا وہ گجرات والا رقبہ۔“

”چلیں کچھ اور ڈال لیں اس میں۔ مجھے لگتا ہے ساٹھ پینسٹھ تک یہ سودا ”ڈن“ ہوجائے گا۔ زیادہ بھی ہو تو پچیس تیس پرسنٹ تو آپ خرید میں ہی کمارہے ہیں۔“

”اچھا یار۔“ شیخو بھائی نے تھکی تھکی آواز میں کہا۔ ”مجھے لگتا ہے کہ اب تو نے یہ ڈھول میرے گلے میں ڈال کے ہی چھوڑنا ہے..... مگر مجھے یہ دس کہ تیرے ارادے کیا ہیں۔ اس کڑی کو طلاق ہو بھی جاتی ہے اور وہ اپنے ماں پیو کے گھر آ بھی جاتی ہے تو پھر کیا ہوگا۔ کیا وہ دیاہ شیاہ کرے گی تجھ سے؟“

ہادی نے ایک گہری سانس لی۔ ”شیخو بھائی! سب کچھ دیاہ شیاہ ہی تو نہیں ہوتا۔ میں نے پہلے بھی آپ کو بتایا تھا۔ حجاب کے سلسلے میں میرے دل پر بہت بھاری بوجھ ہے۔ میں اس کو ہلکا کرنا چاہتا ہوں۔“

”یعنی عشق وشق کوئی نہیں ہے تجھے۔“ شیخو بھائی نے ذرا طنزیہ انداز میں کہا۔

”وہ تو جو ہے..... سو ہے۔ لیکن اس کے لیے ویاہ شیاہ اور شادی وادی ضروری نہیں ہوتی شیخو بھائی۔ پر آپ ٹھہرے پکے لہوری سیٹھ۔ آپ کو یہ باتیں سمجھ میں نہیں آئیں گی۔“

شیخو بھائی نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”آہو یار! اگر یہ گل سمجھ میں آتی ہوتی تو خود ہی آٹھ دس سطریں لکھ کر دو ہزار کا چیک وصول نہ کرلیتا۔“

”اب مجھے یقین ہوگیا ہے کہ آپ نے لسی پی ہے۔ کیونکہ لسی پی کر ہی آپ ایسی باتیں کرتے ہیں۔“ ہادی نے ہلکے پھلکے انداز میں تبصرہ کیا۔

”اچھا چل چھوڑ اس گل کو۔ لیکن جو کچھ بھی کرے ہو ہاتھ پیر بچا کر کرنا۔ میں پھر کہہ رہا ہوں۔ یہ اٹلی والے بڑے عجیب لوگ ہوتے ہیں یہاں۔ ہاشم ایک حد تک ہی تمہارا ساتھ دے سکتا ہے۔“

☆☆☆

دروازے میں آنے کے بعد حجاب کا ہاتھ نیلا ہوگیا اور کچھ سوج بھی گیا تھا۔ لیکن جسمانی چوٹوں کے بجائے کہیں زیادہ تکلیف اس کے دل و دماغ میں تھی۔ وہ جو کچھ سن رہی تھی، جو کچھ سہہ رہی تھی، وہ ناقابل برداشت تھا۔ وہ اڑتے اڑتے سے فقرے اس کی سماعت میں گونجتے رہتے تھے جن میں جھوٹ کے سوا اور کچھ نہیں تھا اور جو راؤ فیملی میں بہت سے لوگوں کی زبان پر تھے..... اس کی پرانی دوستی ہے ہادی سے۔ یہ انٹرنیٹ پر اس سے کئی کئی گھنٹے باتیں کرتی تھی۔ وہ اس سے ملنے ہی اٹلی آیا تھا۔ یہ اس کے ساتھ ہوٹلوں میں وقت گزارتی رہی ہے۔ حجاب کو لگتا تھا کہ اس کے کانوں میں دہکے انگارے ٹھونسے جارہے ہیں۔

اس کے اردگرد مناظر جیسے ساکت ہوکر رہ گئے تھے۔ بس تقریباً بارہ فٹ ضرب چودہ فٹ کا ایک کمرا، ایک اٹیچ باتھ روم، باتھ روم والی دیوار کے ساتھ ایک آف وائٹ الماری اور الماری کے ساتھ ڈبل بیڈ۔ خاکستری رنگ کا ایک قد آدم ریفریجریٹر اور شیشے کی ایک مستطیل میز۔ یہ چیزیں دیکھ دیکھ کر اب اسے ابکائی سی آنے لگتی تھی۔ دیواریں اور ان کے رنگ کاٹنے کو دوڑتے تھے۔ وہ اندھیرے سے گھبراتی تو بلب آن کرلیتی۔ بلب کی مدھم روشنی سے دم گھٹنے لگتا تو پھر اندھیرا کرلیتی۔ اس نے قید تنہائی کی اذیت کے بارے میں بہت سنا تھا مگر اس کا تجربہ زندگی میں پہلی بار ہوا تھا۔

بے بسی کی انتہا کو چھو کر وہ سوچنے لگتی۔ کیا کوئی اس کے لیے کچھ کرے گا؟ کیا کوئی ایسی بات ہوجائے گی کہ جلال کے دل میں اس کے لیے اور اس کے بیمار والدین کے لیے رحم آجائے۔ کبھی کبھی اس کے ذہن میں ہادی کا خیال آتا اور اس کے اندر غم و غصے کی لہر بلند ہوتی۔ دانستہ یا نادانستہ اس شخص نے بہت زیادہ نقصان پہنچایا تھا اس کی زندگی کو۔

رات بھر حجاب کے ہاتھ میں درد ہوتا رہا۔ صبح تک وہ زیادہ سوج گیا۔ حسب معمول نو بجے کے قریب دروازہ کھلا۔ چھ سات انچ کی درز پیدا ہوئی اور کلثوم نے سالن اور چائے پر مشتمل روکھا سوکھا ناشتا اندر پہنچا دیا۔ حجاب کراہتے ہوئے بولی۔ ”کلثوم مجھے بہت درد ہورہا ہے۔ کہیں ہڈی کو کچھ نہ ہوگیا ہو۔ پلیز جلال کو بلا دو۔ وہ دیکھ لیں۔“

”وہ چلے گئے ہیں۔“ وہ خشک لہجے میں بولی۔

اسی دوران میں حجاب کو کھانسی کی دور افتادہ آواز سنائی دی۔ یہ آواز کسی بالائی کمرے سے آئی تھی اور یقیناً جلال ہی کی تھی۔

وہ دروازے کے خلا سے منہ لگا کر پکارنے لگی۔

”جلال..... جلال..... میری بات سن لیں۔“

اس کی آواز دور تک گونج رہی تھی۔ کلثوم نے جھٹکے سے دروازہ بند کردیا۔ حجاب نے اپنا چہرہ بہ مشکل بچایا۔ دروازہ بند ہونے کے بعد بھی وہ پکارتی رہی اور دستک دیتی رہی۔ چند منٹ بعد دروازے سے باہر پھر آہٹیں ہوئیں۔ دروازہ کھلا اور دوسری طرف جلال کی صورت نظر آئی۔ اس بار وہ دروازہ پورا کھول کر اندر آگیا۔ ”کیا قیامت مچا رکھی ہے تم نے۔“ اس نے پوچھا۔

وہ اپنے مضروب ہاتھ کو تھامے ہوئے بولی۔ ”جلال! مجھے بہت درد ہورہا ہے۔ رات بھر ہوتا رہا ہے۔ کہیں کوئی فریکچر نہ ہوگیا ہو۔“

اس نے ہاتھ کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ حجاب کو انگلیاں ہلانے کا کہا۔ انگلیاں حرکت کررہی تھیں۔ اس نے ہتھیلی پر تھوڑا سا دباؤ ڈال کر چیک کیا۔ وہ بری طرح کراہنے لگی۔

”کچھ نہیں ہوا۔“ وہ سپاٹ آواز میں بولا۔ ”بس ذرا داب آئی ہے۔“

کلثوم عقب میں کھڑی تھی۔ جلال کے کہنے پر وہ الماری میں سے فرسٹ ایڈ کا باکس نکال لائی۔ جلال نے اس کے ہاتھ پر آیوڈیکس ٹائپ کی کوئی آئنٹمنٹ لگائی اور روئی رکھ کر پٹی باندھ دی۔ اس عمل کے دوران میں وہ درد سے کراہتی رہی مگر جلال جیسے سن ہی نہیں رہا تھا۔ ”اب اسے لٹکا کر نہ رکھنا۔“ وہ بولا۔

”پورے بازو میں درد ہورہا ہے۔“ وہ سسکی۔

اس نے باکس میں سے ڈیکلا رون کا پین کلر انجکشن نکالا اور حجاب کے بازو میں ٹھونک دیا۔

کلثوم باہر جاچکی تھی۔ وہ روہانسی آواز میں بولی۔ ”جلال! پلیز میرے ساتھ ایسا مت کریں۔ میں آپ کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کروں گی، نہ ہی میں نے پہلے کیا ہے۔ شریفاں والا فون میں نے صرف اس لیے اپنے پاس رکھا تھا کہ..... کہ.....“

”اس پر اس شاعر صاحب کی کال آئے گی۔“ وہ بات کاٹ کر پھنکارا۔

”نہیں جلال..... نہیں۔“ وہ بلکی۔ ”مجھے ڈر تھا کہ ایسا ہوگا۔ اس کے پاس شریفاں کا نمبر تھا۔ میں قسم کھاتی ہوں جلال.....“ اس کا گلا رندھ گیا۔ وہ کوشش کے باوجود آگے نہ بول سکی اور گھٹنوں میں سر دے کر ہچکیوں سے رونے لگی۔ وہ بستر پر بیٹھی تھی۔

وہ خاموش کھڑا رہا۔ اس نے التجا آمیز انداز میں اس

کا کندھا تھامنا چاہا۔ اس نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ "منہ سے بولو، کیا چاہتی ہو تم؟"

وہ اپنے اندر کی ساری لجاجت اپنے لفظوں میں سمیٹ کر بولی۔ "جلال! آپ کو پتا ہے مجھے بند جگہوں سے کتنا ڈر آتا ہے۔ میں یہاں گھٹ گھٹ کر مر رہی ہوں۔ مم...... مجھے کہیں بھی لے جائیں لیکن اس کمرے سے اب نکال لیں۔"

"یعنی میں ظالم ہوں، میں نے تمہیں بے گناہ یہاں بند کیا ہوا ہے۔ حبس بے جا میں رکھا ہوا ہے تمہیں۔ ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ مجھے بھی اب احساس ہو رہا ہے کہ شاید میں زیادتی کر رہا ہوں تم سے۔ مجھے اس کی تلافی کرنی چاہیے بلکہ معافی مانگ کر تلافی کرنی چاہیے۔ بتاؤ کس طرح معافی مانگوں تم سے؟ بتاؤ۔"

"آپ ایسا مت کہیں۔ آپ شوہر ہیں میرے...... میرے مجازی خدا کی حیثیت رکھتے ہیں......"

"مت استعمال کرو ایسے الفاظ۔ یہ مقدس لفظ تمہارے منہ میں آ کر بدچلنی کا طعنہ بن جاتے ہیں۔ میں تمہارے لیے جو کر سکتا ہوں وہ کر دیتا ہوں۔ تمہیں اس "ظلم" سے نجات دے دیتا ہوں۔ اگر جانا چاہتی ہو تو چلی جاؤ۔ دروازہ کھلا ہے تمہارے سامنے۔"

حجاب حیرت زدہ سی کھڑی ہو گئی۔ وہ جلال کو دیکھ رہی تھی۔ جیسے اسے اپنے کانوں پر یقین نہ ہو۔ وہ اس کا لب و لہجہ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سسک کر بولی۔ "میں بڑی سے بڑی قسم کھا سکتی ہوں جلال! میں آپ کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کروں گی۔ اگر کروں تو بے شک میری جان لے لیجیے گا۔ ٹکڑے کر دیجیے گا میرے۔"

"وہ تو بعد کی بات ہے۔ لیکن میری ایک بات ابھی اچھی طرح سن لو۔ جس وقت تم اس دروازے سے باہر نکلو گی، میں اسی وقت تمہاری طلاق کے کاغذوں پر دستخط کر دوں گا۔ اسی وقت بالکل آزاد کر دوں گا تمہیں۔"

یکایک حجاب کے سینے میں امید کے سارے چراغ، تیز ہوا کے جھونکے سے بجھ گئے۔ ایک سرد لہر ریڑھ کی ہڈی سے اٹھی اور پورے جسم میں پھیل گئی۔ طلاق لینے اور دینے والی بات ان کے درمیان پہلے بھی ہو چکی تھی اور جس پس منظر میں ہوئی تھی وہ بھی حجاب کو معلوم تھا۔ بات اب طلاق کی نہیں تھی۔ بات تو اس معاشی شکنجے کی تھی جو جلال نے اس پر کس رکھا تھا اور اس کے والدین پر بھی۔ وہ طلاق کی بات کر رہا تھا تو ساتھ ہی اس "معاشی شکنجے" کو بے دریغ کسنے کی بات بھی کر رہا تھا جو اس کے والدین کی سانس روک سکتا تھا۔ وہی بھاری بھرکم قرضہ جسے جلال ایک مہلک ہتھیار کے طور پر استعمال کر رہا تھا۔ وہ کسی بھی وقت اس قرضے کے عوض میں اس کے بوڑھے والد اور جواں سال بھائی کو عدالتوں میں گھسیٹ سکتا تھا اور وہ اس مصیبت کو جھیلنے کی سکت ہرگز نہیں رکھتے تھے۔

"جاؤ...... اب جاتی کیوں نہیں۔ کیا سوچ رہی ہو؟" جلال کی پھنکار اس کے کانوں میں پڑی۔

"پلیز جلال۔" اس نے روتے ہوئے دوبارہ جلال کا توانا کندھا تھامنا چاہا۔ اس نے دھکا دے کر اسے بیڈ پر پھینک دیا۔ دانت پیس کر بولا۔ "میں جانتا ہوں کیوں جانا چاہتی ہے تو باہر۔ کیوں کھلی ہوا میں سانس لینے کے شوق چڑھے ہوئے ہیں تجھے۔ سب جانتا ہوں، وہ حرامزادہ ابھی یہیں ہے۔ انہی گلیوں میں گھوم رہا ہے آوارہ کتے کی طرح لیکن...... لیکن میں اب تجھے منع نہیں کروں گا۔ جانا چاہتی ہے تو چلی جا۔ دروازہ پورا کھلا ہے تیرے سامنے۔ چلی جا اگر جانا ہے تو۔"

وہ بستر پر اوندھی پڑی ہچکیوں سے روتی رہی۔ اس کا جسم بالکل بے جان ہو گیا تھا۔ دروازے کی طرف جانا تو کجا دروازے کی طرف دیکھنے کی ہمت بھی اس میں نہیں رہی تھی۔ اپنی ماں کا بیمار لاچار چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ جلال کچھ دیر ٹانگیں چوڑی کر کے کھڑا رہا اور اس کے ردعمل کا انتظار کرتا رہا۔ "اب جاتی کیوں نہیں؟" وہ چنگھاڑا۔

ایک لمحے کے لیے لگا کہ وہ پھر اس پر پل پڑے گا اور اس کو ادھیڑ کر رکھ دے گا لیکن پھر شاید اسے اس کے زخمی ہاتھ کا خیال آ گیا۔ کوئی باریک سا فریکچر ہڈی ٹوٹنے کا باعث بھی بن سکتا تھا۔ اس نے اس بیڈ کو زوردار لات رسید کی جس پر وہ لیٹی ہوئی تھی۔ پھر کسی بگولے کی طرح پھنکارتا ہوا باہر نکل گیا۔ باہر نکلتے ہوئے اس نے اسے اور اس کے والدین کو بے نقطہ سنائی تھیں۔ چند سیکنڈ بعد کلثوم نے غصیلے انداز میں دروازہ باہر سے بند کر دیا اور حسب معمول لاک لگا دیا۔ ایک دم حجاب کا سارا جسم سرد ہو گیا۔ اسے لگا کہ وہ کسی ٹھنڈی ٹھار قبر میں اترتی جا رہی ہے۔ اپنی امی کا چہرہ اس کے تصور میں آیا، پھر ابو کا، پھر بھائی فیصل کا۔ کہاں ہیں وہ سب؟ وہ اسے دوبارہ زندہ دیکھ سکیں گے؟

> زندگی کے نشیب و فراز گھٹن زدہ ماحول اور حدود قیود سے نبرد آزما باہمت حسینہ کی داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

انوکھا انتقام

سلیم انور

والدین ہمیشہ بچوں کی تربیت درست انداز میں کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر... یہ ضروری نہیں کہ ان کے تمام انداز اور اندازے درست بھی ثابت ہوں...... اکثر ایسے بچے خود کو بڑے چالباز سمجھتے ہیں مگر کبھی کبھی چالبازوں کی ساری بازی پلٹ جاتی ہے، جو خود کو دنیا سے بہت آگے سمجھتے ہیں وہی زمانے سے بہت پیچھے رہ جاتے ہیں۔ وہ بھی اس قافلے میں اتنا پیچھے رہ گیا تھا کہ اڑنے والی دھول نے اس کے تمام نقش تک چھپا دیے۔

بے وقوف کر ایک سچے انسان کے ہاتھوں رسوا ہونے والوں کا انجام

میرے باپ کی تدفین کے دن تک میں نے اس بات پر کبھی یقین نہیں کیا تھا کہ مرنے کے بعد بھی کوئی انتقام لے سکتا ہے۔

وہ جارجیا کا ایک مخصوص مرطوب دن تھا جب ڈیڈی کی تدفین کی گئی تھی۔ تدفین کے بعد میں اپنے بھائی کے ہمراہ اس تجہیز گاہ کے پورچ کی سیڑھیوں پر بیٹھا ہوا تھا جو اب ہماری ملکیت بن چکا تھا۔ اس وقت افق پر گرمیوں کا سورج ڈوب رہا تھا اور آسمان پر سرخ، بنفشی اور نارنجی رنگ کی روشنیوں کی دھاریاں بکھری ہوئی تھیں۔ ہوا میں صنوبر کے درختوں، جنگلی پھولوں، سمندری پانی اور تپتی ہوئی زمین کی ملی جلی خوشبو شامل تھی جو دل کو بھلی محسوس ہو رہی تھی۔

لیکن میرے اور کرٹس کے درمیان چھائی طویل خاموشی مجھے بے چین کیے ہوئے تھی۔

بالآخر یہ خاموشی کرٹس نے توڑی۔ وہ بولا۔ "جانتے ہو ڈیڈی تمہیں نہیں بخشیں گے۔ تم نے جو کچھ کیا ہے وہ اس کا بدلہ ضرور چکائیں گے۔"

میں نے ایک اچٹتی نگاہ اپنے بھائی پر ڈالی۔ اس کے درشت لہجے نے میرے وجود کو جھنجھوڑ دیا۔ میں تو اسے تسلی دینے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ اس کام میں، میں خود کو بہتر تصور کرتا تھا لیکن اس کے الفاظ میرے لیے کسی سانپ کی پھنکار

سے کم نہیں تھے۔

''ہم نے ابھی تو ان کی تدفین کی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''یہ کریک ول کی تاریخ کی سب سے بڑی تدفین تھی۔ وہ اب ممکنہ طور پر میرے ساتھ کیا کر سکتے ہیں؟''

''اس بات کی اہمیت نہیں کہ وہ مر چکے ہیں، جیک۔ تم نے برسوں تک انہیں جس طرح ذلیل و رسوا کیا ہے۔ وہ قبر کے اندر رہ کر بھی تم سے اسی بات کا انتقام لیں گے۔ ڈیڈی بھی کسی کو سزا سے بچ نکلنے کا موقع نہیں دیتے تھے۔'' کرٹس نے کہا۔

میں دھیرے دھیرے سر ہلانے لگا۔ میں اور کرٹس اس وقت سے ہماری خاندانی تجہیز گاہ میں کام کر رہے تھے جب ہم چھوٹے ہوا کرتے تھے۔ یہ تجہیز گاہ ڈیڈی کو اپنے باپ سے ورثے میں ملی تھی۔ اب یہ ہماری ملکیت تھی۔

میں نے ہائی اسکول کے زمانے میں اپنا بیشتر وقت بدمعاشوں کے خلاف کرٹس کے دفاع میں گزارا تھا جو اس کی دھیمے انداز گفتگو اور منکسر المزاجی پر اشتعال میں آجاتے تھے۔ لوگوں کے ساتھ اس کا انداز ہمیشہ پریشان کن ہوتا تھا اور جب لڑکے ہمارے فیملی بزنس کے بارے میں ظریفانہ لطیفے بیان کرتے تھے تو وہ سنجیدہ ہو جاتا تھا۔

میں اسے کسی قسم کا صدمہ نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ لیکن یہی وقت تھا کہ اسے اس حقیقت کا علم ہو جائے جس کی میں نے پلاننگ کی ہوئی تھی۔ شاید ہماری یہ بحث اس سلسلے میں اچھی ثابت ہو سکتی تھی۔

''میں نے کس طرح ڈیڈی کی تذلیل کی تھی؟'' میں نے جاننا چاہا۔

''انہیں علم تھا کہ تم مُردوں کی دیکھ بھال کے لیے لوگوں سے پیسے اینٹھا کرتے تھے۔'' کرٹس نے کہا۔

''وہ تو میں صرف اپنا جیب خرچ نکالنے کے لیے کرتا تھا۔'' میں نے اعتراف کیا۔

یہ سن کر کرٹس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اس نے تیزی سے پلکیں جھپکانا شروع کر دیں۔ پھر میرے سینے پر اپنی انگلی کھبوتے ہوئے بولا۔ ''لیکن تم نے لوگوں کے ساتھ دھوکا دہی کی ہے۔ انہیں چکمہ دے کر رقم اینٹھی ہے۔''

''وہ کیسے؟'' میں نے اس سے اصل بات اگلوانے کے لیے پوچھا۔

''تم لوگوں سے یہ کہتے تھے کہ لاشوں کو حنوط کرنے والے مائع کو سونگھنے سے ان کی زندگی کی مدت طویل ہو جائے گی اور ایک بار اس خوشبودار مائع کو سونگھنے کے تم ان سے پانچ ڈالر وصول کرتے تھے۔''

''یہ تو میں ان کے ساتھ مذاق کرتا تھا، کرٹس اور ڈیڈی تو ہر دور کے سب سے بڑے عملی مذاق کرنے والے تھے اور میں جو کچھ کر رہا تھا اس پر وہ خوب ہنستے تھے۔''

''تم گزشتہ چند برسوں میں بہت بدل چکے ہو، جیک۔ اب میں تمہیں بالکل بھی نہیں جانتا۔ کسی روز تمہیں اس کا حساب دینا ہوگا اور تم سے یہ حساب ڈیڈی لیں گے۔'' کرٹس نے کہا۔

ہم چند سیکنڈ تک خاموشی کے ساتھ ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ پھر یہ خاموشی کرٹس نے توڑی۔ وہ بولا۔ ''میں تو بھول ہی گیا تھا۔'' اس نے اپنے اسپورٹ کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر سفید رنگ کا ایک لفافہ باہر نکالا۔ ''یہ ڈیڈی کی خانے دار الماری میں رکھا ہوا تھا۔ یہ ہم دونوں کے نام ہے اور اس پر ''ارجنٹ'' لکھا ہوا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس میں ہم دونوں کے لیے ہدایات ہوں گی کہ ان کے جانے کے بعد ہمیں تجہیز گاہ کو کس طرح سے چلانا ہے اور اب وہ جا چکے ہیں۔''

''کرٹس، میں تمہیں کچھ بتانا چاہتا ہوں اور میرے خیال سے یہ اس بات کا سب سے مناسب اور بہتر موقع ہے۔'' میں نے یہ کہہ کر ایک لمبا اور گہرا سانس لیا۔

کرٹس نے استفہامیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''میں اکتالیس برس سے اس قصبے میں رہ رہا ہوں لیکن اب مزید نہیں رہ سکتا۔ کل میں ہمیشہ کے لیے یہاں سے چلا جاؤں گا۔ اور میں تنہا جا رہا ہوں۔'' میں نے انکشاف کیا۔

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو، جیک! تم تو ڈیڈی سے ہمیشہ یہی کہا کرتے تھے کہ جب ان کا انتقال ہو جائے گا تو تم یہیں قیام کرو گے اور یہ کاروبار جاری رکھو گے۔'' کرٹس نے قدرے حیرانی سے کہا۔

''تو پھر؟ اب وہ اس بارے میں شکایت کرنے کے لیے یہاں موجود نہیں ہیں۔ مجھے گزشتہ چند برسوں سے اس قصبے سے نفرت ہو گئی ہے۔ ڈیڈی نے ممی کے مرنے کے بعد ہم دونوں کو ہمیشہ خلفشار میں جتلا رکھا۔ ہم جو کچھ بھی کرتے تھے وہ ان کی نظروں میں کبھی درست نہیں ہوتا تھا۔'' میں نے اپنی بھڑاس نکالتے ہوئے کہا۔

''تم نہیں جا سکتے۔''

''دیکھو بھائی۔ تم تو جانتے ہو کہ میں تمہارے لیے کچھ بھی کر سکتا ہوں لیکن یہاں اب میں ایک دن بھی نہیں رہ سکتا۔ میرے پاس 8057.35 ڈالرز ہیں جو میں نے کاروبار کے کھاتے سے لیے تھے۔ یہ زیادہ رقم تو نہیں لیکن آغاز کے لیے مناسب ہے۔''

''تم نے یہ رقم ڈیڈی کی رقم سے چرائی ہے؟''

''مجھے اپنے مستقبل کے لیے رقم کی ضرورت تھی۔ میں نے یہ رقم ایک بڑے خاکی رنگ کے تھیلے میں رکھی ہے اور اس پر پلاسٹک ٹیپ لپٹا ہوا ہے۔ جب میں یہاں سے جاؤں گا تو وہ رقم میرے ساتھ ہوگی۔'' میں نے جواب دیا۔

پھر میں نے کرٹس کے ہاتھ سے وہ سفید لفافہ لے لیا جس پر ارجنٹ لکھا ہوا تھا۔ ''چلو یہ بھی دیکھ لیتے ہیں کہ بڑے میاں کیا کہنا چاہتے تھے۔'' میں نے کہا۔

''میں شرطیہ کہتا ہوں انہیں اس بات کا علم تھا کہ تم رقم چوری کر رہے ہو اور وہ تمہیں اس حقیقت سے آگاہ کرنے والے تھے۔''

میں نے لفافہ چاک کیا اور اس میں تہ کیا ہوا کاغذ باہر نکال لیا پھر میں نے تہ کھول کر کاغذ پر لکھی تحریر پڑھنا شروع کی جو ایک قطعہ تھا۔ پہلے تو یہ قطعہ بالکل بھی میری سمجھ میں نہیں آیا۔ قطعہ یہ تھا۔

بوڑھا کھور اپنی گور میں گیا
چار سو ہزار اس نے تھا بچایا
خزانے کی تلاش کے لیے تمہیں چاہیے اک اشارہ
ایسی جگہ کا سوچو جہاں سے ہوتا ہے نظارہ

میں چند سیکنڈ تک سڑک پار پتھریلی پارکنگ لاٹ پر نظریں جمائے رہا اور پھر قطعہ کے تمام اشارے یکجا ہو کر میری سمجھ میں آگئے۔

کرٹس نے وہ خط میرے ہاتھ سے لے لیا۔ خط پڑھنے کے دوران اس کی انگلیاں الفاظ پر گردش کرنے لگیں اور اس کے ہونٹ حرکت کرتے رہے۔ پھر اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور بولا۔ ''میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔''

میں اپنے بے بی بھائی پر مسکرا دیا۔ ''یاد ہے جب گزشتہ برس اولڈ مین کھور کا انتقال ہوا تھا تو ہر طرف اس کے وصیت نامے کے نہ ہونے کے بارے میں چہ میگوئیاں ہوئی تھیں اور کچھ لوگوں نے شور وغل بھی مچایا تھا؟''

کرٹس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''لوگ اندازہ ہی نہیں لگا سکے کہ اس نے اپنی دولت کا کیا، کیا۔ وہ اس نصف قصبے کا مالک تھا اس لیے ایک بڑی شے سمجھا جاتا تھا۔''

میں نے خط کی جانب اشارہ کیا۔ ''وہ دولت کے لحاظ سے ایک بڑی شے تھا اور ہم اس دولت کو حاصل کرنے والے ہیں۔ تمام کی تمام دولت...... چار سو ہزار ڈالرز!''

کرٹس بھونچکا میرا منہ تکنے لگا۔

''میں ہمیشہ سے جانتا تھا کہ ڈیڈی کامیاب ہو کر رہیں گے۔ کرٹس، ہم امیر آدمی بننے والے ہیں۔''

قبرستان قصبے سے باہر لگ بھگ ایک میل کے فاصلے پر تھا۔ میں نے پک اپ سڑک پر سے اتار کر درختوں کے ایک جھنڈ کے پیچھے روک دی۔ پھر پک اپ کے عقبی حصے میں رکھے ہوئے دو بیلچے اور ایک اوور سائز اسپاٹ لائٹ اٹھا کر قبروں کی جانب چل پڑا۔ فضا میں تازہ تراشیدہ گھاس اور صنوبر کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ ہم قبروں کے درمیان سے راستہ بناتے ہوئے کھور کی جانب بڑھ رہے تھے۔ چاند کی روشنی میں ہمیں راستہ تلاش کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آرہی تھی۔ قصبے سے لے کر قبرستان پہنچنے تک کرٹس نے تمام راستے کوئی بات نہیں کی تھی اور اس کی یہ خاموشی میرے اعصاب پر بوجھ بنی ہوئی تھی۔

''کھور کی کوئی فیملی نہیں تھی۔'' میں نے اس خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔ ''تم نے کتنی مرتبہ اسے یہ کہتے ہوئے سنا تھا کہ وہ اپنی دولت کسی کو نہیں دینا چاہتا؟ کہتا تھا کہ وہ اس دولت کو اپنے ساتھ لے جائے گا۔''

''تو پھر؟''

''تو میرے خیال سے اس نے ڈیڈی سے یہ وعدہ لیا ہوگا کہ مرنے کے بعد وہ اس کی دولت اس کے ساتھ اس کے تابوت میں دفنا دیں۔'' میں نے کہا۔

یہ سن کر کرٹس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ میں نے اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے منڈلاتے ہوئے صاف دیکھ لیے۔

''میں اس کی قبر نہیں کھودوں گا، جیک!''

''یقیناً تم کھودو گے۔ اس نے اپنی قسمت قصبے کے ہر ایک فرد سے دھوکا دہی کر کے بنائی تھی۔ اب یہی وقت ہے کہ کوئی اس کی دولت بھلائی کے کاموں کے لیے استعمال میں لائے۔'' میں نے اسے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

کھور کی قبر ایک پہاڑی کی چوٹی پر تھی جہاں سے اونچی نیچی چراگاہ کا دلکش نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ قبر کا پتھر سادہ اور چھوٹا تھا۔ وہ بوڑھا نمائشی نہیں تھا۔ وہ ضرورت سے زیادہ بھی ایک دھیلا بھی فالتو خرچ نہیں کرتا تھا۔

میں نے اپنی اسپاٹ لائٹ روشن کر دی اور وادی کا ایک سرسری جائزہ لیا۔ ڈیڈی ہمیشہ یہی کیا کرتے تھے کہ قبرستان کا یہ مقام سب سے عمدہ ہے۔ مجھے علم تھا کہ ڈیڈی نے اندازہ لگا لیا تھا، میں ان کے قطعے کے اشارے سمجھ جاؤں گا کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔

میں نے ایک بیلچہ کرٹس کو تھما دیا اور اسپاٹ لائٹ زمین پر رکھ دی تاکہ قبر اور اس کے آس پاس کا حصہ روشنی کی زد میں رہے۔ رات کے سناٹے میں جھینگروں کی جھنجھناتی آوازوں اور تیز ہوا کے باعث درختوں کی شاخوں کی سرسراہٹ کے سوا اور کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں سیکڑوں مرتبہ یہاں

آچکا تھا لیکن رات کے وقت یہاں مجھے خوف سا محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے بیلچہ زمین میں گاڑا اور کھودنا شروع کر دیا۔

کرٹس کھڑا دیکھنے لگا۔ "اگر شیرف آگیا تو پھر ہم کیا کریں گے؟" اس نے پوچھا۔

"اس کے آنے کا کوئی امکان نہیں۔ کاؤنٹی شیرف اس قصبے میں مہینے میں صرف ایک بار آتا ہے۔ وہ گزشتہ ہفتے ہی یہاں آیا تھا۔ ابھی کچھ عرصے تک نہیں آئے گا۔" میں نے جواب دیا۔

"لوگوں کو پتا چل جائے گا کہ کسی نے کلمور کی قبر کھودی ہے۔" کرٹس نے خدشہ ظاہر کیا۔

"یقیناً پتا چل جائے گا لیکن انہیں یہ علم نہیں ہو سکے گا کہ قبر کس نے کھودی ہے اور یقیناً وہ یہ بھی نہیں جان پائیں گے کہ کیوں کھودی ہے۔ اب سوچنا بند کرو اور کام میں لگ جاؤ۔ ہم جتنی جلدی رقم پالیں گے اتنی ہی جلدی یہاں سے نکل چلیں گے۔" میں نے جواب دیا۔

میں چند منٹ تک کھودتا رہا۔ پھر ستانے کے لیے گھاس پر لیٹ گیا اور سوچنے لگا۔ زندگی اب بھی ٹھیک ٹھاک گزر رہی تھی۔ لیکن دولت ہاتھ آنے کے بعد تو ہماری زندگی اور بھی بہت زیادہ بہتر ہو جائے گی۔

آسمان پر موجود چند بادلوں کی رنگت ہلکی گلابی ہو رہی تھی کہ پو پھٹ رہی ہے اور صبح ہونے میں لگ بھگ نصف گھنٹا باقی ہے۔ میں نے کرٹس کی طرف دیکھا۔ اس نے قبر خاصی کھود لی تھی اور گڑھے میں سے صرف اس کا سر باہر دکھائی دے رہا تھا۔

تب مجھے فاصلے پر ایک روشنی دکھائی دی جو سڑک پر تیزی سے لہراتی ہوئی قبرستان کی سمت بڑھ رہی تھی۔

میں نے اپنی اسپاٹ لائٹ آف کر دی اور لپک کر کرٹس کے پاس پہنچ گیا۔ "کوئی آرہا ہے۔" میں نے اسے بتایا۔

"اوہ شٹ!" کرٹس نے کہا۔ "مجھے معلوم تھا کہ ہم پکڑے جائیں گے۔" وہ اچھل کر گڑھے سے باہر آگیا اور اس روشنی کو تکنے لگا جو قبرستان میں داخل ہو رہی تھی۔

"شاید بچے ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "جاؤ انہیں ڈرا کر بھگا دو۔ بیلچے کو زور زور سے قبر کے کسی پتھر پر بجانا تاکہ وہ خوف زدہ ہو کر بھاگ کھڑے ہوں۔"

کرٹس نے بیلچہ اپنے کاندھے پر رکھا اور آتی ہوئی روشنی کی جانب چل پڑا۔ کرٹس کے اندر یہ بات بہت اچھی تھی کہ اسے جو حکم دیا جاتا وہ اس کی تعمیل میں کسی قسم کی پس و پیش نہیں کرتا تھا۔

چند منٹ گزر گئے۔ اب خاموشی مجھے گراں گزر رہی تھی۔

تب مجھے دبی دبی آوازیں سنائی دیں۔

"جیسس کرٹس!" میں نے خود سے سرگوشی کے لہجے میں کہا۔ "ان سے بات مت کرو۔ ان سے چھٹکارا حاصل کرو۔"

پھر فاصلے پر قدموں کی آوازیں سنائی دیں جو قریب آنے پر بلند ہوتی جا رہی تھیں۔ میں چوکنا ہو گیا۔ اتنے میں دھب کی آواز گونجی جیسے کسی نے تربوز پر ڈنڈے سے ضرب لگائی ہو۔ چند سیکنڈ بعد قدموں کی آواز پھر ابھرنے لگی اور کرٹس نزدیک آتا دکھائی دیا۔

وہ مجھ سے چند انچ کے فاصلے پر آکر رک گیا۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی، شانے لٹکے ہوئے تھے اور وہ گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔

"وہ شیرف تھا۔" کرٹس نے ہانپتے ہوئے بتایا۔ پھر تیزی سے چند مختصر سانس کھینچتے ہوئے اپنی کیفیت کو نارمل کرنے کی کوشش کی۔ "کہہ رہا تھا اسے معلوم تھا کہ ہم ادھر آئے ہوئے ہیں۔ وہ ہم سے بات کرنا چاہتا تھا۔ اسے کیسے پتا چلا کہ ہم ادھر آئے ہوئے ہیں، جیک؟"

"یقیناً اس نے ہماری پک اپ کو ادھر آتے دیکھا ہوگا۔" میں نے سڑک کی سمت نظریں گھماتے ہوئے کہا۔ "تم نے اسے ٹال دیا؟"

"میں گھبرا گیا تھا اور میں نے دوڑنا شروع کر دیا۔ میرا بیلچہ ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ شیرف میرے عین عقب میں آرہا تھا۔ اس کا پیر بیلچے کے کنارے پر پڑا اور بیلچے کے پھل نے اچھل کر اس کی کنپٹی پر ضرب لگا دی۔ ضرب پڑتے ہی شیرف گر پڑا۔ اس کا سر ایک قبر کے بھاری کتبے سے ٹکرا گیا اور اس کی کھوپڑی چٹخ گئی۔ وہ مر چکا ہے، جیک! میں نے اس کمبخت شیرف کو قتل کر دیا ہے۔ اب ہم کیا کریں؟"

"تمہیں یقین ہے کہ وہ مر چکا ہے؟"

کرٹس نے کئی بار اپنا سر اثبات میں ہلایا۔ "وہ لوگ مجھے بجلی کی کرسی پر بھیج دیں گے جیک۔ ہے نا؟"

"اول تو یہ ایک حادثہ تھا اور دوسرا یہ کہ ہم ہمیشہ کی طرح ایک دوسرے کا بچاؤ کریں گے۔ بھائی بھائی ایسا ہی تو کرتے ہیں۔ سمجھ گئے؟" میں نے اسے دلاسا دیا۔

میں نے وادی کی سمت نظریں جما دیں اور سوچنے لگا۔

کچھ دیر بعد میں نے کلمور کی قبر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کرٹس سے کہا۔ "رقم نکالنے کے بعد ہم شیرف کو اس قبر کے اندر ڈال دیں گے۔ بہت کم لوگ قبرستان کے اس حصے کی طرف آتے ہیں۔ لوگوں کو یہ جاننے میں وقت لگ جائے گا کہ کسی نے کلمور کی قبر میں ادل بدل کی ہے۔ ہم پر کوئی بھی شبہ نہیں کرے گا۔ کم آن، ہمیں تیزی سے اپنا کام نمٹانا ہوگا۔"

کرٹس دوبارہ گڑھے میں اتر گیا اور ایک بار پھر کھودنا

شروع کردیا۔

چند منٹ بعد اس کا بیلچہ کسی ٹھوس شے سے ٹکرایا۔ وہ گھٹنوں کے بل جھک گیا اور اپنے ہاتھوں سے مٹی ہٹانے لگا۔ چند سیکنڈ بعد گھور کے تابوت کا اوپری حصہ ظاہر ہوگیا۔

میں چھلانگ لگا کر گڑھے میں اتر گیا اور بیلچے کی مدد سے تابوت کے بند ڈھکن کو کھولنے لگا۔ کرٹس نے روشنی کا حلقہ تابوت کے اندر مرکوز کردیا۔ میں نے تابوت کا ڈھکن اٹھادیا۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے گھور کی کھوپڑی مجھے دیکھ کر مسکرا رہی ہو۔ میں توقع کررہا تھا کہ رقم عین سامنے موجود ہوگی لیکن رقم موجود نہیں تھی۔

میں نے کرٹس سے روشنی لے لی۔ "اسے اوپر اٹھاؤ!"

"اوہ جیسس، جیک۔ کیا مجھے یہ کرنا ہوگا؟"

"جو میں کہہ رہا ہوں وہ کرو!"

کرٹس نے گھور کے ڈھانچے کو دونوں پہلو الٹ پلٹ کیا اور میں روشنی کی مدد سے تابوت کے ہر گوشے کو چیک کرنے لگا۔

رقم کہیں بھی موجود نہیں تھی۔

"تم غلط تھے، جیک۔ وہ کمبخت رقم کہاں ہے؟" کرٹس نے قدرے جھلاتے ہوئے لہجے میں کہا۔

عین اسی لمحے مجھے احساس ہوا کہ ڈیڈی نے ہمارے ساتھ کیا، کیا ہے۔ "انہوں نے ہم سے اپنا آخری عملی مذاق کیا ہے۔ انہیں معلوم تھا کہ ہم گھور کی قبر ضرور کھودیں گے۔ وہ اس وقت غالباً اوپر جنت میں بیٹھے ہم پر قہقہے لگا رہے ہوں گے اور ہنسی سے لوٹ پوٹ ہورہے ہوں گے۔ ہم ان کی داستان کے جھانسے میں آکر احمق بن گئے۔" میں نے اپنا سر پیٹتے ہوئے کہا۔ "کم آن۔ اب چل کر شیرف کو ٹھکانے لگاتے ہیں۔"

شیرف کی لاش گھاس پر منہ کے بل پڑی ہوئی تھی۔ اس کی کھوپڑی جس کتبے کے بھاری پتھر سے ٹکرائی تھی اس پر خون صاف دکھائی دے رہا تھا۔ کرٹس نے اس کے شانوں کے نیچے ہاتھ ڈال کر اسے اٹھایا اور میں نے اس کے دونوں پیر پکڑ لیے۔

چند منٹ ہم نے اسے گھور کی لاش کے اوپر لٹادیا اور تابوت کا ڈھکن بند کردیا۔ پھر بیلچے کی مدد سے تابوت کے اوپر مٹی ڈالنا شروع کردی۔

ابھی تھوڑی سی مٹی ڈالی ہی تھی کہ مجھے شیرف کی گشتی پولیس کار کا خیال آگیا۔ "ہمیں شیرف کی گاڑی کی چابیاں چاہیے ہوں گی تاکہ اس کی کار کو یہاں سے ہٹادیا جائے۔"

"شاید اس نے چابی اگنیشن میں لگی چھوڑدی ہو۔" کرٹس نے خیال ظاہر کیا۔

میں نے نفی میں سرہلادیا۔ "جب ہم اسے اٹھا کر یہاں لا رہے تھے تو مجھے اس کی جیب سے چابیوں کی جھنکار سنائی دی تھی۔"

پھر میں نے بیلچے بھر کر تابوت پر سے مٹی ہٹادی۔ لیکن ایک ہلکی سی دستک کی آواز نے میرا خون منجمد کردیا۔ یہ آواز تابوت کے اندر سے آرہی تھی۔

"جیسس کرٹس! میرا خیال ہے تم نے کہا تھا کہ وہ مرچکا ہے۔" میں نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

کرٹس نے بے چارگی کے انداز میں شانے اچکادیے۔ "شاید میں غلط تھا لیکن یہ بہتر ہوگیا۔" پھر اس نے اپنی آواز بلند کرتے ہوئے کہا۔ "شیرف، اپنی چابیاں باہر اچھال دو!"

"کیا تم بالکل بے عقل اور گاؤدی ہو؟" میں نے سرہلاتے ہوئے کہا۔ "بعض اوقات مجھے یقین نہیں آتا کہ تم میرے بھائی ہو۔ لگتا ہے کہ اسپتال میں شناخت میں کسی قسم کی گڑبڑ ہوگئی تھی اور تمہیں میرے اصلی بھائی سے بدل دیا گیا تھا۔"

"مجھے احمق مت کہو، جیک۔"

"بعض اوقات مجھے تم پر حیرانی ہوتی ہے۔ میں بس یہی کہہ رہا ہوں۔"

"تم میرے ساتھ بہتر سلوک روا رکھنا شروع کردو ورنہ کسی روز میں......"

میں نے گڑھے میں دوبارہ مٹی ڈالنا شروع کردی۔

کرٹس نے میرے شانے کو ایک زوردار جھٹکا دیا۔ "یہ تم کیا کررہے ہو؟ شیرف ابھی زندہ ہے۔"

"ہم اسے باہر نہیں نکال سکتے۔ وہ ہمیں شناخت کرلے گا۔ ہم دھر لیے جائیں گے۔" میں نے جواز پیش کیا۔

"ڈیڈی سے رقم چرانا ایک الگ بات تھی۔ لیکن یہ تو سراسر قتل ہوگا۔ تم میرے بھائی نہیں ہو۔ اب میں تمہیں بالکل بھی نہیں جانتا۔" کرٹس کے منہ سے تھوک اڑنے لگا۔ "تم بہت خطرناک ہو۔"

"پیچھے ہٹ جاؤ۔" میں نے کہا۔

اس نے میرا بازو جکڑ لیا اور میرے چہرے کے قریب آگیا۔ غصہ اس کی آنکھوں میں بھرا ہوا تھا۔ کرٹس نے اس سے پہلے کبھی مجھے چیلنج نہیں کیا تھا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ وہ بالکل درست کہہ رہا تھا۔ اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ میں اس کی بات سننے اور ماننے پر رضامند ہوگیا تھا۔

"جاؤ ڈاکٹر جیکسن کو لے کر آجاؤ۔" میں نے کہا۔ "کہنا کہ اسے فوری چلنا ہے۔"

کرٹس دوڑ پڑا۔ اس کا رخ قبرستان کے باہر کھڑی ہماری پک اپ کی سمت تھا۔ پھر پک اپ کا انجن اسٹارٹ ہونے اور سڑک پر ٹائروں کی چرچراہٹ کی آواز سنائی دی۔

میں ایک بار پھر گڑھے میں کود گیا اور تابوت کا ڈھکن اٹھادیا۔ شیرف کی سانسیں معمولی چل رہی تھیں۔ "حوصلہ رکھو!" میں نے کہا۔ "ڈاکٹر آرہا ہے۔"

سورج اب مکمل نمودار ہوچکا تھا اور نارنجی رنگ کا ایک بھرپور گولا دکھائی دے رہا تھا۔ آسمان پر موجود بادلوں کی رنگت گلابی اور بنفشی ہورہی تھی۔ میں گھاس پر لیٹ گیا اور سوچنے لگا کہ میں اور کرٹس اس ابتری سے اب کس طرح اپنی جان چھڑا سکتے ہیں۔ تب مجھے احساس ہوا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں نے قصبے کو چھوڑنے کا پلان تو پہلے ہی بنایا ہوا تھا اور یہ اس پر عمل کرنے کا بہترین وقت لگ رہا تھا۔ میں نے سڑک کی جانب دوڑنا شروع کردیا۔ میں اپنے خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ ایک کار کے انجن کی آواز نے مجھے چونکادیا۔

پھر ایک پولیس گشتی کار میرے برابر میں آکر رک گئی۔ ایک ڈپٹی نے اپنی جانب کی کھڑکی کا شیشہ گرادیا۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ ڈیڈی کی تدفین کے موقع پر وہاں موجود تھا۔

"ہے، جیک۔" اس نے مجھے مخاطب کیا۔ "ہمیں ایک عجیب سی فون کال موصول ہوئی ہے۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ شیرف بوڑھے گھور کی قبر کے پاس زخمی پڑا ہے۔ یہ بھی بتایا کہ تم یہاں موجود ہو اور اس بارے میں مجھے سب کچھ تفصیل سے بتاسکتے ہو۔"

میں نے سرہلادیا۔ کرٹس اتنا احمق نہیں تھا جتنا کہ میں اسے سمجھتا تھا۔

☆☆☆

جیل کی کوٹھری میں پیشاب، پسینے اور باسی تمباکو کی بدبو رچی ہوئی تھی۔ میں لکڑی کی بینچ پر بیٹھ گیا اور میں نے اپنا سر سیمنٹ کی دیوار سے ٹکادیا۔ کچھ دیر بعد میرے ڈیڈی کے وکیل جم رالنز نے دروازہ کھولا اور اندر آگیا۔ "کیا تم آج مجھ سے بات کرنا چاہتے ہو؟"

میں نے انکار میں سرہلادیا۔

"اگر تم نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ کیا ہوا تھا تو میں تمہارا دفاع نہیں کرسکوں گا۔ تم پر قبر میں چوری کرنے اور اقدام قتل کے الزامات ہیں۔ تم جانتے ہو کہ یہ کتنے سنگین الزامات ہیں۔ ہے نا؟" وکیل جم رالنز نے کہا۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"تو پھر تم اپنی مرضی چلالو۔ کرٹس کے خلاف تمام الزامات واپس لے لیے گئے ہیں کیونکہ وہ تمہارے خلاف گواہی دینے پر رضامند ہوگیا ہے۔ اس نے تمہارے خلاف الزامات کی فہرست میں اس کاروباری رقم کی خورد برد کو بھی شامل کرنے کی درخواست کی ہے جو تم کرتے رہے ہو۔ میں نے اسے اتنے غصے میں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ وہاں تم دونوں کے درمیان کیا بات ہوئی تھی جو وہ اتنے اشتعال میں ہے؟"

میں نے شانے اچکادیے۔

اگر میں مکمل داستان بیان کردیتا تو کرٹس دوبارہ اس معاملے میں پھنس سکتا تھا اور میں اپنے بھائی کے ساتھ ایسا کچھ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ میں اپنی سزا بھگت لوں گا اور جیل سے رہائی پانے کے بعد اپنی زندگی سنوارنے کی کوشش کروں گا۔ شاید ڈیڈی کے ذہن میں بھی یہی بات تھی اور وہ مجھ سے یہی چاہتے تھے۔

"یہاں آتے ہوئے میں نے ایک عجیب کہانی سنی!" وکیل جم رالنز نے کہا۔ "تمہارے ڈیڈی نے اپنے مرنے سے قبل شیرف کو فون کیا تھا۔ انہوں نے شیرف سے کہا تھا کہ ان کے خیال میں کوئی بوڑھے گھور کی قبر کو کھودنے کی کوشش کرسکتا ہے۔ انہوں نے شیرف سے نگاہ رکھنے کو کہا تھا۔"

یہ سن کر میرا منہ لٹک گیا۔

"تمہیں کم ازکم وکیل کی فیس کے بارے میں فکرمند ہونے کی چنداں ضرورت نہیں۔ تمہارے ڈیڈی نے میرے پاس ایک بڑا سا خاکی رنگ کا لفافہ رکھوایا تھا جس میں 8057.35 ڈالرز کی رقم موجود ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ اگر تم کسی مشکل میں گرفتار ہوجاؤ تو میں اس رقم کو استعمال میں لے آؤں۔" وکیل جم رالنز نے بتایا۔

"میرا بوڑھا باپ ہمیشہ ہمارے بارے میں ہی سوچتا تھا۔" میں نے قدرے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"ایک اور بات۔ اب تمہاری خاندانی تجہیزگاہ کے تمام معاملات کرٹس چلائے گا اور اسے کسی قسم کی مالی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ تمہارے ڈیڈی چار سو ہزار ڈالرز سے زیادہ رقم کا ایک ٹرسٹ فنڈ چھوڑ کر گئے ہیں جس کی خاص ہدایات یہ ہیں کہ یہ فنڈ صرف اور صرف فیملی بزنس کے لیے استعمال میں لایا جائے۔ کیا تمہیں کوئی آئیڈیا ہے کہ انہوں نے اتنی ڈھیر ساری رقم کہاں سے حاصل کی تھی؟"

تب میں نے اس بارے میں مکمل چپ سادھنے کا فیصلہ کرلیا اور پھر کبھی اس بارے میں زبان نہیں کھولی۔ کچھ بھی ہو، آخر کو وہ میرا باپ تھا اور اس نے میری نہ سہی میرے بھائی کی زندگی تو سنوار دی تھی۔

مرزا امجد بیگ

دیر ہو جانا کوئی معنی نہیں رکھتا مگر کچھ بھی غلط ہو جانے سے زندگی کے معنی بدل جاتے ہیں اور کچھ کہا نہیں جاسکتا کہ زن کی بدولت زیادہ جرائم پیدا ہوتے ہیں یا زر کی وجہ سے... جو بھی ہے بہت برا ہے۔ کیونکہ سچ کو سچ ثابت ہونے میں جب سالوں کا عرصہ حائل ہو جائے تو شرافت بھی جرم کا چولا بدل کر تمام تر مفاہمتوں سے دامن بچالیتی ہے... اور یہ صورتِ حال انتہائی خطرناک ہوتی ہے۔ لہٰذا قانون کی اب آنکھیں بھی ہونی چاہئیں اور کان بھی... تب ہی اس کے لمبے ہاتھ مجرم کی گردن تک پہنچ پائیں گے ورنہ سہاروں کا محتاج قانون ہو یا کوئی انسان، لڑکھڑاہٹ قدموں سے جان نکال دیتی ہے... اس کیس میں بھی اگرچہ جھوٹ سے جان پر بن گئی تھی لیکن مرزا امجد بیگ نے تمام لڑکھڑاتی چالوں کو بالائے طاق رکھ کر اصل مجرم کے چہرے سے نقاب اٹھا ہی دیا... اسی میں قانون کی معراج اور قانون کے رکھوالوں کی لاج تھی۔

عدالت کے کٹہرے میں ایک جھوٹے کیس کا سچا فیصلہ

میرا نام جیسا کہ آپ جانتے ہیں، مرزا امجد بیگ اور کام وکالت ہے۔ بعض لوگوں کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ میں ہمیشہ ہر کیس جیت کیسے لیتا ہوں اور میں آج تک جتنے کیسز کی کہانی آپ کو پڑھوا چکا ہوں، اس حساب سے تو میری عمر دو، سوا دو سو سال تو ہونا ہی چاہیے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، سسپنس میں یہ سلسلہ سن اسی یا اکیاسی میں شروع ہوا تھا اور اب دو ہزار چودہ بھی اختتام کی جانب گامزن ہے۔ موٹا سا حساب بھی لگایا جائے تو تینتیس چونتیس سال بنتے ہیں۔

آپ کے پہلے سوال کا جواب تو یہ ہے کہ دنیا میں ایسا کوئی شخص نہیں جس کی زندگی میں کامیابی کے ساتھ ناکامیابی نہ جڑی ہو۔ بس، کم یا زیادہ کا فرق ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے میں بہت خوش قسمت واقع ہوا ہوں کہ میری پیشہ وارانہ زندگی میں ناکامی کا تناسب اتنا کم ہے کہ کسی قطار شمار میں نہیں آتا۔ اِکا دُکا کیسز میں کبھی جزوی اور کبھی کلی طور پر مجھے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اور اس کا بنیادی سبب میرے موکل کی کوئی غلط بیانی ہی رہا ہے۔ یہاں پر یہ مثال صادق آتی ہے کہ ڈاکٹر اور وکیل سے کبھی جھوٹ نہیں بولنا چاہیے ورنہ صحت اور جیت کھٹائی میں پڑ جاتی ہے۔

جہاں تک کیسز کی تعداد کا تعلق ہے تو ایک بات ذہن میں رکھیں کہ عدالتوں میں بعض اوقات ایک ساتھ کئی کیس لگے ہوتے ہیں۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ یہ تعداد کبھی ایک دو تک محدود ہو جاتی ہے اور بعض اوقات درجن سے بھی متجاوز ہو جاتی ہے۔ یہاں پر میں ایک دو اور باتوں کی بھی وضاحت کرتا چلوں۔ اکثر لوگ مجھے کوئی رائٹر قسم کی چیز سمجھتے ہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ میں صرف اپنے کیسز کی فائلز اور دیگر اہم پوائنٹس ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ کے حوالے کر دیتا ہوں۔ وہ اپنے اسٹاف رائٹرز سے کہانی کی شکل میں لکھوا کر آپ کی نذر کرتے ہیں۔ یہ تمام تر کہانیاں اس زمانے کی ہیں جب میں سٹی کورٹ میں باقاعدہ وکالت

کیا کرتا تھا۔ اب وقت کافی آگے بڑھ چکا ہے۔ اس وقت جب آپ یہ کہانی پڑھ رہے ہیں، میں آپ سے کوسوں دور ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہا ہوں۔ اس طویل تمہید کے بعد میں اصل واقعے کی طرف آتا ہوں۔

موسم بہار کا آغاز ہو چکا تھا۔ مارچ قریب الختم تھا۔ میں ایک شام حسب معمول اپنے آفس میں بیٹھا اپنے پاس آنے والے افراد کے مسائل سن رہا تھا کہ ایک پریشان حال خاتون میرے چیمبر میں داخل ہوئی۔ میں نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا اور پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ استفسار کیا۔

"جی، فرمائیں، میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟"

"میرا نام فوزیہ ہے۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ "میں ایک اسکول ٹیچر ہوں۔"

میں نے رف پیڈ اور قلم سنبھال لیا۔ فوزیہ کی عمر تیس سال رہی ہوگی۔ وہ درمیانے قد اور بھرے بھرے بدن کی مالک ایک سانولی اور خوش شکل عورت تھی۔ میں نے پوچھا۔

"کیا آپ کو اپنے اسکول والوں سے کسی قسم کی شکایت ہے؟"

"نہیں وکیل صاحب۔" وہ جلدی سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "میں اپنے نہیں بلکہ داؤد کے مسئلے کے سلسلے میں آپ کے پاس حاضر ہوئی ہوں۔"

"داؤد......" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "یہ کون صاحب ہیں؟"

"داؤد میرے شوہر کا نام ہے۔" اس نے دکھی لہجے میں بتایا۔

"اوہ......!" میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور پوچھا۔ "داؤد کے ساتھ ایسا کیا ہوگیا ہے جو آپ کو میرے پاس آنا پڑا؟"

"داؤد کو پولیس نے گرفتار کرلیا ہے۔"

میں سیدھا ہوکر بیٹھ گیا۔ "کس جرم میں؟"

"اس نے کوئی جرم نہیں کیا وکیل صاحب۔" وہ زخمی لہجے میں بولی۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "میرے سوال کو اس طرح لیں کہ پولیس نے آپ کے شوہر کو کس الزام میں گرفتار کیا ہے؟"

"اس پر قتل کا الزام ہے۔" فوزیہ نے جواب دیا۔

"کس کے قتل کا؟" میرا قلم رف پیڈ پر پھسلنے لگا۔

"مقتول کا نام اسلم فاروقی ہے۔"

"مقتول سے آپ کے شوہر کا کیا تعلق تھا؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ عرصہ پہلے تک ہم اسلم فاروقی کے کرایہ دار تھے۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "لیکن اب ہم نے گھر بدل لیا ہے۔"

"اسلم فاروقی کو کب اور کہاں قتل کیا گیا ہے؟" میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"اس کی فیکٹری میں۔" اس نے جواب دیا۔ "پرسوں سہ پہر کا واقعہ ہے۔"

گزشتہ روز چھبیس مارچ تھا۔ میں نے سوال کیا۔ "اور آپ کے شوہر کو کب گرفتار کیا گیا ہے؟"

"کل رات کو گھر سے۔" اس نے بتایا۔ "اس وقت رات کے نو بجے تھے۔"

"کل رات کو گرفتاری ہوئی۔" میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اس کا مطلب ہے، آج پولیس نے آپ کے شوہر کو عدالت میں پیش کرکے اس کا ریمانڈ حاصل کرلیا ہوگا؟"

"جی ہاں...... ایسا ہو چکا ہے۔" اس نے بتایا۔

"فوزیہ صاحبہ!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ فاروقی کے قتل کے الزام میں آپ ہی کے شوہر کو کیوں گرفتار کیا گیا ہے۔ کیا اس کا کوئی خاص سبب ہے؟"

"پچھلے چند روز سے داؤد اور اسلم فاروقی کے درمیان ٹھن ٹھن چل رہی تھی۔" اس نے جواب دیا۔ "اور آج سہ پہر میں بھی اچھی خاصی تلخ کلامی ہوگئی تھی۔"

"ٹھن ٹھن اور تلخ کلامی کی وجہ؟" میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔

اس نے ایک گہری سانس خارج کی اور جھکے ہوئے لہجے میں بولی۔ "وکیل صاحب، یہ خاصی طویل کہانی ہے۔ اگر آپ بور نہ ہوں تو میں آپ کو سناتی ہوں۔"

"بوریت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" میں نے کہا۔ "اور یہ بات اپنے ذہن میں رکھیں کہ جب تک میں مقتول اور آپ کے شوہر کے درمیان ہونے والی چپقلش اور ٹھن ٹھن سے پوری طرح آگاہ نہیں ہو جاؤں گا، آپ کی کوئی مدد نہیں کرسکوں گا۔"

"ٹھیک ہے، وکیل صاحب۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "میں آپ کو تفصیل سے سارے حالات بتاتی ہوں۔"

آیندہ آدھے گھنٹے میں فوزیہ نے مجھے جو معلومات فراہم کیں۔ میں ان کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ ایک بات کی وضاحت کرتا چلوں کہ ان میں سے بہت سی باتیں مجھے بعد میں معلوم ہوئی تھیں لیکن واقعات کے تسلسل کو قائم رکھنے کے لیے میں نے انہیں بھی بیان کردیا ہے۔ اسی طرح بعض باتیں میں نے دانستہ حذف کردی ہیں۔ ان کا ذکر عدالتی کارروائی کے دوران میں مناسب موقع پر کیا جائے گا۔

یہ بھی بتادوں کہ فوزیہ کی فراہم کردہ تفصیلات کی روشنی میں، اسی رات میں نے متعلقہ تھانے جاکر ملزم داؤد سے ایک تفصیلی ملاقات بھی کرلی تھی۔ داؤد سے بھی کافی کارآمد باتیں پتا چلی تھیں۔ چنانچہ پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد میں نے یہ کیس اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ فیس کے حوالے سے فوزیہ نے مجھ سے ایک درخواست کی اور میں نے اس کی بات مان لی۔ میں فیس کی پیشگی وصولی کے اصول پر سختی سے کاربند رہتا ہوں لیکن پتا نہیں، فوزیہ کی درخواست میں ایسی کیا بات تھی کہ میں دو قسطوں میں فیس لینے پر راضی ہوگیا۔ آدھی ایڈوانس اور آدھی کیس کی باقاعدہ سماعت شروع ہونے پر۔ بعض اوقات انسان کو اپنے اصولوں میں لچک پیدا کرنا پڑتی ہے۔

☆☆☆

داؤد اور فوزیہ کی شادی کو پانچ سال ہوگئے تھے تاہم ابھی تک وہ دو سے تین نہیں ہوئے تھے۔ داؤد بولٹن مارکیٹ میں ایک دکان پر سیلزمین کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ مذکورہ دکان پر الیکٹرک کی، گھریلو استعمال کی اشیا فروخت ہوتی تھیں مثلاً پنکھے، ٹیوب لائٹس، استریاں وغیرہ۔ داؤد کی ڈیوٹی آٹھ سے دس گھنٹے کی تھی جس کی اسے دو ہزار تنخواہ ملتی تھی۔ وہ سستا زمانہ تھا۔ دو ہزار روپے کو خاصی معقول تنخواہ سمجھا جاتا تھا۔

فوزیہ ایک اسکول ٹیچر تھی اور اسے پندرہ سو تنخواہ ملتی تھی۔ دونوں کی آمدنی کل ملا کر اتنی ہوجاتی تھی کہ وہ بہ آسانی گزارہ کرلیتے تھے۔ انہیں کبھی کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ شادی کے بعد ان پانچ سالوں میں انہوں نے چار گھر بدلے تھے۔ فاروقی والا گھر پانچواں تھا اور جب یہ کیس میرے پاس آیا، وہ فاروقی والے گھر کو بھی خیرباد کہہ چکے تھے۔

اسلم فاروقی ناظم آباد کے علاقے میں رہتا تھا اور گھر کے قریب ہی دو چار گلیاں چھوڑ کر اس نے ایک چھوٹا سا کارخانہ کھول رکھا تھا جہاں وہ ماسکنگ ٹیپ تیار کرتا تھا۔ ماسکنگ ٹیپ پیکنگ وغیرہ کے کام آتی تھی۔ علاوہ ازیں مختلف نوعیت کے فرنیچر زپر ڈیزائن وغیرہ بنانے کے لیے بھی اسے استعمال کیا جاتا تھا۔ اسپرے پینٹ کرنے والے بھی مختلف مقاصد کے لیے ماسکنگ ٹیپ کا سہارا لیتے تھے۔ اسلم فاروقی کا یہ چھوٹا سا کارخانہ ایک گھر کے اندر ہی کھلا ہوا تھا جہاں وہ محدود عملے کے ساتھ ماسکنگ ٹیپ کی تیاری کا کام جاری رکھے ہوئے تھا۔ اس کا بزنس ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا۔

کارخانے کے علاوہ فاروقی کا ایک اور ذریعہ آمدنی بھی تھا۔ اس کا گھر ایک سو چالیس گز پر بنا ہوا ایک دو منزلہ مکان تھا۔ بالائی منزل پر وہ خود اپنی فیملی کے ساتھ رہتا تھا۔ جبکہ زیریں منزل کو دو برابر حصوں میں تقسیم کرکے اس نے دو کرایہ دار بسا رکھے تھے۔ ان دو پورشنز سے اسے اتنا کرایہ مل جاتا تھا کہ اس میں اس کی پوری فیملی کا مہینے بھر کا راشن ڈل جاتا تھا۔ دونوں میاں بیوی کے علاوہ ان کی کل سات اولادیں تھیں جن میں بیٹے اور بیٹیاں دونوں شامل تھے۔ فاروقی کے بچوں کی عمریں تین سے سولہ سال کے درمیان تھیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق فاروقی کے بچے بدتمیزی اور شیطانی میں پورے محلے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے اور دلچسپ بات یہ کہ فاروقی اور اس کی بیوی زبیدہ کو اپنی اولاد میں کوئی عیب دکھائی نہیں دیتا تھا۔ کہیں بھی لڑائی چھڑا ہو، وہ اپنے بچوں ہی کی حمایت میں بولتے تھے۔ بعض والدین اسی طرح کے ہوتے ہیں۔

زبیدہ ایک موٹی اور بیمار عورت تھی جس کا زیادہ تر وقت بستر پر گزرتا تھا۔ وہ چوبیس گھنٹے میں بہتر قسم کی دوائیں کھاتی تھی۔ اسے درجنوں بیماریاں لاحق تھیں۔ واقفانِ حال بتاتے تھے کہ شادی کے وقت زبیدہ بہت خوب صورت اور اسمارٹ ہوا کرتی تھی۔ اسلم فاروقی کے رویے اور اوپر تلے سات بچوں کی پیدائش نے زبیدہ کو اتنی من کی دھوبن بنا کر رکھ دیا تھا۔

میرا موکل داؤد بھی چند روز پہلے تک فاروقی کا کرایہ دار تھا۔ وہ لگ بھگ دو سال تک فاروقی والے گھر میں رہا تھا پھر فاروقی کے نامناسب رویے کو دیکھتے ہوئے وہ اس گھر کو چھوڑنے پر مجبور ہوگیا تھا۔ اس کے برابر میں دوسرے پورشن میں ایک کرسچین فیملی آباد تھی۔ اگرچہ یہ دونوں پورشنز سیکیورٹی کے لحاظ سے انتہائی محفوظ، روشن اور ہوادار تھے لیکن فاروقی کی شاطرانہ ہوشیاری داؤد اور فوزیہ کی برداشت سے باہر ہوگئی تھی۔

جب وہ لوگ کرایے پر یہاں رہنے آئے تھے تو فاروقی کے حسنِ اخلاق اور اصول پسندی نے انہیں بہت متاثر کیا تھا لیکن جلد ہی انہیں احساس ہوگیا کہ اسلم فاروقی کی اصول پسندی صرف اسی کو فائدہ پہنچانے کے لیے ہے۔ لگ بھگ ایک ماہ کے بعد جب بجلی اور گیس کے بلز آئے تو ان کے بیچ پہلا پھڈا ہوا۔

فوزیہ، داؤد کی بہ نسبت جلدی گھر آجایا کرتی تھی۔ رات کو جب داؤد گھر پہنچا تو فوزیہ نے اس کے سامنے ایک پرچی رکھ دی۔ داؤد نے سوالیہ نظر سے بیوی کو دیکھا اور پوچھا۔

''کیا ہے......؟''

''بجلی اور گیس کا بل ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

''یہ کس قسم کا بل ہے......!'' داؤد نے اس پرچی کو الٹ پلٹ کرتے ہوئے جھنجلاہٹ بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

''یہ تو تم فاروقی صاحب سے پوچھو۔'' وہ بے نیازی سے بولی۔ ''یہ پرچی ان کا بچہ دے گیا ہے۔''

داؤد ہاتھ منہ دھو کر فریش ہوا پھر کھانا کھانے کے بعد وہ اوپر اسلم فاروقی کے پاس چلا گیا۔ فاروقی نے بڑے تپاک سے اس کا استقبال کیا اور اپنے ڈرائنگ روم میں بٹھانے کے بعد چائے پانی کے بارے میں پوچھا۔

''کسی تکلف کی ضرورت نہیں فاروقی صاحب!'' داؤد نے جلدی سے کہا۔ ''میں ابھی کھانا کھا کر آرہا ہوں۔''

''چائے تو چلے گی......!''

''نہیں، بالکل نہیں۔'' داؤد نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''میں اس پرچی کے بارے میں آپ سے پوچھنے آیا تھا۔''

''یہ آپ کا پچھلے مہینے کا بجلی اور گیس کا بل ہے۔'' فاروقی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''میں نے دونوں اماؤنٹ کو اوپر نیچے لکھ کر ٹوٹل کر دیا ہے۔''

''وہ تو مجھے بھی نظر آرہا ہے جناب۔'' داؤد نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔ ''لیکن یہ تو بہت زیادہ ہے۔ ہم تو پہلے بھی دوسرے گھروں میں کرایے پر رہے ہیں......''

''ٹھہریں...... میں آپ کو کچھ دکھاتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے اسلم فاروقی اپنی جگہ سے اٹھ گیا اور گھر کے اندرونی حصے کی جانب قدم بڑھا دیے۔

تھوڑی دیر کے بعد جب وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک فائل تھی۔ وہ داؤد کے قریب ہی بیٹھ گیا اور بولا۔

''میں اپنے گھر کے تمام یوٹیلٹی بلز نہایت ہی پابندی کے ساتھ بھرتا ہوں اور جمع شدہ بلز سنبھال کر اس فائل میں لگا لیتا ہوں۔'' فائل میں لگے بلز کو الٹ پلٹ کرنے کے بعد اس نے دو بلز نکال لیے اور داؤد کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

''دیکھ لیں۔ یہ گیس اور بجلی کے تازہ ترین بلز ہیں۔ میں نے بل کی رقم کو تین پر برابر تقسیم کرنے کے بعد ایک حصے کی پرچی آپ کو بھجوائی تھی۔ میں نے یہ دونوں بلز بینک میں بھر دیے ہیں۔''

''تین پر برابر تقسیم......'' داؤد نے سوالیہ نظر سے فاروقی کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''آپ کی یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی؟''

''بھئی، اس میں سمجھ میں نہ آنے والی کون سی بات ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''اس مکان میں تین فیملیز آباد ہیں۔ ایک میری فیملی، ایک آپ کی فیملی اور ایک آپ کے پڑوسی ساؤل کی فیملی۔ بجلی اور گیس کا جو بھی بل آئے گا وہ ہم تینوں پر ہی تقسیم ہوگا نا......!''

''تقسیم کا یہ فارمولا تو اپنی جگہ درست ہے فاروقی صاحب۔'' داؤد نے تحمل سے کہا۔ ''لیکن آپ یہ بھی تو دیکھیں کہ تینوں فیملیز کا استعمال ایک جیسا نہیں۔ جب وہ بجلی اور گیس ایک جتنی استعمال نہیں کرتے تو بلز میں برابر شیئر کیوں کریں......'' لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''فاروقی صاحب! آپ کے گھر میں ماشاءاللہ نو افراد آباد ہیں اور رہائشی پورشن بھی ہم سے دگنا ہے۔ ساؤل کی فیملی میں چار افراد ہیں۔ میاں بیوی اور دو بچے اور ہم تو صرف دونوں میاں بیوی ہیں جو دن بھر گھر سے باہر رہتے ہیں۔ ہم دونوں جاب والے ہیں۔ سب سے کم ہم بجلی اور گیس استعمال کرتے ہیں۔''

''آپ نے جو اعداد و شمار بیان کیے ہیں میں ان سے اختلاف نہیں کروں گا۔'' فاروقی گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے تو آپ کوئی اور گھر دیکھ لیں۔''

داؤد نے دو تین ماہ کی تلاش کے بعد یہ گھر پسند کیا تھا۔ وہ فوری طور پر کوئی نیا تجربہ کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ گھر سیکیورٹی کے لحاظ سے انتہائی محفوظ تھا۔ ویسٹ اوپن ہونے کی وجہ سے ہوا کی آمد و شد بہت زیادہ تھی۔ پورشن کے عقبی حصے یعنی صحن سے آسمان نظر آتا تھا لہٰذا دھوپ بھی گھر میں بہ آسانی داخل ہو جاتی تھی۔ وہ ایک آئیڈیل رہائش تھی۔ بس، یہ بلز کا مسئلہ آن کھڑا ہوا تھا اور وہ بھی اس لیے کہ بجلی اور گیس کے میٹرز مشترکہ تھے۔ اگر یہ بلز تینوں فیملیز پر برابر تقسیم کیے جاتے تو اصولی طور پر یہ ایک غیر منصفانہ تقسیم تھی کیونکہ تینوں فیملیز کے حجم میں زمین آسمان کا فرق تھا جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ لوگ بجلی اور گیس بھی ایک دوسرے کی بہ نسبت کم اور زیادہ استعمال کرتے تھے۔

''بات دوسرا گھر دیکھنے کی نہیں ہے فاروقی صاحب!'' داؤد نے قدرے نرمی سے کہا۔ ''آپ خود بھی تو دیکھ رہے ہیں۔ ہم دونوں میاں بیوی پورا دن گھر میں نہیں ہوتے۔ رات کو ایک پنکھا چلتا ہے یا دو گھنٹے کے لیے دو ٹیوب لائٹس جلتی ہیں۔ اسی طرح گیس کا سب سے کم استعمال بھی ہمارے ہی گھر میں ہے۔ اس صورتِ حال میں بلز میں برابر شیئرز زیادتی والی بات نہیں؟''

''آپ کی بات میں وزن تو ہے داؤد صاحب!'' اسلم فاروقی نے گمبھیر انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''آپ ہی بتائیں، اس مسئلے کو کس طرح حل کیا جائے۔ آپ کے ذہن میں کوئی آئیڈیا ہو تو سامنے لائیں؟''

''کیوں نا کرایے داروں کے لیے بجلی اور گیس کے سب میٹرز لگا لیے جائیں۔'' داؤد نے گہری سنجیدگی سے مشورہ دیا۔ سب میٹرز کی ریڈنگ کے مطابق آپ مجھ سے بل لے لیا کریں۔ اگر کم استعمال ہوگا تو کم اور زیادہ استعمال ہوگا تو زیادہ۔''

''ہوں......'' فاروقی سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''تجویز تو آپ کی خاصی معقول ہے۔''

''فاروقی صاحب!'' داؤد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''گیس کی تو پھر بھی خیر ہے۔ یہ کمپنی بڑی شرافت کا مظاہرہ کرتی ہے۔ بہت ہی معقول بلز ہوتے ہیں ان کے۔ اگر آپ صرف بجلی کے ہی سب میٹرز لگوا دیں تو مسئلہ حل ہو جائے گا۔''

''ٹھیک ہے، تین سب میٹرز لگوا لیتے ہیں۔'' فاروقی نے رضامندی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

''تین کیوں فاروقی صاحب؟'' داؤد نے پوچھا۔ ''آپ کے کرایے دار تو صرف دو ہی ہیں......''

''پانی والی موٹر کو کیوں فراموش کر رہے ہیں آپ!'' فاروقی نے چبھتے ہوئے انداز میں کہا۔ ''سب سے زیادہ بجلی تو وہی کھاتی ہے۔ لائن کا پانی کھینچنے کے لیے رات کو چار پانچ گھنٹے موٹر چلانا پڑتی ہے پھر انڈر گراؤنڈ ٹینک کا پانی چھت والی ٹینکی میں منتقل کرنے کے لیے بھی ایک آدھ گھنٹا موٹر چلتی ہے۔ پانی تو ہر گھر کی ضرورت ہے۔ کوئی کم استعمال کرے یا زیادہ لیکن آپ نے یہ تو دیکھا ہوگا کہ چوبیس گھنٹے پانی لائن کے اندر موجود رہتا ہے۔''

''یہ تو آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں فاروقی صاحب۔'' داؤد نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ ''یہاں پر پانی کی کوئی پرابلم نہیں ہے۔''

''بس تو پھر ٹھیک ہے۔'' فاروقی نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''تین سب میٹرز لگوا لیتے ہیں۔ دو آپ دونوں کرایے داروں کے اور ایک موٹر کا۔ موٹر والی ریڈنگ کو تین پر برابر تقسیم کر لیں گے۔'' لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''داؤد صاحب! بجلی کے محکمے میں آپ کا کوئی جاننے والا ہے؟''

''نہیں جناب۔'' داؤد نے نفی میں گردن ہلا دی۔

''ٹھیک ہے، میں ہی کسی سے بات کرتا ہوں۔''

داؤد نے اسلم فاروقی کا شکریہ ادا کیا اور واپس اپنے گھر آگیا۔ فوزیہ کو اس نے اس گفتگو کی تفصیل سے آگاہ کیا تو وہ بھی مطمئن ہوگئی۔ آئندہ چند روز میں اسی موضوع پر داؤد کی ساؤل سے بھی بات ہوئی۔ ساؤل نے بھی اس آئیڈیا کو سراہا۔ وہ بھی اس بات سے سخت پریشان تھا کہ مالک مکان یعنی اسلم فاروقی کا بجلی اور گیس کا استعمال ان سے دوگنا تھا بلکہ ان سے بھی کہیں زیادہ اور وہ شاطر آدمی بلز کا زیادہ تر بوجھ اپنے کرایے داروں کے کندھوں پر منتقل کر دیتا تھا۔

دو ماہ گزر گئے لیکن اسلم فاروقی سب میٹرز لگوانے کی مہم میں کامیاب نہ ہو سکا۔ جب داؤد اور ساؤل کا اصرار بڑھا تو ایک روز اس نے ان دونوں کو ایک خطرناک خوشخبری سنا دی۔

''بھئی! میں نے بجلی کے محکمے میں ایک بندے سے سب میٹرز کے سلسلے میں بات کر لی ہے۔'' فاروقی نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میٹرز تو لگ جائیں گے لیکن ایک مسئلہ ہے......!''

''کیا مسئلہ فاروقی صاحب؟'' ساؤل نے اضطراری انداز میں پوچھا۔

''وہ بندہ فی میٹر تین ہزار روپے کا خرچہ بتا رہا ہے۔'' فاروقی نے کہا۔ ''یعنی تین میٹرز کے نو ہزار روپے اور ایک ہزار روپے اس کے چائے پانی کے لیے۔ کل ملا کر دس ہزار کا خرچہ ہے جناب۔''

''تو......؟'' داؤد نے سوالیہ نظر سے فاروقی کی طرف دیکھا۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''چار چار ہزار روپے

آپ دونوں کو دینا ہوں گے اور دو ہزار میں دے دوں گا۔ ایک ہزار اپنا اور ایک ہزار اس بندے کا جیب خرچ۔"

"یہ کس قسم کا حساب ہے فاروقی صاحب؟" ساؤل نے استفسار کیا۔

"بھئی! حساب تو بہت سیدھا ہے۔ پتا نہیں، آپ لوگوں کی سمجھ میں کیوں نہیں آرہا۔" فاروقی نے جھنجلاہٹ بھرے لہجے میں کہا۔ "بجلی کے محکمے والے بندے کو میں اپنی جیب سے ایک ہزار دوں گا۔ اس کا بوجھ آپ لوگوں پر نہیں ڈال رہا۔ باقی اپنے میٹر کے تین ہزار اور ایک ہزار موٹر والے میٹر کا شیئر تو آپ کو ہی دینا ہوگا نا۔"

"یہ تو سراسر ظلم ہے فاروقی صاحب!" داؤد نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ "ہم تو کرایے دار ہیں۔ اس نوعیت کے اخراجات کا بوجھ آپ ہم پر تو نہیں ڈال سکتے۔"

"بھئی! جو حقیقت تھی وہ میں نے آپ لوگوں کے سامنے رکھ دی ہے۔" وہ روکھے لہجے میں بولا۔ "اگر آپ کو سب میٹرز لگوانے کا شوق ہے تو یہ بوجھ تو برداشت کرنا ہی ہوگا۔ آپ اگر یہ کام کسی بندے سے مفت میں کرواسکتے ہیں تو کروالیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں......" لمحاتی توقف کرکے اس نے باری باری دونوں کو گہری نظر سے دیکھا اور سپاٹ آواز میں بولا۔

"میں اس سے زیادہ آپ لوگوں کے لیے اور کچھ نہیں کرسکتا۔ اگر آپ ان حالات میں یہاں رہنا نہ چاہتے ہوں تو میری طرف سے کوئی پابندی یا زبردستی نہیں ہے۔ آپ کو کرایے کے گھر بہت مل جائیں گے اور مجھے کرایے دار......!"

فاروقی کے یہ جملے کرایے دار کے غبارے کی ساری ہوا نکال دیتے تھے۔ اس بات میں کسی شک وشبہے کی گنجائش نہیں تھی کہ مکانیت اور تحفظ کے لحاظ سے فاروقی کا گھر بہت ہی آئیڈیل رہائش گاہ تھی جہاں آپ کی عزت، جان اور مال کو کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا لہٰذا قدرے زیادہ بلز کو کڑوا گھونٹ سمجھ کر حلق سے اتارا جاسکتا تھا۔

ساؤل نے کبھی فاروقی سے بلز کا شکوہ نہیں کیا تھا اور اس کا ایک بڑا سبب تھا۔ اس کی آٹھ سالہ بیٹی میری اور دس سالہ بیٹا ایوریسٹ گھر سے نزدیک ہی ایک اسکول میں پڑھتے تھے۔ اگر وہ گھر تبدیل کرتا تو بچوں کا اسکول بھی تبدیل کرنا پڑتا جو خاصا خرچے والا کام تھا، پھر اس کے دونوں بچے اس اسکول میں بہت اچھے جارہے تھے۔ نئے اسکول میں جاکر ان کا کیا حشر ہوتا، قبل از وقت کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا تھا۔ علاوہ ازیں، سب سے اہم بات یہ تھی کہ ساؤل کو اپنی جاب کے سلسلے میں بھی ایک دو روز کے لیے شہر سے باہر بھی جانا پڑتا تھا۔ فاروقی کا گھر ایسا تھا کہ وہ اپنی فیملی کی سیکیورٹی کے حوالے سے بے فکر ہوکر دو چار دن گھر سے باہر گزار سکتا تھا۔

داؤد کے ساتھ اگرچہ شہر سے باہر جاکر وقت گزارنے کا کوئی معاملہ نہیں تھا لیکن یہ بات وہ بھی مانتا تھا کہ بلز کی مد میں دو تین سو زیادہ تو جارہے تھے لیکن یہاں اطمینان اور سکون دوسرے گھروں کی بہ نسبت بہت زیادہ تھا چنانچہ اس نے بھی حالات سے سمجھوتا کرنے ہی میں بھلائی جانی۔

وقت تیزی سے آگے بڑھتا گیا۔ سال کے اختتام پر فاروقی نے کرایے میں دو سو روپے اضافے کا مطالبہ کردیا۔ داؤد آٹھ سو روپے کرایے پر یہاں آیا تھا اور اب فاروقی یہ کرایہ ایک ہزار کرنا چاہتا تھا۔ ان دنوں شہر کے مختلف علاقوں میں چوریوں اور ڈکیتیوں کی ایک وبا سی پھوٹ پڑی تھی۔ ہر روز دو چار ایسی خبریں سننے کو مل جاتی تھیں کہ فلاں علاقے میں فلاں واردات ہوگئی۔ اس صورت حال میں داؤد نے شفٹنگ کا رسک لینے کے بارے میں سوچا بھی نہیں اور بڑی شرافت کے ساتھ فاروقی کا مطالبہ تسلیم کرتے ہوئے کرایے میں دو سو روپے کا اضافہ کردیا۔

مزید ایک سال گزر گیا۔ اس سال کے اختتام پر حالات ایسے واہیات ہوگئے کہ داؤد کو وہ گھر چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اچانک لائن میں پانی غائب ہوگیا تھا۔ جب دو دو، تین تین دن کے وقفے سے پانی آنے لگا تو گھریلو ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ٹینکرز ڈلوانے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ پانی کا ٹینکر جتنے میں آتا وہ رقم تینوں گھروں پر تقسیم کردی جاتی تھی۔ یہاں تک تو سب ٹھیک تھا لیکن خرابی اس وقت پیدا ہوئی جب ٹینکر کی قیمت میں برابر شیئر کرنے کے باوجود بھی داؤد اور فوزیہ کو پانی سے محرومی کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ انتہائی ناقابل برداشت سچویشن تھی۔

پانی کا ٹینکر عموماً صبح دس گیارہ بجے ڈلتا تھا اور اس وقت داؤد اور فوزیہ گھر میں موجود نہیں ہوتے تھے۔ جب وہ اپنی اپنی جاب سے واپس آتے تو پانی ختم ہوچکا ہوتا تھا۔ وہ لوگ جیسے تیسے گزارہ کرتے اور اگلے روز محض منہ دھوکر گھر سے نکل جاتے۔ یہ سلسلۂ ناانصافی زیادہ دنوں تک نہیں چل سکتا تھا پھر فوزیہ کے انکشاف نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔

"مجھے پکی خبر ملی ہے کہ فاروقی نے اپنے گھر کے اندر بھی پانی کی ایک ٹینکی لگا رکھی ہے۔" فوزیہ نے ایک رات داؤد کو بتایا۔ "اگر تمہیں میری بات کا یقین نہ ہو تو اس کے

گھر کے اندر جھانک کر خود تصدیق کرلو......!"

"تو کمینگی کی انتہا ہے۔" داؤد نے غصیلے لہجے میں کہا۔ "میں کسی تصدیق کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ تم بھلا مجھ سے جھوٹ کیوں کہوگی۔"

"ہمیں دو دو، تین تین دن کے بعد نہانا نصیب ہوتا ہے۔ میلے کپڑوں کا ایک انبار جمع ہوگیا ہے۔" فوزیہ نے دکھی لہجے میں کہا۔ "جب پانی کا ٹینکر ڈلتا ہے تو ہم دونوں گھر میں موجود نہیں ہوتے۔ میں واپس آکر دیکھتی ہوں تو فاروقی کے سارے بچے نہائے دھوئے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کے بدن پر اجلا لباس موجود ہوتا ہے۔ ہمارے پورشن کے صحن سے ان کے گھر کی دونوں الگنیاں نظر آتی ہیں جن پر درجنوں کپڑے سوکھنے کے لیے لٹکے دکھائی دیتے ہیں اور یہ سب دیکھ کر دل کڑھتا ہے داؤد۔"

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو فوزیہ۔" داؤد گہری سنجیدگی سے بولا۔ "پانی کی شارٹیج کا ایسا معاملہ آن پڑا ہے کہ یہ مسئلہ دنوں میں تو حل ہوتا نظر نہیں آتا۔ جب تک لائن میں مناسب پانی آنا شروع نہیں ہوتا، ٹینکرز تو ڈلیں گے۔ اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ہم دونوں کام کاج چھوڑ کر دن بھر گھر میں بیٹھے رہیں اور جیسے ہی پانی کا ٹینکر ڈلے، اس سے کما حقہ، استفادہ کریں۔"

"ایک کام ہوسکتا ہے داؤد......!" فوزیہ نے صلاح دینے والے انداز میں کہا۔

"ہاں بولو...... کون سا کام؟" داؤد نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"تم فاروقی سے کہو کہ ہمارے پورشن میں جست کی ایک چھوٹی سی ٹینکی لگوادے۔" فوزیہ نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "ہم اپنی اپنی ڈیوٹی پر جاتے ہوئے اس کا والو کھول جایا کریں گے۔ جب ٹینکر والا پانی چلے گا تو ہماری ٹینکی میں بھی آجائے گا۔ پھر ہم اپنی سہولت سے اسے استعمال کرلیا کریں گے۔"

"تجویز تو تمہاری اچھی ہے۔" وہ تعریفی نظر سے فوزیہ کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "لیکن پچھلے دو سال میں فاروقی کو میں جتنا سمجھ سکا ہوں اس کی روشنی میں بڑے وثوق کے ساتھ میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ ٹینکی لگوا کر دینے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوگا۔ وہ یہی کہے گا کہ...... اپنی جیب سے لگوالو!"

"تم اس سے بات تو کرو۔" فوزیہ نے کہا۔ "دیکھیں، وہ کیا جواب دیتا ہے۔"

اگلے روز داؤد نے پانی کی غیر منصفانہ تقسیم پر اسلم فاروقی سے بات کی تو اس نے کھرے لہجے میں کہا۔

"داؤد میاں! اگر تم لوگ دن بھر گھر میں نہیں ہوتے تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟"

"آپ کا کوئی قصور نہیں ہے فاروقی صاحب!" داؤد نے معتدل انداز میں کہا۔ "لیکن آپ میرے مسئلے کو بہ آسانی حل کرسکتے ہیں۔"

"وہ کس طرح؟" فاروقی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"آپ ہمیں چھوٹی سی جستی ٹینکی لگوادیں۔" داؤد

نے اپنی بیوی کی تجویز کو مالک مکان کی سماعت میں انڈیلتے ہوئے کہا۔ ”ٹینکی میں پانی جمع رہے گا تو ہمیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔“

”تو ٹھیک ہے۔“ فاروقی نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ”آپ اپنی مدد آپ کے تحت ٹینکی لگوالیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

”بات اعتراض کی نہیں گنجائش کی ہے فاروقی صاحب۔“ داؤد خود پر جبر کرتے ہوئے بولا۔ ”ابھی میری جیب اس خرچے کی اجازت نہیں دیتی۔“

”میری جیب کا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے داؤد صاحب۔“ فاروقی نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ”آپ دو ماہ تک رک جائیں تو شاید کوئی سبیل نکل آئے۔“

داؤد کو ایک سو ایک فیصد یقین تھا کہ فاروقی اپنی مالی حالت کے حوالے سے قصداً دروغ گوئی سے کام لے رہا تھا۔ اس کا شاپ کا بزنس ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا اور دو پورشنز کا کرایہ بھی ہر ماہ باقاعدگی کے ساتھ اس کی جیب میں جا رہا تھا۔ یہ جاننے کے لیے کہ فاروقی کے ذہن میں کیا ہے، داؤد نے پوچھ لیا۔

”فاروقی صاحب! دو ماہ کے بعد ایسا کیا ہونے والا ہے؟“

”دو ماہ کے بعد آپ کا سال پورا ہوجائے گا۔“ فاروقی نے داؤد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے آپ کا کرایہ بڑھانا ہے۔ ساؤل کا اگلے مہینے بڑھاؤں گا۔ پھر ہاتھ میں تھوڑی گنجائش پیدا ہوجائے گی۔ میں دونوں پورشنز میں جست کی چھوٹی ٹینکیاں لگوا دوں گا لیکن اسی شرط پر......“

”کون سی شرط فاروقی صاحب؟“ داؤد نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

فاروقی نے جواب دیا۔ ”آدھے آدھے پر...... یعنی ٹینکی کے آدھے پیسے میں دوں گا، آدھے آپ۔ اللہ اللہ، خیر سلا......!“

فاروقی کی چالاکی اور کمینگی کسی تعارف کی محتاج نہیں تھی۔ داؤد دل ہی دل میں کھول کر رہ گیا۔ فاروقی سے کسی بحث کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے ٹینکی کے معاملے پر اصرار کیا تو وہ فلسفہ جھاڑنے لگے گا جس کے نتیجے میں داؤد کو غصہ آجائے گا اور پھر کوئی بھی بدمزگی ہوسکتی تھی۔

وہ خاموشی سے اٹھا اور اپنے گھر آگیا۔ فوزیہ نے جب پوچھا کہ کیا رہا تو اس نے فوزیہ کو فاروقی کے ساتھ ہونے والی ملاقات کی تفصیل سے آگاہ کردیا۔ فوزیہ نے پوری بات سنی اور ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔

”اب تو صرف ایک ہی صورت باقی بچی ہے......!“

”کون سی صورت؟“ داؤد نے پوچھا۔

”پانی کے بغیر گزارہ ممکن نہیں ہے۔“ فوزیہ نے [illegible] ہوئے لہجے میں کہا۔ ”ہمیں اپنی جیب سے ہی ٹینکی لگوانا پڑے گی۔“

”ایک اور صورت بھی ہے۔“ داؤد نے زہرخند انداز میں کہا۔ ”جو تمہاری پیش کردہ صورت سے زیادہ موثر ہے۔“

”میں بھی تو سنوں......؟“ فوزیہ نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”اگر ہم اپنی جیب سے ٹینکی لگوا بھی لیں تو فاروقی کی ذلالت کا سلسلہ کہیں پر رکنے والا نہیں۔“ داؤد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”یہ ذلیل انسان کل کوئی نیا ایشو کھڑا کردے گا۔“

”پھر......؟“ فوزیہ کی سوالیہ نگاہ داؤد پر ٹکی تھی۔

”پھر میں نے فیصلہ کیا ہے کہ......“ داؤد نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”ہم بہت جلد اس گھٹیا انسان کا گھر چھوڑ دیں گے۔“

”داؤد! کیا نیا گھر آسانی سے مل جائے گا۔“ فوزیہ نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔

”آسانی سے نہیں تو مشکل سے مل جائے گا۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”فاروقی دو ماہ کے بعد کرایہ بڑھانے کی بات کر رہا ہے۔ میرا خیال ہے، اس سے پہلے میں کوئی اور مناسب سا گھر تلاش کرنے میں کامیاب ہوجاؤں گا۔“

اگلے ہی روز سے داؤد نے گھر کی تلاش شروع کردی اور دو ماہ سے ایک ہفتہ قبل اس نے جہانگیر روڈ پر ایک چھوٹا سا مکان ڈھونڈ نکالا۔ اس نے فوزیہ کو بھی مذکورہ مکان دکھایا۔ فوزیہ نے بھی مکان پسند کرلیا پھر باہمی رضامندی سے انہوں نے اسلم فاروقی کا گھر چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا۔ چوبیس فروری کو داؤد نے فاروقی سے ملاقات کی اور اسے اپنے فیصلے سے آگاہ کردیا۔

”یہ کون سا طریقہ ہے داؤد صاحب!“ فاروقی نے برہمی سے کہا۔ ”آپ کو ایک ماہ پہلے بتانا چاہیے تھا جو کہ ایک اصول بھی ہے۔ اگر مجھے آپ سے گھر خالی کرانا ہوتا تو ایک ماہ پہلے نوٹس دیتا۔“

”میں آپ کی بات سے اختلاف نہیں کروں گا کیونکہ آپ نے ایک اصولی بات کی ہے۔“ داؤد نے نرمی سے کہا۔ ”لیکن آپ میری مجبوری کو بھی تو سمجھنے کی کوشش کریں، میرا خیال ہے، اب ہم مزید ایک ساتھ نہیں چل سکیں گے۔“

”ٹھیک ہے، میں آپ کی مجبوری کا احساس کرلیتا ہوں۔“ فاروقی نے چالاکی سے کہا۔ ”لیکن میں ایڈوانس کی رقم فوری طور پر ارینج نہیں کرسکوں گا۔ چند دن اوپر نیچے ہوسکتا ہے۔“

”جناب! میں نے وہاں ٹوکن (بیعانہ) دے دیا ہے۔“ داؤد نے نرمی سے کہا۔ ”ہم لوگ یکم مارچ کو شفٹنگ کریں گے۔ آج چوبیس تاریخ ہے۔ آپ کوشش کریں گے تو ارینج ہو ہی جائے گا۔“

”فروری ویسے بھی اٹھائیس کا مہینا ہے۔“ فاروقی نے ہونٹ سکیڑتے ہوئے کہا۔ ”بہرحال، میں کوشش کرتا ہوں۔“

داؤد مطمئن ہوگیا لیکن جب یکم مارچ تک بھی داؤد نے ایڈوانس کی رقم واپس نہ کی تو پریشانی نے اسے گھیر لیا۔ نئے مکان میں سامان رکھنے سے پہلے ایک ماہ کا کرایہ اور ایڈوانس کی رقم مالکِ مکان کو ادا کرنا ضروری تھا۔ کرایہ تو اس کے پاس تھا لیکن ایڈوانس کی رقم فاروقی سے لے کر ہی نئے مالک مکان کو دینا تھی اور فاروقی لیت و لعل سے کام لے رہا تھا۔

یکم سے دو مارچ ہوا تو داؤد کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ نئے مالک مکان نے بڑے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ اگر وہ چوبیس گھنٹے کے اندر ایڈوانس کی رقم ادا نہیں کرے گا تو وہ مکان کسی اور پارٹی کو کرایے پر اٹھا دے گا۔ دو تین اور فیملیز بھی وہ مکان دیکھنے آرہی تھیں۔ داؤد نے جاکر فاروقی کی منت کی۔

”فاروقی صاحب! آپ صبح مجھے ایڈوانس کی رقم واپس کردیں ورنہ وہ مکان میرے ہاتھ سے نکل جائے گا اور میں نے جو ٹوکن وہاں دیا ہے وہ بھی واپس نہیں ملے گا۔“

”صبح تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ فاروقی نے بڑی سفاکی سے کہا۔ ”چند دن اور لگ جائیں گے۔“

”کتنے چند دن اور......؟“ داؤد نے تلخ لہجے میں پوچھا۔

داؤد اچھی طرح جانتا تھا کہ فاروقی جان بوجھ کر اسے تنگ کر رہا تھا ورنہ دس ہزار روپے کوئی اتنی بڑی رقم نہیں تھی جو وہ ارینج نہ کرسکتا۔ فاروقی اپنی کمینی فطرت کے ہاتھوں مجبور تھا اور داؤد کی اپنی مجبوریاں تھیں۔ داؤد کے سوال کے جواب میں فاروقی نے کہا۔

”دیکھیں داؤد صاحب! آپ دس مارچ کو رات میں میرے پاس آجائیں، آپ کی رقم میں تیار رکھوں گا۔“

”دس مارچ میں تو ابھی کافی دن باقی ہیں۔“ داؤد نے جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں کہا۔ ”مالک مکان اتنے دن انتظار نہیں کرسکے گا۔“

”آپ ایک کام کیوں نہیں کرتے۔“ فاروقی نے ہمدردی بھرے انداز میں کہا۔ ”چند دنوں کے لیے آپ اپنے سیٹھ سے دس ہزار ادھار لے کر نئے مالک مکان کو ایڈوانس ادا کرکے شفٹنگ کرلیں۔ میں آپ کو دس مارچ کو دوں گا تو آپ وہ رقم اپنے سیٹھ کو واپس کردیجیے گا۔“

یہ ترکیب داؤد کے ذہن میں بھی آئی تھی کیونکہ ”مرتا کیا نہ کرتا“ کے مصداق اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا لیکن وہ پہلے فاروقی کو گھس کر دیکھنا چاہتا تھا جو اس کے دس ہزار دبائے بیٹھا تھا۔

”ٹھیک ہے فاروقی صاحب! میں دس مارچ ہی کو آپ کے پاس آؤں گا۔“ وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ”امید ہے، آپ اپنا وعدہ پورا کریں گے۔“

”انشاءاللہ...... ضرور......!“ اس نے بڑے وثوق سے کہا۔

اگلے روز داؤد نے اپنے سیٹھ سے بات کی۔ سیٹھ نے اس کی پریشانی کو دیکھتے ہوئے دس ہزار روپے ادھار دے دیے اور ساتھ ہی تسلی آمیز انداز میں یہ بھی کہہ دیا۔

”یہ رقم فوری طور پر واپس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جب بھی ہاتھ آسان ہو تو دے دینا اور اگر تم کہو گے تو میں تمہاری تنخواہ میں سے ہر ماہ تھوڑے تھوڑے کاٹتا رہوں گا۔ اس طرح تم پر دباؤ بھی نہیں پڑے گا اور رفتہ رفتہ قرض بھی ادا ہوجائے گا۔“

داؤد نے اپنے سیٹھ کے مشورے پر فوراً عمل کر ڈالا اور پانچ مارچ کو گھر شفٹ کرلیا۔ اس کی بیوی فوزیہ بہت خوش تھی۔ اس کی نظر فاروقی سے ملنے والے دس ہزار روپے

مشورہ

ایک آدمی آدھی رات کو اپنی موٹی بیوی سے بولا کہ ”سسک سسک کے مرنا ٹھیک ہے یا ایک دم؟“

بیوی۔ ”ایک دم۔“

آدمی۔ ”تو اپنی دوسری ٹانگ بس مجھ پر رکھ دو۔“

مرسلہ۔ رضوان تنولی کریزدی، اورنگی ٹاؤن، کراچی

پر لگی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے ذہن میں بڑی بھرپور منصوبہ بندی بھی کرلی تھی کہ وہ اس رقم کو کہاں کہاں خرچ کرے گی۔ حسنِ اتفاق سے دس ہزار روپے اس کے ہاتھ لگنے والے تھے۔ گھر کی ایک ایک محرومی اور ضرورت اسے رہ رہ کر یاد آنے لگی تھی مگر کسی نے ایسے ہی موقع کے لیے کیا خوب کہا ہے کہ...... جن پر تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے۔

دس مارچ کو داؤد فاروقی کے پاس پہنچا اور اپنی رقم کا تقاضا کیا۔ آگے سے فاروقی نے چند روز کی مزید مہلت مانگ لی۔ داؤد کو اس کی بہانہ بازی پر غصہ تو بہت آیا لیکن غصے کے عملی اظہار سے کچھ بھی حاصل ہونے والا نہیں تھا۔ کسی حکمتِ عملی کے ذریعے ہی فاروقی سے رقم نکلوائی جاسکتی تھی۔ جھگڑا کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

دس مارچ کے بعد داؤد کبھی فاروقی کے گھر اور کبھی اس کے کارخانے کے چکر لگانے لگا۔ فاروقی ہر بار اسے کوئی نئی کہانی سنا دیتا تھا بالآخر اس نے فاروقی سے دوٹوک بات کرنے کا فیصلہ کرلیا اور پچیس مارچ کو وہ دکان سے جلدی چھٹی کرکے فاروقی کے کارخانے پہنچ گیا۔

اس وقت کارخانے کے اندر بہت کم لوگ کام کر رہے تھے۔ ویسے بھی فاروقی نے اپنا اسٹاف بہت محدود رکھا ہوا تھا۔ فاروقی اپنے آفس نما کمرے میں موجود تھا۔ داؤد اس کے سامنے جاکر بیٹھ گیا۔

فاروقی نے کمالِ مکاری سے کہا۔ ''داؤد صاحب! آپ کے لیے ٹھنڈا منگواؤں یا گرم؟''

داؤد نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''آپ برائے مہربانی میری رقم واپس کردیں تو میں آپ کا شکر گزار ہوں گا۔''

''آپ مجھے پانچ دن کا اور ٹائم دیں داؤد صاحب!'' فاروقی نے مکاری بھرے لہجے میں کہا۔ ''ان شاءاللہ! یکم اپریل کو میں آپ کی رقم ادا کردوں گا۔''

''کہیں مجھے اپریل فول بنانے کا ارادہ تو نہیں!'' داؤد نے تیکھی نظر سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کمال ہے......'' فاروقی برہمی سے بولا۔ ''آپ میری نیت پر شک کر رہے ہیں؟''

''فاروقی صاحب!'' داؤد نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ ایک ماہ سے 'آج کل، آج کل' کر رہے ہیں۔ آپ کے اس رویے کے پیشِ نظر میں آپ کی نیت کے بارے میں کیا رائے قائم کروں؟''

''آج کل کاروبار خاصا ڈاؤن جارہا ہے۔'' فاروقی نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''آپ کو کچھ اندازہ نہیں ہے داؤد صاحب۔ آپ تو تنخواہ دار ہیں، ہر ماہ آپ کو [illegible] تنخواہ مل جاتی ہے۔ اپنے سیٹھ سے پوچھیں، بزنس [illegible] پوزیشن چل رہی ہے۔''

''میں ان باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا کہ آپ کے بزنس کی کیا پوزیشن ہے۔'' داؤد نے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مجھے میری رقم چاہیے۔ میں نے آپ کے بھروسے پر اپنے سیٹھ سے دس ہزار روپے ادھار [illegible] تھے۔ آپ نے مجھ سے دس مارچ کو رقم لوٹانے کا وعدہ کیا تھا اور آج پچیس تاریخ ہوگئی ہے۔ وعدہ خلافی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ سیٹھ ہر روز مجھ سے رقم کا تقاضا کرتا ہے۔ میری نوکری داؤ پر لگی ہوئی ہے اور آپ کو کوئی فکر ہی نہیں [illegible] جانتا ہوں، آپ کی مالی حالت اتنی بھی پتلی نہیں کہ جیب سے دس ہزار نہ نکال سکیں۔''

''میری بات مان لیں داؤد صاحب۔'' فاروقی نے بڑی رسان سے کہا۔ ''اپنے سیٹھ سے کہیں، پانچ دن اور رک جائے۔ میں یکم کو آپ کی رقم لوٹا دوں گا۔''

''مجھے آج اور ابھی اپنی رقم چاہیے۔'' داؤد نے ضدی لہجے میں کہا۔

''آج میں آپ کے لیے کچھ نہیں کرسکتا۔'' فاروقی نے رکھائی سے کہا۔ ''آپ خواہ مخواہ ضد کر رہے ہیں۔''

''آپ چاہیں تو بہت کچھ کرسکتے ہیں۔'' داؤد نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''لیکن آپ کی پیسے دینے کی نیت ہی نہیں ہے۔''

''جب آپ کو میری نیت پر ہی بھروسا نہیں تو پھر میں کیا کرسکتا ہوں۔''

''آپ کو کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں۔'' داؤد نے تلخی سے کہا۔ ''بس، آپ شرافت سے میری رقم واپس کردیں۔''

''کیا میں اب تک آپ کے ساتھ بدمعاشی کر رہا ہوں جو آپ مجھے شرافت کا درس دے رہے ہیں؟'' فاروقی اچانک جھٹکے سے اکھڑ گیا۔

''آپ کا رویہ شرافت کے زمرے میں تو ہرگز نہیں آتا فاروقی صاحب۔'' داؤد نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر میری بات کا یقین نہ ہو تو کسی بھی شخص کو ثالث مقرر کرکے فیصلہ لے لیں۔ آپ کو خود ہی اندازہ ہوجائے گا کہ آپ اب تک میرے ساتھ کتنی زیادتی کرچکے ہیں۔''

''مجھے کسی سے ثالثی کرانے کی ضرورت نہیں۔'' فاروقی نے برہمی سے کہا۔ ''ابھی تو میرے پاس پیسے نہیں ہیں، جب ہوں گے، میں آپ کو فون کردوں گا۔ آکر لے جایئے گا۔ جب تک میں آپ کو فون نہ کروں، میرے گھر یا کارخانے میں چکر لگانے کی ضرورت نہیں۔''

''یہ تو کھلی بدمعاشی ہے فاروقی صاحب!'' داؤد نے فیصلے لہجے میں کہا۔

''آپ کچھ بھی سمجھ لیں۔'' فاروقی ڈھٹائی سے بولا۔ ''اب آپ یہاں سے جاسکتے ہیں۔ مجھے اور بھی بہت سے ضروری کام ہیں......''

''فاروقی صاحب! یہ آپ ٹھیک نہیں کر رہے۔'' داؤد نے سٹپٹائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ مجھے کسی اور طریقے پر مجبور نہ کریں۔ آپ میری شرافت کا امتحان نہ لیں۔''

''کیا کرلیں گے آپ......'' فاروقی نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔ ''بتائیں، آپ کیا کریں گے؟''

''اگر گھی سیدھی انگلی سے نہ نکلا تو مجھے مجبوراً انگلی کو ٹیڑھا کرنا پڑے گا......'' داؤد نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''تو یہ شوق بھی پورا کرکے دیکھ لیں۔'' فاروقی نے حقارت بھری نظر سے داؤد کی طرف دیکھا۔ ''میں ڈرتا نہیں ہوں کسی سے بھی۔''

اس کے بعد ان دونوں میں تلخ و ترش جملوں کا تبادلہ ہوا اور داؤد یہ کہتے ہوئے، پاؤں پٹخ کر اس کے کارخانے سے نکل آیا۔

''میں نے اپنی رقم نہ نکلوائی تو میرا نام بھی داؤد نہیں......''

داؤد جھلائے اور جھنجلائے ہوئے ذہن کے ساتھ گھر پہنچا اور بیوی کو سارا واقعہ کہہ سنایا۔ یہ حالات سن کر فوزیہ کو غصہ بھی آیا اور شدید افسوس بھی ہوا۔ دونوں نے رات کا کھانا زہر مار کیا اور ٹی وی کھول کر بیٹھ گئے۔

پھر ٹھیک نو بجے پولیس ان کے دروازے پر پہنچی اور داؤد کو اسلم فاروقی کے قتل کے الزام میں گرفتار کرکے اپنے ساتھ لے گئی۔

☆☆☆

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے کیس کا چالان عدالت میں پیش کردیا۔ میں نے اپنے وکالت نامے کے ساتھ ہی ملزم داؤد کی درخواست ضمانت بھی دائر کردی۔

عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا۔ وکیل استغاثہ نے ضمانت کے خلاف اور میں نے ضمانت کے حق میں دلائل دینا شروع کیے۔ ہمارے بیچ لگ بھگ پندرہ منٹ تک بحث جاری رہی جس کے اختتام پر جج نے درخواست ضمانت کو رد کرتے ہوئے باقاعدہ سماعت کے لیے اگلی تاریخ دے دی۔

جیسا کہ پہلے بھی میں کئی بار اس امر کی وضاحت کرچکا ہوں کہ قتل کے ملزم کی ضمانت ناممکن حد تک مشکل ہوتی ہے۔ اس پیشی کے اختتام کے ساتھ ہی میرے موکل اور اس کیس کے ملزم داؤد کو جیوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا گیا۔ اب اس کیس کے فیصلے تک اسے جیل ہی میں رہنا تھا۔ اگر فیصلہ اس کے حق میں آجاتا تو رہائی اس کا مقدر ٹھہرتی اور اگر فیصلہ اس کے برخلاف چلا جاتا تو پھر اس کی زندگی کا بیشتر حصہ جیل کی سنگلاخ دیواروں کے پیچھے گزرنا تھا لیکن مجھے قوی امید تھی کہ میں اپنے موکل کو باعزت رہا کرانے میں کامیاب ہوجاؤں گا۔

ہم عدالت سے باہر آئے تو فوزیہ خاصی بجھی بجھی نظر آئی۔ اس کیس کی وجہ سے وہ خاصی الجھ گئی تھی کیونکہ وہ دونوں ہی ایک دوسرے کی زندگی کا سہارا تھے۔ ان کا کوئی قریبی عزیز رشتے دار نہیں تھا۔ ایک موقع پر فوزیہ نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر میں ضرورت محسوس کروں تو وہ اسکول سے ایک دو ماہ کی چھٹی لے سکتی ہے لیکن میں نے اسے ایسا کرنے سے منع کردیا تھا اور یہ کہا تھا کہ وہ بس اس روز چھٹی کرلیا کرے جب اس کیس کی تاریخ ہو۔ ایک دو ماہ کی چھٹی کی واقعتاً کوئی ضرورت نہیں تھی۔

جیل کی وین جب داؤد کو لے کر عدالت کے احاطے سے نکل گئی تو فوزیہ کافی دیر تک حسرت بھری نگاہ سے جاتی ہوئی وین کو دیکھتی رہی۔ اس کی محویت میں خلل آیا تو میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔

''فوزیہ صاحبہ! آپ کچھ زیادہ ہی پریشان تو نہیں ہورہی ہیں؟''

اس نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے الٹا مجھی سے پوچھ لیا۔ ''بیگ صاحب! داؤد کو اس مصیبت سے نجات مل جائے گی نا؟''

''سو فیصد یقین ہے مجھے!'' میں نے پراعتماد لہجے میں کہا۔ ''آپ حوصلہ مضبوط رکھیں اور میری ہدایات پر من و عن عمل کرتی جائیں۔ پھر کامیابی ہم سے زیادہ دور نہیں رہے گی۔''

''ان شاءاللہ!'' وہ خاصے توانا لہجے میں بولی۔

میں نے تسلی تشفی دے کر فوزیہ کو رخصت کردیا اور

پارکنگ لاٹ کی جانب بڑھ گیا۔

آگے بڑھنے سے پہلے میں آپ کو استغاثہ اور پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے بارے میں بتاتا چلوں تاکہ عدالتی کارروائی کے دوران میں آپ کا ذہن کسی الجھن کا شکار نہ ہو۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق مقتول فاروقی کی موت پچیس مارچ کی سہ پہر چار اور چھ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ موت کا سبب سر کے عقبی حصے میں شدید ترین چوٹ بتایا گیا تھا۔ ایک آہنی راڈ کی مدد سے اس کی کھوپڑی کے عقبی حصے کو چٹخا دیا گیا تھا۔ یہ ضرب اتنی شدید تھی کہ موقع پر ہی مقتول کی موت واقع ہو گئی تھی۔ مذکورہ آہنی راڈ کو آلۂ قتل کی حیثیت حاصل تھی اور پولیس نے بہ آسانی جائے وقوعہ سے آلۂ قتل کو بازیاب کر لیا تھا۔ آہنی راڈ کے ایک سرے سے چند بال بھی چپکے ہوئے ملے تھے۔ لیبارٹری ٹیسٹ نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ بال مقتول کے سر کے بالوں ہی سے تعلق رکھتے تھے۔

استغاثہ نے میرے موکل کو سخت ترین سزا دلوانے کے لیے بڑی خطرناک رپورٹ تیار کی تھی۔ اس رپورٹ کے مطابق ملزم داؤد نے مقتول اسلم فاروقی کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ وہ کبھی اس کے گھر اور کبھی کارخانے پہنچ جاتا تھا۔ وہ جب بھی فاروقی سے ملنے کے بعد رخصت ہوتا، فاروقی کی طبیعت خراب ہو جاتی تھی۔ وہ ملزم کی حرکتوں سے عاجز آچکا تھا پھر وقوعہ کے روز تو حد ہی ہو گئی۔ ملزم سہ پہر میں مقتول کے کارخانے پہنچ گیا اور رقم کا مطالبہ کر دیا۔ دونوں کے درمیان تلخ کلامی اس قدر بڑھ گئی کہ ملزم کو خود پر قابو نہ رہا اور اس نے طیش کے عالم میں آہنی راڈ سے مقتول کے سر پر حملہ کر دیا اور ایک ہی کاری ضرب سے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

استغاثہ کی رپورٹ میں سب سے زیادہ چونکا دینے والی بات یہ تھی کہ مقتول کو قتل کرنے کے بعد ملزم اس کی میز کی دراز میں سے ایک بھاری رقم بھی چرا لے گیا تھا۔ استغاثہ کے دعوے کے مطابق وہ رقم پچاس ہزار روپے بتائی گئی تھی۔ یہ واقعی ایک انکشاف انگیز نکتہ تھا۔

میں نے بڑی توجہ اور باریک بینی سے تمام رپورٹس کا مطالعہ کیا اور اپنے طور پر ایک لائحہ عمل تیار کر لیا کہ مجھے اس کیس کے ساتھ کس نوعیت کا برتاؤ کرنا ہے۔ میں اپنی منصوبہ بندی سے پوری طرح مطمئن تھا۔

مقتول کی طرف سے اس کیس کی پیروی اگرچہ اس کی بیوی زبیدہ ہی کر رہی تھی تاہم وہ اپنی دائمی بیماری کی وجہ سے ہر پیشی پر عدالت میں حاضر ہونے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ اس کی سات اولادوں میں تین بڑی بیٹیاں تھیں۔ اس کے بعد بیٹے کا نمبر آتا تھا جس کی عمر کم و بیش دس سال تھی یعنی وہ بھی خاطر خواہ اس کیس کی پیروی کرنے کے قابل نہیں تھا لہٰذا اس سلسلے کی ساری ذمے داری وکیل استغاثہ کے کندھوں پر آ گئی تھی۔ ابتدائی چند پیشیاں تیکنیکی کارروائی کی نذر ہو گئیں۔

☆☆☆

دو ماہ کے بعد عدالت کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز ہوا۔ جج نے اپنی بھاری بھر کم آواز میں فردِ جرم پڑھ کر سنائی۔ ملزم نے میری ہدایت کے عین مطابق صحتِ جرم سے انکار کر دیا۔ پولیس کسٹڈی میں، ریمانڈ کی مدت کے دوران میں لیے گئے ملزم کے بیان کو عدالت زیادہ اہمیت نہیں دیتی۔ اکثر ملزم پولیس کی معروفِ زمانہ تفتیشی سختیوں سے محفوظ رہنے کے لیے بڑی شرافت سے اقبالِ جرم کر لیتے ہیں۔ اس طرح پولیس کا کام آسان ہو جاتا ہے اور وہ ملزم کے ساتھ زیادہ طبع آزمائی نہیں کرتے۔

اس کے بعد ملزم کا حلفیہ بیان ریکارڈ کیا گیا۔ وکیل استغاثہ نے ملزم پر کڑی جرح کی لیکن میرے موکل نے نہایت ہی تحمل اور حوصلے کے ساتھ وکیل سرکار کے سوالات کا سامنا کیا اور میری ہدایات کے عین مطابق جوابات دے کر وکیل استغاثہ کو خود پر حاوی نہیں ہونے دیا۔ پھر استغاثہ کے گواہوں کا سلسلہ شروع ہوا۔

استغاثہ کی جانب سے کل چھ گواہوں کی فہرست عدالت میں دائر کی گئی تھی لیکن میں یہاں پر صرف ان گواہوں کے بیانات اور بعدازاں ان پر ہونے والی جرح کا احوال بیان کروں گا جس میں آپ کی دلچسپی کا وافر مواد موجود ہوگا۔ اس سے پہلے کہ وکیل استغاثہ اپنا کوئی گواہ سامنے لاتا، میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے درخواست کی۔

"جنابِ عالی! اگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو میں اس کیس کے تفتیشی افسر سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔"

میری یہ درخواست کسی بھی طور پر اعتراض کے زمرے میں نہیں آتی تھی لیکن وکیل استغاثہ نے پہلی بال پر ہی چوکا لگانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"یور آنر! چند سوالات کا مطلب چند سوالات ہی ہونا چاہیے۔ میرے فاضل دوست زورِ خطابت میں اتنا آگے بڑھ جاتے ہیں کہ انہیں عدالت کے قیمتی وقت کا ذرا بھی خیال نہیں رہتا......"

جج نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔ اس "نظر" کا واضح مطلب یہی تھا کہ مجھے خود ہی وکیلِ استغاثہ کے سوال کا جواب دینا چاہیے۔ میں جج کا اشارہ پا کر اپنے حریف وکیل کی جانب متوجہ ہو گیا۔

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور وکیلِ استغاثہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ "میرے فاضل دوست! ابھی آپ نے میری جس "صلاحیت" کا ذکر کیا ہے وہ سنی سنائی تک محدود ہے یا اس سلسلے میں آپ کو کوئی ذاتی تجربہ بھی ہے؟"

میں نے تو روا روی میں یہ بات پوچھ لی تھی لیکن وکیل استغاثہ کی طرف سے جو جواب آیا اس نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ فخر سے سینہ پھلاتے ہوئے بولا۔

"جناب! میں سنی سنائی پر زیادہ بھروسا نہیں کرتا ہوں۔ ابھی میں نے آپ کے بارے میں جو کچھ بھی کہا وہ میرا ذاتی تجربہ ہے......"

میں نے محتاط لہجے میں کہا۔ "آپ کا مطلب ہے، ہم پہلے بھی کسی کیس میں ایک دوسرے کے مقابل وکالت کر چکے ہیں؟"

"جی...... میرا یہی مطلب ہے۔" وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔

مذکورہ وکیل کا نام انجم عثمانی تھا۔ میں نے بہت یاد کرنے کی کوشش کی کہ کب میں نے اس کے مقابلے میں وکالت کے جوہر دکھائے تھے لیکن میں اس شخص کو اپنی یادداشت میں زندہ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اگر میں سوال و جواب کے چکر میں پڑ جاتا تو اس سے کچھ حاصل نہ ہوتا سوائے وقت کی بربادی کے...... لہٰذا میں نے نارمل بال کے بجائے یارکر مار دیا۔ میں نے نہایت ہی شائستگی سے کہا۔

"میرے فاضل دوست! جس کیس میں ہم روبہ رو ہوئے تھے اس کا نتیجہ کیا رہا تھا۔ میرا مطلب ہے، آپ ملزم کو جیل بھجوانے میں کامیاب رہے تھے یا میں اسے باعزت بری کرانے میں کامران رہا تھا؟"

وہ جھینپے ہوئے انداز میں بولا۔ "خوش قسمتی سے آپ وہ کیس جیت گئے تھے۔"

میں نے اطمینان بھری سانس خارج کی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں اپنی خوش قسمتی سے جیتا یا آپ اپنی بدقسمتی سے وہ کیس ہار گئے تھے اس بات کی زیادہ اہمیت نہیں ہے۔ اگر میں نے کسی گواہ پر بہت زیادہ وقت

صرف کر کے اپنے موکل کو باعزت بری کرالیا تھا تو میری نظر میں یہی سب سے اہم ہے لیکن آپ پریشان نہ ہوں......" میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"آج میں واقعی تفتیشی افسر کو چند سوالات میں نمٹا دوں گا۔ آپ کو اس سلسلے میں زیادہ فکر مند ہونے کی چنداں ضرورت نہیں......"

وہ برا سا منہ بنا کر رہ گیا۔ اگلے ہی لمحے جج کے حکم پر انکوائری آفیسر وٹنس باکس میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ انکوائری آفیسر کی حیثیت کسی بھی کیس میں استغاثہ کے گواہ ایسی ہوتی ہے اور اسے ہر پیشی پر عدالت میں حاضر رہنا پڑتا ہے۔

اس کیس کا تفتیشی آفیسر عہدے کے اعتبار سے ایک سب انسپکٹر تھا۔ اس کا نام منظور حسین معلوم ہوا۔ منظور حسین ایک ڈھیلا ڈھالا پولیس آفیسر تھا۔ میں جج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد وٹنس باکس (گواہوں والے کٹہرے) کے قریب چلا گیا پھر منظور حسین کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"آئی او صاحب! آپ کو اس واقعے کی اطلاع کب اور کس نے دی؟"

"پولیس کے روزنامچے کے مطابق یہ اطلاع پچیس مارچ کی سہ پہر لگ بھگ سوا پانچ بجے دی گئی تھی۔" تفتیشی افسر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "اور یہ اطلاع مقتول کے ایک ملازم خاص نے دی تھی۔"

"اس ملازم خاص کا نام بتانا پسند کریں گے؟"

"ارشد محمود......!"

"منظور حسین صاحب!" میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "آپ جائے وقوعہ پر کتنے بجے پہنچے تھے؟"

"مجھے وہاں پہنچنے میں دس سے پندرہ منٹ لگے ہوں گے۔" اس نے بتایا۔ "آپ ساڑھے پانچ سمجھ لیں۔"

"حیرت ہے...... ایسی پھرتی کی پولیس سے عموماً توقع نہیں کی جاتی۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"اس کی دو وجوہات ہیں......" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

میں سمجھ رہا تھا، وہ میری بات پر بھڑک اٹھے گا اور کوئی الٹا سیدھا جواب دے گا لیکن اس نے خلاف معمول جواب دے کر مجھے واقعی حیران کر دیا تھا۔ میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

"کون سی دو وجوہات آئی او صاحب؟"

"نمبر ایک......" وہ اپنی سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے بولا۔ "پولیس اسٹیشن جائے وقوعہ سے بہت ہی قریب واقع ہے۔ نمبر دو......" اس نے رک کر ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"آپ کو محکمۂ پولیس سے متعلق بہت بڑی غلط فہمی ہے کہ ہم لوگ بروقت رسپونس نہیں کرتے جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ ہمیں جیسے ہی کسی جرم کی اطلاع ملتی ہے، ہم فوری ردعمل کے طور پر جائے واردات کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔"

"یہ گراں قدر معلومات فراہم کرنے کا بے حد شکریہ آئی او صاحب!" میں نے نیم طنزیہ لہجے میں کہا۔ "آپ بھی مقتول اسلم فاروقی کے قتل کی اطلاع ملتے ہی فوراً جائے وقوعہ یعنی مقتول کے کارخانے پہنچ گئے تھے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا منظور حسین صاحب؟"

"نہیں جناب...... آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" اس نے مختصر سا جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ "جب آپ جائے وقوعہ پر پہنچے تو وہاں کتنے افراد موجود تھے...... میرا مطلب ہے، کارخانے کے اندر؟"

"صرف ایک...... مقتول کا ملازمِ خاص۔"

"یعنی ارشد محمود؟"

"جی ہاں!"

"آپ نے جائے وقوعہ پر کیا دیکھا؟" میں نے جرح کے سلسلے کو دراز کرتے ہوئے استفسار کیا۔

"مقتول اپنی کرسی پر اس طرح بیٹھا تھا کہ اس کے جسم کا بالائی حصہ میز پر ڈھیر تھا۔" آئی او نے جواب دیا۔ "اس کا سر پچھلی جانب سے بری طرح چٹخا ہوا تھا جہاں سے خارج ہونے والا خون میز پر بڑے بے ڈھنگے انداز میں پھیلا ہوا تھا۔ مقتول کو دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ قیدِ حیات سے آزاد ہو چکا ہے......"

"آپ کو آلۂ قتل تلاش کرنے میں کسی دقت کا سامنا تو نہیں کرنا پڑا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں......" اس نے نفی میں گردن ہلائی اور بتایا۔ "آلۂ قتل تو ادھر میز پر ہی پڑا تھا۔"

میں اس چوبی میز کی سمت بڑھ گیا جو پیش کار کی میز کے قریب ہی رکھی تھی۔ مذکورہ میز پر آلۂ قتل سیلوفین تھیلی کے اندر موجود تھا۔ آلۂ قتل ایک آہنی سلاخ تھی جس کی لمبائی کم و بیش اٹھارہ انچ اور موٹائی ایک انچ تھی۔ میں نے سیلوفین

بیگ کو اٹھایا اور واپس آئی او کے پاس آ گیا پھر وہ بیگ منظور حسین کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے سوال کیا۔

"کیا اسی راڈ کی مدد سے مقتول اسلم فاروقی کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا؟"

"جی ہاں...... بالکل۔" اس نے جلدی سے اثبات میں گردن ہلائی۔ "پوسٹ مارٹم رپورٹ میں اسی راڈ کا ذکر ہے اور آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اس راڈ کے ایک سرے پر مقتول کے سر کے چند بال بھی چپکے ہوئے ہیں اور...... خون خشک ہونے کے بعد سیاہی مائل رنگت اختیار کر چکا ہے......"

"جی، آپ کی بیان کردہ تمام خصوصیات مجھے اس آہنی راڈ کے ایک سرے پر بہ خوبی نظر آ رہی ہیں۔ میں نے پوسٹ مارٹم رپورٹ اور آلۂ قتل کے لیبارٹری ٹیسٹ کی رپورٹ کو بھی بڑی توجہ سے پڑھا ہے لیکن افسوس......" میں نے ڈرامائی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"کہ آپ اس آہنی راڈ کے دوسرے سرے کو یکسر فراموش کیے بیٹھے ہیں......"

"جی...... کیا مطلب؟" وہ چونک کر الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے سیلوفین بیگ ایک مرتبہ پھر اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا اور کہا "آئی او صاحب! آلۂ قتل کے ایک سرے پر تو آپ کو مقتول کے سر کے چند بال اس کے جمے ہوئے خون کے ساتھ چپکے نظر آ رہے ہیں مگر اسی سلاخ کے دوسرے سرے پر بھی تو ایک نہایت ہی اہم شے موجود ہے جس کی طرف آپ کا دھیان ہی نہیں گیا......"

وہ میری جرح کے انداز سے گھبرا کر رہ گیا، الجھن زدہ لہجے میں مستفسر ہوا۔ "کک...... کون سی اہم شے...... مجھے تو وہاں کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا۔"

"یہ تو مانتے ہیں نا کہ آہنی راڈ کے جس سرے پر مقتول کا خون اور سر کے بال چپکے ہوئے ہیں اسی سرے کی خوف ناک ضرب نے مقتول اسلم فاروقی کی کھوپڑی کے عقبی حصے کو چٹخایا تھا؟" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

"جی ہاں...... بالکل مانتا ہوں۔" اس نے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی۔ "لیبارٹری ٹیسٹ اور پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی اس امر کی تصدیق کرتی ہے۔"

"آپ اس بات سے بھی انکار نہیں کریں گے کہ راڈ کی مدد سے جب قاتل نے مقتول کی کھوپڑی کے عقبی حصے پر قاتلانہ حملہ کیا تو اس نے اس راڈ کو دوسرے سرے سے تھام رکھا تھا؟" میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

"اس میں تو کسی شک و شبے کی گنجائش ہو ہی نہیں سکتی وکیل صاحب!" وہ مجھے ایسی نظر سے دیکھتے ہوئے بولا جیسے میں نے کوئی انتہائی احمقانہ بات کر دی ہو۔ "آپ بھی کیسی بات کر رہے ہیں......؟"

"میرے نزدیک بھی کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں ہے آئی او صاحب!" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اور میں نے یہ بات اس لیے کی ہے کہ مجھے آپ کی نگاہ پر شبہ ہونے لگا ہے......"

میرے آخری جملے پر وہ بپھر کر رہ گیا، بگڑے ہوئے لہجے میں بولا۔ "کیا مطلب ہے آپ کا؟"

"مطلب یہ کہ میرے خیال میں آپ کو نظر کا چشمہ استعمال کرنا چاہیے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اس سرے پر مجھے جو کچھ نظر آ رہا ہے وہ آپ کو دکھائی کیوں نہیں دے رہا......؟"

"آخر وہ ہے کیا......!" وہ چیخ سے مشابہ لہجے میں مستفسر ہوا۔

"فنگر پرنٹس!" میں نے دھماکا کیا۔ "جب قاتل نے آہنی راڈ کو اس سرے سے تھام کر مقتول اسلم فاروقی کی کھوپڑی کو نشانہ بنایا تھا تو راڈ کے گرفت والے سرے پر یقیناً اس کی انگلیوں کے نشان بھی آ گئے ہوں گے۔"

"لیکن......" وہ بکھری ہوئی آواز میں بولا۔ "آپ کو فنگر پرنٹس کیسے نظر آ رہے ہیں......؟"

"یہی تو میرا پوائنٹ ہے آئی او صاحب!" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "آپ نے آہنی راڈ کے دوسرے سرے پر سے قاتل کے فنگر پرنٹس اٹھانے کی زحمت گوارا کیوں نہیں کی۔ کیس فائل کے اندر ایسی کوئی رپورٹ موجود نہیں ہے...... یہ سنگین غفلت کیا معنی رکھتی ہے؟"

آئی او کی حالت دیدنی تھی۔ فنگر پرنٹس رپورٹ کی غیر موجودگی غیر ذمے داری کا ایک منہ بولتا ثبوت تھا۔ میرے کڑے سوالات نے اسے بری طرح بوکھلا کر رکھ دیا لیکن جواب دینا بھی ضروری تھا۔ ہڑبڑائے ہوئے انداز میں اس نے کہا۔

"میں نے فنگر پرنٹس اٹھانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔"

"سبحان اللہ......!" میں نے استہزائیہ انداز میں کہا پھر روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے یوں اضافہ کیا۔ "جنابِ عالی! ایک شخص کو بڑی بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔ آلۂ قتل بھی موقع سے دستیاب ہو جاتا ہے لیکن پولیس آلۂ قتل یا جائے وقوعہ کی کسی بھی چیز سے فنگر پرنٹس اٹھانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔ عدالتی زبان میں اسے استغاثہ کی ایک سنگین خامی تصور کیا جانا چاہیے......"

جج نے اپنی گردن کو اثباتی جنبش دی پھر اپنے سامنے پھیلے ہوئے کاغذات پر کچھ نوٹ کرنے کے بعد دوبارہ ہماری جانب متوجہ ہو گیا۔ میں نے آئی او سے جرح کا سلسلہ جاری رکھا۔

"منظور حسین صاحب! جائے وقوعہ کی کارروائی مکمل کرنے کے بعد آپ نے کیا کیا تھا؟"

"مقتول کے ملازمِ خاص ارشد محمود کی زبانی ہمیں پتا چلا تھا کہ مقتول کے کمرے میں جانے والا آخری شخص ملزم داؤد تھا۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "ارشد نے ہمیں یہ بھی بتایا تھا کہ اس روز مقتول اور ملزم کے بیچ رقم کے لین دین پر اچھی خاصی گرما گرمی بھی ہو گئی تھی لہٰذا ہم نے جائے وقوعہ کی کارروائی نمٹانے کے بعد ملزم کے گھر کا رخ کیا اور اسے حراست میں لے لیا۔"

"ملزم کی گرفتاری کتنے بجے عمل میں آئی تھی؟" میں نے پوچھا۔

اس نے جواب دیا۔ "رات نو بجے۔"

میں نے پوچھا۔ "استغاثہ کی رپورٹ کے مطابق ملزم نے نہ صرف مقتول اسلم فاروقی کو موت کے گھاٹ اتارا بلکہ اس کی میز کی دراز میں سے ایک خطیر رقم بھی چرا لے گیا تھا۔ جب آپ نے......"

"پچاس ہزار روپے!" وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔

میں نے اس کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے اپنا بیان جاری رکھا۔ "جب آپ نے ملزم کو اس کے گھر سے حراست میں لیا تو اس کے قبضے سے پچاس ہزار کی رقم بھی برآمد کر لی ہو گی؟"

"نہیں جناب! وہ رقم برآمد نہیں ہو سکی۔" وہ مایوسی سے گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "ہم نے اس کے گھر کا چپا چپا چھان مارا اور بڑے تسلی بخش انداز میں ملزم کی جامہ تلاشی بھی لی تھی مگر رقم کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔"

"ملزم نے مذکورہ پچاس ہزار کے بارے میں کیا بیان دیا تھا؟"

"یہ رقم چرانے سے انکاری ہے۔" آئی او نے جواب دیا۔

"اور رقم کے سلسلے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

"ہمارے خیال میں ملزم نے جائے وقوعہ سے گھر جاتے ہوئے رقم کو کہیں ٹھکانے لگا دیا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"ملزم لگ بھگ ایک ہفتہ ریمانڈ پر آپ کی کسٹڈی میں رہا تھا۔" میں نے انکوائری آفیسر کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ "اس دوران میں آپ نے اس سے رقم کے بارے میں اگلوانے کی کوشش نہیں کی" لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "سننے میں تو یہی آتا ہے کہ آپ کی کسٹڈی میں تفتیشی مراحل سے گزرتے ہوئے تو پتھر بھی بولنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔"

آئی او منظور حسین نے معاندانہ نظر سے مجھے گھورا پھر ٹودی پوائنٹ جواب دیا۔ "ہم نے ملزم سے جتنی بھی پوچھ گچھ کی اس میں یہ رقم کے حوالے سے اپنی لاعلمی ہی کا اظہار کرتا رہا ہے۔"

"اوہ......!" میں نے ہمدردانہ انداز میں کہا۔ "گویا ملزم کے اعصاب پولیس کی تفتیش کے مقابلے میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار ثابت ہوئے تھے۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور خجل سا ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔ "منظور حسین صاحب! آپ کو یہ کس نے بتایا تھا کہ وقوعہ کے روز مقتول کی میز کی دراز میں پچاس ہزار روپے رکھے ہوئے تھے؟"

"یہ بات ہمیں مقتول کی بیوہ زبیدہ نے بتائی تھی۔" آئی او نے جواب دیا۔ "جائے وقوعہ مقتول اسلم فاروقی کے گھر سے زیادہ دور نہیں ہے۔ مقتول کو پیش آنے والے اندوہناک واقعے کی خبر زبیدہ کو ہوئی تو وہ فوراً کارخانے پہنچ گئی۔ وہ ایک سدا کی بیمار عورت ہے۔ آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ شوہر کی ناگہانی موت کی اطلاع نے اسے کس قدر پریشان کر دیا ہو گا۔ زبیدہ نے ہمیں بتایا کہ آج ایک پارٹی نے مقتول کو پچاس ہزار روپے کی پےمنٹ کرنا تھی......" وہ لمحے بھر کو رکا پھر ایک گہری سانس لینے کے بعد بولا۔

"بعد میں جب میں نے ارشد محمود سے اس پےمنٹ کے بارے میں پوچھا تو اس نے بھی تصدیق کر دی کہ مذکورہ پارٹی دن میں آئی تھی اور اس نے پچاس ہزار روپے کی پےمنٹ بھی کی تھی۔ رقم کی وصولی کے وقت ارشد بھی مقتول کے کمرے میں موجود تھا اور اس نے اپنی آنکھوں سے مقتول کو وہ رقم میز کی دراز میں ڈالتے ہوئے دیکھا تھا۔"

"یعنی...... آپ کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وقوعہ کے روز جب ملزم مقتول کے پاس اپنے دس ہزار روپے لینے پہنچا تو اس وقت مقتول کی میز کی دراز میں پورے پچاس ہزار روپے کیش رکھا ہوا تھا؟"

"حالات و واقعات تو یہی بتاتے ہیں وکیل صاحب!" اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ "بعد میں ہم نے اس پارٹی سے رابطہ کر کے بھی اس امر کی تصدیق کی تھی کہ پچاس ہزار روپے کی پےمنٹ ہوئی بھی تھی یا نہیں۔

پارٹی نے تصدیق کر دی کہ پچیس مارچ کی دوپہر اس نے مقتول کو اس کے کارخانے کے اندر پچاس ہزار روپے ادا کیے تھے۔ اس میں سے کچھ رقم پرانے مال کی پےمنٹ تھی اور کچھ نئے مال کے آرڈر کے سلسلے میں تھی۔"

"آئی او صاحب!" میں نے معتدل انداز میں کہا۔ "کیا آپ اس پارٹی کا نام ظاہر کرنا پسند فرمائیں گے جس نے وقوعہ کے روز مقتول کو پچاس ہزار روپے دیے تھے؟"

"ضرور......" وہ بڑی رسان سے بولا۔ "اس شخص کا نام فضل کریم ہے۔ وہ ماسکنگ ٹیپ کی خرید و فروخت کا کام کرتا ہے۔ مقتول سے ماسکنگ ٹیپ خرید کر وہ حیدرآباد اور سندھ کے دوسرے اضلاع کے علاوہ پنجاب کے بھی بعض علاقوں تک ماسکنگ ٹیپ کی سپلائی جاری رکھے ہوئے تھا۔ فضل کریم کی رہائش کراچی کے ایک معروف علاقے گلشن اقبال میں ہے۔ اگر آپ کہیں گے تو میں آپ کو اس کے گھر کا

ایڈریس بھی نوٹ کرادوں گا اور اس کا فون نمبر بھی۔"

"یہ تمام تر معلومات میں آپ سے ضرور لوں گا آئی او صاحب۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "لیکن یہاں سے فارغ ہوجانے کے بعد...... فی الحال آپ مجھے مقتول کے آفس کے بارے میں بتائیں!"

"کیا بتاؤں؟" وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ "آفس وہ جگہ ہے جہاں مقتول اسلم فاروقی کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ آپ نے اس مقام کو اچھی طرح دیکھ رکھا ہے۔ اتفاق سے مجھے بھی ایک بار وہاں جھانکنے کا موقع ملا ہے۔ میری معلومات کے مطابق اس کمرے میں ایک دروازہ اور ایک کھڑکی ہے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا آئی او صاحب؟"

"جی نہیں، آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "جائے وقوعہ کی وہی کیفیت ہے جو آپ نے بیان کی ہے۔"

"دروازے سے اندر داخل ہوں تو سامنے والی دیوار کے ساتھ مقتول اسلم فاروقی کی ریوالونگ چیئر نظر آئے گی۔" میں نے تصدیق طلب انداز میں تفتیشی افسر کی جانب دیکھا۔ "ریوالونگ چیئر کے آگے میز اور میز کے سامنے ملاقاتیوں کے لیے دو کرسیاں رکھی دکھائی دیں گی۔ کمرے کی مغربی دیوار میں ایک جالی دار بڑی سی کھڑکی ہے جو کارخانے کے اندرونی حصے میں کھلتی ہے جہاں سے، دفتر کے اندر بیٹھا ہوا مقتول اپنے کارخانے کے ورکرز کو کام کرتے ہوئے دیکھ سکتا تھا؟"

"جی ہاں...... آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" آئی او نے مختصراً کہا۔

"کمرے کی مشرقی دیوار پر ایک شوکیس نما الماری نصب ہے۔" میں نے استفسار کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "اس شوکیس کے اندر ماسکنگ ٹیپ کے مختلف سیمپلز رکھے رہتے ہیں؟"

"آپ کا تجزیہ اور مشاہدہ سولہ آنے صحیح ہے وکیل صاحب!"

"جب آپ جائے وقوعہ پر پہنچے تو مقتول اسلم فاروقی اپنی ریوالونگ چیئر پر اس طرح بیٹھا تھا کہ اس کا بالائی بدن میز پر ڈھیر تھا اور وہ اس دنیا سے اُس دنیا میں جاچکا تھا۔ میز پر پھیلے ہوئے خون سے اندازہ ہوتا تھا کہ جیسے ہی اس کی کھوپڑی پر آہنی راڈ سے کاری وار کیا گیا وہ دھڑام سے میز پر آرہا۔ "وہ" سے یہاں میری مراد اس کے بدن کا بالائی حصہ ہے۔ پھر اسے اٹھنے کا موقع نہ مل سکا؟"

"جی، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" آئی او نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ "پوسٹ مارٹم رپورٹ سے اس امر کی تصدیق بھی ہوتی ہے۔"

"پوسٹ مارٹم رپورٹ ہی میں یہ بھی درج ہے کہ مقتول کی کھوپڑی کے عقبی حصے کو نشانہ بنایا گیا تھا۔" میں نے قدرے جارحانہ انداز میں کہا۔

"جی، یہ ایک حقیقت ہے۔" وہ جلدی سے بولا۔ "لاش کے تفصیلی معائنے کے بعد میں بھی اسی نتیجے پر پہنچا تھا۔"

میں نے آئی او کو گھمانے کی کوشش کی۔ "جب ملزم اپنے دس ہزار روپے لینے مقتول کے کارخانے پہنچا تو اس وقت مقتول کی میز کی دراز میں پچاس ہزار روپے رکھے ہوئے تھے؟"

"آپ پہلے بھی مجھ سے یہ سوال کر چکے ہیں۔" وہ ناگواری سے بولا۔ "اور میں نے اس کا جواب بھی دے دیا ہے۔"

"مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ آپ نے اس سوال کا جواب "ہاں" میں دیا تھا۔" میں نے کہا۔ "یعنی اس وقت مقتول کی میز کی دراز میں پچاس ہزار روپے موجود تھے لیکن اس وقت میں آپ سے کچھ اور پوچھنا چاہتا ہوں۔"

"کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟" وہ الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

"یہ کہ......" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "جب مقتول کی میز کی دراز میں پچاس ہزار روپے رکھے ہوئے تھے تو اس نے ملزم کو دس ہزار روپے ادا کیوں نہیں کردیے تھے؟"

"یہ تو آپ اسی سے جا کر پوچھیں۔" وہ بڑی بے رخی سے بولا۔

"اس کے پاس جانے کے لیے مجھے زندگی سے ہاتھ دھونا پڑیں گے اور میں فی الحال ایسا ہرگز نہیں چاہوں گا البتہ......" میں نے لمحاتی توقف کرکے ڈرامائی انداز میں کہا۔ "البتہ آپ یہاں زندہ سلامت موجود ہیں۔ میں آپ سے ایک نہایت ہی اہم سوال پوچھ لیتا ہوں۔"

میں اتنا کہہ کر خاموش ہوا تو وہ منتظر نگاہ سے مجھے تکنے لگا کہ پتا نہیں، میں اس سے کیا پوچھنے والا ہوں۔ میں نے اسے زیادہ دیر تذبذب میں مبتلا رکھنا مناسب نہ سمجھا اور

نہایت ہی سنجیدگی سے کہا۔

"منظور حسین صاحب! فرض کریں، آپ مقتول والی ریوالونگ چیئر پر بیٹھے ہیں اور میں میز کی دوسری جانب ملاقاتیوں والی ایک کرسی پر براجمان ہوں۔ ہمارے درمیان کسی بھی بات پر تلخ کلامی جاری ہے۔ یہ بدمزگی اس انتہا کو پہنچ جاتی ہے کہ میں طیش کے عالم میں ایک آہنی راڈ اٹھا کر آپ کے سر پر دے مارتا ہوں۔ آپ اس ضرب کی تاب نہ لاتے ہوئے میز کے اوپر ڈھے جاتے ہیں اور انا للہ ہوجاتے ہیں۔ یہاں پر آپ سے میرا سوال یہ ہے کہ......" میں نے لمحاتی توقف کرکے ایک آسودہ سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"میں آہنی راڈ سے آپ کے سر پر جو خطرناک ضرب لگاؤں گا اس سے آپ کی کھوپڑی کا کون سا حصہ متاثر ہوگا؟"

"ظاہر ہے پیشانی...... یا سر کا بالائی حصہ۔" وہ بے ساختہ بولا۔

میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑا اور پاٹ دار آواز میں کہا۔ "جناب عالی! موت ایک سنگین حقیقت ہے اور کوئی بھی شخص اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ اور انکوائری آفیسر کے تازہ ترین جواب نے استغاثہ کی قلعی کھول دی ہے۔ مقتول کی کھوپڑی کا عقبی حصہ چٹخا کر اسے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا اور یہ اسی صورت ممکن تھا جب اس کے سر پر پیچھے سے آہنی راڈ کا وار کیا جاتا جبکہ مقتول اور ملزم کے بیچ ہونے والی تلخ کلامی کے وقت ملزم، مقتول کے سامنے میز کی دوسری جانب بیٹھا ہوا تھا جہاں سے وہ مقتول کے سر کے عقبی حصے کو ہرگز ہرگز نشانہ نہیں بنا سکتا تھا اور ان لمحات میں ان کے درمیان جو چپقلش فضا قائم ہوچکی تھی اس میں مقتول کبھی بھی ملزم کو راڈ بہ دست اپنے پیچھے جا کر ایک خطرناک ضرب لگانے کا موقع فراہم نہیں کرسکتا تھا لہٰذا......" میں سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر ایک وقفے کے بعد اپنا بیان مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"لہٰذا حالات وواقعات کی روشنی میں یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ اسلم فاروقی کے بہیمانہ قتل میں ملزم کا ہاتھ نہیں ہوسکتا۔ میرے موکل کو کسی سوچی سمجھی سازش کے تحت اس کیس میں پھنسانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ دیٹس آل یور آنر!"

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہوگیا۔ جج

اقوال زریں

✂ اچھے لوگ قرض خوش دلی سے ادا کرتے ہیں۔

✂ ملازم سے اگر اچھا کام لینا چاہتے ہو تو تنخواہ بھی اچھی دو۔

✂ غصہ حماقت سے شروع ہوکر ندامت پر ختم ہوتا ہے۔

✂ جاہل بے موقع غصہ کرنے سے پہچانا جاتا ہے۔

✂ اگر دنیا ہمیشہ ایک شخص کے پاس رہتی تو اب جن کے پاس موجود ہے ان کو ہرگز نہیں ملتی۔

✂ جو شخص خود اپنے نفس کی اصلاح نہیں کرتا وہ دوسروں کے حق میں کبھی مصلح نہیں بن سکتا۔

✂ بدطینت لوگوں سے بچو کہ ان کی صحبت سے سوائے رنج کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔

✂ جو شخص بروں کی صحبت میں بیٹھتا ہے وہ زندگی میں کبھی سکھ نہیں پاتا۔

مرسلہ: ناصر عباس۔ گلیانہ روڈ کھاریاں

نے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کردیا۔

"دی کورٹ از ایڈ جارنڈ......!"

☆☆☆

آئندہ پیشی پر استغاثہ کی جانب سے یکے بعد دیگرے تین گواہ عدالت میں پیش ہوئے اور انہوں نے حلفیہ بیان ریکارڈ کرانے کے بعد وکیلِ استغاثہ کے مختلف سوالات کے جوابات دیے۔ میں نے استغاثہ کے ان گواہوں پر برائے نام ہی جرح کی تھی۔ ان کی گواہی اور بعدازاں ہونے والی جرح میں ایسی کوئی خاص بات نہیں جو میں آپ کی خدمت میں پیش کرسکوں۔ ان سب کا موقف ایک دوسرے سے ملتا جلتا تھا۔ ان کے خیال میں ملزم ایک غصہ ور، جھگڑالو اور بدتمیز شخص تھا اور آئے روز مقتول کو تنگ

کرنے اس کے پاس پہنچ جایا کرتا تھا وغیرہ وغیرہ......!

اگلی پیشی سے پہلے میں نے اچھا خاصا ہوم ورک بھی کرلیا تھا۔ میں نے ذاتی طور پر فضل کریم سے بھی ایک تفصیلی ملاقات کی تھی۔ رقم کی ادائیگی کے حوالے سے اس نے بڑے ٹھوس انداز میں تصدیق کی تھی۔ وہ وقوعہ کے روز دوپہر میں مقتول کے کارخانے جاکر اس سے ملا تھا اور رسمی گفتگو کے بعد مبلغ پچاس ہزار روپے مقتول کو دے کر واپس آگیا تھا۔ اس کے بعد کارخانے کے اندر کیا واقعات پیش آئے اس بارے میں وہ کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ فضل کریم ایک دوراندیش، معاملہ فہم کاروباری شخص تھا۔ اس سے کسی قسم کی دروغ گوئی کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔

یہ سب تو چل ہی رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں مقتول کے ملازم خاص ارشد محمود کے بارے میں بھی معلومات حاصل کرنے سے چوکا نہیں تھا۔ ارشد محمود کا نام استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں شامل تھا۔ اسی شخص نے پولیس کو اسلم فاروقی کے قتل کی اطلاع دی تھی۔ پولیس نے جو چالان عدالت میں پیش کیا تھا اس میں درج بیشتر باتیں ارشد محمود سے حاصل ہونے والی معلومات کا نتیجہ تھیں۔ میں نے اپنے مخصوص ذرائع استعمال کرکے ارشد محمود کے حوالے سے اچھی خاصی جان کاری حاصل کرلی تھی۔

آیندہ پیشی پر مقتول کی بیوہ زبیدہ خانم کو گواہی کے لیے عدالت میں پیش کیا گیا۔ وہ ایک موٹی تازی اور سانولی عورت تھی۔ اس کی شاہکار بیماری کے بارے میں پیچھے تفصیلاً بیان کیا جاچکا ہے۔ میری نظر میں زبیدہ کو عدالت میں لاکر گواہی دلوانے کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ وکیل استغاثہ نے اسے محض اس لیے زحمت دی تھی کہ مقتول کے حق میں، عدالت کی زیادہ سے زیادہ ہمدردیاں سمیٹ سکے۔ پتا نہیں، وہ اس کوشش میں کس حد تک کامیاب رہا تھا۔

زبیدہ نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کرادیا تو وکیل استغاثہ اسے کافی دیر تک گھیرے رہا۔ جب اس نے زبیدہ کی جان چھوڑی تو میں مختصری جرح کے لیے وٹنس باکس کے قریب چلا گیا اور استغاثہ کے گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔

"زبیدہ صاحبہ! مجھے آپ کے شوہر کی ناگہانی موت کا بہت افسوس ہے۔ میں آپ کے غم میں برابر کا شریک ہوں لیکن جب آپ گواہی کے لیے عدالت کے کمرے تک پہنچ ہی گئی ہیں تو میں بھی آپ سے صرف ایک سوال کرنا چاہوں گا......!"

اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا اور اکتاہٹ بھری نظر سے مجھے تکتی رہی۔

میں نے تمہید باندھتے ہوئے کہا۔ "آپ نے معزز عدالت کے روبرو جو بیان ریکارڈ کرایا ہے اور بعد از آں وکیلِ استغاثہ کے سوالات کے جواب میں جو کچھ بتایا ہے اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ملزم نے آپ لوگوں خصوصاً مقتول کا جینا حرام کر رکھا تھا۔" لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے کہیں آپ کے بیان سے کوئی غلط تاثر تو نہیں لے لیا؟"

"نہیں۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ "آپ نے حقیقت بیان کی ہے۔"

"اب میں آپ سے وہ سوال پوچھوں گا جس کا اوپر ذکر کیا ہے۔" میں نے متعدل انداز میں کہا۔

وہ متذبذب انداز میں مجھے گھورنے لگی۔

میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "یہ تو ایک ٹھوس حقیقت ہے کہ مقتول نے ملزم کو گھر والے ایڈوانس کی رقم مبلغ دس ہزار روپے ہر صورت واپس کرنا تھے پھر لگ بھگ ایک ماہ گزر جانے کے بعد بھی مقتول اس سے ٹال مٹول کیوں کر رہا تھا جبکہ ایسا بھی نہیں کہ خدانخواستہ مقتول کے مالی حالات خستہ ہوں......؟"

"بات مالی حالات یا ٹال مٹول کی نہیں ہے وکیل صاحب!" زبیدہ نے عذر کی آڑ لیتے ہوئے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ "دس ہزار کوئی اتنی بڑی رقم نہیں کہ فاروقی ادا نہیں کرسکتا تھا۔"

"پھر اصل بات کیا تھی؟" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

"پہلی بات تو یہ کہ ملزم نے میرے شوہر کے ساتھ دھوکا کیا تھا جس پر فاروقی سخت غصے میں تھا۔" وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولی۔

"کیسا دھوکا؟" میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

"کرائے پر گھر لینے اور دینے کا ایک اصول ہوتا ہے۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "اگر کرایے دار کو گھر چھوڑنا ہو تو وہ ایک ماہ پہلے مالک مکان کو اطلاع دیتا ہے تاکہ وہ کسی نئے کرایے دار سے بات چیت کرسکے۔ اسی طرح اگر مالک مکان کو گھر خالی کرانا ہو تو وہ کرایے دار کو ایک ماہ پہلے نوٹس دیتا ہے تاکہ کرایے دار اپنے لیے کوئی دوسرا گھر تلاش کرسکے لیکن ملزم نے محض چار دن پہلے فاروقی کو بتایا کہ وہ گھر خالی کرکے جارہا ہے۔ شاید آپ کو نہیں معلوم کہ ایک ماہ تک وہ گھر خالی پڑا رہا ہے جس سے ہمیں ایک ماہ کے کرایے کا نقصان ہوا ہے......"

"مجھے آپ کے اس نقصان کا افسوس ہے زبیدہ صاحبہ!" میں نے اپنائیت بھرے لہجے میں کہا۔ "یہ تو ہوگئی ایک بات۔ اب آپ دوسری بات بھی بتادیں؟"

"اسلم فاروقی کو ایک تو اس بے اصولی کا غصہ تھا۔" وہ تلخی سے بولی۔ "اور دوسری بات یہ کہ ملزم کی طرف کچھ حساب نکلتا تھا جو وہ دینے کو تیار نہیں تھا۔ ملزم کی اس ہٹ دھرمی نے فاروقی کو جھنجلاہٹ میں مبتلا کردیا تھا اور اس نے طے کرلیا تھا کہ اچھی طرح ناک رگڑوانے کے بعد ہی وہ ملزم کے دس ہزار روپے واپس کرے گا۔"

پتا نہیں، غصے میں یا سادگی میں زبیدہ خانم نے معزز عدالت کے سامنے ایک ایسی حقیقت بیان کردی تھی جس سے مقتول کی بدنیتی کی تصدیق ہوتی تھی اور یہ تصدیق سراسر میرے موکل کے حق میں جاتی تھی۔ میں نے زبیدہ کو نمٹانے کی غرض سے یہ بھی پوچھ لیا۔

"آپ نے ملزم اور مقتول کے درمیان کسی حساب کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ کیا قصہ ہے زبیدہ صاحبہ؟"

"آپ جانتے ہیں، بجلی اور گیس کے بلز پچھلے مہینے کے استعمال کے حساب سے جاری کیے جاتے ہیں۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "فاروقی کو ان بلز کی آمد کا انتظار تھا تاکہ وہ ایڈوانس کی رقم میں سے بلز کی رقم کاٹ سکے پھر ان دو سالوں میں ملزم نے اور اس کی بیوی نے جو توڑ پھوڑ کی تھی اس کی کٹوتی بھی لازمی تھی......"

اس کے بعد زبیدہ نے ٹوٹ پھوٹ کے بارے میں بھی بتایا مثلاً کچن میں چولہے والی سلیب میں سل بٹا لگنے سے ایک دراڑ آگئی تھی۔ واش بیسن کی ایک سائڈ چٹخ گئی تھی اور اسی طرح کی دوسری بہت سی شکایات۔ میں ان ایشوز کی تفصیل میں جاکر آپ کو ہرگز بور نہیں کروں گا۔ اگر آپ کو کرایے دار کی حیثیت سے زندگی گزارنے کا اتفاق ہوا ہے تو آپ ان مسائل سے بہ خوبی آگاہ ہوں گے۔

میں نے جیسے ہی مقتول کی بیوہ زبیدہ خانم کو فارغ کیا، اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہوگیا۔ جج نے دس روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کردی۔

اس دوران میں ملزم کی بیوی فوزیہ مسلسل میرے رابطے میں تھی اور وہ ہر پیشی پر عدالت میں موجود ہوتی تھی۔ اب تک کی عدالتی کارروائی کو دیکھ کر وہ خاصی مطمئن ہوگئی تھی۔ ابتدا میں اس کے چہرے اور آنکھوں میں فکر کی جو گہری پرچھائیاں نظر آتی تھیں وہ اب معدوم ہوگئی تھیں۔

☆☆☆

منظر اسی عدالت کا تھا اور گواہوں والے کٹہرے میں استغاثہ کا سب سے اہم گواہ اور مقتول کا ملازمِ خاص ارشد محمود کھڑا تھا۔

ارشد نے اپنا حلفیہ بیان ریکارڈ کرایا۔ پھر وکیل استغاثہ نے نپی تلی جرح کے بعد اسے فارغ کردیا۔ اپنی باری پر میں جج کی اجازت حاصل کرکے وٹنس باکس کے قریب چلا گیا۔

ارشد محمود کی عمر لگ بھگ چالیس سال رہی ہوگی۔ وہ گول چہرے والا مائل بہ فربہی ایک عام سا شخص تھا۔ مقتول کے کارخانے میں اسے سپروائزر کی حیثیت حاصل تھی۔ عملے میں وہ مقتول کے سب سے زیادہ نزدیک سمجھا جاتا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اپنی جرح کا آغاز کیا۔

"ارشد صاحب! آپ کو مقتول اسلم فاروقی کی موت کا دکھ تو بہت ہوا ہوگا؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے جناب۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "میرا اور فاروقی صاحب کا دس سال کا ساتھ تھا۔"

"گویا آپ کو مقتول کے کارخانے میں کام کرتے ہوئے دس سال کا عرصہ ہوگیا تھا؟" میں نے تصدیق طلب نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

اس نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

میں نے پوچھا۔ "آپ نے پولیس کو بیان دیا ہے کہ وقوعہ کے روز دوپہر کے وقت فضل کریم نامی ایک شخص مقتول کو مبلغ پچاس ہزار روپے دے کر گیا تھا۔ جب وہ مقتول کو پیمنٹ کر رہا تھا تو آپ بھی دفتر کے اندر موجود تھے۔ مقتول نے آپ کے سامنے وہ رقم میز کی دراز میں ڈالی تھی؟"

"جی ہاں، میں نے پولیس کو یہی بیان دیا ہے۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "اور یہی حقیقت بھی ہے۔"

"فضل کریم کے جانے کے بعد مقتول سے ملنے اور کون آیا تھا؟" میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"یہی آیا تھا......" گواہ نے اکیوزڈ باکس (ملزم والے کٹہرے) کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔ "کاش......! یہ منحوس شخص اس دن فاروقی صاحب سے ملنے

نہ آیا ہوتا......" بولتے بولتے اس کی آواز بھیگ گئی۔
میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ "ارشد صاحب! آپ نے ملزم کے لیے "منحوس" کا لفظ کیوں استعمال کیا؟"
"تو اور کون سا لفظ استعمال کروں۔" وہ برہمی سے بولا۔ "اگر یہ اس دن فاروقی صاحب سے ملنے نہ آتا تو ان کے بیچ جھگڑا نہ ہوتا اور یہ شخص فاروقی صاحب کی جان نہ لیتا......!" بات کے اختتام پر اس نے نفرت بھری نظر سے میرے موکل کو دیکھا۔
کسی بھی کیس میں ملزم کی حالت بڑی قابل رحم اور افسوسناک ہوتی ہے۔ اسے وکیل استغاثہ کی کڑی اور خوفناک جرح کا سامنا کرنا پڑتا ہے، استغاثہ کے گواہوں کے تلخ و ترش جملے سننا پڑتے ہیں اور حاضرینِ عدالت میں سے بعض لوگوں کی نفرت بھری نگاہوں سے اپنے دل و جگر کو چھلنی کرنا پڑتا ہے اور...... یہ سب کچھ وہ نہایت ہی خاموشی کے ساتھ برداشت کرتا ہے۔
"تو آپ کے خیال میں......" میں نے ارشد محمود کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ "مقتول اسلم فاروقی کو ملزم داؤد نے قتل کیا ہے؟"
"جی ہاں، بالکل......!" وہ بڑے وثوق سے بولا۔
"کیا آپ نے اپنی آنکھوں سے ملزم کو آہنی راڈ سے مقتول پر حملہ آور ہوتے دیکھا تھا؟" میں نے آہستہ آہستہ گواہ کے گرد گھیرا تنگ کرتے ہوئے پوچھا۔
"جی اپنی آنکھوں سے تو نہیں دیکھا......" وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔ "لیکن مجھے پکا یقین ہے کہ اسی نے فاروقی صاحب کا خون کیا ہے۔"
"آپ کے اس پکے یقین کا کوئی سبب تو ہوگا ارشد صاحب؟"
"جی ہے سبب۔" وہ سر کو اوپر نیچے حرکت دیتے ہوئے بولا۔
"عدالت وہ سبب جاننا چاہتی ہے۔" میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔
"دیکھیں جناب......!" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "یہ بندہ لگ بھگ چار بجے سہ پہر کارخانے میں پہنچا تھا۔ میں نے ہی اسے فاروقی صاحب کے کمرے میں پہنچایا تھا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد دفتر کے اندر سے ان کے بولنے کی تیز آوازیں آنے لگی تھیں۔ مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی کہ ان میں خاصی تلخ کلامی ہو رہی تھی۔ میں نے ان کے معاملے میں مداخلت کرنے کی کوشش نہیں کی اور اپنے کام میں لگا رہا۔ کچھ دیر کے بعد دفتر کے اندر خاموشی چھا گئی، پھر میں نے ملزم کو فاروقی صاحب کے کمرے سے نکل کر کارخانے سے باہر جاتے ہوئے دیکھا تھا۔"
"تم جس جگہ پر بیٹھے اپنے کام میں مصروف تھے، کارخانے کا وہ حصہ دفتر سے کتنے فاصلے پر ہے؟" میں نے پوچھا۔
"زیادہ دور نہیں جناب۔" وہ جلدی سے بولا۔ "زیادہ سے زیادہ بارہ فٹ کا فاصلہ ہوگا۔"
"جب مقتول کے دفتر کے اندر اچانک خاموشی چھا گئی اور تم نے ملزم کو کارخانے سے باہر جاتے دیکھا تو تم نے کیا کیا تھا؟" میں یکدم "آپ" سے "تم" پر آ گیا تھا۔
"میرے دل میں آئی کہ جا کر فاروقی صاحب سے پوچھوں کہ یہ بندہ ان سے کیوں جھگڑا کر رہا تھا۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "پھر میں دفتر کے اندر چلا گیا تھا۔"
"آفس کے اندر پہنچ کر تم نے کیا دیکھا؟"
"فاروقی صاحب اپنی کرسی پر تو بیٹھے تھے لیکن ان کا بالائی دھڑ میز کے اوپر ڈھیر تھا۔" وہ جھرجھری لیتے ہوئے بولا۔ "میں ان کی حالت دیکھ کر کانپ اٹھا۔ ان کے سر میں سے خون نکل کر میز پر جمع ہو رہا تھا۔ قریب ہی وہ آہنی راڈ بھی رکھی تھی جس کی خوفناک ضرب نے فاروقی صاحب کی کھوپڑی چٹخا دی تھی۔ یہ سب دیکھ کر میں بہت زیادہ گھبرا گیا۔ مجھے یہ سمجھنے میں وقت نہ ہوئی کہ ملزم، مقتول کے سر پر آہنی راڈ کا وار کرکے وہاں سے فرار ہو گیا تھا۔"
"اس کے بعد تم نے کیا کیا؟" میں نے پوچھا۔
"میں نے پہلے تو فاروقی صاحب کی بیگم کو فون کر کے اس اندوہناک واقعے کی اطلاع دی۔" استغاثہ کے گواہ ارشد محمود نے بتایا۔ "اس کے بعد متعلقہ پولیس اسٹیشن فون کر دیا تھا۔"
"پھر پولیس آ گئی۔ اس نے جائے وقوعہ کا جائزہ لیا۔ آلۂ قتل کو اپنے قبضے میں کیا اور تمہاری نشان دہی پر ملزم کی گرفتاری کے لیے اس کے گھر کی جانب روانہ ہو گئی۔" میں نے ایک ہی سانس میں کہا پھر پوچھا۔ "میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟"
"جی نہیں۔" وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "سب کچھ ویسا ہی پیش آیا تھا جو آپ نے بیان کیا ہے۔"
"تم نے ابھی جو کچھ معزز عدالت کے سامنے بتایا ہے یا پولیس کو جو بیان دیا ہے اس کی تصدیق کے لیے تمہارے پاس کوئی گواہ بھی ہے؟"
"جی کیسا گواہ؟" وہ حیرت بھری نظر سے مجھے تکنے لگا۔
"مطلب یہ کہ......" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "وقوعہ کے روز کارخانے کے اندر جو تلخ و ترش واقعات پیش آئے ان کا کوئی اور بھی عینی شاہد ہے؟"
"نہیں جناب! اس دن میرے اور فاروقی صاحب کے سوا کارخانے میں اور کوئی موجود نہیں تھا۔" وہ بڑے اعتماد کے ساتھ بولا۔
"اس کی کوئی خاص وجہ؟" میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔
وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "جی، خاص وجہ تھی اس کی۔"
"کیا میں وہ خاص وجہ جان سکتا ہوں؟"
"کیوں نہیں!" وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ "چوبیس مارچ کو ایک بڑا اسلامی دن پڑا تھا اور آنے والی رات جاگنے کی تھی یعنی چوبیس اور پچیس مارچ کی درمیانی رات عبادت کی تھی۔ فاروقی صاحب نے تمام اسٹاف سے چوبیس مارچ کو کام کرایا تھا اور پچیس مارچ کی چھٹی دے دی تھی تاکہ جو لوگ رات کو جاگ کر عبادت کریں انہیں دوسرے دن اپنی نیند پوری کرنے کا موقع مل جائے۔"
"پچیس مارچ کو صرف تم کارخانے میں حاضر تھے یا پھر مقتول اسلم فاروقی۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "کیا تم دونوں نے پچھلی رات عبادت نہیں کی تھی؟"
"فاروقی صاحب کا تو مجھے پتا نہیں۔" وہ سادہ سے لہجے میں بولا۔ "لیکن میں نے بھرپور عبادت کی تھی لیکن فاروقی صاحب کا حکم تھا کہ دوپہر سے پہلے کارخانے پہنچنا ہے تو میں دس بجے کے قریب بیدار ہو گیا تھا۔ پھر نہا دھو کر میں کارخانے چلا آیا تھا۔"
"ارشد محمود!" میں نے جرح کا زاویہ یک دم تبدیل کر دیا۔ "تم نے شروع میں بتایا ہے کہ تمہیں مقتول فاروقی کے پاس کام کرتے ہوئے لگ بھگ دس سال ہو گئے ہیں۔ کیا تم اپنے کام اور مقتول کے رویے یا سلوک سے خوش تھے؟"
"اگر خوش نہ ہوتا تو کبھی کا یہ نوکری چھوڑ کر جا چکا ہوتا۔" وہ بڑے مضبوط لہجے میں بولا۔ "فاروقی صاحب ہر لحاظ سے میرا بہت خیال رکھتے تھے۔"

صبر و تحمل

ایک شخص کو سرکاری افسر مقرر کیا گیا تو ایک قریبی دوست نے اس سے ملنے کے بعد نصیحت کی "افسر بننے کے بعد ایک بات یاد رکھنا کہ صبر و تحمل کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑنا۔"
اس شخص نے جواب دیا۔ "میں ہمیشہ یہ بات ذہن میں رکھوں گا۔" دوست نے اسے یہ نصیحت تین بار کی۔ جب بھی دوست نصیحت کرتا، وہ جواب میں کہتا۔ "اچھا! میں ایسا ہی کروں گا۔" مگر جب دوست نے چوتھی بار نصیحت کی تو وہ افسر مشتعل ہو گیا اور بولا۔
"تم نے مجھے بے وقوف سمجھ رکھا ہے، جو بار بار یہی نصیحت دہرائے جا رہے ہو؟" دوست نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔
"دیکھا...... صبر و تحمل سے کام لینا آسان بات نہیں ہے، ابھی میں نے چند بار ہی ایک بات کہی اور تم غصے میں آ گئے۔" یہ بات سن کر دوست افسر سخت شرمندہ ہوا۔

اللہ رب العزت کی حمد و ثنا

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا۔
ایک اللہ کے بندے نے کہا۔ "اے اللہ! آپ ہی کے لیے تمام تعریفیں ہیں جو آپ بزرگ ذات اور عظیم سلطنت کے شایانِ شان ہیں۔ تو فرشتوں (کراماً کاتبین) کو دشواری ہوئی اور انہیں سمجھ نہ آیا کہ اس کا ثواب کیسے لکھیں۔ چنانچہ دونوں (فرشتے) آسمان کی طرف چڑھے اور عرض کیا۔ "اے ہمارے پروردگار! آپ کے بندے نے ایک بات کہی ہے ہمیں سمجھ نہیں آیا کہ اس کا ثواب کیسے لکھیں؟"
اللہ عزوجل باوجودیکہ اپنے بندے کی اس بات سے واقف ہیں۔ پوچھا۔ "اس نے کیا کہا؟" انہوں نے عرض کیا کہ "اے پروردگار! اس نے کہا۔ "اے اللہ! آپ ہی کے لیے تمام تعریفیں ہیں......" تو اللہ رب العزت نے ان دونوں فرشتوں سے فرمایا کہ میرے بندہ کا یہی کلمہ لکھ دو۔ جب وہ مجھے ملے گا تو میں خود اسے اس کا اجر دوں گا۔"
(سنن ابن ماجہ شریف۔ باب فضل الحامدین)
مرسلہ۔ طالب حسین طلحہ،
ہائی سیکیورٹی زون، نیو سینٹرل جیل ملتان

''وہ تمہیں جو بھی تنخواہ دیتے تھے تم اس پر مطمئن تھے؟''

''جی، پوری طرح مطمئن تھا۔'' اس نے جواب دیا۔

''کیا میں پوچھ سکتا ہوں، مقتول تمہیں کتنی تنخواہ دیتا تھا؟''

''پندرہ سو روپے۔'' اس نے بتایا۔ ''اس کے علاوہ بھی فاروقی صاحب گاہے بہ گاہے مجھے کچھ نہ کچھ دیتے ہی رہتے تھے۔''

''گویا اس تنخواہ میں تمہارا ٹھیک ٹھاک گزارہ ہو رہا تھا؟''

''جی بالکل......'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''کچھ بچت وغیرہ بھی ہو جاتی تھی یا سب کھا پی کر برابر کر دیتے تھے؟'' میں نے اس کی گردن کے گرد پھندے کو کستے ہوئے پوچھا۔

''بچت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جناب۔'' وہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ ''بس پورا مہینا ٹھیک گزر جاتا تھا۔ کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔''

''کیا یہ درست ہے کہ تم اپنی بیوی اور تین بچوں کے ساتھ لیاقت آباد المعروف بہ لالوکھیت میں رہتے ہو؟''

''جی ہاں، یہ درست ہے۔'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔

''اور وہ مکان بھی کرایے کا ہے؟''

''جی...... اپنی ساری زندگی کرایے کے مکانوں ہی میں گزری ہے۔'' وہ بے پروائی سے بولا۔

''کبھی تم نے اپنا ذاتی گھر بنانے کے بارے میں بھی سوچا؟''

''جناب! ذاتی گھر کی سوچ اور خواہش تو ہر وقت دل و دماغ میں رہتی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''اس خواہش کی تعبیر کے لیے کبھی تم نے عملی کوشش بھی کی؟''

''عملی کوشش کا سوال تو اس وقت پیدا ہو جب جیب میں پیسے ہوں۔'' وہ حسرت بھرے لہجے میں بولا۔ ''اللہ عزت و آبرو سے مہینا پورا کر دیتا ہے، یہی بہت ہے۔''

اس نے میرے پھیلائے ہوئے جال میں قدم رکھ دیا تھا۔ میں نے اب تک ارشد محمود کے حوالے سے جو تحقیق کی تھی اسے استعمال میں لاتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو...... تنخواہ دار آدمی کے لیے ذاتی گھر کے خواب دیکھنا تو ممکن ہے لیکن ان سہانے خوابوں کو تعبیر دینا اس کے بس کی بات نہیں لیکن......'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے استغاثہ کے گواہ سے پوچھا۔

''لیکن بعض لوگ اپنی اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے بی سی (کمیٹی) وغیرہ ڈال لیتے ہیں۔ یکمشت ذاتی گھر نہ بھی خرید سکیں تو کہیں پلاٹ بک کرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کیا تمہیں کبھی بی سی ڈالنے کا خیال آیا؟''

''نہیں جناب!'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''اگر بی سی ڈالیں تو ہر ماہ ایک مخصوص رقم بھرنا بھی پڑتی ہے اور اپنی اتنی گنجائش نہیں ہے۔''

''کبھی تمہارا کوئی پرائز بانڈ نکلا ہے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

اس نے جواب دیا۔ ''نہیں جناب! میں اتنا خوش قسمت نہیں ہوں۔''

''ارشد محمود!'' میں نے یک لخت اپنی جرح میں جارحیت بھرتے ہوئے پوچھا ''کیا تم نے بندر روڈ دیکھ رکھا ہے؟''

''آپ بھی کمال کرتے ہیں جناب......!'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''کوئی شخص کراچی میں رہتا ہو اور اس نے بندر روڈ نہ دیکھا ہو، یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے۔''

''گویا تم نے بندر روڈ دیکھا ہوا ہے؟''

''جی ہاں...... بالکل!'' وہ پُر وثوق لہجے میں بولا۔

''بندر روڈ پر ایک کمپنی ''برہانی ایسوسی ایٹس'' کا آفس ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کیا تم نے یہ آفس دیکھ رکھا ہے؟''

وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔ ''میں کسی برہانی ایسوسی ایٹس کو نہیں جانتا۔''

''گویا کبھی اس دفتر میں تمہیں جانے کا اتفاق نہیں ہوا؟''

''کبھی نہیں!'' وہ دوٹوک انداز میں بولا۔

''ٹھیک ہے......!'' میں نے سرسری لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ''ارشد محمود! کیا تم نے نیو کراچی کا علاقہ ''یوپی موڑ'' دیکھ رکھا ہے؟''

''آبجیکشن یور آنرز!'' وکیلِ استغاثہ نے اپنی موجودگی کا یقین دلاتے ہوئے تیز لہجے میں کہا۔

جج سمیت عدالت کے کمرے میں موجود ہر شخص نے گردن اٹھا کر وکیلِ استغاثہ کی طرف دیکھا۔ جج نے

لہجے میں وکیلِ استغاثہ سے استفسار کیا۔

''وکیل صاحب! آپ کو کس بات پر اعتراض ہے؟''

''جناب عالی! اس وقت عدالت میں اسلم فاروقی مرڈر کیس کی سماعت ہو رہی ہے اور میرے فاضل دوست استغاثہ کے معزز گواہ کو کراچی کا نقشہ یاد کرانے کی کوشش کر رہے ہیں......''

''نقشہ یاد کرانے کی کوشش نہیں کر رہا۔'' میں نے ترکی بہ ترکی کہا۔ ''بلکہ گواہ کی یادداشت کا امتحان لے رہا ہوں۔''

''آپ کے ان سوالات کا زیرِ سماعت کیس سے کیا تعلق ہے؟'' وکیل استغاثہ نے جھلاہٹ آمیز انداز میں مجھ سے پوچھا۔

''جو بھی تعلق ہے، ابھی کھل کر سامنے آجائے گا۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے......!''

''یور آنر......!'' وکیل استغاثہ نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے فریادی لہجے میں کہا۔ ''میرے نزدیک وکیلِ صفائی غیر متعلقہ جرح کر کے معزز عدالت کا قیمتی وقت برباد کر رہے ہیں۔ عدالت سے میری استدعا ہے کہ انہیں ایسی کوشش سے باز رہنے کی تاکید کی جائے۔ دیٹس آل یور آنرز!''

وکیلِ استغاثہ کے اعتراض کو اہمیت دیتے ہوئے جج نے مجھ سے پوچھا۔ ''بیگ صاحب! آپ کے ان سوالات کی عدالت کی نظر میں کیا حیثیت ہے؟''

''جناب عالی! اگر میرے فاضل دوست نے ''آبجیکشن'' کا نعرہ بلند نہ کیا ہوتا تو اب تک میرے سوالات کی عدالتی اہمیت اور حیثیت کھل کر سامنے آچکی ہوتی۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں نے اب تک استغاثہ کے معزز گواہ پر ایک لفظ بھی فالتو یا غیر ضروری خرچ نہیں کیا۔ میں معزز عدالت سے پُر زور اپیل کرتا ہوں کہ مجھے اپنی جرح مکمل کرنے کا موقع فراہم کیا جائے اور وکیلِ سرکار کو میری جرح میں مداخلت سے روکا جائے۔''

جج نے اثبات میں گردن ہلائی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں مجھ سے کہا۔ ''بیگ صاحب! پلیز پروسیڈ......!''

میں دوبارہ استغاثہ کے گواہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''ارشد محمود!'' میں نے سخت لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ ''کیا تم نے نیو کراچی کا علاقہ ''یوپی موڑ'' دیکھ رکھا ہے؟''

''جی...... نام سنا ہے......'' وہ گڑبڑاتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''لیکن کبھی اس طرف جانے کا اتفاق نہیں ہوا......!''

''اپنا پلاٹ دیکھنے بھی نہیں گئے؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی!'' وکیل استغاثہ نے چیخ سے مشابہ لہجے میں کہا۔ ''وکیلِ صفائی استغاثہ کے گواہ کو ہراساں کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جب گواہ نے یوپی موڑ دیکھا ہی نہیں تو پھر وہاں اس کا پلاٹ کیسے نکل آیا؟''

جج نے مجھ سے پوچھا۔ ''بیگ صاحب! یہ پلاٹ کا کیا قصہ ہے؟''

میں نے اپنی فائل میں سے چند نہایت ہی اہم کاغذات کی نقول نکال کر جج کی جانب بڑھا دیں اور کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔

''جناب عالی! ان کاغذات کے مطابق لیاقت آباد، مکان نمبر فلاں فلاں کے رہائشی ارشد محمود نے پندرہ اپریل کو برہانی ایسوسی ایٹس کے آفس واقع بندر روڈ جا کر اپنے لیے ایک سو بیس گز کا ایک پلاٹ پینسٹھ ہزار روپے میں خریدا تھا۔ مذکورہ پلاٹ نیو کراچی کے علاقے ''یوپی موڑ'' کے نزدیک واقع ہے۔ ان کاغذات پر ثبت دستخط اسی ارشد محمود کے ہیں جو اس وقت استغاثہ کے معزز گواہ کی حیثیت سے میری جرح کا سامنا کر رہا ہے۔ اگر......'' میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر بہ آواز بلند کہا۔

''جناب عالی! استغاثہ کا گواہ ارشد محمود تھوڑی دیر پہلے معزز عدالت کے روبرو اس بات کا اقرار کر چکا ہے کہ وہ اپنی آمدنی میں بہ مشکل گزارہ کرتا ہے۔ اس کی بچت نہیں ہوتی۔ اس نے زندگی میں کبھی ''بی سی'' نہیں ڈالی اور نہ ہی کبھی اس کا کوئی پرائز بانڈ کھلا ہے پھر...... پھر اس امر کا سراغ لگانا بہت ضروری ہے کہ اس کے پاس اچانک پینسٹھ ہزار کی رقم کہاں سے آگئی جو اس نے ایک سو بیس گز کا پلاٹ خرید ڈالا اور وہ بھی مقتول اسلم فاروقی کی موت کے صرف بیس روز بعد......؟''

جج نے پوری توجہ سے میرے دلائل سنے پھر سوالیہ نظر سے ارشد محمود کی طرف دیکھا۔ اس سے قبل کہ جج اس سے کچھ پوچھتا، وہ چلا اٹھا۔

''م...... میں نے...... کہیں کوئی پلاٹ نہیں خریدا...... وکیل صاحب جھوٹ بول...... رہے ہیں...... مجھے خوامخواہ اس کیس میں گھسیٹنے کی کوشش کی جا رہی ہے...... پ...... پ...... پانی......!''

"سائنس کی ریسرچ نے ثابت کیا ہے کہ جب کوئی شخص دروغ گوئی سے کام لے رہا ہوتا ہے تو اس کے گلے کے اندر پائے جانے والے غدود لعاب بنانا بند کردیتے ہیں لہٰذا اس کا حلق ایسا خشک ہوجاتا ہے کہ گھبرا کر پانی مانگنے کی ضرورت پیش آتی ہے جیسا کہ اس وقت استغاثہ کا گواہ ارشد محمود "پ...... پانی" کی صدا لگا رہا ہے......" میں نے گونج دار آواز میں کہا۔ "اور اس کے جھوٹ کو ثابت کرنا چنداں مشکل نہیں۔ برہانی ایسوسی ایٹس کا آفس اس بات کی تصدیق کرسکتا ہے کہ پندرہ اپریل کو ارشد محمود......" میں نے وٹنس باکس میں کھڑے استغاثہ کے گواہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اسی ارشد محمود نے پینسٹھ ہزار روپے میں اپنے لیے "یوپی موڑ" کے علاقے میں ایک سوبیس گز کا ایک پلاٹ خریدا تھا......!"

میری بات ختم ہونے سے پہلے ہی ارشد محمود کے گھٹنوں سے جان نکل چکی تھی۔ اس نے پہلے کٹہرے کی ریلنگ کو تھاما پھر ہارے ہوئے جواری کے مانند اس نے کٹہرے کے فرش پر اکڑوں بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھام لیا۔

اس کے عمل نے عدالت کو باور کرادیا تھا کہ اب "برہانی ایسوسی ایٹس" کے آفس سے کسی تصدیق کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

☆☆☆

آیندہ پیشی پر عدالت نے میرے موکل کو باعزت بری کردیا۔

داؤد کی باعزت بریت کے پیچھے ارشد محمود کے اقبالِ جرم کا ہاتھ تھا۔ اس نے دولت کے لالچ میں اپنے سیٹھ اسلم فاروقی کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ جج کے حکم پر جب پولیس نے "برہانی ایسوسی ایٹس" کے آفس سے جا کر میرے دعوے کی تصدیق کی تو پتا چلا کہ استغاثہ کے گواہ ارشد محمود نے پندرہ اپریل کو واقعی کمپنی سے پینسٹھ ہزار کے عوض ایک سوبیس گز کا ایک پلاٹ واقع یوپی موڑ خریدا تھا۔ اس تصدیق کے بعد ارشد محمود کے پاس اقرار جرم کے سوا کوئی چارہ نہیں بچا تھا۔

ارشد محمود نے اپنے اقراری بیان میں بتایا کہ اپنے گھر کا خواب وہ برسوں سے دیکھ رہا تھا لیکن اس خواہش کی تکمیل کی دور دور کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی پھر وقوعہ کے روز جب اس نے مقتول اسلم فاروقی کو طیش کے عالم میں میرے موکل کے ساتھ جھگڑا کرتے سنا تو اس کی نیت میں فتور آگیا۔

یہ بات تو طے تھی کہ وہ فاروقی کے کارخانے میں ساری زندگی بھی محنت کرتا رہتا تو اپنا ذاتی گھر نہیں بنا سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ دوپہر میں فضل کریم نامی ایک شخص فاروقی کو پچاس ہزار روپے دے کر گیا تھا جو اس کی میز کی دراز میں رکھے تھے۔ اس کے جی میں آئی کہ اگر وہ اپنے سیٹھ کو قتل کرکے پچاس ہزار کی رقم پر ہاتھ صاف کرلے تو سارا الزام میرے موکل داؤد پر ڈالا جاسکتا ہے۔ اسی لمحے شیطان نے اس کے دماغ پر قبضہ کرلیا۔

جیسے ہی داؤد، فاروقی سے تلخ کلامی کے بعد کارخانے سے رخصت ہوا، ارشد، فاروقی کے کمرے میں داخل ہوا۔ ارشد، فاروقی کے لیے انتہائی قابل بھروسا شخص تھا۔ ان کے بیچ داؤد کے حوالے سے بات چیت ہونے لگی۔ اسی دوران میں کمال چالاکی سے ارشد، فاروقی کے عقب میں پہنچ گیا۔ فاروقی کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ارشد کی نیت میں کس نوعیت کی خرابی پیدا ہوچکی ہے لہٰذا اس کی غفلت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ارشد نے آہنی راڈ کے ایک بھرپور وار سے اسلم فاروقی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے موت کی نیند سلادیا۔ اس قابلِ مذمت "کارنامے" کے بعد فاروقی کی میز کی دراز میں سے پچاس ہزار روپے نکالنا اس کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل ثابت ہوا تھا......

جج کے ایک سوال کے جواب میں ارشد محمود نے بڑی ڈھٹائی سے بتایا تھا کہ وہ تو صرف پچاس ہزار کی توقع کررہا تھا لیکن جب اس نے فاروقی کی میز کی دراز کھولی تو وہاں پینسٹھ ہزار رکھے تھے۔ اس نے پینسٹھ ہزار کی رقم کو مالِ غنیمت جان کر پار کیا اور کارخانے ہی کے ایک حصے میں چھپادیا تاکہ اگر اتفاق سے پولیس اس کی بھی جامہ تلاشی لے تو وہ شک سے پاک نکلا۔

جس روز عدالت نے داؤد کو بری کیا، فوزیہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ وہ اپنے شوہر کو آزاد فضا میں سانس لیتا دیکھ کر بے حد مطمئن نظر آتی تھی اور میری ممنون بھی کہ جس کی کوشش نے داؤد کو اس مصیبت سے نجات دلائی تھی۔

فرطِ جذبات سے اس نے میری طرف دیکھا اور تشکرانہ لہجے میں بولی۔ "بیگ صاحب! اس کیس سے نمٹتے ہوئے لگ بھگ ایک سال لگ گیا لیکن......"

میں نے اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی قطع کلامی کرتے ہوئے زیرِلب مسکرا کر کہہ دیا "دیر آید، درست آید......!"

(تحریر: حسام بٹ)

ہیجان

ڈاکٹر شیر شاہ سید

ہیجان چاہے جس صورت حال میں ہو ہمیشہ زندگی میں سکون کو غارت کرنے کا سبب بنتا ہے... لیکن تخلیق کا ہیجان انسان کو ایک نئی زندگی عطا کرتا ہے۔ یہی حال کچھ اس کا بھی تھا جب اس کی کانٹوں بھری زیست میں کچھ گلاب لمحوں نے جنم لیا تو تمام فضا مہک اٹھی... اور اس کی زندگی کا کُل اثاثہ وہی چند لمحات تھے جن کی بدولت اسے ایک نئے جہان سے آشنائی ہوئی۔

سنگریزہ رستوں پر قدم اٹھاتی ایک حسینہ کی کاوشوں کا احوال

آئن اسٹائن نے کہا تھا۔

"I want to know God,s thought, the rest are details"

میں تخلیق کار کی سوچ کو سمجھنا چاہتا ہوں، باقی تو صرف تفصیلات ہیں۔ شاید ساری زندگی آئن اسٹائن تخلیق کار کی سوچ کی گرہوں کو سلجھانے کی کوشش کرتا رہا۔ تخلیق کار کے گورکھ دھندے کو وہ کتنا سمجھا، مجھے نہیں پتا مگر میں اس گورکھ دھندے میں کیسے الجھ کر سلجھی یا سلجھ کر الجھی، اس کا مجھے ابھی

تک اندازہ نہیں ہے۔ میں کابل پولی ٹیکنیک یونیورسٹی میں فزکس پڑھاتی تھی۔ یہ پولی ٹیکنیک یونیورسٹی، کابل یونیورسٹی سے زیادہ دور نہیں ہے۔ پیدل بھی آیا جایا جاسکتا ہے۔ وہیں سے میں نے فزکس میں ماسٹرز کیا جس کے بعد وہیں مجھے لیکچرر کی نوکری مل گئی تھی۔ ابو محکمۂ تعلیم میں ملازم تھے اور امی اسکول میں پڑھاتی تھیں، ایک بھائی فوج میں پائلٹ تھا، دوسرا بھائی ارجمند کابل یونیورسٹی میں فارسی ادب پڑھاتا تھا۔ ارجمند نے تہران یونیورسٹی سے فارسی میں پی ایچ ڈی کی تھی، اسے پڑھنے پڑھانے کا جنون تھا۔ دنیا بھر کی زبانوں کی شاعری کے ترجمے، ہر زبان میں لکھا جانے والا جدید کلاسیکی ادب، دنیا بھر میں ہونے والے مذاکروں، مناظروں کا فارسی میں ترجمہ، ایران سے ہوکر کابل بھی پہنچ جاتا۔ وہاں مجھے زندگی کا احساس ہوا، وہاں مجھ پر علم کے دروازے کھلے۔ ہماری لائبریری، ہماری لیبارٹری میں وہ سب کچھ تھا جو ایک ماڈرن لیبارٹری میں ہونا چاہیے۔

یونیورسٹی میں ہی میری ملاقات آریان سے ہوئی، آریان ارجمند کا دوست تھا۔ ماسکو سے انگلش میں پی ایچ ڈی کرکے آیا اور یونیورسٹی میں ہی شعبہ انگریزی ادب میں اسسٹنٹ پروفیسر کے عہدے پر تعینات ہوا۔ میری اس سے پہلی ملاقات ارجمند کے کمرے میں ہوئی، میں ارجمند کے کمرے میں بیٹھی اس کا انتظار کررہی تھی کہ وہ آگیا۔ سرخ وسفید چہرہ، گہری بھویں۔ بھرے بھرے ہونٹ اوران کے اوپر گہری سیاہ مونچھیں، سر پر گھنے بال۔ اس کا قد لانبا تھا اور اسے دبلا ہی کہا جاسکتا تھا۔ اس نے نیلا کوٹ، نیلے رنگ کی قمیص اور خاکی پتلون پہنی ہوئی تھی۔ پیروں میں سیاہ جوتا مجھے ایسا لگا جیسے وہ موزے پہننا بھول گیا ہو، اس کی گردن میں نیلے رنگ کا ہی مفلر تھا جو دونوں کاندھوں سے نیچے لٹک رہا تھا۔

میں نے اسے دیکھا اور دیکھنے کے ساتھ ہی میرے دل میں اس کے لیے ایک شدید قسم کی کشش پیدا ہوگئی تھی۔ وہ جاذب نظر تھا۔ ایک خاص قسم کا مردانہ حسن تھا اس میں۔ میں اسے دیکھتی رہی پھر گھبرا کر بولی، ”جی میں ارجمند کی بہن ہوں۔ انتظار کررہی ہوں اس کا۔“

”اوہ! اچھا تو آپ فرشتے ہیں، فزکس پڑھاتی ہیں یہاں پر۔ ارجمند نے بتایا تھا مجھے۔ مجھے آریان کہتے ہیں، میں انگلش پڑھاتا ہوں۔ ابھی آیا ہوں ماسکو سے۔“ اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا تھا۔

بعض لوگوں سے بار بار نہیں ملنا پڑتا۔ پہلی ہی ملاقات میں ایسا لگتا ہے جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔ اس دن بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ آیا، بیٹھا اور بات چیت شروع کردی تھی۔ ”اچھا تو کیا خیال ہے آپ کا، سماج میں لٹریچر اور فلسفے کی زیادہ اہمیت ہے یا فزکس کیمسٹری کی۔“ اس نے مجھ سے گفتگو کا آغاز کردیا۔

”سماج میں علم کی اہمیت ہونی چاہیے، چاہے کوئی بھی علم ہو۔ علوم تو سارے ہی اہم ہیں، سماج کی بہت ساری ضرورتیں ہیں اور علم اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ہوتا ہے۔“ میں نے جواب میں کہا تھا۔

”کیا بات ہے فرشتے، کیا بات ہے، برا تو نہیں مانو گی اگر میں صرف فرش کہہ کر پکاروں۔ فرشتے تو بہت بڑا نام ہے اور ایسا لگتا ہے جیسے بہت دور ہو تم اور فرش تو جیسے بہت ہی قریب ہو۔“ اس نے بڑی بے تکلفی سے تکلفات کے پردوں کو اتار پھینکا۔ پھر کہنے لگا۔ ”بات تو تمہاری صحیح ہے، مگر کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ جب تک سماج میں ادب کی چاشنی نہ ہو، فلسفے کا کھوج نہ ہو، شاعری کی حساسیت نہ ہو، قانون کی گرفت نہ ہو اس وقت تک سماج، سماج نہیں ہوتا، ایک ہجوم ہوتا ہے لوگوں کا، ایک ریوڑ کی طرح۔ ایسے ریوڑ کو فزکس، کیمسٹری، باٹنی یا زولوجی کیا دے سکتی ہے، کچھ بھی نہیں۔ کیا غلط کہہ رہا ہوں میں؟“

”نہیں، صحیح کہہ رہے ہیں آپ۔ سماج بغیر ادب وفن، فلسفہ وشاعری اور قانون وروایات کے ہوگا تو سماج نہیں ہوگا۔ لیکن تاریخ میں ایسے بہت سارے سماج بنے، ٹوٹے، بکھرے اور تحلیل ہوگئے۔ فلسفی نہ روحانی ضروریات پوری کرسکے اور نہ مادی ضروریات کا حصول کراسکے۔ اگر ان لوگوں کی فزکس، کیمسٹری، بائیولوجی، ریاضی، موحولیات اور آسمانوں پر بھی نظر ہوتی تو آج کسی دوسری دنیا میں ہوتے ہم لوگ۔ انسان کے اندر کی دنیا کو اگر فلسفوں کی ضرورت ہے تو انسان کے باہر کی کائنات کو بھی انسان کو سمجھنا ہوگا۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ میں نے بھی اپنی رائے کا اظہار کردیا تھا۔

دروازہ کھلا اور ارجمند کمرے میں داخل ہوا۔ ”اوہ! معاف کرنا دیر ہوگئی، میں ذرا وائس چانسلر کے پاس چلا گیا تھا۔“ اس نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر آریان کو مخاطب کرکے اس نے بتایا کہ حالات خراب ہورہے ہیں۔ روسی فوجی تو واپس چلے گئے ہیں مگر حکومتی کنٹرول آہستہ آہستہ ختم ہورہا ہے۔ بڑے مشکل حالات ہوتے جارہے ہیں۔ خیر چھوڑو کہیں کھانا کھاتے ہیں، چلو آریان تم بھی چلو۔

ہم لوگ یونیورسٹی کے سادہ سے ریستوران میں کھانا کھانے چلے گئے۔ بڑی دلچسپ باتیں ہوئی تھیں اس دن روزمرہ کی باتیں، انگریزی وفارسی ادب کی باتیں، سیاسی وسماجی حالات کی باتیں۔ آریان نہ صرف یہ کہ خوب صورت آدمی تھا بلکہ خوب صورت ذہن ودماغ کا بھی مالک تھا۔ ذہین تھا، سمجھدار تھا اور بلا کا رومانی۔ اس دن کے بعد وہ میرے دل میں بیلا کی پھولوں کی خوشبو کی طرح مہکتا رہا۔

اتنی شدید تڑپ، چاہت، کسی کے لیے پہلے کبھی میرے دل میں نہیں ہوئی تھی۔ وہ ایک سائے کی طرح میرے وجود پر چھا گیا۔ مجھ میں خواہش تو شدید تھی پر ہمت نہیں تھی کہ میں اس کے سامنے چلی جاتی، بیٹھ جاتی، سر اٹھاتی اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتی۔ ”آریان صاحب محبت کے بارے میں کیا خیال ہے آپ کا، کیا اچھا ادب، اچھی شاعری، اچھا افسانہ، اچھا ناول محبت کے بغیر بھی تخلیق کیا جاسکتا ہے۔“ میں یہ نہیں کرسکی۔ اس کے بارے میں سوچتی رہی، من ہی من میں سلگتی رہی اور اسے تلاش کرتی رہی۔ نہ جانے وہ کہاں کھو گیا تھا۔

ایک ہفتے کا ذکر ہے، میں کلاس ختم کرکے باہر نکلی تو وہ نظر آیا۔ دیوار سے ٹیک لگائے، سفید قمیص، خاکی پتلون، نیلا کوٹ، نیلا مفلر اور کالے جوتوں میں پیر بغیر موزے کے، کھڑا جیسے میرا انتظار کررہا ہو۔ میں نے بے قرار ہوکر اسے دیکھا، اس نے بھی بڑی بے قرار نظروں سے مجھے دیکھا تھا۔

”کیا حال ہے تمہارا فرش۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔

”میں دوسرے دن ہی غزنی چلا گیا تھا۔ میری ماں کی طبیعت خراب تھی، انہیں لے کر قندھار کے بڑے اسپتال جانا پڑا، بہر حال اب وہ ٹھیک ہیں۔ تم کیسی ہو، میں نے سوچا تھا کہ دوسرے دن ہی آکر ملوں گا مگر شام کو ماں بی کا فون آگیا پھر میں رک نہیں سکتا تھا۔“

”میں ٹھیک ہوں۔“ مسکرا کر جواب دیا تھا میں نے۔ کیسے کہتی کہ ٹھیک نہیں ہوں تمہیں، بے قراری سے ڈھونڈتی پھرتی ہوں۔ بے تاب ہوہوکر، نظر بھر کے دیکھتی ہوں دور سے آنے والے، نیلا کوٹ پہنے ہر شخص کو اور تمہیں نہ پاکر کتنی اداسی اترتی ہے میرے بدن میں، میری روح میں۔ کاش کہ یہ سب کچھ کہہ سکتی اس سے۔

مگر اس نے سب کچھ کہہ دیا بنا کسی تردد، کسی جھجک اور کسی تکلف کے ”فرش شادی کروگی مجھ سے۔ ہاں کہہ دو تو ماں بی کو گھر بھیج دوں تمہارے۔“

مجھے ایسا لگا جیسے لمبے سے اس کاریڈور میں شروع سے آخر تک یکایک چاندنی پھیل گئی ہو، ساری کلاسوں کے دروازے یکایک کھل گئے ہوں اور ہر طرف سے پھولوں کی بارش شروع ہوگئی ہو۔

پھر بہت جلد ہی ہم دونوں کی شادی ہوگئی، ہم دونوں کے والدین کی مرضی سے۔ ہم دونوں ہی کی زندگی میں یکایک جیسے بہار آگئی۔ میں اس سے خوش تھی اور وہ مجھ سے سیر۔ ہم دونوں کو جیسے ایک دوسرے کے بغیر چین نہیں آتا تھا۔ آریان کہتا تھا اپنی زندگی کی بہترین نظمیں اس نے انہی زمانے میں لکھی تھیں۔ نہ جانے مجھ میں کہاں سے قوت آگئی تھی، ایسا لگتا تھا جیسے اڑنا چاہوں تو اڑتی چلی جاؤں، بادلوں سے بھی آگے۔

ہم دونوں نے بہت سا وقت گزارا اور بہت سی جگہیں دیکھیں، نوروز میں مزار شریف گئے، جشن ہرات میں گھومے، غزنی وقندھار کے بازاروں میں چکرائے، کابل کے ہوٹلوں، ریستورانوں میں رنگین شاموں میں ہمارے نام کی قندیلیں جلیں۔ میں نے کوئی نظم پڑھی تو اسے سنادی۔ اس نے کوئی کتاب لی تو مجھے بتایا۔ میں فزکس کے قوانین اور کائنات کے جانے بوجھے راز اسے اس طرح سے بتاتی جیسے میں نے ہی ان کا پتا لگایا ہے۔ آئن اسٹائن، کارل سگاں،

چھ عادتیں

ایک بار آپ ﷺ نے شیطان کو کمزور دیکھا تو وجہ پوچھی۔ شیطان نے کہا کہ آپ ﷺ کی امت کی چھ عادتیں مجھے کمزور کردیتی ہیں۔

- ✂ ہر کام کرنے سے پہلے بسم اللہ پڑھتے ہیں۔
- ✂ جب ملتے ہیں تو ایک دوسرے کو السلام علیکم کہتے ہیں۔
- ✂ جب آپس میں ملتے ہیں تو مصافحہ کرتے ہیں۔
- ✂ جب کبھی کسی کام کا ارادہ کرتے ہیں تو انشاء اللہ کہتے ہیں۔
- ✂ ہمیشہ استغفار کا ورد کرتے ہیں۔
- ✂ آپ ﷺ کا نام سنتے ہی درود بھیجتے ہیں۔

آیئے ان کاموں کو اپنا کر شیطان کو کمزور سے کمزور تر بنائیں۔

مرسلہ: طالب حسین طلحہ، نیو سینٹرل جیل، ملتان

اسٹیفن ہاکنز کی زندگی کے قصے، ان کی دریافتیں، بلیک ہول کے بارے میں کائنات اور بگ بینگ کا تذکرہ ایسے کرتی جیسے میں خود وہاں موجود تھی۔ ایسا احساس مجھے پہلے کبھی نہیں ہوا۔ کتنے لوگوں کو بتایا تھا میں نے لیکن کبھی ایسا محسوس نہیں ہوا تھا مجھے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ کسی نے اتنی توجہ سے سنا کب تھا مجھے، اتنی اہمیت کس نے دی تھی میری باتوں کو۔ آریان مجھے سنتا، دیکھتا، محسوس کرتا اور ساتھ ساتھ اس طرح چلتا جیسے گزرے سفر میں ساتھ تھا اور آگے بھی ساتھ رہے گا۔ خود اعتمادی انتہا پر پہنچ گئی تھی۔

پھر بہت کچھ بہت تیزی سے ہو گیا ہم لوگوں کے ساتھ۔ نجیب کی حکومت ختم ہوئی، مجاہدین نے افغانستان کے حصے بخرے کر دیے، انارکی ایسی پھیلی کہ لگتا تھا کہ نہ جانے کتنے ٹکڑے ہو جائیں گے ملک کے۔ لوگ جیسے تیسے حالات کا سامنا کر ہی رہے تھے کہ ایک سیاسی قوت ٹڈی دل کی طرح یکایک نمودار ہوئی اور پورے ملک پر تیزی سے قابض ہو گئی۔

ایک رات آریان واپس نہیں آئے۔ بہت کھوج لگائی ہم لوگوں نے۔ یونیورسٹی سے تو میں فارغ کر دی گئی تھی۔ برقعہ پوش ہو کر میں اور میری ماں، میرا بھائی اسے تلاش کرتے رہے۔ گلی گلی، دفتر دفتر، تھانہ تھانہ، کچھ پتا نہیں چلا آریان کا۔ ایک دن بازار میں میرے والد اور بھائی کو گولی ماردی گئی۔ دو دن کے بعد مسخ شدہ لاش ملی۔ نہ جانے کس طرح دفنایا تھا انہیں۔ وہ سب کچھ ایک ڈراؤنے خواب کی طرح یاد ہے۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے آریان بھی مر گئے ہیں۔ ختم ہو گئے ہیں کسی قید خانے میں اپنے وعدوں کو یاد کرتے ہوئے۔

The wood are lovely, dark and deep
But I have promises to keep
And miles to go before I sleep
And miles to go before I sleep

ایک دن یہ لائنیں پڑھی تھیں انہوں نے میرے سامنے۔ میں انہی لائنوں کو دہراتی رہی، یاد کرتی رہی۔ انہی دنوں پتا چلا کہ غزنی میں آریان کے گھر پر ایک بم گرا تھا اور کوئی بھی نہیں بچ سکا۔ دو سال گزرنے کو تھے کہ ماں، ارجمند اور کابل سے نکلے، بس کے ذریعے سرحد پر پہنچے جہاں سے پشاور کا راستہ آسان تھا۔

پشاور میں پورے ایک مہینا ٹھہر کر ہر مہاجر کیمپ میں آریان کی تصویریں لیے ہم تینوں، لوگوں سے پوچھتے رہے۔ لوگ مجھے دیکھتے، ان کی آنکھوں میں افسوس ہوتا، کرب ہوتا، درد ہوتا، ہمدردی کے بول ہوتے، حالات پہ گلہ ہوتا، اوپر والے کی ناانصافی کی شکایت ہوتی لیکن کوئی بھی اس کے بارے میں خبر نہیں دے سکا۔

پشاور میں ہی ہم تینوں نے امریکا میں پناہ کے لیے درخواستیں دی تھیں۔ پھر کوئٹہ میں جاننے والے افغانوں سے آریان کا پتا کیا۔ اس کا کچھ پتا نہیں چلا۔ وہ نہ جانے کہاں کھو گیا تھا۔

☆☆☆

امریکا میں زندگی آسان نہیں تھی۔ واشنگٹن ایئرپورٹ پر ہمارے پاسپورٹ اور امیگریشن کے مسائل حل ہونے کے بعد ہمیں ٹاؤن ہاؤس میں ٹھہرایا گیا۔ ایک ہفتے میں ہمارے کاغذات بن کر آ گئے۔ نیشنل سیکیورٹی نمبر اور ورک پرمٹ مل گیا۔ ابتدائی طور پر مناسب رقم فراہم کر دی گئی اور پھر امریکا کی زندگی کا آغاز ہو گیا۔

فیروز نے ہم تینوں کی بڑی مدد کی۔ مکان کا حصول، امریکا میں رہنے کا طریقہ، مختلف قوانین کا جاننا، مدد حاصل کرنے کے طریقے، ہماری تو انگلش اچھی تھی مگر میری فزکس کی ڈگری اور ارجمند کی فارسی میں اہلیت کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی واشنگٹن میں۔ وطن سے دور فرنگ کے دیار میں قسمت نے کچھ اور ہی گل کھلائے۔

ہم سب نے یہی فیصلہ کیا کہ ماں گھر میں رہیں گی۔ شروع میں مجھے دواؤں کی دکانوں کی ایک کمپنی اکیرڈ میں نوکری ملی اور ارجمند ایک شاپنگ سینٹر میں کام کرنے لگا۔ ہم دونوں نے ہی پڑھنے کا بھی فیصلہ کر لیا تھا جس کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی۔ کام کے ساتھ ساتھ میں نے کمپیوٹر کے کورسز لے لیے اور ارجمند نے دو جگہوں پر کام شروع کر دیا۔ جارج ٹاؤن یونیورسٹی میں اسے ایک امتحان دے کر مشرقی زبانوں کے شعبہ میں داخلہ ملنے کی اُمید ہو گئی جس کے لیے رقم کی ضرورت تھی۔ ان تمام کاموں میں فیروز نے ہماری بڑی مدد کی تھی۔

فیروز کا تعلق پشاور سے تھا۔ وہ بہت پہلے ہی کالج چھوڑ کر امریکا کا ویزا لے کر امریکا آ گیا تھا، پھر واپس نہیں گیا۔ مختلف کام کیے تھے اس نے۔ کمپیوٹر میں مہارت حاصل کر لی اور اب آئی بی ایم میں ایک اچھی ملازمت کر رہا تھا۔ پہلے دن ہی ہماری ملاقات اس سے ایئرپورٹ پر ہوئی تھی جہاں وہ اپنے کسی دوست کو رخصت کرنے آیا تھا۔ ہمیں دیکھ کر رکا، ہم سے بات کی، پھر شام کو ہمارے ٹھکانے پر

آن پہنچا اور اس دن سے کسی اچھے دوست کی طرح ہماری مدد کرتا رہا۔ گھر کے حصول سے لے کر بینک کے اکاؤنٹ تک، کریڈٹ کارڈ کے لیے درخواست سے لے کر گاڑی خریدنے تک، تعلیم سے لے کر نوکری کے حصول تک۔ وہ بہت سوشل تھا پھر بھی اکیلا اور ہم لوگ تو اجنبی بھی تھے۔ اکیلے بھی تھے اور ضرورت مند بھی۔

ڈھائی سال کا عرصہ خاموشی سے گزر گیا۔ بہت سارے مزید افغان نہ جانے کن کن راستوں سے بھٹکتے ہوئے امریکا کی ہر ریاست میں پہنچ گئے۔ ہم لوگ کوشش کرتے رہے لیکن ہمیں آریان کی زندگی یا موت کی خبر نہیں ملی۔ ایک دن ماں نے کہا تھا مجھ سے کہ زندگی طویل ہے، فیروز نے تمہارا ہاتھ مانگا ہے، اسے سب کچھ بتایا ہے ہم لوگوں نے۔ میرا اور ارجمند کا بھی یہی خیال ہے کہ تم فیروز سے شادی کرلو، سات سال سے بھی اوپر ہوگئے ہیں۔ زندگی تو گزارنی ہی ہوگی، کب تک اکیلے رہوگی۔ کب تک یونہی گزاروگی۔ یہ دن یہ رات، یہ شب یہ مہینے یہ سال، نہ جانے کیوں مار ڈالا ان لوگوں نے اسے۔ یہ کہہ کر ان کے آنسو نکل آئے تھے۔

اس روز آریان کی موت ہوگئی کیونکہ اسی روز امیدوں کی موت ہوگئی تھی اور جب امید ختم ہوجائے تو سب کچھ ختم ہوجاتا ہے۔ امید ہی کے سہارے تو ہم سب لوگ زندہ رہتے ہیں۔ اچھے دنوں کی امید، گئے ہوئے دنوں سے بہتر دنوں کی امید، بیماری سے صحت یاب ہونے کی امید، زندگی میں کامیاب ہونے کی امید، امید ہی تو ہے جو ہم سب کا سہارا ہوتی ہے اور جب امید مرجائے تو سب کچھ مرجاتا ہے۔ چند ہفتوں کے بعد میں دوسری دفعہ خاموشی سے دلہن بنی اور فیروز میری زندگی میں داخل ہوگئے۔

فیروز اچھے آدمی تھے۔ انہوں نے مجھے دل سے چاہا، میرے غموں کو سمجھا، مجھے میرے ماضی کے ساتھ، میرے پورے وجود کو قبول کرلیا۔ مجھے سہارا دیا، حوصلہ دیا، میرے دل میں نئی امیدوں کے بیج لگائے۔ اس کیاری میں آب پاشی کی، مجھے دوبارہ زندہ کردیا۔ میں ایک سال کے اندر ہی ماں بن گئی تھی، ایک خوب صورت سی بھولی بھالی سی بچی کی ماں، جس کا نام ہم لوگوں نے زیتون رکھا تھا۔

ارجمند کو یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کے لیے اسکالر شپ مل گئی تھی۔ ماں نے اس کے لیے ایک اچھی سی افغان لڑکی پسند کرلی تھی، ماہ رخ نام تھا اس کا۔ کابل سے ہی تعلق تھا ان کا۔ واشنگٹن کا سب سے بڑا افغانی ریسٹورنٹ انہی لوگوں کا تھا۔ ارجمند کو ماہ رخ یونیورسٹی میں ملی تھی اور ماہ رخ کی ماں کو ماں نے کابل کے اسکول میں بہت پہلے پڑھایا تھا۔ میں کام چھوڑ کر گھر میں بچی کی پرورش کررہی تھی۔ فیروز اپنے کام میں مصروف تھے اور زندگی کی نئی ڈگر کو ہم لوگوں نے قبول کرلیا تھا۔

مگر اس دن میں جیسے ہی بچے کی گاڑی کو دھکیلتے ہوئے شاپنگ مال کے کار پارکنگ کی طرف جارہی تھی تو مجھے وہ نظر آگیا۔ وہی چہرہ، وہی بالوں کا مخصوص انداز، وہی مونچھیں، بالوں اور مونچھوں میں چاندی جیسے سفید تار جھلک رہے تھے۔ نیلی قمیص، خاکی پینٹ، نیلا کوٹ، گردن میں لپٹا ہوا سیاہ مفلر، سیاہ جوتے بغیر موزوں کے، ساتھ ہی کوٹ کا ایک طرف کا بازو خالی تھا جیسے کاندھوں سے بازو کاٹ دیا گیا ہو۔ میں نے اسے دیکھا، اس نے مجھے دیکھا، پھر اس نے بچی کو دیکھا اور چند معمولی لمحوں میں شاید سب کچھ سمجھ گیا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے اس کے دل، اس کے جسم کا سارا خون اس کے چہرے پر آگیا ہے۔ چہرے پر تیزی سے آتی ہوئی خوشی لمحوں کے اندر اداسی کے سایوں میں کھوتی چلی گئی۔ مجھے ایسے لگا جیسے چاندی کے بال اس کے چہرے پر بھی پھیلتے چلے گئے ہیں۔

خدایا، تم زندہ ہو، میرے مالک، میرے محبوب، میرے دوست، میرے ساتھی تم زندہ ہو۔ کہاں تھے، دیکھو کیا ہوگیا، میں تمہاری ہوں مگر تمہاری نہیں، اب کیا ہوگا، نہ جانے کیسے کیسے سوالات کس کس طرح سے میرے دماغ میں گونجے، میرے چہرے پر چمکے، میری زبان سے لگے اور میں چکرا کر زمین پر بیٹھ گئی۔

اس نے مجھے اپنے ایک ہاتھ سے سہارا دے کر اٹھایا۔ میرے ہاتھ سے گاڑی کی چابی لے کر گاڑی کا دروازہ کھولا، بچی کو پچھلی سیٹ پر بٹھایا، میں بہت کچھ کہنا چاہتی تھی، کچھ نہیں کہہ سکی۔ روتی ہوئی گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔ اس نے جلدی جلدی کاغذ کے ایک ٹکڑے پر اپنا نمبر لکھ دیا اور مجھ سے ارجمند کا نمبر پوچھ کر ایک کاغذ پر لکھ لیا، پھر وہ آہستہ سے اس شام کے دھندلے اندھیروں میں کھو گیا۔

وہ شام بڑی بھیانک شام تھی۔ میں آریان کی بیوی تھی اور فیروز کی بھی بیوی۔ آریان میرا محبوب تھا۔ میں فیروز کے بچے کی ماں تھی۔ اسے میں نے پوجا تھا یہ یقین کرلینے کے باوجود کہ وہ مرگیا ہے۔ میں اسے اپنے دل کے کسی بھی خانے سے تھوڑی دیر کے لیے بھی جدا نہیں کرسکی تھی۔ وہ میرے وجود میں تحلیل ہوگیا تھا اور فیروز میرے چاروں طرف

موجود تھا...... خدایا، کیا کردیا تو نے۔ کیسی یہ دنیا بنائی...... کیسے یہ رشتے باندھے...... کیوں انہیں جوڑا...... کیوں انہیں توڑا...... کیا مرضی ہے تیری، کیا چاہتا ہے تو مالک۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں چیخوں، چیخ کر روؤں اتنا روؤں کہ آسمان زمین پر گر جائے۔ مگر میں محض سوچتی رہی، الجھتی رہی اور ٹوٹتی رہی روتی رہی اور من ہی من میں چیختی رہی۔

شام کو فیروز آئے تو میں ان سے کچھ چھپا نہیں سکی۔ بڑا ظلم کیا ان پر میں نے۔ میں کچھ اور کر بھی نہیں سکتی تھی اور کچھ اختیار میں بھی نہیں تھا میرے۔ میں نہیں رہ سکتی تھی ان کے ساتھ۔ جب تک وہ مردہ تھا میں ان کی تھی، لیکن اگر وہ زندہ ہے تو میں کسی اور کی ہو ہی نہیں سکتی ہوں۔ میں نے فیروز کو بتادیا۔ اپنی مجبوری اپنا دل کھول کر سامنے رکھ دیا میں نے۔ میں دہری زندگی کیسے گزارتی۔ گزار ہی نہیں سکتی تھی میں۔ وہ میرے وجود کا حصہ تھا۔

اس دن ہی دوسری موت دیکھی میں نے۔ فیروز میری سنتے رہے، نہ چیخے نہ الجھے، کبھی ایک جگہ کبھی دوسری جگہ۔ آنسوؤں سے چہرہ تر، بار بار بچی کو چومتے رہے، مجھے دیکھتے رہے، سوچتے رہے، میرے پاس بیٹھ گئے پھر بولے ”مجھے منظور ہے۔ مگر اس بچی کا کیا ہوگا فرشتے، اس کا باپ تو میں ہوں۔ تم ماں ہو مگر کیسے چلے گا۔“ انہوں نے التجا کی تھی ”مجھے بچی کو تو لے جانے دینا۔ اسے رکھوں گا اپنے پاس۔ کبھی نہیں آؤں گا تمہاری زندگی میں، تمہارے درمیان، اتنا تو حق دو گی مجھے۔“ نہ جانے وہ رات کیسے گزری۔

دوسرے دن صبح ہی ارجمند اور ماں گھر آئے۔ آریان کو بغیر کسی جرم کے پکڑ کر لے گئے تھے۔ آریان نے بہت سمجھایا کہ وہ کمیونسٹ نہیں ہے مگر ماسکو کی ڈگری، انگریزی کی پروفیسری یہ سب کچھ اس کے لیے گواہ بن گئی تھی۔ ایک دفعہ جیل سے بھاگنے کی کوشش میں اس کے بازوؤں پر گولی لگی تھی جس کے بعد ایک بازو کاٹ دیا گیا تھا۔ پھر کسی نہ کسی طرح وہ کابل پہنچا جہاں کسی کو ہمارے بارے میں پتا نہیں تھا۔ اس کا خاندان تو پہلے ہی بم کی نذر ہوگیا تھا۔ وہاں سے وہ پشاور پہنچا جہاں کسی نے بتایا تھا کہ ارجمند کو امریکن امیگریشن کے کاغذات بھرتے ہوئے اس نے دیکھا تھا۔ پھر وہ بھی اسلام آباد آکر امریکا میں پناہ کی درخواست قبول ہونے کے بعد امریکا آگیا تھا۔ ماں نے بتایا کہ وہ چاہتا ہے کہ زندگی تمہارے ساتھ گزارے بشرطیکہ تمہیں بھی قبول ہو۔ اسے سب کچھ قبول ہوگا، تم، تمہاری بچی، اگر یہ ممکن نہیں تو پھر وہ واپس چلا جائے گا، واپس افغانستان، کابل یونیورسٹی۔

پھر سب کچھ آسانی سے ہوگیا۔ فیروز بچی کو لے کر میری زندگی سے نکل گئے۔ میں ماں کے گھر واپس آگئی۔ خوش بھی، رنجیدہ بھی۔ امیدوں کے ساتھ مایوسیوں میں گھری ہوئی۔ میں اس کے بازوؤں میں اور وہ میرے گلے لگ کر رودیا تھا بے قرار ہوکر۔

تین دنوں کے بعد یکایک فیروز گھر آئے، بچی کو لے کر جو ہمک کر مجھ سے چپک گئی تھی۔ وہ خاموشی سے مجھے، آریان، ارجمند اور ماں کو دیکھتے رہے۔ پھر آریان سے مخاطب ہوکر بولے۔ ”میں آپ لوگوں کی زندگیوں سے نکل جانا چاہتا ہوں۔ بہت مشکل ہے میرے لیے، ایک لمحے کو بھی دل نہیں کرتا ہے کہ اس بچی کو چھوڑوں لیکن فرشتے سے بھی بے انتہا پیار ہے مجھے اور اس کی بیٹی سے بھی محبت ہے۔ میں بچی کو چھوڑ دوں گا آپ کے پاس ہمیشہ کے لیے۔ کبھی نہیں آؤں گا بس ایک دفعہ کہہ دو تم اسے اپنی ہی بچی سمجھو گے، باپ بن جاؤ گے اس کے۔“ اس نے بڑے درد سے کہا تھا۔

آریان اٹھے، اس کے قریب آئے، اسے گلے سے لگایا، اس کے ماتھے کو چوما، اس کے ہاتھوں کو تھاما۔ ”یہ تمہاری بیٹی ہے مگر میری فرشتے اس کی ماں ہے، اپنی ذات سے زیادہ چاہوں گا، اسے اپنی ذات سے زیادہ۔ تم سے بھی مجھے عقیدت ہے تم نے فرشی کو دوبارہ زندگی دی تھی۔ وہ تمہاری بھی ہے اور یہ دونوں میرے لیے میری ذات سے زیادہ ہوں گے۔“

انہوں نے بڑے اعتماد سے فیروز کو یقین دلایا تھا۔

ہم لوگ کابل واپس جارہے ہیں، وہیں رہیں گے، میں، آریان، میری بچی، میری ماں۔ آریان پھر سے کابل یونیورسٹی میں پڑھائیں گے، میں بھی پھر سے کابل پولی ٹیکنک میں وہی سب کچھ کروں گی جسے کرکے ہمیشہ مجھے خوشی ہوتی ہے یعنی فزکس پڑھانے کا کام۔ لیکن ابھی تک ایک سوال بار بار آتا ہے دماغ میں، آئن اسٹائن کا سوال تخلیق کار کی سوچ کے بارے میں اس کے ذہن کے بارے میں، تخلیق کار کی سمجھ کی بارے میں۔

I want to know God,s thought.

مجھے بھی تخلیق کار کی سوچ کا پتا کرنا ہے۔ تفصیلات سے تو میں آگاہ ہوں اور آپ بھی آگاہ ہوچکے ہیں مگر اس کے ذہن میں کیا ہے، کاش میں سمجھ سکوں۔

محفلِ شعروسخن

❁ مس زرینہ نواز......گوجرانوالہ
وہ جب بھی کہتے تھے کہ ہم جیسا کوئی اور نہیں ہے دنیا میں
انہیں چاند دکھا کر انگلی سے ہم ادھر اشارہ کرتے تھے

❁ مہرین ناز ڈوگر......حیدرآباد
یہ رات دن یہ لمحے مجھے اچھے لگتے ہیں
تمہیں سوچوں تو سارے سلسلے اچھے لگتے ہیں
بہت دور تک چلنا مگر پھر بھی وہیں رہنا
مجھے تم سے تم ہی تک فاصلے اچھے لگتے ہیں

❁ راجا افتخار علی افقی......چوآسیدن شاہ، موہڑہ
ذرا ٹھہرو کہ بارش ہے یہ تھم جائے تو پھر جانا
کسی کا تجھ کو چھو جانا مجھے اچھا نہیں لگتا

❁ حسیب احمد چناے......الکڈی، کرک
نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی
تمہارے پیامی نے سب راز کھولا
خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی

❁ وارث علی......النور کالج، سند یلیانوالی
نزاکت ہے ختم ان پر ہوا ہے دردِ سر پیدا
ذرا ماتھے کو چوما تھا، پڑے ہیں کل سے سر باندھے

❁ متین سلطان......کراچی
درپردہ رقیبوں سے گلے شکوے نہیں اچھے
تمہیں جو بھی شکایت ہو، ہمارے روبرو کرنا

❁ محمد عقیل چٹھہ......حافظ آباد
عجب چمک سی میرے آنسوؤں میں رہتی ہے
چراغ تیرتے ہیں پانیوں کے اوپر بھی

❁ اظہر حسین پچار......ہزاری، جتوئی
وقف خوف وہراس لگتا ہے
دل مصائب شناس لگتا ہے
تو جو اوجھل ہوا نگاہوں سے
شہر سارا اداس لگتا ہے

❁ رمضان پاشا......گلشن اقبال، کراچی
کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا جو گلے ملو گے تپاک سے
یہ نئے مزاج کا شہر ہے ذرا فاصلے سے ملا کرو

❁ محمد جاوید اختر......نور پور تھل، ضلع خوشاب
تو مجھ سے دوریاں بڑھانے کا شوق پورا کر
میری بھی ضد ہے تجھے ہر دعا میں مانگوں گا

❁ محمد رشید سیال......روہڑی، ضلع سکھر
مجھ سے مخلص تھا نہ واقف میرے جذبات سے تھا
اس کا رشتہ تو فقط اپنے مفادات سے تھا
اب جو بچھڑا ہے تو کیا روئیں جدائی پہ تیری
یہ اندیشہ تو ہمیں پہلی ملاقات سے تھا

❁ ایم این عماد......ضلع دیر، اوچ
حسن خود بیتاب تھا اپنی نمائش کے لیے
مفت میں اہلِ نظر بدنام ہوکر رہ گئے

❁ محمد رمضان حسرت الحسنی......نور پور تھل، خوشاب
قاصد پیامِ شوق کو اتنا نہ کر طویل
پوچھیں تو اتنا کہنا آنکھیں ترس گئیں

❁ محمد عثمان انصاری......نیوسینٹرل جیل ملتان
کوئی موسم ہو دل میں ہے تمہاری یاد کا موسم
کہ بدلا ہی نہیں جاناں تمہارے بعد کا موسم
نہ کوئی غم خزاں کا ہے نہ خواہش ہے بہاروں کی
ہمارے ساتھ ہے یارو کسی کی یاد کا موسم

❁ طالب حسین طلحہ......نیوسینٹرل جیل ملتان
ان کی آنکھوں میں دیکھ کر آنسو
اپنی بربادیوں کا غم نہ رہا
تیرے ایک بار مسکرانے سے
کوئی شکوہ تیری قسم نہ رہا

❁ رضوان تنولی کریڑوی......اورنگی ٹاؤن، کراچی
کسی کے دل میں کیا چھپا ہے، بس خدا ہی جانتا ہے
دل اگر بے نقاب ہوتے، تو سوچو کتنے فساد ہوتے

❁ ساگر تلوکر......چشمہ بیراج
یاد آتے بلال حبشی ہیں
وہ تڑپ اب کہاں اذانوں میں
چند بوڑھے ملے مساجد میں
بھیڑ دیکھی شراب خانوں میں

❁ اعجاز احمد راحیل......ساہیوال
آج پھر بجھ گیا جل جل کے امیدوں کا چراغ
آج پھر تاروں بھری رات نے دم توڑ دیا
جس سے فسانۂ ہستی میں تسلسل تھا کبھی
اس محبت کی روایات نے دم توڑ دیا

❁ اشوک کمار......میرپور خاص
جوق در جوق تمناؤں کے دھوکے کھا کر
دل اگر اب بھی دھڑکتا ہے تو حد کرتا ہے

❁ مس زرینہ نواز......گوجرانوالہ
وہ جب بھی کہتے تھے کہ ہم جیسا کوئی اور نہیں ہے دنیا میں
انہیں چاند دکھا کر انگلی سے ہم ادھر اشارہ کرتے تھے

❁ محمد محسن فاروقی......نیوسینٹرل جیل ملتان
یونہی بے سبب نہ پھرا کرو کوئی شام گھر بھی رہا کرو
وہ غزل کی سچی کتاب ہے اسے چپکے چپکے پڑھا کرو

❁ ایم افضال انصاری......ڈنگہ شہر
تو نے رکھا نہیں خیال میرا
ورنہ ہوتا نہ ایسا حال میرا
تیری خواہش بڑی طلب کے بغیر
بیت جائے گا یہ بھی سال میرا

❁ محمد اکرام صدیقی......اٹک سٹی
مدت سے کوئی شخص رلانے نہیں آیا
جلتی ہوئی آنکھوں کو بجھانے نہیں آیا
کہتا تھا کہ ہم ساتھ جئیں ساتھ مریں گے
اب روٹھ گئے ہیں تو منانے نہیں آیا

❁ محمد اسلم......خانیوال
ساری رات سوتے ہوئے
میں نے جنت کی سیر کی
صبح جو آنکھ کھلی تو دیکھا
کہ سر ماں کے قدموں میں ہے

❁ عمران اکرم سلیم کامریڈ......کھاتاں
یہ مشغلہ ہے کسی کا نہ جانے کیا چاہے
نہ فاصلوں کو مٹائے نہ فیصلہ چاہے

❁ قیصر اقبال گچہ......کلول ضلع بھکر
وقت اچھا بھی آئے گا ناصر
غم نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی

❁ محمد واجد علی گچہ......کلول، بھکر
کل امیرِ شہر نے ریت کے گھر بانٹے ہیں
برسات کے موسم میں بھلا اور کیا سخاوت کرتا

❁ احمد خان توحیدی......پاکستان اسٹیل، کراچی
مانندِ سحر صحنِ گلستاں میں قدم رکھ
آئے تہِ پا گوہرِ شبنم تو نہ ٹوٹے
ہو کوہ و بیابان سے ہم آغوش ہو لیکن
ہاتھوں سے تیرے دامنِ افلاک نہ چھوٹے

❁ سید محی الدین اشفاق......کروڑ لعل عیسن
اب تیری وضاحت میں صداقت نہیں لگتی
اب اپنی محبت کی صفائی نہ دیا کر

❁ ریاض بٹ......حسن ابدال
کون سیاہی گھول رہا ہے وقت کے بہتے دریا میں
میں نے آنکھ جھکی دیکھی ہے آج ایک ہرجائی کی

❊ منشی محمد عزیز مے......لڈن وہاڑی
اِک پیکرِ وفا کا یہ اعجاز دیکھنا
کچے گھڑے کی رچ گئی خوشبو چناب میں

❊ زوہیب احمد ملک......گلستان جوہر، کراچی
نہ جانے کون سا آنسو کسی سے کیا کہہ دے
ہم اس خیال سے نظریں جھکائے بیٹھے ہیں

❊ امداد علی عرف ندیم عباس تنہا......میرپور خاص
تصویر میں نے مانگی تھی شوخی تو دیکھیے
اِک پھول اس نے بھیج دیا ہے گلاب کا

❊ الیلی......کراچی
مجھ میں پیوستہ ہو تم یوں کہ زمانے والے
میری مٹی سے میرے بعد نکالیں گے تمہیں

❊ سید اکبر شاہ......اوگی، مانسہرہ
یہ جو نظروں سے تم میرے دل کو نڈھال کرتے ہو
کرتے تو ظلم ہو صاحب مگر کمال کرتے ہو

❊ احمد حسن عرضی......قبولہ شریف بائی پاس
تم تو غم دے کے بھول جاتے ہو
مجھ کو احسان کا پاس رہتا ہے

❊ محمد قدرت اللہ نیازی......حکیم ٹاؤن، خانیوال
میری باتوں میں میری یادوں میں
حساب کرکے بتاؤں تو بے حساب ہو تم

❊ مدحت......گلشن اقبال، کراچی
ساتھ لمحوں کا اور یاد برسوں کی
اچھے لوگوں کی یہی بات بُری لگتی ہے

❊ شفیق احمد......سرگودھا
جب بھی آتی ہے موسم کی اداؤں میں تبدیلی
اس شخص کا بدل جانا بہت ہی یاد آجاتا ہے

❊ محمد اشفاق سیال......شورکوٹ سٹی
ہم ایسے سادہ دل، واقف کہاں آدابِ الفت سے
کہ جاں پر کھیلتے ہیں اور تم سے پیار کرتے ہیں

❊ جنید احمد ملک......گلستان جوہر، کراچی
اُن کے لیے بھی کوئی بشارت میرے مولا
خوابوں کے سوا جن کو میسر نہیں کچھ بھی

❊ زاہد چودھری......ٹوبہ ٹیک سنگھ
صدیوں سے تجھے تکتے ہوئے سوچ رہا ہوں
جی تیرے خدوخال سے بھر کیوں نہیں جاتا

❊ محمد بشارت......کنگرو دورہ
اِک وعدہ ہے کسی کا جو وفا ہوتا نہیں
ورنہ ان تاروں بھری راتوں میں کیا ہوتا نہیں

❊ اشفاق شاہین......کراچی
ہمیں خبر ہے کہ ہوا کا مزاج رکھتے ہو
مگر یہ کیا، ذرا دیر کو رکے بھی نہیں

❊ داؤد اشفاق......کراچی
یہی ہے ذوقِ عبادت کی انتہا ساغر
غمِ حیات کے ماروں کا احترام کرو

❊ ماہین فاطمہ......کراچی
یہ رکھ رکھاؤ محبت سکھا گئی اُس کو
وہ روٹھ کر بھی مجھے مسکرا کے ملتا ہے

❊ جبران احمد ملک......گلشن اقبال، کراچی
شہرِ دل کو صحرا کہہ کر گزرے تھے وہ بے پروا
پلٹ کے دیکھا ویرانے میں، تنہا تو پچھتائے بہت

❊ محمد اظہر......ملیر، کراچی
ساون آیا، گرجے بادل، جاگ اٹھے ارمان
سیج سجا کے یہ آشا ہے آئے گا مہمان

❊ محمد اقبال......کورنگی، کراچی
تخت و تاج کی بازی میں کب جیت ہوئی غمخواروں کی
یہ کھیل بھی ہے زرداروں کا، یہ بازی ہے سرداروں کی

❊ جاوید شبیر بربرہ......علی پور، مظفر گڑھ
اوجِ فلک سے جب چاہے برسائے برسات الٰہی
مشکل میں ہر ایک بشر کا دیتا ہے تو ساتھ الٰہی

مُحفلِ شعر و سُخن

کوپن برائے شمارہ جون 2014

نام :..

پتا :..

اس عقلمند کی ترقی کا راز جسے لغزشوں سے سیکھنے کا ہنر آتا تھا

سودا

تنویر ریاض

اچھا سوداگر وہی ہوتا ہے جو کسی بھی نقصان سے بچنے کی حتی الامکان کوشش کرتا ہے... لیکن اس کے لیے حاضر دماغی اور وسیع النظری کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان دونوں صلاحیتوں سے وہ مالا مال تھی تب ہی تو اس نے اتنا کامیاب سودا کر ڈالا کہ زندگی سنور گئی۔

وہ بھی ایک عام سا دن تھا اور مجھے اس کے حوالے سے کوئی ایسی خاص بات یاد نہیں آرہی جس کا ذکر کیا جائے لیکن تم میری وکیل ہو اور جاننا چاہتی ہو کہ اس دن کیا واقعات پیش آئے تھے۔ تمہارا اصرار ہے کہ میں صبح بستر سے اٹھنے کے بعد اپنے معمولات کی ایک ایک تفصیل تمہیں بتاؤں جبکہ میرے خیال میں ان سب باتوں کا مقدمے سے کوئی تعلق نہیں بنتا اور سب کچھ معمول کے مطابق ہی ہوا تھا پھر کیوں نہ ہم اس مقدمے کے بارے میں کوئی بات کریں

کیونکہ میں ساری عمر جیل میں رہنا نہیں چاہتی۔ وکیل ہونے کے ناتے تم بہتر طور پر سمجھ سکتی ہو کہ میرے حق میں کیا بہتر ہے۔ جانتی ہوں کہ بعض اوقات بہ ظاہر نظر آنے والی کوئی معمولی اور غیر اہم بات بھی ملزم کی رہائی کا سبب بن جاتی ہے اور تمہاری قابلیت کی تو بڑی دھوم ہے۔ تم نے تو اس شخص کو بھی بری کروا دیا جس نے اپنی بیوی کو قتل کیا تھا۔ کیا کہا۔ اس نے قتل نہیں کیا تھا بلکہ یہ محض اس پر الزام ہے۔ ٹھیک ہے، تم وکیل ہو۔ اپنے موکل کے دفاع میں یہی کہو گی لیکن سب جانتے ہیں۔ خیر چھوڑو ہمیں اس سے کیا لینا دینا۔

☆☆☆

مجھے صبح سویرے بستر چھوڑنا پڑتا ہے۔ اگر ایسا نہ کروں تو وقت پر ناشتا تیار نہیں ہو سکتا لیکن اس سے بھی پہلے چند منٹ کے لیے اپنے کتے کو سیر کے لیے باہر لے کر جاتی ہوں۔ یہ عادت اسے میرے شوہر لیوپولڈ نے ڈالی ہے۔ اس نے کسی میگزین میں پڑھ لیا تھا کہ صبح کی سیر صحت کے لیے مفید ہے۔ چنانچہ اس نے بھی اس پر عمل شروع کر دیا اور اپنے ساتھ کتے کو بھی لے جانے لگا لیکن یہ معمول چند روز سے زیادہ جاری نہ رہ سکا۔ اس وجہ سے لیوپولڈ کو دفتر جانے کے لیے تیار ہونے کا وقت نہیں ملتا تھا۔ وہ ناشتا چھوڑ سکتا ہے لیکن بننے سنورنے کے لیے اسے پورا وقت درکار تھا۔ دراصل اس کے کام کی نوعیت ہی ایسی تھی کہ اسے بناؤ سنگار کا بہت خیال رکھنا پڑتا تھا۔ لیوپولڈ نے تو صبح کی سیر ترک کر دی لیکن کتا اس کا عادی ہو چکا تھا، چنانچہ یہ ذمے داری مجھے سنبھالنا پڑی۔

میرے شوہر کو ناشتے میں ہمیشہ گرم چائے اور دلیا چاہیے ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ توس، دہی اور پھل بھی ضروری تھے اور یہ ڈیوٹی بھی میری تھی کہ سیب چھیل کر اس کی قاشیں بناؤں اور اس کی خدمت میں پیش کروں۔

...تم مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہی ہو۔ شاید تمہارا خیال ہے کہ میں موضوع سے ہٹ رہی ہوں حالانکہ تم نے خود ہی ناشتے کے بارے میں تفصیل جاننے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ میری ساس کو ناشتے میں توس اور ابلے ہوئے انڈے پسند تھے اور وہ بھی گرم ہونے چاہئیں لیکن اس کی باری تو بجے کے قریب آتی تھی۔ اس سے پہلے مجھے دوسرے لوگوں کے لیے بھی ناشتا بنانا ہوتا تھا۔ شوہر سے فارغ ہونے کے بعد میں میری کے لیے سینڈوچ تیار کرتی۔ وہ میرے شوہر کی بہن یعنی میری نند ہے۔ یہ بات تو میں تمہیں پہلے بھی بتا چکی ہوں کہ جب تک اس کی شادی نہیں ہو جاتی وہ ہمارے ساتھ رہنے پر مجبور ہے۔ کیونکہ اپنی محدود آمدنی میں وہ کرایہ کا گھر نہیں لے سکتی۔ اسے آٹھ بجے کام پر پہنچنا ہوتا ہے۔ اس لیے وہ سوا سات بجے ناشتا کر لیتی ہے۔ اس کے لیے زیادہ اہتمام نہیں کرنا ہوتا۔ وہ صرف کافی اور جام لگے ٹوسٹ پر ہی گزارہ کر لیتی ہے۔ وہ لنچ کے لیے سینڈوچ لے جاتی ہے۔ لہٰذا میں اس کے سینڈوچ کے ساتھ ساتھ اپنے بیٹے میکس کے لیے بھی اسنیکس تیار کر لیتی ہوں۔ پھر بچوں کے لیے میز سجاتی ہوں دودھ، دلیا، کارن فلیکس وغیرہ وغیرہ۔ چھوٹی بیٹی لیزا کو چاکلیٹ ملک بہت پسند ہے۔ میری ڈائننگ روم میں ناشتا کیا کرتی تھی کیونکہ کچن میں بچوں کا شور اس کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ صرف بچے ہی نہیں بعض اوقات مجھے بھی زور سے بولنا پڑ جاتا بالخصوص اس وقت جب میکس کی توجہ ناشتے سے ہٹ جاتی تو میں اسے ڈانٹ ڈپٹ کرتی تاکہ اسے اسکول جانے میں دیر نہ ہو جائے۔ لیزا ناشتے کے دوران میز پر چیزیں گراتی رہتی اور مجھے بار بار کپڑے سے میز صاف کرنا پڑتی تھی، اسی دوران میری اپنا ناشتا ختم کر لیتی تو میں ڈائننگ روم سے برتن اٹھاتی اور اس کے ساتھ ساتھ میری نظر میکس پر بھی ہوتی کہ وہ وقت پر ناشتا ختم کر کے تیار ہو جائے پھر میں لیزا کو پکڑ کر اسے پینٹ، جیکٹ اور جوتے پہناتی اور ہم گھر سے نکل جاتے۔

جی ہاں، مجھے میکس کو اسکول چھوڑنے جانا ہوتا تھا، وہ بہت چھوٹا ہے۔ اسی طرح میں لیزا کو بھی گھر پر نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ وہ صرف تین سال کی ہے اور گھر میں اسے دیکھنے والا کوئی نہیں۔ میرے شوہر کے پاس تو بالکل بھی وقت نہیں کہ وہ اسے دیکھ سکے۔ اسے سکون سے ناشتا کرنے اور تیار ہونے کی عادت تھی، ویسے بھی صبح کے وقت وہ کوئی شور شرابا پسند نہیں کرتا۔ آخر اسے دن بھر دفتر میں کام بھی کرنا ہوتا ہے۔ اسی طرح میری بھی تقریباً اسی وقت گھر سے نکلتی تھی جب بچے اسکول جا رہے ہوتے ہیں جبکہ میری ساس اس وقت سو رہی ہوتی تھی۔ گھر واپس آنے کے بعد لیزا اپنے ڈیڈی کو پیار کر کے خدا حافظ کہتی اور پھر......

اس جمعرات کو بھی سب کچھ اسی طرح ہوا تھا۔ معمول سے ہٹ کر چھوٹی موٹی باتیں تو ہوتی رہتی ہیں۔ اس روز بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ لیزا نے میز پر رکھی شہد کی بوتل میں انگلی ڈالی اور اسے چاٹنا شروع کر دیا۔ اس وقت میرا شوہر دفتر جانے کے لیے نکل رہا تھا۔ لیزا دوڑتی ہوئی گئی اور اپنی عادت کے مطابق اس سے لپٹ گئی۔ نہ جانے کس طرح تھوڑا سا شہد اس کے چشمے پر لگ گیا۔ میرے شوہر نے ٹشو پیپر سے چشمہ صاف کیا تو اسے معلوم ہوا کہ اس کی جیکٹ پر بھی شہد لگ گیا ہے۔ میں نے گیلا کپڑا لے کر اس سے شہد صاف کرنے کی

کوشش کی لیکن دھبے اور نمایاں ہو گئے۔ میں دوڑتی ہوئی اوپر گئی اور اپنے شوہر کو دوسرا کوٹ لا کر دیا۔ اس دوران لیزا نے شہد کی بوتل فرش پر گرا دی۔ جس گھر میں چھوٹے بچے ہوں وہاں اس قسم کے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ شوہر کے جانے کے بعد میں نے لیزا کو ایک اونچی کرسی پر بٹھا دیا کیونکہ وہ بار بار فرش پر گرے ہوئے شہد کی طرف بڑھ رہی تھی۔ جبکہ وہاں بوتل کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے بھی پڑے تھے۔ اس نے بہ طور احتجاج زور زور سے رونا شروع کر دیا جس سے میری ساس کی آنکھ کھل گئی اور وہ لیزا کے رونے پر ناراض ہونے لگی۔ اس پر لیزا نے اور بھی اونچی آواز میں رونا شروع کر دیا۔ ایک طرف میں اسے چپ کرانے کی کوشش کرتی رہی تو اس کے ساتھ ساتھ میں نے ساس کی زبان بند کرنے کے لیے اسے ایک پیالی چائے اور صبح کا اخبار پکڑا دیا۔ پھر میں نے کپڑے سے وہ جگہ صاف کی اور کتے کے پنجے بھی دھو دیے۔ میرا خیال تھا کہ کہیں اس نے اپنے آپ کو زخمی نہ کر لیا ہو کیونکہ وہاں کانچ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے۔ کتے کو تو کچھ نہیں ہوا لیکن اس کوشش میں میری انگلیاں ضرور زخمی ہو گئیں، چنانچہ مجھے اپنی مرہم پٹی کرنا پڑی لیکن اس کے باوجود مجھے فرش پر خون کے قطرے نظر آ رہے تھے۔ اس کتے نے شہد چاٹنے کی کوشش میں اپنا منہ زخمی کر لیا تھا۔ اب میں اس کے منہ پر پٹی تو نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے میں نے اسے باتھ روم میں بند کر دیا۔

اس کے بعد میں نے کچن کا فرش صاف کیا۔ لیزا کو گود میں اٹھایا اور ایک ہاتھ سے انڈے توڑ کر فرائی پین میں ڈالنا شروع کر دیے۔ پھر انہیں اتار کر پلیٹ میں رکھا۔ لیزا کے کپڑے بدلے اور ساس کو دیکھنے چلی گئی جو مجھے آواز دے رہی تھی۔ اسے گرم چائے چاہیے تھی۔ میں نے لیزا کو ایک جگہ بٹھایا اور ساس کے لیے چائے تیار کرنے لگی۔ اس دوران لیزا باتھ روم میں چلی گئی جہاں کتا بیٹھا ہوا تھا۔ لیزا نے اسے گود میں لیا تو اس کے کپڑوں پر خون کے دھبے لگ گئے چنانچہ مجھے ایک بار پھر اس کی پینٹ بدلنا پڑی، میں اسے خون آلود لباس میں تو اسکول نہیں لے جا سکتی تھی۔

مجھے لیزا کو لے کر 9 بجے اسکول پہنچنا تھا لیکن ان چکروں میں پانچ منٹ تاخیر سے پہنچی۔ اسکول کی ہیڈ ٹیچر نے مجھے ناگواری سے دیکھا۔ ان کے یہاں دیر سے آنا اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا کیونکہ اس طرح وہ اپنا پروگرام وقت پر شروع نہیں کر سکتے تھے۔ واپس آنے کے بعد میں نے باتھ روم صاف کیا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس وقت تک کتے کے منہ

مجبوری

ایک میمن نے عیدالاضحیٰ کے 6 ماہ بعد خواب میں دیکھا کہ جنت میں سب بکرے کھیل رہے ہیں مگر اس کا بکرا بیٹھا ہوا ہے، میمن نے اپنے بکرے سے پوچھا۔ ”اوئے تو کیوں نہیں اٹھ کے کھیل رہا؟“

بکرے کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے رندھی ہوئی آواز میں بولا۔ ”حاجی صاحب میرا ایک پایا آپ کے فریزر میں ہے میں 3 ٹانگوں سے نہیں کھیل سکتا۔“

لوڈشیڈنگ کے اثرات

ایک پاکستانی فوجی دوسرے سے۔ ”یار جنرل صاحب کہتا ہے کہ اس بار جنگ کمپیوٹر سے لڑی جائے گی؟“

دوسرا فوجی۔ ”ہاں میزائل کمپیوٹر سے کنٹرول ہوتے ہیں ناں اس لیے۔“

پہلا فوجی۔ ”پھر تو ہم جنگ ہار جائیں گے۔“

دوسرا فوجی۔ ”وہ کیسے؟“

پہلا فوجی۔ ”اگر میزائل چھوڑنے سے پہلے بجلی چلی گئی تو؟“

سیر کو سوا سیر

شوہر۔ ”میری امی آ رہی ہیں کچھ بنا لو۔“ بیوی نے منہ بنا لیا۔

اگلی بار بیوی۔ ”میری امی آئی ہیں پلیز آپ باہر سے کچھ لے آئیں“ ......شوہر رکشا لے آیا۔

سلیقہ پسند

پاکستانی بیویاں سلیقے والی ہوتی ہیں وہ سب کے سامنے اپنے شوہر کو ”اے گدھے“ یا ”اوئے گدھے“ نہیں کہتیں، اس لیے وہ مختصر کر کے کہتی ہیں۔ A.G/O.G

مرسلہ۔ رضوان تنولی کریڑوی، اورنگی ٹاؤن، کراچی

سے خون بہنا بند ہو چکا تھا۔ ورنہ اسے بھی جانوروں کے اسپتال لے جانا پڑتا۔ پھر میں نے ناشتے کے برتن دھوئے، کچن صاف کیا اور بستر کی چادریں بدلنے لگی۔

تم سوچ رہی ہوگی کہ میں نے اپنے ناشتے کا ذکر نہیں کیا۔ میں اسی بھاگ دوڑ کے دوران تھوڑی بہت کافی یا چائے لے لیتی ہوں اور سینڈوچ بناتے وقت ایک آدھ ٹکڑا منہ میں رکھ لیتی ہوں۔ یہی میرا ناشتا ہے مجھے اپنے وزن کو بھی کنٹرول کرنا ہے کیونکہ میرے پاس کھیلنے یا ورزش کرنے کے لیے بالکل وقت نہیں ہے۔

بستر کی چادریں بدلنے کے بعد میں نے ساس کے لیے نہانے کا پانی گرم کیا۔ مجھے اس کی تھوڑی بہت مدد کرنا پڑتی ہے۔ وہ ستر سال کی ہوگئی ہے اور کبھی کبھی اسے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے میں دقت ہوتی ہے۔ اس لیے اسے سہارا دیے رہتی ہوں۔ اگر وہ گر پڑی اور اس کی کوئی ہڈی ٹوٹ گئی تو میں کس طرح سنبھال پاؤں گی۔ اکثر و بیشتر وہ اپنا لباس خود ہی تبدیل کر لیتی ہے لیکن اس جمعرات کو اسے بزرگ شہریوں کی میٹنگ میں جانا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کون سا لباس پہن کر جائے۔ اگر میں اسے کوئی مشورہ دیتی تو اس کی سمجھ میں نہ آتا کیونکہ اس کا ذوق مجھ سے بہت مختلف تھا۔ مجھے بھی کسی کام سے باہر جانا تھا لہٰذا میں نے جلدی جلدی شاور لیا اور لباس تبدیل کر کے جانے کے لیے تیار ہوگئی ورنہ مجھے دیر ہو جاتی۔

عین اسی وقت میری ساس کو خیال آیا کہ اس موسم میں نیلا سوئٹر پہننا مناسب نہ ہوگا اور بیگنی سوئٹر اس اسکرٹ سے میچ نہیں کر رہا تھا جو میں نے اس کے لیے منتخب کیا تھا۔ وہ لونگ روم میں کھڑی شکوہ کر رہی تھی اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے پھر میں نے الماری سے ایک گہرے نیلے رنگ کا اسکرٹ نکالا جس پر معمولی سی شکنیں پڑی ہوئی تھیں لیکن وہ اسے اس حالت میں پہننے کے لیے تیار نہ تھی۔ مجبوراً مجھے اس پر استری کرنا پڑی لیکن اس دوران میں وہ براؤن اسکرٹ اور بیگنی سوئٹر پہن چکی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ موسم سرد ہو گیا ہے اور اگر وہ نیلے رنگ کا اسکرٹ پہنتی ہے تو اس کے پاس اس کی مناسبت سے کوئی کوٹ نہیں ہے۔ میرے پاس اس موضوع پر گفتگو کرنے کے لیے بالکل وقت نہیں تھا چنانچہ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ ہم اس پر بعد میں بات کریں گے۔ ویسے بھی میرے پاس لنچ سے پہلے بالکل وقت نہیں تھا۔ مجھے ایک بجے لیزا اور میکس کو ان کے اسکول سے لینا تھا اور اگر میں ان کے لیے صرف سوپ یا نوڈلز بھی بناتی تو یہ مشکل تمام ہی یہ کام ہو سکتے تھے۔

میں نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ مجھے ملازمت کے سلسلے میں لیبر ڈپارٹمنٹ بھی جانا ہے۔ اس کا لیکچر شروع ہو جاتا، وہ مجھے کفایت شعاری کی تلقین کرتی اور پوچھتی کہ میں ان سو یورو کا کیا کرتی ہوں جو وہ ہر ماہ مجھے کھانے کی مد میں دیتی ہے۔ اس کے نزدیک یہ ایک بہت بڑی رقم تھی جسے میں بے دردی سے خرچ کر دیتی تھی۔ میں خاموشی سے باہر آئی اور اپنی بائیک پر سوار ہو کر منزل کی طرف روانہ ہوگئی۔ مجھے ہوا کی مخالف سمت سفر کرنا تھا۔ اس لیے بائیک چلانے میں دشواری ہو رہی تھی۔ میں دس بج کر پانچ منٹ پر اس دفتر میں پہنچی۔ وہاں کاؤنٹر پر موجود ایک عورت نے مجھے بی ٹی ڈبلیو پروگرام کے بارے میں بتایا یعنی بیک ٹو ورک، یہ ان لوگوں کے لیے تھا جو ایک وقفے کے بعد کام پر واپس آنا چاہتے ہوں۔ اس نے مجھے ایک کمرے میں جانے کے لیے کہا جہاں اس شخص سے میری ملاقات ہوئی، میں اسے پہلے سے نہیں جانتی تھی۔ اس لیے مخالفت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ مجھے اس وقت تھوڑی سی تلخی ضرور ہوئی جب اس نے بتایا کہ میں اس پروگرام میں شامل نہیں ہو سکتی۔

انہیں کسی ایسے شخص کی ضرورت تھی جو تیز رفتاری سے عمدہ ٹائپ کر سکتا ہو۔ میں نے اسے بتایا کہ میں بھی ایک گھنٹے میں دس سے پندرہ صفحات ٹائپ کر سکتی ہوں جبکہ دو بچوں کے ہوتے ہوئے یہ خاصا مشکل کام ہے۔ شاید مجھے یہ بات نہیں کہنی چاہیے تھی۔ اس سے وہ یہ سمجھا کہ میں گھر پر ٹائپ کرتی ہوں اور اس طرح ٹیکس چوری کی مرتکب ہو رہی ہوں۔ میں نے اسے بتایا کہ خود بھی یہ کام نہیں کرنا چاہتی کیونکہ یہ کوئی لگی بندھی آمدنی نہیں ہے اور اسی لیے ملازمت تلاش کر رہی ہوں لیکن وہ میری باتوں سے قائل نہیں ہوا اور کہنے لگا کہ مجھے ایسی عورتوں کا حق نہیں مارنا چاہیے جو ملازمت کر کے اپنا گزارہ کرتی ہیں بلکہ اس پر خدا کا شکر کرنا چاہیے کہ مجھے شوہر کی سپورٹ حاصل ہے۔ اس کے علاوہ اسے یہ اعتراض بھی تھا کہ دو بچوں کے ہوتے میں کس طرح ملازمت کی ذمے داریاں نبھا سکوں گی۔

اس کا اعتراض بجا لیکن لیزا جس پری اسکول میں جاتی تھی وہاں ایک بہت اچھا ڈے کیئر سینٹر بھی تھا اور وہ پہلے ہی کہہ چکے تھے کہ اگر مجھے ملازمت مل گئی تو وہ لیزا کو ڈے کیئر سینٹر میں داخل کر لیں گے۔ اس کی باتیں سننے کے بعد بھی میں خاموش تھی لیکن جب اس نے کہا کہ مجھے ایک کورس کرنا چاہیے اس کے بعد وہ میری ملازمت کے بارے میں سوچ سکتا ہے۔ یہ کورس ان لوگوں کے لیے تھا جو طویل عرصے سے ملازمت نہیں کر رہے تھے۔ اس کورس میں بتایا جاتا تھا کہ کس طرح انہیں صبح اٹھنا ہوگا اور دوبارہ کام پر جانے کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنا ہوگا۔ اس دوران وہ پورے وقت مجھے گھورتا رہا۔ اس کی نظریں میرے جسم کو چھید رہی تھیں مانا کہ دو بچوں کی ماں ہونے کے باوجود خاصی پرکشش تھی اور جب تک لوگوں کو نہ بتاؤں کہ شادی شدہ ہوں، انہیں یقین ہی نہیں آتا تھا لیکن خوب صورت اور پرکشش ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہر کوئی ہمیں چلتا پھرتا اشتہار سمجھ کر اپنی نظریں گاڑ دے۔ وہ جس بے باکی سے میرے جسم کا جائزہ لے رہا تھا، اس سے مجھے سخت الجھن ہو رہی تھی۔ اس کے باوجود مجھے یہ خوش فہمی تھی کہ شاید وہ مجھے ٹائپ کرتے دیکھنا چاہتا ہے۔

یہ خیال آتے ہی میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کے ٹائپ رائٹر کی جانب بڑھنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی وہ بھی کھڑا ہو گیا اور نہ جانے اسے کیا سوجھی کہ وہ چلّانے لگا۔ شاید وہ مجھے ٹائپ کرنے سے روکنا چاہ رہا تھا۔ اس کی چیخ و پکار سے میں خوفزدہ ہوگئی۔ اگر اسے نہ روکتی تو شور سن کر دفتر کے دوسرے لوگ بھی وہاں آ جاتے اور میرا تماشا بن جاتا۔ میں نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا لیکن اس پر تو جیسے دیوانگی طاری ہوگئی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں نے ایسا کیا کر دیا۔ اگر وہ نہیں چاہتا تھا کہ میں ٹائپنگ کروں تو آرام سے بھی منع کر سکتا تھا۔ میں اس کی جانب بڑھی تاکہ اسے شور مچانے سے روک سکوں۔ وہ بدک کر پیچھے ہٹا اور اپنی میز سے جا ٹکرایا۔ اس کا ہاتھ لگنے سے میز پر رکھا ہوا پانی کا جگ زمین پر گر پڑا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ وہ نیچے جھک کر کانچ کے ٹکڑے اٹھانے لگا۔

میری نظروں کے سامنے صبح کا منظر گھوم گیا جب لیزا نے شہد کی بوتل زمین پر گرائی تھی اور اس کے ٹکڑے چنتے ہوئے میری انگلی کٹ گئی تھی۔ اس کوشش میں وہ بھی زخمی ہو سکتا تھا چنانچہ میں نے اسے کالر سے پکڑا اور اوپر اٹھانے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ میری توقع سے زیادہ بھاری ثابت ہوا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ شاید اتنی آسانی سے اسے نہ اٹھا سکوں گی۔ اس نے گھوم کر مجھے دیکھا۔ اس کے چہرے پر مجھے ناگواری کے آثار نظر آئے جیسے اسے میری یہ حرکت اچھی نہ لگی ہو جبکہ میں اس کی بہتری کے لیے ایسا کر رہی تھی۔ وہ تھوڑا سا خوفزدہ بھی تھا۔ اس کا چہرہ لٹھے کی طرح سفید ہو رہا تھا اور اس کے ماتھے سے پسینا بہہ رہا تھا۔ ایسی حالت میری ساس کی بھی ہو جاتی تھی جب وہ سنتی کہ لیوپولڈ میرے ساتھ چھٹیاں منانے کہیں باہر جانا چاہتا ہے تو اسے بے ہوشی کے دورے پڑنا شروع ہو جاتے۔

میں نے کمرے کی کھڑکی پوری کھول دی تاکہ اسے تازہ ہوا مل سکے اور اسے کرسی پر بٹھانے کی کوشش کی لیکن وہ کرسی کے گرد گھومتا رہا۔ اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ لگتا تھا کہ وہ مجھ سے خوفزدہ ہے۔ یہ بڑی عجیب بات تھی میں اس کے پاس اپنی غرض سے آئی تھی۔ خوفزدہ مجھے ہونا چاہیے تھا لیکن یہاں تو معاملہ ہی الٹا ہو گیا تھا۔ حالانکہ میں نے اس کے انکار پر کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ میں تو صرف اتنا چاہتی تھی کہ وہ میری ٹائپنگ دیکھ لے تاکہ اسے اندازہ ہو جائے کہ میں اس کی مرضی اور معیار کے مطابق ٹائپ کر سکتی ہوں۔ شاید یہی بات اسے ناگوار گزری تھی، وہ ان لوگوں میں سے تھا جو اپنی کہی ہوئی بات کو حرف آخر سمجھتے ہیں۔

اس کی نظر فرش پر گئی۔ وہاں دو پنسلیں پڑی تھیں جو غالباً پانی کے جگ کے ساتھ ہی میز سے گر گئی تھیں اس کا پاؤں ایک پنسل پر پڑا اور وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ سکتی وہ کھلی ہوئی کھڑکی سے باہر جا چکا تھا۔ میں نے وحشت کے عالم میں اپنے چہرے پر ہاتھ رکھ لیا۔ آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ پانچویں منزل سے گرنے کے بعد اس کا کیا حال ہوا ہوگا۔ کاش وہ احتیاط سے کام لیتا۔

مجھے اس جیل میں رہتے ہوئے دو ماہ ہو چکے ہیں۔ پولیس کو شبہ ہے کہ شاید میں نے اسے دھکا دیا تھا۔ جبکہ میں نے تمہیں تمام واقعات بلاکم و کاست بتا دیے ہیں۔ تمہارے خیال میں یہ حادثہ بے پروائی کے سبب پیش آیا اور تم اسے ثابت بھی کر سکتی ہو۔ جانتی ہوں تم بڑی پائے کی وکیل ہو اور تم نے قتل کے مجرموں کو بھی سزا سے بچایا ہے، مجھے تمہارے الفاظ پر یقین ہے۔ میں نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ساری زندگی اس جیل میں نہیں گزار سکتی۔ ہاں۔ دو تین سال کی بات اور ہے۔ کیونکہ میں نے سنا ہے کہ میری نے دفتر سے طویل چھٹی لے لی ہے اور میری ساس کو لیوپولڈ کے لیے کھانا بنانا پڑ رہا ہے۔ اب ان دونوں کو میری قدر معلوم ہو رہی ہوگی۔ اچھا ہے کچھ عرصہ گھر سے دور رہوں تاکہ انہیں چھٹی کا دودھ یاد آ جائے۔ لیکن اس کے لیے مجھے یہ اعتراف بھی کرنا ہوگا کہ میں نے جان بوجھ کر اسے دھکا دیا۔ میرے خیال میں پورے دن کی مشقت کے عوض یہ سودا مہنگا نہیں۔ تم کیا کہتی ہو؟

ماروی

محی الدین نواب

چھٹی قسط

اگر کوئی کائنات کے رمز کو سمجھنے کی سعی کرے تو سب سے پہلے اسے انسان کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خاموش صحرا کی ویرانی ہو یا پُرجوش لہروں کی روانی... سمندر کی گہرائی ہو یا آسمان کی بلندی... چاند ستاروں کا حسن ہو یا قوسِ قزح کے رنگ... تہ در تہ زمین کی پرتیں ہوں یا بلند آسمان کے سات پردے... ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے ہوں یا بادوباراں کی طوفانی گرج۔ کبھی ہلکی ہلکی بوندوں کی پھوار کا ترنم اور کبھی بجلی کی چمک، کہیں پھولوں کی مہک، کہیں کانٹوں کی کسک... اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں اس کائنات میں جگہ جگہ بکھیر دیں اور... ہر شے کو ایک مقام بھی عطا کیا، مگر... جب انسان کو بنایا تو اس پوری کائنات کو جیسے اس کے اندر کہیں چپکے سے بسا دیا اور یہ بھی عجب کھیل ہے کہیں نام یکساں ہیں مگر تقدیریں الگ اور کہیں چہرے حیران کُن حد تک ایک جیسے ہیں مگر ان کی تقدیر کا لکھا کہیں ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا۔ اس داستان کی ماروی وہ نہیں جو سندھ کی دھرتی پر عزت و احترام کی ایک علامت کے طور پر جانی جاتی ہے، اسے یہ بھی پتا نہیں کہ اس کا نام ماروی کس نے اور کیوں رکھا... شاید اس کے بڑوں نے سوچا ہو کہ نام کی یکسانیت سے مقدر کی دیوی اس پر بھی مہربان ہو جائے... جدید ماروی بہت عقیدت کے ساتھ اپنی ہم نام پر رشک کرتی ہے... یہ جانتے ہوئے کہ وہ کبھی اس مقام کے قریب بھی نہیں پھٹک سکے گی... ورق ورق، سطر سطر دلچسپی، تحیّر اور لطیف جذبوں میں سموئی ہوئی ایک کہانی جس کے ہر موڑ پر کہیں حسن و عشق کا ملن ہے تو کہیں رقابت کی جلن... آج کے زمانے کے اسی چلن میں رنگین و سنگین لمحات کی لمحہ لمحہ روداد کو سمیٹتے، نئے رنگ و آہنگ کا تحیّر خیز سنگم۔

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

یہ داستان ہے دورِ جدید کی ماروی اور اس کے عاشق مراد علی منگی کی۔ مراد ایک گدھا گاڑی والا ہے جو اپنے والد اور ماروی، چاچا جمرو اور چاچی منگی کے ساتھ اندرون سندھ کے ایک گاؤں میں رہتے تھے، گاؤں کا وڈیرا حشمت جلالی ایک بدنیت انسان تھا جس نے ماروی کا رشتہ دس ہزار روپے کے عوض مانگا تھا، چونکہ ماروی مراد کی منگ تھی اور دونوں بچپن ہی سے ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے لہٰذا وہ اس پر راضی نہیں تھی نتیجتاً انہیں گوٹھ چھوڑنا پڑا۔ مراد جو کہ ثانوی تعلیم یافتہ تھا وڈیرا حشمت کی منشی گیری کرتا تھا۔ وڈیرا حشمت جلالی اور اس کے بیٹے روایتی ذہنیت کے مالک تھے اور انہوں نے جائداد بچانے کی خاطر اپنی بیٹی زلیخا کی شادی قرآن سے کردی۔ ماں نے مخالفت کی مگر اس کی ایک نہ چلی۔ زلیخا نے بغاوت کا راستہ اپنایا اور مراد کو مجبور کیا کہ اس کی تنہائیوں کا ساتھی بن جائے۔ مراد تیار نہ ہوا اور ایک رات گزارنے کے بعد اپنے باپ کے ساتھ گاؤں سے غائب ہوگیا۔ اس رات زلیخا نے اسے ایک قیمتی ہار بھی تحفتاً دیا تھا۔ گاؤں سے فرار ہو کر یہ دونوں کراچی کے ایک مضافاتی علاقے قیمن گوٹھ آگئے جہاں ماروی اپنے چاچا، چاچی کے ساتھ پہلے ہی آچکی تھی۔ یہیں مراد کی ملاقات اتفاقاً محبوب علی چانڈیو سے ہوگئی جو کہ ممبر اسمبلی اور بزنس ٹائیکون، لیکن ہو بہو مراد کا ہم شکل تھا۔ بس دونوں کے درمیان صرف قسمت کا فرق تھا۔ محبوب چانڈیو اپنے ہم شکل کو دیکھ کر حیران ہوا پھر اسے یاد آیا کہ حشمت جلالی جو کہ خود بھی ممبر اسمبلی تھا اس کا ذکر اپنی منشی کی حیثیت سے کرچکا تھا۔ اس کے استفسار پر مراد نے اپنی بے گناہی کا اعلان کیا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ مراد کے فرار کے بعد زلیخا نے اپنی ماں کے تعاون سے گاؤں کے ایک اور نوجوان جمال سے شادی کرلی اور خاموشی سے فرار ہوگئی۔ وڈیرے اور اس کے بیٹوں کو پتا چلا تو انہوں نے تلاش شروع کرائی، ناکامی پر انہوں نے بے عزتی سے بچنے کے لیے ایک نوکرانی جو کہ زلیخا کے ہی قد کاٹھ کی تھی برباد کر کے قتل کردیا اور اس کا چہرہ تیزاب سے مسخ کر کے اسے اپنی بیٹی ظاہر کر کے الزام مراد پر لگادیا۔ یہاں شہر میں محبوب جب مراد سے ملا تو اس نے مراد کو اپنے پاس رکھ کر بہترین تربیت دینے کا فیصلہ کیا اور اسے اپنی جگہ رکھ کر خود گوشہ نشین ہوتا تھا۔ محبوب کے سرپرست اس کے والد کے زمانے کے معروف تگی تھے جو اس کے کاروباری معاملات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ انہی کے مشورے پر ایک ماڈل سمیرا کو سیکریٹری کے طور پر رکھا گیا۔ مراد سے ملاقات کے دوران ماروی کی جھلک دیکھ کر محبوب اس پر دل وجان سے مرمٹا لیکن یہ ایک پاکیزہ جذبہ تھا جس میں کوئی کھوٹ نہ تھا۔ اس نے اپنی مصنوعات کے لیے بطور ماڈل ماروی کو چنا اور مراد کے ذریعے اسے راضی کیا۔ مراد کو شادی کے لیے ایک لاکھ کی ضرورت تھی۔ محبوب نے زلیخا کے دیے ہوئے ہار کو ایک لاکھ میں خریدنے کی پیشکش کی لیکن مراد راضی نہ ہوا۔ اسی دوران مراد کے گھر چوری کی واردات ہوئی اور چور نقد رقم کے ساتھ زلیخا کا وہ ہار بھی لے گئے لیکن پکڑے گئے یوں مراد بھی زلیخا کے قاتل کی حیثیت سے گرفتار ہوگیا۔ زلیخا مراد کے بچے کو جنم دے کر دوسرے بچے کی پیدائش کے دوران چل بسی لیکن وڈیرا باپ اور بیٹوں کو خبر نہیں تھی کہ زلیخا کہاں اور کس حال میں ہے۔ ماں رابعہ جانتی تھی لیکن مراد سے نالاں تھی۔ وہ شوہر اور بیٹوں سے بھی ناراض تھی لہٰذا انہیں خبر نہیں کی۔ مراد اس قتل کے مقدمے میں ملوث تھا اور محبوب چانڈیو ماروی کی خاطر اس کے مقدمے کی پیروی کررہا تھا۔ اسی باعث اس کی وڈیرا حشمت سے دشمنی ہوگئی۔ یہ بات پارٹی کے لیڈر تک پہنچ گئی تو چانڈیو استعفیٰ دے کر چلا آیا۔ یوں ماروی کے دشمنوں میں اضافہ ہوگیا۔ اسے اغوا کرنے کی کوشش کی گئی جب وہ اپنی سہیلی کی شادی میں شرکت کے لیے گوٹھ گئی، تاہم محبوب چانڈیو اسے بچالایا۔ دوسری جانب جاسوس سیکریٹ ایجنٹ برنارڈ کو رہا کرانے کے لیے اسکاٹ لینڈ سے تین ایجنٹ مرینہ جو کہ جیلر کی بیٹی ہے دیگر دو ساتھی بہرام اور دارا اکبر کے ساتھ آئے ہوئے ہیں۔ مرینہ مراد کو ایک نظر دیکھ کر دل ہار گئی اور اس سے شادی کرنے کے لیے اسے ورغلا کر ماروی سے دور کررہی تھی جبکہ ماروی پر بھی دباؤ تھا کہ وہ محبوب سے شادی کرلے لیکن دونوں اپنے عشق پر قائم تھے۔ مقدمے کو معلوم نہیں کب تک چلنا تھا لیکن محبوب نیک نیتی سے ان کا مددگار تھا اور حتیٰ کہ جب ماروی محبوب کے احسانات سے بچنے کے لیے جان بوجھ کر غائب ہوگئی جس میں سمیرا بھرپور مدد کررہی تھی تاکہ محبوب ماروی کی مدد سے باز آجائے مگر اس خبر کے بعد وہ دلبرداشتہ ہو کر خود مراد کی جگہ جیل میں قید ہوگیا جبکہ دوسری جانب ماروی کی تلاش کا لالچ دے کر مراد کو مرینہ جیلر باپ کی مدد سے جیل سے باہر نکال لائی اور محبوب اس کی جگہ بند ہوگیا۔ باہر نکل کر مراد مرینہ کی نیت بھانپ کر اسے جھانسا دیتے ہوئے اس کے شکنجے سے فرار ہوگیا۔ جبکہ دوسری جانب سمیرا اور تگی صاحب محبوب کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ ایک موقع پر مرینہ مراد کا پیچھا کرتے ہوئے [illegible] میں ماروی تک پہنچ گئی اور محبوب سے فون پر اپنے باپ کے ذریعے رابطہ کرایا تو اسی خبر سے محبوب میں نئی زندگی دوڑ گئی۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

وہ باپ بیٹی جرائم کی دنیا کے پروردہ تھے۔ مجرموں کے ہتھکنڈوں کو اور ان کی رگ رگ کو سمجھتے تھے۔ ان کے برعکس مراد نے جرائم کی ابجد بھی نہیں پڑھی تھی۔ اس نے پہلی بار ایک ریوالور کو ہاتھوں میں پکڑا تھا۔ صرف آدھے گھنٹے تک اناڑی پن سے گولیاں چلانا سیکھتا رہا تھا۔ اس کے بعد ہی فرار ہو کر باپ بیٹی کے برسوں کے تجربات کو للکار رہا تھا۔

مرینہ ایک اناڑی سے دھوکا کھا کر بری طرح جھنجلا گئی تھی۔ قسمیں کھا رہی تھی کہ اسے پکڑتے ہی گولیاں مار کر اپاہج بنا دے گی۔ اس کے گلے میں زنجیر باندھ کر اسے اپنا کتا بنا کر رکھے گی۔ کسی حال میں پیچھا نہیں چھوڑے گی۔

اس نے فرار ہو کر، مردانگی دکھا کر کئی ڈاکوؤں کی لاشیں گرا کر اسے حیران کردیا تھا۔ وہ اور زیادہ اس کی دیوانی ہوگئی تھی۔ کئی گھنٹوں تک اسے تلاش کرتے رہنے کے بعد وہ رات کی تاریکی میں ایسے وقت ملا تھا جب اس کی گاڑی کا پیٹرول ختم ہوگیا تھا۔ وہ اس کا پیچھا نہیں کرسکتی تھی۔ جھنجلا کر رہ گئی تھی۔ اس نے ڈاکوؤں کی ایک جیپ میں فرار ہوتے ہوئے کہا تھا۔ ”مرینہ! مجھے بھول جاؤ۔ میرا پیچھا چھوڑ دو۔“

مرینہ کی حالت قابلِ دید تھی۔ جیسے میلوں دور تک تلاش کررہی تھی۔ وہ بالکل قریب آکر ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ وہ تڑپ کر رہ گئی تھی۔

مراد گاڑی نہیں چلا سکتا تھا۔ اس نے چار ڈاکوؤں کو ہلاک کیا تھا۔ دو فرار ہوگئے تھے اور ایک زخمی ہوا تھا۔ وہ زخمی اس قابل تھا کہ گاڑی چلا سکتا تھا۔ اس کی ایک پسلی شاید ٹوٹ گئی تھی۔ وہ جلد سے جلد کسی قریبی اسپتال میں پہنچنا چاہتا تھا۔ مراد کی گن پوائنٹ پر ڈرائیو کررہا تھا۔

دونوں ضرورتمند تھے۔ وہ زخمی زندگی کی طرف لوٹ کر آنا چاہتا تھا اور مراد اس علاقے سے بہت دور جا کر کسی آبادی میں پہنچ کر معلوم کرنا چاہتا تھا کہ سبّی جانے کے لیے اسے کس سمت جانا ہوگا۔

ایک ڈاکو ایک عاشق، دونوں ضرورتمند ایک کشتی کے سوار تھے۔ ایک گاڑی میں جارہے تھے۔

مراد پچھلی سیٹ پر تھا۔ آگے ڈرائیو کرنے والا تکلیف سے کراہ رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”کیا بہت تکلیف ہورہی ہے؟ کسی آبادی تک کسی اسپتال تک پہنچ سکو گے؟“

وہ لمبی لمبی سانسیں کھینچ رہا تھا۔ کہہ رہا تھا۔ ”دعا مانگ رہا ہوں کسی طرح ڈاکٹر تک پہنچ جاؤں۔“

مراد کے قریب ایک بیگ رکھا ہوا تھا۔ اس نے کھول کر دیکھا۔ اس میں ایک پستول اور درجنوں بلٹس رکھے ہوئے تھے۔ کسی ڈاکو کا ایک جوڑا لباس اور تولیا رکھا ہوا تھا۔

اس نے لباس نکال کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ بڑے بڑے نوٹوں کی گڈیاں اور اپنے ریوالور کے بلٹس اس میں رکھے۔ چند نوٹ اپنی جیب میں رکھ لیے۔ پھر اس نے دیکھا۔ گاڑی کی رفتار سست ہورہی تھی اور ایسے وقت دور بہت دور ٹمٹماتی ہوئی روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔

اس نے پوچھا۔ ”کیا آگے کوئی ٹاؤن یا گاؤں ہے؟“

گاڑی سست رفتاری سے کبھی داہنی کبھی بائیں جارہی تھی۔ اس نے پوچھا۔ ”یہ گاڑی کیسے چلا رہے ہو؟ رفتار بڑھاؤ۔“

وہ جواب دینے کے قابل نہیں رہا تھا۔ گاڑی رک گئی۔ مراد نے پریشان ہو کر آگے کو اس کی طرف جھک کر پوچھا۔ ”کیا ہوا؟ پیٹرول ختم ہوگیا ہے؟“

زندگی کا پیٹرول ختم ہوگیا تھا۔ زخمی کا سر ڈھلکا ہوا تھا اور دیدے پھیل کر ساکت ہوگئے تھے۔

کیا ہے یہ زندگی...... ابھی تھی، ابھی نہیں ہے۔

اس نے چند لمحوں کے لیے سر جھکالیا۔ ہر ذی روح کو موت کے سناٹے میں جانا ہے۔

یہ گن یہ بلٹس یہ طاقت یہ غرور سب یہیں رہ جاتے ہیں۔ وہ بیگ کو شانے سے لٹکا کر گاڑی سے باہر آگیا۔

تھوڑی دیر پہلے وہ گاڑی سلامتی کی طرف لے جارہی تھی۔ اب ایک مقتول کا جنازہ بن گئی تھی۔ اس جنازے کو مراد آگے نہیں لے جاسکتا تھا۔ وہ پھر پیدل ہوگیا تھا۔

اس نے دور ٹمٹماتی ہوئی روشنی کی طرف جاتے ہوئے اندازہ لگایا، کوئی چھوٹا سا ٹاؤن ہوگا اور تقریباً دو کلومیٹر کے فاصلے پر ہوگا۔ جتنا بھی فاصلہ تھا۔ جانا تو ہر حال میں تھا۔

اس زخمی نے زندگی کی طرف لوٹ آنے کا حوصلہ کیا تھا۔ جان لیوا تکلیف کے باوجود گاڑی ڈرائیو کرتا ہوا اسے تقریباً چالیس کلومیٹر دور لے آیا تھا۔ مرینہ بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ گاڑی میں پیٹرول نہیں تھا۔ یہ اطمینان تھا کہ وہ اس کے تعاقب میں پیدل نہیں آسکے گی۔

لیکن وہ بہت کچھ کرسکتی تھی اور کرنے والی تھی۔ اس میں شبہ نہیں تھا کہ وہ مراد کی دیوانی ہوگئی تھی۔ اسے حاصل کرنے کی خاطر قانون سے کھیل رہی تھی۔ مراد یہ اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ اس کا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ وہ ایک چھوٹے سے ٹاؤن میں پہنچ گیا۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ پوری بستی گہری نیند میں تھی۔

وہ آگے بڑھنے لگا۔ کسی سے ملنا تھا، پوچھنا تھا کہ وہ کون سی جگہ ہے؟ اور کون سا راستہ اسے ماروی کے گھر تک لے جائے گا؟

کچی سڑک کے کنارے ایک بڑا سا مگر غریب اور ویران سا ہوٹل تھا۔ وہاں لکڑی کے تخت اور بینچ بچھے ہوئے تھے۔ سب کے سب خالی پڑے تھے۔ اندر کھانے کا سامان ہوگا۔ چونکہ چوری کا ڈر نہیں تھا۔ اس لیے ہوٹل کھلا ہوا تھا۔ کوئی پہرے دار نہیں تھا۔

وہ ایک تخت پر اپنا بیگ رکھتے ہوئے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ وہ بستی صبح سے پہلے جاگنے والی نہیں تھی۔ ایسے وقت آہٹ سی ہوئی۔ اس نے بڑی پھرتی سے ریوالور نکال کر گھوم کر دیکھا۔ کوئی خطرہ نہیں تھا۔ کچھ فاصلے پر چار پاؤں والا ایک چوکیدار اسے گھور کر دیکھ رہا تھا اور اپنی دم ہلا رہا تھا۔

مراد اسے دیکھ کر تھکے ہوئے انداز میں تخت پر بیٹھ گیا۔ نیند سے اس کی آنکھیں بوجھل ہورہی تھیں۔ وہ بھونکنے لگا۔

اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ آسمان پر ستارے بکھرے ہوئے تھے۔ پوری کائنات پر سناٹا طاری تھا۔ ذہن میں ایک کتا ہی بات کرنے کے لیے رہ گیا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا تخت کے قریب سر جھکا کر بیٹھ

گیا۔اس نے جھک کراس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ "یہ محبت کیا ہوتی ہے؟ جب بولنے کے لیے کوئی نہ ہو تو آدمی کتے سے اور کتا آدمی سے بولنے لگتا ہے۔ سنا ہے مجنوں بھی اسی طرح لیلیٰ کے کتے سے بولتا رہتا تھا۔"

وہ بولتے بولتے چپ ہوگیا۔اچانک ہی خاموش فضاؤں میں میٹھے سر بولنے لگے۔دور کہیں سے بانسری کی تان ابھری تھی جیسے رات کی اندھیر نگری سے ماروی نے پکارا ہو۔بڑی درد بھری آواز تھی سیدھی مراد کے کلیجے میں گھس رہی تھی۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔رات جانے والی تھی۔ایسے وقت نہ جانے کون دل جلا راگ سے آگ لگا رہا تھا۔وہ بھی جیسے جدائی کا مارا ہوگا۔درد مشترک ہو تو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔

وہ تخت سے اتر کر کھڑا ہوگیا۔بیگ کو اٹھا کر شانے سے لٹکا کر آواز کی سمت جانے لگا۔پھر چار قدم چل کر رک گیا۔وہ سریلی تان کھلی فضا میں گونج رہی تھی۔چاروں طرف سے سنائی دے رہی تھی۔وہ کدھر جائے؟

وہ سوچ سوچ کر چاروں طرف گھوم گھوم کر کسی ایک سمت کا تعین کرنا چاہتا تھا لیکن پیار کے گنبد سے گونجنے والی بانسری ہر سو تان اڑا رہی تھی۔وہ دیوانہ وار گھوم گھوم کر زور سے بولنے لگا۔

"ہے ماروی!
ہو ہو ہو ماروی!
بانسریا تیرے شہر میں بول رہی ہے
دیوانے دل کی دنیا ڈول رہی ہے۔"

اس کی آواز سناٹے کا سینہ چیرتی ہوئی دور تک پھیل رہی تھی۔نیند کی نگری میں فریاد بن کر گونج رہی تھی۔

پھر ذرا سی دیر میں اس ہوٹل کے پاس عورتوں اور مردوں کی بھیڑ لگ گئی۔محبت فریاد بن گئی تھی۔ابھی شہر سو رہا تھا۔ابھی ماروی کے پیار نے جگا دیا۔

ایک بزرگ نے پوچھا۔ "کون ہو تم؟"

اس نے کہا۔ "ایک بھٹکا ہوا مسافر ہوں۔اپنی ماروی کو ڈھونڈ رہا ہوں۔"

ایک جوان نے کہا۔ "یہ بھی موہن لال کی طرح کسی موہنی کا دیوانہ لگتا ہے۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی بانسری کی تان بالکل قریب سے سنائی دی۔عورتوں اور مردوں کی بھیڑ دو حصوں میں چھٹنے لگی۔وہ دکھائی دینے لگا۔کرتا اور دھوتی پہنے ہوئے تھا۔بھگوان کرشن مراری کی طرح بانسری کو ہونٹوں سے لگائے سُر پھونک رہا تھا۔ایک عورت نے کہا۔ "یہ موہن دیوانہ ہے۔جس دن مال بیچنے شہر جاتا ہے اس دن صبح ہونے سے پہلے اٹھ بیٹھتا ہے۔بانسری بجا کر اسے یاد کرتا ہے۔"

موہن نے بانسری کو ہونٹوں سے ہٹا کر کہا۔ "میں اسے یاد کرتا ہوں، میری بانسری موہنی کو خبر پہنچاتی ہے کہ میں مال لے کر شہر جا رہا ہوں اور اس کی بستی سے گزرنے والا ہوں۔"

مراد نے پوچھا۔ "کیا تم کسی شہر کی طرف جا رہے ہو؟"

"ہاں۔میں مرغیاں اور مویشی بیچنے قلات جاتا ہوں۔"

"وہاں سے ڈیرا بگٹی کتنی دور ہے۔"

"قلات کے بعد سبی ہے۔سبی کے بعد ڈیرا بگٹی بہت دور ہے۔کیا تم ادھر جاؤ گے؟"

وہ خلا میں تکتے ہوئے ماروی کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "ہاں۔وہ مجھے وہیں ملے گی۔"

ایک نے پوچھا۔ "تم کون ہو اور کہاں سے آرہے ہو؟"

"میں آپ ہی لوگوں کی طرح محبت کرنے والا انسان ہوں۔کراچی سے آرہا ہوں۔مجھے افسوس ہے اپنے بارے میں زیادہ نہیں بتا سکوں گا۔"

"کچھ تو بتانا ہوگا۔بڑے شہروں میں بڑی بڑی واردات کرنے والے گرفتاری سے بچنے کے لیے ادھر چھپنے آتے ہیں۔"

"میں نے کوئی واردات نہیں کی ہے۔"

"پھر کراچی سے پیدل کیسے آئے ہو۔ادھر ریل گاڑی نہیں چلتی ہے۔پکی سڑک نہیں ہے۔"

دوسرے نے کہا۔ "تم خضدار کی پکی سڑک سے اتر کر تین کلومیٹر چل کر یہاں آئے ہو۔معلوم ہوتا ہے جہاں جانا ہے وہاں کا راستہ نہیں جانتے۔"

مراد نے کچھ سوچا پھر کہا۔ "سچ یہ ہے کہ ایک عورت تین بدمعاشوں کے ساتھ میرا پیچھا کر رہی ہے۔وہ مجھے گرفتار کرانا چاہتی ہے۔لیکن میں صرف اپنی ماروی سے شادی کروں گا۔لیکن وہ میرا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ابھی وہ مجھے ڈھونڈ رہی ہوگی۔ادھر ضرور آئے گی۔"

وہ موہن کو دیکھ کر بولا۔ "میری مدد کرو۔مجھے یہاں سے دور اپنی گاڑی میں لے چلو۔"

"میں اونٹ گاڑی میں مال لے جاتا ہوں۔وہ بہت آہستہ چلتی ہے اور کوئی عورت موٹر گاڑی میں آئے گی تو تم اس سے بچ کر کہاں جا سکو گے؟"

اس نے پوچھا۔ "کیا یہاں کسی کے پاس جار پہیوں

یا دو پہیوں والی گاڑی ہے؟ میں اس کی منہ مانگی قیمت دوں گا۔"

معلوم ہوا وہاں تیز رفتار گاڑیاں کسی کے پاس نہیں ہیں۔اس نے پوچھا۔ "کیا یہاں گھوڑا مل سکتا ہے؟"

ایک نے کہا۔ "کل رات دو آدمی گھوڑوں پر آئے تھے۔وہ تھکے ہوئے تھے یہاں ایک مکان میں سو رہے ہیں۔"

دو گھڑ سواروں کی بات پر مراد کا ماتھا ٹھنکا۔پچھلی رات دو ڈاکو اس سے مقابلے کے دوران میں جان بچانے کے لیے دو گھوڑوں پر فرار ہوئے تھے۔وہ یہاں پہنچے ہوئے تھے اور یقیناً پچھلی رات کی طرح مسلح ہوں گے۔

اس نے پوچھا۔ "ان کے پاس تین گھوڑے ہوں گے اور بندوقیں ہوں گی۔"

"گھوڑے دو ہیں اور بندوقیں بھی ہیں۔یہاں سے اکثر ڈاکو اور اسمگلر گزرتے رہتے ہیں لیکن ہم کسی کا راستہ نہیں روکتے اس کے آگے ہاتھ جوڑ کر سر جھکا لیتے ہیں۔"

مراد ظالموں کے آگے ہاتھ نہیں جوڑ سکتا تھا۔پھر وہ اسے پہچانتے ہی گولیوں سے بھون کر رکھ دیتے۔دماغ میں خطرے کی گھنٹی بج رہی تھی۔وہاں سے فوراً بھاگ جانا ہی دانشمندی ہوتی۔

لیکن پھر وہی مسئلہ درپیش تھا۔وہ فرار ہوتے وقت پیدل ہوتا اور ڈاکو اس پر گھوڑے دوڑاتے گزر جاتے وہاں کسی کے پاس کوئی تیز رفتار گاڑی نہیں تھی۔

اس نے سوچتی ہوئی نظروں سے بستی والوں کو دیکھا پھر پوچھا۔ "کیا تم سب ان بندوق والوں سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہو؟ میرا ساتھ دو۔میں انہیں یہاں سے بھگا دوں گا یا مار ڈالوں گا۔"

کتنے ہی سر انکار میں ہلنے لگے۔وہ کہنے لگے کہ وہاں گولیاں چلنے نہیں دیں گے۔عورتیں اور بچے سہم گئے تھے۔کچھ لوگ اس سے کہہ رہے تھے۔ "تم جاؤ۔تمہیں خدا کا واسطہ دیتے ہیں۔یہاں سے جاؤ۔ہماری عورتوں اور بچوں پر رحم کرو۔"

وہ پریشان ہوگیا کہ پیدل کہاں جائے اور کتنی دور تک جائے؟ اس کے پیچھے ڈاکو آئیں گے۔مرینہ بھی آئے گی۔وہ پیدل جس راستے پر جائے گا، مارا جائے گا۔

اس کے آگے ایک ہی راستہ تھا کہ تیز رفتار سواری مل جائے اور اس وقت وہاں دو گھوڑے تھے۔ان میں سے ایک اس کی ضرورت پوری کرسکتا تھا۔

اس نے مجبور ہو کر اپنے لباس میں ہاتھ ڈالا پھر آہستگی سے ریوالور نکال لیا۔اس کے ہاتھ میں ہتھیار دیکھتے ہی وہ سب سہم کر پیچھے ہٹنے لگے اس نے کہا۔ "ڈرو نہیں۔میں کسی کو نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔تمہاری سلامتی چاہوں گا۔میرا صرف ایک کام کرو۔مجھے اس مکان تک پہنچا دو جہاں وہ دونوں سو رہے ہیں۔اس کے بعد تم اپنے گھروں میں جا کر دروازے اور کھڑکیاں بند کرلو۔اگر گولیاں چلیں گی تو تم سب محفوظ رہو گے۔"

اسی طرح انہیں سلامتی مل سکتی تھی۔وہ سب اپنے اپنے گھروں کی طرف تیزی سے جانے لگے۔وہ دو جوانوں کے ساتھ چلتا ہوا ایک اسکول کے پاس آیا۔وہاں ایک کھونٹے سے دو گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ایک جوان نے کچھ فاصلے پر ایک مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ جس کا دروازہ سبز رنگ کا ہے۔اس مکان میں وہ دونوں ہیں۔"

اس نے مکان کی طرف دیکھا پھر ہاتھ کے اشارے سے انہیں جانے کو کہا۔وہ چلے گئے۔ابھی رات باقی تھی۔دور افق سے پچھلے پہر کا چاند طلوع ہو رہا تھا۔چاند کی سرخی نے دور تک سرخ روشنی پھیلا دی تھی۔وہ دبے قدموں چلتا ہوا اس مکان کی ایک کھڑکی کے پاس آیا۔پھر کان لگا کر سننے لگا۔

کچھ آہٹیں سنائی دیں۔کسی سامان کو ادھر سے ادھر سرکانے کی آواز تھی۔پھر کوئی منہ میں پانی لے کر کلی کر رہا تھا۔اور کوئی کہہ رہا تھا۔ "ہمیں اس طرح بے خبر ہو کر نہیں سونا چاہیے تھا۔بستی والے تھانے میں مخبری کرسکتے ہیں۔ہمیں گرفتار کرا سکتے ہیں۔"

دوسرے کی آواز سنائی دی۔ "میں یہاں سے ایک بار گزر چکا ہوں۔یہ لوگ بزدل ہیں۔ہم جیسوں کے آگے ہاتھ جوڑتے ہیں۔ڈرپوک ہیں اس لیے ہم سے دشمنی نہیں کریں گے۔"

"صبح ہونے سے پہلے نکل چلو۔مجھے وہ لاکھوں روپے اور سونے کے زیورات دکھائی دے رہے ہیں۔ہم نے زندگی میں پہلی بار بہت بڑا نقصان اٹھایا ہے۔"

"اسے بھول جاؤ۔یاد کرنے سے غصہ آتا ہے۔پتا نہیں وہ دشمن کون تھا۔یقین نہیں آتا کہ اکیلا تھا اور ہمارے ساتھیوں کی موت بن گیا تھا۔"

دوسرے نے کہا۔ "اب ہمیں نظر آئے گا تو اسے گولیوں سے چھلنی کرکے رکھ دیں گے۔"

مراد کان لگائے سن رہا تھا۔اسے صرف ایک

گھوڑے کی ضرورت تھی۔ وہ مکان کے دروازے کو باہر سے بند کر دیتا تو وہ دونوں اس کا راستہ روکنے کے لیے باہر نہیں آسکتے تھے۔ وہ آسانی سے ایک گھوڑے پر بیٹھ کر وہاں سے جاسکتا تھا۔

لیکن اس کے جانے کے بعد بیچارے بستی والوں کی شامت آجاتی۔ وہ ڈاکو انہیں الزام دیتے کہ مراد ان کی مدد سے پھر ایک بار انہیں نقصان پہنچا کر گیا ہے۔

اس کا ضمیر گوارا نہیں کر رہا تھا کہ وہ عورتوں اور بچوں کو ان ظالموں کے حوالے کر کے چلا جائے۔ اس نے دبے قدموں آگے بڑھ کر دروازے کو باہر سے بند کر دیا۔ پھر اس نے مکان کے چاروں طرف گھوم کر دیکھا، پیچھے بھی ایک دروازہ تھا۔ اس نے اسے بھی باہر سے بند کر دیا۔ اب وہ دونوں وہاں قیدی بن گئے تھے۔

اس نے تہیہ کرلیا کہ انہیں ٹھکانے لگا کر بستی والوں کو ان سے نجات دلا کر جائے گا۔ وہ دونوں باتیں کر رہے تھے۔ پھر چپ ہو گئے۔ کھڑکی پر دستک سنائی دی۔ ایک نے کہا۔ ''پتا نہیں کون ہے اسے دروازے پر آنا چاہیے۔ وہ کھڑکی بجا رہا ہے۔''

اس نے دروازے کے پاس آکر اس کی چٹخنی گرائی پھر اس کے دونوں پٹ کھولنے چاہے تو وہ نہیں کھلا۔ اس نے زور سے دھکا دیا پھر کہا۔ ''یہ باہر سے بند ہے۔''

دوسرا بڑبڑاتے ہوئے کھڑکی کے پاس جاتے ہوئے بولا۔ ''وہ باہر سے کیسے بند ہو گیا؟ شاید کسی بچے نے شرارت کی ہے۔''

اس نے کھڑکی کے پاس آکر اس کے دونوں پٹ کھول دیے۔ پھر پوچھا۔ ''کون ہے؟''

کوئی نہیں تھا لیکن وہ سامنے ایک بڑے سے پتھر کی طرف دیکھ کر چونک گیا۔ اس پتھر کے اوپر اس کا بیگ کھلا ہوا الٹا رکھا تھا اور ان میں سے بڑے نوٹوں کی گڈیاں باہر نکل کر بکھری ہوئی تھیں۔

وہ شدید حیرانی سے چیخ پڑا۔ ''رمزی! ہمارے لاکھوں روپے۔۔۔ ادھر آ۔۔۔''

رمزی دوڑتا ہوا آیا۔ پھر دونوں ہی اپنی لٹی ہوئی دولت کو آنکھوں کے سامنے دیکھ کر تڑپ گئے۔ رمزی نے کہا۔ ''یہ میرا بیگ ہے۔ یہ گاڑی میں رکھا ہوا تھا۔ یہ یہاں کیسے آیا؟''

وہ دروازے کے پاس آکر اسے دھکا دے کر کھولنے کی کوشش کرنے لگے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''نوٹوں کی گڈیاں میرے بیگ میں نہیں تھیں۔ کوئی انہیں یہاں لایا ہے۔''

دروازہ نہیں کھل رہا تھا۔ وہ یکلخت چپ ہو کر ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ خطرے کا احساس ہوا۔ ایک نے کہا۔ ''یہ بیگ، یہ روپے انہیں کوئی یہاں لایا ہے۔''

''ہاں ہمیں کھڑکی سے دکھا رہا ہے اور اس نے دروازے کو باہر سے بند کر دیا ہے۔''

وہ دونوں تیزی سے دوڑتے ہوئے اپنی بندوقوں کے پاس آئے۔ انہیں اٹھا کر کارتوس کی پیٹی شانوں سے لٹکا کر اسی تیزی سے دوڑتے ہوئے پچھلے دروازے پر آگئے۔ پھر اسے کھولنا چاہا تو معلوم ہوا کہ اسے بھی باہر سے بند کر دیا گیا ہے۔

اب ان پر خوف طاری ہوا۔ رمزی نے کہا۔ ''ہم گھر گئے ہیں۔ یہاں سے نکل نہیں سکیں گے۔''

وہ مکان کے پچھلے صحن میں تھے۔ ادھر کی دیواریں دس فٹ اونچی تھیں وہ آسانی سے انہیں پھلانگ کر فرار ہو سکتے تھے۔ لیکن باہر تو دشمن تاک میں ہوں گے۔

اور پتا نہیں وہ کتنے ہوں گے؟ وہ کل رات والا دشمن تنہا ہے یا ابھی پولیس والوں نے انہیں گھیر لیا ہے؟

انہیں طرح طرح کے اندیشے باہر جانے سے روک رہے تھے۔ رمزی نے کہا۔ ''پولیس والے ہوتے تو ہمیں للکارتے۔ ہتھیار باہر پھینک کر آنے کو کہتے۔''

''ہاں وہ اکیلا ہے۔ ہم اس سے نمٹ لیں گے۔''

وہ ایک ٹوٹی ہوئی کرسی دیوار سے لگا کر اس پر چڑھ کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ چاند کی روشنی میں دور تک کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پھر وہ اپنی گن سنبھالتا ہوا دیوار پر چڑھ کر بولا۔ ''وہ ادھر نہیں ہے۔ سامنے لاکھوں روپے پڑے ہیں وہاں ہوگا۔ میں باہر جا کر دروازہ کھولتا ہوں۔ پھر ہم اس سے نمٹ لیں گے۔''

وہ دیوار سے باہر کود کر دوڑتا ہوا دروازے کے پاس آیا۔ وہاں مکانات ایک دوسرے کے قریب تھے۔ مراد ایک مکان کی دیوار کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ وہ پچھلا دروازہ کھلتے ہی رمزی بھی باہر آیا۔ اسی وقت مراد نے فائرنگ شروع کر دی۔

وہ ایک دوسرے سے دور نہیں تھے۔ دو چار گز کے فاصلے پر تھے۔ اس کے باوجود وہ اناڑی صحیح نشانہ نہ لے سکا۔ وہ بچ گئے لیکن زخمی ہو کر گر پڑے ایک بری طرح زخمی ہوا تھا۔ دوسرے کے بازو میں گولی لگی تھی۔ وہ جوابی فائرنگ کرتے ہوئے بھاگنے لگا۔

جو زمین پر پڑا تکلیف سے کراہ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ سے گن نکل کر دور چلی گئی تھی۔ مراد نے قریب آکر اس کے جسم میں دو گولیاں اتار دیں۔ اتنے قریب سے نشانہ خطا نہیں ہوا۔ وہ تڑپ کر ٹھنڈا پڑ گیا۔

رمزی بھاگ رہا تھا۔ گولی بازو میں گھس گئی تھی۔ انگارے کی طرح دہک رہی تھی۔ وہ جلن کی شدت کے باعث لڑکھڑا کر گر پڑا۔ مراد اس کے سر پر پہنچ گیا۔ اس کے زخمی بازو کو ٹھوکر ماری تو وہ حلق پھاڑ کر چیخنے لگا۔ اس کی گن بھی ہاتھ سے نکل گئی تھی۔

اس نے جھک کر اس کی کنپٹی سے ریوالور لگا کر کہا۔ ''میں اناڑی ہوں تو کیا ہوا؟ کیا اتنے قریب سے بھی نہیں مرے گا؟''

وہ اسے گولی مار کر اٹھ گیا۔ تیزی سے چلتا ہوا اپنے بیگ کے پاس آگیا۔ اس میں نوٹوں کی گڈیاں ٹھونستے ہوئے اونچی آواز میں بولا۔ ''باہر آجاؤ۔ وہ دونوں جہنم میں پہنچ گئے ہیں۔''

وہ شانے سے بیگ لٹکا کر گھوڑوں کے پاس آیا پھر ایک کی گردن کو تھپکتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں حاصل کرنے کے لیے یہ خون خرابا ہوا ہے۔ مجھے یہاں سے لے چلو۔''

وہ ایک گھوڑے کی لگام تھام کر اس پر سوار ہو گیا۔ بستی والے اس کے پاس آرہے تھے۔ کچھ لوگ مکان کے پیچھے جا کر ان کی لاشیں دیکھ کر آئے تھے۔ مراد نے کہا۔ ''ان لاشوں کو دفن کر کے تھانے پولیس اور کچہری کے چکروں سے بچ سکتے ہو۔ جو بہتر سمجھو وہ کرو۔ جا رہا ہوں۔ خدا حافظ۔''

اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی وہ آگے بڑھا پھر سرپٹ دوڑتا ہوا اسے بستی والوں سے دور لے گیا۔ وہ اناڑی جنگجو دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

☆☆☆

ایک مثلث زاویے تین۔ ایک محبت دیوانے تین
تین تگاڑا کام بگاڑا۔

محبت میں دو ہوں تو داستان عشق روایتی انداز میں اختتام کو پہنچتی ہے۔ تین ہوں تو ختم ہونے کو نہیں آتی۔ بھی ہانپتی کانپتی بھی الجھتی سلجھتی تماشے دکھاتی چلی جاتی ہے۔

یہ تماشا سب کے سامنے ہی تھا کہ ماروی کو اغوا نہیں کیا گیا تھا اور کیا بھی گیا تھا۔ کمال یہ بھی تھا کہ اسے دو دیوانوں کی دنیا سے نابود کیا گیا تھا اور وہ موجود بھی تھی۔

خیال تھا کہ ماروی نابود ہوگی تو محبوب دیوانگی سے فرزانگی کی طرف، ہوش و حواس کی کاروباری دنیا میں واپس آجائے گا۔

لیکن یہ معاملہ اور الجھ گیا تھا۔ محبوب نے جیل کی چار دیواری میں مراد کی جگہ آکر ساری تدبیروں کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا تھا۔

ماروی اپنے محسن کی بہتری کے لیے اس کی نظروں میں مرحومہ بن رہی تھی۔ ائرکنڈیشنڈ کوٹھی کا عیش و آرام چھوڑ کر کہیں دور ایک ویرانے میں چھپنے اور رہنے جا رہی تھی۔

عارضی طور پر مرحومہ بننے کے سلسلے میں سمیرا اور معروف تجلی نے اسے سہولتیں فراہم کی تھیں۔ وہ ایک ائرکنڈیشنڈ کوچ میں چاچا اور چاچی کے ساتھ کراچی کے سپر ہائی وے سے روانہ ہوئی تھی۔ فاصلے کا صحیح اندازہ نہیں تھا۔ خیال تھا کہ آدھی رات سے پہلے بستی سے سو کلومیٹر آگے ایک گاؤں ریتی تک پہنچ جائے گی لیکن منزل تک پہنچنے میں دیر ہو رہی تھی۔

سفر کے دوران چاچا جمرو بہت بیمار ہو گیا تھا۔ پچھلے کئی مہینوں سے گردے کی تکلیف تھی پھر بخار نے آدبوچا تھا۔ کسی بڑے اسپتال میں اچھے ڈاکٹر سے علاج کرانا ضروری ہو گیا تھا۔ انہوں نے جیکب آباد پہنچ کر سفر ملتوی کر دیا۔

ایک بڑے ٹاؤن میں پہنچتے ہی ماروی نے عبا پہن لی۔ نقاب میں چھپ گئی سمیرا نے کہا تھا۔ ''محبوب صاحب تمہیں تلاش کرنے کے لیے اخبارات میں تمہاری تصویریں شائع کرائیں گے۔ چینلز کے ذریعہ بھی تمہیں پیش کرتے رہیں گے لہٰذا تمہیں نقاب میں رہنا چاہیے۔''

اور یہی ہوا تھا۔ انہوں نے چاچا کے علاج کے لیے جیکب آباد کے ایک ہوٹل میں عارضی رہائش اختیار کی تھی۔ وہاں اس نے دوسری رات ٹی وی چینلز میں اپنی تصویر دیکھی تھی۔ اس کا دیوانہ محبوب اسے ڈھونڈ نکالنے کے لیے لاکھوں روپے انعام کے طور پر دینے کا اعلان کر رہا تھا۔

ہوٹل میں اخبارات بھی آتے ہیں۔ چاچی ختی نے اخبار کے ایک صفحہ پر اس کی تصویر دکھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ دیکھ۔ اخبار میں بھی تیری تصویر چھپوا دی ہے۔''

وہ اس کا ہاتھ تھام کر بولی۔ ''تو نقاب میں مردوں سے چھپے گی لیکن عورتوں سے تو پردہ نہیں کرے گی۔ جو تجھے دیکھے گی وہ لاکھوں روپے حاصل کرنے کے لیے محبوب کو یہاں لے آئے گی۔ اخبار میں ان کا فون نمبر بھی لکھا ہوا ہے۔''

وہ پریشان ہو کر بولی۔ ''ہم کیا کریں چاچی! ہم نے اغوا ہونے کا ڈراما کیا ہے۔ بیچاری سمیرا کو سچ مچ بیہوش کیا گیا

تھا۔ میں محبوب صاحب سے دور رہنے کے لیے مراد سے دور ہوگئی۔ پھر بھی بات نہیں بن رہی ہے اور بگڑتی جارہی ہے۔"

وہ پریشان ہوکر بولی۔ "یہاں لوگ میری صورت دیکھتے ہی لاکھوں روپے کے لیے مجھ پر جھپٹ پڑیں گے۔"

"تیرا چاچا اسپتال میں پڑا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا اسے چھوڑ کر تجھے کہاں چھپانے لے جاؤں؟"

"میں جہاں چھپنے جاؤں گی وہاں میری تصویر مجھ سے پہلے پہنچی ہوگی۔ محبوب صاحب اپنی دولت سے کھیلنا خوب جانتے ہیں۔ لیکن میری محبت میں جب بھی اچھائی کرتے ہیں تو برائی ہوتی ہے۔ ان کے دماغ میں یہ بات نہیں آئی؟ یہ نہیں سوچا کہ انعام حاصل کرنے والے مجھے تماشا بنادیں گے۔"

چاچی نے اخبار کو پھینکتے ہوئے کہا۔ "چولہے میں جائیں انعام پانے والے۔ تم اپنی بات کرو۔ جلدی فیصلہ کرو۔ ہمیں یہاں سے بھی بھاگنا ہوگا۔"

وہ دونوں سوچنے لگیں۔ ماروی نے کہا۔ "ہمیں ایسی جگہ جانا ہوگا' جہاں نہ ٹی وی ہو نہ کوئی اخبار پڑھتا ہو۔"

"گاؤں دیہات والے ان پڑھ ہوتے ہیں۔ اخبار نہیں پڑھتے مگر ٹی وی تو ہر جگہ پہنچ گیا ہے۔"

"نہیں چاچی...! اب بھی ایسے گاؤں دیہات ہیں جہاں بجلی کی روشنی نہیں ہے۔

ہم سبی اور ریتی سے آگے جائیں گے۔ وہاں بجلی کی روشنی نہیں ہے اور نہ کوئی اخبار ادھر آتا ہے۔"

ماروی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "چاچا کی طبیعت ذرا سنبھل گئی ہے۔ ہم ڈاکٹر سے دوائیں لے کر انہیں ابھی اسپتال سے لے جائیں گے۔ چلو۔ یہاں سے نکلو۔"

اس نے عبا پہنی۔ چہرے کو نقاب میں چھپایا۔ پھر وہ دونوں اپنا مختصر سا سامان اٹھا کر ہوٹل کا بل ادا کرکے اسپتال پہنچ گئیں۔ اس نے چاچا سے پوچھا۔ "اب کیسی طبیعت ہے؟"

اس نے سر ہلا کر کہا۔ "بس ٹھیک ہے۔ بڑھاپے میں بیماریوں کے ساتھ جینا پڑتا ہے۔"

منی نے پوچھا۔ "ہمیں یہاں سے بھاگنا ہوگا۔ کیا ٹرین یا ٹیکسی میں سفر کرسکو گے؟"

اس نے پوچھا۔ "کیا محبوب صاحب ادھر آرہے ہیں؟"

"سمجھو آرہے ہیں۔ تم اپنی بات کرو؟"

"طبیعت کبھی بگڑتی ہے کبھی سنبھلتی ہے۔ ہمیں ماروی کو چھپا کر رکھنا ہے۔ یہاں سے بھاگنا ہی ہے تو ٹرین اور ٹیکسی کیا میں پیدل بھی دوڑتا جاؤں گا۔"

وہاں سے سبی اور ریتی جانے کے لیے بس سروس تھی لیکن آٹھ یا دس گھنٹوں کا سفر تھا۔ ماروی اتنی دیر تک مسافروں کے درمیان منہ چھپا کر نہیں رہ سکتی تھی۔ مجبوری تھی' آگے بھی لوگوں سے چھپ کر سفر کرنا تھا۔ اسپتال کے باہر ٹیکسی اور آٹو رکشے کھڑے تھے۔ چاچا نے ایک ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔ "میں بیمار ہوں۔ بس میں سفر نہیں کرسکوں گا۔ ہمیں ریتی سے سو کلومیٹر آگے جانا ہے۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے کہا۔ "اس ویرانے میں کون جاتا ہے۔ سبی سے آگے ایک بھی پیٹرول پمپ نہیں ہے۔ ایک بڑے کین میں پیٹرول لے جانا ہوگا۔ ٹنکی بھی فل کرانی ہوگی۔"

چاچا چاچی راضی ہوگئے۔ ڈرائیور ان کا سامان اٹھانے اسپتال کے کمرے میں آیا۔ ماروی عبا میں تھی لیکن کمرے میں نقاب الٹ کر رکھی۔ وہ اسے دیکھتے ہی ٹھٹک گیا۔

نقاب نہ بھی الٹتی' چہرہ چھپا رہتا۔ تب بھی دیکھنے کے لیے آنکھیں تو بے پردہ رہتی ہیں۔ اور وہ آنکھیں ایسی تھیں کہ پہلی نظر میں کھینچ لیتی تھیں۔ کوئی عاشق مزاج ہو یا نہ ہو۔ ایک بار دیکھنے کے بعد یاد رہ جاتی تھیں۔

ڈرائیور نے اخبار کے صفحہ پر اور ٹی وی اسکرین پر چاند سا چہرہ تو دیکھا ہی تھا۔ وہ دس لاکھ روپے دینے والی آنکھیں بھی دیکھی تھیں۔ وہ بھلا یاد کیسے نہ رہتیں۔

وہ سامان اٹھا کر سوچتا ہوا۔ ٹیکسی کے پاس آیا۔ اسے ڈکی میں رکھنے لگا۔ یہ تو اس نے پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ نصیب کی لاٹری کھلے گی اور وہ کہیں ملے گی تو اسے فوراً چادر میں چھپالے گا۔ اس پر کسی کی نظر نہیں پڑنے دے گا۔ یہ دیکھ کر اسے اطمینان ہوا کہ وہ پہلے ہی نقاب میں چھپی ہوئی تھی۔

ماروی چاچی کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ چاچا اگلی سیٹ پر آگیا۔ ڈرائیور نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ "میرا نام جلال احمد ہے۔ مگر سب میرے کو جلا کہتے ہیں۔ سچ کہتا ہوں' کسی سے جلتا نہیں ہوں۔ مگر یہ نام پڑ گیا ہے۔ آپ کا نام کیا ہے؟"

چاچا نے کہا۔ "میرا نام بھی بہت اچھا تھا۔ بگڑ کر جھمرو ہوگیا۔ سب مجھے جھمرو چاچا کہتے ہیں۔"

جلے نے اچانک سوال کیا۔ "آپ لوگ چھپنے کے لیے اتنی دور کیوں جارہے ہیں؟"

"کیا...؟" وہ تینوں چونک گئے۔

اس نے مسکرا کر کہا۔ "میں نے ماروی کو پہچان لیا ہے۔ ٹی وی اور اخبار میں بھی نام لکھا ہوا ہے۔"

چاچا نے سر گھما کر پیچھے ماروی اور چاچی کو دیکھا۔ وہ تینوں پریشان ہوگئے تھے۔ جلے نے کہا۔ "آپ پریشان نہ ہوں۔ میں روپے پیسے کا لالچی نہیں ہوں۔ ماں قسم دس لاکھ روپے کے لیے کسی کو فون نہیں کروں گا۔"

ان تینوں کو ذرا اطمینان ہوا۔ وہ بولا۔ "آپ اتنی دور نہ جائیں۔ میرے گھر میں چھپ کر رہیں۔"

"آئیں...؟" انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ چاچی نے انکار میں سر ہلایا۔ چاچا نے کہا۔ "تم بہت اچھے ہو۔ مگر ہم تم پر بوجھ نہیں بنیں گے۔ وہاں ہم اپنے بھائی کے گھر جارہے ہیں۔"

وہ بولا۔ "وہاں پہنچنے تک راستے میں نہ جانے کتنے لوگ ماروی کو دیکھ کر پیچھے پڑ جائیں گے۔"

"ہم راستے میں کہیں نہیں رکیں گے۔"

"رکنا تو پڑے گا۔ راستے میں پیٹرول بھرانا ہوگا۔ کسی ڈھابے کے سامنے رک کر کچھ کھانا پینا ہوگا اور اگر کہیں نہ بھی رکے تو پولیس والے روکیں گے۔ وہ تو ماروی کو مکھن کے بال کی طرح چٹکی میں لے جائیں گے اور تم سب دیکھتے رہ جاؤ گے۔"

وہ درست کہہ رہا تھا۔ آگے پولیس چوکیاں تھیں۔ انہوں نے یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ ان سے بچ کر آگے نہیں جا سکیں گے۔ چاچی نے مجبور ہوکر پوچھا۔ "تمہارے گھر میں اور کون ہے؟ ہم وہاں بیٹھ کر سوچیں گے۔"

"میرے بوڑھے ماں باپ ہیں۔ باپ بیمار رہتا ہے۔ ماں بیچاری گھر کے کام سے لگی رہتی ہے۔"

ماروی نے کہا۔ "تمہارے گھر میں محلے پڑوس کی عورتیں آئیں گی تو میں ان سے پردہ نہیں کرسکوں گی۔ بھید کھل جائے گا کہ تمہارے گھر میں چھپی ہوئی ہوں۔"

"میں کسی کو گھر میں گھسنے نہیں دوں گا۔ دکھ مصیبت میں کوئی جھانکنے نہیں آتا۔ اب کوئی آئے گا تو دھتکار دوں گا۔"

اس نے ایک دروازے کے سامنے گاڑی روک کر کہا۔ "یہ میرا مکان ہے۔ آؤ۔ یہاں آرام سے رہو۔"

چاچی نے کہا۔ "ارے بیٹے! تم نے تو ہمیں سوچنے ہی نہیں دیا اور یہاں لے آئے۔"

"میں سوچنے کو منع نہیں کرتا۔ گھر میں آرام سے بیٹھ کر سوچیں۔ پھر تم جو کہو گی' وہ کروں گا۔"

بے شک انہیں اطمینان اور سہولت سے بیٹھ کر سوچنا سمجھنا تھا۔ منہ چھپانے کے تمام راستے کمزور تھے۔ ابھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ دنیا والوں سے چھپ کر رہنے کے لیے کیا

کرنا ہے؟

انہوں نے گھر میں آکر جلّے کے ماں باپ سے ملاقات کی۔ پھر چاچی نے ایک الگ کمرے میں آکر وہاں آرام سے بیٹھ کر ماروی سے کہا۔ ”معروف صاحب نے ایک طرف تو ہمیں یہاں تک دوڑایا ہے۔ دوسری طرف تمہارا اشتہار لگا کر ہمارے لیے مصیبت کردی ہے۔“

ماروی نے کہا۔ ”سمیرا نے مجھ سے کہا تھا کہ میرے جانے کے بعد محبوب صاحب کی تسلی کے لیے مجھے ڈھونڈا جائے گا۔ اگر میں اخبار اور ٹی وی میں اپنی کوئی خبر پڑھوں اور تصویریں دیکھوں تو ہرگز واپس نہ آؤں۔“

”وہ لوگ پڑھے لکھے عقل والے ہیں۔ کیا اتنی سی بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی کہ دس لاکھ کا انعام رکھا جائے گا تو ساری دنیا ہمارے پیچھے پڑ جائے گی؟“

”چاچی! ہم نے انہیں یقین دلایا تھا کہ جس ویرانے میں رہنے جا رہے ہیں۔ ادھر کوئی ہمیں ڈھونڈنے نہیں آئے گا۔“

چاچا نے کہا۔ ”ہم نے جیسا کہا۔ ویسا ہی انہوں نے سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ ان کی بات چھوڑو، اپنی سوچو' ہمیں کیا کرنا ہے؟“

ماروی نے اپنے فون کا سوئچ آف رکھا تھا۔ اسے آن کرتے ہوئے بولی۔ ”میں سمیرا سے بات کرتی ہوں۔ وہ دوسرا اشتہار لگائیں گے کہ ماروی کو تلاش نہ کیا جائے۔ دس لاکھ روپے کا انعام ختم کردیا گیا ہے۔“

جلال احمد عرف جلّا وہاں بیٹھا ان کی باتیں سن رہا تھا۔ اس نے ماروی سے کہا۔ ”بہن! ایسا ظلم نہ کرو۔ غریب کا فائدہ ہونے دو۔ تم واپس جانا نہیں چاہتیں' نہ جاؤ۔ یہاں ساری زندگی اپنے بھائی کے ساتھ رہو۔“

وہ ہاتھ جوڑ کر عاجزی سے بولا۔ ”میں نہیں جانتا تم وہاں سے یہاں چھپنے کیوں آئی ہو؟ تمہاری جو بھی پریشانی ہے۔ ماں قسم اسے یہ بھائی دور کرے گا۔“

”کوئی میری پریشانیاں دور نہیں کرسکے گا۔ جنہوں نے دس لاکھ کا انعام رکھا ہے۔ وہ بھی پریشان ہیں۔“

اس نے نمبر پنچ کرکے فون کو کان سے لگایا۔ جلّے نے ایکدم سے آگے بڑھ کر فون کو اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ اسے بند کردیا۔ چاچی نے غصے سے کہا۔ ”یہ کیا کررہے ہو؟“

وہ بولا۔ ”میں بیٹا اور بھائی بن کر بول رہا ہوں تو سمجھ میں نہیں آرہا ہے؟ اب بھی کہتا ہوں۔ مجھے اپنا بنالو اور دس لاکھ روپے حاصل کرنے دو۔ عقل کی بات سمجھاتا ہوں۔ کسی کو خبر نہ ہو اور یہ کام چپ چاپ ہوجانے دو تو اچھا ہے۔“

چاچا نے کہا۔ ”ابھی تم نے کہا تھا روپے پیسے کے لالچی نہیں ہو۔ دس لاکھ روپے کے لیے کسی کو فون نہیں کرو گے۔“

”ایسا نہ کہتا تو تم لوگ میرے گھر نہ آتے۔“

وہ تینوں ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ ماروی نے کہا۔ ”تم بہن بھی کہہ رہے ہو اور دھوکا بھی دے رہے ہو۔“

”اگر بھائی مان لو تو یہ دھوکا نہیں ہوگا۔ ایک بہن اپنے بھائی کی غریبی دور کرے گی۔“

”اور تم بھائی بن کر دس لاکھ لے کر بہن کو ان مصیبتوں میں پہنچاؤ گے، جہاں سے یہ بھاگ کر آئی ہے۔“

اس نے ماروی کو سنجیدگی سے دیکھا پھر پوچھا۔ ”تم کیسی مصیبتوں سے بھاگ کر آئی ہو؟ تم کون ہو' تمہارے ساتھ کیا ہورہا ہے؟ مجھے اپنے بارے میں سچ سچ بتاؤ۔ جب میں نے کہہ دیا ہے کہ بھائی ہوں تو پھر یہ بھائی تمہاری مصیبتیں ضرور دور کرے گا۔“

اس کی باتوں سے سنجیدگی اور سچائی جھلک رہی تھی۔ ماروی تھوڑی دیر تک چپ رہی پھر بولی۔ ”میری مصیبت یہ ہے کہ مجھ سے جو بھی محبت کرتا ہے' وہ مجھے مصیبت میں ڈالتا ہے اور خود بھی مصیبتیں جھیلتا رہتا ہے۔

مراد میرے بچپن کی محبت ہے۔ ہم جوان ہوئے تو اس کی زندگی میں ایک حویلی کی شہزادی آئی۔ مراد کو اس کی قربت بھی ملتی اور لاکھوں روپے بھی ملتے۔ لیکن اس نے میری خاطر اسے ٹھکرادیا۔“

جلال احمد نے کہا۔ ”واہ شاباش! تمہارا مراد سچا عاشق ہے۔“

وہ بولی۔ ”اگر وہ اسے نہ ٹھکراتا تو اس کے ساتھ فرار ہوکر عیش و عشرت کی زندگی گزارتا۔ یا کم از کم کہیں آزادی سے گھومتا پھرتا رہتا۔ لیکن میری محبت بہت مہنگی پڑ رہی ہے۔ اسے قتل کے جھوٹے الزام میں گرفتار کیا گیا ہے۔ خدا ہی بچانے والا ہے۔ دشمن اسے پھانسی پر چڑھانے والے ہیں۔“

جلال نے بڑے دکھ سے کہا۔ ”یا خدا...! یہ تو ایک مصیبت ہے کہ قانونی ہتھکنڈوں سے اور دولت سے ہی دور ہوسکتی ہے۔“

ماروی نے کہا۔ ”ایک دولتمند اسے دور کرنے کی پوری کوششیں کررہا ہے۔ مقدمہ کے سلسلے میں لاکھوں روپے خرچ کررہا ہے اور لاکھوں خرچ کرنے والا ہے۔“

وہ بولا۔ ”ہماری دنیا میں ایسے سخی داتا بہت کم ہیں۔“

”ایک وڈیرا میری عزت کا دشمن ہے۔ وہ دولتمند مجھے اس ظالم کے خلاف تحفظ دیتا آرہا ہے۔ اس نے مجھے عزت آبرو سے رہنے کے لیے ایک کوٹھی دی تھی۔ وہ فرشتہ

ہے۔ مجھے ہر طرح کا عیش و آرام پہنچا تا رہا تھا۔“

وہ بولا۔ ”اس پر خدا کی رحمت ہو۔“

”وہ بھی میرا عاشق ہے۔ مراد کا رقیب ہے۔“

وہ ناگواری سے بولا۔ ”اس پر خدا کی مار ہو۔ وہ تمہیں حاصل کرنے کے لیے دولت لٹا رہا ہے۔“

”کیا کیا جائے۔ انسان اپنی ضرورت سے بھی مجبور ہوتا ہے۔ کچھ لینے کے لیے ہی کچھ دیتا رہتا ہے۔“

”سب ہی خودغرض نہیں ہوتے۔“

”ہوتے ہیں۔ تم خود کو دیکھو۔ بھائی بننے کا اور میری مصیبتوں میں کام آنے کا دعویٰ کررہے ہو لیکن اس کے عوض دس لاکھ روپے حاصل کرنا چاہتے ہو۔“

وہ جھینپ گیا۔ پھر بولا۔ ”میں ان کی طرح دولتمند نہیں ہوں۔ غریب ٹیکسی ڈرائیور ہوں۔ کیا تم نہیں چاہو گی کہ ایک غریب بھائی کا ایک مکان ہوجائے اس کے پاس ایک اور ٹیکسی ہوجائے۔“

”پھر تو اس دولتمند کو بھی یہ چاہنا چاہیے کہ اس کے لاکھوں روپے کے احسانات کے عوض میں مراد کی محبت اسے دوں۔ مراد کو چھوڑ کر اس کی ہوجاؤں۔ جبکہ وہ فرشتہ ہے۔ ایسا نہیں چاہتا۔“

وہ خیالوں میں محبوب کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ”وہ مراد کو رقیب نہیں سمجھتا ہے۔ اگر سمجھتا تو اس کا مقدمہ نہ لڑتا۔ مراد جیل کی چار دیواری میں ہے۔ یہ اس کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر اس غریب کو میری نظروں میں کمتر بنا کر مجھے حاصل کرلیتا۔ میں اس کے احسانات کے بوجھ تلے دبی ہوئی ہوں۔ راضی نہ ہونے کے باوجود مجھے اس کی منکوحہ بننا پڑتا۔“

جلال نے حیرانی سے پوچھا۔ ”وہ کون ہے؟ جو تمہارا عاشق بھی ہے اور مراد کا رقیب بھی نہیں ہے۔“

”وہ ایک بہت بڑا بزنس مین محبوب علی چانڈیو ہے۔ اس نے مجھے اغوا سے اور ہلاکت سے بچانے کے لیے دشمنوں سے مقابلہ کیا ہے۔ میری خاطر گولی کھائی ہے۔ میں نے اس دیوانے کو صرف میری خاطر موت سے لڑتے دیکھا ہے۔“

وہ اس کے بہترین اعمال سے متاثر ہوکر کہہ رہی تھی۔ ”اس کے احسانات اس کی قربانیاں جب بھی یاد آتی ہیں۔ میری آنکھیں بند ہوجاتی ہیں۔ میں سحرزدہ سی ہوجاتی ہوں۔ اس محبت کرنے والے فرشتے کی مٹھی میں آجاتی ہوں۔“

پھر وہ دل ہی دل میں بولی۔ ”ہائے میں کیا کروں؟ اب دو غلی کیفیات سے گزرنے لگی ہوں۔ محبوب نے مجھے جیت لیا ہے۔ وہ بھی اہم ہوگیا ہے۔ میرے دل کے ترازو میں دونوں عاشقوں کا پلڑا برابر ہورہا ہے۔“

جلال نے کہا۔ ”پھر تو میں کہتا ہوں۔ وہ دولت لٹانے والا' گولی کھانے والا تمہاری خاطر موت سے لڑنے والا سچا عاشق ہے۔ مراد تو نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس نے تمہارے لیے نہ کچھ کیا ہے نہ کرے گا۔ جیل میں پڑا ہے۔ یا تو اسے پھانسی ہوگی یا عمر قید ہوگی وہ کبھی باہر نہیں آسکے گا۔“

وہ تڑپ کر بولی۔ ”میرے مراد کے بارے میں ایسا نہ کہو۔ وہ میری خاطر زلیخا کو نہ ٹھکراتا تو آج جیل میں نہ ہوتا۔ ابھی وہ ایک بے بس قیدی ہے۔ اگر آزاد ہوتا میری عزت کا محافظ بن کر ساتھ رہتا۔ پھر محبوب کی طرح وہ بھی میرے لیے گولیاں کھاتا اور جان کی بازیاں لگاتا رہتا۔

مراد کو مجھ سے زیادہ کوئی نہیں جانتا۔ اسے ایک بار جیل کی سلاخوں سے باہر نکلنے کا موقع مل جائے تو وہ آگ اور بارود سے کھیلتا ہوا مجھ تک پہنچے گا۔“

وہ حیرانی سے بولا۔ ”تم اُسے بھی چاہتی ہو۔ اسے بھی چاہتی ہو۔ محبوب تمہیں چاہتا ہے اور مراد کو رقیب نہیں سمجھتا اور مراد بھی محبوب پر اعتماد کرتا ہے۔ وہ جیل میں رہ کر دیکھ رہا ہے کہ تم محبوب کے رحم و کرم پر ہو۔ تم تینوں کس طرح کا عشق کررہے ہو۔ یہ میری سمجھ سے باہر ہے۔“

”تم دس لاکھ کے لالچ سے باز آجاؤ۔ مجھے بہن کہا ہے تو بہن کے کام آؤ۔ پھر معلوم ہوگا کہ بے لوث محبت کیسے کی جاتی ہے اور ہم تینوں کس طرح کسی غرض اور لالچ کے بغیر ایک دوسرے پر اعتماد کررہے ہیں اور ایک دوسرے سے پیار کررہے ہیں۔

ماں کی قسم کھانے والے بھائی...! عشق سمجھایا نہیں جاتا۔ اپنے بہترین اعمال سے سمجھا جاتا ہے۔“

”تم بہت اچھی ہو۔ اچھی باتیں کررہی ہو اور وہ تم سے محبت کرنے والے دونوں عاشق بھی خوب ہیں۔ لیکن میں بہت غریب ہوں' کمزور ہوں۔ یہاں بیٹھے بٹھائے آسانی سے دس لاکھ مل رہے ہیں۔ میں انہیں ٹھکرانے کا حوصلہ نہیں کروں گا۔ فی الحال تمہارا فون میرے پاس رہے گا۔ تم انعام دینے والوں سے بات نہیں کروگی۔ میں اپنے فون سے بات کروں گا۔“

”میرا فون واپس کرو۔ میں کسی سے بات نہیں کروں گی۔“

”پہلے بات کرلوں۔ انعام کی رقم مجھے مل جائے پھر اسے واپس کردوں گا۔ تم میری شرافت کو سمجھو میں نے تمہیں

یہاں لاکر چوروں بدمعاشوں اور لالچی انسانوں سے تحفظ دیا ہے۔ باہر کسی نے تمہیں دیکھ لیا تو ایک نہیں ہزاروں تم پر جھپٹ پڑیں گے۔ تم کس کس سے جان چھڑاؤ گی۔ عزت آبرو سے بھی جاؤ گی۔"

وہ اپنے طور پر درست کہہ رہا تھا۔ ماروی نے سوچا۔ اسے سمیرا اور معروف سے باتیں کرنے دے۔ پھر سمیرا خود ہی جلال عرف جلّے سے کہے گی کہ ماروی سے باتیں کرنے کے بعد اسے رقم دی جائے گی۔ تب ہی وہ مجبور ہوکر ان سے بات کرانے کے لیے فون واپس کردے گا۔

وہ بولی۔ "ٹھیک ہے۔ تم ان سے باتیں کرو۔"

اس نے ماروی کا فون اپنی جیب میں رکھا پھر اپنا فون نکالتے ہوئے کہا۔ "میں نے اخبار میں ان لوگوں کا نمبر پڑھتے ہی اپنے فون میں لکھ لیا تھا۔ یہ۔ یہاں ہے۔"

اس نے بٹن دبا کر فون کو کان سے لگایا۔ دوسری طرف ریکارڈنگ کی آواز نے اسے مایوس کیا۔ ماروی نے کہا۔ "میرا فون مجھے دو۔ ابھی بات ہوجائے گی۔"

وہ مجبور ہو کو بولا۔ "ٹھیک ہے۔ مگر پہلے میں بات کروں گا۔"

"منظور ہے۔ تم ہی پہلے بات کروگے۔"

اس نے جیب سے فون نکال کر دیتے ہوئے کہا۔ "دیکھو۔ کوئی چالاکی نہ دکھانا۔ میں بھائی بن کر تمہیں سلامتی دے رہا ہوں۔ مجھے بھائی ہی بن کر رہنے دو۔"

وہ فون لے کر نمبر پنچ کرتے ہوئے بولی۔ "تمہارے سامنے ہی بول رہی ہوں۔ سنتے رہو۔"

رابطہ ہوتے ہی سمیرا کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو ماروی! تم نے اپنا فون کیوں بند رکھا تھا۔ میں کئی بار کال کر چکی ہوں۔"

وہ بولی۔ "میں نے سوچا تھا۔ کوئی خاص ضرورت ہوگی تو فون کھولوں گی ورنہ اسے چھپا کر رکھوں گی۔ راستے میں کہیں کالنگ ٹون بجنے لگے تو فون چھیننے والے آجاتے ہیں۔"

جلال عرف جلّا فون سے کان لگا کر سن رہا تھا۔ سمیرا کہہ رہی تھی۔ "تم نے سنا ہوگا اور پڑھا ہوگا اور تم جانتی ہو کہ ہم سچ مچ تمہیں تلاش نہیں کررہے ہیں۔ محبوب صاحب کو یقین دلا رہے ہیں کہ تم اغوا کی گئی ہو۔ کہیں گم ہوگئی ہو یا تمہیں ہلاک کردیا گیا ہے۔ ہم نے ان کی تسلی کے لیے دس لاکھ روپے کا انعام رکھا ہے۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ نہ ہم تمہاری واپسی چاہتے ہیں نہ کسی کو دس لاکھ دیں گے۔"

جلّے کا منہ حیرت اور مایوسی سے کھل گیا۔ ماروی نے کہا۔ "لیکن آپ لوگوں نے جس طرح انعام کا لالچ دیا ہے۔ اس کے نتیجے میں مجھ پر مصیبتیں آرہی ہیں۔ انعام کے لالچ میں لوگ مجھے ڈھونڈ رہے ہیں اور میں عبا اور نقاب میں چھپی رہتی ہوں۔ اس کے باوجود جلال احمد نامی ایک ٹیکسی ڈرائیور کی گرفت میں آگئی ہوں۔ یہ میرے ذریعہ دس لاکھ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یہ لو پہلے اس سے بات کرو۔"

ماروی نے فون جلّے کو دیا۔ وہ اسے کان سے لگا کر بولا۔ "بی بی جی! یہ کیا ناٹک ہے؟ انعام دینے کے لیے جو فون نمبر بتایا گیا ہے۔ وہ تو بند رہتا ہے۔ وہاں سے کوئی بولا نہیں ہے اور تم بول رہی ہو کہ سچ مچ دس لاکھ نہیں دیے جائیں گے۔ یہ ناٹک صرف محبوب کو جھوٹی تسلی دینے کے لیے کیا جارہا ہے۔"

سمیرا نے کہا۔ "تم ٹھیک سمجھ رہے ہو۔ ماروی کو پریشان نہ کرو۔ اسے واپس یہاں لاؤ گے تو تمہیں کوئی رقم نہیں ملے گی۔"

وہ بولا۔ "میں نے محبوب کی کہانی سنی ہے۔ مجھے پورا یقین ہے جب انہیں معلوم ہوگا کہ ماروی کو نہ اغوا کیا گیا ہے نہ ہلاک کیا گیا ہے۔ یہ میرے پاس زندہ سلامت ہے۔ تب وہ دولتمند عاشق صاحب مجھے دس لاکھ ضرور دیں گے۔"

یہ ایسی بات تھی کہ ادھر سمیرا کو ادھر ماروی کو چپ لگ گئی۔ وہ بول رہا تھا۔ "سنو۔ اتنی بڑی رقم حاصل کرنے کے لیے میں کیا کروں گا؟ خطرہ مول لے کر ماروی کو کراچی لانا چاہوں گا تو اسے ڈھونڈنے والے راستے میں پہچان لیں گے اور پولیس والے بھی ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ جائیں گے۔"

ادھر ماروی اُدھر سمیرا اس کی باتیں سن رہی تھیں۔ جواباً کچھ بول نہیں پا رہی تھیں۔ وہ سمیرا سے کہہ رہا تھا۔ "میڈم...! انعام حاصل کرنے والوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچے گی۔ ان میں دس لاکھ روپے تقسیم کیے جائیں گے تو ہر ایک کو شاید ایک ایک پیسا ملے گا۔ لیکن میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ کچھ تو میرے پاس بھی عقل ہے۔ میں یہ کروں گا کہ تمہارا ناٹک محبوب کو معلوم ہوجائے گا۔ میں بتاؤں گا کہ جس ماروی کو چھپایا جارہا ہے۔ وہ میرے پاس ہے۔"

وہ دونوں پریشان ہوگئیں۔ فون پر تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر سمیرا نے شکست خوردہ انداز میں کہا۔ "جلال احمد! تم نہیں جانتے ماروی بہت مظلوم ہے۔ دس کے دونوں عاشق بھی انجانے میں اس پر ظلم کررہے ہیں۔ وہ اپنے پیار کی سچائی سے اس کے لیے مسائل پیدا کررہے

ہیں۔ کیا ایسے وقت ہم اور تم اس غریب لڑکی کے ساتھ نیکی نہیں کرسکتے ؟"

وہ خاموشی سے سن رہا تھا۔ وہ فون پر بول رہی تھی۔ "ہم چاہتے ہیں ماروی بچپن سے مراد کی ہے مراد کی ہی رہے۔ محبوب صاحب سے اتنی دور ہوجائے کہ انہیں اس کی موت کا یقین ہوجائے۔ تب انہیں رفتہ رفتہ صبر آجائے گا۔ یہ اپنی کاروباری دنیا میں واپس آجائیں گے اور آج نہیں تو کل ماروی کو ایک دن اس کا مراد مل جائے گا۔

جلال احمد! تم غریب ٹیکسی ڈرائیور ہو۔ ہم تمہیں خالی ہاتھ نہیں رہنے دیں گے۔ کچھ نہ کچھ انعام ضرور دیں گے۔ تم خدا کے واسطے ماروی سے نیکی کرو۔"

اس نے پوچھا۔ "مجھے کیا ملے گا؟ میں غریب آدمی ہوں۔ نیکی کرنا چاہتا ہوں۔ مگر مجھے کچھ تو ملنا چاہیے۔"

"اگر تم ماروی کو اس کی منزل تک پہنچا دو گے تو ہم تمہیں ایک لاکھ روپے دیں گے۔"

اس کے چہرے سے ایک ذرا اطمینان ظاہر ہوا۔ وہ بولا۔ "میں پولیس اور لالچی لوگوں کے چکر میں پڑنا نہیں چاہتا۔ کسی جھمیلے کے بغیر ایک لاکھ مل جائیں تو خدا کا شکر ادا کروں گا۔"

"تو پھر ماروی جہاں چاہتی ہے وہاں اسے پہنچا دو۔"

"جس دن یہاں مجھے ایک لاکھ ملیں گے۔ میں خدا کو حاضر وناظر جان کر اس کے گھر کے دروازے تک اسے پہنچا دوں گا۔"

ماروی بھی فون سے کان لگا کر باتیں سن رہی تھی۔ وہ بول رہا تھا۔ "وہاں سے ایک لاکھ یہاں کون پہنچائے گا؟ کیا بینک یا ڈاک خانے کے ذریعہ رقم آئے گی؟ میں نہیں چاہتا کہ بینک والوں کو یا ڈاک خانے والوں کو معلوم ہو کہ ایک ٹیکسی ڈرائیور کو اتنی بڑی رقم مل رہی ہے۔ پھر آپ بتائیں یہ رقم مجھے کب اور کیسے ملے گی؟"

ماروی نے کہا۔ "سمیرا...! یہ رقم میں ابھی یہاں ادا کروں گی۔ تم دوسرا مسئلہ حل کرو۔"

"وہ دوسرا مسئلہ کیا ہے؟"

"سفر کے دوران پولیس چوکیاں آئیں گی۔ وہ تلاشیاں لیتے ہیں۔ مجھے بھی بے نقاب دیکھنا چاہیں گے۔ پھر مجھے دیکھ کر دس لاکھ حاصل کرنا چاہیں گے۔ ان سے کیسے نمٹا جائے گا؟"

سمیرا نے کہا۔ "فکر نہ کرو۔ تم وہاں سے چلو۔ جب بھی کسی پولیس چوکی میں روکا جائے گا۔ وہ پولیس والے اشتہار میں دیے ہوئے نمبر پر ہم سے رابطہ کریں گے۔ ہم انہیں جواب دیں گے کہ اب تم گمشدہ نہیں ہو۔ ہماری مرضی کے مطابق اپنے گھر جارہی ہو۔ جس کسی نے ماروی کو تلاش کرکے ہمارے پاس پہنچایا تھا۔ ہم اسے انعام دے چکے ہیں۔"

ماروی نے کہا۔ "ہاں اب میں کسی رکاوٹ کے بغیر اپنی منزل تک پہنچ جاؤں گی۔ سمیرا...! تمہارا بہت بہت شکریہ۔ میں پھر کسی وقت فون کروں گی۔"

سمیرا سے رابطہ ختم ہوگیا۔ جلال عرف جلّا ماروی کو بے یقینی سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "یہ ابھی تم نے یہاں ایک لاکھ دینے کی بات کی ہے۔"

وہ بولی۔ "ہاں کی ہے۔ تو پھر...؟"

"یہ۔ اتنی بڑی رقم۔ یہاں... تمہارے پاس ہے؟"

چاچی نے کہا۔ "ہمارا سامان گاڑی میں رکھو۔ گھر سے باہر جاؤ۔ واپس آؤ گے تو رقم مل جائے گی۔"

"میں تم لوگوں کو کھلائے پلائے بغیر یہاں سے نہیں لے جاؤں گا۔ راستے میں کھانے پینے کا اور ضرورت کا جو سامان ہے۔ ابھی یہاں سے خرید لیں گے۔ چاچا جمرو میرے ساتھ بازار چلو۔"

وہ چاچا کے ساتھ چلا گیا۔ ماروی اپنی اٹیچی کھولتے ہوئے بولی۔ "میں ان میں سے ایک لاکھ جلال کو دیدوں گی۔ تم نے باقی بڑی تدبیر سے اپنے پاس محفوظ رکھے ہیں انہیں وہیں رہنے دو۔"

انہوں نے یہی کیا۔ وہ چاچا کے ساتھ ضروری سامان سفر لے کر آیا تو اسے ایک لاکھ دیدیے۔ اس نے خوش ہوکر دعائیں دیں۔ اپنے ماں باپ کو وہ رقم دے کر اسے چھپا کر رکھنے کی تاکید کی۔ پھر وہ سب مطمئن ہوکر آرام سے بیٹھ کر روٹیاں کھانے لگے۔

لیکن ان کے نصیب میں اطمینان نہیں تھا۔ کھانے کے دوران میں باہر والے دروازے پر دستک سنائی دی۔ انہوں نے نظروں ہی نظروں میں ایک دوسرے سے پوچھا۔ "کون آیا ہوگا؟"

جلّے نے کہا۔ "گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ میں نے اماں سے کہہ دیا ہے۔ وہ کسی کو اندر نہیں آنے دیں گی۔ کوئی لاٹ صاحب بھی ہوگا تو اسے باہر ہی سے ٹال دیں گی۔"

وہ سر جھکا کر کھانے لگے۔ تھوڑی دیر بعد اس کی ماں نے آکر کہا۔ "پڑوسن آئی تھی۔ اس کے پیچھے دو آدمی کھڑے تھے۔ پوچھ رہی تھی ہمارے گھر میں کہاں سے مہمان آئے ہیں؟ میں نے کہا۔ سکھر سے آئے ہیں۔ وہ اندر آنا چاہتی

تھی۔ میں نے یہ کہہ کر دروازہ بند کر دیا کہ مہمان ابھی روٹی کھا رہے ہیں۔"

پھر وہ چلے سے بولی۔ "بیٹے! ابھی تو میں نے ٹال دیا ہے۔ لیکن وہ پھر آئے گی۔ اس کے ساتھ ابھی دو بندے تھے۔ ان کی تعداد بڑھ سکتی ہے۔"

چلے نے سر ہلا کر کہا۔ "بات پھیل رہی ہوگی۔ ابھی دو آئے تھے۔ بعد میں دو سو بھی چلے آئیں گے۔"

ان کا کھانا حرام ہو گیا۔ وہ کھانے سے اُٹھ گئے۔ پانی کا گھونٹ بھی حلق سے اُتارا نہیں جا رہا تھا۔ ایسی پریشانی کے وقت کوئی تدبیر ذہن میں نہیں آ رہی تھی۔

وہ ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے۔ چلے نے ماں سے کہا۔ "پھر جا کر دیکھو۔ وہ باہر ہیں یا جا چکے ہیں؟"

وہ بیرونی دروازے کی طرف گئی۔ اس نے کھڑکی کے پردے کو ذرا سا ہٹا کر دیکھا۔ پڑوسن نہیں تھی۔ لیکن اب وہاں تین افراد نظر آ رہے تھے۔

ماں نے واپس آ کر کہا۔ "ایک آدمی اور بڑھ گیا ہے۔ اب تو محلے کی عورتیں بھی بھیڑ لگائیں گی۔"

لاکھوں روپے حاصل کرنے والوں کی تعداد بڑھتی رہنے والی تھی۔ ماروی عبا پہنے کھڑی تھی۔ چلے نے کہا۔ "اماں! میں چاچی اور چاچا کے ساتھ سامان لے کر سامنے کے دروازے سے نکلوں گا۔ تم ایسے وقت ماروی کو پچھلے دروازے سے لے جاؤ۔"

ماں نے کہا۔ "میں پیچھے جا کر دیکھ لوں۔ کوئی نہیں ہوگا تو ابھی اسے یہاں سے لے جاؤں گی۔"

وہ وہاں سے گئی پھر ایک منٹ میں آ کر بولی۔ "کوئی نہیں ہے بھیڑ سامنے لگ رہی ہے۔ ماروی! فوراً میرے ساتھ آؤ۔"

بیٹے نے کہا۔ "اماں! ہم مسجد و یار حبیب کے سامنے انتظار کریں گے۔ تم سے پہلے وہاں پہنچیں گے۔"

چلے سامان اُٹھا کر چاچا چاچی کے ساتھ دروازہ کھول کر باہر آیا۔ اس وقت تک محلے کی کئی عورتیں اور مرد وہاں آ گئے تھے۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاچی اور چاچا کو دیکھ رہے تھے۔ انہیں عبا میں چھپنے والی اور اخباروں میں چھپنے والی نظر نہیں آ رہی تھی۔

چلے ٹیکسی اسٹارٹ کر کے جا رہا تھا۔ ایک عورت نے پوچھا۔ "ایک اور نقاب میں تھی۔ وہ کہاں ہے؟"

"وہ بیمار ہو گئی ہے۔ کچھ روز ہمارے گھر میں رہے گی۔ میں ان بزرگوں کو اسٹیشن تک چھوڑنے جا رہا ہوں۔ واپسی میں ڈاکٹر کو لے کر آؤں گا۔ خدا کے لیے اس بیمار کو پریشان نہ کرنا۔ جب ڈاکٹر اجازت دے۔ تب اسے جی بھر کے دیکھ لینا۔"

یہ کہہ کر وہ ٹیکسی آگے بڑھا کر تیز رفتاری سے دور چلا گیا۔ چلے کی ذہانت نے بڑا کام دکھایا۔ پیچھا کرنے والوں سے آخر پیچھا چھوٹ ہی گیا۔

اس نے مسجد و یار حبیب کے سامنے ذرا رُک کر انتظار کیا۔ ماروی چلے کی ماں کے ساتھ خیریت سے آ کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ انہوں نے اس کی ماں کا شکریہ ادا کیا پھر وہاں سے آگے چل پڑے۔ انسان پریشانیوں کے دباؤ میں نہ آئے۔ حوصلے اور ذہانت سے کام لے تو بڑی بڑی مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں۔

بہر حال بڑی الجھنوں کے بعد معاملہ سلجھ گیا تھا۔ آگے کوئی رکاوٹ پیش آتی تو اس سے بھی نمٹنے کی تدبیر سوچ لی گئی تھی۔

ماروی آرام سے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر سوچ رہی تھی۔ خیالوں میں محبوب تھا۔ اس نے نیکی اور شرافت سے پیار کی انتہا کر دی تھی۔ یہ بات نہیں تھی کہ وہ اس پر دولت لٹا رہا تھا اور وہ اس سے متاثر ہو رہی تھی۔ وہ اس کی طلب میں خون بھی بہا رہا تھا۔ موت سے لڑ رہا تھا۔ صرف اتنا ہی نہیں اربوں روپے کے بزنس کو بھی خاک میں ملا رہا تھا۔

اور عشق کیسے کیا جاتا ہے؟

اور کتنے احسانات رہ گئے ہیں کرنے کے لیے؟

اور کتنی قربانیاں رہ گئی ہیں دینے کے لیے؟

وہ دیوانہ باقی جان لیوا آزمائشوں سے بھی گزرنے والا تھا۔

وہ نہیں جانتی تھی جو اس کی لاعلمی میں وہ دیوانہ کر رہا تھا۔ اس کی تلاش میں وہ اپنی کوٹھیاں، جائیداد اور سمندر پار تک پھیلا ہوا کاروبار چھوڑ کر گم ہو گیا تھا۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ میرا معروف تھا جسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ہلکان ہو رہے ہیں، وہ ایسی جگہ ہے جہاں دنیا کا کوئی جرائم جاسوس بھی پہنچ نہیں پائے گا۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ محبوب نے اسے تلاش کرنے کے لیے مراد کو جیل سے باہر کر دیا ہے اور سزائے موت تک پہنچنے کے لیے خود اس کی جگہ قیدی بن گیا ہے۔

یہ تو عشق اور قربانیوں کی انتہا تھی۔ ماروی کو اتنی بڑی قربانی کا علم ہوتا تو وہ تڑپ کر رہ جاتی۔

وہ یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ محبوب نے قیدی بننے کے

لیے مراد کو بے خبر رکھا ہے۔ وہ بے چارہ بھی نہیں جانتا ہے کہ دم بدم احسانات کرنے والا سائیں اس کی جگہ پہنچ گیا ہے۔

اور مراد کیا تھا؟

وہ بھی عشق کے امتحان میں محبوب سے پیچھے نہیں تھا۔ اسے پہلے سے بتایا جاتا کہ محبوب اس کی جگہ سزا کاٹنے جیل میں آئے گا تو وہ ہرگز ایسا نہ ہونے دیتا۔ وہ تو اپنی ماروی کو ڈھونڈ نکالنے کے لیے مرینہ کی باتوں میں آ کر جیل سے نکل آیا تھا۔

یہ ماروی کی بدنصیبی تھی کہ وہ مراد کے حالات سے بے خبر تھی۔ یہ نہیں جانتی تھی کہ اس کے پیار میں اس کی تلاش میں ایک گدھا گاڑی والا منہ زور گھڑ سوار اور دودھاری تلوار ہو گیا ہے۔ بارود سے کھیلنے والا بندوق بردار بن گیا ہے۔ اور گولیاں برساتا ہوا لاشیں گراتا ہوا اس کی طرف چلا آ رہا ہے۔

اری ماروی! تو کچھ نہیں جانتی، ایک تیری خاطر مرنے کے لیے اندر گیا ہے۔ دوسرا مرنے مارنے کی خاطر باہر آ گیا ہے اور باہر آ کر شہ زور بنتا جا رہا ہے۔

ٹیکسی کی رفتار سست ہونے لگی۔ پولیس چوکی کا سپاہی ہاتھ اٹھا کر رکنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ جلال گاڑی کو روک کر باہر آیا۔ وہاں تین سپاہی تھے۔ ان کا افسر لکڑی کے کیبن کے سامنے کرسی پر بیٹھا تھا۔ میز پر دیسی شراب کی بوتل رکھی ہوئی تھی۔

اس نے بوتل کو منہ سے لگا کر دو گھونٹ پینے کے بعد سپاہی سے کہا۔ "جا کے دیکھ۔ کوئی دینے دلانے والی سواری ہے کہ نہیں؟"

ایک سپاہی نے ٹیکسی کے پاس سے چیخ کر کہا۔ "سر! ایک آدمی اور دو عورتیں ہیں۔ ان کے پاس کھانے پینے، پہننے اوڑھنے کا سامان ہے اور کچھ نہیں ہے۔"

وہ کرسی سے اٹھ کر مستی میں ذرا تن کر زیر لب بڑبڑایا۔ "سالا بولتا ہے۔ عورتیں ہیں۔ یہ نہیں بولتا کہ بوڑھی ہیں یا جوان؟"

وہ بوتل ہاتھ میں پکڑے لڑکھڑاتا ہوا پچھلی سیٹ کے پاس آیا۔ پھر جھک کر کھڑکی سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "ایک پردے میں ہے۔ ایک پردے سے باہر۔"

پھر وہ ایک سپاہی کی طرف ہاتھ ہلا کر بولا۔ "اے سیدو... ! وہ پردے والا گانا کیا ہے؟"

سپاہی نے کہا۔ "پردے میں رہنے دو۔ پردہ نہ اٹھاؤ، پردہ جو اٹھ گیا تو بھید کھل جائے گا۔"

افسر نے ڈانٹ کر کہا۔ "اے اوگلوکار کی اولاد! سُر میں گا۔ نہیں تو جوتے ماروں گا۔"

وہ سُر میں گانے لگا۔ وہ پھر کھڑکی پر جھک کر ماروی سے بولا۔ "بھید کیا کھلتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ پردے کے پیچھے سوہنی من موہنی صورت چھپائی جاتی ہے۔ سالا اِدھر پہاڑی پتھریلے ویران علاقے میں ایک پھول بھی نہیں کھلتا ہے۔"

وہ بوتل سے دو گھونٹ پی کر بولا۔ "پھول کیسے کھلتے ہیں۔ نقاب اٹھاؤ۔ ہمیں جلوا دکھاؤ۔ اس سوکھی سڑی نوکری میں کچھ تو شراب کی مستی لاؤ۔"

چاچی نے کہا۔ "میری بیٹی نقاب نہیں ہٹائے گی۔ یہ شرعی پردہ کرتی ہے۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "یہ شرعی پردہ کیا ہوتا ہے؟"

جلال نے کہا۔ "حضور! شرعی نہیں شرعی پردہ۔ یہ صرف باپ اور بھائی کے سامنے آتی ہے۔"

وہ بولا۔ "اچھا اچھا۔ یہ تو بہت اچھا کرتی ہے۔"

پھر اس نے سپاہیوں سے کہا۔ "یہ تم سب اُدھر منہ کرو۔ شرعی بی بی پردہ اٹھا رہی ہے۔"

تینوں سپاہیوں نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ وہ پھر کھڑکی پر جھک کر بولا۔ "دیکھو۔ یہ سپاہی کتنے پکے مسلمان ہیں۔ تمہیں نہیں دیکھیں گے۔ چلو کھل جاؤ۔"

وہ بے بسی سے چاچی اور چاچا کو دیکھنے لگی۔ وہ ایک گھونٹ پی کر ہنستے ہوئے بولا۔ "کوئی بات نہیں۔ بیٹھی رہو۔ جب تک چاہو بیٹھی رہو۔ گاڑی آگے نہیں جائے گی۔"

ماروی نے جلال کو دیکھا۔ وہ بے بسی سے بولا۔ "میری بہن... ! ہم حضور کی اجازت کے بغیر آگے نہیں جا سکیں گے۔ کوئی بات نہیں، منہ دکھا دو۔"

وہ اس ویرانے کا بادشاہ سلامت تھا۔ وہی سلامتی سے جانے کی اجازت دے سکتا تھا۔ ماروی نے چہرے سے نقاب کو ہٹا دیا۔ وہ بڑی ترنگ میں آ کر بولا۔ "واہ کیا جلوا ہے۔ گھر والی کی قسم... ویرانے میں گلاب کھل گیا ہے۔"

اس نے بوتل کو منہ سے لگا کر ایک گھونٹ بھرا۔ وہ ایک گھونٹ بھاری پڑ گیا۔ اچانک ہی ایک زور کا ٹھسکا لگا۔

اچانک ٹھسکا کیوں لگا... ؟

یوں لگا کہ ٹھیک گھونٹ بھرتے وقت یاد آیا۔ "ارے... ! میں تو اخبار میں اس کی تصویر دیکھ چکا ہوں۔"

دس لاکھ کا ٹھسکا معمولی نہیں ہوتا۔ ہاتھ سے بوتل چھوٹ گئی تھی۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر کھانس رہا تھا اور جھٹکے کھا رہا تھا۔

جلال نے ہاتھ جوڑ کر پوچھا۔ ''حضور! ہم جائیں؟''
وہ کھانستے کھانستے ڈگمگاتے ہوئے' اسے دھکا دے کر بولا۔ ''یہ تو وہ ہے....''
وہ ہاتھ نچا کر بولا۔ ''ارے وہ ہے یہ تو...
صبح یہاں سے ایک گاڑی والا گزرا تھا۔اس کے پاس اخبار تھا اور اخبار میں اس کی تصویر تھی۔ارے...اس کے پیچھے تو دس لاکھ روپے کا انعام ہے۔''
جلال نے کہا۔ ''جی ہاں۔انعام حاصل کرنے کے لیے فون نمبر بھی لکھا ہوا تھا۔''
''ہاں میرے پاس کاغذ نہیں تھا۔میں نے بوتل کے لیبل پر وہ نمبر لکھا تھا۔''
پھر اس نے چونک کر نیچے قدموں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ۔یہ بوتل تو ٹوٹ گئی...''
وہ جلدی سے جھک کر بوتل کے ٹکڑے اٹھا کر جوڑنے لگا۔جلال نے کہا۔ ''وہ نمبر میرے پاس ہیں لیکن اب بیکار ہو گئے ہیں۔یہ اپنے ماں باپ کے پاس پہنچ گئی ہے۔انعام دینے والے ماں باپ اس کے ساتھ بیٹھے ہیں۔''
وہ کھڑکی سے جھانک کر چاچا اور چاچی کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔پھر بولا۔ ''یہ تو غریب غریب سے لگتے ہیں۔کیا یہ کسی کو دس لاکھ روپے انعام دے سکتے ہیں؟''
چاچی نے کہا۔ ''دینے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔بیٹی خود ہی ہمارے پاس آگئی ہے۔''
''میں کیسے یقین کروں؟''
جلال نے کہا۔ ''میرے پاس انعام دینے والوں کا نمبر ہے۔ان سے بات کر کے پوچھ لو۔''
وہ اپنا فون نکال کر بولا۔ ''نمبر بتاؤ۔''
جلال نے ماروی کے نمبر نوٹ کرائے۔ادھر ماروی نے چپ چاپ اپنا فون چاچی کی طرف بڑھا دیا۔اس شرابی نے ٹیکسی سے ذرا دور جا کر نمبر پنچ کیے۔رابطہ ہونے پر چاچی نے ذرا رعب دار آواز میں کہا۔ ''ہیلو کون ہے؟''
وہ بولا۔ ''میں ویران چوکی کا پولیس افسر آپ کو خوش خبری سنا رہا ہوں۔وہ جو آپ کی دس لاکھ روپے والی لڑکی ہے' اسے ابھی ابھی اپنی چوکی میں پکڑا ہے۔اسے جانے نہیں دوں گا۔آپ بولیں' دس لاکھ ادھر لے کے آئیں گے۔یا میں لڑکی کو اُدھر لے کے آؤں؟''
چاچی نے کہا۔ ''افسر صاحب! جس لڑکی کو آپ نے پکڑا ہے وہ میرے پاس ہے اور میں اس کے ساتھ آپ کی چوکی میں ٹیکسی کے اندر بیٹھی ہوں۔''

اس نے اچھل کر پلٹ کر دیکھا۔پھر دوڑتا ہوا ٹیکسی کے پاس آیا۔چاچی نے کہا۔ ''آپ کو یقین نہیں آئے گا تو ہمارے ساتھ بڑے افسروں کے سامنے چل کر ماننا پڑے گا کہ آپ خوامخواہ ہمیں پریشان کرتے رہے ہیں۔''
''نہیں۔میں پریشان تو نہیں کر رہا ہوں۔میں تو چیک کر رہا ہوں۔میں۔میں اپنی ڈیوٹی کر رہا ہوں۔''
اس نے حسرت سے ماروی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ کیا ہوا...؟تم خود ہی اِدھر پہنچ گئیں۔میری بوتل ٹوٹ گئی ہے۔میں نے تھوڑی سی پی تھی۔میرے نقصان کا کچھ خیال کرو۔دس لاکھ نہ سہی۔دس بوتلیں تو مل جائیں پھر میں نہیں روکوں گا۔قسم سے کہتا ہوں پھر نہیں روکوں گا۔''
جلال نے چاچا سے کہا۔ ''انہیں پانچ سو دے دیں۔''
افسر نے سپاہیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''پانچ سو سے کیا ہوگا۔یہ میرے تین یتیم بچے بھی ہیں۔''
چاچا نے جیب سے ایک ہزار روپے نکال کر دیے۔وہ خوش ہو کر بولا۔ ''شکریہ۔اے ڈرائیور! انہیں آرام سے لے جاؤ۔''
جلال نے فوراً ہی سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کی پھر اسے تیز رفتاری سے بڑھاتا ہوا وہاں سے دور ہوتا چلا گیا۔افسر ہزار کے نوٹ کو اور جانے والی گاڑی کو دیکھ کر سوچ رہا تھا۔ ''مالدار اسامی ہے۔بیٹی خود ان کے پاس آگئی۔ کو انعام نہیں دینا پڑا۔ان کے دس لاکھ روپے بچ گئے۔''
کیوں بچ گئے؟
مال تجوری میں محفوظ ہے۔
کیوں محفوظ ہے؟
تجوری اس کے پاس ہے۔مال ہمارے پاس ہونا چاہیے۔
ایک سپاہی نے کہا۔ ''سر! وہ تو جا چکے ہیں۔اب کیا ہوگا؟''
وہ بولا۔ ''جانے کے بعد ہی تو ہوگا۔مال ہمارے نصیب میں ہے۔ہمارے پاس ہی آئے گا۔''
اس نے فون پر نمبر پنچ کیے۔رابطہ ہونے پر ایک بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔ ''سلام صاحب! حکم کریں۔''
وہ بولا۔ ''سرباز! ایک تگڑی اسامی ہے۔ایک گھنٹے کے اندر تمہارے علاقے سے گزرنے والی ہے۔''
''کیا ان کے پاس نقد رقم یا سونا چاندی ہے؟''
''نہیں۔وہ نادان نہیں ہیں۔اس ویران علاقے میں سفر کر رہے ہیں۔نہ نقد رقم رکھیں گے نہ سونا چاندی لے جائیں گے لیکن ہم ان سے لاکھوں روپے وصول کر سکیں گے۔''
''کیسے کریں گے؟''

”ٹیکسی میں بوڑھے ماں باپ ہیں اور ان کی جوان بیٹی ہے۔ بیٹی کو پکڑ کر چھپا دو۔ ان کے ماں باپ کو جانے دو۔ ان سے بولو چپ چاپ دس لاکھ لا کر دیں گے تو بیٹی ملے گی۔ اگر چالاکی دکھائیں گے۔ اگر پولیس کی یا دوسرے بدمعاشوں کی مدد سے حملہ کریں گے تو بیٹی زندہ نہیں ملے گی۔“

سرباز اس علاقہ کا ایک خطرناک ڈاکو تھا۔ اس کے ساتھی جدید اسلحہ سے لیس رہتے تھے۔ اس علاقے میں پولیس برائے نام تھی۔ سپاہیوں کی تعداد بہت ہی کم تھی۔ وہ نہ تو ان سے لڑتے تھے نہ کبھی واردات سے انہیں روکتے تھے۔ اپنے کان پکڑتے تھے اور ان ڈاکوؤں سے سمجھوتا کر کے اپنی بیوی بچوں کے لیے زندہ رہتے تھے۔ سپاہی بھی بے چارے نہیں ہوتے مگر ہو گئے تھے۔

اب وہ چور سپاہی دس لاکھ روپے انعام کے ذریعہ نہیں، اغوا برائے تاوان کے ذریعہ حاصل کرنے والے تھے۔

☆☆☆

انہوں نے ایک بڑا سا گڑھا کھود کر دونوں کی لاشیں اس میں پھینک دی تھیں پھر اس گڑھے کو بند کر دیا تھا۔ جہاں جہاں لہو کے دھبے تھے انہیں دھو ڈالا تھا۔ مراد ایک گھوڑا لے گیا تھا۔ دوسرا کھونٹے سے بندھا ہوا تھا۔ اس گھوڑے کو آزاد کر کے اسے ہانک دیا تھا۔ وہ آزاد ہوتے ہی ہنہناتا ہوا وہاں سے بھاگ گیا تھا۔

اب وہاں آنے والوں کو شبہ نہیں ہو سکتا تھا کہ تین اجنبی ادھر آئے تھے۔ ان کے درمیان گولیاں چلی تھیں۔ دو مارے گئے تھے اور ایک زندہ واپس چلا گیا تھا۔

وہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کی ملی جلی آبادی تھی۔ وہ امن و امان سے رہتے تھے۔ ایک دوسرے کے لیے مسئلہ نہیں بنتے تھے۔ اس راستے سے گزرنے والے ڈاکو اور اسمگلر ان کا سکون برباد کرتے رہتے تھے۔ پولیس والے کبھی کبھی آتے تھے لیکن انہوں نے کبھی کسی کو گرفتار نہیں کیا تھا۔

وہ بے چارے نہیں جانتے تھے کہ ابھی ان پر ایک اور آفت آنے والی تھی اور اس آفت کا نام مرینہ تھا۔

خضدار سینٹرل جیل کے جیلر نے اپنے دو سپاہیوں کے ذریعہ پیٹرول کے دو بڑے کین بھیج دیے تھے۔ اس کی گاڑی کی ٹنکی فل ہو گئی تھی اور ایک فاضل کین بعد میں کام آ سکتا تھا۔

گاڑی میں جان پڑتے ہی وہ اس سمت چل پڑی جدھر مراد ڈاکوؤں کی گاڑی میں گیا تھا۔ وہ تقریباً دو گھنٹے بعد اس کا تعاقب کر رہی تھی۔ یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ یار دلدار دشمنِ جاں کتنی دور نکل گیا ہوگا۔ لیکن اس پولیس والی کی تربیت کا تقاضا تھا کہ دنیا کے آخری سرے تک اپنے شکار کا پیچھا کرتے رہو۔ ہاتھ سے نکلنے والے کہیں نہ کہیں ہاتھ آ ہی جاتے ہیں۔

وہ اپنی تربیت اور تجربات کے مطابق درست تھی۔ آگے جا کر بیچ سڑک پر وہ گاڑی دکھائی دی۔ اس نے قریب آ کر دیکھا تو اگلی سیٹ کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اسے ڈرائیو کرنے والا سیٹ پر ایک طرف ڈھلکا ہوا تھا۔ دیدے پھیلے ہوئے تھے۔ وہ پسلی کی طرف سے لہو میں بھیگا ہوا تھا۔

مرینہ کے ایک تابعدار نے کہا۔ ”ہم تاریکی میں دیکھ نہیں پائے تھے۔ مراد شاید اسی گاڑی میں فرار ہوا تھا۔“

وہ بولی۔ ”یہی میں سوچ رہی ہوں۔ وہ گاڑی چلانا نہیں جانتا ہے۔ اس نے وہاں چار ڈاکوؤں کو ہلاک کیا۔ پھر ایک کو زخمی کر کے اس سے گاڑی ڈرائیو کراتا ہوا یہاں تک آیا۔ زخمی یہاں پہنچتے پہنچتے مر گیا۔ وہ مجبور ہو کر پھر پیدل بھاگ رہا ہے۔“

دوسرے تابعدار نے کہا۔ ”وہ پھر پیدل ہو گیا ہے تو ہم آگے جا کر اسے پکڑ لیں گے۔“

وہ تینوں مرینہ کے ساتھ تیزی سے آ کر اپنی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ اسے ڈرائیو کرتے ہوئے آگے جانے لگے۔ وہ بڑبڑا رہی تھی۔ ”مائی گاڈ! میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ بیچارہ سا اور بیوقوف سا نظر آنے والا ایسا تیز طرار چیتا بن جائے گا۔“

ایک تابعدار نے کہا۔ ”اس نے کل رات بندوق پکڑی۔ آدھے گھنٹے تک گولیاں چلانا سیکھیں اور اتنا زبردست شوٹر بن گیا ہے کہ پانچ ڈاکوؤں کو موت کے گھاٹ اتار چکا ہے۔“

دوسرے تابعدار نے کہا۔ ”بندہ بہت خطرناک اور ضدی ہے۔ کل شام سے ہمیں دوڑا رہا ہے۔ تھکتا نہیں جانتا۔ ماروی کے پیچھے بھاگتا جا رہا ہے۔“

تیسرے تابعدار نے کہا۔ ”یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ہم سے سامنا ہوگا تو وہ ہتھیار نہیں پھینکے گا۔ جم کے مقابلہ کرے گا۔“

مرینہ نے کہا۔ ”میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں۔ اسے ہلاک نہ کرنا۔ صرف زخمی کرنا۔ میں اسے اپاہج بنا کر اپنے قدموں میں رکھوں گی۔ اب وہ میرے تلوے چاٹا کرے گا۔“

تیسرے تابعدار نے کہا۔ ”وہ ہمیں گولی مارے گا تو کیا ہم اس پر گولی نہ چلائیں۔“

”گولی ضرور چلاؤ۔ مگر اسے زندہ رہنا چاہیے۔ اگر تم

میں سے کسی نے اسے ہلاک کیا تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی اور کوئی مجھے دھوکا دے کر واپس جانا چاہے گا تو میرے پاپا اسے کتے کی موت ماریں گے۔“

وہ تینوں چپ رہے۔ ولاور جان جیسے جلاّد جیلر کی بیٹی سے بحث نہیں کر سکتے تھے۔ ان میں سے ایک ڈرائیو کر رہا تھا۔ دو پیچھے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان تینوں نے عقب نما آئینے میں ایک دوسرے کو دیکھا۔ دل میں کہا۔ ”ہماری جان کیا مفت کی ہے؟ کوئی ہمیں مار ڈالے اور ہم اسے نہ ماریں۔“

ایک نے دوسرے سے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا۔ ”مراد نشانے پر آئے گا تو بچ کر نہیں جائے گا۔“

دوسرے نے کہا۔ ”اور یہ لندن زادی ہمیں ہلاک کرنا چاہے گی تو کیا ہم اسے چھوڑ دیں گے؟“

گاڑی اس بستی میں آ کر رک گئی جہاں سے مراد گزر کر گیا تھا۔ سڑک کے کنارے والا ہوٹل کھل گیا تھا۔ سونے والے بیدار ہو گئے تھے۔ سب اپنے اپنے کام سے آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ مرینہ نے ہوٹل کے مالک سے پوچھا۔ ”یہاں پچھلی رات ایک ہٹا کٹا جوان آیا تھا، وہ کہاں ہے؟“

ڈھابے کے مالک نے کہا۔ ”میں تو اپنے گھر جا کر سو جاتا ہوں۔ ادھر کوئی آیا ہوگا تو میں نے نہیں دیکھا۔“

وہ تینوں تابعدار بھی وہاں کے محلوں اور گلیوں میں پوچھتے پھر رہے تھے۔ سب انکار کر رہے تھے۔ اگر کوئی آیا ہوگا تو رات کی تاریکی میں چپ چاپ ادھر سے گزر گیا ہوگا۔

مرینہ سمجھ رہی تھی کہ مراد کہیں ایک جگہ نہیں ٹھہرے گا۔ ماروی کی تلاش میں بھاگتا بھٹکتا رہے گا۔ وہ چاروں اسے ڈھونڈتے ہوئے ایک گلی سے گزر رہے تھے۔ وہ اچانک ایک مکان کے سامنے رک گئے۔

مرینہ کی جاسوس نظروں نے اس مکان کے پچھلے دروازے اور دیواروں پر بلٹس کے نشانات دیکھے۔ ایک اناڑی شوٹر سے جتنے نشانے خطا ہوئے تھے وہ سب وہاں نشان چھوڑ گئے تھے۔ پھر وہاں ضائع ہونے والے بلٹس بھی پائے گئے۔

ان چاروں نے دو چار ہوائی فائر کیے تو بستی والے سہم گئے۔ مرینہ کے حکم سے تابعداروں نے ان سب کو نشانے پر رکھا پھر وہ بولی۔ ”وہ یہاں ہے۔ فوراً بتاؤ اسے کہاں چھپایا ہے؟“

وہ قسمیں کھانے لگے کہ اسے نہ چھپایا گیا ہے نہ وہ چھپ کر رہنے والا تھا۔ وہ بہت ہی خطرناک بندہ تھا۔ دو ڈاکوؤں کو موت کے گھاٹ اتار کر ان کے ایک گھوڑے پر اس طرف گیا ہے۔

انہوں نے ہاتھ اٹھا کر بتایا کہ کس سمت گیا ہے۔

مرینہ نے پوچھا۔ ”کتنی دیر ہوئی ہے؟“

”کوئی ایک گھنٹا ہو رہا ہے۔“

وہ چاروں فوراً ہی اپنی گاڑی میں بیٹھ کر اسی سمت چل پڑے۔ راستے میں مرینہ بڑبڑا رہی تھی۔ ”یہ وہ سیدھا سادا گدھے گاڑی والا نہیں ہے جسے میں جیل سے نکال کر لائی ہوں۔ میں شاید دھوکا کھا گئی ہوں۔ کسی بہت ہی ماہر اور شاطر چھپے ہوئے فائٹر کو لے آئی ہوں۔“

وہ دور کھڑکی کے باہر دیکھتے ہوئے بولی۔ ”وہ غضب کا شوٹر ہے۔ اس نے بستی میں بھی دو ڈاکوؤں کو مار ڈالا۔ ایک رات میں سات مرڈر کیے ہیں، وہ بھی تنہا لڑتے ہوئے... او گاڈ...! آنکھوں سے دیکھ کر بھی یقین نہیں ہو رہا ہے۔“

وہ بڑی حیرت سے بڑے جذبے سے سوچ رہی تھی۔ اتنی متاثر ہو رہی تھی کہ اس کی طرف کھنچی جا رہی تھی۔ وہ پاگل ہو رہی تھی۔ اسے زندگی گزارنے کے لیے ایسے ہی غضب ناک لائف پارٹنر کی ضرورت تھی۔ وہ اس کے حواس پر حاوی ہو گیا تھا۔

اس نے ڈرائیو کرنے والے کو اور پیچھے بیٹھنے والے تابعداروں کو دیکھا۔ پھر کہا۔ ”اس سے سامنا ہو تو گولی نہ چلانا۔“

ان تینوں نے پھر عقب نما آئینے میں ایک دوسرے کو خاموشی سے دیکھا۔ وہ حکم دے کر چپ ہو گئی تھی۔ ایک نے پوچھا۔ ”اگر اس نے گولیاں چلائیں تو؟“

”میں چلانے نہیں دوں گی۔ اس کے سامنے آ جاؤں گی۔ اس کے سامنے ہتھیار پھینک دوں گی۔ تب وہ نہیں لڑے گا اور مجھ سے دور نہیں بھاگے گا۔“

ایک نے اطمینان کی سانس لے کر کہا۔ ”اس سے اچھی بات کیا ہوگی؟ آپ نے بڑی دانشمندی سے یہ فیصلہ کیا ہے۔“

وہ اپنے دل میں بولی۔ ”کیا کروں؟ میں ہتھیار ڈالنے والی عورت نہیں ہوں۔ لیکن وہ اسی طرح قابو میں آئے گا۔“

گاڑی کی محدود فضا میں تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ وہ ونڈ اسکرین کے پار اسی بے چینی سے دیکھ رہی تھی۔ جیسے ابھی اس کے پاس پہنچنے ہی والی ہو۔

پھر وہ پریشان ہو کر بولی۔ ”کتنی دیر ہو گئی ہے۔ کوئی انسانی آبادی، کوئی کچا پکا مکان دکھائی نہیں دے رہا ہے۔“

ایک نے کہا۔ ”یہ بلوچستان کا بہت ہی ویران پہاڑی علاقہ ہے۔“

مرینہ نے کہا۔ ”وہ پچھلی رات سے بھاگ رہا ہے۔ آخر انسان ہے۔ بھوکا ہوگا۔ سونا چاہتا ہوگا۔ آگے کسی انسانی آبادی میں پہنچا ہوگا۔ تم رفتار اور بڑھاؤ۔“

رفتار اور بڑھ گئی۔ لیکن آگے جا کر سست پڑ گئی۔ آگے راستہ دو سمتوں میں جا رہا تھا۔ ڈرائیو کرنے والے نے پوچھا۔ ”میڈم... ! اب کدھر چلیں؟“

وہ الجھ گئی۔ بڑبڑانے لگی۔ ”وہ کدھر گیا ہوگا؟“

وہ گاڑی سے اتر کر بولی۔ ”باہر آؤ۔ گھوڑا اپنے پیروں کے نشانات چھوڑتا گیا ہوگا۔ ہم اسی سمت جائیں گے۔“

وہ گاڑی سے اُتر کر دونوں راستوں پر دور تک جا کر نشانات تلاش کرنے لگے اور مایوس ہونے لگے۔ حیرانی کی بات تھی کہ وہ گھوڑے پر وہاں سے نہیں گزرا تھا۔

وہ دور تک دیکھتے ہوئے بولی۔ ”وہ یہاں تک آنے سے پہلے ہی سڑک چھوڑ کر ادھر میدانی پہاڑی ناہموار راستوں سے گیا ہوگا۔ گھوڑا اسے ہر طرح کے نشیب و فراز سے لے جا رہا ہوگا۔“

وہ پریشان ہو کر دور تک دیکھتے ہوئے بولی۔ ”پتا نہیں کہاں جا رہا ہوگا۔ ہمیں کس سمت جانا چاہیے۔“

وہ سب بری طرح اُلجھ گئے تھے۔ دو طرفہ راستوں کو دیکھ رہے تھے کہ کس سمت جائیں؟

اُلجھتے رہنے میں وقت ضائع ہو رہا تھا۔ آخر وہ گاڑی میں آ کر بیٹھ گئے۔ کہیں تو جانا تھا۔ وہ ایک راستے پر چل پڑے۔

پچھلی سیٹوں پر دونوں تابعدار سو گئے۔ وہ پچھلے بیس گھنٹوں سے جاگ رہے تھے۔ کہیں کھانے پینے کا بھی موقع نہیں ملا تھا۔ جس بستی سے مراد گھوڑا لے کر گیا تھا۔ وہاں پیٹ بھرا جا سکتا تھا۔ لیکن وہ مراد کے پیچھے پاگل ہو رہی تھی۔ اس نے بھی کچھ کھایا تھا نہ تابعداروں کو کھانے دیا تھا۔ آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

سورج سر پر آ گیا تھا۔ انہوں نے ایک بستی میں پہنچ کر اچھی طرح کھایا پیا۔ دھابے کے مالک سے پوچھا۔ ”کیا ادھر سے کوئی گھڑسوار گزرا ہے۔“

دھابے کے مالک نے کہا۔ ”ہاں۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹا پہلے ایک تگڑا جوان آیا تھا۔ اس نے ایک گلاس پانی پیا پھر سبی جانے کا راستہ پوچھا اور چلا گیا۔“

مرینہ نے پوچھا۔ ”سبی کس طرف ہے؟“

اس نے کہا۔ ”یہاں سے شمال کی طرف ہے۔ یہ سڑک یہاں سے رحمت پور جاتی ہے۔ وہاں سے ریل گاڑی گزرتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ایک پکی سڑک بھی سبی پہنچا دیتی ہے۔“

ڈرائیو کرنے والے نے کہا۔ ”میڈم! ہمیں کم از کم دو گھنٹے کی نیند لینے دیں۔“

وہ بولی۔ ”ہم اس کے قریب پہنچ رہے ہیں۔ وہ ماروی کی تلاش میں اسی طرف جائے گا۔ مجھے تو نیند نہیں آئے گی۔ میں گاڑی چلاؤں گی تم تینوں سوتے ہوئے چلو۔“

وہ پھر گاڑی میں آ کر بیٹھ گئے۔ وہاں سے آگے جانے لگے۔ مراد اس کے دماغ میں سلگ رہا تھا۔ وہ ڈرائیو کر رہی تھی۔ سو نہیں سکتی تھی۔ جب تک وہ نہ ملتا اس کی آنکھیں پھٹی رہتیں۔

ایک گھنٹے کے سفر کے بعد سڑک کے کنارے ایک چھوٹی سی چار دیواری نظر آئی۔ اس کے چاروں طرف کپڑے کی رنگ برنگی جھنڈیاں لگی تھیں۔ دو اونچے لال پیلے جھنڈے بھی لہرا رہے تھے۔ وہ کسی بزرگ کا مزار تھا۔ ایک بوڑھا ہاتھ میں جھنڈی لے کر بیچ سڑک پر کھڑا ہو گیا تھا اور گاڑی کو رکنے کا اشارہ کر رہا تھا۔

مرینہ نے گاڑی کو روک کر پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟“

وہ بوڑھا کسی پیر و مرشد کا نام بتا کر کہنے لگا۔ ”یہ ایک بزرگ دین کا مزار ہے۔ یہاں نذرانہ دو۔ دعائیں مانگو تو من کی مراد پوری ہوتی ہے۔ بیٹی! تیری مراد بھی پوری ہوگی۔“

مرینہ کو دینی معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے کبھی نماز نہیں پڑھی تھی۔ وہ دعا اور نذرانوں کو بھلا کیا مانتی۔ لیکن اس بوڑھے نے مراد کا نام لیا تھا اور کہہ رہا تھا کہ من کی مراد پوری ہوگی۔ وہ اسے ضرور ملے گا۔

اس نے فوراً ہی بیگ میں سے پانچ سو کا نوٹ نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے پیر کے پاس جانے کا ٹائم نہیں ہے۔ ان سے کہنا مراد کو میرے پاس پہنچا دیں۔ وہ مجھے ملے گا تو یہاں آؤں گی اور ہزاروں روپے دوں گی۔“

وہ گاڑی اسٹارٹ کر کے تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ اس بوڑھے کی باتوں نے اس کے اندر جوش اور جذبے کو اور بڑھا دیا تھا۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ وہ آگے جا کر مراد کو پا لے گی۔

کوئی دل میں گھس جائے تو اسی طرح پاگل کر دیتا ہے۔ وہ گاڑی کی رفتار بڑھاتی ہوئی رحمت پور پہنچ گئی۔ وہ تینوں سو رہے تھے۔ انہیں جگا کر کہا۔ ”مراد یہاں

ہوگا۔ ہمیں بیس گھنٹوں سے دوڑا رہا ہے۔ یہاں کسی ہوٹل میں نیند پوری کر رہا ہوگا۔ چلو ہر چھوٹے بڑے ہوٹل میں گھس کر دیکھو۔“

انہوں نے ایک بازار میں گاڑی کو پارک کیا پھر دروازے کھول کر باہر آ گئے۔ وہاں دور تک کئی ہوٹل تھے۔ وہاں جا کر اسے تلاش کرنے لگے۔ مراد کا حلیہ بتا کر کہنے لگے کہ جو اسے ابھی ہمارے سامنے لائے گا۔ اسے دس ہزار روپے انعام دیں گے۔

انعام کے لالچ میں کئی لوگ مراد کا حلیہ ذہن میں رکھ کر اسے ڈھونڈنے لگے۔ تھانیدار کو معلوم ہوا تو اس نے ایک کھٹارا جیپ میں آ کر مرینہ کو دیکھا پھر بڑے رعب اور دبدبے سے پوچھا۔ ”کون ہو تم... ؟ کسے تلاش کرتی پھر رہی ہو؟ یہ مراد کون ہے؟“

وہ اسے گھور کر دیکھ رہی تھی۔ وہ بھی اسے گھورتے ہوئے بولا۔ ”اسے کیوں ڈھونڈ رہی ہو؟ جانتی ہو میں یہاں کا تھانے دار ہوں۔ تمہیں پہلے میرے پاس آنا چاہیے تھا۔“

مرینہ نے اسے حقارت سے دیکھا۔ ایک طرف تھوکا۔ پھر اپنا آئی ڈی کارڈ دکھایا تو اس نے فوراً الرٹ ہو کر سیلوٹ کیا۔ وہ بولی۔ ”ڈھول کے پول ہو۔ صرف اوپر سے بجتے رہتے ہو۔“

اس نے کہا۔ ”سوری میڈم... ! آپ حکم کریں۔“

اس نے پوچھا۔ ”تم نے ایسے شخص کو دیکھا ہے۔ جس نے گرے کلر کی شلوار قمیص پہنی ہے۔ اس کا قد چھ فٹ سے ایک آدھ انچ زیادہ ہوگا۔ بہت صحت مند ہے۔ باڈی بلڈر دکھائی دیتا ہے۔“

تھانیدار نے کہا۔ ”شاید وہ ادھر آیا تھا لیکن ہماری نظروں میں نہیں آیا۔ ہمارے دو سپاہی ریلوے اسٹیشن کے پیچھے سے ایک گھوڑے کی لگام پکڑ کر لائے تھے۔ کہہ رہے تھے۔ اس گھوڑے کا کوئی مالک نہیں ہے۔“

مرینہ نے پورے یقین سے کہا۔ ”وہی ہوگا۔ اس نے گھوڑے کو یہاں چھوڑ دیا ہے۔ اس کا مطلب ہے اسے کوئی دوسری تیز رفتار گاڑی مل گئی ہے۔“

تھانیدار نے کہا۔ ”ایک ٹرین دس بجے ادھر سے سبی اور خوست کی طرف جاتی ہے۔“

وہ اچھل پڑی۔ اسے آگے اور کچھ نہیں سننا تھا۔ اپنی گاڑی کی طرف دوڑتے ہوئے تابعداروں سے بولی۔ ”وہ ٹرین میں سبی کی طرف گیا ہے۔ بس مل گیا سمجھو۔“

وہ سب گاڑی میں بیٹھ گئے۔ وہ اس قدر جوش میں تھی کہ تابعداروں کے جاگنے کے باوجود خود ڈرائیو کر رہی تھی۔ آندھی طوفان کی رفتار سے اُڑی جا رہی تھی۔ وہ تینوں پریشان تھے۔ نیند پوری نہیں ہوئی تھی۔ بیزار ہو رہے تھے۔

ایک نے کہا۔ ”میڈم! پلیز اسپیڈ کم کریں۔“

اس نے جھڑک دیا۔ ”یو شٹ اپ۔ میں اناڑی نہیں ہوں۔ وہ دس بجے کی ٹرین سے گیا ہے۔ ابھی دو بج رہے ہیں۔ وہ ہم سے چار گھنٹے آگے ہے۔ وہ سبی پہنچ کر ضرور کچھ کھانے پینے اور سونے کے لیے رُکے گا۔“

وہ سڑک کبھی ریلوے لائن کے ساتھ چلتی تھی۔ کبھی دور ہو جاتی تھی۔ پھر کئی کلو میٹر کے بعد ریل کی پٹڑیوں کی طرف چلی آتی تھی۔ ایک بار ان کی گاڑی پٹڑیوں سے بہت دور آ گئی۔ مرینہ نے کہا۔ ”وہ ریل لائن نظر نہیں آ رہی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ سڑک دوسری طرف جا رہی ہو؟“

ایک تابعدار نے کہا۔ ”نو میڈم... ! تھانیدار نے کہا تھا۔ یہ سڑک بھی سبی کو ہی جاتی ہے۔“

آگے وہی ویران پہاڑی علاقہ تھا۔ کچھ دور جانے کے بعد انہوں نے دیکھا۔ آگے سڑک پر ایک ٹیکسی کھڑی ہوئی تھی۔ چار گھڑسوار اس ٹیکسی کے چاروں طرف بندوقیں تانے ہوئے تھے۔

مرینہ نے گاڑی روک دی۔ وہ ان سے دور سڑک کے موڑ پر چھوٹے ٹیلے کے پیچھے تھی۔ لینڈ کروزر ان گھڑسواروں کی نظروں میں نہیں آئی تھی۔

بندوقوں کی زد میں آنے والے ٹیکسی کے دروازے کھول کر باہر آ رہے تھے۔ ایک دروازے سے جو باہر نکلی وہ عبا پہنے ہوئے تھی اور نقاب میں چھپی ہوئی تھی۔

مرینہ نے تابعداروں سے کہا۔ ”وہ ڈاکو ہیں۔ انہیں لوٹنے کے بعد ادھر سے گزریں گے اور ہمیں اسی راستے پر آگے جانا ہے۔ ان سے ٹکراؤ لازمی ہوگا۔“

ایک نے کہا۔ ”ہاں۔ اور تو کوئی صورت نہیں ہے۔“

وہ بولی۔ ”ہمیں آگے جا کر ریلوے ٹریک کے ساتھ سبی پہنچنا ہے۔ مورچے بناؤ۔“

انہوں نے لانگ رینج کی رائفلیں سیٹوں کے پیچھے سے نکال لیں۔ کارتوس کے تھیلے اٹھا لیے پھر گاڑی سے نکل کر جھکتے ہوئے، چھپتے ہوئے ان سے قریب تر ہونے لگے۔ مرینہ ایک ٹیلے کے پیچھے تقریباً پندرہ گز کے فاصلے پر پہنچ گئی۔ وہاں سے ان کی باتیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔

تین ڈاکو گھوڑوں سے اُتر گئے تھے۔ ان کا سردار گھوڑے پر بیٹھا کہہ رہا تھا۔ ”ہم اس لڑکی کو لے جا رہے

ہیں۔ اسے زندہ سلامت واپس چاہتے ہو تو دس لاکھ روپے لے آؤ۔ ہمیں بتاؤ۔ کتنی دیر میں رقم لاؤ گے۔ ہم اسی وقت لڑکی کو یہاں لے آئیں گے۔ پولیس کو یا اپنے بدمعاشوں کو حملہ کرنے کے لیے لاؤ گے تو یہ تمہیں زندہ نہیں ملے گی۔"

مرینہ چاچی اور چاچا کو نہیں جانتی تھی۔ جسے پہچانتی تھی وہ نقاب میں تھی۔ چاچی ہاتھ جوڑ کر کہہ رہی تھی۔ "مجھے پکڑ کر رکھو۔ میری بیٹی یہاں سے جا کر دس لاکھ کا انتظام کر کے اس ڈرائیور کے ذریعہ رقم یہاں پہنچا دے گی۔"

سردار نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ہم تیرے جیسی بڑھیا کو اپنے پاس رکھ کر کیا کریں گے؟ ہمیں رقم نہیں ملے گی تو جوان لڑکی کو بازار میں بیچ دیں گے۔ کچھ تو رقم مل جائے گی۔"

مرینہ کو ان کے معاملات سے دلچسپی نہیں تھی۔ وہ آندھی طوفان کی رفتار سے آئی تھی۔ آگے بھی اسی رفتار سے مراد تک پہنچنے کے لیے بے چین تھی اور وہ ڈاکو دیوار بن گئے تھے۔

اس نے رائفل سے سردار کا نشانہ لیا۔ وہ تو اسکاٹ لینڈ یارڈ کی تربیت یافتہ تھی۔ ٹریگر کے دباتے ہی گولی سیدھی سردار کی پیشانی پر لگی۔ فائرنگ کی گونجتی ہوئی آواز کے ساتھ سردار گھوڑے کی پیٹھ سے الٹ گیا۔ پیچھے گر نہ سکا۔ اس کے پاؤں رکاب میں پھنسے ہوئے تھے۔ گھوڑا بدک کر اس کی لٹکتی ہوئی لاش کو لے کر بھاگنے لگا۔

تینوں ڈاکو اچانک حملے سے بوکھلا گئے۔ اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر بھاگنے لگے۔ جوابی فائرنگ کرنے کے لیے یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ گولی نے کہاں سے آ کر سردار کو ٹھنڈا کیا ہے۔

ایسے وقت تابعداروں نے بھی فائرنگ کی۔ وہ بھاگنے والے بھی گولیاں کھا کر گرے اور گھوڑے ان کے بغیر بھاگتے چلے گئے۔ ان میں سے ایک ٹیکسی کے پیچھے ہی گرا تھا۔ بری طرح زخمی ہوا تھا۔ لیکن زندہ تھا۔

ایک ڈاکو کے بھاگتے وقت اس کا گھوڑا ماروی کے اتنے قریب سے گزرا تھا کہ وہ لڑکھڑا کر زمین پر گر پڑی تھی۔

مرینہ اور تابعدار اپنی لینڈ کروزر میں آ کر بیٹھ گئے۔ وہ اسٹارٹ ہو کر تیزی سے آگے بڑھی۔ لیکن ٹیکسی کے پاس سے گزرنے کے لیے رفتار ذرا سست کرنی پڑی وہاں چاچی اور چاچا زمین پر بیٹھے ہوئے ماروی کو سنبھال رہے تھے۔ اچھی طرح سانس لینے کے لیے اس کے چہرے سے نقاب ہٹا دی تھی۔

یہی وہ وقت تھا' جب شناسائی ہوئی۔ مرینہ نے ادھر سے گزرتے ہوئے ایک نظر عبا والی پر ڈالی تو ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ سوکن دکھائی دی تھی۔ وہ چیخ کر بولی۔ "گاڑی روکو۔"

اس کے رُکتے ہی وہ پھرتی سے دروازہ کھول کر باہر دوڑتی ہوئی آئی پھر ماروی کے پاس آ کر رک گئی۔ وہ زمین پر اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ اسے قریب سے دیکھ کر یقین ہوا کہ ماروی ہی ہے تو وہ خوشی کے مارے قہقہے لگانے لگی۔

اس نے ایک ہی بار اسے جیل میں دیکھا تھا۔ جب وہ مراد سے ملاقات کرنے آئی تھی اور اسے دیکھ کر بڑی سنگدلی سے یہ فیصلہ کیا تھا کہ مراد سے اس کی وہ آخری ملاقات ہوگی۔ پھر کبھی وہ اپنے عاشق سے ملنے نہیں پائے گی۔

اس فیصلے پر عمل کرنے کا موقع ہاتھ آ گیا تھا۔ وہ ابھی اسے گولی مار کر ایک بہت بڑی دیوار گرا سکتی تھی۔

ہاں کون اسے روک سکتا تھا؟

یہ وہی بدنصیب سوکن تھی۔ جس کی خاطر وہ پچھلی رات اسے دھوکا دے کر فرار ہوا تھا۔

اور جس کی خاطر ٹھکرا کر گیا تھا' وہ اس کے ہتھے چڑھ گئی تھی۔

وہ مارے خوشی کے قہقہے لگا رہی تھی۔ قہقہوں کے دوران مست ہو کر ادھر سے ادھر ڈگمگا رہی تھی۔ وہاں سب کے سب اسے حیرانی سے اور سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس بات پر پاگلوں کی طرح ہنس رہی ہے۔

اس کے تابعداروں نے پہلے کبھی ماروی کو نہیں دیکھا تھا۔ اگر انہیں معلوم ہوتا کہ یہ وہی ہے۔ جس کے خاطر مراد ان کی میڈم کو ٹھکرا کر گیا ہے تو وہ اس کی خوشیوں کو سمجھ لیتے کہ سوکن اس کے ہاتھوں مرنے آ گئی ہے۔

ماروی حیران تھی۔ پریشان ہو کر سوچ رہی تھی کہ وہ کون ہے اور اسے دیکھ کر کیوں اس طرح ہنس رہی ہے؟

چاچی نے پوچھا۔ "اے بیٹی! تم کون ہو؟ تم خدا کی رحمت ہو۔ تم نے ڈاکوؤں سے ہمیں بچایا ہے۔ کیا تم ہمیں جانتی ہو؟ اس طرح کیوں ہنس رہی ہو؟"

وہ ہنستے ہنستے یکلخت چپ ہو گئی۔ کوئی بات اچانک ہی ذہن میں آئی تھی۔ وہ ماروی کو چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگی۔ پھر اس کی نگاہوں سے سنجیدگی جھلکنے لگی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ان سے دور جا کر ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ گئی۔ سر جھکا کر سوچنے لگی۔

چاچا نے ان تابعداروں سے پوچھا۔ "یہ کون ہے۔ ہماری بیٹی کو دیکھ کر کیوں ہنس رہی تھی۔ اب اچانک کیوں سے چپ ہو گئی ہے۔ دور جا کر بیٹھ گئی ہے؟"

ایک تابعدار نے کہا۔ "ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ میڈم کو کیا ہو گیا ہے۔ یہ لندن سے آئی ہیں۔ وہاں کی ایک بہت بڑی پولیس افسر ہیں اور یہاں کراچی کی جیل میں جو بڑے جیلر صاحب ہیں' ان کی بیٹی ہیں۔"

کراچی جیل کی بات پر ماروی نے چونک کر اس تابعدار کو دیکھا۔ دل نے دھڑک دھڑک کر کہا۔ "وہاں میرا مراد ہے۔"

چاچی نے ان سے کہا۔ "ہمارا ہونے والا داماد وہاں جیل میں ہے۔ بیچارے پر قتل کا جھوٹا الزام ہے۔"

ان تابعداروں کو معلوم تھا کہ مراد پر قتل کا جھوٹا الزام ہے اور مرینہ اس پر عاشق ہو کر اسے جیل سے نکال لائی ہے۔

ایک تابعدار نے پوچھا۔ "تمہارے داماد کا نام کیا ہے؟"

چاچا نے کہا۔ "مراد..."

ان تینوں نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر ایک نے ماروی کو دیکھا' سوچا پھر اس کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔ "کیا اس کا نام ماروی ہے؟"

چاچی نے کہا۔ "ہاں۔ تم اس کا نام کیسے جانتے ہو؟"

وہ تینوں جواب میں بہت کچھ بول سکتے تھے۔ لیکن میڈم کا موڈ اور مزاج سمجھے بغیر کچھ کہہ نہیں سکتے تھے۔ اس وقت اس کا موڈ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ پہلے تو خوش ہو رہی تھی۔ پھر سنجیدہ ہو کر دور جا کر بیٹھ گئی تھی۔

وہ جو آندھی طوفان کی رفتار سے مراد کو پکڑنے جا رہی تھی۔ وہ اچانک تھم گئی تھی۔ اب جلدی نہیں تھی۔ دماغ میں یہ بات آئی تھی کہ ماروی اس کی مٹھی میں رہے گی تو مراد خود ہی کھنچا چلا آئے گا۔

وہ ان سب سے دور جا کر اس بات پر غور کر رہی تھی کہ ماروی کو مار دیا جائے یا زندہ رکھا جائے؟

وہ کئی پہلوؤں سے سوچ رہی تھی۔ ایک پہلو یہ تھا کہ اس کے زندہ رہنے سے مراد اسی کے پیچھے بھاگتا رہے گا۔ مجھے پلٹ کر بھی نہیں دیکھے گا۔

اگر مر جائے گی تو مراد کچھ دنوں کے بعد اسے بھول کر میری طرف مائل ہو جائے گا اور اگر اسے بھول نہیں پائے گا اور اگر اسے معلوم ہو جائے گا کہ میں نے ماروی کو مار ڈالا ہے تو پھر کبھی میرا یار نہیں بنے گا۔ میری جان کا دشمن بن جائے گا۔

اور اگر میں اسے زندہ رہنے دوں۔ اسے کہیں چھپا کر قیدی بنا کر صرف اس کی آواز مراد کو سناتی رہوں تو وہ ماروی کی سلامتی کے لیے ہمیشہ میرا غلام بنا رہے گا۔

اور میں یہی چاہتی ہوں کہ ایسا غضب ناک شہزور مرد میرا غلام بن کر رہے۔

اور یہی مناسب ہے وہ اپنی معشوقہ کی سلامتی کی خاطر مجھ سے دور نہیں بھاگے گا۔ میں جو کہتی رہوں گی وہ کرتا رہے گا۔

اس نے سر اٹھا کر دور چاچی کے پاس کھڑی ہوئی ماروی کو دیکھا۔ پھر بڑی ناگواری سے کہا۔ "بچ گئی۔ اسے زندہ رکھنا ہی ہوگا۔"

اس نے فون نکال کر جیلر باپ سے رابطہ کیا پھر کہا۔ "ہیلو مائی ڈیئر سویٹ پاپا!"

وہ بولا۔ "بیٹی! کہاں ہو تم؟ کیا مراد کو پکڑ لیا ہے۔"

"سمجھیں کہ پکڑ لیا ہے۔ ماروی میرے ہاتھ آ گئی ہے۔ آئندہ یہ میرے شکنجے میں رہے گی تو سمجھ لیں کہ وہ میرے قدموں میں لوٹتا رہے گا۔"

"ہوں۔ پھر تو تم اس کے پیچھے نہیں بھاگو گی وہ تمہارے پیچھے ہاتھ باندھے آتا رہے گا۔"

"پاپا! آپ نے کہا تھا کہ کوئی وڈیرا آپ کا دوست ہے۔ اِدھر کسی علاقے میں اس کی نجی جیل ہے۔ وہاں درجنوں عورتیں اور مرد قید بامشقت جھیلتے رہتے ہیں۔"

"اچھا تو تم چاہتی ہو ماروی کو وہاں قیدی بنا کر رکھا جائے۔"

"یس پاپا...!"

"نو پرابلم۔ میں وڈیرے سے بات کرتا ہوں۔ انتظار کرو۔ ابھی تمہیں کال کروں گا۔"

وہ فون بند کر کے انتظار کرنے لگی۔ ایک تابعدار نے آ کر کہا۔ "میڈم...! آپ جلد سے جلد مراد تک پہنچنا چاہتی تھیں۔ کیا ہم چل رہے ہیں؟"

"نہیں۔ اب جلدی نہیں ہے۔ تم تینوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں ماروی تک پہنچ گئی ہوں۔ وہ جو لڑکی وہاں عبا پہنے ہوئے ہے' وہی ماروی ہے۔"

"جی ہاں۔ ہم نے باتوں ہی باتوں میں معلوم کیا ہے۔"

اس نے چونک کر اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔ "کیا اسے مراد کے بارے میں بتایا ہے؟"

"نو میڈم۔ ہم انجان بن گئے ہیں۔"

"شاباش۔ جاؤ۔ میں ابھی ایک ضروری کال اٹینڈ کر کے آؤں گی۔ انہیں باتوں میں الجھائے رکھو۔"

وہ ماروی اور چاچی کی طرف چلا گیا۔ پندرہ منٹ بعد باپ نے فون پر کہا۔ "وڈیرے سے بات ہوئی ہے۔ میں نے اسے بتایا ہے کہ تم کیا چاہتی ہو۔ وہاں تمہارا مقصد پورا ہو جائے گا۔ وہ میرے بہترین دوستوں میں سے ہے۔"

''اس کا نام بتائیں؟''

''اس کا نام شاہ میاں ولی ہے۔ اپنے علاقہ کا بادشاہ ہے۔ سرکاری پولیس اس کی نمک خوار ہے۔ آج تک کسی بھی حکمران کے دور میں اس کی نجی جیل پر چھاپا نہیں پڑا۔ وہاں ماروی تک مراد اور محبوب تو کیا قانون کے محافظ بھی نہیں پہنچ پائیں گے۔''

''آپ اس کا پتا اور فون نمبر بتائیں۔ میں ابھی اس وڈیرے سے بات کروں گی۔''

باپ نے پتا اور فون نمبر بتایا۔ اس نے وڈیرا شاہ میاں ولی سے رابطہ کیا پھر کہا۔ ''انکل! میں دلاور جان کی بیٹی مرینہ بول رہی ہوں۔ ابھی پاپا نے آپ سے بات کی ہے۔''

''ہاں بیٹی! ابھی تمہارے باپ نے بتایا ہے۔ تم کوئی شکار پھانس کر لارہی ہو اور وہ ایک بہت ہی خوبصورت جوان لڑکی ہے۔ میں تمہیں خوش آمدید کہتا ہوں۔ کب آرہی ہو؟''

''اس وقت میں سبّی کے قریب ہوں۔ آپ بتائیں ابھی شام کے پانچ بجے ہیں۔ یہاں سے چلوں گی تو وہاں تک کتنے گھنٹوں میں پہنچ پاؤں گی۔ میرے پاس لینڈ کروزر ہے۔''

وہ بولا۔ ''اندازاً دس گھنٹے کے اندر پہنچ جاؤ گی۔''

''ٹھیک ہے۔ میں آرہی ہوں۔''

اس نے رابطہ ختم کرکے دور ماروی کی طرف دیکھا پھر پتھر سے اتر کر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اس کے سامنے آگئی۔ ماروی نے تینوں تابعداروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ابھی ان سے معلوم ہوا ہے کہ تم جیلر صاحب کی بیٹی ہو۔ اسی جیل میں میرا مراد سزا پارہا ہے۔''

مرینہ نے کہا۔ ''میں جانتی ہوں۔ لیکن تم نہیں جانتیں کہ وہ جیل سے فرار ہوگیا تھا۔''

وہ پریشان ہوکر بولی۔ ''نہیں۔ وہ جیل سے کیسے بھاگ سکے گا۔ وہ تو بہت ہی سیدھا سادا سا ایک غریب اور کمزور آدمی ہے۔''

وہ طنزیہ انداز میں بولی۔ ''ہاں وہ کتنا سیدھا اور کمزور ہے۔ یہ میں جانتی ہوں۔ جیل میں چند بدمعاش قیدی اسے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔''

''یہ ہوسکتا ہے وہاں خطرناک مجرم ہوتے ہیں۔ وہ اسے اپنے ساتھ لے گئے ہوں گے۔''

مرینہ نے کہا۔ ''وہ جیل سے بھاگنے کے بعد پولیس سے تو بچ گیا لیکن ایک وڈیرے کے شکنجے میں آگیا ہے۔ کہتے ہیں نا کہ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا تو وہ اس وقت اس وڈیرے کی ایک جیل میں آرام فرمارہا ہے۔''

''وہ جیل کہاں ہے؟''

''یہاں سے پتا نہیں کتنی دور ہے۔ اس جگہ کا نام جام تھارو ہے۔ میں مراد کو ڈھونڈنے یہاں تک آئی تھی۔ مجھے ابھی معلوم ہوا ہے کہ وہ جام تھارو میں پکڑا گیا ہے۔ وہاں کے وڈیرے نے اسے اپنی نجی جیل میں ڈال دیا ہے۔ میں وہاں جارہی ہوں۔ اس سے ملنے کی کوشش کروں گی۔''

ماروی نے تڑپ کر کہا۔ ''میں بھی جاؤں گی۔ یا اللہ... ! یہ میرے مراد کے ساتھ کیا ہورہا ہے؟ پہلے اسے جھوٹے الزام میں جیل بھیجا گیا۔ اب اسے زبردستی جیل سے بھگا کر کسی وڈیرے کے پاس پہنچادیا گیا ہے۔''

چاچی نے کہا۔ ''مجھے یقین نہیں آرہا ہے۔ کیا مراد سے فون پر بات ہوسکتی ہے۔''

مرینہ نے کہا۔ ''پہلے وڈیرے سے جا کر ملوں گی۔ وہ اپنے فون کے ذریعہ اس سے بات کرانے پر راضی ہوگا تو تم چاچی بھتیجی اس سے باتیں کرسکو گی۔''

ماروی نے کہا۔ ''چاچی! ہمیں جانا ہوگا۔ نہیں تو میں اس کے لیے سوچ سوچ کے مرتی رہوں گی۔''

مرینہ نے کہا۔ ''میری گاڑی میں بیٹھو اور چلو۔ دیر نہ کرو۔''

وہ چاچی کے ساتھ لینڈ کروزر میں آکر بیٹھ گئی۔ مرینہ نے تابعداروں سے کہا۔ ''تم میں سے ایک گاڑی ڈرائیو کرے گا۔ باقی ماروی کے چاچا کو لے کر اس ٹیکسی میں ساتھ ساتھ چلو۔''

پھر اس نے جلال احمد سے کہا۔ ''ہمیں جہاں تک لے جاسکتے ہو۔ لے چلو۔ جو بھی معقول معاوضہ ہوگا۔ تمہیں ملے گا۔''

وہ قافلہ وہاں سے روانہ ہوگیا۔ مرینہ ڈرائیو کرنے والے تابعدار کے ساتھ اگلی سیٹ پر تھی۔ پچھلی سیٹ پر ماروی اور چاچی تھیں۔ باقی افراد پیچھے ٹیکسی میں آرہے تھے۔

☆☆☆

ابھی وہ سب گردش میں تھے۔ مراد بھی گردش سفر میں تھا۔ وہ گھوڑے کی پیٹھ سے اتر کر ٹرین میں سوار ہوا تھا اور سبّی تک گیا تھا۔ وہاں سے بس یا رکشا ٹیکسی میں ریتی کی طرف جانا تھا۔

اس نے سبّی کے ایک ہوٹل میں پہنچ کر غسل کیا۔ پھر روٹی کھانے کے دوران ہوٹل کی کھڑکی سے باہر بازار کی رونق دیکھنے لگا۔ قریب ہی ایک آٹو پارٹس کی دکان میں فار سیل کی ایک تختی لگی ہوئی تھی۔ ایک موٹر سائیکل پندرہ ہزار میں فروخت کی جارہی تھی۔

وہ لقمہ چباتے ہوئے سوچنے لگا۔ مجھے گاڑی کی سخت ضرورت ہے۔ اگرچہ میں چلا نہیں سکتا۔ لیکن موٹر سائیکل چلانا تو بہت آسان ہے۔ ایک دن میں سیکھ جاؤں گا۔

وہ فار سیل کی تختی کو دیکھ کر اپنے آپ سے بولا۔ ''اسے خرید لینا چاہیے؟ کوشش کروں گا تو سیکھ لوں گا۔ جب بندوق چلانا سیکھ گیا ہوں تو اسے بھی چلانا آجائے گا۔''

وہ کھانے کے بعد آٹو پارٹس کی دکان میں آیا۔ وہاں ایک موٹر سائیکل کھڑی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر بولا۔ ''اگر اس میں کوئی خرابی نہیں ہے تو ابھی خرید لوں گا۔''

دکاندار نے کہا۔ ''اے ون گاڑی ہے۔ صرف چھ مہینے چلائی ہے۔ پیسوں کی بہت ضرورت ہے اس لیے بیچ رہا ہوں۔''

اس نے کہا۔ ''خرید تو لوں گا۔ لیکن مجھے چلانا نہیں آتا ہے۔ کیا تمہارا کوئی آدمی مجھے چلانا سکھا سکتا ہے؟''

''میرا سالا ابھی سکھا دے گا۔ اس کے ساتھ بازار کا ایک راؤنڈ مارو گے تو چلانا آجائے گا۔''

وہ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ ''اگر تمہارا سالا مجھے سکھاتا ہوا ریتی تک جائے گا تو میں پانچ ہزار زیادہ دوں گا۔''

وہ خوش ہوکر بولا۔ ''ضرور جائے گا۔ اس کے ساتھ ریتی تک چلاتے جاؤ گے تو ایکسپرٹ ہوجاؤ گے۔''

اس نے آواز دے کر سالے کو بلایا۔ مراد نے انہیں بیس ہزار دیے۔ وہ بولا۔ ''گاڑی تمہارے نام کرنے کے کاغذات آج نہیں' کل تک ملیں گے۔''

''مجھے کاغذات کی جلدی نہیں ہے۔ اپنے پاس رکھو گے۔ کسی دن آکر لے لوں گا۔''

اس کے سالے کا نام رمضان تھا۔ رمضان اس کے پاس آکر گاڑی کو سڑک پر لاکر بتانے لگا کہ اسے کس طرح اسٹارٹ کرتے ہیں اور چلاتے ہیں۔ کس طرح گیئر بدلتے ہیں اور ضرورت کے مطابق رفتار بڑھاتے گھٹاتے ہیں۔

وہ اس کی ہدایات کے مطابق چلانے لگا۔ رمضان گاڑی کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا گائڈ کرنے لگا۔ پھر اس کے پیچھے آکر بیٹھ گیا۔ وہ ریتی کی طرف جانے لگے۔

وہ کبھی کبھی غلطیاں کرنے کے باوجود بڑے اعتماد سے گاڑی چلا رہا تھا۔ ریتی پہنچنے تک اسے راہنمائی کی ضرورت نہیں رہی۔ وہاں اس نے مخی چاچی کی بہن اور بہنوئی کے نام لیے تو اس چھوٹی سی بستی میں اسے مطلوبہ دروازے تک پہنچادیا گیا۔

ماروی نے کہا تھا کہ وہ چاچی اور چاچا کے ساتھ اسی گھر میں رہنے آئے گی۔ لیکن وہاں نہیں تھی۔ چاچی کی بہن نے کہا۔ ''یہاں رہو۔ ہوسکتا ہے مخی آج کل میں آجائے۔''

ماروی ان کے ساتھ کئی دن پہلے نکلی تھی۔ اسے وہاں پہنچنا چاہیے تھا۔ پھر کیوں نہیں پہنچی...؟

کیا کہیں رک گئی ہے یا بدنصیبی نے پھر اس کے آگے رکاوٹیں پیدا کردی ہیں؟

مصیبتیں تو پوچھے بغیر آتی جارہی تھیں۔

اس نے میزبان خاتون سے کہا۔ ''میں دوسرے راستوں سے بھٹکتا آرہا ہوں۔ چاچی دوسرے راستے سے آرہی ہوگی۔ اب اس دوسرے راستے سے میں دور تک جاؤں گا اور دیکھوں گا کہ وہ تینوں کہاں رہ گئے ہیں۔''

پھر اس نے سوچ کر کہا۔ ''اگر وہ میرے جانے کے بعد آئیں گے تو آپ مجھے فون پر اطلاع دے سکیں گی۔''

''ہم غریب ہیں۔ یہاں بستی میں صرف ایک اسکول ماسٹر کے پاس فون ہے۔''

مراد نے کہا۔ ''میرے پاس بھی نہیں ہے۔ اور یہ بہت ضروری ہے۔ آج ہی خریدوں گا۔''

اس نے اسکول ماسٹر سے ملاقات کی۔ وہ بولا۔ ''میرا بیٹا دبئی میں ہے۔ اس نے یہ فون دیا ہے۔ ہم کبھی کبھی اس پر باتیں کرتے ہیں۔ یہاں بجلی نہیں ہے۔ بیٹری ری چارج کرانے اور بیلنس ڈالنے کے لیے سبّی جاتا ہوں۔''

مراد نے اس کا فون نمبر لکھ کر کہا۔ ''میں اپنا فون خرید کر آپ سے بات کروں گا۔ آپ ایک مہربانی کریں یہاں جب بھی میرے رشتے دار آئیں گے تو آپ فوراً مجھے فون پر اطلاع دیں گے۔ میں آج ہی آپ کے نمبر پر اپنا فون نمبر بھیجوں گا۔''

اسکول ماسٹر نے اور چاچی کی بہن نے یقین دلایا کہ اسے فوراً ہی اطلاع دی جائے گی۔

اسے کچھ دیر وہاں آرام کرنا چاہیے تھا۔ لیکن آرام حرام ہوگیا تھا۔ اسے دیکھے بغیر اسے پائے بغیر نہ نیند آسکتی تھی۔ نہ بھوک لگ رہی تھی۔ کیا معشوق تھی، دوڑائے جارہی تھی۔

اس نے سبّی واپس آکر ایک فون خریدا پھر اسکول ماسٹر کو اپنا نمبر Send کردیا۔ یہ وہی گدھا گاڑی والا تھا جو تین وقت کھاتا تھا۔ وہ جوڑے لباس میں خوش رہتا تھا اور ماروی کی محبت اسے سرشار رکھتی تھی۔

آج اسی ماروی کی محبت میں اس نے موبائل فون خریدا جو پہلے غیر ضروری تھا۔ موٹر سائیکل چلانا سیکھ گیا اور تو

اور بارود اور لہو سے کھیلنا بھی آ گیا تھا۔

اس کا دل کہتا تھا کہ ماروی چاچی کے ساتھ ادھر ضرور آئے گی۔ راستے میں ہوگی یا کسی شہر یا قصبے میں ضرور تا رُک گئی ہوگی۔ وہ اس راستے پر واپس جانے لگا جو ریلوے لائن کے ساتھ کبھی قریب ہو کر جاتا تھا۔ کبھی بہت دور ہو جاتا تھا۔

اس نے بہت دور آنے کے بعد موٹر سائیکل کی رفتار دھیمی کردی۔ آگے سڑک کے آس پاس تین لاشیں دکھائی دے رہی تھیں۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں مرینہ اپنے تابعداروں کے ساتھ آئی تھی۔ انہوں نے چار گھڑسوار ڈاکوؤں کو ہلاک کیا تھا پھر ماروی، چاچی اور چاچا کو وہاں سے لے گئے تھے۔

اس نے گاڑی روک دی۔ دو لاشیں سڑک سے دور تھیں۔ تیسرا سڑک کے کنارے پڑا تھا۔ ابھی لاش میں تبدیل نہیں ہوا تھا۔ بری طرح زخمی تھا۔ مراد کو دیکھتے ہی تکلیف سے کراہتے ہوئے بولا۔ ”پانی...!“

اس نے موٹر سائیکل سے اترتے ہوئے پوچھا۔ ”کون ہو تم لوگ؟ یہاں کس نے گولیاں چلائی ہیں؟“

وہ گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے بولا۔ ”ایک عورت تین مردوں کے ساتھ لینڈ کروزر میں آئی تھی۔“

وہ فوراً ہی اس کے اور قریب آکر زمین پر گھٹنے ٹیک کر بولا۔ ”وہ عورت کدھر گئی ہے؟ کیا وہ تم لوگوں سے کسی ایسے شخص کا پتا پوچھ رہی تھی جو میرے جیسا ہو؟“

”وہ ایک قیدی کی بات کر رہی تھی جو کراچی جیل سے فرار ہو کر جام تمارو میں پکڑا گیا ہے۔“

وہ ٹھہر ٹھہر کر ہانپتے ہوئے بول رہا تھا۔ ”یہاں ایک بوڑھا ایک بوڑھی ایک جوان لڑکی کے ساتھ ٹیکسی میں تھے۔ اس بوڑھی نے کہا۔ کراچی جیل میں اس کا ہونے والا داماد ہے۔ اس نے اس کا نام مراد بتایا تھا۔“

ایک دم سے مراد کے دماغ میں روشنی کا جھماکا سا ہوا۔ ہائے...! جانِ حیات ماروی دکھائی دے رہی تھی۔

چاچی ختی نے اسے ہونے والا داماد کہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”وہ لڑکی اپنے بزرگوں کے ساتھ کدھر گئی ہے؟“

”وہ عورت انہیں جام تمارو لے گئی ہے۔“

”جام تمارو کدھر ہے۔ جلدی بولو۔“

وہ اٹک اٹک کر سانس لیتے ہوئے بولا۔ ”پانی...!“

اس نے فوراً ہی بیگ میں سے پانی کی بوتل نکالی۔ اس کا جسم ہولے ہولے جھٹکے کھا رہا تھا۔ اس کا منہ ذرا سا کھل گیا تھا۔ مراد نے بوتل کھول کر اس کے منہ میں تھوڑا سا پانی ڈالا اس نے ایک جھٹکا کھا کر پانی کو حلق سے اتارا۔ مراد نے پوچھا۔ ”کیا یہی راستہ جام تمارو گیا ہے؟“

وہ دوسرا گھونٹ نہ پی سکا۔ اس کی گردن ڈھلک گئی۔ زندگی ایسی ہی ہوتی ہے۔ کسی وقت بھی ڈھلکا دیتی ہے۔

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

اس کے اندر اندیشے اور بے چینی بھر گئی تھی۔ ایک دشمن عورت ماروی کو لے گئی تھی۔ ایک موٹی عقل سے بھی یہ بات سمجھی جاسکتی تھی کہ نیک ارادے سے نہیں لے گئی ہے۔

ماروی کا سراغ بھی ملا تو یوں ملا کہ گلاب کانٹوں کے ساتھ ملا۔ کیا نصیب تھے کہ دوڑائے چلے جا رہے تھے۔

اس نے موٹر سائیکل پر بیٹھ کر کک ماری۔ اسے اسٹارٹ کیا پھر آگے چل پڑا۔ راستے میں کسی سے معلوم ہو جاتا کہ جام تمارو کہاں ہے؟

☆☆☆

وہ پچھلی شام سے مراد کے پیچھے دوڑ لگا رہی تھی۔ اب وہ دونوں جام تمارو جاتے وقت ایک ہی راستے پر تھے۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ جس کے پیچھے لگی ہوئی ہے اب وہ اس کے پیچھے آرہا ہے۔

وہ مرینہ سے تقریباً پچاس کلومیٹر پیچھے تھا پھر یہ کہ ایک سیکنڈ ہینڈ موٹر سائیکل پر دوڑ رہا تھا۔ تیز دکی طوفانی رفتار کو نہیں پکڑ سکتا تھا۔ سوچ رہا تھا۔ آگے جا کر گاڑی بدلنا ہوگی۔

آگے جا کر کیا ہونے والا ہے یہ دونوں نہیں جانتے تھے۔ مرینہ فی الحال مطمئن تھی۔ ماروی اس کے ہاتھ آگئی تھی۔ یقین تھا کہ مراد اس کی خاطر گھٹنے ٹیکنے ضرور آئے گا۔

وہ گاڑی کی اگلی سیٹ پر بیٹھی تیز رفتاری سے چلی جا رہی تھی۔ اس نے سر گھما کر پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی ماروی کو دیکھا۔ پھر فون پر باپ سے کہا۔ ”ماروی میرے ساتھ گاڑی میں ہے اور میری باتیں سن رہی ہے۔ ہم مراد سے ملنے جام تمارو جا رہے ہیں۔ اسے اب بھی پوری طرح یقین نہیں ہے کہ مراد ایک جیل سے فرار ہو کر دوسری جیل میں پہنچ گیا ہے۔ ہم اسے ابھی یقین دلا سکتے ہیں۔“

”کیسے یقین دلانا چاہتی ہو؟“

ماروی اور چاچی یہ باتیں سن رہی تھیں لیکن پچھلی سیٹ سے جیلر باپ کی باتیں سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ مرینہ نے کہا۔ ”پاپا! یہ فون پر مراد سے باتیں کرے گی تو اسے یقین آجائے گا۔“

باپ نے پوچھا۔ ”مراد کہاں ہے؟ یہاں تو محبوب ہے۔“

”میں چاہتی ہوں۔ ماروی کو معلوم ہو جائے کہ کون کہاں ہے؟ وہ فون پر بولے گا۔ اسے یقین دلائے گا کہ

مراد جیل میں نہیں ہے۔ تب میری یہ بات سچ ہوگی کہ مراد جیل سے نکل کر وڈیرے کے چنگل میں آگیا ہے۔“

”ہاں اس طرح ماروی کو یقین ہو جائے گا کہ اس کے دونوں عاشق کن حالات سے گزر رہے ہیں۔“

”یہ مجھ پر شبہ نہیں کرے گی۔ مطمئن ہو کر میرے ساتھ مراد سے ملنے جائے گی۔“

وہ بولا۔ ”میں ابھی محبوب کے سیل میں ملنے جا رہا ہوں۔ انتظار کرو۔ ماروی سے اس کی بات کراؤں گا۔“

رابطہ ختم ہو گیا۔ مرینہ نے پچھلی سیٹ کی طرف گھوم کر کہا۔ ”تم ہماری باتیں سن رہی تھیں۔ میرے پاپا کوشش کر رہے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر میں تم مراد سے باتیں کر سکو گی۔“

ماروی نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”خدا کا شکر ہے۔“

☆☆☆

وہ سب ہی ایک دوسرے کے ساتھ خوب تماشا کر رہے تھے۔ سمیرا اور معروف تجلی نے محبوب اور مراد کو یہ معلوم نہیں ہونے دیا تھا کہ انہوں نے ماروی کو ان سے دور کیا ہے۔

محبوب نے سمیرا اور معروف سے یہ چھپایا تھا کہ وہ مراد کی جگہ جیل میں پہنچ گیا ہے اور مراد سے یہ حقیقت چھپائی تھی کہ وہ اس کی جگہ قیدی بن گیا ہے۔

مرینہ نے بھی مراد کو یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ کتنی آسانی سے اسے محبوب بنا کر سپاہیوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر جیل سے باہر لے آئی تھی۔

اب مرینہ ماروی کو یہ نہیں بتا رہی تھی کہ مراد اسے تلاش کرنے کے لیے اسی علاقے میں کہیں آیا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی ماروی تک پہنچے وہ اسے دھوکا دے کر ایک وڈیرے کی جیل میں لے جا رہی تھی۔

جیلر نے سیل میں آکر محبوب سے کہا۔ ”بہت بڑی خوش خبری سنا رہا ہوں۔ ماروی زندہ ہے۔“

اس نے پوچھا۔ ”آپ کو کیسے معلوم ہوا؟“

”تمہیں بھی معلوم ہو جائے گا۔ جب یہاں سے نکل کر باہر جاؤ گے تو پورے ایک لاکھ روپے لوں گا اور ابھی فون پر اس سے باتیں کراؤں گا۔“

وہ خوشی سے اچھل پڑا دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ تیزی سے چلتا ہوا قریب آکر آہنی سلاخوں کو تھام کر بولا۔ ”میں ایک لاکھ سے زیادہ دوں گا۔ کیا واقعی وہ زندہ ہے۔ میں اس سے باتیں کروں گا۔ یا خدا میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں؟“

”پہلے یہ سوچ لو اور سمجھ لو تمہیں کیا کہنا ہے؟ وہ تم سے

کترنیں

ایک فلاسفر نے کیا خوب کہا ہے، انسان کی پہچان اس کی خوب صورتی، لباس، خاندان، تعلیم اور دولت سے نہیں ہوتی، اگر انسان کسی چیز سے پہچانا جاتا ہے تو وہ صرف اس کا اپنا ”شناختی کارڈ“ اس لیے ہمیشہ اپنا شناختی کارڈ اپنے پاس رکھیے۔

اثرانگیز

ایک بزرگ آدمی کی آنکھوں کا آپریشن ہوا، ڈاکٹر نے سجدہ کرنے سے روکا اور 14 دن تک اشارے سے نماز پڑھنے کو کہا۔ بزرگ نے کھانا پینا چھوڑ دیا۔ ایک دو دن تو گھر والوں نے سمجھا شاید روٹی چباتے ہوئے آنکھوں کو تکلیف ہوتی ہوگی۔ کچھ دنوں بعد انہوں نے پوچھ ہی لیا کہ ڈاکٹر نے تو سجدہ کرنے سے منع کیا ہے نا کہ کھانا کھانے سے۔

بزرگ نے بہت ہی خوب صورت جواب دیا کہ جس کو سجدہ نہ کرسکوں اس کا رزق کھاتے ہوئے شرم آتی ہے۔

مرسلہ۔ رضوان تنولی گریڈی، اورنگی ٹاؤن، کراچی

باتیں کرے گی تمہیں مراد سمجھے گی۔“

”میں تو یہاں مراد ہی ہوں۔ اسے بھی یہی کہوں گا۔“

”نہیں۔ تم محبوب ہو۔ اسے سچ بتاؤ گے۔“

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ ”یہ مناسب نہیں ہوگا۔“

”کیوں مناسب نہیں ہوگا۔ اسے سچ معلوم ہونا چاہیے۔“

”اسے یہ معلوم ہوگا کہ مراد مجھے سزائے موت پانے کے لیے اپنی جگہ چھوڑ گیا ہے تو وہ ماروی کی نظروں سے گر جائے گا۔“

”یہ تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔ وہ کمتر ہو جائے گا۔ تم برتر ہو جاؤ گے۔ وہ تمہاری ہو جائے گی۔“

”سچ یہ ہے کہ مراد نے مجھے یہاں نہیں پہنچایا ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ میں اس کی جگہ سزا پا رہا ہوں۔ وہ انجان ہے معصوم ہے۔ میں جھوٹ بول کر ماروی کا دل نہیں جیتوں گا۔“

وہ گھور کر بولا۔ ”تم کیا ہو محبوب؟ اس کے لیے دولت لٹا رہے ہو۔ اونچی سوسائٹی میں جو عزت اور شہرت ہے۔ اسے خاک میں ملا رہے ہو۔ تم نے اس کے لیے لہو بہایا ہے۔ مرتے مرتے بچے ہو۔ اب مرنے کے لیے یہاں

آئے ہو۔ یہ سب اس کی طلب میں کر رہے ہو۔ اور اب جھوٹ بول کر وہ آسانی سے مل رہی ہے تو اسے حاصل کرنے سے کترا رہے ہو۔''

''میں اسے سچے ایمان سے اور پیار کی سچائی سے حاصل کروں گا ورنہ نہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ تمہاری مرضی۔ مگر اسے یہ ضرور بتاؤ کہ وہ جیل سے باہر اسے تلاش کرنے گیا تھا لیکن دشمنوں نے اسے پکڑ کر جام تھارو کے ایک نجی جیل میں پہنچا دیا ہے۔''

محبوب نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ''کیا واقعی؟ کیا مراد کسی نئی مصیبت میں پھنس گیا ہے؟''

''ہاں۔ تم جانتے ہو مرینہ اسے کس مقصد کے لیے لے گئی تھی۔ وہ اسے دل و جان سے چاہتی ہے اور وہ اسے دھوکا دے رہا ہے۔ میری بیٹی بھی پاگل ہو گئی ہے۔ اسے پانے کے لیے چوبیس گھنٹوں سے بھاگتی بھٹکتی پھر رہی ہے۔''

''وہ مراد کو کسی وڈیرے کی جیل سے کیسے چھڑا کر لائے گی؟''

''تم ابھی فون پر ماروی سے بولو کہ مرینہ سے تعاون کرے۔ اس کے ساتھ جام تھارو جائے۔ وہاں وڈیرے سے سمجھوتا کیا جائے گا۔ اسے منہ مانگی رقم دی جائے گی۔''

''آپ فون پر بات کرائیں۔ بے چارہ مراد کسی نہ کسی مصیبت میں پھنستا ہی رہتا ہے۔''

جیلر ولاور جان نے فون پر بیٹی سے کہا۔ ''ماروی کو فون دو۔ اس سے بولو مراد سے باتیں کرے۔''

محبوب نے کہا۔ ''آپ پھر مجھے مراد کہہ رہے ہیں۔''

''میں تو کہوں گا۔ تم قیدی نمبر سات سو سات ہو۔ اسے حقیقت تم بتاؤ۔''

اس نے فون محبوب کو دیا۔ اسے کان سے لگاتے ہی ماروی کی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو مراد...!''

کئی دنوں کے بعد گمشدہ آواز سنائی دی تو وہ سیدھی دل میں جا کر دھڑکنے لگی۔ وہ محبت سے سرشار ہو کر خوشی سے مست ہو کر بولا۔ ''اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ ماروی! تم زندہ ہو۔ سلامت ہو۔ میں خدا کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے۔ مجھے نئی زندگی مل رہی ہے۔ تم کہاں گم ہو گئی تھیں؟''

''میں کیا بتاؤں؟ بولنے کے لیے بہت کچھ ہے۔ مرینہ کہتی ہے کہ میں صرف ضروری باتیں کروں۔ میں تمہارے پاس آ رہی ہوں۔ تم کسی وڈیرے کی جیل میں بند ہو گئے ہو نا؟''

محبوب نے کہا۔ ''میں نہیں مراد وہاں قیدی بن گیا ہے۔''

ماروی نے چونک کر فون کو دیکھا پھر کہا۔ ''ہاں مجھے کچھ ایسا لگا تھا کہ میں مراد سے نہیں آپ سے باتیں کر رہی ہوں۔ آپ کے لیے دولت کچھ بھی نہیں ہے۔ آپ پر خدا کی رحمت ہو۔ آپ مراد کو وہاں سے چھڑا کے لے آئیں۔''

''انشا اللہ اسے وہاں سے رہائی ملے گی۔ لیکن ابھی میں اپنا ایک پیسا بھی کام میں نہیں لا سکتا۔ ایک چیک بھی نہیں لکھ سکتا کیونکہ مراد کی جگہ جیل میں سزا کاٹ رہا ہوں۔''

وہ حیرانی سے بولی۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

وہ بولا۔ ''یہ یقین کرنے والی بات نہیں ہے۔ مگر تم یقین کرو ماروی...! میں نے کبھی تم سے جھوٹ بات نہیں کی۔ اس وقت بھی تم سے سچ کہہ رہا ہوں۔''

''کیا آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ مراد آپ کو سزا بھگتنے کے لیے جیل میں چھوڑ کر گیا ہے؟''

''نہیں ماروی! مراد خود غرض اور مطلب پرست نہیں ہے۔ وہ جان دیدے گا لیکن کبھی مجھے کسی مصیبت میں نہیں ڈالے گا۔ میں نے ایسی چال چلی ہے کہ جیلر سے اور مرینہ سے معاملات طے کر کے اس کی جگہ آ گیا ہوں۔

وہ میرے اس طریقہ کار سے بے خبر ہے۔ تمہاری تلاش میں باہر چلا گیا ہے۔ میں ایک ایک بات سچ کہہ رہا ہوں۔ مراد میری اس چال سے بے خبر ہے۔ وہ بے چارہ سمجھ رہا ہے کہ تمہیں تلاش کرنے کے لیے جیل سے فرار ہوا ہے۔''

وہ ایسی باتیں ایسے حقائق سن کر الجھ رہی تھی۔ پریشان ہو کر بولی۔ ''آپ لوگ کیا چکر چلا رہے ہیں۔ کیسی چالیں چل رہے ہیں۔ میں الجھ رہی ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔

آپ مراد کی جگہ آ گئے۔ مراد دوسری جیل میں بند ہو گیا ہے۔ آپ نے ایسا کیوں کیا ہے؟''

''تمہاری خاطر کیا ہے۔ تمہارے اغوا ہونے کے بعد سب ہی کو یقین ہو رہا تھا کہ تمہیں ہلاک کر دیا گیا ہے۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ تمہارے پاس دوسری دنیا میں جانا چاہتا تھا۔

اس کا ایک ہی راستہ تھا کہ تمہارے لیے جان دینا ہے تو ہم شکل ہونے کا فائدہ اٹھاؤں۔ مراد کو ممکنہ سزائے موت سے بچا کر اس کی جگہ لے کر تمہارے پاس آ جاؤں۔''

ماروی کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ عشق میں ایسی دیوانگی اس نے سنی تھی۔ دیکھی نہیں تھی۔ وہ بے اختیار بولی۔ ''ایسا پاگل تو دنیا میں کوئی نہ ہوگا۔''

وہ یکبارگی روتے ہوئے بولی۔ ''آپ کے جنون

نے آپ کی دیوانگی نے تو مجھے جکڑ لیا ہے۔ محبت کے ایسے شکنجے میں کس لیا ہے کہ اب کبھی نکل نہیں پاؤں گی بلکہ نکلنا ہی نہیں چاہوں گی۔''

وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر رو رہی تھی۔ آنسوؤں کو روکنے کی کوششیں کر رہی تھی۔ محبوب نے کہا۔ ''چپ ہو جاؤ۔ آنسو پونچھ لو۔ تم زندہ سلامت ہو۔ اب میں زندگی کی طرف لوٹ آنے کے لیے مقدمہ جیتنے کے لیے دن رات ایک کر دوں گا۔''

وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ ''میرے محبوب...! میں پہلی بار آپ کو میرے محبوب کہہ رہی ہوں۔ وعدہ کریں۔ آپ اپنی ماروی کی خاطر جیت کر باہر آئیں گے۔''

وہ مسرتوں سے بھر گیا تھا۔ ماروی نے کتنی قربانیوں کے بعد اسے بڑے پیار سے بڑے جذبے سے میرے محبوب کہا تھا۔ وہ خوشی سے کانپتے ہوئے بولا۔ ''انشا اللہ آؤں گا۔ اب تو میں تمام دولت اور جائداد کو داؤ پر لگا کر یہ مقدمہ جیت کر جلد ہی تمہارے پاس آؤں گا۔''

''وعدہ کریں میرے مراد کو بھی جیل سے نکال لائیں گے۔''

''وعدہ کرتا ہوں۔ جب مقدمہ جیت لوں گا تو ہم دونوں ہی تمام شکنجوں سے نکل آئیں گے۔''

پھر اس نے کہا۔ ''ماروی! یہ جیلر صاحب مجھ سے فون لے رہے ہیں۔ میری ایک بات مانو جام تھارو میں مراد سے مل کر کراچی آ جاؤ۔ میری سیکیورٹی میں رہو۔''

''اب میں آپ کی ہر بات مانوں گی۔ مراد سے جا کر ملوں گی۔ پھر اس کے ساتھ کراچی آؤں گی۔''

اسے جواب نہیں ملا۔ وہ بولی۔ ''ہیلو...؟''

جیلر کی آواز سنائی دی۔ ''فون مرینہ کو دو۔ میری بیٹی کے ساتھ جام تھارو جاؤ۔ وہاں اپنے مراد سے مل سکو گی۔''

اس نے فون مرینہ کو دیا۔ وہ اسے کان سے لگا کر بولی۔ ''تھینک یو پاپا! میں ماروی کی باتیں سن رہی تھی اور اُدھر کے جوابات سمجھ رہی تھی۔''

وہ کن انکھیوں سے ماروی کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''فی الحال اتنا ہی کافی ہے کہ ماروی کو ہم پر اعتماد ہو گیا ہے۔''

اس نے فون بند کیا۔ ماروی نے کہا۔ ''آپ بہت اچھی ہیں۔ میں آپ پر اعتماد کر رہی ہوں۔''

مرینہ فاتحانہ انداز میں مسکرانے لگی۔ ادھر محبوب نے جیلر سے کہا۔ ''ماروی نے زندہ ہو کر مجھے دنیا کا سب سے خوش نصیب انسان بنا دیا ہے۔ میں خوب خوشیاں منانا جشن منانا چاہتا ہوں۔ پلیز آپ ابھی معروف صاحب سے میری بات کرائیں۔ اب انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں یہاں

بااصول

ایک ادبی رسالے کا اصول تھا کہ اس میں جس قلم کار کے افسانے شائع ہوتے تھے انہیں باقاعدہ معاوضہ دیا جاتا تھا۔ ایک قلم کار نے اس رسالے کو اپنے بہت سے افسانے بھیجے۔ مگر اس کی کوئی بھی کہانی رسالے کی زینت نہ بن سکی۔ اس صورتِ حال سے ادیب بہت افسردہ ہوا اور تنگ، ایک دن رسالے کے دفتر جا پہنچا۔ رسالے کے ایڈیٹر نے اسے ایک افسانے کے مساوی معاوضہ پیش کر دیا۔

ادیب بہت خوش ہوا۔ اس نے ایڈیٹر سے پوچھا کیا میرا کوئی افسانہ شائع ہونے کے لیے منتخب ہو گیا۔ ایڈیٹر نے جواب دیا۔ ''نہیں! آپ کا کوئی بھی افسانہ قابلِ اشاعت نہیں ہے۔ یہ رقم تو وہ ہے جو ردی میں آپ کے افسانے فروخت کر کے حاصل ہوئی ہے۔''

مرسلہ: حسنین عباس، کمیل عباس، گلیانہ روڈ کھاریاں

ہوں۔ وہ دنیا کے بڑے بڑے وکیلوں کی خدمات حاصل کر کے مجھے یہاں سے نکال لے جائیں گے۔''

وہ بولا۔ ''بے شک یہی ہوگا۔ مسٹر معروف کو بھی سب کچھ معلوم ہونا چاہیے اور آپ مجھے بھی بہت کچھ دیں گے۔ لیکن ذرا صبر کریں۔ بارہ گھنٹے بعد آپ جو چاہیں گے وہ ہوگا۔''

''بارہ گھنٹے بعد کیوں؟''

''ہماری کچھ مجبوریاں ہیں۔ ماروی دس بارہ گھنٹوں میں جام تھارو پہنچے گی۔ اس کے بعد ہی اصل صورتِ حال سامنے آئے گی۔ پھر ہم بھی سوچیں گے آپ بھی سوچیں گے کہ ہم نے کیا کیا ہے اور اب آپ کو کیا کرنا چاہیے؟''

اس کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ محبوب اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ بڑی مکاری سے مسکراتا ہوا وہاں سے چلتا ہوا جیل کے دوسرے حصے میں آیا۔ پھر اس نے فون پر وڈیرا شاہ ولی سے کہا۔ ''سائیں! میری بیٹی آ رہی ہے۔ ماروی کو ساتھ لا رہی ہے۔ میں تمہیں یہ بتا دوں کہ وہ لڑکی ایک ارب پتی بزنس مین کی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور ہے۔''

وڈیرے نے کہا۔ ''یہ آنکھوں کا نور دل کا سرور تو شاید بیٹی کے لیے کہا جاتا ہے۔''

"اگر بیٹی کے لیے کہا جاتا ہے تو آپ سے گزارش ہے کہ اسے بیٹی بنا کر وی آئی پی ٹریٹمنٹ دیں۔ اس کے دونوں عاشق سر پھرے ہیں۔ ایک اپنی دولت سے مارتا ہے۔ دوسرا بارود سے کھیلنے والا خطرناک کھلاڑی بن گیا ہے۔"

"اگر وہ ایسے خطرناک ہیں تو آپ کیوں نہیں ڈرتے؟"

"میں اور میری بیٹی قانون کی چھتر چھایہ میں رہتے ہیں اور صرف قانون سے ہی نہیں مجرموں سے بھی کھیلنا جانتے ہیں۔ آپ ایک محدود علاقے میں پولیس والوں کو خرید کر حکمرانی کرتے ہیں۔ وہ دونوں پاگل ایسے سر پھرے ہیں کہ آپ کو اس علاقہ سے اٹھا کر باہر لے جائیں گے۔"

"وہ ایسے خطرناک ہیں تو لڑکی کو میرے پاس نہ لاؤ۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "ڈر گئے؟ آپ تو دعویٰ کرتے تھے کہ آپ کی اجازت کے بغیر کوئی آپ کی زمین پر قدم نہیں رکھ سکتا ہے۔ پھر وہ دونوں اُدھر کیسے آئیں گے؟"

اُدھر سے وہ قہقہہ لگانے لگا۔ جیلر نے پوچھا۔ "آپ کس بات پر ہنس رہے ہیں؟"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "آپ کے ڈرانے پر ہنسی آرہی ہے۔ ابھی یہ لکھ لیں۔ آپ کو جلد ہی معلوم ہوگا کہ میں ایک ارب پتی سے اور ایک بارود کے کھلاڑی سے کیسے کھیلوں گا اور ان دونوں سے کس طرح فائدہ اٹھاؤں گا۔"

"اچھی بات ہے۔ میں دیکھوں گا۔ فی الحال ہم یہی چاہیں کہ ماروی تمہاری جیل میں رہے اور ان دونوں کے ہاتھ نہ لگے۔"

"جو میرے ہاتھ آجاتی ہے، وہ پھر کسی کے ہاتھوں میں نہیں جاتی۔ فی الحال خدا حافظ۔"

رابطہ ختم ہوگیا۔ جیلر دلاور جان فون بند کرکے آفس کی طرف جاتے ہوئے موجودہ حالات کے ہر پہلو پر غور کرنے لگا۔

وہ باپ بیٹی بڑی حکمت عملی سے بڑی ہنرمندی سے ان تین عاشقوں کو گھیر رہے تھے۔ مرینہ اپنی سوکن کو ایک وڈیرے کے جیل میں پہنچا رہی تھی۔ محبوب اس کی سلامتی کے لیے جیل سے باہر نہیں آسکتا تھا۔ بس ایک مراد کی طرف سے اندیشہ تھا۔ وہ زنجیریں توڑنے کے بعد ہاتھ نہیں آرہا تھا۔

ویسے مرینہ نے ایسی چال چلی تھی کہ اب مراد کے بھی کس بل ڈھیلے ہونے والے تھے۔ وہ بھی ماروی کی سلامتی کے لیے اس لندن والی کے آگے گھٹنے ٹیکنے والا تھا۔

☆☆☆

سمیرا اور معروف تجلی، محبوب کو ڈھونڈ نکالنے کے لیے پانی کی طرح پیسے بہا رہے تھے۔ یہ خدشہ تھا کہ محبوب کو ماروی کی موت کی غلط اطلاع ملے گی تو وہ دیوانہ خودکشی کر لے گا۔ اسے ایسے اقدام سے روکنے کے لیے انہوں نے اخبارات اور ٹی وی چینلز کے ذریعہ اعلان کرایا کہ ماروی زندہ ہے۔ پھر انہوں نے چھوٹے چھوٹے پمفلٹ چھپوائے۔ پمفلٹ میں یہ لکھوایا۔ "میرے محبوب! تمہاری ماروی زندہ ہے۔ واپس آجاؤ۔"

انہوں نے ان پمفلٹس کو ملک کے ہر صوبے، ہر شہر اور گاؤں دیہاتوں میں پھیلا دیا۔ یہ امید تھی کہ محبوب جہاں بھی ہوگا۔ اسے پڑھ کر واپس آجائے گا۔

وہ کاغذی تحریر دنیا کے ہر حصے میں پہنچ رہی تھی۔ صرف پڑھنے والے کے پاس جیل کے اندر نہیں آسکتی تھی۔ وہ جو اتنی محنت کر رہے تھے اور رقم ضائع کر رہے تھے، اس کا خاطرخواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوسکتا تھا۔

پھر حالات ایک نئے موڑ پر آگئے تھے۔ محبوب کو جیل کی چار دیواری کے اندر ہی ماروی کی خیریت معلوم ہوگئی۔ اس سے فون پر باتیں بھی ہوگئیں۔ اب وہ جیل سے باہر نکلنے کے لیے تڑپ رہا تھا۔ ماروی نے وعدہ کیا تھا کہ وہ کراچی واپس آکر پھر اس کی پناہ میں رہے گی اور وہ اسے نئے سرے سے پناہ دینے کے لیے فی الحال سمیرا اور معروف تجلی سے رابطہ کرنا چاہتا تھا۔

اس کے چاہنے سے کیا ہوتا؟ وہ جیل میں جیلر کا محتاج تھا اور جیلر نے اسے بارہ گھنٹے کے لیے ٹال دیا تھا۔ ایک قیدی کی مجبوری تھی وہ دل پر پتھر رکھ کر بارہ گھنٹے گزار رہا تھا۔

ویسے حالات بدل رہے تھے۔ قتل کا مقدمہ کمزور ہونے والا تھا۔ حشمت جلالی نے عدالت میں جب سے زلیخا کی آواز فون پر سنی تھی۔ تب سے پریشان تھا، گھبرایا ہوا تھا۔ کبھی یقین ہو رہا تھا کہ زلیخا زندہ ہے اور اسی نے فون پر بات کی ہے۔ کبھی بڑی شدت سے یہ شبہ ہوتا تھا کہ یہ فراڈ ہوسکتا ہے۔ دشمنوں کی چال ہوسکتی ہے کسی عورت نے زلیخا بن کر اسے خوف اور اندیشوں میں مبتلا کیا ہے۔

اس نے اپنے وکیل سے بات کی۔ اسے زلیخا کے فون کے متعلق بتایا۔ وہ بھی سن کر الجھ گیا۔ اس نے کہا۔ "اس فون کال سے دو ہی باتیں ذہن میں آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ فراڈ ہے۔ دوسرا یہ کہ فراڈ نہ ہوا اور وہ دوسری پیشی کے دن سچ مچ عدالت میں حاضر ہوگی تو یہ مقدمہ آپ کے خلاف ہوجائے گا۔

وہ حاضر ہوکر بیان دے گی کہ مراد نے نہ اس کے زیورات چرائے ہیں نہ اس سے زیادتی کی ہے۔ یوں مراد کے سر سے قتل اور چوری کا الزام ٹل جائے گا۔ اسے الزامات سے بری کر کے عزت کے ساتھ رہا کر دیا جائے گا۔

پھر آپ پر الزام آئے گا کہ کھیتوں میں پائی جانے والی لاش کو آپ نے بیٹی کیوں کہا؟ کیوں تیزاب سے اس کا چہرہ بگاڑا گیا۔ آپ نے نہیں بگاڑا تو کس نے بگاڑا؟ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکے گا کہ کسی بے قصور مقتولہ کو زلیخا ثابت کرنے کے لیے ہی اس پر تیزاب پھینکا گیا تھا۔"

حشمت جلالی کو پسینا آنے لگا۔ وکیل نے کہا۔ "اگر بیٹی واقعی زندہ ہے تو وہ عدالت میں آکر آپ پر کاروکاری کا الزام لگائے گی۔ یہ بیان دے گی کہ باپ اور بھائی کے خوف سے وہ فرار ہوگئی تھی۔"

رابعہ وکیل کی باتیں سن رہی تھی۔ اس نے حشمت سے کہا۔ "میں نے جب سے سنا ہے کہ اس نے آپ کو فون کیا ہے اور وہ زندہ ہے۔ تب سے خدا وند کریم کا شکر ادا کر رہی ہوں۔ اس کی زندگی کی اور سلامتی کی دعائیں مانگ رہی ہوں۔"

حشمت نے کہا۔ "اس کا مطلب ہے۔ میری تباہی اور موت کی دعائیں مانگ رہی ہو۔"

"آپ کے خلاف دعائیں نہ مانگوں تب بھی بیٹی کی واپسی آپ کو جیل کی چار دیواری میں پہنچا دے گی۔"

اس ایک فون کال نے باپ کو اور دونوں بیٹوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ گیہوں کے ساتھ گھن پس جاتا ہے۔ وہ بھی باپ کے ساتھ پس جانے والے تھے۔

فی الحال دوسری پیشی تک سوچنے سمجھنے کا بہت وقت تھا۔ انہیں کسی ایک بات کو ماننا تھا کہ زلیخا زندہ ہے یا نہیں ہے؟

اگر زندہ ہے تو کیا اس مقدمہ سے بھاگنا ہوگا؟

ابھی کسی نتیجہ پر پہنچنے کا وقت تھا۔ رابعہ کی یہ تدبیر کامیاب رہی تھی۔ وہ تینوں باپ بیٹے اس کی واپسی پر بھی یقین کر رہے تھے، کبھی انکار کر رہے تھے۔ اور انکار کرنے کے باوجود بے اختیار اسے تصور میں دیکھنے لگتے تھے۔

ایک رات تو حشمت جلالی نیند سے چونک کر اٹھ بیٹھا۔ پہلی بار بیٹی اسے خواب میں دکھائی دی تھی۔ وہ کمرے کی نیم تاریکی میں آنکھیں پھاڑے ایک سمت تک رہا تھا۔ اسے اپنوں سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ اس نے کبھی پیدا کرنے والے ماں باپ کو خواب میں نہیں دیکھا تھا۔ البتہ مجرا کرنے والیوں کو دیکھتا رہا تھا۔ اس رات پہلی بار بیٹی نے اسے بڑبڑا دیا تھا۔

وہ خواب اس کے ذہن کو جھنجوڑ کر کہہ رہا تھا کہ وہ زندہ ہے۔ تب ہی خواب میں آئی ہے۔ ورنہ آج سے پہلے کیوں نہیں آئی تھی؟ وہ خواب نہیں تھا۔ ایک وارننگ تھی۔

رابعہ تو اپنے اس مجازی خدا سے بری طرح تپ گئی تھی۔ پتا نہیں کیوں ایسے شوہر اپنے نام کے ساتھ خدا کا نام لے آتے ہیں۔ خدا نہیں بن پاتے تو مجازی خدا کہلا کر خوش ہوتے ہیں اور سینے پر مونگ دلتے رہتے ہیں۔

جب سے اس نے کھانے میں زہر ملاتے دیکھا تھا۔ تب سے سوچ رہی تھی۔ وہ کمبخت وڈیرا مر ہی جائے تو اچھا ہے۔

اس کے سوچنے سے وہ مر نہیں سکتا تھا۔ اس لیے وہ سچ مچ اسے مار رہی تھی۔ وہ دونوں بڑی راز داری سے ایک چھت کے نیچے زہریلا کھیل کھیل رہے تھے۔ حشمت رابعہ کی نظریں بچا کر اس کے کھانے میں زہر کا ایک قطرہ ٹپکاتا تھا۔ وہ بھی اس کی لاعلمی میں اس کے کھانے کو زہریلا کرنے لگی تھی۔

رشتے زہر بن جائیں تو اسی طرح آہستہ آہستہ ایک دوسرے کو مارتے ہیں۔ کبھی زبان کے زہر سے اور کبھی سچ مچ عداوت کے زہریلے عمل سے..... حشمت جلالی نے رابعہ کو سلو پوائزن دینے کی پہل کی تھی۔ رابعہ بچ گئی تھی۔ اب یہی چال اس پر الٹا رہی تھی۔

وہ پچھلے پندرہ دنوں سے زہریلا کھانا کھا رہا تھا۔ رفتہ رفتہ کمزوری محسوس کرنے لگا تھا۔ یہ نہیں جانتا تھا کہ آگے چل کر اور زیادہ کمزور ہونے والا تھا۔

جو گڑھا اس نے رابعہ کے لیے کھودا تھا۔ اس میں گر چکا تھا۔ ایک دن اس پر مٹی ڈالی جانے والی تھی۔

ڈاکٹر نے اس کی لیبارٹری رپورٹ پڑھی تھی اور کہا تھا خون میں کمی ہو رہی ہے۔ اس نے کمی پوری کرنے کی دوائیں دی تھیں۔ اسے خون بڑھانے والی غذائیں اور پھل کھانے کو کہا تھا اور وہ لاعلمی میں اپنی کرنی کا پھل کھا رہا تھا۔

رابعہ اس کا پیچھا چھوڑنے والی نہیں تھی۔ جب تک وہ جی رہا تھا۔ تب تک اس کی ہر سانس کو بوجھل کر دینا چاہتی تھی۔ اپنا کلیجا ٹھنڈا کرنے کے لیے مزید تدابیر سوچتی رہتی تھی۔

پھر ایک تدبیر سوجھی۔ اس نے اپنے داماد سے فون پر کہا۔ "پتا نہیں تم سعودی عرب سے کب آؤ گے۔ فی الحال ایک سی ڈی میں میری مرحوم بیٹی کی چلتی پھرتی تصویریں بھیجو اور زلیخا کی طرف سے ایک خط لکھو کہ وہ بیمار ہے۔ طبیعت سنبھل جائے گی اور جمال کو چھٹی ملے گی تو وہ پاکستان آکر

اپنے ظالم باپ اور بھائیوں سے نمٹ لے گی۔"

اس کے داماد جمال نے یہی کیا۔ اس کے پاس مرحوم بیوی کی کئی ویڈیو فلمیں تھیں۔ اس نے ان ویڈیوز میں سے خاص خاص سین ایک سی ڈی میں ٹرانسفر کرائے۔ ایک الگ ویڈیو فلم تیار کی پھر رابعہ کے نام ایک خط لکھا۔

"میری پیاری امی...!

ہم عورتیں کیا ہیں...؟

باپ، بھائی اور شوہروں کے لیے محض کھلونا ہیں۔ یہ اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے ہمیں بیاہ کر لاتے ہیں پھر ہماری جوانی نچوڑ لینے کے بعد غیر ضروری سامان کی طرح بے حسی کے اسٹور روم میں ڈال کر بھول جاتے ہیں۔

ہم وڈیروں کے خاندان میں پیدا ہو کر کاروکاری کے الزام میں مار ڈالی جاتی ہیں۔ میرے ظالم باپ اور بے غیرت بھائیوں نے مجھے بھی مار ڈالنے کی کوششیں کی تھیں۔ خدا کا شکر ہے آپ کی دعاؤں نے مجھے بچالیا۔

میں جمال کے ساتھ ایک خوش نصیب سہاگن بن کر مسرتوں سے بھرپور زندگی گزار رہی ہوں۔ آپ میری ویڈیو فلم میں میری ہنستی کھیلتی زندگی کی جھلکیاں دیکھیں۔ مارنے والوں سے اوپر وہ بچانے والا قوی ہے مہربان ہے۔

ابھی آپ دیکھ رہی ہیں تو میری گود میں آپ کا نواسہ نظر آئے گا۔ دیکھیں کتنا خوبصورت اور چنچلا ہے۔ بالکل مراد لگ رہا ہے۔ اپنے باپ پر گیا ہے۔

میرے مجازی خدا جمال کہتے ہیں کہ یہ مراد کی امانت ہے۔ اگر وہ اجازت دے گا تو ہم اسے کلیجے سے لگا کر رکھیں گے۔ ورنہ اس کی امانت اسے سونپ دیں گے۔

میں جلد ہی جمال کے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔ زچگی سے فارغ ہوتے ہی پاکستان آؤں گی۔ اپنے بچے کے باپ کو جھوٹے مقدمے میں سزائے موت پانے نہیں دوں گی۔ بھری عدالت میں باپ اور بھائی کہلانے والے دشمنوں کا پول کھول دوں گی۔

پچھلے ڈھائی برسوں سے خاموش رہی۔ سوچا تھا ان دشمنوں کو معاف کردوں گی آخر باپ اور بھائی ہیں۔ لیکن انہوں نے مراد کو، میرے بچے کے باپ کو مقدمہ میں پھنسا کر یہ سمجھا دیا ہے کہ وہ آئندہ میرے تمام بچوں سے بھی دشمنی کرتے رہیں گے۔

فقط آپ کی بیٹی... زلیخا۔"

حشمت جلالی ایک دن کے لیے شہر سے گوٹھ میں آیا ہوا تھا۔ اسی دن کوریئر سروس سے ایک پیکٹ حویلی کے پتے پر آیا۔ اس نے اسے کھول کر ایک سی ڈی اور لفافے کو دیکھا پھر لفافے سے خط نکال کر پڑھا تو بیٹھے بیٹھے لرز گیا۔

اس نے فوراً ہی کمپیوٹر کو آن کیا۔ پھر اسے آپریٹ کیا تو سی ڈی کے ذریعہ اسکرین پر زلیخا چلتی پھرتی دکھائی دی۔ جسے خواب میں چلتے پھرتے دیکھا تھا، وہ سچ مچ آنکھوں کے سامنے متحرک تھی۔

اس کا سر گھومنے لگا۔ ثبوت آنکھوں کے سامنے تھا کہ بیٹی زندہ ہے۔ اسی نے خط لکھا ہے اور اسی نے چار دن پہلے فون کیا تھا۔

اس وڈیرے کی حالت قابلِ دید تھی۔ بیٹی اس کے اندر گھس کر کلیجہ نوچ رہی تھی۔ وہ کسمسا رہا تھا۔ بار بار پہلو بدل رہا تھا۔

وہ اسی وقت گاڑی میں بیٹھ کر شہر کی طرف بھاگا۔ اس نے فون پر رابعہ کو اور دونوں بیٹوں کو بتایا کہ زلیخا کسی شک و شبہ کے بغیر زندہ ہے۔ وہ ثبوت لے کر آرہا ہے۔ بڑے بیٹے برکت نے پوچھا۔ "ایسا کیا ثبوت مل گیا ہے کہ آپ ڈر گئے ہیں۔ بھاگے چلے آرہے ہیں۔ خود کو سنبھالیں۔ آرام سے آئیں۔"

اس نے کہا۔ "ثبوت دیکھو گے تو بولنا بھول جاؤ گے۔ وکیل نعیم درانی سے بولو آج رات آٹھ بجے ہماری کوٹھی میں آئیں۔ یا ہم ان کے آفس میں جائیں گے۔ میں شام تک کراچی پہنچ رہا ہوں۔"

ادھر دونوں بیٹوں کے دماغوں میں ہلچل مچ گئی تھی۔ رابعہ اندر سے خوش تھی اوپر سے پریشانی بھی ظاہر کر رہی تھی اور بیٹی کی زندگی کا ثبوت ملنے پر خوشی کا بھی اظہار کر رہی تھی اور یہ تو جانتی ہی تھی کہ جو خط آیا ہے اس میں کیا لکھا ہے اور اس نے کس طرح ایک مجرم باپ کو دہلا دیا ہے۔

پچھلے چھ دنوں سے ایک وقت کے کھانے میں زہر کا ایک قطرہ اس کے اعصاب کو کمزور بناتا جارہا تھا۔ وہ جسمانی طور سے کمزور ہوتا جارہا تھا۔ اب دماغ پر ہتھوڑے پڑ رہے تھے۔

وکیل نعیم درانی نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ زلیخا کبھی واپس نہ آئے، جو کھیتوں میں ماری گئی ہے وہی زلیخا ثابت ہوتی رہے۔ ورنہ اس کا بگاڑا ہوا چہرہ ثابت کرے گا کہ اسے زلیخا بنانے کے لیے اس پر تیزاب پھینکا گیا تھا اور اب وہ سب جیتی جاگتی زلیخا کا وجود آنکھوں کے سامنے اسکرین پر دیکھنے والے تھے۔ وہ اگلی پیشی میں اسکرین سے نکل کر عدالت میں آنے والی تھی۔

اس نے کراچی پہنچ کر رابعہ کو بیٹوں کو اور وکیل درانی کو اس کی متحرک تصویریں دکھائیں۔ اس کا خط پڑھایا۔ وکیل نے اسے پڑھ کر اور اسکرین پر زلیخا کو دیکھ کر کہا۔ "اب کوئی دوسری رائے نہیں ہوسکتی۔ یہ مقدمہ آپ ہار چکے ہیں۔"

وکیل نے جیسے عدالتی فیصلہ سنا دیا۔ اس نے کہا۔ "اب ہلاک ہونے والی فرضی زلیخا کا مقدمہ آپ کے گلے پڑے گا۔ اُدھر مراد جیل سے باہر آئے گا۔ اِدھر آپ اندر جائیں گے چونکہ مرڈر کیس ہے اس لیے میں آپ کو ضمانت پر رہا نہیں کراسکوں گا۔"

حشمت نے دونوں بیٹوں کو دیکھا پھر بڑے اعتماد سے کہا۔ "یہ میرے دو مضبوط بازو ہیں۔ مجھے ہتھکڑیاں لگنے نہیں دیں گے۔ ان میں سے کوئی میری جگہ جیل جائے گا۔"

وہ دونوں اچھل پڑے۔ "ہم کیوں سزا پانے جائیں گے؟ ہم نے کیا کیا ہے کہ سزا پائیں گے؟"

حشمت نے کہا۔ "شرم کرو۔ باپ کے کام آنے سے پہلے بھاگنے کی باتیں کررہے ہو۔"

رحمت نے کہا۔ "کام آنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم پھانسی چڑھنے کے لیے جیل چلے جائیں۔"

باپ نے کہا۔ "کیا تم لوگوں نے پھانسی چڑھنے کا کام نہیں کیا ہے؟ کھیتوں میں سب سے پہلے تم دونوں نے ہی وہ لاش دیکھی تھی بلکہ تمہاری آنکھوں کے سامنے ہمارے حواریوں نے رانی کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ اس وقت تو میں حویلی میں تھا۔"

برکت نے کہا۔ "حویلی میں آپ نے اس سے منہ کالا کیا تھا۔ ہم نے تو اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ موج مستی آپ نے کی اور جیل میں ہم جائیں گے؟ واہ بابا جانی شاہ...!"

رحمت نے کہا۔ "ہم کیا الو کے پٹھے ہیں؟ آپ کو پاگل دکھائی دے رہے ہیں؟"

حشمت نے کہا۔ "جیل میں جانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پھانسی پر چڑھ جاؤ گے۔ میں باہر رہ کر تمہارا مقدمہ لڑتا رہوں گا۔"

برکت نے کہا۔ "اسی طرح آپ اندر جائیں گے تو ہم آپ کا مقدمہ لڑتے رہیں گے۔"

ان باپ بیٹوں کے درمیان نفرت اور عداوت پیدا کرنے کا وقت آگیا تھا۔ رابعہ نے بیٹوں کی حمایت کرکے چنگاری بھڑکائی۔ "میرے بیٹے درست کہہ رہے ہیں۔ آپ نے میری بیٹی پر یہ الزام لگانا چاہا کہ وہ کسی یار کے ساتھ فرار ہو رہی تھی۔ اس کے یار نے چہرہ بگاڑ کر اسے مار ڈالا ہے۔ یہ سارے منصوبے آپ نے بنائے تھے۔ آپ نے ملازمہ رانی کو برباد کیا تھا۔"

وہ ناگواری سے بولی۔ "شرم کریں۔ جس کی آبرو لوٹی اسی کو بیٹی بنا کر کھیتوں میں ہلاک کرادیا۔ سارا کیا دھرا آپ کا ہے پھر میرا کوئی بیٹا جیل میں کیوں جائے گا؟"

رابعہ ایک بڑے صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ماں کی حمایت حاصل ہوتے ہی وہ دونوں اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے دائیں بائیں آکر بیٹھ گئے۔

حشمت حیرانی سے منہ کھولے انہیں دیکھ رہا تھا۔ سمجھ گیا کہ اس کے دو بازو، دو اہم سپاہی اس کے محاذ سے اکھڑ کر نئے محاذ پر ماں کی گود میں پہنچ گئے ہیں۔

اس کا سر چکرانے لگا۔ سلو پوائزن ایسے ہی وقت اپنا اثر دکھاتا تھا۔ اس نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کرلیں۔ اب ایک ہی بات سمجھ میں آرہی تھی کہ اس مقدمے سے جان چھڑائے۔ بیٹے ساتھ نہیں دیں گے تو وہ عدالتی جنگ جاری نہیں رکھ سکے گا۔

اس نے پوچھا۔ "درانی صاحب! کیا ہم زلیخا کے آنے سے پہلے مقدمہ لڑنے سے انکار کرسکتے ہیں۔ کسی بھی طرح اس مقدمے کو ختم کرسکتے ہیں؟"

وہ بولا۔ "اس کے لیے محبوب علی چانڈیو کے دست راست معروف تجلی سے بات کرنی ہوگی۔ وہ سمجھوتا کرنے پر آمادہ ہوگا تو معمولی سی قانونی کارروائی کے بعد یہ مقدمہ ختم ہوجائے گا۔"

رابعہ نے کہا۔ "میرا خیال ہے چانڈیو اور معروف تجلی راضی نہیں ہوں گے۔"

وکیل نے کہا۔ "راضی ہوجائیں گے۔ وہ معروف کاروباری لوگ ہیں۔ اس مقدمہ سے فوراً جان چھڑائیں گے۔ ان کا فائدہ ہی فائدہ ہے۔ وہ مقدمہ کے اخراجات سے بچیں گے اور اہم بات یہ کہ مراد کو رہائی مل جائے گی۔"

حشمت جلالی نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام کر کہا۔ "پتا نہیں! کیسی کمزوری ہے۔ دل گھبرا رہا ہے۔ درانی صاحب! آپ محبوب علی چانڈیو سے صلح صفائی کی بات کریں۔"

درانی نے کہا۔ "چانڈیو لاپتا ہے۔ اس کے اپنے لوگ اخبارات اور ٹی وی کے ذریعہ اسے تلاش کررہے ہیں۔ میں معروف تجلی سے بات کروں گا۔"

حشمت جلالی صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔ ایک ہاتھ سے اپنا سر سہلا رہا تھا۔ رابعہ نے اس کی کھوپڑی گھما دی تھی۔ وہ دو بیٹوں کے درمیان بیٹھی

زیرلب مسکرا رہی تھی۔

☆☆☆

شاہ ولی میاں کی زمین اسی کلومیٹر تک پھیلی ہوئی تھی۔اس کے باپ دادا نے جام تھارو کے نام سے ایک چھوٹا سا شہر آباد کیا تھا۔ باقی زمینوں پر دور تک آم کے باغات تھے۔آموں کی کوالٹی اتنی عمدہ تھی کہ وہ بیرونی ممالک بھیجے جاتے تھے۔اچھی خاصی آمدنی تھی۔وہ خوب کما رہا تھا۔

وہ مست ہو کر کہتا تھا۔''دولت کس لیے کمائی جاتی ہے؟''

پھر خود ہی جواب دیتا تھا۔''شراب میں بہنے کے لیے اور شباب میں ڈوبنے کے لیے...''

ایک بیوی تھی'شہزادی ثریا جو بہت ہی خوبصورت اور صحت مند تھی۔لیکن شراب کا مزہ گھر والی کے ساتھ نہیں باہر والی کے ساتھ آتا ہے۔اس لیے اس کے فارم ہاؤس میں دستور عیاشی کے مطابق باہر والیاں آتی جاتی رہتی تھیں۔

شہزادی ثریا نے سات برسوں میں تین بیٹے پیدا کیے تھے۔ایک کا نام شاہ داد میاں'دوسرے کا نام شاہ زاد میاں اور تیسرے کا شاہ ارباز میاں تھا۔دو بیٹے اپنے باپ کی زمیں اور آم کے باغات سنبھالتے تھے۔تیسرا بیٹا شاہ ارباز لندن میں رہتا تھا۔وہاں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔

وہ تین بیٹے پیدا کرنے کے دوران مرجھاتی رہی تھی۔تیسرے بیٹے کے بعد اس کے بدن میں ہڈیاں زیادہ اور گوشت کم رہ گیا تھا۔عورت ہو یا قربانی کا جانور'مرد گوشت ٹٹولتا ہے۔گوشت چباتا ہے اور ہڈیاں پھینک دیتا ہے۔

شاہ ولی میاں اپنے وعدہ کے خلاف اس پر سوکن لے آیا۔دوسری بیوی بانو عقیلہ کھلتا ہوا تازہ گلاب تھی۔بچے والی ہونے کے بعد اس پر بھی زوال آنے والا تھا۔ابھی تو حویلی میں اسی کا مان مرتبہ بڑھا ہوا تھا۔

شہزادی ثریا نے اعتراض کیا کہ سوکن کے ساتھ نہیں رہے گی۔اس بات پر جھگڑے ہونے لگے۔شاہ ولی میاں نے ایک روز اس کی پٹائی کی تو بڑے بیٹے شاہ داد میاں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا۔''یہ میری ماں ہے۔اس نے مجھے پیدا کیا ہے۔میں نے جس ہاتھ سے تیرا ہاتھ پکڑا ہے۔اس میں صرف تیرا لہو نہیں'ماں کا دودھ بھی شامل ہے۔''

وہ باپ کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے بولا۔''آئندہ امی پر نہ ہاتھ اٹھانا'نہ گالی دینا۔جوان بیٹا برداشت نہیں کرے گا۔''

وہ گہری سنجیدگی سے بیٹے کو دیکھتے ہوئے بولا۔''آج تک کسی نے میرا ہاتھ پکڑنے کی جرأت نہیں کی۔کیا تمہیں میری طاقت کا اندازہ ہے۔ابھی ایک ملازم کو اشارہ کروں گا تو وہ تمہیں گولیوں سے چھلنی کر دے گا۔''

شاہ داد میاں نے باپ کے سامنے گھٹنے ٹیک کر کہا۔''آپ جانتے ہیں۔میں موت سے نہیں ڈرتا لیکن جس طرح ماں کا احترام کرتا ہوں۔اسی طرح آپ کے آگے جھکتا ہوں۔میں آپ کا فرمانبردار ہوں اور مرتے دم تک رہوں گا۔''

اس نے متاثر ہو کر بیٹے کو دیکھا۔اس کی ماں پر ایک نظر ڈالی پھر وہاں سے پلٹ کر چلا گیا۔ماں نے آگے بڑھ کر بیٹے کو سینے سے لگایا۔وہ دروازے کی طرف دیکھ کر دھیمی آواز میں بولا۔''میں اس کے سامنے مصلحتاً جھک گیا تھا۔''

ماں نے حیرانی سے اور سوالیہ نظروں سے بیٹے کو دیکھا۔وہ بولا۔''یہ یہاں کا حکمران ہے۔لیکن یہ بوڑھا ہو رہا ہے۔حکمران مجھے ہونا چاہیے۔اپنی زمینیں نہ سہی' آم کے باغات تو میرے نام ہونے چاہئیں۔لیکن یہ تمام زمینوں پر اور آمدنی کے ذرائع پر سانپ بن کر بیٹھا ہوا ہے۔''

شہزادی ثریا بیٹے کے باغیانہ خیالات سن کر خوش ہو رہی تھی۔وہ بھی سرگوشی میں بولی۔''تدبیر کرتے رہو گے تو تقدیر بنتی رہے گی۔بڑی رازداری سے اپنے وفاداروں اور جاں نثاروں کی تعداد بڑھاتے رہو۔''

وہ ماں کا ہاتھ اپنے سر پر رکھتے ہوئے بولا۔''آپ کی دعاؤں سے یہی کر رہا ہوں۔''

وہ اس کی پیشانی کو چوم کر بولی۔''میرا بیٹا بہت سمجھ دار ہے۔بیٹے! ایک کام کرو۔یہ میری سوکن کا کانٹا دور کر دو۔''

''رہنے دیں امی! جب ابا آپ کو نہیں پوچھتا ہے۔آپ کی طرف نہیں آتا ہے تو اسے جانے دیں۔جان بھی جاتا ہے۔''

پھر وہ ماں کے کان میں بولا۔''میں آپ کی سوکن سے بھی فائدہ اٹھانے والا ہوں۔''

ماں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔وہ وہاں سے اٹھ کر دروازے کے پاس آیا۔اسے اندر سے بند کیا پھر ماں کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔بالکل قریب ہو کر سرگوشی میں بولا۔''آپ کی سوکن کی بہن نبیلہ یہاں آتی جاتی رہتی ہے۔وہ مجھے پھانس رہی ہے۔''

ماں نے غصہ سے کہا۔''بڑی بہن تمہارے باپ کو پھانس کر حویلی والی بن گئی۔چھوٹی تم پر ڈورے ڈال رہی ہے۔''

وہ بولا۔''آپ میری پوری بات سنیں۔میں جان بوجھ کر پھنس رہا ہوں۔''

"کیا...؟" ماں نے اسے حیرانی سے دیکھا۔
وہ بولا۔ "عقیلہ بڑی چالباز ہے۔ وہ ایک طرف مجھ کو اور دوسری طرف ابا کو پھانس رہی ہے۔"
"یا اللہ! اور تم دیکھ سمجھ کر بھی اس کے جال میں پھنس رہے ہو۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟"
وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "آپ سنیں تو سہی۔ آپ کی سوکن عقیلہ چاہتی ہے کہ میں اس کی بہن کا دیوانہ بن کر رہوں گا تو دونوں بہنیں ہم باپ بیٹے کے سروں پر ناچتی رہیں گی۔"
وہ ماں کو بازوؤں میں لے کر بولا۔ "اور میں ناچنے دوں گا۔ جانتی ہیں کیوں؟"
وہ ایک ذرا توقف سے بولا۔ "وہ دونوں بہنیں اتنی سر چڑھ گئی ہیں کہ ابا کے تجوری والے کمرے میں جاتی ہیں۔ اس تجوری میں زمینوں کی اور کاروبار کی اہم دستاویزات ہیں۔ کچھ ایسی دستاویزات ہیں جن سے ابا محروم ہوگا تو مشکل میں پڑ جائے گا۔ قانون کی تلوار اس کے سر پر لٹکتی رہے گی۔"
وہ بیٹے کو بڑے پیار سے دیکھ رہی تھی۔ وہ بول رہا تھا۔ "وہاں کچھ ایسے کاغذات ہیں جو اسے کئی عورتوں اور مردوں کا قاتل ثابت کرتے ہیں۔"
"یعنی اس نے خود ہی اپنے برے اعمال کا ذخیرہ اس تجوری میں سنبھال کر رکھا ہے؟"
"جی ہاں۔ ایسے کاغذات بھی ہیں جو اس کی نجی جیل کے بارے میں بہت سے راز فاش کرتے ہیں۔ میں یہ تمام دستاویزی ثبوت حاصل کروں گا۔"
ماں نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیسے حاصل کرو گے؟"
"میں نے آپ کی سوکن سے کہا ہے کہ اس کی بہن نبیلہ سے شادی کروں گا لیکن اس وقت جب وہ تجوری سے میری مطلوبہ دستاویزات چرا کر لائیں گی۔ اور دونوں بہنوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ جلد ہی ہاتھ کی صفائی دکھائیں گی۔"
اس نے بے یقینی سے پوچھا۔ "کیا وہ اتنی اہم چیزیں وہاں سے چرا کر لے آئیں گی؟"
"وہ بہت شاطر ہے۔ ابا کے ساتھ تجوری والے کمرے میں راتیں گزارتی ہے۔ وہ پینے کا عادی ہے اسے زیادہ پلاتی ہے اور اس کی مدہوشی سے فائدہ اٹھاتی ہے۔ وہ ایک رات تجوری سے ایک دستاویز نکال کر میرے پاس لائی تھی۔ وہ میرے کام کی نہیں تھی۔ واپس لے گئی۔ وہ پڑھی لکھی نہیں ہے۔ اس لیے دیر ہو رہی ہے۔ اب تک ایک ہی کام کی دستاویز ہاتھ لگی ہے۔ کوئی بات نہیں۔ رفتہ رفتہ میرے کام کے کاغذات مجھے ملتے رہیں گے۔"
"میں تمہاری کامیابی کی دعائیں مانگوں گی۔"
دوسرا بیٹا شاہ زاد بھی ماں کو بہت چاہتا تھا۔ باپ کا بھی فرمانبردار تھا۔ ثریا اور شاہ داد نے فی الحال اسے اس سنگین معاملے میں اپنا رازدار نہیں بنایا۔ تیسرا بیٹا ان سب معاملات سے دور لندن میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔
ایک ماہ کے اندر ہی اس کی سوتیلی ماں عقیلہ نے اس کے تمام مطلوبہ اہم کاغذات اسے لا کر دیے اور کہا۔ "اب وعدے کے مطابق میری بہن سے شادی کرو۔"
اس نے کہا۔ "ابا اپنی سالی سے میری شادی نہیں ہونے دے گا۔ پہلے میں نبیلہ سے چھپ کر نکاح پڑھاؤں گا پھر کچھ روز گزارنے کے بعد اس رشتے کا اعلان کروں گا۔"
"نکاح کب پڑھاؤ گے۔ کہاں پڑھاؤ گے؟"
"کل ابا لاڑکانہ جا رہا ہے۔ تم نبیلہ کے ساتھ چھوٹی حویلی میں آجاؤ۔ میں قاضی صاحب اور چند دوستوں کے ساتھ وہاں انتظار کروں گا۔"
"ایسا نہ ہو کہ تمہارا باپ اچانک واپس آجائے؟"
"نہیں آئے گا۔ اس سے نہ ڈرو۔ خوش ہو جاؤ۔ آج تمہارا سوتیلا بیٹا ہوں کل تمہارا بہنوئی بن جاؤں گا۔"
وہ بولی۔ "قاضی صاحب کو یہ رشتہ نہ بتانا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ قابل اعتراض ہو۔ وہ نکاح نہیں پڑھائیں گے۔"
"فکر نہ کرو۔ کل ہماری نئی رشتے داری ہر حال میں ہوگی۔"
وہ چھوٹی حویلی ان کی زمینوں کے ایک دور افتادہ حصے میں تھی۔ شاہ داد کا ایک ڈرائیور ان دو بہنوں کو بڑی رازداری سے وہاں لے آیا۔ حویلی کے اندر شاہ داد کے چار گن مین تھے۔ عقیلہ نے پوچھا۔ "قاضی صاحب نہیں آئے؟"
شاہ داد نے کہا۔ "آجائیں گے۔ بیٹھو اور یہ بتاؤ کہ آج نہیں تو کل ابا کو چوری کا پتا چلے گا تو اسے کس پر شبہ ہوگا؟"
عقیلہ نے کہا۔ "سب سے پہلے تم پر شبہ ہوگا۔ وہ نشے کی حالت میں مجھ سے کہتا رہتا ہے کہ اسے تم پر بھروسا نہیں ہے۔ تم اپنی اصلیت کو اندر چھپا کر رکھتے ہو اور اوپر سے فرمانبردار بن کر رہتے ہو۔ وہ صرف اپنے دو بیٹوں پر بھروسا کرتا ہے۔"
وہ بولا۔ "تم درست کہہ رہی ہو۔ ابا مجھ پر شبہ کرتا ہے لیکن وہ کبھی سمجھ نہیں پائے گا کہ میں اس کی تجوری تک کیسے پہنچا جبکہ ہم تین بیٹے کبھی اس کمرے میں نہیں جاتے اور جب وہ کہیں جاتا ہے تو اپنے کمرے کو مقفل رکھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ حویلی کے ملازم اس کے تابعدار ہیں۔ اس کی غیر موجودگی میں ہم تالا توڑنا چاہیں گے تو اسے خبر ہو جائے گی۔"

عقیلہ نے پریشان ہو کر سوچا پھر کہا۔ "وہ دو بیٹوں پر شبہ نہیں کرے گا۔ یہ سمجھے گا کہ تم نے کسی کے ذریعہ چوری کرائی ہے۔"
وہ بولا۔ "ذریعہ تو صرف تمہیں ہی بتاؤں گا کیونکہ ایک تم ہی ہو جو اس کی شراب نوشی اور مدہوشی کے دوران اس کمرے میں راتیں گزارتی رہی ہو۔"
"ہاں۔ وہ مجھ پر بھی شبہ کرے گا۔"
"تم پر بھی نہیں۔ صرف تم پر ہی شبہ کرے گا۔ تمہارے سوا کوئی وہاں قدم نہیں رکھتا ہے۔ وہ پورے یقین کے ساتھ تمہاری گردن دبوچے گا۔"
نبیلہ نے سہم کر کہا۔ "باجی کو نہ ڈراؤ۔ تم ہمارے ساتھ ہو۔ میں اس گھر کی بہو بن جاؤں گی تو ہمارا پلڑا بھاری ہوگا۔ ہم باجی پر الزام نہیں آنے دیں گے۔"
شاہ داد نے کہا۔ "الزام تو تم پر بھی آئے گا کیونکہ تم بھی دو بار اسی کمرے میں راتیں گزار چکی ہو۔"
نبیلہ چونک گئی پھر غصہ دکھاتے ہوئے بولی۔ "ابھی مجھ سے شادی کر رہے ہو اور الزام دے رہے ہو کہ میں نے تمہارے باپ کے کمرے میں راتیں گزاری ہیں۔"
وہ بولا۔ "حویلی میں میرے بھی مخبر ہیں۔ تم دونوں بہنیں جو بازاری کھیل کھیل رہی ہو وہ سب میرے علم میں ہے۔"
ان کا بھید کھل گیا تھا۔ انہوں نے پریشان ہو کر ایک دوسرے کو دیکھا پھر عقیلہ نے کہا۔ "تم میری بہن پر جھوٹا الزام لگا رہے ہو۔ یہ تمہیں دل و جان سے چاہتی ہے۔ اتنا شرمناک الزام لگاتے ہوئے تمہیں شرم آنی چاہیے۔"
شاہ داد نے آگے بڑھ کر ایک زور کا طمانچہ رسید کیا۔ پھر کہا۔ "میں ایک ہی بات جانتا ہوں۔ چوری کا پتا چلتے ہی ابا تم دونوں پر تشدد کی انتہا کرتا رہے گا۔ پھر کیا ہوگا؟"
اس نے کمرے سے جاتے ہوئے کہا۔ "پھر تم دونوں نیم مردہ ہو کر میرا نام اگل دو گی۔ بہتر ہے کہ ابھی مردہ ہو جاؤ۔"
وہ بولتا ہوا کمرے سے باہر آگیا۔ وہاں صرف گن مین رہ گئے۔ چند لمحوں کے بعد ہی دو گولیاں چلنے کی آواز سنائی دی۔ پھر خاموشی چھا گئی۔
دوسرے دن شاہ ولی میاں لاڑکانہ سے واپس آیا تو عقیلہ کو نہ پا کر ثریا سے پوچھا۔ "تمہاری سوکن کہاں گئی ہے؟"
اس نے کہا۔ "وہ میری پابند نہیں ہے۔ مجھ سے پوچھ کر نہیں جاتی۔ میں کیا جانوں کہاں گئی ہے۔"
اس نے عقیلہ کے میکے میں فون کیا۔ وہاں سے کہا گیا۔ "کل صبح دس بجے ایک پرانی سی کار آئی تھی۔ دونوں بہنیں یہ کہہ کر گئی تھیں کہ حویلی میں جا رہی ہیں۔ کیا وہاں نہیں ہیں؟"
وہ جھنجلا کر بولا۔ "کیا یہاں ہوتیں تو میں تم سے پوچھتا۔ آخر وہ کل سے کہاں گئی ہے؟"
اس نے اپنے تمام کارندوں کو فون پر حکم دیا کہ دونوں بہنوں کو تلاش کیا جائے۔ تھانے میں گمشدگی کی رپورٹ درج کرائی۔ پولیس بھی انہیں تلاش کرنے لگی۔ لیکن کسی کو ان کا نام و نشان تک نہیں مل رہا تھا۔
یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کون انہیں ایک پرانی کار میں لینے آیا تھا اور انہیں کہاں لے گیا تھا۔ وہ کار بھی کسی کو کہیں نظر نہیں آئی۔ کسی بڑے شہر کی ٹریفک میں جا کر ناقابلِ شناخت ہو گئی تھی۔
شاہ ولی میاں ایک دن وہ تجوری کھول کر ایک ضروری کاغذ تلاش کر رہا تھا۔ تب اسے معلوم ہوا کہ وہاں اس کی بہت سی اہم دستاویزات نہیں ہیں۔ اس نے پریشان ہو کر ایک ایک دستاویز پر نظر ڈالی تو انکشاف ہوا کہ اس کے خلاف ایسے ایسے ٹھوس ثبوت تجوری کے باہر چلے گئے ہیں جو اسے قانون کی گرفت میں لا کر پھانسی کے پھندے تک پہنچا سکتے ہیں۔ اس کی نجی جیل سے تعلق رکھنے والے کاغذات بھی غائب تھے۔ وہ خوف سے تھرا کر رہ گیا۔ وہ اس جیل کے پس پردہ کیا دھندا کرتا ہے یہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کا بہت ہی اہم راز طشت از بام ہونے والا تھا۔ وہ صدمہ سے زمین پر بیٹھ گیا۔ فوراً ہی ان دونوں بہنوں کی طرف دھیان گیا۔ ان کے سوا کوئی چرا ہی نہیں سکتا تھا۔
اس نے اپنے متعلق سوچا۔ "کبھی کبھی میں اتنی پی لیتا تھا کہ مدہوش ہو جاتا تھا ایسے وقت عقیلہ اور نبیلہ میرے بیگ سے چابیاں نکال کر تجوری کھول لیتی ہوں گی۔
میں نے تو کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ انہیں تجوری میں رکھے ہوئے کاغذات سے دلچسپی ہوگی۔ وہ پڑھنا لکھنا نہیں جانتی تھیں نہ کوئی کاغذ پڑھ سکتی تھیں۔ نہ ان کی اہمیت انہیں معلوم ہو سکتی تھی۔
اور وہ ان پڑھ جاہل عورتیں ایسے ہی کاغذات نے گئی

ہیں جن کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ان کاغذات سے میرے دشمن ہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔کیا وہ دونوں میرے کسی دشمن کا کام کرنے کے لیے بیوی اور سالی بن کر آئی تھیں؟"

وہ غصہ اور صدمے سے چیخ پڑا۔دونوں بیٹوں کو بلا کر کہنے لگا۔"میرے اہم کاغذات چرائے گئے ہیں۔مجھے ان غائب ہونے والی عورتوں پر شبہ ہے۔میں انہیں کہاں جا کر پکڑوں؟"

وہ دو انگلیاں دکھاتے ہوئے بولا۔"پچھلے دو ہفتوں سے ہم انہیں ڈھونڈ رہے ہیں۔پولیس بھی تھک ہار کر بیٹھ گئی ہے۔میں کیا کروں؟ ان حرام زادیوں کو کہاں جا کے پکڑوں؟"

جس مجرم کو پکڑنا چاہیے تھا۔اسی بیٹے کا بازو تھام کر بولا۔"بیٹے! کچھ کرو۔کم از کم یہ تو معلوم کرو کہ وہ ہمارے کس دشمن کے لیے کام کر رہی تھیں اور کہاں جا کے مر گئی ہیں۔ان کا نام و نشان بھی نہیں مل رہا ہے۔"

دوسرے بیٹے شاہ زاد نے کہا۔"ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے۔وہ جن کے لیے کام کر رہی تھیں۔انہوں نے ہی ان دونوں کو مار ڈالا ہے تاکہ وہ کبھی پکڑی جائیں تو ان کی نشاندہی کرنے کے لیے زندہ نہ رہیں۔"

شاہ ولی میاں نے کہا۔"میری اہم کمزوریاں دشمن کے ہاتھوں میں پہنچ گئی ہیں۔اسے تو ڈنکے کی چوٹ پر للکارنا چاہیے تھا۔وہ خاموش کیوں ہے؟ کیوں اب تک چھپا ہوا ہے؟"

شاہ داد نے کہا۔"ابھی اس کی کوئی مجبوری ہوگی یا کوئی حکمت عملی ہوگی۔وہ آپ کو چیلنج کرنے کے لیے کسی مناسب موقع کا انتظار کر رہا ہوگا۔"

اور واقعی شاہ داد کو جلدی نہیں تھی۔وہ خوب سوچ سمجھ کر باپ کی کمزوریوں سے کھیلنے والا تھا۔

شاہ ولی میاں اسی کلومیٹر تک پھیلی ہوئی زمینوں کا تنہا مالک تھا۔وہاں کا بے تاج بادشاہ تھا۔اس کے مسلح کارندوں کی ایک فوج تھی۔دشمنوں سے یا اپنی زمین پر رہنے والے باغیوں سے نمٹنے کے لیے وہ فوج گھوڑوں پر اور جیپ کاروں پر دندناتی پھرتی تھی۔

وہاں تھانہ تھا اور سرکار سے تنخواہ پانے والی پولیس شاہ والے میاں سے بھی ہر ماہ فاضل تنخواہ لے کر اس کے تمام جرائم کی پردہ پوشی کیا کرتی تھی۔

ڈاکو ہوں' قاتل ہوں یا سیاسی مجرم ہوں وہاں کسی خوف اور اندیشے کے بغیر آرام اور اطمینان سے رہتے تھے۔

جو غریب مفرور مجرم ہوتے تھے وہ شاہ ولی میاں کی ضرورت کے وقت کام آنے والے فوجی بن جاتے تھے۔اس کے لیے وارداتیں کرتے تھے پھر اسی جیل میں آکر چھپ جاتے تھے۔

شاہ داد میاں وہاں کی جیل سے' زمینوں سے اور آم کے باغات سے ہونے والی آمدنی کا زیادہ سے زیادہ حصہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔باپ اپنی زندگی میں دینے والا نہیں تھا۔اس کی صحت بتا رہی تھی کہ جلدی مرنے والا بھی نہیں ہے۔

اب یہ موقع ملا تھا' وہ باپ کی کمزوریوں سے کھیل کر اس سے منہ مانگی رقمیں وصول کرتا رہتا۔وہ باقاعدہ پلاننگ کے مطابق کام کرنے لگا۔اس نے ایک ایسے اسٹیج کے فنکار کو اچھی خاصی رقم دے کر اپنا رازدار بنایا' جو کسی کی بھی آواز کی اور لہجے کی نقالی بڑی مہارت سے کرتا تھا۔

اس کا نام کچھ اور ہوگا۔اسٹیج کے اور اپنے فن کے حوالے سے متوالا کہلاتا تھا۔شاہ داد میاں نے اسے اچھی طرح سمجھا دیا کہ وہ شاہ ولی میاں کو کب فون پر مخاطب کرے گا اور اس سے کیا بولے گا۔

اس نے ایک کاغذ پر اسکرپٹ کی طرح تمام اہم باتیں لکھ کر متوالا کو دی تھیں۔تاکہ اسے ہر بات یاد رہے اور وہ فون پر بے جھجک بول سکے۔

شاہ ولی میاں ایک روز اپنے بیٹوں کے ساتھ آم کے ایک باغ میں آیا۔وہاں متوالا کے فون نے اسے متوجہ کیا۔شاہ ولی نے بٹن دبا کر اسے کان سے لگا کر پوچھا۔"ہیلو کون ہے؟"

دوسری طرف سے بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔"بعض اوقات فولادی تجوریاں موم ہو جاتی ہیں۔نازک عورتیں انہیں کھول کر اپنا کام دکھا جاتی ہیں۔"

یہ سنتے ہی وہ بیٹوں سے بولا۔"وہ بول رہا ہے۔"

شاہ داد نے انجان بن کر پوچھا۔"کون؟"

دوسری طرف سے کہا گیا۔"اچھا تو بیٹا بھی تمہارے ساتھ ہے۔چلو اسے بھی معلوم ہو جائے گا کہ تجوری کے کاغذات کیا گل کھلانے والے ہیں۔زمینوں سے ہونے والی آمدنی کے علاوہ نجی جیل سے ہونے والی حرام کی کمائی میں بیٹے بھی باپ کے ساتھ ہیں۔باپ پھنسے گا تو بیٹے بھی پھنسیں گے۔"

شاہ ولی نے پوچھا۔"کون ہو تم؟"

"یہ بتانا ہوتا تو فون نہ کرتا۔ابھی تمہارے سامنے ہوتا۔"

"ان تمام دستاویزات کی کیا قیمت لوگے؟"

"تمام کاغذات میرے ہی پاس رہیں گے۔انہیں حفاظت سے رکھنے کا معاوضہ ایک لاکھ روپے ماہانہ لوں گا۔"

"ہر ماہ ایک لاکھ روپے کی ادائیگی مذاق نہیں

ہے۔اوقات میں رہ کر بولو۔"

"میری اوقات یہ ہے کہ میں آرمی والوں کے بہت قریب ہوں۔میں پولیس اور انٹیلی جنس والوں کو گنتی میں نہیں لاتا۔جب چاہوں گا آرمی کے جوان اس مجرمانہ جیل میں پہنچ جائیں گے۔انہیں رشوت سے خرید نہیں سکو گے۔"

وہ تینوں اس کی باتیں سن رہے تھے۔اس کی باتوں سے معلوم ہو رہا تھا کہ اسے اس جیل کے تہ خانے کا بھی علم ہے جہاں جا کر اصل مفرور مجرم چھپ جایا کرتے ہیں۔

مجرمانہ ریکارڈ رکھنے والے اکثر سیاستدان اقتدار کی کرسی سے گرتے ہی ملک سے فرار ہو جاتے ہیں۔دو برس پہلے ایک سیاستدان گرفتاری سے بچنے کے لیے کس طرح فرار ہوا تھا یہ کوئی نہ جان سکا۔وہ نہ تو ہوائی جہاز سے گیا تھا نہ بحری راستے سے۔خشکی کے راستے سے بھی اس نے سرحد پار نہیں کی تھی۔پولیس انٹیلی جنس اور آرمی والے اسے ڈھونڈتے ہی رہ گئے تھے اور وہ شاہ ولی کی جیل میں پہنچ کر عیش و آرام سے تھا۔آئندہ الیکشن میں اس کی پارٹی جیتے گی تو وہ پھر منظر عام پر سیاست کے میدان میں آسکے گا۔

متوالا فون پر بول رہا تھا۔"قومی دولت لوٹنے والا ایک اعلیٰ عہدیدار بھی وہاں چھپا ہے۔لاکھوں روپے کمانے والا ایک جعلی کمپنی کا مالک بھی وہاں آرام سے ہے۔"

شاہ ولی نے پریشان ہو کر کہا۔"چپ ہو جاؤ۔ماہانہ پچاس ہزار لو اور خاموش ہو کر بیٹھ جاؤ۔"

"ایک لاکھ سے کم نہیں لوں گا۔جو کہہ دیا وہ پتھر کی لکیر ہے۔

اس کے علاوہ وہاں میرا ایک نمائندہ دن رات رہے گا۔یوں سمجھو وہیں زندگی گزارے گا۔نجی جیل کے پاس جو تین کمروں والا مکان ہے جہاں تمہارے مسلح کارندے رہتے ہیں اسے خالی کراؤ۔میرا وہ نمائندہ وہیں رہا کرے گا۔اس نمائندے پر کسی طرح کی پابندی عائد نہیں کرو گے۔اسے نجی جیل کے گراؤنڈ فلور سے تہ خانے تک جاتے آتے رہنے کی آزادی دو گے۔اسے ذرا بھی نقصان پہنچایا جائے گا تو اس سے زیادہ نقصان تم اٹھاؤ گے۔"

"یہ مناسب نہیں ہے۔وہ نمائندہ یہاں کی تمام مصروفیات کا بھیدی بن کر رہے گا۔"

"یہی تو میرا کھیل ہے۔اس بھیدی سے تمہارے تمام بھید مجھے معلوم ہوتے رہیں گے۔"

شاہ ولی نے پوچھا۔"یہ بتاؤ' تم کب تک چھپے رہو گے؟ ماہانہ رقم کیسے وصول کرو گے؟ کوئی تو اتنی بڑی رقم لینے آئے گا۔یا ہمیں وہاں پہنچانا ہوگا۔"

"رقم پہنچانے کے لیے کہیں دور نہیں جاؤ گے میرے نمائندے کو دے دیا کرو گے پھر اس ٹوہ میں نہیں رہو گے کہ وہ رقم کس طرح کہاں پہنچاتا ہے؟"

شاہ داد کے لیے رقم حاصل کرنا آسان تھا۔پلاننگ کے مطابق وہ نمائندہ ماہانہ رقم اپنے پاس رکھتا۔شاہ داد وہاں آتا جاتا رہتا پھر موقع پا کر اس سے رقم لے جاتا۔

شاہ ولی یہ دیکھتا کہ نمائندہ وہاں رہ کر کیا کر رہا ہے؟ لیکن یہ معلوم نہیں کر سکتا تھا کہ وہ فون کے ذریعہ کہاں خبریں پہنچا رہا ہے اور اسے کہیں خبریں پہنچانے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔حقیقتاً شاہ داد باپ کے ساتھ تمام دھندے میں ملوث رہتا تھا۔وہ اندر کی ایک ایک بات جانتا تھا۔اس نے یوں ہی باپ کو الو بنانے کے لیے اس نمائندے کو مخبر بھی بنا دیا تھا۔

ایسی ٹھوس اور جامع پلاننگ کے بعد وہ پچھلے ایک برس سے ماہانہ ایک لاکھ روپے کما رہا تھا۔باپ کی کوئی اور کمزوری پکڑ کر اپنی آمدنی میں اضافہ کرنا چاہتا تھا۔ایسے ہی وقت معلوم ہوا کہ وہاں کسی ماروی نام کی لڑکی کو لایا جا رہا ہے۔

جب اس کا باپ فون پر جیلر دلاور جان سے ماروی کے متعلق باتیں کر رہا تھا تو شاہ داد وہاں بیٹھا سن رہا تھا۔ان کی گفتگو ختم ہونے کے بعد اس نے کہا۔"پہلی بار کسی لڑکی کو اس جیل میں لایا جا رہا ہے۔کیا وہ کسی معاملے میں بہت اہم ہے؟"

وہ بولا۔"جیلر میرا دوست ہے۔پرانی شناسائی ہے۔وہ کہہ رہا تھا' جلد ہی اس لڑکی سے مالی فائدہ پہنچے گا۔وہ ایک قاتل کی اور ایک ارب پتی کی معشوقہ ہے۔ارب پتی اس کی حفاظت اور سلامتی کے لیے لاکھوں کروڑوں روپے خرچ کرتا رہے گا۔اس کے برعکس وہ قاتل اپنی ماروی کی خاطر ہمارے لیے مسئلہ بن جائے گا۔"

شاہ داد یہ سن کر بے چین ہو گیا کہ ماروی کے ذریعہ کروڑوں روپے حاصل ہو سکتے ہیں۔اس نے باپ سے کہا۔"وہ لڑکی بہت قیمتی ہے۔اسے جیل میں نہ رکھا جائے ہم اسے حفاظت سے نہیں رکھیں گے۔اسے برباد کر دیں گے تو وہ ارب پتی اس کے عوض ایک پیسا بھی نہیں دے گا۔"

وہ تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔"مرینہ لندن کی ایک بہت بڑی پولیس افسر ہے۔وہ باپ بیٹی ہماری اس جیل کے بارے میں جانتے ہیں۔لیکن وہاں تہ خانہ ہے یہ نہیں جانتے۔وہ ہمارے خفیہ معاملات کو سمجھنے کی کوشش کرے گی۔اس چالباز عورت سے ہوشیار رہنا ہوگا۔"

شاہ داد کروڑوں روپے دینے والے عاشق کے معاملے میں ہوشیاری دکھانے کی سوچ رہا تھا۔ یہ چاہتا تھا کہ ماروی کو چھپا کر رکھنے کا معاوضہ باپ کی جیب میں نہ جائے۔ پورا کا پورا اس کے ہاتھ لگتا رہے۔ اس نے پوچھا۔ "اس ارب پتی کا نام کیا ہے؟"

"محبوب علی چانڈیو... فیشن انڈسٹریز کا مالک ہے۔"

شاہ داد باپ کے پاس سے اٹھ کر حویلی کے باہر آ گیا۔ اس نے فون نکال کر نمبر پنچ کیے۔ پھر اسے کان سے لگایا۔ دوسری طرف کال بیل سنائی دے رہی تھی۔ پھر ایک شناسا آواز سنائی دی۔ "ہیلو شاہ داد! کیسے ہو؟"

"بالکل ٹھیک ہوں۔ تمہارا بوتیک کیسا چل رہا ہے؟"

وہ بولا۔ "طارق روڈ پر بیٹھا ہوں یہاں فیشن سے تعلق رکھنے والے کاروبار خوب چلتے ہیں۔"

"کیا وہاں کسی فیشن انڈسٹریز کے مالک محبوب علی چانڈیو کو تم جانتے ہو؟"

"کیسے نہیں جانوں گا۔ ان کا ہی مال فروخت کرتا ہوں۔"

"تمہارا ان سے فون پر رابطہ رہتا ہوگا۔"

"بالکل رہتا ہے۔ بائی دا وے یہ اچانک تمہیں ان سے کیوں دلچسپی ہوگئی ہے؟"

اس نے دلچسپی کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ اس سے پوچھا۔ "کیا محبوب علی چانڈیو کا فون نمبر دے سکتے ہو؟"

"بھئی وہ تو بہت اونچی چیز ہے۔ ہم جیسے دکانداروں سے بات نہیں کرتا ہے۔ ہمارا رابطہ اور لین دین اس کے مارکیٹنگ منیجر سے رہتا ہے۔"

"کیا اس منیجر سے اس کا نمبر معلوم کر سکتے ہو؟"

وہ حیرانی سے بولا۔ "یار! بات کیا ہے؟ کیا اس ارب پتی کی بچھڑی ہوئی محبوبہ کو اس کے پاس پہنچاؤ گے۔"

"اچھا تو تم اس کے عشق کی داستان جانتے ہو؟"

"یہاں کون نہیں جانتا؟ پورے کاروباری حلقے میں ماروی اور محبوب کا نام گونج رہا ہے۔ سنا ہے چانڈیو اس کے عشق میں رانجھا کی طرح جوگی بن گیا ہے۔ دنیا داری چھوڑ کر اس کی تلاش میں کہیں گم ہو گیا ہے۔"

شاہ داد نے کہا۔ "میں نے بھی سنا ہے اسے ڈھونڈ کر لانے والے کے لیے لاکھوں روپے کا انعام رکھا گیا ہے۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "اچھا تو اسے ڈھونڈنے کے لیے اس کا فون نمبر چاہتے ہو۔"

شاہ داد بھی ہنستے ہوئے بولا۔ "یہی سمجھ لو۔ تجی کی کمائی میں سب کا حصہ' تمہارا بھی۔ اگر میں نے ڈھونڈ لیا اور لاکھوں روپے مل گئے تو تمہیں بھی کچھ دے ہی دوں گا۔"

اس بات پر دونوں ہنسنے لگے۔ پھر دکاندار دوست نے کہا۔ "کوئی جوگی اپنے پاس فون نہیں رکھتا۔ میں چانڈیو کے ایک بزرگ اور نگران اعلیٰ معروف تجلی کا فون نمبر بتا رہا ہوں۔ کیا ان سے بات کرو گے؟"

"ہاں۔ نمبر بتاؤ۔"

اس نے نمبر بتائے شاہ داد نے اسے فون میں لکھ لیا۔ رابطہ ختم کر کے سوچنے لگا۔ ایک ارب پتی نے اس کے عشق میں جوگ لیا ہے۔ تعجب ہے۔ وہ لڑکی کتنی حسین و جمیل ہوگی۔ اس نے تو تجسس اور بے چینی پیدا کر دی ہے۔ میں دیکھوں گا کہ کیسی ہے چند گھنٹوں میں یہاں آنے والی ہے۔

☆☆☆

سمیرا اور معروف تجلی یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ وڈیرا حشمت جلالی مقدمہ بازی سے باز آنا چاہے گا اور ان سے سمجھوتا کرنا چاہے گا۔

معروف آفس میں محبوب کی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ وکیل نعیم درّانی اس سے ملنے آیا اس نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "تعجب ہے۔ دریا الٹا بہہ رہا ہے۔ آپ کہیں بھول سے تو نہیں آ گئے...؟ آئیں۔ تشریف رکھیں۔"

وہ ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "میں بھول چوک سے بچنے کی کوششیں کرتا ہوں۔ البتہ وڈیرا حشمت جلالی صبح کا بھولا ہے شام کو گھر آنا چاہتا ہے۔"

"آپ اس بات کی وضاحت کریں۔"

"حشمت جلالی سمجھوتا کرنا چاہتا ہے۔ مراد کے معاملے کو عدالت کے باہر ختم کر دینا چاہتا ہے۔"

"وہ اچانک کافر سے مسلمان کیوں ہو رہا ہے؟"

وکیل نے کہا۔ "یہ تو اچھی بات ہے۔ آپ حضرات نیکی کریں اسے مسلمان ہونے دیں۔"

"بے شک مقدمہ بازی ختم ہوگی تو ہم بھی فضول بھاگ دوڑ سے بچیں گے۔ اپنے کاروبار پر پوری توجہ دیں گے لیکن معلوم تو ہو کہ اچانک صلح کیوں کی جا رہی ہے؟ ہم شبہ کر سکتے ہیں کہ صلح صفائی کے پیچھے بھی دشمن کی کوئی چال ہوگی۔"

"آپ ہر طرح سے اطمینان کر لیں۔ حشمت جلالی سے یا تو ملاقات کریں یا ابھی فون پر بات کریں۔ پھر آپ مطمئن ہوں گے۔ راضی ہو جائیں گے تو صلح ہو جائے گی۔"

"ٹھیک ہے آپ اس سے بات کرائیں۔"

سمیرا ایک فائل لے کر کمرے میں آئی۔ معروف نے کہا۔ "یہاں بیٹھو اور ایک چونکا دینے والی خبر سنو۔ حشمت جلالی مقدمہ ختم کرنا چاہتا ہے۔"

سمیرا نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے نعیم درّانی کو دیکھا۔ وہ فون پر کہہ رہا تھا۔ "جلالی صاحب میں درانی بول رہا ہوں۔ جیسا کہ ہمیں معلوم ہوا تھا' محبوب علی چانڈیو کہیں گئے ہیں۔ معروف تجلی صاحب ان کے قائم مقام ہیں۔ مقدمہ کے سلسلے میں ان سے ہی معاملات طے ہو سکتے ہیں۔"

اس نے تھوڑی دیر تک دوسری طرف کی باتیں سنتے رہنے کے بعد کہا۔ "ٹھیک ہے۔ میں معروف صاحب کو فون دے رہا ہوں۔ ان سے بات کریں۔"

اس نے فون معروف کی طرف بڑھایا۔ وہ اسے لے کر کان سے لگا کر بولا۔ "جی حشمت جلالی صاحب! فرمائیں۔"

حشمت نے کہا۔ "مراد کا جو مقدمہ لڑا جا رہا ہے۔ اس کے نگراں آپ ہی ہیں؟"

"جی ہاں۔ میں محبوب کے بزنس سے لے کر گھر تک کے تمام معاملات کی نگرانی کرتا ہوں۔"

"میں نے مراد پر خواہ مخواہ مقدمہ دائر کیا ہے۔ ہم ایک پیشی بھی بھگت چکے ہیں۔ آگے میں نہیں چاہتا۔ میں تھک گیا ہوں۔ یہ مقدمہ ختم ہو جائے تو ہم دونوں کے حق میں بہتر ہوگا۔"

"آپ نے اچانک اتنا بڑا فیصلہ کیوں کیا ہے؟"

"میں بہت بیمار رہنے لگا ہوں۔ میری بیماری ڈاکٹر کی بھی سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ عقل کہتی ہے' ایسی حالت میں عدالت کے چکر نہ لگاؤں۔ رقم ضائع نہ کروں۔ مجھ جیسے بیمار کو آرام اور سکون سے رہنا چاہیے۔"

"میں بحث نہیں کروں گا۔ صلح اس شرط پر ہوگی کہ آپ کی کوئی شرط نہیں مانی جائے گی۔"

"میری طرف سے لین دین کی کوئی شرط نہیں ہوگی۔"

"ٹھیک ہے پھر میں درّانی صاحب سے پوچھتا ہوں کہ اس مقدمہ کو کس طرح قانونی طور پر ختم کیا جائے گا؟"

فون کا رابطہ ختم ہوگیا۔ وکیل درانی نے کہا۔ "اسے ختم کرنے میں کوئی دردسری نہیں ہوگی۔ ہمارے اور آپ کی طرف سے صلح صفائی کی درخواست پیش کی جائے گی۔ پھر ایک ہی پیشی میں یہ کیس ختم ہو جائے گا۔"

سمیرا نے کہا۔ "یہ ثابت نہیں ہوا ہے کہ مراد نے زلیخا کو واقعی قتل کیا تھا یا نہیں؟ وہ قتل ہر حال میں جرم ہے۔ اسے قانون کیسے معاف کرے گا؟"

درانی نے کہا۔ "اگر عدالت کی طرف سے ایسا اعتراض اٹھایا جائے گا تو ہم تحریری بیان دیں گے کہ مراد کی طرف سے خون بہا کی ادائیگی ہو چکی ہے۔ تب کسی اعتراض کے بغیر مقدمہ عدالت سے خارج کر دیا جائے گا۔ مراد کو رہائی مل جائے گی۔"

معروف نے کہا۔ "ہمیں منظور ہے۔ ہمارا وکیل آج ہی آپ سے ملے گا۔ آپ دونوں کوشش کریں کہ یہ کیس جلد سے جلد ختم ہو جائے۔ بے چارے مراد کو رہائی مل جائے۔"

"جج صاحبان ایسے صلح صفائی کے معاملات عدالت سے باہر اپنے چیمبر میں نمٹاتے ہیں۔ اس کے لیے خصوصی وقت دیتے ہیں۔ ایک یا دو ہفتے میں یہ معاملہ نمٹ جائے گا۔"

وکیل نعیم درانی مصافحہ کر کے چلا گیا۔ سمیرا نے خوش ہو کر کہا۔ "یہ تو کمال ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ خصوصی مدد مل رہی ہے۔ مراد کو رہائی ملے گی تو آپ فوراً ہی ماروی سے اس کا نکاح پڑھا دیں۔ وہ اس کی شریک حیات بن جائے گی پھر محبوب صاحب اخلاقاً اس کی طلب سے باز آجائیں گے۔"

معروف نے کہا۔ "خدا کرے ایسا ہی ہو۔ اس کا عشق ختم ہو یا نہ ہو۔ کم از کم جنون ہی ختم ہو جائے اور وہ پہلے کی طرح بزنس کی طرف دھیان دینے لگے۔"

"پتا نہیں' وہ کہاں ہوں گے؟ انہیں کس طرح معلوم ہوگا کہ مراد کو رہائی ملنے والی ہے؟ جیسے ہی انہیں معلوم ہوگا' وہ ہم سے ضرور رابطہ کریں گے۔"

"ہم تو کئی ذرائع سے اسے بتاتے آ رہے ہیں کہ ماروی زندہ ہے' وہ واپس آجائے۔"

وہ کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ "تعجب ہے' وہ جہاں بھی ہے وہاں کیا ٹی وی نہیں دیکھتا ہوگا؟ اخبار نہیں پڑھتا ہوگا؟ ہمارا ایک بھی پمفلٹ اس کی نظروں سے نہیں گزرا ہوگا؟"

وہ بولی۔ "اگر ہمارا ایک بھی اشتہار ان کے سامنے آئے گا تو وہ فوراً ہم سے رابطہ کریں گے آخر وہ کہاں ہیں کہ ہماری آواز ان تک نہیں پہنچ رہی ہے؟"

وہ آہنی سلاخوں کے پیچھے تھا۔ اسے چاہنے والے اسے واپس بلانے والے کبھی یہ ناممکن سی بات سوچ ہی نہیں سکتے تھے کہ وہ مراد کی جگہ بیٹھا ہوا ہے۔ جب صلح صفائی کے نتیجے میں رہائی ملے گی تو حیرت انگیز انکشاف ہوگا کہ جیل سے باہر مراد نہیں' محبوب علی چانڈیو چلا آ رہا ہے۔

واقعی وہ دن انتہائی حیرتوں کا اور مسرتوں کا ہوگا جب وہ جیل سے باہر آئے گا۔ اس روز سمیرا اور معروف پر حیرتوں

کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں گے۔ ان کے سامنے جیسے جادو سے گمشدہ محبوب آجائے گا۔

سمیرا نے کہا۔ ”بیچارہ مراد بے قصور جیل میں پڑا ہوا ہے۔ کیا اسے خوش خبری سنائی جائے۔ وہ غریب ایسا قیدی ہے کہ اس سے ملنے والی ماروی بھی دور چلی گئی ہے۔ اسے معلوم ہوگا کہ رہائی ملنے والی ہے تو وہاں اس قیدی کی زندگی کچھ روز کے لیے آسان ہوجائے گی۔“

معروف نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ ”اس غریب سے زندگی کی مسرتیں چھین لی گئی ہیں۔ ہم اسے خوش خبری سنا کر تھوڑی سی خوشیاں دے سکتے ہیں۔“

اس نے میز پر سے فون اٹھا کر جیلر دلاور جان کے نمبر پنچ کیے۔ پھر رابطہ ہونے پر کہا۔ ”میں معروف تجلی بول رہا ہوں۔“

”جی معروف صاحب! فرمائیں کیسے یاد کیا؟“

”میں مراد سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ میں بچھڑوں کو ملانے کا نیک کام کرتا ہی رہتا ہوں۔ آپ اجازت نامہ لے آئیں۔“

”قانون‘ عدالت اور اجازت نامہ تو آپ ہیں۔ محبوب سے جولین دین تھا‘ مجھ سے بھی ہوسکتا ہے۔“

”سوری۔ یہ فی الحال نہیں ہوسکے گا۔ یہاں کے موجودہ حالات مجھے اجازت نہیں دیں گے۔“

”آپ ہمارا پیغام دینا چاہیں گے؟“

”ہاں۔ یہ ہوسکتا ہے۔ فرمائیں‘ پیغام کیا ہے؟“

”مدعی حشمت جلالی مقدمہ کو ختم کر رہا ہے۔ ہمارے درمیان سمجھوتا ہوگیا ہے۔ مراد کو جلد ہی رہائی مل جائے گی۔“

جیلر فون کو کان سے لگائے خلا میں تک رہا تھا۔ تصور میں محبوب کو رہائی پاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ معروف نے پوچھا۔ ”آپ چپ کیوں ہیں؟“

وہ خیالات سے چونک کر بولا۔ ”میں حیران ہوں کہ اچانک مراد کی قسمت چمک رہی ہے۔ میں ابھی یہ خوش خبری سناؤں گا۔“

رابطہ ختم ہوگیا۔ اس نے بیٹی کی ضد مان کر انتہائی احمقانہ اور مجرمانہ غلطی کی تھی۔ قیدیوں کو تبدیل کیا تھا۔ تب سے اندر ہی اندر سہا رہتا تھا کہ اتنے بڑے جرم کا کبھی انکشاف ہوگا تو اس کی نوکری بھی جائے گی اور جیل کی کوئی کوٹھری اس کے مقدر میں لکھ دی جائے گی۔

مرینہ نے باپ سے جھوٹا وعدہ کیا تھا کہ وہ مراد کو دو دنوں میں واپس لے آئے گی۔ پھر اسے باہر لے جانے کے بعد یہ جھوٹ بولے گی کہ مراد اس سے رسیاں تڑا کر بھاگ گیا ہے اور وہ سچ مچ فرار ہوگیا تھا۔

اس کے بعد جیلر کا سکون برباد ہوگیا تھا۔ وہ مجبور ہوگیا تھا۔ اب اسے ہر حال میں محبوب کو مراد بنا کر رکھنا تھا۔ ورنہ کسی وقت بھی اس کی شامت آسکتی تھی۔

ابھی معروف تجلی نے مراد کے لیے جو خوش خبری سنائی۔ وہ دراصل جیلر کے لیے بہت بڑی خوش خبری تھی۔ اگر مقدمہ ختم ہو جاتا۔ محبوب جلد ہی رہائی پا کر جیل سے چلا جاتا تو جیلر کو تمام اندیشوں سے نجات مل جاتی۔

وہ تیزی سے چلتا ہوا جیل کے مختلف حصوں سے گزرتا ہوا قیدی نمبر سات سو سات کے سیل میں آیا۔ وہ ایک دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ جیلر کو دیکھ کر فوراً ہی سلاخوں کے پاس آ کر بولا۔ ”کیا ماروی جام تمارو پہنچ گئی ہے؟“

”نہیں۔ رات نو یا دس بجے تک پہنچے گی۔ اس کی فکر نہ کرو۔ وہ میری بیٹی کے ساتھ ہے۔ ایک زبردست خوش خبری سنو۔ وڈیرا جلالی تمہارے مقدمہ سے ہاتھ اٹھا رہا ہے۔ سمجھوتا کر رہا ہے۔ جلد ہی تمہیں یہاں سے رہائی مل جائے گی۔“

محبوب نے اسے بے یقینی سے دیکھا۔ پھر کہا۔ ”شیطان کبھی فرشتہ بن ہی نہیں سکتا۔ وہ دشمن ماروی کے لیے پاگل ہو رہا ہے۔ سمجھوتا کبھی نہیں کرے گا۔“

”تم یقین کرو یا نہ کرو۔ ابھی تمہارے معروف تجلی نے کہا ہے کہ میں یہ خوش خبری بیچارے مراد تک پہنچا دوں اور مراد تو سلاخوں کے پیچھے تم ہی ہو۔ جو معروف صاحب تمہارا پورا کاروبار سنبھال رہے ہیں اور تمہارے ذاتی معاملات سے نمٹتے رہتے ہیں‘ کیا وہ جھوٹ بولیں گے؟“

وہ خوشی سے کھل گیا۔ ”اگر معروف صاحب نے یہ کہا ہے تو پھر مجھے یقین کرنا چاہیے۔“

دشمن کا سمجھوتا کرنا‘ مقدمے کا ختم ہونا اور جھوٹے الزام سے بری ہونا بہت بڑی بات تھی۔ محبوب نے سیل میں ایک طرف جا کر قبلہ رو ہو کر سجدہ کیا۔ وہ خدا کا شکر ادا کر رہا تھا۔ اُدھر ماروی مل گئی تھی۔ اِدھر رہائی ملنے والی تھی۔

وہ سجدہ کرنے کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگ رہا تھا۔ ایسے وقت دل میں بات آئی کہ مراد اگر کسی وڈیرے کی جیل میں ہے اور مرینہ ماروی کو اس سے ملانے لے جا رہی ہے تو اس سے پہلے فون کے ذریعہ مراد سے باتیں ہوسکتی ہیں۔

اس نے سلاخوں کے پاس آ کر جیلر سے پوچھا۔ ”مراد جام تمارو کی ایک جیل میں ہے؟“

”ہاں۔ میری بیٹی ماروی کو اسی کے پاس لے جا رہی ہے۔“

”بیٹی کو فون کریں‘ جہاں ہے وہاں رک جائے۔ ابھی جام تمارو نہ جائے۔“

”یہ کیا کہہ رہے ہو؟ وہ کیوں نہ جائے؟“

”پہلے فون پر مراد سے ماروی کی بات کرائی جائے۔“

”وہ وڈیرا سر پھرا ہے۔ فون پر بات کرنے کی اجازت نہیں دے رہا ہے۔“

”جو فون پر بات کرنے کی اجازت نہیں دے رہا ہے‘ وہ ملاقات کی اجازت کیوں دے رہا ہے؟ کیا اس لیے کہ ماروی وہاں آئے اور اسے بھی اپنی جیل میں ڈال دے؟“

”وہ ایسا نہیں کرے گا۔ میرا دوست ہے۔ ماروی اور مرینہ کو نقصان نہیں پہنچائے گا۔“

”مجھے مرینہ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ابھی فون کرو اور مرینہ سے بولو‘ جب ماروی فون پر مراد کی آواز سن لے تب اسے وہاں لے جائے۔“

وہ ناگواری سے بولا۔ ”کیا تم مجھے حکم دے رہے ہو؟“

”میں التجا کر رہا ہوں۔ پلیز ابھی فون کرو۔ میری ماروی کو اُدھر جانے سے روک دو۔ مجھے یقین کرنے دو کہ جہاں وہ جا رہی ہے‘ وہاں مراد ہے اور وہ اپنے مراد سے مل پائے گی۔“

”یہ تمہیں چند گھنٹوں کے بعد معلوم ہوجائے گا۔“

”جب ابھی معلوم ہوسکتا ہے۔ وہ فون پر مراد کی آواز سن سکتی ہے تو پھر چند گھنٹوں کے بعد کیوں؟“

”میں تم سے بحث نہیں کروں گا۔ میری بیٹی جو بہتر سمجھ رہی ہے‘ وہ کر رہی ہے۔“

وہ غصے سے بولا۔ ”تم دونوں باپ بیٹی فراڈ ہو۔ پتا نہیں میری ماروی کے ساتھ کیا کرنے والے ہو۔ میں آخری بار کہہ رہا ہوں۔ فون کرو اور اسے جام تمارو جانے سے روکو۔ ورنہ میری دشمنی مہنگی پڑے گی۔“

جیلر نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ پھر کہا۔ ”دشمنی اور تُو کرے گا؟ پنجرے میں رہ کر چیخے گا چلّائے گا اور زیادہ سے زیادہ گالیاں دے گا اور کیا کرے گا؟“

پھر حقارت سے بولا۔ ”قسمت تجھ پر مہربان ہے۔ تجھے جلد ہی رہائی ملنے والی ہے۔ جا اور ایک بار سجدہ کر رہائی ملنے تک اللہ اللہ کرتا رہ۔ اپنی اوقات میں رہے گا تو عزت سے باہر جائے گا۔“

یہ کہتے ہوئے وہ پلٹ کر جانے لگا۔ محبوب نے یکبارگی چیخ کر کہا۔ ”میں محبوب علی چانڈیو ہوں۔ قیدی نمبر سات سو سات مراد علی منگی نہیں ہوں۔“

جیلر کے اندر جیسے دھماکا ہوا۔ وہ ایکدم سے اچھل کر پلٹ کر دوڑتا ہوا آیا۔ ”ارے یہ کیا بول رہا ہے۔ چپ ہوجا۔۔۔“

وہ سلاخوں کے درمیان دونوں ہاتھ لے جا کر اس کا منہ بند کرنا چاہتا تھا۔ محبوب نے پیچھے ہٹ کر کہا۔ ”میں اپنی اوقات بتا رہا ہوں۔ اب تُو دیکھے گا کہ میں کیسی دشمنی کروں گا۔“

وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ”فار گاڈ سیک آہستہ بول۔ میں بھول گیا تھا کہ تُو کیسی دشمنی کرسکتا ہے۔ ذرا عقل سے کام لے۔ یہاں اپنی اصلیت ظاہر کرے گا تو جو رہائی ملنے والی ہے وہ نہیں ملے گی۔ تجھے پھر اس جرم میں مزید سزا ملے گی کہ تو نے اصل قیدی کو فرار کرانے کے لیے قانون کے محافظوں کو دھوکا دیا ہے۔“

محبوب نے کہا۔ ”اور اس دھوکے بازی میں جیلر دلاور جان نے اپنی بیٹی کی خاطر جی جان سے ساتھ دیا ہے۔ پھر تیرا کیا بنے گا؟ تُو بھی اسی سیل میں رہنے آئے گا۔ ہم دونوں یہاں مل کر بھائی کی طرح رہیں گے۔“

وہ پریشان ہو کر بولا۔ ”محبوب صاحب! آپ بہت ذہین ہیں۔ اپنی ذہانت سے سوچیں‘ سمجھیں‘ آپ کو اسی طرح رازداری سے رہ کر رہائی پا کر باہر جانا چاہیے۔“

”میں ماروی کے لیے یہاں آیا ہوں۔ وہ زندہ نہ ہوتی تو سزائے موت پا کر اس کے پاس پہنچ جاتا۔ خدا کا شکر ہے وہ زندہ سلامت ہے۔ اگر وہ جام تمارو جائے گی اس کی سلامتی پر‘ اس کی عزت پر ذرا بھی آنچ آئے گی اور وہ کل صبح تک کراچی نہیں آئے گی تو میں اس کے بغیر یہاں سے باہر نہیں جاؤں گا۔“

”وہ سلامتی سے رہے گی۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔“

”یہ وعدہ کرو کہ کل صبح تک میرے بزرگ معروف تجلی کے پاس پہنچ جائے گی ورنہ کل کے بعد میں تمہاری وردی اتروا دوں گا۔“

وہ پریشان ہو کر سوچنے لگا۔ ”وہ کراچی نہیں آسکے گی۔ مرینہ مراد کو پھانسنے کے لیے اسے چارہ بنا رہی ہے اور اسے تجی جیل میں چھپا کر رکھنے والی ہے۔“

محبوب نے کہا۔ ”سوچنے میں وقت ضائع نہ

کرو۔ فوراً مرینہ سے بولو کہ ماروی کو یہاں لے آئے۔"

اس نے مجبور ہو کر بے دلی سے فون پر بیٹی کے نمبر پنچ کیے۔ اسے کان سے لگایا۔ پھر رابطہ ہوتے ہی بولا۔ "تم کہاں ہو؟ جام تھارو سے کتنی دور ہو؟"

"میں نہیں جانتی۔ ہمارے ساتھ ایک ٹیکسی ڈرائیور ہے۔ ابھی اس نے کہا ہے کہ ہم تین گھنٹے میں وہاں پہنچ جائیں گے۔"

"مرینہ! میں بڑی مشکل میں پڑ گیا ہوں۔ ابھی ادھر نہ جاؤ۔ رک جاؤ۔ پہلے میری بات سن لو۔"

"بات کیا ہے بولیں؟ میں آگے بڑھتے ہوئے بھی آپ کی باتیں سن سکتی ہوں۔"

"نہیں، جہاں ہو وہیں رک جاؤ۔ بڑی گڑبڑ ہوگئی ہے۔"

اس نے ڈرائیو کو گاڑی روکنے کا حکم دیا۔ ساتھ آنے والی ٹیکسی بھی رک گئی۔ اس نے پوچھا۔ "کیا بات ہے پاپا؟ آپ پریشان ہیں؟"

"یہ محبوب کہہ رہا ہے کہ ماروی کو جام تھارو نہ لے جاؤ۔ کل صبح تک کراچی لے آؤ۔"

"اسے بھونکنے دیں۔ آپ کیوں پریشان ہو رہے ہیں۔"

"یہ میری کمزوریوں سے کھیل رہا ہے۔ کہتا ہے ماروی صبح تک یہاں نہ آئی تو چیخ چیخ کر اعلان کرے گا کہ یہ محبوب ہے قیدی مراد نہیں ہے۔"

مرینہ نے پیچھے بیٹھی ہوئی ماروی کو کن انکھیوں سے دیکھا پھر دروازہ کھول کر گاڑی سے باہر آگئی۔ وہاں سے ذرا دور ہو کر غصے سے بولی۔ "اس کتے کی کھوپڑی اچانک کیوں گھوم گئی ہے؟"

"پتا نہیں اس کے دماغ میں یہ بات کیسے سما گئی ہے کہ جام تھارو کی جیل میں مراد نہیں ہے۔ اگر ہوتا تو پہلے فون پر ماروی کو اس کی آواز سنائی جاتی۔ اور وہ یہی کہہ رہا ہے کہ پہلے ماروی اور مراد کو فون پر ملایا جائے۔ جب وہ بات کرے گی۔ مطمئن ہوگی۔ تب اس سے ملنے جام تھارو جائے گی۔"

"ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا۔ نہ وہاں مراد ہے۔ نہ ہم محبوب کا مطالبہ پورا کرسکیں گے۔"

"ایک نئی بات یہ ہے مرینہ...! کہ حشمت جلالی مقدمہ بازی سے باز آگیا ہے۔ ایک آدھ ہفتے میں مراد کو یعنی کہ محبوب کو یہاں سے رہائی مل جائے گی۔"

"پھر اسے سمجھائیں کہ گڑبڑ نہ کرے۔ عقل سے کام لے۔ رہائی پانے تک زبان بند رکھے۔"

"وہ ایک ہی بات کہتا ہے۔ ماروی یہاں صبح تک نہ آئی تو اس کے بغیر یہاں سے رہائی نہیں پائے گا۔ کل یہاں ہنگامے کرے گا۔ خود کو محبوب کی حیثیت سے ظاہر کرے گا۔"

وہ پریشان ہو کر بولی۔ "کچھ کریں پاپا...!"

"میں کیا کرسکتا ہوں۔ یہاں اس کا منہ بند کرنے کے لیے اس پر ٹارچر کرسکتا ہوں۔ لیکن اس کے چیخنے چلانے سے جیل کے دوسرے عہدیداروں کو حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ کئی عہدیداروں سے میری بنتی نہیں ہے۔ انہیں دشمنی کرنے کا بھرپور موقع ملے گا۔ پھر سمجھو کہ میرا کیا ہوگا؟"

"پاپا! کل شام سے مراد کے پیچھے بھاگ رہی ہوں۔ اب ماروی ہاتھ آئی ہے۔ اب میں ہاری ہوئی بازی جیتنے والی ہوں۔ مراد اسے حاصل کرنے کے لیے میرا تابعدار بن جائے گا۔ کچھ کریں پاپا...!"

"مرینہ اس پر مٹی ڈالو۔ ایسے بہت سے گبرو جوان تمہاری زندگی میں آئیں گے تم ماروی کو لے کر یہاں آجاؤ۔"

"تو پاپا...! مراد تو میری ضد بن گیا ہے۔ میں ہاری ہوئی بازی جیتنا جانتی ہوں۔ آپ تھوڑی دیر انتظار کریں۔ میں ابھی کال بیک کروں گی۔"

دلاور جان نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔ "وہ ابھی تھوڑی دیر میں کال کرے گی۔ ہمیں انتظار کرنا ہوگا۔"

"میں ساری رات انتظار کروں گا۔ لیکن صبح ماروی کا منہ دیکھنا چاہوں گا۔"

اس نے محبوب کو بے بسی سے دیکھ کر سر جھکا لیا۔ ادھر مرینہ لینڈ کروزر سے دور کھڑی تیزی سے سوچ رہی تھی کہ کیا کرے؟

باپ کو قانونی گرفت سے بچانا تھا اور مراد کو تو آخری سانسوں تک نہیں چھوڑنا تھا۔

اور محبوب وہاں ماروی کو طلب کر رہا تھا۔ اس نے جیلر باپ کو خوف اور اندیشوں کی سولی پر لٹکا دیا تھا۔

وہ چاروں طرف گھوم کر رات کی تاریکی کو دیکھنے لگی۔ سوچنے لگی۔ اسے کچھ کر گزرنا تھا۔

حیرت انگیز واقعات، سحر انگیز لمحات اور سنسنی خیز گردش ایام کی دلچسپ داستان کا مزید احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

ستم ظریف

امجد رئیس

غیروں پر غیروں کا ستم تو روایتی انداز میں زندگی کا حصہ ہے مگر... اپنوں پر اپنوں کا ظلم... خواہ کتنا ہی روایتی اور پرانا قصہ ہو لیکن جب جب ہوا دلوں پر ایک الگ ہی نقش چھوڑ گیا۔ دولت کی ہوس شاید اپنے پرائے کی تمیز بھی کھو دیتی ہے۔ یہی حال ان خون کے رشتوں کا بھی تھا جو گھر کے بھیدی لنکا ڈھا رہے تھے۔

اغوا برائے تاوان کی ایک چونکا دینے والی روداد

ستائیس مئی، صبح سات بجے۔ ٹیلی فون کال، مسٹر کلارک "فورتھ کیو" کے لیے۔ فورتھ کیو مینشن، لانگ آئی لینڈ۔

"مسٹر فورتھ کیو، بولنا مت...... صرف سنتے جاؤ، فون کالز آسانی سے کھوج لی جاتی ہیں، لیکن خطوط نہیں...... یہ کال پہلی اور آخری ہے، نیز بہت مختصر ہے۔ تمہاری 10 سالہ سوتیلی بیٹی اموجن ہمارے پاس ہے۔ آئندہ ٹائپ شدہ خطوط میں اسے "خالص مال" لکھا جائے گا۔ مزید معلومات کے لیے خطوط کا تبادلہ ویران "گارور فارم" کے سامنے والے زنگ آلود میل باکس کے ذریعے ہوگا۔ یہ تمہاری پراپرٹی کے نزدیک ووڈ روڈ کے کونے پر ہے۔ ہر شب اسے چیک کرتے رہو۔ بیوی کے علاوہ کسی کو بتایا تو بچی کو ختم سمجھو۔"

کلک، ٹوں...... ں...... ں

منجانب۔ ہنٹر اینڈ کو۔

☆☆☆

25 مئی۔

ڈیئر مسٹر فورتھ کیو۔ بحوالہ "خالص مال"

بذریعہ خطوط اب تک جو تبادلہ خیال ہوا ہے، اس کے بعد ہماری جانب سے طے ہوا ہے کہ "خالص مال" کی صاف ستھری ترسیل آپ کو دس لاکھ ڈالر کی ادائیگی پر ہو جائے گی۔ ہماری معلومات کے ذرائع مستند ہیں...... ہم جانتے ہیں کہ یہ رقم آپ کے لیے زیادہ نہیں ہے۔ آپ اور آپ کی بیگم جس اذیت سے گزر رہے ہیں، اسے ختم کیجیے۔ ٹائپ شدہ جواب طے کردہ میل باکس میں کل دس بجے کے بعد ڈال دیجیے۔ ہم جو کہتے ہیں وہ کرتے ہیں۔ باقی آپ پر منحصر ہے کہ آپ رازداری کا خیال رکھیں۔ "خالص مال" محفوظ حالت میں ہے۔

مخلص۔ اے۔ ہنٹر

☆☆☆

26 مئی۔

مسٹر ہنٹر! "خالص مال" کو اچھی حالت میں رکھیے۔ ہدایت کے مطابق میں نے پولیس سے رابطہ نہیں کیا ہے۔ نہ ایسا کوئی ارادہ ہے۔ بیگم اور میں دیانتداری کے ساتھ سودا نمٹائیں گے۔ تاہم آپ کے معلومات کے ذرائع میں خامی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں اتنی بڑی رقم کا بندوبست کیونکر اور کب تک کرسکوں گا۔ تاہم سودے کے معاملے میں اپنے مکمل تعاون کا یقین دلاتا ہوں۔ اور آپ سے بھی یہی توقع رکھتا ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ "خالص مال" کو نقصان پہنچنے کی صورت میں یہ تعاون فوراً ختم ہو جائے گا۔

بے چین و منتظر...... کلارک فورتھ کیو

☆☆☆

ڈیئر مسٹر فورتھ کیو! معصوم نہ بنیں، نہ ہمارے ذرائع کو چیلنج کریں۔ ہم جانتے ہیں کہ آپ متذکرہ رقم کا بندوبست کر سکتے ہیں۔ تاہم آپ نے تعاون کے حوالے سے جو باتیں کی ہیں تو ہم آپ کو 25% رعایت دے رہے ہیں۔ آپ 750,000 ڈالرز تیار رکھیں تاکہ ہم "خالص مال" کی ڈلیوری کا بندوبست کریں۔ ہمیں خوشی ہوگی کہ آپ کا مطلوبہ آئٹم ہمارے ہاتھ سے جلد ترسیل ہو جائے۔

پُر یقین...... اے، ہنٹر

☆☆☆

ڈیئر مسٹر ہنٹر!

یہ خط میں لان میں بیٹھ کر لکھ رہا ہوں اور برسوں میں پہلی بار سکون اور اطمینان محسوس کر رہا ہوں۔ صاف سوچ کے ساتھ پراعتماد ہوں کہ میں سودے کو بہتر انداز میں ہینڈل کر رہا ہوں۔ آپ نے 25% رعایت دے کر اپنی معقولیت پسندی کا ثبوت دیا ہے...... ایسے لوگوں سے کوئی بھی دوسرا معقول شخص اعتماد اور

خلوص کے ساتھ سودے بازی کرسکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اس حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کریں گے کہ آپ کے تعاون کے باوجود 750000 ڈالرز ایک بڑی رقم ہے اور میں اپنی موجودہ حیثیت کے باوجود شارٹ نوٹس پر اگر رقم کے لیے بھاگ دوڑ کرتا ہوں تو رازداری کو نقصان پہنچنے کے روشن امکانات ہیں۔ کیا آپ مزید کم رقم کے ساتھ "خالص مال" کی ترسیل میں آرام محسوس نہیں کریں گے؟

معقولیت پسند...... کلارک فورتھ کیو

☆☆☆

ڈیئر مسٹر فورتھ کیو!

"خالص مال" ایک بیش قیمت بلکہ انمول آئٹم ہے، جس کی اسٹوریج ایک مشکل امر ہے اور اس قسم کے آئٹم کی اسٹوریج اور ترسیل کمپنی کے لیے ایک نازک اور مشکل ترکام ہے۔ تمام تر حقائق اور دشواریوں کی روشنی میں ہم اس شرط پر قیمت نصف کرنے کے لیے تیار ہیں کہ رقم فوری طور پر ادا کی جائے گی۔ یہ ہماری فائنل پیشکش ہے۔

ہمیشہ کے مانند۔ پُریقین...... اے۔ ہنٹر

☆☆☆

ڈیئر مسٹر ہنٹر،

آپ کی تازہ پیشکش اور تعاون کے بعد مجھے یقین ہو چلا ہے کہ میرا خیال درست تھا کہ میں سمجھدار اور حقیقت پسند افراد سے معاملہ کررہا ہوں۔ بے شک بیگم "خالص مال" سے متعلق صدمہ کی کیفیت سے دوچار ہیں۔ میں نے ان کا غم بانٹنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ کسی عورت سے شادی کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی کمپنی کو خریدنا، تو پھر ہمیں اثاثوں کے ساتھ قرضہ جات اور ذمّے داریوں کو بھی قبول کرنا چاہیے۔ تاہم بیگم اور میں 500000 ڈالرز کے لیے قدرے متفکر ہیں۔ امید ہے کہ آپ 10000 کے لگ بھگ سوچیں گے۔

بصد احترام...... کلارک فورتھ کیو

☆☆☆

فورتھ کیو!

کل درمیانی شب میل باکس میں 90000 ڈالرز رکھ دو۔ اسے قطعی سمجھو یا پھر "خالص مال" سے ہاتھ دھونے کے لیے تیار رہو۔ تم ہمیں غیر آرام دہ حالت میں رکھنے کی کوشش کر رہے ہو اور یہ ہمیں پسند نہیں۔ ہم قاتل نہیں ہیں لیکن بننے میں دیر بھی نہیں لگے گی۔

اے۔ ہنٹر

☆☆☆

ڈیئر مسٹر ہنٹر،

السر کی تکلیف دہ حالت سے برسوں بعد آرام ملا ہے اور میں سودے کے معاملے میں بہتر انداز میں سوچنے کے قابل ہوں۔ اگرچہ بیگم کا تقاضا ہے کہ میں کچھ نہ کچھ کروں۔ لیکن 90000 ...... ڈالرز میری استطاعت سے باہر ہیں۔ میرے اگلے خط کے ساتھ 20000...... ڈالرز موجود ہوں گے۔ اس کی ترسیل کے لیے تیار رہو۔ میں شروع سے ایمانداری کے ساتھ معاملہ کررہا ہوں...... حتیٰ کہ میری تازہ پیشکش کا بیگم کو بھی علم نہیں ہے۔

مخلص بہ قلب...... کلارک فورتھ کیو

☆☆☆

فورتھ کیو!

پاگل ہو گئے ہو؟ "خالص مال" انمول ہے۔ ہم پھر دُہراتے ہیں کہ ہم قاتل نہیں ہیں۔ تم ایک نکتہ پر غالباً متفق ہو کہ زندگی اور صحت کے مقابلہ میں رقم کی کوئی اہمیت نہیں۔ ہم "خالص مال" کل روانہ کردیں گے اگر تم ہماری پریشانی اور خاموشی کے پیش نظر 5000 ڈالرز بڑھا دو؟ جلدی کرو۔

اے۔ ہنٹر

☆☆☆

برائے ہنٹر اینڈ کو

31 مئی

ڈیئر مسٹر ہنٹر، کافی غور و خوض کے بعد میں تمہاری آخری تجویز کو مسترد کرتا ہوں اور اپنی سابقہ پیشکش کا اعادہ کرتا ہوں مزید یہ کہ اس معاملے میں کسی اور بات چیت کی ضرورت محسوس نہیں کررہا ہوں۔ لہٰذا بچّی کو روانہ کرو یا سودا ختم سمجھو۔

فورتھ کیو

☆☆☆

یکم جون

کلارک فورتھ کیو، مجھ سمیت ہنٹر اینڈ کو کا بورڈ تبدیل ہو گیا ہے۔ نیا وائس پریذیڈنٹ نئے خیالات و نظریات کا مالک ہے۔ ہم جو خطوط روانہ کرچکے ہیں، ان سب کی کاربن کاپی محفوظ ہے...... تمہارے ٹائپ کردہ خطوط بھی محفوظ ہیں۔

یقیناً، اغوا کنندگان کے لیے یہاں کا قانون نہایت سخت ہے، تاہم یہ قانون بچوں کے لیے اتنا شدید نہیں ہے۔ پہلے جرم پر بچوں کو عموماً معاف کردیا جاتا ہے یا علامتی سزا دی جاتی ہے...... اگر تم چاہتے ہو کہ یہ تمام خطوط پولیس کے حوالے نہ کیے جائیں تو 500000 ڈالرز کل رات، چھوٹے نوٹوں کی شکل میں میل باکس میں رکھ دو...... مجھے مزید وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔

متفکر...... "خالص مال"

متکلّم صوفی

ضیا تسنیم بلگرامی

قدرت یوں تو روزِ ازل سے ہی انسان کے چونکنے اور سوچنے کے لیے بہت سے در وا کرتی آئی ہے لیکن انسان کی عقل کے پردے ان معاملات کی جانب متوجہ ہونے ہی نہیں دیتے۔ اس کے باوجود جہالت کی دبیز چادر کو ہٹانے کے لیے کچھ لوگ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی چاہت اور اطاعت میں اتنے آگے بڑھ جاتے ہیں کہ گمراہی بہت پیچھے رہ جاتی ہے... آپ کو بھی اللہ نے یہ اعجاز دیا کہ بچہ جب بولنے اور سمجھنے کی سکت نہیں رکھتا آپ لوگوں کو نصیحت و وعظ فرماتے تھے... کچھ خبر نہیں خدا کی قدرت کب اور کس پر مہربان ہو جائے۔

اپنی کرامات و عبادات سے مخلوق کو فیض یاب کرنے والے ولی کی روداد

تین سال کے بچے، عبداللہ کے بیٹے سہلؒ نے اپنے ماموں محمد بن سوارؒ کو نمازِ تہجد پڑھتے جو دیکھا تو ان کے پیچھے خود بھی کھڑے ہو گئے۔ ماموں کا بہت زیادہ وقت عبادت و ریاضت ہی میں گزرتا تھا اور سہلؒ بن عبداللہ ایک عرصے سے اپنے ماموں کی ریاضت پر توجہ دیے ہوئے تھے۔ صبح فجر کی اذان سے ذرا پہلے ماموں نے سوچا کہ ذرا سی دیر کے لیے اگر کمر ٹکالی جائے تو مناسب ہوگا۔ یہ سوچ کر وہ مڑے اور اپنے پیچھے اپنے تین سال کے بھانجے کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے، پوچھا۔ "بیٹے سہلؒ! تم یہاں کیا کررہے ہو؟"

سہلؒ نے معصومیت سے جواب دیا۔ "ماموں! میں آپؒ کے ساتھ عبادت کررہا تھا۔"

ماموں نے دریافت کیا۔ "کب سے؟"

جواب ملا۔ "جب سے آپؒ خود مصروفِ عبادت ہیں۔"

ماموں نے حیرت سے پوچھا۔ "تمہارے پیروں میں تکلیف تو نہیں ہوئی؟"

بھانجے نے جواب دیا۔ "پیروں کو تکلیف تو نہیں ہوئی، ہاں دل کو لذت ضرور ملی۔"
ننھے سے بچے کے عارفانہ جواب نے محمد بن سوار کو اور زیادہ حیران کر دیا۔ ابھی یہ حیرت دور نہ ہوئی تھی کہ سہلؒ نے ایک اور عجیب و غریب بات کہہ دی، بولے۔ "ماموں! میں آپ کو ایک دلچسپ بات بتاؤں؟"
ماموں نے جواب دیا۔ "ضرور بتاؤ۔"
بھانجے نے کہا۔ "میں ازل سے آج تک عرش کے سامنے سجدہ ریز ہوں۔ کیا آپؒ میری بات سمجھ گئے؟"
ماموں کے دل کی جو حالت ہوئی، اسے وہ بیان نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے اپنے بھانجے کو تنبیہ کی۔ "بھانجے! اپنے ننھے سے منہ سے اتنی بڑی بات تم کیوں کہہ رہے ہو؟ تم ابھی دنیا سے واقف نہیں ہو۔ اگر تمہاری یہ بات دوسرے لوگ سن لیں گے تو تمہیں دار پر چڑھا دیں گے۔ آئندہ یہ بات کسی اور کے سامنے نہ کہنا۔"
بھانجے پر شاید اس بات کا کوئی اثر ہی نہیں ہوا، مزید عرض کیا۔ "اور ماموں! آپ حیرت کریں گے کہ جب خدا نے مجھ سے کہا تھا الست بربکم (کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟) تو مجھے اپنا جواب بلیٰ (بے شک) آج تک یاد ہے۔"
ماموں نے اپنا سر پیٹ لیا، بولے۔ "سہلؒ! خدا کے لیے تو اپنی زبان بند کر۔ تو ابھی بچہ ہے لیکن میں اس عمر میں ایسی باتیں نہیں کر سکتا۔" بھانجے نے خاموشی اختیار کر لی۔

☆☆☆

سہلؒ نے روزے رکھنے شروع کر دیے۔ ان کے افطار میں طرح طرح کی چیزیں سامنے رکھ دی جاتیں لیکن یہ ہمیشہ جو کی روٹی سے افطار کرتے۔ گھر والے سہلؒ کی عادات پر حیران رہتے اور عالم یہ تھا کہ ابھی کسی ایک عادت نے انہیں حیرت میں ڈالا ہی تھا اور یہ ابھی ختم نہ ہوئی تھی کہ کسی نئے واقعے، کسی نئی بات نے مزید حیرت میں ڈال دیا۔
سہلؒ کو غور و فکر کی بڑی عادت تھی۔ بارہ سال کی عمر میں کسی مسئلے نے انہیں الجھا دیا۔ یہ اپنی سمجھ کے مطابق اس پر غور و فکر کرتے رہے لیکن جب مسئلہ سمجھ میں نہ آیا تو آپؒ نے اپنے عہد کے بڑے بڑے عابد و زاہد اور لائق لوگوں کی ذہن میں ایک فہرست تیار کی کہ اس معاملے میں کس سے مدد لی جا سکتی ہے۔ آخر بصرے کے حبیب حمزہؒ کی طرف دل مائل ہو گیا اور بارہ سالہ لڑکے نے بصرے کا سفر اختیار کیا۔ حبیب حمزہؒ نے اس ہونہار نوعمر مہمان کی پیشانی میں چند ایسی علامتیں دیکھیں جو غیر معمولی تھیں۔ انہوں نے سہلؒ کا پرجوش استقبال کیا، پوچھا۔ "بیٹے! تمہارا نام؟"
انہوں نے جواب دیا۔ "سہلؒ بن عبداللہ!"
حبیب حمزہؒ نے پوچھا۔ "کہاں سے آئے ہو؟"
انہوں نے جواب دیا۔ "تستر سے۔"
حبیب حمزہؒ نے شفقت سے اپنے پاس بٹھا لیا، بولے۔ "بیٹے! جب تک جی چاہے میرے پاس رہو اور جو کچھ جاننا یا پوچھنا چاہتے ہو اس کے لیے میں حاضر ہوں۔"
کئی دن بعد سہلؒ نے حبیب حمزہؒ سے اپنے دل کے تردّدات دور کیے اور ان کی صحبت سے فیضیاب ہوتے رہے۔ آخر مطمئن ہو کر تستر واپس چلے گئے۔ حبیب حمزہؒ کی صحبت نے ان میں یہ تبدیلی پیدا کر دی تھی کہ پہلے وہ افطار کے بعد کچھ کھا پی لیتے تھے لیکن اب اس میں بھی کمی پیدا ہو گئی کہ رات کو بس ایک چھٹانک کی دو ٹکیاں کھا کر عبادت میں مشغول ہو جاتے اور یہ ٹکیاں بھی جو کی ہوتیں۔ کچھ عرصے بعد اس میں بھی ترمیم کر دی۔ پہلے ہر روز افطار کر لیا کرتے تھے لیکن اب تین تین دن بعد افطار کرنے لگے۔ پھر اس میں اور اضافہ کر دیا اور کئی کئی دن اور کئی کئی رات متواتر روزے رکھ کر صرف ایک بادام پر گزر کرنے لگے۔ جو لوگ آپؒ کے ذکر و شغل سے واقف تھے انہیں اس بات پر حیرت تھی کہ آخر شب و روز کا، ہفتوں روزہ رکھ کر ان کا ایک بادام کھا لینا، ان میں توانائی کس طرح قائم رکھتا ہے۔ ایک شخص نے ڈرتے ڈرتے پوچھ بھی لیا۔
"حضرت! ذرا ایک بات تو بتایئے۔ آخر یہ ایک بادام، جو آپ شب و روز کے کئی ہفتوں کے ایک روزے کے بعد کھاتے ہیں، آپؒ کے جسم میں کس طرح توانائی قائم رکھتا ہے؟"
آپؒ نے جواب دیا۔ "تیرا سوال مناسب اور معقول ہے لیکن میں جن تجربات کے بعد یہاں تک پہنچا ہوں وہ کچھ عجیب اور عقل سے ماورا ہیں۔ میں نے فاقہ کشی اور کھانے کا الگ الگ تجربہ کیا ہے۔ شروع شروع میں تو یہ حال تھا کہ بھوک سے نقاہت طاری ہو جایا کرتی تھی اور جب کھا لیتا تو توانائی بحال ہو جاتی تھی لیکن میں نے یہ تجربہ مسلسل جاری رکھا تو ایک عجیب و غریب نتیجہ برآمد ہوا۔

اب عالم یہ ہے کہ اگر میں کھا لیتا ہوں تو روح میں نقاہت آ جاتی ہے اور فاقہ کشی کرتا ہوں تو اسے توانائی حاصل ہو جاتی ہے۔"
جب سے آپؒ کو یہ معلوم ہوا تھا کہ شعبان کے روزوں کی فضیلت زیادہ ہے۔ آپؒ شعبان کے روزے بالکل نہیں چھوڑتے تھے۔
آپؒ کی گفتگو میں علم کلام کی جھلک بہت زیادہ پائی جاتی تھی۔ آپؒ اہل تستر کے حال پر افسوس کرتے تھے، فرماتے تھے۔
"افسوس کہ لوگ پڑے سوتے ہیں اور جب یہ مر جائیں گے تو بیدار ہوں گے اور جب بیدار ہوں گے تو پچھتائیں گے اور جب پچھتائیں گے تو ان کا پچھتانا بے کار ہوگا اور انہیں کچھ فائدہ نہ دے گا۔" اس کے بعد فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ کو رات اور دن کی گھڑیوں میں دلوں کی اطلاع ہوتی رہتی ہے اور جب وہ کسی کے دل میں اپنے سوا کسی اور کی احتیاج دیکھتا ہے تو اس پر ابلیس کو مسلط کر دیتا ہے۔"
کسی نے سوال کیا۔ "حضرت! ایک صوفی کو کن باتوں کی پابندی کرنی چاہیے؟"
آپؒ نے جواب دیا۔ "تین چیزوں کی۔ اول اپنے راز کی نگہداشت، دوم اپنے فقر کی حفاظت اور سوم اپنے فرائض کی ادائیگی۔ لوگو! یاد رکھو اللہ تعالیٰ نیت کا قبلہ ہے اور نیت، قلب کا قبلہ ہے۔ قلب بدن کا قبلہ ہے، بدن اعضا کا قبلہ ہے اور اعضا دنیا کے قبلے ہیں اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھو کہ جو گمان سے بچا وہ تجسس سے بچا۔ جو تجسس سے بچا وہ غیبت سے بچا، جو غیبت سے بچا وہ زور (جھوٹ، فریب، مکر) سے بچا، جو زور سے بچا وہ بہتان سے بچا۔"
جب آپؒ ایک عرصے تک ایسی باتیں کرتے رہے تو تستر کے بااثر حضرات ان سے عاجز آنے لگے۔ آپؒ ان سے ذرا بھی نہ ڈرتے تھے، جو کہنا ہوتا تھا برملا کہہ دیتے تھے۔
ابن منصور حلاج کو آپؒ کی صاف گوئی اتنی پسند آئی کہ آپ کے مریدوں میں شامل ہو گئے۔ ابن منصورؒ کی صاف گوئی تو بعد میں اتنی مشہور ہوئی کہ "انا الحق" کے شور نے انہیں دار پر چڑھوا دیا۔ تستر کے عوام، خواص اور عرفا، سہلؒ بن عبداللہ کی مخالفت میں متحد اور یک زبان ہو گئے۔ ان تینوں کا ایک نمائندہ وفد کی شکل میں آپؒ کی خدمت میں پہنچا اور تند و تیز لہجے میں آپؒ کو منع کیا کہ ان کے خلاف زبان نہ کھولی جائے۔
آپؒ نے جواب دیا۔ "یہ کس طرح ممکن ہے جبکہ دنیا کے سارے فتنے تم تینوں کی طرف سے نازل ہوتے ہیں۔"
ان میں عارف نے آپؒ کی بات کو بہت شدت سے محسوس کیا، پوچھا۔ "عوام اور خواص کے فتنوں کی تو میں بات اس لیے نہیں کروں گا کہ اپنی اپنی حالت سے یہ دونوں خود ہی واقف ہوں گے اور خود ہی جواب دے لیں گے لیکن میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ عارفوں کی طرف سے اہلِ دنیا میں کون سے فتنے نازل ہوتے ہیں؟"
آپؒ نے جواب دیا۔ "میں جو کچھ کہوں گا، اگر تم عارف ہو تو اس سے ضرور اتفاق کرو گے۔ عارف اسی کو کہتے ہیں ناں جو سب کچھ جانتا ہے یعنی وہ حق اور ناحق سے خوب اچھی طرح واقف ہو جاتا ہے۔ اس واقفیت کے بعد جب وہ حق کے وجوب میں تاخیر سے کام لیتا ہے تو یہیں سے فتنوں کا آغاز ہو جاتا ہے۔"
عامی نے سوال کیا۔ "اور حضرت! ہماری وجہ سے کون سے اور کس طرح فتنوں کا نزول ہوتا ہے؟"
آپؒ نے جواب دیا۔ "تم پہلے عامی کی تعریف کو سمجھ لو اس کے بعد میں جواب دوں گا۔"
عامی نے کہا۔ "اس کی آپ ہی تعریف فرما دیں۔"
آپؒ نے جواب دیا۔ "عامی وہ شخص یا لوگ کہلائیں گے جو علوم عقلی و نقلی اور باطنی سے واقف نہیں ہوتے، اگر یہ ان علوم کو حاصل کر لیں گے مگر انہیں سمجھنے کی استطاعت اور لیاقت نہ رکھتے ہوں تو اس سے جو فتنے پیدا ہوں گے وہ عوامی فتنے کہلائیں گے۔"
خواص کا نمائندہ کیوں چپ رہتا، فوراً بولا۔ "اور حضرت! اب اس فتنے کی وضاحت بھی فرما دیں جسے آپ خواص کا فتنہ فرما رہے ہیں۔"
آپؒ نے جواب دیا۔ "خواص وہ ہیں جو جانتے تو سب کچھ ہیں مگر ان کی عقل اور حیلہ جو دانش انہیں رخصت اور تاویل میں الجھا دیتی ہے یعنی جسے اختیار کرنا چاہیے اس سے نظریں چراتے ہیں اور تاویل میں ایک دوسرا عمل اختیار کر کے خود کو زبردستی حق بجانب قرار دیتے ہیں۔"
تینوں آدمی لاجواب ہو کر چلے گئے لیکن ان کے دلوں میں آپؒ کے خلاف کینہ بیٹھ گیا۔ ان لوگوں نے مل جل کر آپؒ کے خلاف لوگوں کو بھڑکانا شروع کر دیا۔ انہوں نے علمائے عصر کو بھی آپؒ کے خلاف کر دیا اور کہا کہ عبداللہ کا بیٹا، عالموں جیسی باتیں کرتا ہے حالانکہ وہ محض صوفی ہے۔ وہ علما کو برا بھلا کہتا ہے۔
چند عالم آپؒ کی خدمت میں پہنچے اور دریافت کیا۔ "کیا یہ درست ہے کہ آپؒ ہمیں برا بھلا کہتے ہیں؟"
آپؒ نے کہا۔ "یہ کس نے کہا، میں تو علما کو برا بھلا نہیں کہتا۔"

عالموں نے کہا۔ ”تستر کے خواص میں سے ایک شخص نے ہمیں بتایا ہے کہ آپؒ نے کہا ہے کہ ہم لوگ حیلہ جو ہوتے ہیں اور رخصت اور تاویلات میں الجھے رہتے ہیں۔“

آپؒ نے جواب دیا۔ ”رخصت اور تاویلات میں تو یہاں کے خواص الجھے رہتے ہیں اور یہ بھی ان کی تاویل ہی ہے کہ انہوں نے اس میں علما کو بھی شامل کرلیا۔“

عالموں میں سے کسی نے پوچھا۔ ”ویسے عالموں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟“

آپؒ نے جواب دیا۔ ”ہمارے ہم عصر علما تین باتوں سے مایوس ہو چکے ہیں یا یوں کہو کہ ان میں ناکام رہے ہیں۔“

عالموں نے بیک زبان دریافت کیا۔ ”کون سی تین باتوں میں؟“

آپؒ نے جواب دیا۔ ”توبہ کی مستقل پابندی سے، سنت کی پیروی سے اور ترکِ مردم آزادی سے۔“

علما آپؒ کے پاس سے کدورتیں لے کر اٹھے اور لوگوں میں آپؒ کے خلاف اشتعال پھیلاتے رہے۔

آپؒ کے خلاف تستر میں اس قدر واویلا مچا اور لوگوں نے مل جل کر اتنا شور و غل کیا کہ آپؒ کے خلاف کفر کا فتویٰ صادر کر دیا گیا۔ ابنِ منصورؒ حلاج نے معلوم نہیں کیا سوچا کہ کچھ کہے سنے بغیر آپؒ سے علیحدگی اختیار کرلی اور ایک دوسرے صوفی عمرو بن عثمان مکی کے پاس چلے گئے۔ آپؒ کو ابنِ منصورؒ کے اس رویے نے اذیت پہنچائی۔ آپؒ نے اپنا کل اثاثہ خدا کی راہ میں دے دیا اور مکہ معظمہ روانہ ہو گئے۔ آپؒ نے یہ عہد کرلیا تھا کہ وہ کسی سے کچھ بھی نہ مانگیں گے۔

دورانِ سفر آپؒ کو کثر فاقہ کشی کرنا پڑی۔ آپ کا نفس آپؒ کو بہت مجبور کر رہا تھا۔ آپؒ نے خود کو مخاطب کیا۔ ”اے میرے نفس! میں محسوس کر رہا ہوں کہ تیری مسلسل فاقہ کشی سے بہت بری حالت ہو رہی ہے لیکن میں بھی کیا کروں، مجبور ہوں اس لیے صبر کر۔“

نفس نے اندر سے خوشامد کی۔ ”اے سہلؒ! میں مچھلی اور روٹی کھانا چاہتا ہوں۔ اگر آپؒ میری یہ خواہش پوری کردیں تو میں آپؒ کو مکہ معظمہ تک نہیں ستاؤں گا اور خاموش رہوں گا۔“

آپؒ نے کہا۔ ”لیکن میں کیا کروں؟ میں نے تو یہ عہد کر رکھا ہے کہ کسی سے کچھ مانگوں گا نہیں اور میرے پاس رقم نہیں ہے کہ اس سے مچھلی اور روٹی خرید کر تیری خواہش پوری کروں۔“

نفس نے جواب دیا۔ ”مجھے نہیں معلوم کہ آپؒ میری خواہش کس طرح پوری کریں گے لیکن میں روٹی اور مچھلی ضرور کھانا ضرور چاہتا ہوں۔“

آپؒ ذرا پریشان سے ہو گئے، بولے۔ ”ٹھہر جا، دیکھ تو میں تجھے کیسی سزا دیتا ہوں۔“

آپؒ نے ادھر ادھر گھوم پھر کر جائزہ لیا کہ یہاں کس قسم کی مشقت کر کے کچھ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ ایک جگہ آپؒ نے دیکھا کہ ایک اونٹ چکی سے بندھا ہوا مشقت کر رہا ہے۔ آپؒ چکی والے کے پاس تشریف لے گئے اور اس سے پوچھا۔ ”بھائی! کیا یہ اونٹ اسی طرح دن بھر چکی میں لگا رہتا ہے؟“

چکی والے نے جواب دیا۔ ”ہاں، کیوں؟ تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟“

آپؒ نے پوچھا۔ ”یہ اونٹ کس کا ہے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”میں نے اسے کرایے پر لے رکھا ہے۔“

آپؒ اس جواب سے بہت خوش ہوئے، پوچھا۔ ”اونٹ والے کو اونٹ کی دن بھر کی مشقت کا کیا معاوضہ دیتے ہو؟“

اس نے جواب دیا۔ ”دو دینار۔“

آپؒ نے کہا۔ ”چکی والے مجھ پر ایک مہربانی کردو۔ تم اس اونٹ کو کھول دو اور مجھے اس کی جگہ باندھ دو، شام کو مجھے دو دینار کے بجائے ایک دینار دے دینا۔“

چکی والے نے آپؒ کو اوپر سے نیچے تک دیکھا اور تعجب سے پوچھا۔ ”اس اونٹ کی جگہ تم جتو گے؟“

”ہاں، کیونکہ اس وقت میرا نفس روٹی اور مچھلی کے لیے بہت تنگ کر رہا ہے۔“

چکی والے کو تامل ہوا لیکن آپؒ نے اصرار کیا۔ ”اے شخص! تو فکر نہ کر، اس طرح میں اپنے نفس کو سزا دینا چاہتا ہوں تاکہ یہ آئندہ مجھے تنگ نہ کرے۔“

چکی والے نے اونٹ کھول دیا اور اونٹ کی جگہ آپؒ کو باندھ دیا۔ آپؒ دن بھر چکی میں جتے مشقت کرتے رہے۔ شام کو اس محنت کے عوض آپؒ کو ایک دینار مل گیا۔ آپؒ نے اس دینار سے روٹی اور مچھلی خریدی اور اپنے نفس کی خواہش پوری کردی۔ آپ تھک کر چکنا چور ہو چکے تھے۔ دن بھر کی مشقت نے برا حال کر دیا تھا۔ آپؒ نے اپنے نفس سے کہا۔ ”دیکھ آئندہ جب بھی تو ایسی کوئی

خواہش کرے گا تو میں تجھے اسی طرح محنت و مشقت میں لگا دوں گا۔“

مکہ معظمہ میں آپؒ کی ملاقات ذوالنون مصری سے ہو گئی۔ آپؒ ان سے بیعت ہو گئے۔

☆☆☆

تستر واپس آکر آپؒ نے نہایت خاموشی سے اپنا کام جاری رکھا۔ آپؒ لوگوں کو تعلیم و تلقین کر کے صدق و صفا کی راہ دکھاتے۔ آپؒ کی شہرت دور دور تک تو پہنچ گئی۔ اسی دوران عمرو لیث نامی حاکم سخت بیمار پڑ گیا۔ اطبا نے جی جان سے اسے بچانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ عمرو لیث نے بیماری سے تنگ آکر اطبا کو ڈانٹ دیا۔

”تم نے حکمت پڑھی ہے یا گھاس کاٹی ہے۔ میں مہینوں سے بسترِ مرگ پر پڑا ایڑیاں رگڑ رہا ہوں اور تم مجھے تختۂ مشق بنائے ہوئے ہو، آخر بات کیا ہے؟“

طبیبوں نے بے بسی سے جواب دیا۔ ”حضور والا! ہم سب نے اپنے علم سے مقدور بھر کوشش کر ڈالی لیکن ناکام رہے۔ مشیت ایزدی کیا ہے ہمیں نہیں معلوم مگر یہ ضرور جانتے ہیں کہ اب معاملہ دوا کا نہیں دعا کا ہے۔ اب کسی خدا رسیدہ سے التجا کیجیے کہ وہ آپ کے حق میں دعا کرے۔“

عمرو لیث نے مایوسی سے دریافت کیا۔ ”لیکن وہ خدا رسیدہ ملے گا کہاں؟“

ایک طبیب نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ سہلؒ بن عبداللہ مستجاب الدعوات ہیں، خدا ان کی ضرور سنے گا۔“

عمرو لیث نے افسوس سے کہا۔ ”لیکن شاید وہ میرے حق میں کوئی دعا نہ کریں۔“

طبیب نے پوچھا۔ ”وہ کیوں؟“

عمرو لیث نے جواب دیا۔ ”وہ اس دور کے عوام، خواص، عرفا اور علما سبھی سے نفور اور نالاں ہیں۔ ظاہر ہے وہ مجھے اس لائق کیوں سمجھیں گے کہ دعا کریں۔“

طبیب نے کہا۔ ”آپ کا خیال درست نہیں ہے۔ سہلؒ دکھی انسانوں کی خدمت پر ہر وقت کمربستہ رہتے ہیں۔ آپ ان سے رجوع کریں گے تو میری ناقص رائے میں وہ آپ کو مایوس نہیں کریں گے۔“

عمرو لیث نے کہا۔ ”لیکن ان سے رجوع کس طرح کیا جائے؟“

طبیب نے جواب دیا۔ ”آپ اپنا ایک آدمی اس درخواست کے ساتھ ان کی خدمت میں روانہ کردیں کہ بندۂ لب گور آپؒ کی عنایات کا طالب بیشمار زندگی کی سانسیں پوری کر رہا ہے۔ اگر یہاں تک آنے کی زحمت نہیں گوارا کرسکتے تو اس عاجز کے حق میں موت ہی کی بددعا فرما دیجیے۔“

عمرو لیث نے طبیب کے مشورے پر عمل کیا۔ آپؒ فوراً عمرو لیث کے پاس پہنچ گئے، فرمایا۔ ”تو نے بددعا کی خواہش کی ہے، یہ میں کس طرح کر سکتا ہوں۔“

عمرو لیث نے رقت سے عرض کیا۔ ”میں آپؒ سے دعا کی درخواست کس منہ سے کروں؟“

آپؒ نے جواب دیا۔ ”نہیں، تو دعا کی خواہش بھی کرسکتا ہے لیکن یہ نکتہ بھی ذہن نشین کرلے کہ دعا اسی کے حق میں اثر انداز ہوتی ہے جو تائب ہو چکا ہو۔ اس لیے پہلے تو تم توبہ کرو، اس کے بعد میں دعا کروں گا۔“

عمرو لیث کی تو جان پر بنی ہوئی تھی فوراً توبہ استغفار کرنے لگا۔

آپؒ نے کہا۔ ”اوں ہوں، یوں نہیں، توبہ استغفار کے ساتھ ساتھ تم ان قیدیوں کو بھی رہا کردو جو قید خانے میں یونہی بند کر دیے گئے ہیں۔“ عمرو لیث نے اس حکم کی بھی تعمیل کردی۔

آپؒ نے اپنے ہاتھ دعا کے لیے اٹھا دیے۔ گریہ وزاری کرتے ہوئے فرمایا۔ ”اے اللہ! جس طرح تو نے اپنی نافرمانی کی ذلت سے عمرو لیث کو دوچار کردیا ہے اسی طرح میری عبادت کی عظمت بھی عمرو لیث کو دکھا دے۔“

دعا ابھی ختم ہی ہوئی تھی کہ عمرو لیث کو اپنے مرض میں افاقہ سا محسوس ہونے لگا۔

اسی وقت آپؒ کا ایک ارادت مند تلاش کرتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ وہ آپؒ کو واپس لے جانا چاہتا تھا۔ آپؒ نے فرمایا۔ ”ذرا دیر ٹھہر جا، عمرو لیث کو اچھا ہو جانے دے پھر میں تیرے ساتھ چلوں گا۔“

وہ ٹھہر گیا اور عمرو لیث کی حالت یہاں تک سدھر گئی کہ وہ بیمار لگتا ہی نہ تھا۔

آپؒ نے کہا۔ ”عمرو لیث! اب تم بالکل اچھے ہو چکے ہو اس لیے مجھے اجازت دو۔“

عمرولیث نے عاجزی سے کہا۔ ”حضرت! ایک ذرا توقف فرمائیں۔ میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔“
آپؒ رک گئے، عمرولیث اندر چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد جب واپس آیا تو اشرفیوں کی تھیلی اس کے ہاتھ میں تھی، نہایت ادب سے عرض کیا۔
”حضرت! یہ حقیر سا نذرانہ میری جانب سے قبول فرمالیں۔“
آپؒ نے خفگی سے جواب دیا۔ ”کیا تم یہ اشرفیاں میری دعا کی قیمت میں دے رہے ہو؟“
عمرولیث نے کانپ کر عرض کیا۔ ”حضرت! یہ میری مجال کہ میں اس قسم کا خیال تک لاؤں، استغفراللہ!“
آپؒ نے حقارت سے کہا۔ ”پھر انہیں وہیں لے جاکر رکھ دو جہاں سے نکال کر لائے ہو۔“
عمرولیث نے مجبوراً تھیلی نذر کرنے کے خیال سے توبہ کرلی۔
آپ کا مرید اس گفتگو کو نہایت افسوس سے سن رہا تھا۔ واپسی میں ایک جگہ عرض کیا۔ ”حضرت! نذرانہ قبول نہ کرکے آپؒ نے اچھا نہیں کیا۔“
آپؒ نے پوچھا۔ ”کیوں؟ اگر قبول کرلیتا تو کیا ہوتا؟“
مرید نے عرض کیا۔ ”حضرت! آپؒ سے کیا چھپاؤں دراصل میں بے حد مقروض ہوں، اگر آپؒ نذرانہ قبول کرلیتے تو میں اپنے قرض سے سبکدوشی حاصل کرلیتا۔“
آپؒ نے فرمایا۔ ”تو زر چاہتا ہے؟ کتنا زر چاہتا ہے؟ اپنے سامنے دیکھ۔“
مرید نے سامنے جو دیکھا تو دور تک سونا ہی سونا دکھائی دیا۔ مرید کے منہ میں پانی بھر آیا۔ آپؒ نے فرمایا۔ ”خدا نے جس کو یہ مرتبہ عطا کیا ہو اس کو دولت کی تمنا کس طرح ہوسکتی ہے۔“

☆☆☆

جمعے کا دن تھا، ایک بزرگ آپؒ کی ملاقات کو حاضر ہوئے۔ آپؒ کے نزدیک ایک سانپ کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ ان بزرگ کو سانپ کے خوف نے قریب نہیں جانے دیا۔ وہ دور کھڑے آپؒ کی اجازت کے منتظر رہے۔ آپؒ نے کہا۔ ”وہاں دور کھڑے کیا کررہے ہو، میرے قریب آجاؤ۔“
ان بزرگ نے جواب دیا۔ ”حضرت! اس سانپ کو تو دور کیجیے۔“
آپؒ نے کہا۔ ”دوست، اس کی پروا کیے بغیر آجاؤ یہ نہیں ستائے گا۔“
وہ بزرگ ذرا جھجکتے ہوئے آپؒ کے قریب پہنچے، سانپ ایک طرف ہٹ گیا۔
آپؒ نے ان بزرگ سے کہا۔ ”جو آسمان کی حقیقت سے ناواقف ہوتا ہے وہی زمین کی چیزوں سے خوف کھاتا ہے۔“ وہ بزرگ کچھ شرمندہ سے ہوگئے۔
آپؒ نے دریافت کیا۔ ”کیا نماز جمعہ کا بھی خیال ہے؟“
بزرگ نے جواب دیا۔ ”کیوں نہیں لیکن جامع مسجد تو یہاں سے اڑتالیس گھنٹوں کے فاصلے پر ہے۔ ہم یہ فاصلہ آخر کس طرح کریں گے؟“
آپؒ نے کھڑے ہوکر فرمایا۔ ”اس کی فکر تم کیوں کرتے ہو۔ لو میرا ہاتھ پکڑلو ہم ابھی وہاں پہنچ جائیں گے۔“
ان بزرگ نے آپؒ کا ہاتھ پکڑلیا۔ پلک جھپکتے میں جوان بزرگ کو ہوش آیا تو خود کو مسجد کے دروازے پر کھڑا دیکھا۔ دونوں مسجد کے اندر داخل ہوگئے اور نمازیوں کے صف میں کھڑے ہوکر نماز جمعہ ادا کی۔ اس کے بعد آپؒ نے ان بزرگ سے فرمایا۔
”حضرت! مخلص صاحب ایمان تو بہت قلیل ہیں، البتہ کلمہ گو بہت زیادہ ہیں۔“
بزرگ تو خاموش ہوگئے لیکن شاید یہ بات اللہ کو اچھی نہیں لگی۔ دوسرے جمعے کو آپؒ وضو کرکے جامع مسجد تشریف لے گئے۔ مسجد بھری ہوئی تھی۔ امام خطبے کے لیے منبر پر چڑھ چکا تھا۔ سہلؒ بن عبداللہ لوگوں کے اوپر سے گزرتے ہوئے پہلی صف میں داخل ہوگئے۔ مسجد کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ آپؒ کے سیدھے ہاتھ پر ایک نوجوان بیٹھا تھا۔ آپؒ نے اسے سرسری نظر سے دیکھا تو اس کی خوب صورتی نے آپؒ کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ اس کے پاس سے خوشبو کے بھبکے پھوٹ رہے تھے۔ اس نے ایک اونی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ اس نے بھی آپؒ کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”سہلؒ! تیرا کیا حال ہے؟ ٹھیک تو ہے؟“
آپؒ نے قدرے مرعوب ہوکر جواب دیا۔ ”ٹھیک ہوں اے اللہ کے صالح بندے۔“
آپؒ پریشان تھے کہ اس نوجوان نے تو آپؒ کو پہچان لیا ہے لیکن آپؒ اسے پہچاننے سے قاصر رہے تھے۔ اسی وقت آپؒ کو پیشاب کی حاجت محسوس ہوئی۔ آپؒ نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو آدمیوں کا زبردست ہجوم دیکھ کر ہمت پست ہوگئی۔ اتنی بہت ساری صفوں

کو پھلانگ کر پیشاب کے لیے جانا بڑا مشکل کام تھا۔ دوسری طرف پیشاب کی شدت کا یہ حال تھا کہ انتہائی صبر و برداشت کے باوجود رک نہیں رہا تھا اور یہ بھی اندیشہ تھا کہ واپس آتے آتے کہیں جماعت سے محروم نہ ہوجائیں۔ آپؒ اسی الجھن میں مبتلا تھے کہ اس اجنبی نوجوان نے آپؒ سے مسکرا کر دریافت کیا۔ ”اے سہلؒ! کیا تمہیں پیشاب کی تکلیف ہورہی ہے؟“
آپؒ نے حیرت سے جواب دیا۔ ”ہاں مگر تمہیں اس کا کیونکر علم ہوا؟“
نوجوان نے اپنی چادر اتار کر آپؒ کو اوڑھا دی اور کہا۔ ”سہلؒ! ان فضول سوال و جواب میں اپنا وقت ضائع نہ کرو، فوراً جاکر قضائے حاجت کرکے واپس آؤ اور نماز میں شامل ہوجاؤ۔“
آپؒ کی آنکھیں بند ہوگئیں کیونکہ نوجوان نے چادر کچھ اس طرح اڑھائی تھی کہ اس میں آپؒ کا چہرہ بند ہوگیا تھا۔ آپؒ نے گھبرا کر اپنے چہرے پر سے چادر ہٹائی تو حیرت کی انتہا نہ رہی۔ سامنے ایک بڑا سا دروازہ تھا۔ نہ مسجد تھی نہ نمازیوں کی صفیں تھیں اور نہ مسجد کے آس پاس کا ماحول۔ سامنے ایک بڑا سا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ دروازے پر ایک شخص کھڑا ہوا تھا، اس نے آپؒ سے کہا۔ ”سہلؒ! اندر جاؤ اور قضائے حاجات سے فارغ ہوکر واپس آجاؤ۔“
آپؒ اس محل میں داخل ہوگئے، یہ نہایت عالی شان تھا۔ اندر داہنی طرف ایک گھنا درخت کھڑا تھا۔ اس کی جڑ میں ایک لوٹا رکھا تھا جس میں پانی بھرا ہوا تھا۔ درخت سے ذرا آگے بیت الخلا تھا۔ آپؒ بیت الخلا سے فارغ ہوکر باہر جو نکلے تو درخت کی ایک شاخ سے ایک رومال لٹکا ہوا دیکھا۔ اس رومال میں ایک مسواک بندھی تھی، پیچھے سے آواز آئی۔ ”سہلؒ! تم غسل کرسکتے ہو اس کے بعد وضو کرلینا۔“
آپؒ نے غسل کیا اور وضو کرکے کپڑے پہنے اور چادر اوڑھنے لگے۔ آپؒ نے ابھی چادر اپنے سر پر ڈالی ہی تھی کہ آپؒ نے آواز سنی۔ ”سہلؒ! اگر تو اپنے کاموں سے فارغ ہوچکا ہے تو ہمیں مطلع کرتا کہ ہم تیری واپسی کا انتظام کریں۔“
آپؒ نے جواب دیا۔ ”میں اپنے ہر کام سے فارغ ہوچکا ہوں۔“
اس نے آپؒ کے اوپر سے چادر کھینچ لی۔ آپؒ نے گھبرا کر آس پاس دیکھا تو وہیں امام کے سامنے پہلی صف میں، اس اجنبی نوجوان کے برابر بیٹھے ہوئے تھے۔ آپؒ نے پریشان ہوکر اپنے آس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں کے چہروں سے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ کیا اس نوجوان کے علاوہ کوئی اور شخص بھی اس واقعے سے واقف ہے۔ پتا چلا سبھی لاعلم تھے۔ آپؒ اس سوچ میں پڑگئے کہ یہ جو کچھ ہوچکا ہے کہیں کوئی خواب تو نہیں تھا۔ کبھی آپؒ اس پر یقین لاتے اور کبھی تکذیب کرنے لگتے۔ اسی ادھیڑبن میں جماعت کھڑی ہوگئی۔ آپؒ نے نماز ادا کی لیکن نماز کے دوران بھی یہی واقعہ آپ کو پریشان کرتا رہا اور اس فکر نے آپؒ کو اور زیادہ تنگ کردیا تھا کہ آخر یہ نوجوان ہے کون؟
نمازیں پڑھ پڑھ کر نمازی مسجد سے نکلنے لگے۔ آپؒ نے اس نوجوان کا پیچھا کیا اور مسجد سے باہر نکل کر اس کا خاموشی سے تعاقب کرنے لگے۔ کافی دیر چلتے رہنے کے بعد وہ نوجوان ایک بڑے سے پھاٹک میں داخل ہوگیا۔ اس کے پیچھے ہی آپ بھی داخل ہوگئے۔ وہ نوجوان ایک دم پیچھے مڑا اور آپؒ سے کہنے لگا۔ ”اے سہلؒ! تم میرا پیچھا کیوں کررہے ہو؟ کیا تم اس پر یقین نہیں کررہے جو آج تمہارے ساتھ پیش آچکا ہے؟“
آپؒ نے جواب دیا۔ ”اپنے شک و شبہے کو دور کرنے کے لیے ہی تو میں نے تمہارا پیچھا کیا ہے۔ میری حیرت کسی طرح بھی کم نہیں ہورہی ہے کہ آخر یہ اسرار کیا ہیں؟“
نوجوان نے کہا۔ ”اچھا پھر میرے پیچھے چلے آؤ۔“
آپؒ اس کے پیچھے پیچھے چلتے رہے۔ اندر داہنی طرف وہی گھنا درخت کھڑا تھا۔ اس کی جڑ میں پانی سے لبریز لوٹا رکھا ہوا تھا۔ درخت سے ذرا آگے بیت الخلا تھا اور درخت کی ایک شاخ سے مسواک سمیت ایک رومال لٹک رہا تھا۔
نوجوان نے آپؒ سے کہا۔ ”مزید یقین کے لیے رومال کو چھو کر بھی دیکھ لو کہ یہ گیلا ہے یا نہیں؟“
آپؒ نے رومال چھوا تو وہ واقعی گیلا تھا۔ آپؒ نے شدتِ جذبات میں کہا۔ ”میں اس واقعے کی صداقت پر اسی طرح یقین لارہا ہوں جس طرح خدا پر رکھتا ہوں۔“
نوجوان نے مسکرا کر کہا۔ ”سہلؒ! یاد رکھو جو اللہ کی اطاعت کرتا ہے اس کی ہر شے اطاعت کرتی ہے، اسے ڈھونڈو گے تو ضرور پالو گے۔“ پھر مسکرا کر کہا۔ ”اور سہلؒ! تمہیں اپنا وہ فقرہ یاد ہے کہ مخلص صاحب ایمان تو بہت قلیل ہیں اور کلمہ گو بہت زیادہ ہیں۔“
آپؒ کے دل پر ایک چوٹ لگی، آنکھیں بھر آئیں۔ نوجوان نے اپنے دونوں ہاتھ آپؒ کی آنکھوں پر رکھ دیے اور آنسو پونچھنے لگا۔ اس نے آنسو پونچھ کر جیسے ہی دونوں ہاتھ آپؒ کے چہرے سے ہٹائے تو دیکھا، سامنے نہ تو وہ نوجوان تھا، نہ وہ محل اور نہ کوئی دوسری ایسی چیز جس کا محل کے متعلقات میں شمار ہوتا تھا۔ آپؒ اپنے گھر کے دروازے پر کھڑے تھے۔ آپ فوراً ہی اندر داخل ہوگئے

اور گریہ وزاری کرتے ہوئے سجدے میں گر گئے۔

☆☆☆

ایک عرصے بعد دورانِ سفر آپؒ کو ایک جنگل میں یوں محسوس ہوا گویا عبادت اور یادِ الٰہی کی یہ لذت انہیں پہلے کبھی نہیں حاصل ہوئی تھی۔ اس دوران نماز کا وقت آ گیا۔ آپؒ نے سوچا کہ اس لذت میں مزید اضافے کے لیے وضو بہت ضروری ہے لیکن اس ویران جنگل میں پانی حاصل کرنا آسان نہیں تھا۔ آپؒ غم و رنج سے اداس ہو گئے اور پانی کی عدم یافت سے پوری روح بے چین اور مضطرب سی ہو گئی۔ اچانک کسی کے آنے کی آہٹ محسوس ہوئی۔ آپؒ نے آہٹ کی سمت دیکھا، درختوں کی آڑ سے کوئی کالی شے حرکت کرتی بڑھی چلی آ رہی تھی۔ آپؒ حیرت سے اس سمت غور سے دیکھنے لگے۔ کوئی کالا کلوٹا شخص دو پیروں پر آپؒ کی طرف چلا آ رہا تھا۔ جب وہ درختوں کے درمیان سے نکل کر باہر سامنے آ گیا تو آپؒ پریشان بھی ہوئے اور حیرت زدہ بھی۔ یہ ایک ریچھ تھا جس نے اپنے سر پر ایک گھڑا اٹھا رکھا تھا اور اس گھڑے کو اس نے اپنے اگلے دونوں پاؤں سے پکڑ رکھا تھا۔

آہستہ آہستہ وہ بالکل آپؒ کے قریب آ گیا۔ آپؒ کے دل میں طرح طرح کے خیالات آ رہے تھے۔ اس نے اپنے سر سے گھڑا آپؒ کے سامنے اتار کر رکھ دیا اور ہاتھ کے اشارے سے سلام کیا۔

آپؒ نے زیرِ لب سوال کیا۔ "خدایا تیری شان ہے کہ یہ گھڑا اس طرح میرے پاس آ گیا۔"

وہ ریچھ آپؒ کے سامنے مودب کھڑا رہا۔ آپؒ کے دل میں ایک علمی شبہ پیدا ہوا اور آہستہ سے ریچھ کو یوں مخاطب کیا، گویا اس سے جواب لینا مقصود نہیں ہے بلکہ محض اپنے علمی اعتراض کو زبان سے ادا کر کے دل کا بوجھ اتارنا ہے۔

"واللہ میں حیران ہوں کہ یہ پانی کا گھڑا جس طرح میرے پاس آیا ہے اس سے میں کیا سمجھوں؟"

انہیں ایسا محسوس ہوا گویا ریچھ جواب دے رہا ہے۔ "اے سہلؒ! ہم وحوش لوگ آج آپس میں ان لوگوں کے بارے میں باتیں کر رہے تھے جو اللہ کی محبت اور توکل میں دنیا سے تعلقات چھوڑے ہوئے ہیں کہ اچانک یہ آواز آئی سہلؒ بن عبداللہ وضو کے لیے پانی تلاش کرتے پھر رہے ہیں چنانچہ میں نے یہ گھڑا لیا اور آپؒ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔"

سہلؒ پر غشی طاری ہو گئی، جب ذرا ہوش آیا تو آپؒ نے دیکھا، پانی کا گھڑا سامنے رکھا ہوا ہے اور ریچھ جا چکا ہے۔ آپؒ نے اس پانی سے وضو کیا۔ کچھ پیاس بھی محسوس ہو رہی تھی۔ آپؒ نے پانی پینا چاہا تو آواز سنائی دی۔ "اے سہلؒ! تمہیں یہ پانی پینے کے لیے نہیں وضو کے لیے بھیجا گیا ہے اس لیے پینے سے پرہیز کرو۔"

گھڑا آہستہ آہستہ ہل رہا تھا۔ آپؒ نے اس سمت غور سے دیکھا۔ جدھر سے آواز آئی تھی لیکن ادھر کچھ بھی نہ تھا۔ اس کے بعد جو گھڑے کی طرف دیکھا تو وہ غائب ہو چکا تھا۔

آپؒ کو اپنے مرشد ذوالنون مصری کی یاد بہت ستاتی رہتی تھی۔ آپؒ دیوار سے ٹیک لگا کر نہیں بیٹھتے تھے اور نہ ہی کبھی پیر پھیلاتے تھے۔ لوگ آپؒ سے مختلف سوالات کر کے تقریر کرنے پر مجبور کرتے تھے لیکن جب سے آپؒ مکہ معظمہ سے واپس آئے تھے اس قسم کے جوابات اور تقریروں سے ہمیشہ گریز کیا کرتے تھے۔ ایک دن لوگوں نے دیکھا آپؒ اپنے پیر کی انگلیاں باندھ رہے ہیں۔ کسی نے دریافت کیا۔ "حضرت! ان انگلیوں میں کیا ہو گیا؟"

آپؒ نے جواب دیا۔ "ان میں سخت درد اٹھ کھڑا ہوا ہے۔"

پوچھا گیا۔ "کیا کہیں چوٹ لگ گئی ہے؟"

آپؒ نے جواب دیا۔ "نہیں، اس کی وجہ کچھ عرصہ بعد بتاؤں گا۔"

آپؒ چار ماہ تک انگلیوں کو باندھے رہے۔ لوگوں نے اس سلسلے میں بارہا سوالات کیے لیکن آپؒ نے جواب نہیں دیا۔

آپؒ کے مریدوں میں سے ایک شخص مصر گیا۔ وہاں آپؒ کے مرشد ذوالنون مصری سے ملاقات کی اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ان کے پیر کی انگلیاں بھی بندھی ہوئی ہیں۔ اس نے تعجب سے پوچھا۔ "حضرت! میں تستر سے آیا ہوں، وہاں میں نے اپنے پیر و مرشد سہلؒ بن عبداللہ کے پیر کی انگلیاں بھی اسی طرح بندھی دیکھی ہیں۔ میں نے اس سلسلے میں ان سے بار بار پوچھا بھی لیکن انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا، کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ایسا کیوں ہے؟"

ذوالنون مصری نے جواب دیا۔ "اے شخص! اس میں کوئی شک نہیں کہ سہلؒ کے علاوہ آج ایسا دوسرا کوئی بھی نہیں جو میرے درد سے باخبر ہو کر اس طرح میری پیروی کرے۔" مزید فرمایا۔ "میں تقریباً چار ماہ سے انگلیوں کے درد میں مبتلا ہوں۔"

وہ شخص جب تستر واپس پہنچا تو دیکھا سہلؒ نے انگلیاں کھول دی ہیں۔ وہ چونکہ اس راز سے واقف ہو چکا تھا اس لیے وہ ادب

جذبات سے مغلوب ہو کر آپؒ کے قدموں میں گر گیا اور کہنے لگا۔ "حضرت! اپنے پیر و مرشد کی مریدی کا جو حق آپؒ نے ادا فرمایا ہے میں یا کوئی اور اس کی ہمت نہیں کر سکتا۔"

ایک دن لوگوں نے دیکھا کہ آپؒ خلافِ معمول دیوار سے پشت لگائے بیٹھے ہیں۔ لوگوں کو اس پر حیرت ہوئی پھر آپؒ نے پیر بھی پھیلا دیے اور فرمایا۔ "لوگو...! تمہیں جو کچھ پوچھنا ہے مجھ سے پوچھ لو۔ آج میں تمہاری باتوں کے جواب دوں گا۔"

کسی نے پوچھا۔ "حضرت! یہ کیا ماجرا ہے کہ پہلے آپؒ نہ تو اس طرح دیوار سے پشت لگاتے تھے اور نہ اس طرح پیر پھیلا کر بیٹھتے تھے اور ہمیں یہ بھی یاد ہے کہ جب آپؒ سے سوالات کیے جاتے تھے تو ان کے جوابات بھی نہیں دیتے تھے پھر آج یہ حیرت انگیز تبدیلی کس طرح آ گئی؟"

آپؒ نے جواب دیا۔ "تھوڑی دیر پہلے تک میرے مرشد حضرت ذوالنون مصری بقید حیات تھے اور میں ان کے احترام میں یہ احتیاط روا رکھتا تھا لیکن اب وہ اس دنیا میں موجود نہیں ہیں اس لیے میں اب خود کو آزاد اور ہلکا سا محسوس کر رہا ہوں۔"

آپؒ نے حج کا دوبارہ قصد فرمایا اور بے سروسامانی سے روانہ ہو گئے۔ کسی بیابان سے گزرتے ہوئے آپؒ کو ایک نہایت بدحال بڑھیا ملی۔ اس کی غربت اور افلاس کا یہ حال تھا کہ پورا جسم چیتھڑوں سے ڈھکا تھا اور شاید بھوک سے چلنا دشوار ہو رہا تھا۔ آپؒ نے ازراہِ ترحم اسے اپنے پاس سے کچھ دینا چاہا تو اس نے آپؒ پر ایک ایسی نظر ڈالی کہ سہلؒ لرز گئے، بولی۔ "سہلؒ! کیا تو اللہ سے زیادہ رحیم و کریم ہے؟"

آپؒ نے جواب دیا۔ "ہرگز نہیں۔"

بڑھیا نے کہا۔ "پھر تو نے میرے حال پر رحم کی جرأت کس طرح کی؟ اللہ جو سب سے زیادہ رحیم و کریم ہے اور میرے چھپے ہوئے حالات سے باخبر ہے، کیا وہ میری مدد نہیں کر سکتا؟"

آپؒ نے ڈر کر جواب دیا۔ "کیوں نہیں کر سکتا۔ کیا مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہو گئی؟"

بڑھیا نے دیکھتے ہی دیکھتے اپنی مٹھی بند کر لی اور ذرا دیر بعد آپؒ کے سامنے کھول دی۔ آپؒ نے دیکھا اس کی ہتھیلی پر سونے کا ایک ٹکڑا رکھا ہوا ہے۔ اس نے آپؒ کو حقارت سے مخاطب کیا۔ "سہلؒ! تم کسی کو دینے کے لیے اپنی جیب سے نکالتے ہو لیکن مجھے غیب سے ملتا ہے۔"

اس فقرے نے آپؒ کی جو حالت کر دی بس آپؒ ہی جان سکتے تھے۔ آپؒ نے ذرا دیر کے لیے اس کے پاس قیام کیا اور بارگاہِ ایزدی میں پیشانی رکھ دی، گڑگڑاتے ہوئے بولے۔ "اے اللہ! تیرا بندہ سہلؒ تو تیرے بندوں کو پہچاننے سے قاصر رہ جاتا ہے پھر تجھے کس طرح پہچاننے جاننے کا دعویٰ کر سکتا ہے۔"

جب آپؒ نے سجدے سے سر اٹھایا تو وہ بڑھیا پھر غائب ہو چکی تھی۔

آپؒ نے بیت اللہ پہنچ کر اس کا طواف شروع کر دیا۔ طواف سے فراغت پا کر آپؒ ایک طرف بیٹھ گئے تو اچانک وہ بڑھیا نظر آ گئی اور یہ دیکھ کر تو ان کے ہوش و حواس ہی جاتے رہے کہ بڑھیا بیت اللہ کا طواف نہیں کر رہی تھی بلکہ بیت اللہ بڑھیا کا طواف کر رہا تھا۔ جب یہ طواف کر چکا تو آپؒ نے اس بڑھیا سے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔ "کیا میں یہ پوچھنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ بیت اللہ نے تیرا کیوں طواف کیا؟"

بڑھیا ہنسنے لگی، بولی۔ "سہلؒ! کیا تو یہ ذرا سی بات بھی نہیں جانتا کہ جو لوگ اختیاری طور پر یہاں پہنچتے ہیں ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ خود بیت اللہ کا طواف کریں لیکن جو یہاں اضطراری عالم میں آتے ہیں، کعبہ ان کا خود طواف کرتا ہے۔" آپؒ پر ایک بار پھر وجدانی کیفیت طاری ہو گئی۔

☆☆☆

آپؒ نے خواب میں دیکھا کہ قیامت قائم ہو چکی ہے اور بہت بڑا پرندہ میدانِ حشر میں جمع لوگوں کے سروں پر منڈلا رہا ہے اور پھر وہ ایک شخص کے کاندھے پر بیٹھ گیا اور اس شخص کو دھکیلتا ہوا ایک طرف غائب ہو گیا۔ کچھ دیر بعد یہ پرندہ پھر نمودار ہوا۔ اس شخص کا کوئی پتا نہ تھا۔ یہ پرندہ ایک اور شخص کے کاندھے پر بیٹھ گیا اور پھر اسے بھی دھکیلتا ہوا ایک طرف لے گیا، یہاں تک کہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ تیسری بار پھر تنہا نمودار ہوا۔

آپؒ نے عاجزی سے سوال کیا۔ "اے اللہ! تیرے بھید تیرے سوا کون جان سکتا ہے، کیا میں یہ پوچھنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ یہ پرندہ کیا کر رہا ہے اور یہ ہے کون؟"

آپؒ کو جواب دیا گیا۔ "اے سہلؒ! یہ پرندہ میرے بندوں کا تقویٰ ہے اور یہ صاحبِ تقویٰ کو پکڑ پکڑ کر جنت میں داخل کر رہا ہے۔"

پرندہ آپؒ کو بھی جنت میں لے گیا۔ وہاں آپؒ کی تین ایسے شناسا بزرگوں سے ملاقات ہوئی جو رحلت فرما چکے تھے اور آپ ان کی بزرگی اور عظمت سے اچھی طرح واقف تھے۔ آپؒ نے یکے بعد دیگرے ان تینوں سے ایک ہی سوال کیا، پوچھا۔ ''میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ دنیا میں آپ کو سب سے زیادہ ڈراؤنی شے کون سی پیش آئی؟''

انہوں نے جواب دیا۔ ''خاتمے کا ڈر۔'' ان تینوں کا ایک ہی جواب تھا۔ اس کے بعد آپؒ کی آنکھ کھل گئی اور محسوس کیا کہ انہیں بھی سب سے زیادہ خاتمے کا ہی ڈر ہے۔

کچھ عرصہ بعد آپؒ نے پھر ایک عجیب و غریب خواب دیکھا۔ آپؒ نے دیکھا ابلیس آپؒ کے سامنے موجود ہے۔ آپؒ نے اس سے سوال کیا۔ ''ابلیس! میں تجھ سے ایک سوال کروں؟''

اس نے جواب دیا۔ ''کیجیے۔''

آپؒ نے پوچھا۔ ''تو جھوٹ تو نہیں بولے گا؟''

ابلیس نے جواب دیا۔ ''سہلؒ! میں تم سے مایوس ہو چکا ہوں اس لیے جھوٹ نہیں بولوں گا۔''

آپؒ نے سوال کیا۔ ''کیا تو یہ بتائے گا کہ تیرے نزدیک سب سے زیادہ پریشان کن کیا بات ہوتی ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''بندے کا خدا کے ساتھ راز و نیاز میں مشغول رہنا۔''

آپؒ نے کہا۔ ''تو معلم الملکوت رہ چکا ہے، خدا کی وحدانیت کا علم تجھ سے زیادہ کسے حاصل ہوگا، آج میں تیری زبان سے کچھ سننا چاہتا ہوں۔''

ابلیس نے اللہ کی وحدانیت پر بولنا شروع کر دیا، وہ دیر تک بولتا رہا اور وہ رموز و اسرار بیان کیے کہ اس دنیا کا بڑے سے بڑا عارف بھی اتنی تشریح کے ساتھ معارف وحدانیت نہیں بیان کر سکتا۔

☆☆☆

آپؒ کے پڑوس میں دو بھائی رہتے تھے۔ ان میں سے ایک حج پر گیا۔ اس نے عرفات میں سہلؒ بن عبداللہ کو دیکھا۔ وہ آپؒ سے باتیں کرنا چاہتا تھا لیکن موقع نہیں مل سکا۔ وہ جب گھر واپس آیا تو اس نے اپنے بھائی سے کہا۔ ''بھائی! افسوس کہ سہلؒ بن عبداللہ کے قریب ہونے کے باوجود جب میدان عرفات میں آپؒ کو دیکھا تو کوشش کے باوجود میں آپؒ کے پاس نہ پہنچ سکا اور وہاں ملاقات کی سعادت سے محروم رہ گیا۔''

چھوٹے بھائی نے جواب دیا۔ ''بھائی صاحب! آپ ہوش میں تو ہیں، آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ میں آٹھویں ذی الحجہ کو آپؒ کے پاس بیٹھا آپؒ کی باتیں سن رہا تھا پھر میں کس طرح یقین کر لوں کہ آپ نے حضرت کو میدان عرفات میں دیکھا؟''

بڑے بھائی کو غصہ آ گیا۔ ''تم مجھے جھٹلانے کی کوشش نہ کرو۔ میں قسم کھا سکتا ہوں کہ میں نے انہیں عرفات کے میدان میں دیکھا تھا۔''

چھوٹے بھائی نے پوچھا۔ ''کس کی قسم؟''

بڑے بھائی نے جواب دیا۔ ''ہم دونوں آپؒ کے پاس چلتے ہیں، اگر آپؒ یہ کہہ دیں کہ ہاں میں انہیں عرفات میں دیکھ چکا ہوں تب کی بات ہے۔ آپؒ مجھے دیکھ کر مسکرائے بھی تھے۔ اگر میری بات غلط ثابت ہوئی تو مجھ پر میری بیوی حرام ہے۔''

دونوں بھائی آپؒ کے پاس پہنچے اور سارا قصہ بیان کر دیا۔

چھوٹے بھائی نے آپؒ سے کہا۔ ''کیا میں آٹھویں ذی الحجہ کو آپؒ کے پاس موجود نہیں تھا؟''

بڑے بھائی نے جوش سے کہا۔ ''اور حضرت! آپؒ سچ سچ فرمایئے کہ کیا میں آپؒ سے میدان عرفات میں نہیں ملا تھا؟ آپ تو مجھے دیکھ کر مسکرائے بھی تھے اور میں کوشش کے باوجود آپؒ کے پاس پہنچنے میں ناکام رہا تھا۔''

آپؒ نے چھوٹے بھائی سے کہا۔ ''تو اپنے بڑے بھائی سے ناحق الجھ رہا ہے، جا خدا کی عبادت میں مشغول ہو جا۔''

اور بڑے بھائی کو حکم دیا۔ ''کون ہے جو تجھے جھٹلا دے، تو اپنی بیوی کو مت چھوڑ۔''

بڑے بھائی نے آہستہ سے پوچھا۔ ''کیا یہ بھی درست ہے کہ آپ آٹھویں ذی الحجہ کو یہاں موجود تھے؟''

آپؒ نے جواب دیا۔ ''تو نے میدان عرفات میں جو کچھ دیکھا تھا، اب اسے کسی اور سے ہرگز بیان نہ کرنا۔'' دونوں بھائی ایک دوسرے کا منہ دیکھ کر رہ گئے۔

ایک شخص آپؒ کی ملاقات کو حاضر ہوا اور آپؒ سے پوچھا۔ ''حضرت! یہ بتایئے نجات کس بات میں ہے؟''

آپؒ نے جواب دیا۔ ''تین باتوں میں۔ خاموشی، تنہائی اور کم کھانے میں۔''

وہ شخص بہت خوش ہوا، بولا۔ ''حضرت! میں آپؒ کی صحبت میں زندگی گزار دینا چاہتا ہوں۔''

آپؒ نے جواب دیا۔ ''ٹھیک ہے تو رہ میری صحبت میں لیکن یہ تو بتا کہ میرے بعد تو کس کی صحبت اختیار کرے گا؟''

اس نے کہا۔ ''پھر خدا کی صحبت اختیار کروں گا۔''

آپؒ نے جواب دیا۔ ''پھر ابھی سے خدا کی صحبت کیوں نہیں اختیار کرتا کیونکہ اس کی صحبت سے کبھی تجھے مایوس نہیں ہونا پڑے گا۔''

آخری عمر میں آپؒ کے پاس درندے بے تکلف آنے جانے لگے۔ آپؒ نے ان کے لیے ایک کوٹھری وقف کر دی تھی اور اس کوٹھری کا نام بیت السباع (درندوں کا گھر) رکھ دیا تھا۔ لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ درندے دم ہلاتے ہوئے آپؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور انہیں ان کی کوٹھری میں پہنچا دیتے۔ وہاں ان درندوں کی گوشت سے تواضع کی جاتی۔

ایک دوسرے بزرگ شیخ ابوالغیث یمنیؒ کے سامنے جب یہ واقعہ بیان کیا گیا تو بعض آدمیوں نے اعتراضاً کہا۔ ''بھلا یہ کس طرح ممکن ہے کہ سہلؒ بن عبداللہ تستری کے پاس جنگلی درندے پالتو جانوروں کی طرح آتے جاتے رہیں اور کسی کو کوئی گزند نہ پہنچائیں؟''

شیخ ابوالغیث یمنیؒ نے غصے سے جواب دیا۔ ''تم لوگ سہلؒ بن عبداللہ کے مرتبے سے واقف نہیں ہو جبھی اس قسم کی باتیں کر رہے ہو۔''

کسی معترض نے کہا۔ ''حضرت! آپ بھی تو صاحب کشف ہیں آخر آپ کی طرف سے کوئی ایسی کرامت کیوں نہیں ظاہر ہوتی؟''

آپؒ نے جواب دیا۔ ''تو ذرا میرے ساتھ جنگل تک چل، وہاں مجھے ایک کام ہے اور وہیں تیرے اعتراض کا جواب بھی مل جائے گا۔''

شیخ ابوالغیث یمنیؒ اس معترض کو لے کر جنگل میں چلے گئے۔ یہ دونوں صاحبان اپنے اپنے گدھوں پر سوار تھے۔ جنگل میں شیخ ابوالغیث یمنیؒ تو گدھے کو چھوڑ کر لکڑیاں کاٹنے لگے اور معترض ادھر ادھر ہوا خوری کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد ایک طرف سے شیر کے دہاڑنے کی آواز سنائی دی۔ معترض ڈر کر بھاگنا چاہتا تھا کہ اس نے ایک وحشت ناک منظر دیکھا۔ شیر نے شیخ یمنیؒ کے گدھے کو پھاڑ ڈالا تھا اور اسے غرا غرا کر چٹ کر رہا تھا۔

معترض خوف کے ساتھ ساتھ دل میں اس بات پر ہنس رہا تھا کہ آج شیخ یمنیؒ کو وہ لاجواب کر کے رہے گا اور ان سے پوچھے گا کہ ''حضرت! آپؒ کی کرامت کہاں چلی گئی کہ شیر آپؒ کی موجودگی میں آپؒ کے گدھے کو چیر پھاڑ کر کھا گیا۔ آپؒ نے اسے روک نہیں لیا۔''

آپ لکڑیوں کا گٹھا لیے ہوئے جنگل سے نمودار ہوئے اور ادھر ادھر اپنے گدھے کو تلاش کرنے لگے۔ شیر آپؒ کے گدھے کو ایک درخت کی آڑ میں کھانے میں مشغول تھا۔

شیخ یمنیؒ نے اپنے گدھے کو آواز دی تو معترض نے طنزاً کہا۔ ''حضرت! آپ کا گدھا تو شیر کے پیٹ میں پہنچ چکا، اب آپؒ قیامت تک اسے پکارتے رہیے۔''

آپؒ نے پوچھا۔ ''وہ شیر کہاں ہے؟''

معترض نے ایک درخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''اس درخت کے پیچھے۔''

آپؒ نے پوچھا۔ ''اور تو یہاں کھڑا کیا کر رہا ہے۔ کیا تجھے شیر سے ڈر نہیں لگ رہا؟''

معترض نے جواب دیا۔ ''چونکہ شیر کی یہ عادت ہے کہ اگر اس کا پیٹ بھر چکا ہو تو وہ بلاوجہ چیر پھاڑ نہیں کرتا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر شیر میری طرف رجوع ہوا تو میں اپنے گدھے کو اس کے حوالے کر کے کسی درخت پر چڑھ جاؤں گا۔''

شیخ یمنیؒ نے کہا۔ ''افسوس کہ اب میں ان لکڑیوں کا گٹھا گھر تک کس طرح لے جاؤں گا؟''

معترض نے طنز کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''اس کام کے لیے میں اپنا گدھا تو پیش کرنے سے رہا۔ شیر کو حکم دیں کہ وہ آپ کا گدھا اگل دے۔''

شیخ یمنیؒ شیر والے درخت کی طرف بڑھے، بولے۔ ''کوئی ترکیب تو کرنا ہی پڑے گی۔''

معترض کی جان نکل گئی، خوشامد کرتے ہوئے بولا۔ ''حضرت! واپس آ جایئے، میرا گدھا حاضر ہے۔ یہاں سے نکلنے کی فکر کیجیے۔''

لیکن شیخ یمنیؒ رکے نہیں۔ درخت کے پیچھے شیر اس وقت بھی موجود تھا۔

آپؒ نے شیر کو ڈانٹا۔ ''کم بخت! یہ تو نے کیا کیا کہ میرا گدھا چٹ کر گیا۔ اب میں اپنی لکڑیاں کس پر لاد کر لے جاؤں گا؟''

شیر نے کتے کی طرح دم ہلانا شروع کر دی۔ آپؒ نے اس کا کان پکڑ لیا، بولے۔ ''آج تو میں تجھے چھوڑنے سے رہا۔ اگر گدھا نہیں ہے تو کیا ہوا، تو تو موجود ہے۔ چل میری لکڑیوں کا گٹھا اپنی پشت پر لاد کر میرے گھر تک پہنچا۔''

معترض نے یہ عجیب و غریب منظر دیکھا تو اس کے ہوش و حواس ہی جاتے رہے۔ آپؒ نے اس سے کہا۔ ''تو کیوں گھبراتا ہے، میں بات انصاف کی کر رہا ہوں۔ جب اس نے میرا گدھا کھایا ہے تو لامحالہ لکڑیاں بھی اس کی پشت پر لادی جائیں گی۔''

آپؒ نے لکڑیوں کا گٹھا شیر کی پشت پر رکھ دیا اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ خوف زدہ معترض آپؒ کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ آپؒ نے اپنے دروازے پر پہنچ کر لکڑیوں کا گٹھا شیر کی پشت سے اتار لیا اور شیر کو حکم دیا۔ "اب تو جنگل واپس جا۔"
شیر اس طرح دم دبا کر فرار ہوا جس طرح بکری بھاگ کھڑی ہوتی ہے۔
آپؒ نے خوف زدہ معترض سے پوچھا۔ "سہلؒ بن عبداللہ کے اس واقعے کے بارے میں تیرا کیا خیال ہے جس میں لوگ بتاتے ہیں کہ انہوں نے درندوں کے لیے بیت السباع قائم کر رکھا ہے؟"
اس نے سہم کر جواب دیا۔ "اب آپؒ جو کچھ فرمائیں گے میں یقین کرلوں گا۔"

☆☆☆

وفات کے قریب آپؒ کے مریدوں نے پوچھا۔ "حضرت! آپؒ کے بعد آپؒ کا خلیفہ کون ہوگا؟"
آپؒ نے جواب دیا۔ "شاد دلگیر آتش پرست۔"
لوگوں نے پوچھا۔ "برسر منبر وعظ کون کہے گا؟"
آپؒ نے اپنا پہلا جواب دُہرایا۔ "شاد دلگیر آتش پرست۔" لوگ حیرت کی وجہ سے زبان سے تو کچھ بھی نہ کہہ سکے لیکن ان کی صورتیں کہہ رہی تھیں کہ ایک آتش پرست آخر کس طرح ان کا خلیفہ بنے گا اور اسے برسر منبر مسلمان کس طرح جانے دیں گے۔
آپؒ نے شاد دلگیر آتش پرست کو بلوایا اور اسے نصیحت کی۔ "شاد دلگیر! میں تجھے حکم دیتا ہوں کہ میرے انتقال کے تیسرے دن یہاں آجانا اور ظہر کی نماز کے وقت سے وعظ کہنا شروع کردینا۔"
آپؒ کے انتقال فرمانے کے تین دن بعد شاد دلگیر آپؒ کی خانقاہ میں داخل ہوا اس وقت وہ اپنا مذہبی لباس پہنے ہوئے تھا۔ وہ اسی لباس میں منبر پر چڑھ گیا اور حاضرین کو مخاطب کیا۔ "لوگو! تمہارے سردار نے مجھے راہ نما بنایا ہے تمہیں اس میں کوئی اعتراض تو نہیں؟"
لوگوں نے جواب دیا۔ "ہمیں کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔"
مجمعے میں سے کسی نے سرگوشی کے انداز میں اعتراض کیا۔ "لیکن جناب! یہ بات ہے کتنی عجیب کہ ایک آتش پرست، خدائے واحد کے منبر سے ہماری راہنمائی کرے۔"
شاد دلگیر آتش پرست نے ہنس کر جواب دیا۔ "تیرا شبہ درست ہے لیکن اس ہدایت میں جو سہلؒ بن عبداللہ نے میرے حق میں فرمائی تھی، یہ اشارہ بھی مضمر ہے کہ میں آتش پرستی کو ترک کردوں۔"
اتنا کہہ کر اس نے اپنا آتش پرستی کا لبادہ اتار دیا۔ اس کے اندر اسلامی لبادہ موجود تھا۔ اس نے کہا۔ "اب میں مسلمان ہو رہا ہوں۔" شاد دلگیر کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوگیا۔
اس کے بعد اس نے پہلا وعظ جو کیا، اس کے مشہور الفاظ یہ تھے۔ "لوگو! میں نے تو ظاہری لبادہ اتار کر اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کیا ہے لیکن تم لوگ مسلمان ہو اور اگر تم روزِ محشر سہلؒ بن عبداللہ سے ملنا اور ان کے قریب رہنا چاہتے ہو تو اس کے لیے ضروری ہے کہ تم اپنے دلوں پر سے غیر اللہ کے لبادے اتار پھینکو۔"
ان جملوں نے لوگوں کے دلوں کی حالت بدل دی اور وہ سب زار و قطار رونے لگے۔
آپؒ کے جنازے میں ایک آتش پرست بھی موجود تھا۔ اس نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں اوپر سے فرشتوں کا نزول دیکھ رہا ہوں۔ اے کاش تم بھی دیکھ سکتے۔" اس کے بعد وہ آتش پرست بھی مسلمان ہوگیا۔
آپؒ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ زندگی چار قسم کی ہوتی ہے۔ فرشتوں کی زندگی، جو ہمیشہ اطاعت میں گزرتی ہے۔ نبیوں کی زندگی، جو علم اور وحی میں گزرتی ہے۔ صدیقوں کی زندگی، جو بے چون و چرا اقتدا میں گزرتی ہے اور باقی لوگوں کی زندگی، خواہ وہ عالم ہوں یا جاہل ہوں، زاہد ہوں یا عابد ہوں۔ ان سب کی کھانے پینے میں گزرتی ہے۔" اس کے بعد مزید فرماتے۔ "ضرورت نبیوں کے لیے ہے، قیام صدیقوں کے لیے، قوت مومنوں کے لیے اور رواتب چوپایوں کے لیے۔"
آپؒ کی ایسی باتوں نے آپؒ کو علمائے متکلمین میں شامل کردیا ہے اور اہلِ تستر ہمیشہ اس بات پر نازاں رہے کہ ان کے وطن کے سہلؒ بن عبداللہ ایک بہت بڑے صوفی ہی نہیں، بہت بڑے متکلم بھی تھے۔

ماخذات

خزینۃ الاصفیا، مفتی غلام سرور لاہوری۔ معارج الولایت، قلمی بحوالہ خزینۃ الاصفیا۔ حقیقہ الفقرا، بحوالہ خزینۃ الاصفیا۔ مفتاح العارفین (قلمی)، عبدالفتاح بن نعمان۔ حسنات العارفین، شہزادہ دارا شکوہ۔

ممی کی چوری

نجمہ مودی

بے شمار وارداتوں اور دلچسپ واقعات میں سے ایک کا انتخاب

یوں تو کوئی بھی مجرم ارتکابِ جرم کے دوران کسی نیکی کو بھی ذہن میں نہیں رکھتا مگر... یہاں تو زندگی سے محروم مردہ بدن کی بھی ایسی تجارت ہو رہی تھی کہ دل پریشان ہوگیا... لیکن یہاں یہ بات قابلِ غور نہیں تھی کہ چوری شدہ مال کی نوعیت کیا ہے۔ البتہ یہ اہم تھا کہ چوری کرنے والا کون ہے... اور جب نام نک ویلوٹ کا آجائے تو نقصان کا اندیشہ نہ ہونے کے برابر رہ جاتا ہے۔

کیرٹن کے سامنے گاڑی روکتے ہی نک ویلوٹ کی نظریں ایک مرتبہ پھر عقبی منظر پیش کرنے والے آئینے کی طرف اٹھ گئیں جہاں کسی گاڑی کی ہیڈ لیمپس کی روشنیاں چمکتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ چند سیکنڈ بعد ہی سیاہ رنگ کی ایک سیڈان ان کی گاڑی کے قریب سے گزرتی ہوئی چند گز آگے ایک موڑ پر غائب ہوگئی۔ یوں تو اس سڑک پر ٹریفک کا ایک نہ رکنے والا سیلاب رواں تھا لیکن اس سیڈان کو شناخت کرنے میں نک سے کوئی غلطی نہیں ہوئی تھی۔ وہ تقریباً پون گھنٹے سے اس گاڑی کو اپنے تعاقب میں دیکھ رہا تھا اور یہ تعاقب اس وقت شروع ہوا تھا جب وہ ساحل سے لوٹے تھے۔ راستے میں دو مرتبہ اس سیاہ سیڈان نے ان کی گاڑی کو اوورٹیک کیا تھا لیکن ہر مرتبہ کسی نہ کسی طرح وہ پھر ان کے پیچھے آگئی تھی۔ پہلے تو نک نے اسے محض اتفاق سمجھا تھا لیکن بالآخر اسے یقین کرلینا پڑا کہ وہ گاڑی ان کا باقاعدہ تعاقب کررہی تھی۔
نک ویلوٹ اپنے ایک دوست کی دعوت پر چند روز پہلے لاس اینجلز آیا تھا۔ ان دنوں چونکہ اس کے پاس کوئی کام نہیں تھا۔ اس لیے اس کے خیال میں چند روز تفریح

کر لینے میں کوئی ہرج نہیں تھا۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ کوئی تفریحی پروگرام ہو اور گلوریا اس کے ساتھ نہ ہو۔ انکشاف تو لاس اینجلز پہنچ کر ہی ہوا تھا کہ نک کا دوست والٹر دراصل شادی کرنے والا تھا۔ محض تجسس پیدا کرنے کے لیے اس نے خط میں شادی کا ذکر نہیں کیا تھا۔ بہرحال شادی کے چوتھے روز والٹر اپنی بیوی کے ساتھ ہنی مون منانے کے لیے فلوریڈا چلا گیا تھا اور گھر نک اور گلوریا کے حوالے کر گیا تھا۔ والٹر کی اس حرکت پر نک کو غصہ تو بہت آیا تھا لیکن اس نے جلد ہی غصہ تھوک دیا کیونکہ وہ تو آیا ہی تفریح کے لیے تھا اور تفریح والٹر کے بغیر بھی ہو سکتی تھی۔

آج شام ساحل پر گزارنے کے بعد رات گیارہ بجے کے قریب وہ واپس لوٹ رہے تھے کہ اس سیاہ سیڈان کو اپنے تعاقب میں دیکھ کر نک نے راستہ بدل دیا۔ گلوریا نے اس کی وجہ بھی دریافت کی لیکن نک نے کوئی جواب دینا مناسب نہیں سمجھا کم از کم اس وقت تک جب تک کہ اسے یقین نہ ہو جاتا کہ واقعی ان کا تعاقب کیا جا رہا تھا، دوسری صورت میں اسے گلوریا کے سامنے ندامت اٹھانا پڑتی۔ نک کی عادت تھی کہ وہ اس وقت تک کوئی بات نہیں کہتا تھا جب تک کہ خود اسے اس کا یقین نہ ہو جاتا۔

''کیا بات ہے، تم نے یہاں گاڑی کیوں روک لی؟'' گلوریا نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''میں تمہیں اتنا بھی کوڑھ مغز نہیں سمجھتا تھا۔'' نک ویلوٹ نے انجن بند کرتے ہوئے اسے گھورا۔

''میں ایسی ہوں بھی نہیں۔'' گلوریا نے تڑ سے جواب دیا۔ ''میں تو اسی وقت سمجھ گئی تھی جب تم نے راستہ تبدیل کیا تھا۔ کیا یہ غلط ہے کہ تمہارے راستہ تبدیل کرنے اور یہاں رکنے کی وجہ..... وہ سیاہ سیڈان ہے جو ابھی ابھی اگلے موڑ پر مڑی ہے؟''

''ٹھیک سمجھیں۔ میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ کون ہے اور یوں گھنٹے سے ہمارا تعاقب کیوں کر رہا ہے۔'' نک نے جواب دیا۔

''گاڑی قریب سے گزرتے ہوئے میں نے اس کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ وہ گاڑی میں اکیلا ہی تھا۔ سر پر سفید بالوں کی جھالر سی تھی۔'' گلوریا نے کہا۔

''یہ تم نے کون سا تیر مار لیا۔ سفید بالوں کی جھالر تو میں نے بھی دیکھی تھی لیکن گاڑی میں تاریکی کی وجہ سے اس کا چہرہ نظر نہیں آسکا تھا۔ بہرحال، اگر وہ واقعی ہمارا تعاقب کر رہا تھا تو چند منٹ میں پتا چل جائے گا۔'' نک بولا۔

''لاس اینجلز تم کئی مرتبہ آچکے ہو۔ یہاں کوئی ایسا آدمی تو نہیں جو تم سے کسی قسم کا انتقام لینا چاہتا ہو؟'' گلوریا کے لہجے میں تشویش تھی۔

''میرا خیال ہے امریکا کا کوئی شہر ایسا نہیں جہاں میری جان کے گاہک موجود نہ ہوں۔ لیکن تم اطمینان رکھو تمہارا آئی کسی کے لیے تر نوالہ ثابت نہیں ہوگا۔ چلو، اب اس ریسٹورنٹ میں چلتے ہیں۔ چند منٹ بعد ہی صورتِ حال کھل کر سامنے آجائے گی۔'' نک نے کہتے ہوئے اپنی طرف کا دروازہ کھول لیا۔

گلوریا بھی دروازہ کھول کر نیچے اتر آئی۔ وہ دونوں اِدھر اُدھر دیکھے بغیر نپے تلے قدم اٹھاتے ہوئے کیرٹن میں داخل ہو گئے۔ یہ اونچے طبقے کا ایک پرسکون ریسٹورنٹ تھا۔ وسیع ہال تین حصوں میں منقسم تھا۔ ایک حصہ چائے کافی وغیرہ پینے والوں کے لیے مخصوص تھا اور دوسرے حصے میں بار...... کاؤنٹر بنا ہوا تھا جبکہ تیسرے حصے میں چھوٹے چھوٹے پرائیویٹ کیبن بنے ہوئے تھے۔

نک نے ایک ایسی میز سنبھال لی جہاں سے داخلی دروازے پر نگاہ رکھی جا سکتی تھی۔ ان کے بیٹھنے کے فوراً بعد ہی ایک دراز قامت ویٹریس ان کے سر پر مسلط ہو گئی۔ وہ لوگ کھانا ساحل کے ایک ریسٹورنٹ میں کھا چکے تھے۔ اس لیے نک نے گلوریا کے مشورے کے بغیر کافی کا آرڈر دینے میں کسی جھجک کا مظاہرہ نہیں کیا۔

ویٹریس جیسے ہی کافی سرو کر کے گئی نک کی نظریں داخلی دروازے کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ ایک طویل قامت ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ نک کے اندازے کے مطابق اس کی عمر پینتالیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ صحت اگرچہ قابلِ رشک تھی لیکن سر کے بیشتر بال جھڑ چکے تھے۔ سفید بالوں کی ایک جھالر سی رہ گئی تھی جو کھوپڑی کا احاطہ کیے ہوئے تھی۔ نک نے اس طرح نظریں پھیر لیں جیسے اسے دیکھا ہی نہ ہو۔ دوسرے ہی لمحے اسے اپنی دائیں پنڈلی پر گلوریا کے پیر کی ہلکی سی ٹھوکر محسوس ہوئی۔

''ہاں، میں نے اسے دیکھ لیا ہے لیکن یہ چہرہ میرے لیے قطعی اجنبی ہے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے اس شخص کو پہلے کبھی دیکھا ہو۔'' نک نے کافی کا کپ اپنی طرف سرکاتے ہوئے اس انداز سے کہا جیسے وہ پہلے سے گلوریا سے باتیں کر رہا ہو۔

وہ شخص دروازے کے قریب کھڑا چند لمحے متجسس نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا پھر سیدھا ان ہی کی میز کی

طرف چلا آیا۔

''مسٹر نک ویلوٹ؟'' اس شخص نے میز کے قریب رک کر سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا پھر جواب کا انتظار کیے بغیر اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''تقریباً ایک ہفتہ پہلے شادی کی ایک تقریب میں تمہیں دیکھا تھا۔ اس کے بعد کوشش کے باوجود تم سے رابطہ نہیں ہو سکا۔ آج اتفاق سے ساحل کے ایک ریسٹورنٹ میں تمہیں دیکھ لیا لیکن تم سے ملاقات سے پہلے میں یقین کر لینا چاہتا تھا کہ کوئی اور شخص میرا یا تمہارا تعاقب تو نہیں کر رہا ہے۔''

''میرا خیال ہے ہم پہلے ایک دوسرے سے کبھی نہیں ملے۔'' نک ویلوٹ نے اسے گھورا۔ ''اور پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کوئی شخص میرا تعاقب کیوں کرنے لگا؟''

''دراصل میں بہت احتیاط پسند آدمی ہوں۔ کوئی قدم اٹھانے سے پہلے ہر پہلو کا جائزہ لینا ضروری سمجھتا ہوں۔''

''اسے تمہید سمجھتے ہوئے اب میں یہ جاننا چاہوں گا کہ تم کون ہو اور ہمارا تعاقب کیوں کر رہے تھے؟'' نک ویلوٹ نے اسے گھورا۔ ویسے اسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ یہ شخص بھی اس سے کوئی چیز چوری کرانا چاہتا ہے۔

''میرا نام الفریڈ بائکل ہے اور ایک معاملے میں تمہاری مدد چاہتا ہوں۔''

''اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں تو تمہیں یہ بھی علم ہوگا کہ میں کن شرائط کے تحت کام کرتا ہوں۔''

''کیا بکواس ہے نک! ہم یہاں تفریح کے لیے آئے ہیں۔ کام کی تلاش میں نہیں۔'' گلوریا نے مداخلت کرتے ہوئے اسے گھورا۔

''اگر تفریح کے دوران آمدنی کا کوئی وسیلہ بھی نکل آئے تو میں اسے برا نہیں سمجھتا۔'' نک نے کہا پھر الفریڈ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''ہاں تو مسٹر الفریڈ! مجھے امید ہے کہ تم میری بات سمجھ گئے ہو گے؟''

''اچھی طرح۔'' الفریڈ نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''تمہاری تمام شرائط مجھے منظور ہیں۔''

''تو پھر شروع ہو جاؤ۔ کیا چیز چوری کرانا چاہتے ہو؟ لیکن ایک منٹ، پہلے میں تمہارے لیے کافی منگوا لوں، تاکہ تم ہمارا منہ نہ تکتے رہو۔'' نک نے کہتے ہوئے ویٹریس کو ایک اور کافی لانے کا آرڈر دیا۔ چند سیکنڈ بعد جب ویٹریس کافی رکھ کر چلی گئی تو نک سوالیہ نگاہوں سے الفریڈ کی طرف دیکھنے لگا۔

الفریڈ نے کافی کی ایک چسکی لی اور کپ میز پر رکھ کر چند لمحے محتاط نگاہوں سے چاروں طرف دیکھتا رہا پھر مدھم لہجے میں کہنے لگا ''مجھے ایک عورت کی لاش چوری کرانا ہے۔''

''لاش!'' نک اور گلوریا نے بیک وقت حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''معاف کرنا دوست! تم نے غلط آدمی کا انتخاب کیا ہے۔ اس مقصد کے لیے تو تمہیں کسی گورکن کی خدمات حاصل کرنا چاہئیں۔''

''تم غلط سمجھے۔'' الفریڈ بولا۔ ''لاش کسی قبرستان سے نہیں ایک مکان سے چوری کی جائے گی۔ دراصل بات یہ ہے کہ تقریباً دو ماہ پہلے میری بیوی کا انتقال ہو گیا تھا۔ جولیا کی موت کے بعد میں اس کی محبت کو دل سے نہ نکال سکا۔ میں ایک ماہر سرجن ہوں اور لاشوں کو حنوط کرنے کے علم میں بھی مہارت رکھتا ہوں۔ میں نے متعدد نایاب جانوروں کی لاشیں حنوط کر کے نیشنل میوزیم کو تحفے کے طور پر دی ہیں جو اب بھی وہاں پر موجود ہیں۔ جولیا کی جدائی میرے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ زندگی میں بھی میں نے کبھی ایک لمحے کو اسے نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیا تھا۔ میں نے اس کی لاش کو حنوط کر لیا تاکہ وہ ہمیشہ میری نظروں کے سامنے رہے۔''

''عشق کی ایک لازوال داستان ہے۔'' نک اس کے خاموش ہونے پر بولا۔

''مذاق نہیں۔'' الفریڈ نے ناگواری سے اس کی طرف دیکھا۔ پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''میرا یہ اقدام اگرچہ سراسر غیر قانونی تھا لیکن میں اس سے باز نہ رہ سکا اور جولیا کی لاش کو حنوط کر کے ایک شوکیس میں سجا دیا، لیکن تقریباً دو ہفتے قبل ایک رات جب میں گھر لوٹا تو لاش غائب تھی۔''

''اسے وہ شوکیس پسند نہیں آیا ہوگا۔'' اس مرتبہ گلوریا نے لقمہ دیا۔

''میں سنجیدہ ہوں مس!'' الفریڈ کا لہجہ ایک بار پھر ناخوشگوار ہو گیا۔

''بات جاری رکھو مسٹر الفریڈ! میں پوری توجہ دے رہا ہوں بلکہ اب تو کچھ دلچسپی بھی لے رہا ہوں۔'' نک بولا۔

''لاش کو غائب پا کر مجھ پر دیوانگی سی طاری ہو گئی۔'' الفریڈ نے بات جاری رکھی۔ ''لیکن ظاہر ہے کہ میں پولیس میں چوری کی رپورٹ نہیں لکھوا سکتا تھا اس لیے میں نے اپنے طور پر اس کی تلاش شروع کر دی۔''

''تمہارے خیال میں لاش چرائی گئی تھی؟'' نک نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''ظاہر ہے، وہ خود چل کر تو کہیں جانے سے رہی۔'' الفریڈ بولا۔ ''تقریباً دس روز پہلے مجھے پتا چلا کہ جولیا کی ممی

اسی شہر میں موجود ہے۔ کسی نامعلوم شخص نے اسے چوری کر کے مصری ممی کے طور پر فروخت کر دیا تھا۔"

"اوہ، میرے خیال میں یہ لاش نیشنل میوزیم نے خریدی ہوگی؟"

"نہیں۔" الفریڈ نے نفی میں سر ہلایا۔ "میوزیم والے اتنے احمق نہیں ہیں کہ صدیوں پرانی ممی اور دو مہینے پہلے مرنے والی کسی عورت کی لاش میں فرق نہ کرسکیں۔ اس شہر میں تمہیں دو چار ایسے آدمی ضرور مل جائیں گے جو نوادرات جمع کرنے کے جنون میں مبتلا ہیں۔ ایڈورڈ کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔ اس کا ایک چھوٹا سا ذاتی میوزیم ہے۔ اسے نوادرات جمع کرنے کا خبط ہے۔ اپنے اس شوق کی تکمیل کے لیے وہ ہر سال لاکھوں ڈالرز خرچ کر ڈالتا ہے۔ اس کے میوزیم میں بہت سی ایسی چیزیں موجود ہیں جو چور بازار سے خریدی گئی ہیں۔ اگرچہ قانوناً یہ بھی جرم ہے لیکن اسے دولت کی آڑ حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک ان معاملات میں اس سے کبھی باز پرس نہیں کی گئی۔ جولیا کی لاش بھی اس نے خریدی ہے۔ اسے یقین ہے کہ یہ لاش قدیم مصر کی کسی شہزادی کی ہے۔"

"اگر ایسی بات ہے تو تم اسے صورتِ حال سے آگاہ کر کے لاش کی واپسی کا مطالبہ کرسکتے ہو۔" نک نے کہا۔

"اس میں بہت سی پیچیدگیاں ہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ کہ جولیا کی لاش کو حنوط کر کے میں خود جرم کا مرتکب ہوا ہوں۔ اگر میں نے اسے صورتِ حال سے آگاہ کر دیا تو وہ الٹا مجھے ہی اندر کروا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ میں لاش کی بے حرمتی نہیں چاہتا اس لیے اب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ کسی طرح لاش حاصل کر کے اسے مذہبی رسوم کے تحت دفن کر دیا جائے تاکہ جولیا کی روح اور میرے دل کو سکون مل سکے۔"

"ہوں۔" نک ویلوٹ نے اس کے خاموش ہونے پر ہنکارا بھرا۔ "کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ واقعی کوئی مصری ممی نہیں بلکہ تمہاری بیوی جولیا ہی کی لاش ہے؟"

"ہاں، میں ثبوت فراہم کرسکتا ہوں۔ میرے پاس جولیا کی تصویریں موجود ہیں جو میرے بیان کی تصدیق کریں گی۔" الفریڈ نے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک لفافہ نکال لیا اور اس میں سے ایک تصویر نکال کر نک کی طرف بڑھا دی۔

نک ویلوٹ غور سے تصویر کو دیکھنے لگا۔ یہ تصویر غالباً کسی پورٹریٹ سے کاپی کی گئی تھی۔ خوب صورت نقش و نگار والی اس عورت کی عمر نک کے خیال میں زیادہ سے زیادہ تیس برس رہی ہوگی۔ چند لمحوں بعد اس نے تصویر لوٹا دی۔

"ٹھیک ہے، میں تمہارا یہ کام کرنے کو تیار ہوں لیکن اگر کوئی قانونی الجھاؤ پیدا ہوا تو اس کی تمام تر ذمے داری تم پر ہوگی۔"

"اسی لیے میں بھاری معاوضے پر تمہاری خدمات حاصل کرنا چاہتا ہوں کیونکہ تم ایسے کاموں کے ماہر ہو۔ مجھے یقین ہے کہ لاش کی چوری کا انکشاف ہونے کے بعد ایڈورڈ کوئی ایسی حرکت نہیں کرے گا جس سے وہ خود قانون کی گرفت میں آتا ہو۔"

"مسٹر ایڈورڈ سے کہاں ملاقات ہوسکتی ہے۔ میرا مطلب ہے اس کا پتا وغیرہ؟" نک نے پوچھا۔

الفریڈ نے مطلوبہ پتا بتا دیا اور اس کے ساتھ ہی جیب سے پھولا ہوا لفافہ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "اس میں پچیس ہزار ڈالرز کی رقم کے علاوہ میرا پتا اور فون نمبر بھی موجود ہے لیکن کام پورا ہونے سے پہلے تم مجھ سے رابطہ قائم نہیں کرو گے نہ ہی لاش کو لے کر اس پتے پر آؤ گے۔ لاش حاصل کرتے ہی مجھے فون کر دینا میں مقررہ جگہ پر پہنچ جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے، اس کے لیے تمہیں شاید ایک ہفتہ انتظار کرنا پڑے۔" نک نے لفافہ جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"ایک ہفتہ کیوں؟"

"انسانی لاش کوئی ایسی چیز نہیں ہوتی جسے جیب میں ڈال کر لایا جاسکے۔ اس کے لیے مجھے خصوصی تیاری کرنا پڑے گی۔"

"ٹھیک ہے لیکن زیادہ تاخیر نقصان دہ ہوگی۔ ممکن ہے اس دوران ایڈورڈ لاش کہیں اور منتقل یا فروخت کر دے۔" الفریڈ اٹھتے ہوئے بولا۔

"مطمئن رہو۔ لاش خواہ کہیں بھی ہو تمہیں مل جائے گی۔" نک نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

الفریڈ کے جانے کے بعد نک نے مسکراتی ہوئی نگاہوں سے گلوریا کی طرف دیکھا اور اسے اٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود بھی کرسی چھوڑ دی۔

☆☆☆

ویسٹ ووڈ بلیوارڈ کی تیسری سڑک کے موڑ پر سرخ پتھروں کی وہ عمارت اگرچہ چند سال قبل ہی معرضِ وجود میں آئی تھی لیکن اس کا طرزِ تعمیر دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اسے کم از کم ایک صدی قبل تعمیر کیا گیا ہوگا۔ گیٹ پر ایک باوردی دربان بھی موجود تھا جس سے مکینوں کی اقتصادی حالت کا

اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔ عمارت کے چاروں طرف ایک وسیع رقبے پر خوب صورت لان پھیلا ہوا تھا۔ دن کے وقت یہ پرشکوہ عمارت یقیناً قابلِ دید رہی ہوگی لیکن اس وقت پائیں باغ اور عمارت کا بیشتر حصہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ گیٹ پر دونوں طرف برقی قمقمے روشن تھے جن کی روشنی ایک محدود رقبے کو اجاگر کر رہی تھی۔ اس سے تقریباً پچاس گز آگے عمارت تک جانے والی سڑک تاریک تھی۔ عمارت کا برآمدہ روشن تھا۔ گراؤنڈ فلور کی ایک کھڑکی اور بالائی منزل کی دو کھڑکیوں میں بھی مدھم روشنی دکھائی دے رہی تھی لیکن اس کے علاوہ وسیع و عریض عمارت کے کسی حصے میں بھی روشنی کی کوئی جھلک نہیں تھی۔

جنوبی سمت سے آنے والی وہ گاڑی متوسط رفتار سے چلتی ہوئی عمارت کے گیٹ کے سامنے سے گزرتی چلی گئی لیکن تقریباً سو گز آگے ایک موڑ گھومتے ہی گاڑی رک گئی۔ اسٹیئرنگ ایک عورت کے ہاتھ میں تھا جس نے گاڑی روکتے ہی تمام بتیاں بجھا دیں اور پیچھے مڑ کر دیکھنے لگی۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے نک ویلوٹ نے کلائی پر بندھی ہوئی ریڈیم ڈائل والی گھڑی دیکھی۔ رات کا ایک بجا تھا۔ اس نے بیٹھے بیٹھے اپنی جیبیں ٹٹول کر ان کا جائزہ لیا۔ پھر دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھتے ہوئے سرگوشیانہ لہجے میں بولا۔

"تم ٹھیک دو بجے اس جگہ پہنچ جانا گلوریا! اگر میں یہاں نہ ملا تو زیادہ سے زیادہ ایک منٹ انتظار کرنے کے بعد واپس چلی جانا۔"

"کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوگی؟" گلوریا نے پوچھا۔

"گڑبڑ کے امکان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ کوشش کے باوجود میں آج دن میں عمارت کے اندر داخل ہونے میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ اس وقت جو بھی کام ہوگا محض اندازوں پر ہی ہوگا۔ مجھے ان معلومات پر بھروسا کرنا پڑے گا جو گزشتہ دو دن میں حاصل کرسکا ہوں۔" نک کہتا ہوا دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔

گلوریا نے ایک ہلکے سے جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا دی۔ نک ویلوٹ اس وقت تک وہیں کھڑا رہا جب تک کہ گاڑی کی عقبی سرخ بتیاں اگلے موڑ پر نگاہوں سے اوجھل نہ ہوگئیں۔ اس نے ایک بار پھر گھڑی پر نگاہ ڈالی اور مڑ کر اس سڑک پر چل دیا جو گھومتی ہوئی سرخ پتھروں والی عمارت کی پشت کی طرف چلی گئی تھی۔

گزشتہ دو دنوں میں نک ویلوٹ نے مختلف ذرائع سے اس عمارت کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تھی جو اگرچہ زیادہ حوصلہ افزا نہیں تھیں لیکن بہرحال ان کے سہارے کام چلایا جاسکتا تھا۔ عمارت کی چار دیواری زیادہ بلند نہیں تھی۔ اسے دوسری طرف پہنچنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ یہ بات وہ پہلے ہی معلوم کرچکا تھا کہ عمارت کے مکینوں کو کتوں سے کوئی لگاؤ نہیں تھا اس لیے وہ بے خوف و خطر عمارت کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

عمارت کی پشت پر پہنچ کر وہ رک گیا۔ دیوار کے قریب جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ جھاڑیوں میں رینگتا ہوا دیوار کے قریب پہنچ گیا اور جیب سے پینسل ٹارچ نکال کر اس کی محدود روشنی میں دیوار کے نچلے حصے کا جائزہ لینے لگا۔ روشنی جلد ہی ایک جگہ پر رک گئی۔ زمین کی سطح سے تقریباً ایک فٹ اوپر دیوار میں ایک روشندان نظر آرہا تھا۔ اس روشندان کی چوڑائی دو فٹ اور لمبائی چار فٹ کے قریب تھی۔ اندر کی طرف شیشہ اور باہر کی طرف لوہے کا جنگلا لگا ہوا تھا۔ یہ عمارت کے تہ خانے کا روشندان تھا۔ نک کی اطلاعات کے مطابق اس تہ خانے میں ایڈورڈ کا ذاتی میوزیم تھا جہاں اس نے دنیا بھر کے نوادرات جمع کر رکھے تھے اور اس کے مطابق الفریڈ کی بیوی جولیا کی حنوط شدہ لاش بھی اسی تہ خانے میں ہونی چاہیے تھی۔ نک کے خیال میں کوئی لاش چرا کر لے جانا واقعی آسان کام نہیں تھا۔ اس کے لیے لمبی چوڑی پلاننگ کی ضرورت تھی۔ آج وہ لاش چرانے کی نیت سے آیا بھی نہیں تھا۔ اس وقت وہ محض حفاظتی انتظامات اور چوری کے امکانات کا جائزہ لینے آیا تھا۔ اس میں اگرچہ یہ خطرہ بھی تھا کہ آج کی مداخلت سے وہ لوگ ہوشیار ہو کر حفاظتی انتظامات میں تبدیلیاں پیدا کر دیں جس سے خود نک کی راہ میں رکاوٹیں پیدا ہوسکتی تھیں لیکن اس کے سوا چارہ بھی نہیں تھا۔

روشندان کے قریب بیٹھ کر نک کچھ دیر تک لوہے کے جنگلے کا جائزہ لیتا رہا پھر جیب سے الیکٹرک ٹیسٹر نکال کر جنگلے کو چیک کرنے لگا۔ اس کا خدشہ بے بنیاد نکلا۔ جنگلے میں کرنٹ نہیں تھا۔ اس نے الیکٹرک ٹیسٹر جیب میں ڈال لیا اور فولاد کاٹنے والی ایک چھوٹی سی آری نکال کر جنگلے کی سلاخیں کاٹنے لگا۔ آری کے چلنے سے ہلکی سی آواز ابھر رہی تھی لیکن وہ آواز اتنی بلند نہیں تھی کہ اسے چند قدم کے فاصلے پر بھی سنا جاسکتا۔

تقریباً پندرہ منٹ میں چند سلاخیں کٹنے سے جنگلے میں اتنا خلا پیدا ہوگیا کہ وہ آسانی سے اندر داخل ہوسکتا تھا۔ آگے شیشہ تھا جسے بے آواز کاٹنے میں بھی اسے زیادہ

دشواری پیش نہیں آئی۔ کٹے ہوئے شیشے میں سے ہاتھ ڈال کر اس نے روشندان کھول دیا۔ اب وہ اندر کودنے کے لیے تیار تھا۔

اسے اندازہ نہیں تھا کہ روشندان زمین کی سطح سے کتنی بلندی پر تھا۔ پوزیشن ایسی تھی کہ وہ ٹارچ کی روشنی میں اندر کا جائزہ بھی نہیں لے سکتا تھا کیونکہ روشندان میں داخل ہونے کے لیے پہلے اس نے ٹانگیں اندر کو نکالی تھیں اور دونوں ہاتھ روشندان کے فریم پر جمائے اندر کی طرف لٹکا ہوا تھا۔ چند لمحے وہ خلا میں جھولتا رہا پھر ہاتھ چھوڑ دیے۔ ایک لمحے کو تو یوں محسوس ہوا جیسے پاتال میں گرتا چلا جا رہا ہو لیکن دوسرے ہی لمحہ دھب کی ہلکی سی آواز سے اس کے پیر فرش سے ٹکرائے۔ وہ تقریباً بارہ فٹ کی بلندی سے کودا تھا، اس لیے نیچے آتے ہوئے اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکا لیکن یہ بھی غنیمت تھا کہ اسے کوئی چوٹ نہیں آئی تھی۔

گرنے کے بعد بھی وہ کچھ دیر تک اپنی جگہ پر دبکا رہا۔ مکان کے اندر کسی محافظ کی موجودگی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ کئی منٹ تک جب کوئی ردعمل ظاہر نہیں ہوا تو اس نے ٹارچ جلالی اور اس کی محدود روشنی میں ماحول کا جائزہ لینے لگا۔ یہ ایک مختصر سا کمرا تھا جس میں فرنیچر نام کا ایک تنکا تک نظر نہیں آرہا تھا۔ فرش پر دھول جمی ہوئی تھی جو اس امر کا واضح ثبوت تھا کہ یہ کمرا طویل عرصے سے استعمال میں نہیں ہے۔ وہ اس دروازے کی طرف بڑھ گیا جو بائیں طرف نظر آرہا تھا۔

دروازہ بند تھا۔ وہ ہاتھ کے دباؤ سے کچھ دیر تک اسے آزمانے کی کوشش کرتا رہا لیکن جب کامیابی نہ ہوئی تو اس نے جیب سے ایک مخصوص بناوٹ کا آہنی تار نکال کر تالے کے کی ہول میں داخل کر دیا اور اسے مخصوص انداز میں دائیں بائیں حرکت دینے لگا۔ چند سیکنڈ بعد ہی کلک کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ اس نے تار نکال کر ہینڈل گھما دیا۔ دروازہ آہستگی سے کھلتا چلا گیا۔ سناٹے میں چرچراہٹ کی آواز اس طرح گونجی تھی جیسے مشین گن سے فائرنگ کی جارہی ہو۔ دروازے کے قبضوں میں غالباً بہت عرصے سے تیل نہیں دیا گیا تھا۔

دوسری طرف ایک راہداری تھی جو چند قدم آگے جاکر بائیں طرف مڑ گئی تھی۔ اس راہداری کے آخری سرے پر مدھم روشنی کا بلب جل رہا تھا۔ نک نے ٹارچ بجھا کر جیب میں ڈال لی اور دبے قدموں آگے بڑھنے لگا۔ اب وہ پہلے سے زیادہ محتاط ہوگیا تھا۔ راہداری میں چند قدم آگے دائیں طرف ایک دروازہ دیکھ کر وہ رک گیا۔ یہ دروازہ بھی اگرچہ مقفل تھا لیکن نک کو اسے کھولنے میں بھی زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ اندر داخل ہوکر اس نے دروازہ آہستگی سے بند کردیا۔ چند لمحے تاریکی میں گھورتا رہا پھر جیب سے ٹارچ نکال کر جلالی۔ دوسرے ہی لمحے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

یہ ایڈورڈ کا میوزیم تھا جو ایک وسیع ہال پر مشتمل تھا۔ اس کے چاروں طرف زمین سے چھت تک شیشے کے دروازوں والی الماریاں بنی ہوئی تھیں۔ ان الماریوں سے ہٹ کر مناسب فاصلوں پر متعدد شوکیس بھی رکھے ہوئے تھے۔ نک ویلوٹ گھوم پھر کر ٹارچ کی روشنی میں الماریوں اور شوکیسوں کا جائزہ لینے لگا جن میں مختلف چیزیں بھری ہوئی تھیں۔ ہر چیز کے ساتھ ایک تختی بھی موجود تھی جس پر اس چیز کے بارے میں وضاحت کی گئی تھی۔ نک حیرت و تعجب سے ہر چیز کو دیکھ رہا تھا۔ بعض چیزیں تو ایسی بھی تھیں جنہیں واقعی تاریخی ورثہ کہا جاسکتا تھا اور جن کی مالیت اس وقت کروڑوں ڈالرز ہوسکتی تھی۔

نک ویلوٹ کو حیرت تھی کہ ایسی نادرِ روزگار چیزوں کی حفاظت کے لیے کوئی خاطر خواہ انتظام کیوں نہیں کیا گیا۔ اس کی طرح کوئی بھی تہ خانے میں داخل ہوکر اس میوزیم کا صفایا کرسکتا تھا۔ ممکن ہے ایڈورڈ کو یہ یقین ہو کہ کوئی اس کے میوزیم میں داخل ہونے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ بہرحال، نک نے یہ سوچتے ہوئے سر جھٹک دیا کہ یہ اس کا دردِ سر نہیں تھا۔ وہ ہال میں گھوم پھر کر مختلف شوکیسوں کا جائزہ لینے لگا لیکن پورے ہال میں کوئی بھی ایسی چیز نظر نہیں آئی جسے لاش یا ممی کا نام دیا جاسکتا۔

وہ چند لمحے وہیں کھڑا الجھی ہوئی نگاہوں سے اطراف کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر ہال سے باہر آکر دبے قدموں دوسرے دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ یہ دروازہ مقفل نہیں تھا۔ وہ اندر داخل ہوگیا۔ یہ کمرا دفتر کے طور پر آراستہ تھا۔ یہاں بھی اگرچہ دیواروں کے ساتھ ایستادہ الماریوں میں کچھ نوادرات سجے ہوئے تھے لیکن ممی کا وجود کہیں بھی نظر نہیں آیا۔ ظاہر ہے ساڑھے پانچ فٹ کی عورت کی لاش کو میز کی دراز میں تو نہیں رکھا جاسکتا تھا۔ وہ دفتر سے نکل کر دوبارہ بڑے ہال میں آگیا اور ایک شوکیس کے قریب کھڑے ہوکر سوچنے لگا کہ ممی کو کہاں رکھا جاسکتا ہے۔

دفعتاً اس کے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ الفریڈ نے بتایا تھا کہ ایڈورڈ چوری کے نوادرات بھی خریدتا ہے اور جولیا کی ممی بھی ایک قدیم مصری ممی کی حیثیت سے اس کے پاس فروخت کی گئی تھی۔ ظاہر ہے چوری میں خریدی ہوئی چیزوں کو فوری طور پر منظر عام پر نہیں لایا جاسکتا۔ ہوسکتا ہے اس خیال کے تحت ایڈورڈ نے بھی اس ممی کو وقتی طور پر کسی دوسری جگہ رکھا ہو۔ ایک خیال یہ بھی تھا کہ ممکن ہے اس ہال میں کوئی ایسی خفیہ جگہ بھی موجود ہو جہاں ایسی کوئی چیز چھپائی جاسکتی ہو لیکن اس جگہ کا سراغ لگانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔

نک ویلوٹ کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ٹارچ کی روشنی نے شوکیس میں آراستہ ایک قدیم مصری رقاصہ کے مجسمے کو اپنے حلقے میں لے رکھا تھا۔ ببول کی لکڑی سے تراشا ہوا یہ مجسمہ تقریباً آٹھ انچ اونچا تھا۔ اس کی موٹائی ڈھائی انچ سے زیادہ نہیں تھی۔ اس رقاصہ کا تعلق تقریباً ساڑھے تین ہزار سال قبل مسیح کے بالائی مصر سے تھا۔ یہ مجسمہ اس خوب صورتی سے تراشا گیا تھا کہ رقاصہ کے چہرے پر پائے جانے والے تاثرات دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا جیسے وہ ابھی بول اٹھے گی۔ یہ فن پارہ دیکھ کر نک کو یہ اندازہ لگانے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی کہ تقریباً ساڑھے پانچ ہزار سال قبل مصر کے باشندے فنونِ لطیفہ میں کس قدر ترقی کرچکے تھے۔

وہ چند لمحے اس مجسمے کو دیکھتا رہا پھر شوکیس کا جائزہ لینے لگا۔ شیشہ آسانی سے ہٹایا جاسکتا تھا۔ اس کے دل میں بے اختیار یہ خواہش مچلی کہ ہزاروں سال قبل از تاریخ کے اس فن پارے کو ہاتھ میں لے کر دیکھے، اس خیال کے ساتھ ہی اس نے شوکیس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا مگر اس کی انگلیوں نے جیسے ہی شیشے کو چھوا پورا ہال الارم کی خوفناک آوازوں سے گونج اٹھا۔ اب یہ بات نک کی سمجھ میں آگئی تھی کہ ان نوادرات کی حفاظت کا ظاہری انتظام اتنا موثر کیوں نہیں تھا۔

الارم کی آواز گونجتے ہی نک نے ٹارچ بجھا کر دروازے کی طرف چھلانگ لگا دی۔ کیونکہ اسے یقین تھا کہ چند سیکنڈ کے اندر اندر کوئی نہ کوئی محافظ یہاں پہنچ جائے گا، جو اسے دیکھتے ہی گولی مار دے گا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ بروقت دروازے سے نکلنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ اگر اسے ایک لمحے کی بھی تاخیر ہوجاتی تو چوہے کی طرح اندر ہی پھنس کر رہ جاتا کیونکہ الارم بجنے کے صرف تین سیکنڈ بعد دروازہ الیکٹرونک انتظام کے تحت خودبخود بند ہوگیا تھا اور اس وقت تک نہیں کھل سکتا تھا جب تک کہ الارم سے اس کا کنکشن ختم نہ کیا جاتا۔ یہاں نک کی پھرتی کام آگئی تھی۔

ہال سے نکلتے ہی وہ اس کمرے کی طرف دوڑا جہاں وہ روشندان سے کودا تھا۔ خالی ہونے کی وجہ سے اس کمرے کے دروازے میں الیکٹرک نظام نہیں تھا۔ اس لیے اسے کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ الارم بجنے کے بعد پانچ سیکنڈ کے اندر اندر وہ روشندان سے باہر پہنچ چکا تھا لیکن اسے فوراً ہی جھاڑیوں میں دبک جانا پڑا۔ کچھ دیر پہلے تاریکی میں ڈوبی ہوئی عمارت اب پوری طرح روشنی کے حلقے میں تھی۔ یہ روشنی لان میں جابجا نصب سرچ لائٹس سے خارج ہورہی تھی۔ عمارت کے چاروں طرف لان کا بیشتر حصہ بھی اب روشنی کی زد میں تھا اور عمارت کے بعض حصوں میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ ایسی صورت میں کسی کی نظروں میں آئے بغیر نکل جانا ممکن نہیں تھا۔ وہ جھاڑیوں میں دبکا ایک طرف کو بڑھتا رہا۔ ایک طرف اسے ایسی جگہ نظر آئی تھی جہاں درختوں کی وجہ سے قدرے تاریکی تھی۔ وہ پیٹ کے بل اسی طرف رینگنے لگا۔ یہاں رکے رہنے کا خطرہ بھی مول نہیں لیا جاسکتا تھا کیونکہ اسے یقین تھا کہ چند منٹ بعد ہی محافظ چاروں طرف پھیل جائیں گے اور وہ کسی چوہے کی طرح پکڑ لیا جائے گا۔

درختوں کے نیچے پہنچ کر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ایک آدمی عمارت سے نکل کر تیز تیز قدموں سے گیٹ کی طرف جاتا ہوا نظر آیا۔ نک نے گھڑی دیکھی۔ دو بجنے میں چار منٹ باقی تھے۔ اگر وہ مقررہ وقت پر یہاں سے نکل کر گلی میں نہ پہنچ سکا تو یہ خدشہ بھی تھا کہ گلوریا کی گاڑی کہیں ان لوگوں کی نظروں میں نہ آجائے۔ اس طرح اس کے ساتھ گلوریا بھی مصیبت میں پھنس سکتی تھی۔ اس نے ایک لمحہ سوچنے میں ضائع کیا پھر اٹھ کر باؤنڈری وال کی طرف دوڑ لگادی۔ گھاس پر قدموں کی آوازیں نہیں ابھر رہی تھی۔ اس کے علاوہ اسے تاریکی کی آڑ بھی حاصل تھی۔ چاردیواری سے باہر آکر وہ بے تحاشا اس طرف دوڑتا رہا جہاں گلوریا کے ملنے کی توقع تھی۔

گلی میں داخل ہوتے ہی اسے گاڑی کا ہیولا دکھائی دیا۔ انجن کی گھرگھراہٹ کی ہلکی سی آواز سنائی دے رہی تھی۔ قریب پہنچتے ہی پچھلی نشست کا دروازہ کھول کر وہ اندر گر گیا۔ اس وقت اس کی کلائی پر بندھی ہوئی ریڈیم ڈائل والی گھڑی کی سوئیاں دو بج کر دو منٹ کا وقت بتا رہی تھیں۔ اس کے اندر داخل ہوتے ہی گاڑی ایک زبردست جھٹکے سے حرکت میں آئی اور تیز رفتاری سے ایک طرف دوڑنے لگی۔ نک سیٹ پر اوندھا پڑا بے ربط تنفس پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"خیریت ہوئی مسٹر ویلوٹ! اگر میں یہاں نہ ہوتا تو

چند منٹ کے اندر اندر تمہیں ان گلیوں میں گھیر لیا جاتا۔"

ننک ولیوٹ اس طرح اچھل پڑا جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ وہ سیدھا ہو کر پھٹی پھٹی سی آنکھوں سے اگلی سیٹ کی طرف دیکھنے لگا جہاں گلوریا کے بجائے الفریڈ بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی کھوپڑی پر سفید بالوں کی جھالر اس کی شناخت کے لیے کافی تھی۔

"تت...... تم......" ننک ہکلایا۔ "گلوریا کہاں ہے؟"

"تم نے شاید عجلت میں دھیان نہیں دیا، یہ گاڑی بھی تمہاری نہیں ہے۔ تمہاری دوست ایک بج کر اٹھاون منٹ پر یہاں پہنچی تھی اور ٹھیک دو بج کر ایک منٹ پر یہاں سے رخصت ہو گئی۔"

"تم یہاں کیسے پہنچے؟" ننک نے پوچھا۔ اب وہ اپنے حواس پر مکمل طور پر قابو پا چکا تھا۔

"جب سے جولیا کی لاش کی بازیابی کا کام تمہیں سونپا ہے میں اس وقت سے تمہاری نگرانی کر رہا ہوں۔"

"گویا تمہیں شبہ ہے کہ میں تمہاری رقم لے کر غائب نہ ہو جاؤں۔" ننک کے لہجے میں ناگواری تھی۔

"یہ بات نہیں۔ اگر اعتماد نہ ہوتا تو میں تم سے رابطہ ہی قائم نہ کرتا۔ تم میری اندرونی کیفیت کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ میں تمہاری نگرانی اس لیے کر رہا تھا کہ کسی گڑبڑ کی صورت میں تمہاری مدد کر سکوں مثال کے طور پر اس وقت یہاں میری موجودگی تمہارے کام آ گئی۔ میں نہیں چاہتا کہ کسی وجہ سے مجھے ناکامی کا سامنا کرنا پڑے جب تک جولیا کی لاش مجھے واپس نہیں مل جائے گی، اس وقت تک مجھے سکون نہیں ملے گا۔"

"اب صورتِ حال یہ ہے مسٹر الفریڈ!" ننک کے لہجے میں بدستور ناگواری تھی۔ "تمہیں یہ تو پتا چل گیا ہوگا کہ میری رہائش کہاں ہے۔ اس وقت تو مجھے کہیں بھی ڈراپ کر دو لیکن صبح میرے گھر پر آ کر اپنی رقم واپس لے لینا۔ میں اس طرح کام کرنا پسند نہیں کرتا کہ ایک آدمی میرے سر پر مسلط ہو۔ رہا مدد کا سوال تو میں اپنی مدد آپ کے اصول پر کام کرتا ہوں۔ مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں۔ گاڑی یہیں روک دو اور صبح کسی وقت آ کر اپنی رقم لے لینا۔"

"تم...... میرا مطلب یہ نہیں تھا مسٹر ولیوٹ!" الفریڈ یکدم گڑبڑا گیا۔ اسی بدحواسی میں اس نے ایکسلریٹر سے پیر ہٹا کر بریک پیڈل دبا دیا۔ جس سے چند گز آگے جا کر گاڑی ایک جھٹکے سے رک گئی۔

"اگر تمہارا یہ مطلب نہیں تھا تو آئندہ مجھ سے دور رہنا۔ سمجھے؟" ننک نے کہتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔

"ایک منٹ مسٹر ولیوٹ!" الفریڈ جلدی سے بولا۔ "تم تقریباً ایک گھنٹا ایڈورڈ کے مکان میں رہے ہو۔ تم نے جولیا کی لاش بھی دیکھی ہوگی۔ ایسے حفاظتی انتظامات کی موجودگی میں لاش وہاں سے کیسے نکالو گے؟"

"یہ میرا دردِ سر ہے اور دوسری بات یہ کہ لاش ایڈورڈ کے میوزیم ہال میں نہیں تھی۔" ننک کہتا ہوا گاڑی سے اتر گیا۔ الفریڈ کا چہرہ دھواں ہو گیا لیکن ننک ولیوٹ اس کے چہرے کے تاثرات دیکھنے کے لیے وہاں رکا نہیں تھا۔

☆☆☆

یوں تو پورے شہر میں رات گئے تک زندگی کے ہنگامے جاری رہتے تھے لیکن جس جگہ ننک ولیوٹ گاڑی سے اترا تھا، یہ شہر کا زیریں علاقہ تھا جو متوسط طبقے کی آبادی پر مشتمل تھا۔ یہاں رات کو بھی دن کا سا سماں رہتا تھا۔ زندگی کی ہماہمی کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگانا دشوار ہوتا تھا کہ رات کب ختم ہوئی اور دن کب شروع ہوا۔ چھوٹے چھوٹے قمار خانوں اور شراب خانوں میں ہر وقت بھیڑ سی لگی رہتی تھی۔

چند قدم چلنے کے بعد ننک ولیوٹ ایک شراب خانے میں گھس گیا۔ الفریڈ نے اس کا موڈ آف کر دیا تھا اور یوں وہ کچھ پینے کی طلب محسوس کر رہا تھا۔ بار کاؤنٹر کے سامنے ایک اسٹول پر بیٹھتے ہوئے اس نے بار ٹینڈر کو وسکی کا آرڈر دیا۔

وہ گلاس پینے کے بعد وہ شراب خانے سے باہر نکل آیا۔ چند قدم چلنے کے بعد ہی ٹیکسی مل گئی۔ جب وہ گھر پہنچا تو گلوریا بے چینی سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔

"تم کہاں رہ گئے تھے ننک؟ میں پریشان ہو رہی تھی۔" وہ اسے دیکھتے ہی بولی۔

"تھوڑی سی گڑبڑ ہو گئی تھی۔ میں دو بج کر دو منٹ پر وہاں پہنچا تو تمہارے بجائے الفریڈ کو اپنا منتظر پایا۔"

"الفریڈ!" گلوریا نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"ہاں۔" ننک نے کہا اور پھر اسے الفریڈ سے ملاقات کی تفصیل بتانے لگا۔ آخر میں بولا۔ "اب ہمیں محتاط ہو کر کام کرنا پڑے گا۔ یوں بھی میرے خیال میں یہ کیس خاصا پیچیدہ ثابت ہوگا۔ ایڈورڈ خاصا محتاط آدمی ہے، اس نے جولیا کی لاش کسی ایسی جگہ چھپا رکھی ہے جہاں کسی عام آدمی کا پہنچنا ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔"

"تم انکار کیوں نہیں کر دیتے۔ بلاوجہ تفریح کا بیڑا غرق کر رہے ہو۔" گلوریا بولی۔

"یہ میرے اصول کے خلاف ہے۔ ایک مرتبہ کیس ہاتھ میں لینے کے بعد انکار میری توہین ہوگی۔" ننک کہتا ہوا بستر پر گر گیا۔

چند منٹ بعد ہی کمرے کی فضا میں اس کے ہلکے ہلکے خراٹے سنائی دینے لگے۔

☆☆☆

صبح کے اخبارات میں ایسی کوئی خبر نہیں تھی جس سے ایڈورڈ کے مکان پر گزشتہ رات ہونے والے ہنگامے کا کچھ پتا چلتا۔ اس سے ننک کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ ایڈورڈ نے پولیس کو بھی اس واقعے کی اطلاع نہیں دی ہوگی۔ گویا وہ اس معاملے کی تشہیر نہیں چاہتا تھا۔ تشہیر کی صورت میں ممکن ہے نوادرات سے دلچسپی رکھنے والے اس کے مکان کی طرف دوڑ پڑتے اور اس طرح ممکن ہے جولیا کی ممی کی بات بھی کسی طرح نکل آتی۔ اس کا ایک ہی مطلب ہو سکتا تھا کہ ایڈورڈ اس ممی کو لوگوں کی نگاہ سے پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا۔

اخبار میں ننک کی دلچسپی کی کوئی خبر نہیں تھی۔ وہ اخبار ایک طرف رکھنا ہی چاہتا تھا کہ اس کی نظر ایک چھوٹی سی خبر پر اٹک گئی۔ اندر کے صفحے پر سنگل کالم کی مختصر سی خبر تھی۔ خبر پڑھتے ہی اس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ آ گئی۔

"کوئی خاص خبر؟" گلوریا نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں، خاص ہی سمجھ لو۔" ننک کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ "آج شام آٹھ بجے نیشنل اسٹیڈیم میں مصری نوادرات کے موضوع پر ایک مختصر سا سیمینار ہو رہا ہے جس میں اس ریاست کے بعض ایسے لوگ شریک ہو رہے ہیں جنہیں مصریات پر اتھارٹی سمجھا جاتا ہے۔ ان میں ایڈورڈ کا نام بھی شامل ہے۔ خبر کے مطابق مسٹر ایڈورڈ آج سہ پہر تک اپنے دیہی مکان سے یہاں پہنچ جائیں گے۔"

"اوہ، اس کا مطلب ہے کہ گزشتہ رات ایڈورڈ اپنے مکان پر موجود نہیں تھا۔" گلوریا بولی۔

"ہاں، اور شاید اسی لیے گزشتہ رات کی گڑبڑ کی پولیس کو اطلاع نہیں دی گئی۔ ممکن ہے ایڈورڈ کے آنے کے بعد کوئی ایسا قدم اٹھایا جائے۔" ننک بولا۔

"تو پھر کیا خیال ہے۔ میرا مطلب ہے اس خبر سے تمہیں کیا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے؟" گلوریا نے پوچھا۔

"یہ بعد میں سوچا جائے گا۔ فی الحال ناشتے کے بعد نیشنل میوزیم جاؤں گا اور ضروری معلومات حاصل کرنے کے بعد شام کو اس اجلاس میں بھی شرکت کروں گا۔" ننک نے کہتے ہوئے اخبار ایک طرف رکھ دیا۔

گلوریا ناشتا تیار کرنے لگی۔ اس دوران ننک خاموش بیٹھا سوچتا رہا۔ اخبار میں سیمینار کی خبر پڑھنے کے بعد اس کے ذہن میں ایک نیا خیال ابھرا تھا لیکن ابھی کوئی بات واضح نہیں ہو سکی تھی اس لیے اس نے گلوریا کو فی الحال کچھ بتانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ شام کو سیمینار میں شرکت کے بعد ہی وہ اپنے خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کوئی منصوبہ بنا سکتا تھا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر ساڑھے دس بجے کے قریب وہ نیشنل میوزیم پہنچ گیا۔ اس میوزیم میں مصریات پر ایک الگ گیلری تھی جس میں قدیم مصری نوادرات کے علاوہ مصری علوم پر اچھا خاصا لٹریچر بھی موجود تھا۔ ننک ولیوٹ کچھ دیر تک نوادرات کا جائزہ لیتا رہا پھر لٹریچر کا مطالعہ کرنے لگا۔ لنچ کے وقفے کے دوران بھی وہ اپنی جگہ سے نہیں اٹھا تھا۔

چار بجے کے قریب جب اس نے سیٹ چھوڑی تو اپنے بارے میں وہ کہہ سکتا تھا کہ وہ مصریات پر اتھارٹی نہیں تو اتنا علم ضرور رکھتا ہے کہ اس موضوع پر کسی بڑے سے بڑے ماہر کو بھی متاثر کر سکے۔ مصری گیلری سے نکل کر وہ سیدھا میوزیم کے ڈائریکٹر کے پاس پہنچ گیا۔

میوزیم کا ڈائریکٹر رابرٹ ایک ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ ننک نے ایک فرضی نام سے اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ اسے قدیم مصری علم سے گہرا لگاؤ ہے اور آج شام اس میوزیم میں جمع ہونے والے ماہرین کی گفتگو سے کچھ فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔

"کیوں نہیں مسٹر جیمز!" میوزیم کے ڈائریکٹر رابرٹ نے مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "سیمینار میں آنے والوں کو آپ سے ملاقات کر کے یقیناً بہت خوشی ہوگی۔ دراصل اس سیمینار کا مقصد ہی یہ ہے کہ ایک دوسرے کے خیالات سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔ یہ کارڈ رکھ لیجیے۔ ٹھیک آٹھ بجے سیمینار شروع ہو جائے گا۔" رابرٹ نے میوزیم کا ایک کارڈ اس کی طرف بڑھا دیا۔

"شکریہ مسٹر رابرٹ!" ننک کارڈ جیب میں رکھتے ہوئے بولا۔ "میں نے سنا ہے کہ یہاں کسی صاحب کا ذاتی میوزیم بھی ہے۔ کیا اس سیمینار میں ان صاحب سے بھی ملاقات ہو سکتی ہے؟"

"مسٹر ایڈورڈ یہاں کی ایک معروف شخصیت ہیں۔ ان کے میوزیم میں بعض ایسے نوادرات موجود ہیں کہ ہمیں بھی رشک آتا ہے۔ وہ آپ سے مل کر یقیناً بہت خوش ہوں

گے۔'' رابرٹ نے کہا۔
نک ویلوٹ تقریباً ایک گھنٹے تک اس سے باتیں کرتا رہا پھر آٹھ بجے واپس آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گیا۔ میوزیم سے نکل کر وہ شہر کے مختلف مقامات پر گھومتا رہا۔ سات بجے کے قریب اس نے ایک ڈرگ اسٹور سے گلوریا کو فون کیا اور پھر ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر ہلکا سا ناشتا کرنے کے بعد میوزیم کی طرف روانہ ہو گیا۔
جب وہ میوزیم میں داخل ہوا تو آٹھ بجنے میں پانچ منٹ تھے۔ سیمینار کے تمام شرکا پہنچ چکے تھے۔ رابرٹ نے سب سے اس کا تعارف کرایا۔ نک، ایڈورڈ سے زیادہ بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی باتوں سے ایڈورڈ بھی خاصا متاثر نظر آ رہا تھا۔ ٹھیک آٹھ بجے جب اجلاس شروع ہوا تو نک کو سیٹ بھی ایڈورڈ کے ساتھ ہی ملی تھی۔ ماہرین کی تعداد آٹھ تھی جن میں سے دو کا تعلق تو لاس اینجلز ہی سے تھا اور باقی مختلف علاقوں سے آئے تھے۔ وہ ایک خاص موضوع پر باری باری اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے۔ آخر میں نک ویلوٹ کو بھی تقریر کرنے کے لیے کہا گیا تو وہ ایک ماہر اسکالر کی طرح بے تکان بولتا چلا گیا۔
دس بجے کے قریب اجلاس کی کارروائی ختم ہو گئی۔ نک ایک بار پھر ایڈورڈ کے ساتھ چپک گیا تھا۔ اس نے جب ایڈورڈ کا میوزیم دیکھنے کی درخواست کی تو وہ انکار نہ کر سکا۔ وہ ایڈورڈ ہی کی کار میں اس کے گھر پہنچ گیا۔ گیٹ میں داخل ہوتے ہوئے نک کچھ عجیب سا محسوس کر رہا تھا۔ گزشتہ رات اس مکان میں داخل ہونے کے لیے اسے کتنے پاپڑ بیلنے پڑے تھے۔
کچھ دیر نشست گاہ میں بیٹھ کر وہ بے تکلفی کے ساتھ ساتھ مصریات کے موضوع پر تبادلۂ خیال کرتے رہے۔ پھر ایڈورڈ اسے لے کر تہ خانے میں میوزیم والے ہال میں پہنچ گیا۔ نک اس دوران دیکھ چکا تھا کہ مکان کے اندر تین چار محافظ موجود تھے لیکن ان کی موجودگی برائے نام ہی تھی کیونکہ میوزیم کی حفاظت کے لیے اندر کا الیکٹرونک نظام ان سے زیادہ کارآمد تھا۔ نک نے یہ بات بھی خاص طور سے نوٹ کی تھی کہ اس دوران ایڈورڈ نے گزشتہ رات کی گڑبڑ کا تذکرہ تک نہیں کیا تھا۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ اس واقعے کی تشہیر نہیں کرنا چاہتا تھا۔
ایڈورڈ شوکیسوں میں آراستہ مختلف چیزوں کے بارے میں بتاتا رہا کہ ان کے حصول کے لیے اسے کتنی دولت خرچ کرنا پڑی تھی۔ ایک شکستہ کھوپڑی کے بارے میں اس نے بتایا کہ یہ اسے قاہرہ میں ایک مصری مزدور سے نہایت سستے داموں مل گئی تھی۔ بعد میں یہ انکشاف ہوا کہ یہ طوطخ آمن کے دربار کے ایک امیر کی کھوپڑی تھی جسے کھدائی کے دوران مصری مزدور نے غائب کر دیا تھا۔
''مسٹر ایڈورڈ!'' نک ویلوٹ نے اس کے میوزیم کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔ ''میں ایک خاص مقصد کے تحت لاس اینجلز آیا تھا۔ مجھے قدیم مصری ممیوں سے زیادہ دلچسپی ہے۔ چند روز پہلے میسوری میں مجھے یہ اطلاع ملی تھی کہ آپ نے حال ہی میں کوئی ممی وغیرہ خریدی ہے۔''
''تمہاری اطلاع غلط ہے مسٹر جیمز!'' ایڈورڈ نے اسے گھورا۔ ''میں نے کوئی ممی نہیں خریدی۔''
''میری اطلاع غلط نہیں ہو سکتی مسٹر ایڈورڈ!'' نک نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''مطمئن رہیے۔ اگر آپ اس ممی کو راز میں رکھنا چاہتے ہیں تو مجھ سے آپ کو کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا۔ میں دراصل ایک اور ممی کے بارے میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''
''کیسی ممی؟'' ایڈورڈ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
''تقریباً تین ماہ قبل مجھے طوطخ آمن کے دربار کی ایک رقاصہ سیری ادس کی ممی ملی تھی۔ یہ ممی بھی مقبرے کی کھدائی کے دوران ہی برآمد ہوئی تھی لیکن چند روز بعد چوری ہو گئی تھی۔ کئی برس تک مختلف ہاتھوں سے ہوتی ہوئی سیری ادس کی ممی چھ ماہ قبل مجھ تک پہنچی ہے۔ اس کا سودا کرنے سے پہلے میں نے پوری طرح اطمینان کر لیا تھا کہ میرے ساتھ کوئی دھوکا تو نہیں ہو رہا ہے لیکن بھاری رقم خرچ کرنے کے بعد اب میں بڑی شدت سے یہ محسوس کر رہا ہوں کہ میں اس کی حفاظت نہیں کر سکتا۔ چھوٹے نوادرات جمع کرنا اور بات ہے لیکن کسی ممی کو اپنے قبضے میں رکھنا میرے خیال میں ہاتھی پالنے سے کم نہیں ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ یہ ممی کسی میوزیم کو فروخت کر دوں گا لیکن اس صورت میں مجھے سب کچھ بتانا پڑے گا جس کا مطلب ہے کہ کچھ قانونی پیچیدگیاں بھی ہوں گی۔ میسوری میں جب مجھے یہ اطلاع ملی کہ آپ نے کوئی ممی خریدی ہے تو یہ سوچ کر یہاں چلا آیا کہ ممکن ہے میرے مسئلے کا بھی کوئی حل نکل آئے۔''
''گویا آپ وہ ممی فروخت کرنا چاہتے ہیں؟'' ایڈورڈ نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔
''ہاں۔ اگر آپ اسے خریدنا پسند کریں تو؟'' نک مسکرایا۔ ''آپ یہ نہ سمجھیے کہ میں آپ کو کسی قسم کا دھوکا دینے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ممی ایک ہفتہ آپ کے پاس رہے گی۔

اس دوران آپ اپنے طور پر اور دوسرے ماہرین کے ذریعے اس کے بارے میں اطمینان کر لیں۔ سودا اس کے بعد ہوگا۔''
''ہوں۔'' ایڈورڈ نے پُرسوچ انداز میں ہنکارا بھرا۔ ''میں اس سلسلے میں صبح آپ سے بات کروں گا مسٹر جیمز! آپ صبح دس بجے تشریف لے آئیے۔''
''ٹھیک ہے۔ میں صبح آ جاؤں گا۔'' نک کہتا ہوا اس کے ساتھ میوزیم ہال سے باہر نکل آیا۔
صبح ٹھیک دس بجے نک ویلوٹ ایک بار پھر ایڈورڈ کے عالیشان مکان میں پہنچ گیا جہاں ایڈورڈ نے پُرجوش انداز میں اس کا استقبال کیا۔ بے تکلفی کے دوران چند منٹ کی رسمی گفتگو کے بعد وہ جلد ہی اصل موضوع پر آ گئے۔
''مسٹر جیمز!'' ایڈورڈ نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''گزشتہ رات میں نے فون پر اپنے ایک دوست سے بات کی تھی۔ اگرچہ اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ طوطخ آمن کے مقبرے کی کھدائی میں اس کے دربار کی ایک رقاصہ سیری ادس کی ممی دریافت ہوئی تھی جس پر چند ہفتے کام بھی ہوا تھا لیکن پھر یکایک وہ ممی غائب ہو گئی۔ تقریباً دو سال بعد ایتھنز میں اس ممی کی موجودگی کا پتا چلا لیکن اس کے بعد اس کے بارے میں کچھ نہیں سنا گیا۔ اب بقول آپ کے وہ ممی آپ کے پاس ہے اور آپ اسے فروخت کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ممی آپ کے پاس کن ذرائع سے پہنچی؟ میں اس سلسلے میں کوئی سوال نہیں کروں گا البتہ اگر یہ سیری ادس کی ممی ثابت ہوئی تو میں منہ مانگی قیمت ادا کرنے کو تیار ہوں۔ اتفاق سے چند ہفتے پہلے میں نے جو ممی خریدی تھی، اس کا تعلق بھی طوطخ آمن ہی کے دور سے ہے۔ آپ نے سیمی راس کے بارے میں سنا ہوگا۔ یہ ممی تقریباً چھ ماہ پہلے ویانا کے سرکاری عجائب گھر سے چوری ہو گئی تھی۔''
''جی ہاں، کچھ عرصہ قبل میں بھی اس کی تلاش میں تھا اور اس تلاش کے دوران سیری ادس کی ممی میرے ہاتھ لگ گئی۔ کیا میں سیمی راس کی ممی ایک نظر دیکھ سکتا ہوں؟'' نک ویلوٹ نے کہا۔
''مجھے افسوس ہے۔ فی الحال یہ ممکن نہیں کیونکہ ممی یہاں موجود نہیں۔ میرے علاوہ صرف دو آدمی اس کے وجود سے آگاہ ہیں۔ گزشتہ سے پیوستہ رات میری عدم موجودگی میں کوئی نامعلوم چور میرے میوزیم میں داخل ہو گیا تھا۔ اس نے کسی چیز کو چھوا تک نہیں۔ جس سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ جو کوئی بھی تھا اسے سیمی راس کی تلاش تھی۔'' ایڈورڈ نے کہا اور پھر اس رات کے واقعے کی تفصیلات بتانے لگا۔
''میرا خیال ہے آپ کو حفاظتی انتظامات میں کچھ تبدیلیاں کر لینا چاہئیں۔ ورنہ ہو سکتا ہے کسی روز آپ کو بھاری نقصان اٹھانا پڑے۔'' نک نے مشورہ دیا۔
''میرے یہاں جدید ترین حفاظتی نظام موجود ہے۔'' ایڈورڈ نے کہا پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ ''میں آج بعد دوپہر اپنے دیہی مکان پر جا رہا ہوں۔ اگر آپ کل صبح سیری ادس کی ممی وہاں لے آئیں تو ہم اطمینان سے بات کر لیں گے۔''
''آپ جانتے ہیں کہ ایسی چیزوں کو ساتھ لیے پھرنا ممکن نہیں اس کے لیے آپ کو کم از کم دو دن انتظار کرنا پڑے گا۔ ممی میسوری میں ہے۔ میں آج ہی اپنے سیکریٹری کو فون کر لیتا ہوں۔ وہ خصوصی طیارے کے ذریعے ممی یہاں لے آئے گا۔ میں پرسوں دوپہر تک آپ سے رابطہ قائم کر سکوں گا۔'' نک نے جواب دیا۔
''ٹھیک ہے، میں آپ کا منتظر رہوں گا۔ سیمی راس کی ممی بھی میرے دیہی مکان پر ہے۔ اس طرح آپ اسے بھی دیکھ سکیں گے۔'' ایڈورڈ نے کہتے ہوئے اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا جو ملاقات ختم ہونے کا اعلان تھا۔
نک ویلوٹ نے گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ ایڈورڈ بیرونی گیٹ تک اسے رخصت کرنے کے لیے آیا تھا۔

☆☆☆

چاروں طرف سے بند سیاہ رنگ کی وہ وین درمیانی رفتار سے پہاڑی راستہ طے کر رہی تھی۔ وین کا پچھلا حصہ مکمل طور پر ایئرکنڈیشن تھا جس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ وین میں کوئی ایسی چیز موجود ہے جس کے گرمی سے خراب ہو جانے کا احتمال ہو۔ ڈرائیونگ کیبن میں اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھے ہوئے نک ویلوٹ کا جسم پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ بڑی مضبوطی سے اسٹیئرنگ پر جما ہوا تھا جبکہ دوسرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے رومال سے وہ بار بار چہرے کا پسینا پونچھ رہا تھا۔
سڑک بتدریج بلندی کی طرف جا رہی تھی۔ اسے لاس اینجلز سے روانہ ہوئے تقریباً دو گھنٹے ہو چکے تھے اور ایڈورڈ کے کہنے کے مطابق اسے اس سڑک پر مزید ایک گھنٹا سفر کرنا تھا۔ اس کے بعد اسے وہ بورڈ نظر آتا جس سے ایڈورڈ کی دیہی رہائش گاہ کی طرف جانے والے راستے کی نشاندہی

ہوتی تھی۔

روانگی سے پہلے نک ویلوٹ نے ایڈورڈ سے فون پر بات کرلی تھی۔ اسے یقین تھا کہ ایڈورڈ کا کوئی نہ کوئی آدمی اس کے استقبال کے لیے سڑک پر موجود ہوگا۔ تقریباً پانچ میل کا مزید راستہ طے کرنے کے بعد سڑک ڈھلوان ہوگئی۔ اسٹیئرنگ پر نک کی گرفت کچھ اور بھی مضبوط ہوگئی۔ بل کھاتی ہوئی اس سڑک پر ذرا سی بے پروائی بھی کسی خوفناک حادثے کا سبب بن سکتی تھی۔

ڈھلوان ختم ہونے کے بعد سڑک ایک مرتبہ پھر بلندی کی طرف جانے لگی۔ نک نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی۔ اس کے سفر کا تیسرا گھنٹا پورا ہونے لگا تھا۔ اس کی نظریں سڑک پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ کسی ایسے بورڈ کا متلاشی تھا جس سے ایڈورڈ کے مکان کی طرف جانے والے راستے کی نشاندہی ہوتی ہو اور پھر ایک موڑ گھومتے ہی اسے بڑی پھرتی سے بریک پیڈل دبا دینا پڑا۔ سڑک کے عین وسط میں ایک آدمی کھڑا اسے رکنے کا اشارہ کررہا تھا۔ گاڑی روکتے ہوئے نک کی نظریں اطراف کا جائزہ لینے لگیں۔ چند گز آگے دائیں طرف ایک کچا راستہ مڑتا ہوا نظر آرہا تھا۔ اسی موڑ پر وہ بورڈ بھی نظر آگیا جس کی ایڈورڈ نے نشاندہی کی تھی۔

''مسٹر جیمو؟'' سڑک پر کھڑا ہوا آدمی اسٹیئرنگ سائڈ کی کھڑکی کے سامنے رک کر سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''ہاں، لیکن تمہیں کیسے پتا چلا کہ تمہارا مطلوبہ آدمی میں ہی ہوسکتا ہوں؟'' نک اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

''صبح سے اب تک صرف تین گاڑیاں اس راستے سے گزری ہیں اور آپ تو ٹھیک اس وقت یہاں پہنچے ہیں جو مسٹر ایڈورڈ نے بتایا تھا۔'' وہ شخص کہتا ہوا اوپر سے گھوم کر نک کے پہلو میں بیٹھ گیا۔

نک نے گاڑی اسی کچے راستے پر موڑ دی۔ تقریباً نصف میل آگے بڑھنے کے بعد اسے درختوں میں گھری ہوئی قلعہ نما وہ عمارت دکھائی دی۔ تقریباً پانچ منٹ بعد وہ اس عمارت میں پہنچ چکے تھے۔ پورچ میں گاڑی رکتے ہی ایڈورڈ بھی ایک دروازے سے نکل کر سامنے آگیا۔ رسمی سی گفتگو کے بعد نک ویلوٹ نے وین کا پچھلا دروازہ کھول دیا اور ایڈورڈ کے آدمیوں نے وین سے وہ تابوت اتار لیا جس میں بہ قول نک ویلوٹ، طوطخ آمن کے دربار کی ایک رقاصہ سیری ادس کی ممی موجود تھی۔ تابوت کو عمارت کے اس ہال میں پہنچا دیا گیا جو کسی میوزیم سے کم نہیں تھا۔ تابوت اس جگہ رکھ دیا گیا جہاں تابوت سے ملتا جلتا شیشے کا ایک بکس پہلے ہی سے موجود تھا۔ نک کی نظریں شیشے کے اندر موجود ممی کے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔ قدیم طرز کے لبادے میں لپٹی ہوئی اس عورت کی عمر تیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ چہرے پر گلاب ایسی تازگی تھی۔ اسے دیکھ کر احساس ہوتا تھا جیسے گہری نیند سو رہی ہو اور ابھی انگڑائی لے کر اٹھ جائے گی۔ یہ تھی اس کی ممی جسے ایڈورڈ نے چند ہفتے قبل لاکھوں ڈالرز خرچ کرکے حاصل کیا تھا اور الفریڈ کے کہنے کے مطابق یہ اس کی چہیتی بیوی جولیا کی لاش تھی جسے مرنے کے بعد اس نے حنوط کرلیا تھا اور کسی نے اسے چرا کر قدیم مصری ممی کی حیثیت سے ایڈورڈ کو فروخت کردیا تھا۔ اسی ممی کی خاطر نک ویلوٹ کو یہاں تک آنا پڑا تھا۔

چند لمحے اس ممی کو دیکھنے کے بعد نک ویلوٹ نے اپنے ساتھ لائے ہوئے تابوت کا ڈھکنا اٹھا دیا اور جب اس نے رنگین چادر کا کونا اٹھایا تو اس کے قریب کھڑے ہوئے ایڈورڈ کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا ہو۔ اس ممی کا چہرہ تو شگفتہ پھول کی طرح تازہ تھا، ان کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ اسے دیکھ کر احساس ہوتا تھا جیسے ابھی ابھی سوئی ہو۔ ایڈورڈ تابوت پر جھک گیا اور ہلال نما نیلے رنگ کے اس نشان کو بہ غور دیکھنے لگا جو ممی کے دائیں رخسار پر نظر آرہا تھا۔

تقریباً آدھا گھنٹا گزر گیا۔ ایڈورڈ بعض دستاویزات کی مدد سے ممی کا موازنہ کرتا رہا پھر وہ اس طرح سیدھا ہوگیا جیسے اس ابتدائی معائنے سے کسی حد تک مطمئن ہوگیا ہو۔

''ٹھیک ہے مسٹر جیمو! آؤ ہم اطمینان سے بیٹھ کر بات کریں گے۔'' وہ کہتا ہوا دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا جنہوں نے ایڈورڈ والی ممی کے شوکیس پر سیاہ رنگ کی ایک بھاری چادر تان دی۔ نک نے بھی اپنی ممی کے چہرے پر چادر درست کرکے تابوت کا ڈھکنا بند کردیا۔

''بات یہ ہے مسٹر جیمو!'' ایڈورڈ نے نشست گاہ میں ایک صوفے پر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔ ''ممی کے سرسری معائنے سے کوئی بات واضح نہیں ہوسکی لیکن میرے خیال میں اس میں شبہے کی زیادہ گنجائش نہیں ہے۔ میں نے اپنے دو دوستوں کو بلایا ہے جو اس موضوع پر اتھارٹی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ لوگ کل صبح یہاں پہنچ جائیں گے۔ ان کے بعد ہی کوئی حتمی رائے قائم کی جائے گی۔''

''لیکن مجھے افسوس ہے مسٹر ایڈورڈ!'' نک نے

شیری کا گلاس اٹھاتے ہوئے کہا جو ابھی ابھی ایڈورڈ کا ایک ملازم میز پر رکھ کر گیا تھا۔ ''میں ممی کو یہاں نہیں چھوڑ سکتا، نہ ہی خود رہ سکتا ہوں۔''

''کیا مطلب؟'' ایڈورڈ نے الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''میرا جو آدمی اس ممی کو لے کر آج صبح میسوری سے یہاں پہنچا ہے اس کی اطلاع کے مطابق کچھ لوگ اس ممی کو حاصل کرنے کے لیے اس کے پیچھے لگ چکے ہیں۔ میں بہت بڑا خطرہ مول لے کر یہاں آیا ہوں۔ مجھے شبہ ہے کہ وہ لوگ یہاں پہنچ جائیں گے۔ میں زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے یہاں رک سکتا ہوں اس کے بعد ایک مختلف راستے سے کسی خفیہ مقام پر چلا جاؤں گا جس کا انتظام میں نے پہلے ہی کرلیا ہے۔ میں نے اپنے ٹھکانے کا پتا نیشنل میوزیم کے ڈائریکٹر مسٹر رابرٹ کو سمجھا دیا ہے۔ آپ کل کسی وقت اپنے دوستوں کو لے کر وہاں پہنچ جائیں تو کسی مداخلت کے خدشے کے بغیر زیادہ اطمینان سے بات ہوسکے گی۔ یہ ممی اس وقت یہاں لانے کا مقصد یہ تھا کہ آپ کسی قسم کا شک نہ کریں۔ وگرنہ فون پر بھی آپ سے بات ہوسکتی تھی۔''

''لیکن، میرے خیال میں آپ کو کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں۔ یہ محفوظ ترین جگہ ہے۔'' ایڈورڈ نے کہا۔

''میں کسی قسم کا خطرہ مول لینے کو تیار نہیں مسٹر ایڈورڈ! وہ لوگ دو مرتبہ پہلے بھی اس قسم کی کوشش کرچکے ہیں۔ اس لیے میں اس ممی کو فروخت کرنا چاہتا ہوں۔''

''یہ تو بڑی تشویش ناک خبر سنائی ہے آپ نے مسٹر جیمو! لیکن بہرحال میں آپ کو کسی بات کے لیے مجبور نہیں کروں گا۔'' ایڈورڈ نے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

نک چند لمحے خاموش رہا پھر اسے اس ممی کے بارے میں فرضی قصے سنانے لگا۔ اسی طرح باتوں میں دو گھنٹے گزر گئے اور پھر وہ جانے کے لیے اٹھ گیا۔ ایڈورڈ کی ہدایت پر اس کے آدمیوں نے نک والا تابوت ہال سے نکال کر وین میں رکھ دیا۔ وین کا پچھلا حصہ بند کرنے سے پہلے نک نے تابوت کا ڈھکنا اٹھا کر اطمینان کرلیا تھا۔ پھر اس نے گرمجوشی سے مسٹر ایڈورڈ سے ہاتھ ملایا اور اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھ گیا۔

وین کچی سڑک پر ہچکولے کھاتی ہوئی جارہی تھی۔ ایک چھوٹی سی چٹان کا موڑ گھومتے ہی اس نے گاڑی روک دی۔ سامنے سڑک پر گلوریا کھڑی تھی۔ گاڑی رکتے ہی وہ دوسری طرف کا دروازہ کھول کر نک کے پہلو میں بیٹھ گئی اور دوسرے ہی لمحے گاڑی ایک زبردست جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ راستہ خطرناک ہونے کے باوجود نک ویلوٹ وین کی رفتار بڑھاتا جارہا تھا۔

''کوئی دشواری تو پیش نہیں آئی تھی؟'' نک نے رومال سے چہرے کا پسینا پونچھتے ہوئے گلوریا سے پوچھا۔

''بالکل نہیں۔ تم نے دو گھنٹے کا وقت دیا تھا لیکن میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹے ہی میں اپنے کام سے نمٹ چکی تھی۔ ہال کے عقبی دروازے سے باہر نکلنے میں بھی کوئی دشواری پیش نہیں آئی لیکن اگر کوئی مل جاتا تو میرا جغرافیہ پوچھنے کی کوشش ضرور کرتا۔ ایسی صورت میں مجھے اپنا ہی کوئی حربہ استعمال کرنا پڑتا۔'' گلوریا مسکرائی۔

''گڈ۔'' نک ویلوٹ بھی مسکرا دیا۔ ''ویسے میں تمہارے فن کا قائل ہوگیا۔ مجھے خدشہ تھا کہ کسی موقع پر پول نہ کھل جائے اس لیے میں نے ایڈورڈ کو زیادہ دیر تابوت کے قریب رکنے نہیں دیا تھا۔ جب وہ تمہارے رخسار پر ہلال نما نشان کو چھو کر دیکھ رہا تھا تو میرا دل...... بے اختیار اچھل پڑا تھا۔ اگر وہ تمہارا سر، بازو یا شانے ٹٹولنا شروع کردیتا تو یقیناً تمہارے جسم کی حرارت محسوس کرکے چونک جاتا۔'' نک چند لمحے خاموش رہا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''میں تمہارا جسم اگرچہ سن کرچکا تھا لیکن یہ خدشہ بہرحال موجود تھا کہ دوا کا اثر وقت سے پہلے زائل نہ ہوجائے مگر میں نے یہ منصوبہ بہت سوچ سمجھ کر ہی بنایا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ہم ایڈورڈ کی بے وقوفی سے فائدہ اٹھانے میں کامیاب ہوجائیں گے۔ اس رات اس کے مکان کے تہ خانے میں واقع میوزیم میں بھرا ہوا کاٹھ کباڑ دیکھ کر میں سمجھ گیا تھا کہ لوگ اسے بے وقوف بنا کر اس کی جیبیں ہلکی کررہے ہیں۔ دولت مند شخص ہے۔ نوادرات جمع کرنے کے شوق میں لٹ رہا ہے اور اپنے آپ کو مصریات کا ماہر سمجھ کر خوش ہورہا ہے۔ دولت خرچ کرنے کا کوئی نہ کوئی ذریعہ تو ہونا چاہیے۔ ایسے خودستائش لوگ اپنی حماقتوں پر تو لاکھوں ڈالر ضائع کردیتے ہیں لیکن کسی غریب کو ایک وقت کا کھانا کھلانا بھی بوجھ سمجھتے ہیں لیکن...... اس کے میوزیم میں ایک دو چیزیں ایسی بھی تھیں جنہیں واقعی نوادرات میں شمار کیا جاسکتا ہے اور مجھے حیرت ہے کہ یہ چیزیں اس کے ہاتھ کیسے لگ گئیں۔''

''اب مزہ تو اس وقت آئے گا جب وہ شوکیس میں سے اپنی مصری ممی کو غائب پائے گا۔'' گلوریا نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

نک ویلوٹ بھی اس کے قہقہے میں شامل ہوگیا۔ کچھ دیر بعد اس نے وین شاہراہ سے ہٹا کر ایک ذیلی سڑک پر

ڈال دی۔ لاس اینجلز پہنچنے کے لیے یہ راستہ قدرے مختصر تھا۔

جب وہ شہر کی حدود میں داخل ہوئے تو شام کے سائے گہرے ہو چلے تھے۔ نک وہ راستے اختیار کر رہا تھا جہاں ٹریفک کم سے کم تھا۔ بالآخر کسی حادثے یا قابل ذکر واقعے کے بغیر وہ بنگلے ایونیو پر واقع ایک مکان میں پہنچ گئے۔ وین کو گیراج میں بند کرنے کے بعد نک نے گلوریا کی مدد سے ممی والا تابوت ایک کمرے میں پہنچا دیا اور کمرا بند کر کے دونوں باہر نکل آئے۔ کچھ دیر بعد گلوریا کو والٹر کے مکان پر چھوڑ کر نک چند ضروری کام نمٹانے کے لیے رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

رات دس بجے نک ویلوٹ بنگلے ایونیو والے مکان میں داخل ہوا تو وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ الفریڈ بھی تھا جس کی آنکھوں پر سیاہ رنگ کی پٹی بندھی ہوئی تھی کچھ دیر پہلے الفریڈ سے رابطہ قائم ہونے پر نک اسی شرط پر اسے یہاں لانے پر آمادہ ہوا تھا کہ اس کی آنکھوں پر پٹی باندھی جائے گی۔

کمرے میں داخل ہونے کے بعد نک نے الفریڈ کی پٹی کھول دی۔ تیز روشنی میں کچھ دیر تک تو وہ آنکھیں مچ مچاتا رہا چند سیکنڈ بعد جب آنکھیں روشنی سے مانوس ہوئیں تو کمرے کے وسط میں تابوت دیکھ کر وہ چونک گیا۔ اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر تابوت کا ڈھکنا اٹھالیا اور ممی کے چہرے سے چادر ہٹاتے ہی اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھر آئے۔ اس کی کیفیت اس بچے کی سی تھی جسے اس کا پسندیدہ کھلونا مل گیا ہو۔

"شکریہ مسٹر ویلوٹ!" الفریڈ، نک کی طرف گھوم گیا۔ "اس ممی کی حفاظت کے لیے مسٹر ایڈورڈ نے جو حفاظتی انتظامات کر رکھے تھے، ان کے پیش نظر مجھے امید نہیں تھی کہ تم اس کے حصول میں کامیاب ہو سکو گے۔ کیونکہ دو مرتبہ میں خود بھی ایسی کوشش کر چکا ہوں جن میں ناکامی کے سوا کچھ نہیں ملا تھا۔"

"لیکن تم نے پہلے اپنی ان کوششوں کا ذکر نہیں کیا تھا۔" نک نے اسے گھورا۔

"ضروری نہیں سمجھا تھا لیکن بہرحال، اس کارنامے پر تم معاوضے کے علاوہ انعام کے بھی مستحق ہو۔ جولیا کی تدفین کے بعد میں تم سے ملوں گا۔"

"تدفین یا فروخت کے بعد؟" نک نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔

"کیا مطلب؟" الفریڈ بری طرح چونک گیا۔

"میری بات کا مطلب تم اچھی طرح سمجھتے ہو مسٹر الفریڈ!" نک نے اس کے چہرے پر نظریں جما دیں۔ "تم نے مجھے اپنی بیوی کی جو تصویر دکھائی تھی وہ یقیناً اس ممی سے ملتی جلتی تھی۔ جس آرٹسٹ نے وہ تصویر بنائی تھی اس نے واقعی کمال کر دیا تھا کہ صدیوں پرانی لاش کے چہرے میں زندگی کی تمام تر رعنائیاں پیدا کر دی تھیں۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ تصویر تمہاری بیوی جولیا کی نہیں اس ممی کی تھی جس کا تعلق قدیم مصر سے ہے۔"

"کیا بکواس ہے۔" الفریڈ غرایا۔

"بکواس نہیں یہ حقیقت ہے مسٹر الفریڈ!" نک نے اپنی بات جاری رکھی۔ "یہ مصری ممی پچاس سال پہلے مغربی جرمنی کے ایک عجائب گھر سے چوری ہوئی تھی۔ تمہارا کاروبار بھی کچھ اسی قسم کا ہے۔ تم اپنی زندگی میں بے شمار نوادرات مختلف عجائب گھروں سے چوری کر کے ان لوگوں کے ہاتھوں فروخت کر چکے ہو جو دولت کے بل بوتے پر ذاتی شہرت کے خواہاں ہیں۔ چند سال قبل ایک میوزیم گزٹ میں تم نے اس ممی کی چوری کا حال پڑھا تو اس کی تلاش میں لگ گئے۔ چند ماہ قبل تمہیں پتا چلا کہ یہ ممی دیانا میں ایک شخص کے قبضے میں ہے۔ تم نے ممی حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے...... اس دوران وہ شخص مختلف لوگوں سے اس ممی کا سودا کرنے کی کوشش کر رہا تھا بالآخر ایڈورڈ سے اس کی بات طے ہو گئی اور تقریباً دو ماہ قبل یہ ممی اس کے قبضے میں آگئی۔ بقول تمہارے تم دو مرتبہ یہاں بھی اس ممی کے حصول کی ناکام کوشش کر چکے ہو۔ اس نے ایسے حفاظتی انتظامات کر رکھے ہیں کہ کوئی ماہر سے ماہر چور بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ پھر تم نے میری خدمات حاصل کیں۔ ایڈورڈ کے میوزیم کا جائزہ لینے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ یہاں سے کوئی چیز چرانے کے لیے باقاعدہ پلاننگ کی ضرورت ہو گی۔ اس دوران میں یہ بھی معلوم کر چکا تھا کہ ممی اس مکان میں نہیں ہے۔ اتفاق سے دوسرے روز ایڈورڈ سے ملاقات کا ایک وسیلہ پیدا ہو گیا۔ اسے شیشے میں اتارنے کے بعد میں نے اسے ایک اور قدیم مصری ممی فروخت کرنے کی پیشکش کی۔ اسے اعتماد میں لینے کے بعد ہی مجھے یہ پتا چلا تھا کہ تمہاری مطلوبہ ممی اس کے دیہی مکان میں ہے چنانچہ میں نے منصوبہ بندی شروع کر دی۔" نک چند لمحے خاموش رہ کر الفریڈ کے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگ دیکھتا رہا پھر سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "تمہیں نہیں معلوم کہ یہ ممی حاصل کرنے کے لیے مجھے اپنی اور اپنی دوست گلوریا کی زندگی خطرے میں ڈالنا پڑی تھی۔ میں نے اس کے جسم کو سن کر کے ایک دستاویز کی مدد سے اس کے چہرے پر ایک قدیم مصری ممی کا میک اپ کیا اور اسے تابوت میں ڈال کر ایڈورڈ کے دیہی مکان پر لے گیا۔ میں نے گلوریا کا جسم سن کرنے کے لیے جو دوا استعمال کی تھی وہ انتہائی خطرناک تھی جس سے اس کی موت بھی واقع ہو سکتی تھی۔ اس کے علاوہ یہ خطرہ بھی تھا کہ اگر...... پول کھل گئی تو ایڈورڈ ہمیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔ بہرحال، ایڈورڈ میری توقع سے کچھ زیادہ ہی بے وقوف ثابت ہوا۔ وہ اپنے طور پر گلوریا کو قدیم مصری ممی تسلیم کر چکا تھا لیکن دوسرے روز اپنے دوستوں سے اس کی تصدیق کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے ایک اور تحفہ دیا کیونکہ میرے پاس صرف دو گھنٹے کا وقت تھا۔ ایک مقررہ وقت کے بعد گلوریا کے جسم سے دوا کا اثر زائل ہو جاتا اور اس کے بعد یہ راز چھپانا مشکل ہو جاتا کہ وہ کوئی ممی نہیں زندہ عورت ہے۔ میں نے ایڈورڈ کو نشست گاہ میں باتوں میں الجھائے رکھا۔ اس دوران ایئر کنڈیشنڈ ہال میں تابوت کے اندر گلوریا کے جسم سے دوا کا اثر زائل ہوتے ہی وہ ہوش میں آگئی۔ اس نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر ایڈورڈ والی ممی کو اپنے تابوت میں منتقل کیا اور ہال کے عقبی دروازے سے غائب ہو گئی۔ میرا خیال ہے اب تک ایڈورڈ کو اپنی ممی کے فرار کا علم ہو چکا ہو گا اور اس کے آدمی خونخوار کتوں کی طرح میری بو سونگھتے پھر رہے ہوں گے۔"

"چلو مان لیا کہ تمہاری کہانی درست ہے لیکن اب کیا مسئلہ ہے۔ میں تمہاری محنت کا معاوضہ ادا کر چکا ہوں۔ اگر تم چاہو تو اتنی ہی رقم انعام کے طور پر بھی دے سکتا ہوں۔" الفریڈ نے پیشکش کی۔

"نہیں مسٹر الفریڈ!" نک مسکرایا۔ "میں تمہیں پہلے ہی اپنی شرائط سے آگاہ کر چکا تھا یعنی میں کوئی ایسی چیز نہیں چراتا جس کی کوئی تاریخی اہمیت ہو۔ یہ ممی تو تاریخی ورثہ ہے۔ اس کی جگہ کسی مکان کا خفیہ تہ خانہ نہیں میوزیم ہے جہاں تاریخ کے طالب علم اس سے کچھ حاصل کر سکیں اور لوگ یہ جان سکیں کہ قبل از تاریخ کے باشندوں کی تہذیب کیا تھی۔"

"تم بلاوجہ ضد کر رہے ہو مسٹر ویلوٹ!" الفریڈ بولا۔

"ضد نہیں، میں تو قدیم علوم و فنون سے دلچسپی رکھنے والوں پر ایک بہت بڑا احسان کر رہا ہوں جس کے لیے میں تمہارا بھی بہت شکر گزار ہوں۔ ٹھیک بارہ بجے نیشنل میوزیم کا ڈائریکٹر رابرٹ چند آدمیوں کو لے کر یہاں پہنچ جائے گا۔ ایک گمنام آدمی کی طرف سے یہ تحفہ پا کر اسے یقیناً بہت خوشی ہو گی اور مجھے یقین ہے کہ یہ ممی سامنے آنے کے بعد اس کے سلسلے میں مسٹر ایڈورڈ بھی اپنی زبان بند رکھیں گے اور تمہارے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ اپنے مفاد میں تمہاری زبان سے بھی ایسا کوئی لفظ نہیں نکلے گا جو میرے یا مسٹر ایڈورڈ کے لیے کسی الجھن کا باعث ہو۔ ہوش میں آنے کے بعد تم کہہ سکتے ہو کہ بعض نامعلوم آدمی تمہیں یہاں باندھ کر ڈال گئے تھے اگر تم نے ممی سے کوئی تعلق ثابت کرنے کی کوشش کی تو طویل عرصے کے لیے آہنی سلاخوں کے پیچھے بند ہو جاؤ گے۔"

"کیا مطلب؟" الفریڈ نے اسے گھورا۔

"مطلب۔" نک کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی اور پھر اچانک ہی اس نے الفریڈ کی کنپٹی پر بھرپور ہاتھ رسید کر دیا۔ وار کچھ اس قدر جچا تلا تھا کہ الفریڈ منہ سے آواز نکالے بغیر ڈھیر ہو گیا۔

نک ویلوٹ نے اسے تابوت کے قریب ہی ایک کرسی پر باندھ دیا اور منہ میں بھی کپڑا ٹھونس دیا تاکہ ہوش میں آنے کے بعد شور نہ مچا سکے۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد اس نے کمرے کا تنقیدی جائزہ لیا اور تمام دروازے بند کر کے باہر نکل گیا۔ ایک ڈرگ اسٹور سے اس نے چند منٹ فون پر کسی سے کوئی بات کی اور پھر والٹر کے مکان کی طرف روانہ ہو گیا جہاں گلوریا اس کی منتظر تھی۔

صبح آنکھ کھلتے ہی نک ویلوٹ نے اخبار اٹھالیا۔ صفحۂ اول پر دو دلچسپ خبریں تھیں۔ پہلی خبر تو اس گمنام شخص سے متعلق تھی جس نے ایک قدیم مصری ممی نیشنل میوزیم کو تحفے کے طور پر پیش کی تھی اور دوسری خبر ایڈورڈ کے دیہی مکان سے ایک مصری ممی کے فرار سے متعلق تھی۔ اخبار کے مطابق شہر کے لوگ ان دونوں واقعات میں کوئی تعلق تلاش کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

نک ویلوٹ نے اخبار رکھ کر گلوریا کی طرف دیکھا جو چائے لے کر آرہی تھی۔ "ہیلو ممی!" وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

"بکومت۔" گلوریا غرائی۔ "اب تم چند روز تک اس مکان سے باہر نہیں نکل سکتے۔ ایڈورڈ کے آدمی کتوں کی طرح شہر کے گلی کوچوں میں تمہاری بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں بھی دو چار روز مکمل آرام کرنا چاہتا ہوں۔ مگر یہ سوچ کر ہی ہول اٹھ رہے ہیں کہ یہ عرصہ مجھے ایک ممی کے ساتھ گزارنا پڑے گا۔" نک ویلوٹ مسکرایا۔

گلوریا نے تاؤ میں آکر گرم گرم چائے اس پر انڈیل دی۔ وہ تو نک کی قسمت ہی اچھی تھی کہ اچھل کر ایک طرف ہٹ گیا تھا ورنہ اس وقت کمرے میں اس کی چیخیں گونج رہی ہوتیں۔

بے روزن گنبد

ناصر ملک

دل جب بوجھل ہوجائے تو زندگی بوجھ بن جاتی ہے... افسردگی اور اضمحلال کے تسلسل سے نہ صرف سفر کٹھن لگتا ہے بلکہ پیروں کے آبلے منزل سے بھی بھٹکا دیتے ہیں۔ اتنا سا فلسفہ اس کی سمجھ میں بہت دیر بعد آیا کیونکہ اپنوں کے ہاتھوں ڈھائے جانے والے ستم نے اس پر گویا سکتہ طاری کر دیا تھا اور... جب تک یہ سکتہ ٹوٹتا... اس وقت تک سارے گلابی موسم، مدھر تاروں بھری رات کا فسوں... برکھا رتوں کی سوغاتیں، جوانی کی جولانیوں کا طلسم... کسی کی خوب صورت آنکھوں میں بسنے کا خواب اور... کسی دل میں اترنے اور دھڑکنے کا ارمان... سب کچھ تو اس سے کہیں گم ہوچکا تھا... اور اب اسے وقت کے دھارے سے ٹکرانا اور ریگِ رواں پر پاؤں جمانا بہت مشکل لگ رہا تھا... منجدھاروں سے ناؤ بچانا اور طوفانوں میں ساحل پانا اگرچہ اس کے بس کی بات نہ تھی مگر اس پر ایک روز قسمت کی دیوی کچھ یوں مہربان ہوئی کہ صدیوں سے جمی برف قطرہ قطرہ پگھلنے لگی... پھر محبت کی دھیمی دھیمی آنچ نے اسے پیار کی بازی کھیلنے پر مجبور کر دیا۔ ہار یا جیت کی پروا کیے بغیر وہ تو بس اس کے دل میں ایک روزن کی تلاش میں تھا جبکہ خود اس کی ذات بے روزن گنبد کے مانند تھی جہاں اس کی آرزوئیں، خواہشیں بھٹکتی پھر رہی تھیں۔ کسی نے کیا خوب تجزیہ کیا ہے کہ جب پیار کے متوالوں کو جنگ سے واسطہ پڑ جائے تو وہ اپنی ذات کے گنبد میں بند ہوجاتے ہیں لیکن تقدیر مہربان ہوجائے تو روزن بھی مل جاتا ہے اور محبت کی زنجیر بھی۔ بالآخر اسے بھی ایک دن وہ روزن مل گیا اور اپنے وزن کا بھی احساس ہوگیا۔

تدبیروں سے تسخیروں کا راز پانے والی ایک عقلمند گھر والی کی اذیتوں کی لازوال داستان

میں اپنی پینتالیس سالہ بیوی کے انتخاب کو دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔ وہ بے حد خوبصورت اور زندگی سے بھرپور تھی۔ اگر ہماری پہلی ملاقات کے پس منظر میں بیگم مہرالنسا کے انتخاب کا عنصر موجود نہ ہوتا تو میں یقینی طور پر اس لڑکی کے شوخ اور جان لیوا حسن کو دیکھ کر حیران ہونے کے بجائے ٹھٹک جاتا کیونکہ اپنی عمر سے پانچ سال زیادہ دکھائی دینے والی بیگم مہرالنسا نہ صرف خود بے تحاشا فربہ اور بدصورت تھی بلکہ اس کا ذوقِ انتخاب بھی مضحکہ خیز ہوا کرتا تھا۔ یہ صرف میری ہی رائے نہیں تھی بلکہ اس کی تمام ملنے جلنے والیاں بھی اس پر دو رائے نہیں رکھتی تھیں۔

وہ میری آفس ٹیبل کے عقب میں دیوار پر لگی پینٹنگز کے سامنے کھڑی تھی اور وہ دروازہ کھلنے کی مدھم سی آواز سن کر پلٹی تھی۔ درمیان میں میز حائل ہونے کی وجہ سے وہ آدھی چھپی ہوئی، آدھی دکھائی دے رہی تھی اور سانسوں کو مٹھی میں لینے کے لیے آدھی ہی کافی تھی۔ اس نے رائل بلیو ویلوٹ کا پھول دار سوٹ پہن رکھا تھا جس پر صاف مطلع کے شریر تاروں کی طرح بکھرے ہوئے ننھے ننھے اسٹچنگ پرل جگمگا رہے تھے۔ اس رنگ کا لباس میری کمزوری تھی اور وہ میری کمزوری سے کھیل رہی تھی۔ آبشار کی طرح چمکدار بال کندھوں پر سے سرک کر سینے پر پھیلے ہوئے اور گلابی گلابی متحیر ہونٹ زمینِ عشق کو لمحوں میں سیراب کرتے تھے۔

"گڈ مارننگ...... سس...... سر! میں مریم ماہ وش ہوں۔" وہ جھینپ گئی۔ سر جھکا کر اپنا سراپا دیکھنے لگی۔ مبادا کچھ غلط ہوگیا ہو۔

اس کے بے ساختہ پن کی بدولت مجھے اپنی آنکھوں میں اچانک بھر جانے والی ندیدگی کا فوراً احساس ہوگیا۔ میں نے سر کے اشارے سے سلام کا جواب دیا اور گھوم کر اپنی چیئر کی طرف بڑھا۔

اس کی ملیح جلد کی تاب نے میری آنکھیں خیرہ کر دی تھیں۔ میں نے اپنی عینک اُتار کر میز پر رکھی، بلا وجہ

آنکھیں رگڑیں اور کہا۔ ”اچھا! تو تم انٹرویو میں کامیاب قرار پائی ہو۔ حیرت ہے اتنی کم عمری میں تم نے اتنا تجربہ کیسے حاصل کرلیا؟“

وہ مؤدبانہ لہجے میں بولی۔ ”سر! گریجویشن کے بعد میں نے تین سال کا عرصہ اخبار کی ملازمت میں گزارا ہے۔“

میں نے دل ہی دل میں حساب لگایا۔ لڑکیاں عموماً انیس برس کی عمر میں گریجویشن کرلیتی ہیں۔ ملازمت کے تین سال شامل کرنے سے اس کی عمر کا ہندسہ بائیس بنتا تھا۔ مجھے اپنی نظر پر شبہ ہوا۔ وہ دیکھنے میں بیس کی معلوم ہوتی تھی۔ میں نے اپنی عینک دوبارہ آنکھوں پر لگالی اور بے اختیار بولا۔ ”یعنی تمہاری عمر بائیس سال ہے۔“

”نہیں سر! میری عمر ستائیس سال ہے۔“ اس نے فوراً میری تصحیح کی۔

مجھے حیرت ہوئی۔ لڑکیاں اپنی عمر گھٹاتی ہیں۔ وہ بڑھا رہی تھی۔ میں نے کرسی گھمائی۔ اُسے دیکھا۔ لگا کہ اُس نے جھوٹ کہا تھا۔ حیرانی آمیز معصومیت سے بولی۔ ”سر! میں نے جھوٹ نہیں کہا۔“

”اوکے!“ اس کی شفاف آنکھوں کی تاب نہ لاتے ہوئے میں نے اپنی کرسی واپس گھمالی۔ ”مریم! تمہیں اس جاب کی نیچر تو سمجھادی گئی ہے ناں؟“

”یس سر! مجھے یقین ہے کہ میں آپ کے معیار پر پوری اُتروں گی۔“ وہ بولی۔

اس کی آواز باریک نہیں تھی۔ بھرائی ہوئی، ہولے ہولے لرزتی ہوئی۔ انتہائی جذبات انگیز...... کہا جاتا ہے کہ لڑکیوں کی باریک آواز مرد کے کانوں میں رس گھولتی ہے۔ اس کی آواز پر غور کرنے کے بعد میں نے آواز کے حسن کے معیار کو بدلتا ہوا پایا۔ میری بیگم کی آواز اس کے جسم کے برعکس بہت نفیس تھی۔ اس نے لتا منگیشکر کے کئی گیت یاد کر رکھے تھے۔ جب وہ اپنی موج میں بیٹھ کر گنگناتی تو یقین نہیں آتا تھا کہ آواز اُسی کے بڑے سے حلق سے نکل رہی ہے۔ آواز کے اُتار چڑھاؤ کو لظم دینے کا ہنر اس نے ازخود حاصل کر رکھا تھا مگر نہ جانے کیوں مجھے اس کی آواز کبھی بھلی نہیں لگی تھی۔

مریم کی آواز باریک نہیں تھی مگر دل کے تاروں کو چھیڑتی تھی۔ میرے خاموش ہونے پر وہ اپنی سیٹ پر چلی گئی اور سیاہ رنگ کے کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ گئی پھر مستفسرانہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

اس سے نظریں اور توجہ ہٹانا بہت مشکل تھا مگر میں نے دلیرانہ انداز میں سر جھٹک کر اپنا انہماک آفس کی تزئین و آرائش کی طرف مبذول کرلیا۔ آج شاید دنیا کی تمام تر حیرتیں مجھے گنگ کرنے پر کمربستہ تھیں۔ یہ سوچ کر کہ دفتر کی جملہ آرائش میری بدذوق بیوی مہرالنسا کے ذہن کی اختراع تھی، میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ دل ہی دل میں اُسے سراہے بنا نہ رہ سکا۔

وال ٹو وال کارپٹ، ریشہ دار پتھر کو تراش کر بنائے گئے امپورٹڈ مخمل سیٹ سے آراستہ جہازی سائز کی شاہانہ میز اور آرام دہ ریوالونگ چیئر کے علاوہ مریم ماہ وش، جو میرے غیر مطبوعہ میگزین کی ایڈیٹر تھی، کے استعمال کا فرنیچر اور پردے...... کہیں کوئی سقم نہیں تھا۔ ڈائننگ روم کو بیگم مہر النسا نے آرام دہ میٹرس بیڈ اور یورمخمل فریج سے آراستہ ریٹائرنگ روم بنادیا تھا۔ فلیٹ اسکرین ٹی وی اور تختے چوستا ہوا ایرانی قالین...... باتھ روم کا مزاج بھی شاہانہ پایا۔

ایک دیوار پر ڈیڑھ ضرب پانچ فٹ سائز کا نیلگوں شیشے کا بڑا نفیس ریک نصب تھا جس کے پانچ خانوں میں میری شاعری پر مشتمل پانچ کتابیں بڑے قرینے سے رکھی تھیں۔ میں نے ریک کھولا۔ پہلا مجموعۂ کلام اُٹھایا۔ چھپنے کے بعد آج پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ چند ورق پلٹے۔ دیباچہ دیکھا، پڑھا نہیں البتہ کتاب کے دو چار اشعار زیرلب پڑھے۔ رومانی عمر کی رنگین شاعری...... سچا طور پر میری تخلیق کے شہ پارے تھے مگر اچھے نہ لگے۔ میں نے کتاب بند کرکے ریک میں رکھ دی اور میں خالی الذہنی کی سی کیفیت میں ہولے ہولے چلتا ہوا اپنی چیئر میں آبیٹھا۔

مریم نے پوچھا۔ ”سر! کیا آج کوئی مسودہ کمپوز کرنا ہے؟“

میں نے اُسے دیکھا، سوچنے کی کوشش کی، پھر قدرے بے بسی سے کہا۔ ”نو ایڈیٹر! میرا خیال ہے کہ آج میں اپ سیٹ ہونے کی وجہ سے کوئی ڈکٹیشن نہیں دے پاؤں گا۔“

”خیر تو ہے سر؟“ اس کی آواز میں بے حد اپنائیت تھی۔

میں نے کہا۔ ”ہم کل سے کام کا باقاعدہ آغاز کریں گے۔ چونکہ ہمارا دفتر دو افراد پر مشتمل ہے اور دونوں زندگی میں پہلی مرتبہ ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ تعارف کی رسم ادا ہوجائے۔ کیا خیال ہے؟“

وہ بولی۔ ”آپ کی آدھی بات سے مجھے اتفاق ہے۔ آپ مجھے نہیں جانتے، میں آپ کو جانتی ہوں۔ میں نے آپ کی شاعری پڑھ اور سن رکھی ہے۔ گزشتہ برس ایک ماہنامہ میں آپ کا تفصیلی انٹرویو چھپا تھا۔ کلام بھی تھا۔ آپ کو یاد ہے؟“

میرا سینہ احساسِ تفاخر سے پھول گیا۔ بہ ظاہر بے پروائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ہاں شاید!“

وہ بولی۔ ”میں جس اخبار میں کام کرتی تھی، اس کے ایڈیٹر صاحب بجٹ کم ہونے کی وجہ سے ہمیشہ ڈمی انٹرویوز شائع کیا کرتے تھے۔ میں اس کام میں ان کی معاونت کرتی تھی۔ ایک مرتبہ انہوں نے مجھے آپ کا انٹرویو تیار کرنے کی ذمے داری سونپ دی۔ مختلف اخبارات اور رسائل میں چھپے ہوئے مضامین کو ملا کر میں نے ایک انٹرویو تیار کیا تھا جس میں سوال بھی میرے تھے اور جواب بھی میرے۔ اس طرح مجھے آپ کے بارے میں کافی معلومات حاصل ہوگئی تھیں۔“

میں اُسے دلچسپی آمیز نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ باتوں کے ساتھ ساتھ کمپیوٹر کا بھی جائزہ لے رہی تھی۔ ”سر! کمپیوٹر میں چند سوفٹ ویئرز انسٹال کرنا پڑیں گے، پھر اس پر میگزین کی کمپوزنگ کی جاسکے گی۔“

میں نے کندھے اُچکائے۔ ”کمپیوٹر کے بارے میں میری معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ کیا سوفٹ ویئر بازار سے خریدنا پڑیں گے؟“

اس نے اپنے لپ اسٹک سے پاک گلابی ہونٹ سکیڑے، بولی۔ ”نہیں سر! یہ چیز دنیا کی کارآمد چیزوں میں شمار ہوتی ہے۔ ہزاروں میں بکتی ہے مگر ہمارے ملک میں مفت ملتی ہے کیونکہ یہاں کاپی رائٹ ایکٹ فعال نہیں۔ میرے سی ڈی ویلٹ میں سارے سوفٹ ویئر موجود ہیں۔ کل لیتی آؤں گی۔ اگر آپ مجھے میگزین میں شامل کیے جانے والے مواد کے بارے میں بریفنگ دے دیں تو میں انٹرنیٹ سے کچھ ڈاؤن لوڈنگ کرسکتی ہوں۔ آپ انتخاب کرلیجیے گا۔“

”مریم پلیز! میں نے کہا ناں کہ آج ہم صرف باتیں کریں گے۔ کام کو کل پر ٹالنا اچھا نہیں ہوتا مگر میں یہی چاہتا ہوں۔“

اس نے مؤدبانہ لہجے میں کہا۔ ”آل رائٹ سر!“ اس کی انگلیاں بہ دستور کی بورڈ پر تھرکتی رہیں اور بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اسکرین پر جمی رہیں۔

میں نے اپنی میز کی دراز کھولی۔ ایک فائل دکھائی دی۔ اُسے نکال کر، کھول کر دیکھنے لگا۔ فائل میں مریم ماہ وش کے اپائنٹ منٹ لیٹر اور سی وی کے ساتھ ذاتی دستاویزات کی نقول لگی ہوئی تھیں۔ اس کے پرسنل ڈیٹا کا جائزہ لینے کے بعد مجھے اس کی ذات سے متعلق ابتدائی معلومات حاصل ہوگئیں۔ وہ بالاکوٹ کی رہنے والی تھی۔ بے اختیار میری نگاہیں پھسلتی ہوئیں اس کے سراپا میں اُلجھ گئیں۔ اتنے مکمل حسن کا تعلق یقینی طور پر بالاکوٹ جیسے قدرتی حسن سے مالا مال علاقے سے ہونا چاہیے تھا۔ بلاشبہ اس کی ذات میں پہاڑوں کا ہیجان خیز اُتار چڑھاؤ، پھولوں کی تازگی، شریر ندی کی شوخیاں، دھوپ کی تمازت، برف کی پاکیزگی اور سرو کا ٹھہراؤ شامل تھا۔ اچانک اُس نے میری جانب دیکھا، کچھ کہنے کے لیے ”سر!“ کہہ کر تمہید باندھی مگر اپنے وجود پر میری نظروں کے غیر معمولی ارتکاز کو دیکھ کر گڑبڑا گئی اور اس نے آنکھیں چرالیں۔ میں شرمندہ ہوکر فائل پر جھک گیا۔ وہ کچھ کہتے کہتے رُک گئی تھی۔ اگر بولتی تو اس کی آواز یقیناً زیادہ لرز رہی ہوتی۔ اس کی فائل بولنے لگی۔ اس نے گریجویشن تک ہر امتحان میں اچھے نمبر حاصل کیے تھے۔ اردو کے مضمون میں اس کی غیر معمولی دلچسپی ظاہر ہورہی تھی۔ ایک مقامی اخبار کا تین سالہ تجرباتی لیٹر بھی فائل میں موجود تھا۔

میں نے مریم سے اس کی سابقہ نوکری کے بارے چند سوالات کیے تو اس نے بتایا۔ ”سر! لطیف صبائی صاحب کے ساتھ کام کرنا اچھا تجربہ ثابت نہیں ہوا کیونکہ وہ کسی بھی معمول کے عادی نہیں تھے۔ کام کی کوئی روٹین نہیں تھی۔ عمومی طور پر پورا ہفتہ فارغ رہتے گزر جاتا اور آخری دن میں سارے ہفتے کا کام کرنا پڑ جاتا تھا۔ چونکہ اخبار کا نیوز نیٹ ورک نہیں تھا...... اس لیے ایک ہی دن میں قومی اخبارات اور انٹرنیٹ سے خبریں منتخب کرکے کمپوز کرنا پڑتی تھیں۔“

”کیا تم اُسے ناکام ادارہ قرار دیتی ہو؟“

”یقیناً سر...... نہ صرف ادارے کو، بلکہ چیف ایڈیٹر کو بھی۔“

”ناکامی کی بنیادی وجوہات؟“

”ادارے کا بجٹ نہیں بنایا جاتا تھا۔ جو آمدنی ہوتی، کھا پی لی جاتی، پھر خالی ہاتھ بیٹھ کر اشتہارات کا تھکا دینے والا انتظار...... بیگم صاحبہ کا انداز بہترین ہے۔“

میرے دل میں حسد کا کانٹا چبھا۔ جی چاہا کہ اُسے کہہ دوں کہ بیگم صاحبہ اپنی عملی زندگی میں ناکام ترین عورت ثابت ہوئی ہیں مگر کہہ نہ سکا اور ہنکارا بھر کر رہ گیا۔

وہ بولتی ہوئی بہت بھلی لگ رہی تھی اور میرا جی چاہ رہا تھا کہ وہ یونہی بولتی رہے، میں سنتا رہوں۔ وہ میری خواہش پوری کرنے لگی۔ میرا انہماک اُسے بار بار مضطرب کررہا تھا۔ کبھی آنکھیں چرالیتی، کبھی کن انکھیوں سے دیکھ لیتی مگر اپنی لرزتی ہوئی خمار بار آواز میں بولتی رہی ”صبائی کے ملنے والے لوگ ندیدوں کی طرح مجھے گھورتے رہتے تھے جس سے مجھے بڑی کوفت ہوتی تھی۔ اس ملازمت کا سب سے تکلیف دہ پہلو یہ تھا کہ مجھے دفتر میں گیارہ بجے دن پہنچنا پڑتا

تھا اور پانچ بجے تک ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنا پڑتا تھا۔"

"مگر یہ تو سبھی دفاتر کا معمول ہے۔"

"ہے تو ایسا ہی مگر اس شیڈول پر آنا جانا میرے لیے بڑا تکلیف دہ ہے۔"

"کیوں؟" مجھے اچنبھا ہوا۔

"وہ دراصل......" وہ کہتے کہتے پھر تھم گئی۔ "کوئی خاص وجہ تو نہیں مگر......بس ایسے ہی سر!"

"تم نے کسی اچھی ملازمت کے لیے کوشش نہیں کی؟" میری دانست میں وہ اخبار کی معمولی سی نوکری سے کہیں بہتر جاب حاصل کر سکتی تھی۔

"بہت ساری کوششوں کے بعد میری ایک کوشش بار آور ثابت ہوئی ہے جس کے نتیجے میں، میں یہاں پہنچی ہوں۔"

"یہاں بھی تنخواہ تو اتنی ہی ہے۔"

"مگر یہاں کا ڈیوٹی شیڈول میری مرضی کا ہے۔"

میں نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ "تمہارا علاقہ بہت خوبصورت ہے۔ ہے ناں؟"

"خوب صورت تھا۔ زلزلے سے پہلے، اب نہیں۔" اس کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔

"زلزلہ قدرتی حسن پر اثر انداز تو نہیں ہوا تھا۔"

اُس نے بہ نظرِ شکایت مجھے دیکھا۔ جواب نہ پا کر میں نے موضوع بدل دیا۔ "شاعری پڑھتی ہو؟"

"یس سر! خبریں کمپوز کرنے سے طبیعت میں پیدا ہونے والی بیزاری کا میرے پاس سوائے شاعری پڑھنے کے، کوئی حل نہیں تھا۔"

"مجھے پڑھا؟"

"یس سر!"

"کیسا پایا؟"

وہ بولی۔ "سچ کہوں؟"

"جھوٹ سننا کوئی پسند نہیں کرتا۔"

اس نے بے یقینی سے مجھے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ دنیا تعریف کی جھوٹی سیڑھی پر بہ خوشی چڑھتی ہے۔ تنقید کی کڑوی گولی کوئی نہیں نگلتا۔

چند لمحے سوچتی رہی، پھر بولی۔ "سچ تو یہ ہے کہ مجھے آپ کی شاعری اچھی نہیں لگی۔ آپ کو بھوک، انقلاب کی ضرورت اور معاشرتی ناہمواریوں کے علاوہ دنیا میں کوئی دکھ نظر نہیں آتا حالانکہ آپ کا بنگلا اور آفس دیکھ کر پتا چلتا ہے کہ آپ بہت امیر آدمی ہیں۔ آدمی شاعری کی کتاب میں ایسا کچھ تلاش کرتا ہے، جیسا اُسے معاشرے میں دکھائی نہیں دیتا۔ آپ کی شاعری پڑھ لی جائے یا اخبار...... ایک جیسی کڑواہٹ ملتی ہے۔"

آج تک میں نے اپنی شاعری کو اس رُخ سے دیکھنے کی زحمت نہیں کی تھی کہ کوئی قاری اخبار کی متبادل شاعری کو پڑھنے کی زحمت کیوں کرے گا؟......میرے ذہن کے بے روزن گنبد میں عجیب سی سرسراہٹ گونجنے لگی۔ آج تک کسی نے یوں میرے منہ پر تنقید کا طمانچہ نہیں مارا تھا۔ سوچا تو اُس کا تجزیہ درست لگا۔

اس نے میرے بدلتے ہوئے تاثرات کو خفگی سمجھا اس لیے معذرت خواہانہ لہجے میں بولی۔ "سر! یہ میری رائے ہے اور ضروری نہیں کہ درست بھی ہو۔ میں رومانی شاعری پڑھتی ہوں کیونکہ مجھے خوابوں کی دنیا اچھی لگتی ہے۔ سچی اور اُجڑی ہوئی دنیا سے دل اوبنے لگتا ہے۔"

میں نے جلدی سے کہا۔ "چونکہ تم جوان ہو اور تمہارے دل میں امید و شوق کی دنیا آباد ہے، اس لیے تمہیں رومانی شاعری اچھی لگتی ہے۔ عمومی طور پر ایسا ہی ہوتا ہے۔ میری ابتدائی شاعری بھی حسن و عشق کی بھول بھلیوں میں چکرا رہی تھی میں بھی چکراتا رہا۔ جونہی زندگی کے حقیقی رُخ دیکھے، مصائب اور الجھنیں، میں زندگی کے نشیب و فراز میں ہی الجھتا چلا گیا۔ رومان بہت پیچھے رہ گیا۔"

وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ اچانک دروازہ کھلا اور مہر النسا کا بھاری بھرکم وجود نظر آیا۔ وہ کمرے میں داخل ہو کر میری طرف آنے کے بجائے مریم کے عقب میں جا کر کھڑی ہو گئی۔ جونہی مریم کو اپنے عقب میں اس کی موجودگی کا احساس ہوا، وہ ایک جھٹکے سے کھڑی ہو گئی۔ مہر النسا بولی۔ "بیٹھ جاؤ......"

وہ احتراماً کھڑی رہی۔ مہر النسا نے اُس کے سراپا کا بہ نظرِ اشتیاق جائزہ لیا۔ اس کی آنکھوں نے مریم کی طرف توصیف اُچھالی، لبوں پر سوال اُبھرا۔ "مریم! تمہیں اپنے چیف ایڈیٹر کیسے لگے؟"

وہ بولی۔ "سر بہت اچھے ہیں۔"

مہر النسا نے کن انکھیوں سے مجھے دیکھا اور کہا۔ "ہوں! اس میں کوئی شک بھی نہیں......اور دفتر؟"

"میری سوچ سے بھی زیادہ خوب صورت ہے بیگم صاحبہ! یہاں کام کرنے کا واقعی مزہ آئے گا۔ آپ نے درست کہا تھا۔"

مہر النسا سر ہلاتے ہوئے میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ اردگرد دیکھتے ہوئے بولی۔ "نچلی دراز میں چیک بک پڑی ہے۔ بیلنس شیٹ بھی رکھی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ

میگزین کے معاملات کو سائنسی بنیادوں پر استوار کریں گے۔ خاص طور پر آپ کو مالی معاملات پر زیادہ توجہ دینا ہو گی۔ چھ ماہ تک میگزین منافع نہیں دے گا اس لیے میں نے چھ ماہ کا بجٹ بنا کر اکاؤنٹ میں رقم جمع کرا دی ہے تاکہ آپ کو کوئی پریشانی نہ ہو۔"

وہ مجھے 'تم' کہہ کر پکارا کرتی تھی۔ دفتر میں 'آپ' کہہ کر مخاطب کرتے ہوئے تھوڑی عجیب لگی۔ ہدایات دے رہی تھی مگر اس نے ادب کا پہلو نظر انداز نہیں کیا تھا۔ چونکہ مہر النسا نے اپنی زندگی کے پچیس سال ڈسٹرکٹ اکاؤنٹ آفس میں گزارے تھے، اس لیے کاغذی کارروائی کو بہت اہم خیال کرتی تھی۔ وہ گھر کے نظم و نسق کو بھی اپنے دفتری معمول کے مطابق سنبھالنے کی عادی تھی جس پر میں کبھی معترض نہیں ہوتا تھا۔

"کوشش کروں گا کہ تمہیں شکایت کا موقع نہ ملے۔" میں نے تہِ دل سے کہا۔

وہ حسبِ معمول بے حد سنجیدہ تھی۔ اردگرد تنقیدی نظر ڈال کر، کرسی چھوڑ کر دروازے کی طرف بڑھی۔ رک کر پلٹی اور بولی۔ "آپ کو جب بھی چائے یا کچھ کھانے پینے کی طلب ہو، انٹرکام پر حکم دیجیے گا۔ ملازمہ پہنچا دیا کرے گی۔ میں آپ کے دفتر میں کم آیا کروں گی تاکہ آپ کے کام میں خلل نہ ہو۔ صرف ہر یکم تاریخ کو آ کر میگزین کے شعبہ مالیات کو منظم کرنے کے لیے آیا کروں گی۔ اب آپ اپنا کام کیجیے۔ اللہ حافظ!"

اس کا بچوں کے کھلونے بھالو جیسا ہاتھ تھوڑا بلند ہوا۔ میں نے ممنونانہ نظروں سے اُسے دیکھا تو مجھے ایک دم جھٹکا لگا۔ اس کے چہرے پر خوشی کے رنگ رقصاں تو تھے مگر آنکھیں بالکل خالی تھیں۔ پندرہ سالہ طویل رفاقت میں پہلی مرتبہ اس کی آنکھوں میں ایسا خلا دکھائی دیا تھا۔

وہ اپنے پیچھے دروازہ بند کر گئی۔ میں کافی دیر تک بند دروازے کو دیکھتا رہا پھر نچلی دراز سے بیگم مہر النسا کا تیار کردہ اکاؤنٹ چارٹ نکال کر پڑھنے لگا۔ مہرو جیسی دکھائی دیتی تھی، ویسی نہیں تھی۔ بہت اچھی تھی۔ بے اختیار میرا دل اس کا زیرِ بار ہو گیا۔ اس کے تیار کیے ہوئے چارٹ کے ماہانہ شیڈول میں بیس ہزار روپے میگزین کی اشاعت کے لیے، پانچ ہزار مریم ماہ وش کی تنخواہ کے، دو ہزار سائر خرچ کے عنوان سے جبکہ تین ہزار روپے میرا جیب خرچ درج تھا۔ اس نے میرے اکاؤنٹ میں ایک لاکھ اسی ہزار روپے جمع کرا دیے تھے۔

شاید......زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے مہر النسا پر پیار آیا جسے میں شادی سے پہلے 'بڑی آپی' اور شادی کے بعد ہر جذبے سے عاری لہجے میں 'مہرو' کہا کرتا تھا۔ یکبارگی میرا جی چاہا کہ میں دفتر سے نکل کر بنگلے میں جاؤں اور اپنی بیگم کے بھالوؤں جیسے لوتھڑے ہاتھ چوم لوں جس نے میرے خوابوں کی تکمیل پر اپنی زندگی بھر کی جمع پونجی لٹا دی تھی۔ سوچا، شام کو شکریہ ادا کروں گا۔ شام آئی تو یہ بات بھول گیا اور اُس کی منتظر نظروں کو نظر انداز کرتے ہوئے بیڈ کی عقبی کھڑکی کھول کر کھڑا ہو گیا۔

"یہ جگہ بہت خوب صورت ہے ناں؟"

"ہوں۔" میں نے دوسرا پردہ بھی کھسکا دیا۔

ہوا خاصی ٹھنڈی تھی مگر ناگوار نہیں لگ رہی تھی۔ تاحدِ نگاہ سبزے سے ڈھکی ہوئی ناہموار اُترائی پھیلی ہوئی تھی جو ایک چھوٹے سے زگ زیگ نالے پر ختم ہوتی تھی۔ اس کے پار چھوٹی پہاڑی تھی جو دیکھنے میں سبز مخمل سے ڈھکی محسوس ہوتی تھی۔ میرے بنگلے کے پہلو سے نکل کر ایک پگڈنڈی ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی نالے تک اُترتی جاتی تھی۔ مہرو مجھے ساتھ لے کر اس پگڈنڈی پر ہر صبح چہل قدمی کیا کرتی تھی۔ دو تین سو گز کے فاصلے پر گھنی اور بے تحاشا سبز جھاڑیوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا۔ ان جھاڑیوں پر آج کل جامنی، سفید اور ہلکے گلابی رنگ کے پھول کھلے ہوئے تھے جو بے حد جاذبِ نظر تھے۔ یہ اسلام آباد کا مضافاتی گاؤں تھا جو اپنی فطری دل کشی کی وجہ سے مری جانے والی شاہراہ پر سے گزرنے والوں کی آنکھوں میں کئی سپنے بھر دیتا تھا۔ اسلام آباد سے بہ مشکل بیس پچیس منٹ کے ڈرائیو روے پر واقع تھا۔ زندگی میں کبھی نہیں سوچا تھا کہ چنیوٹ جیسے غربت زدہ علاقے سے نکل کر کسی دن یہاں منتقل ہو جاؤں گا مگر یہ ناممکن کام مہرو نے کر دکھایا تھا۔

میرا کھڑکی سے دکھائی دینے والے مناظر سے ہٹنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ مہرو بیڈ پر دراز تھی۔ میگزین پر نظریں جمائے اس علاقے کے حسن پر میری رائے طلب کر رہی تھی اور میں اُسے حسبِ عادت نظر انداز کر رہا تھا۔ وہ بیڈ سے اُتر کر میرے عقب میں آ گئی، بولی۔ "وسیم! کیا تمہیں یہ سب کچھ اچھا لگتا ہے؟"

میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "ہاں!"

"یہی تمہارا خواب تھا نا؟" اس کی آواز میں ایک طلب جھلملا رہی تھی کہ میں اس کے سرانجام دیے گئے کارنامے کو سراہوں۔ مگر میں نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ اس نے اپنے

دونوں ہاتھ میرے شانے پر رکھ دیے اور بولی۔ ”وسیم! پہاڑ بڑے کھردرے ہوتے ہیں۔ بھلا ناہموار جگہ میں بھی کوئی حسن ہوتا ہے؟ نہیں ناں...... بے ترتیبی عدم توازن کو جنم دیتی ہے۔ یہاں نہ تو درختوں میں کوئی ترتیب ہے، نہ پھول پودوں میں، اور تو اور...... یہاں موسم میں بھی کوئی توازن نہیں ہے۔ کبھی بہت شوخ، کبھی سرد اور کبھی یخ بستہ ہوائیں، کبھی برف تو کبھی تیز دھوپ...... کیا یہ عدم توازن بھی دل کو اچھا نہیں لگ رہا؟“

وہ میرا دھیان بانٹنے میں کچھ کامیاب ہو گئی تھی۔ میں چونک کر بولا۔ ”میں شاعر ہوں۔ فطرت سے بہت زیادہ انسپائریشن لیتا ہوں۔ تم نے ساری زندگی اعداد و شمار میں بسر کی ہے مگر اس عدم توازن کو پسند کر رہی ہو، یہی حسن کا اعتراف ہے۔“

اس کی آواز میں اندوہ بار سنجیدگی شامل ہو گئی۔ ”یعنی میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ حسن کبھی بھی توازن پر تکیہ نہیں کرتا؟“

میں نے ہنکارا بھرا۔

وہ بولی۔ ”پھر ایسا کیوں ہے کہ میرا جسم سڈول نہیں، متوازن بھی نہیں...... بہت موٹی اور سانولی ہوں مگر تمہاری آنکھ میرے وجود کی بے ترتیبی سے کسی خوبصورتی کو کھوجنے کی کوشش نہیں کرتی۔ ہوں؟“

میرا تنا ہوا جسم ایک دم ڈھیلا پڑ گیا۔ اس نے بڑے کمال سے ایسے موضوع کو چھیڑ دیا تھا جس پر میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بولا۔ ”بچے سو گئے ہیں؟“

اس کے حلق سے لمبی سانس خارج ہوئی اور شکست خوردہ آواز میں بولی۔ ”ہاں! پہاڑی راستوں کے عادی نہ ہونے کی وجہ سے تھک کر جلد سو جاتے ہیں۔ نعیم کو ہلکا سا ٹمپریچر تھا۔ میں نے سیرپ پلا کر سرِ شام سلا دیا تھا۔ اب ٹھیک ہے۔“

اس نے میری عدم دلچسپی کو بھانپ کر چنیوٹ والے گھر کا تذکرہ چھیڑا۔ اُسے رہ رہ کر اپنے بہن بھائی، والدین اور میرے والدین یاد آتے تھے۔ مجھ سے چمٹ کر کتنی یادیں تازہ کرتی رہی پھر شکوہ بھرے انداز میں بولی۔ ”مگر تمہیں کیا؟ تم نے تو کبھی بھول کر کسی کو یاد نہیں کیا۔ یوں جیسے تمہارا ان سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ چچا جان تمہیں کتنا مس کرتے ہوں گے۔ وہ تو ہر شام کو تمہیں دیکھنے اور چومنے کے عادی تھے۔“

میں نے بیزاری سے کہا۔ ”سب فراڈ تھا۔“

اس نے آہ بھر کر خاموشی اختیار کر لی۔ تھوڑی دیر بعد پھر بول پڑی۔ ”میگزین کے نام کا فیصلہ ہو گیا؟“

میں نے اپنے پسندیدہ ناموں کی فہرست پریس لاء برانچ کو بھیج رکھی تھی۔ آج کل میں آنے والی ہے۔ اُسے علم تھا، پھر بھی پوچھ رہی تھی، محض بات بڑھانے کے لیے۔ میں نے کہا۔ ”دیکھیں، کون سا نام اوکے ہوتا ہے۔“

”کچھ دے دلا دینا تھا۔“ اس نے کہا۔ ”کیونکہ جب تک رشوت کا ٹانک نہ پلایا جائے، فائل نقاہت کے مارے ایک میز سے دوسری میز کا فاصلہ طے نہیں کر سکتی۔“

”آفس کے ایک آدمی کو چند نوٹ تھما دیے تھے۔“

”ڈیکلریشن کا پراسس کتنا لمبا ہے؟“

”دو چار دنوں کا...... اگر دام خرچ کیے جائیں تو۔“

”تو کر دینا۔ میں چاہتی ہوں کہ پہلے شمارے کی اشاعت سے قبل ڈاکومنٹس مکمل ہو جائیں۔ اور ہاں! تم اپنے میگزین میں سیاست اور کرائمز رپورٹس شامل نہ کرنا۔“

”کیوں؟“ میں بے ساختگی سے مستفسر ہوا۔

”نہیں وسیم! وہ خاصے الجھن اور دشمنی والے کام ہیں جبکہ میں تمہیں پرسکون اور خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔“

مجھے سیاست اور کرنٹ افیئرز سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں نے ہنکارا بھرا، کہا۔ ”میں کلچر اور لٹریچر پر کام کرنا چاہتا ہوں۔“

وہ خوش ہو گئی۔

میں اس موضوع سے بھی اُکتا گیا، بولا۔ ”فرض کیا میگزین فلاپ ہو جاتا ہے۔ تب؟“

شاید میں دل ہی دل میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کی اتنی بڑی رقم داؤ پر لگے اور وہ اپنے معمول کی شکایات میں ایک اور باب کا اضافہ کر لے۔

”تم بے فکری سے اپنا کام کرو۔ مجھے یقین ہے کہ میگزین بہت جلد اپنی سرکولیشن مضبوط کر لے گا۔ جس کام کا انسان کو شوق ہو، اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچا ہی لیتا ہے۔ کئی صوبائی اور وفاقی ادارے ثقافتی اور ادبی رسائل کی بھرپور مالی اعانت کرتے ہیں۔ تم اپنے ملنے جلنے والوں سے رابطہ کرو۔ وسیلہ ڈھونڈو اور ہر ایسے ادارے میں اپلائی کر دو۔ میں اپلائی فائل بنانے میں مریم کی مدد کر دوں گی اور آگے پراسیس سمجھا دوں گی۔“

میرا جی چاہا کہ میں اس کا عملی نہ سہی، زبانی شکریہ ادا کر دوں مگر عجیب سی جھجک آڑے آ گئی۔ میں نے اوکے کہہ کر گفتگو سے پھر من چرا لیا۔ وہ بولی۔ ”یاد آیا وسیم! تمہیں مریم کیسی لگی؟“

میں نے پہلو تہی کی۔ ”کام دیکھ کر ہی کوئی رائے قائم کر سکوں گا۔“

”اُس کی شخصیت پر ہی رائے زنی کر دو۔“ مہرو کی آواز میں موہوم سی التجا تحلیل ہو گئی۔

”ٹھیک ہے۔“

”بس ٹھیک؟“

”تو اور کیا کہوں؟“ میں نے مصنوعی بیزاری کا مظاہرہ کیا۔ ”خود پر زیادہ توجہ دینے کی عادی معلوم ہوتی ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ وہ اپنے آپ پر ذرہ بھر توجہ نہیں دیتی۔ اس نے تو ٹھیک سے میک اَپ نہیں کیا ہوتا۔“ اس نے اپنے انتخاب کی دانستہ حمایت کرنا چاہی۔

”شاید ایسا ہی ہو۔“ میں نے پہلو تہی کی۔

”میں نے اپنے علاقے میں اتنی خوب صورت لڑکی نہیں دیکھی تھی۔“ اس کا لہجہ تحسین آمیز ہو گیا۔ ”انٹرویو کے لیے جتنی بھی لڑکیاں آئی تھیں، حسین تھیں۔ مریم حسین تر تھی۔ اس کی اُردو پر دسترس بھی اچھی تھی تبھی میں نے اُسے منتخب کر لیا۔“

”تم مجھے آفس میں ’آپ‘ کیوں کہہ رہی تھیں؟“ میں نے اپنی عادت کے مطابق اچانک پلٹا کھایا اور جواب گول کر دیا۔

”تم اس چھوٹی سی سلطنت کے بادشاہ ہو اور بادشاہ کو تعظیم سے مخاطب کیا جاتا ہے۔“ اس کے لہجے میں طنز نہیں تھا، پیار تھا۔

باتوں میں ہمیں دھیان ہی نہیں رہا تھا کہ باہر کا منظر اندھیرے میں گم ہو گیا تھا اور ہوا بے حد سرد ہو گئی تھی۔ اس نے مجھے کھڑکی سے ہٹ جانے کا مشورہ دیا اور میرا شانہ چھوڑ کر بیڈ کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے بیڈ لیمپ آن کیا۔ ٹیوب لائٹ آف کرنے سے پہلے اس نے ملحقہ بیڈ روم میں جھانک کر بچوں پر نگاہ ڈال لی تھی۔

میں کھڑکی بند کر کے بیڈ پر آ کر لیٹ گیا۔ وہ اپنا بھاری بازو آنکھوں پر رکھے لمبی لمبی سانسیں لے رہی تھی جو کچھ ہی دیر بعد خاصے دہشت ناک خراٹوں میں بدلنے والی تھیں۔ میں بے دھیانی میں اس کی کہی ہوئی بات کو ذہن میں دُہرانے لگا۔

اس نے کہا تھا کہ اس کے پینتالیس سال پرانے بدن کی بے اعتدالیوں اور عدم توازن میں سے میری آنکھ نے آج تک حسن کو کھوجنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں نے کوشش کی۔ بھدے پیروں سے لے کر گنجے چٹے بالوں پر مشتمل چٹیا تک، دائیں ہاتھ کی بڑی انگلی کی آخری پور سے بائیں ہاتھ کی پور تک آنکھوں ہی آنکھوں میں اُس کا سارا بدن ٹٹولا...... نہیں، کچھ بھی دکھائی نہیں دیا۔ وہ بنجر وجود کی مالک تھی۔ میں نے آج تک ازدواجی عمر میں اس کا موازنہ کسی سے نہیں کیا تھا مگر آج اُسے مریم کے پہلو میں کھڑا کر کے دیکھ رہا تھا۔

مریم کے وجود سے حسن کو کھوجنا نہیں پڑتا تھا کیونکہ وہ سراپا حسن تھی۔ اس کے ہونٹ گلاب ایسے نہیں تھے۔ گلاب اُس کے ہونٹوں جیسا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جھیل نہیں تھی، جھیلیں اُسے دیکھ کر اپنی گیرائی ماپتی تھیں۔ ایک لمبی سانس حلق میں اُتاری اور کروٹ بدل کر پہلو کے بل ہو گیا۔ اس کو دیکھنے سے نہ دیکھنا بھلا تھا۔ میں خاصا تھک گیا تھا۔ مجھے یہاں آئے ہوئے آج دسواں دن تھا۔ ان دنوں میں میرا ذہن مسلسل حیرانیوں کے جھٹکوں پر لرزاں تھا۔ ہر لحہ مجھے استعجاب زدہ کر دیتا تھا اور مہرو کا ہر نیا اقدام مجھے پریشان کرنے والا ثابت ہوتا تھا۔

اگلی صبح میں نے طویل عرصے کے بعد اپنے بناؤ پر خصوصی دھیان دیا۔ ایسا نہیں تھا کہ میں شکل و صورت میں گیا گزرا تھا یا مجھے احساسِ کمتری لاحق تھا مگر میرے دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی تھی کہ میں اُسے اچھا دکھائی دوں جو میری آنکھوں میں زندگی کی نئی جوت جگا کر پرس جھلاتی دفتر سے رخصت ہو گئی تھی۔ میری تیاری کے دوران مہر النسا نے ڈائننگ ٹیبل پر ناشتا لگا دیا۔ مجھے بتانے آئی۔ دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ گہری نظروں سے سرتاپا دیکھنے کے بعد فرطِ اطمینان سے گویا ہوئی۔ ”ایک دم ڈیشنگ...... بالکل ایسے لگ رہے ہو...... جیسے میں تمہیں دیکھنا چاہتی ہوں۔“

میں نے رُخ پھیر لیا۔ فائدہ نہ ہوا۔ اس کی جاگتی ہوئی آنکھیں آئینے میں دکھائی دینے لگیں، بولی۔ ”پرفیوم اِدھر رکھا ہے۔ وہی...... جو تمہیں بہت پسند ہوا کرتا تھا۔ یاد ہے ناں؟“

میں نے اس کی نشاندہی پر ڈریسنگ ٹیبل کی دراز کھینچی۔ کالی ڈوری والی مخملیں تھیلی جس پر لیدر ٹیگ لگا ہوا تھا۔ اس ننھے سے لیدر ٹیگ پر فائل گرنے کے الفاظ کھدے ہوئے تھے۔ یہ میرا پسندیدہ پرفیوم تھا۔ میں نے ڈوری کی گرہ کھول کر شیشی نکالی۔ آدھی دیکھ کر سوالیہ نظروں سے آئینے میں مہرو کو دیکھا۔ وہ جھٹ سے بولی۔ ”پڑی پڑی اُڑ گئی ورنہ میں نے تو بڑی سنبھال کر رکھی ہوئی تھی۔“

میرا سر جھک گیا۔ سوچنے لگا۔ لگاؤں؟ نہ لگاؤں؟...... سر اُٹھا کر امید بھری نظروں سے دیکھتی ہوئی آنکھوں پر ایک طرح کا ترس آیا۔ میں نے خوشبو چھڑکی۔ کمرا سوکس

مہک سے ایک دم معطر ہو گیا۔ ایک لمبی سانس پھیپھڑوں میں اُتاری۔ کوئی بوجھ سا سر سے ہٹتا ہوا محسوس ہوا۔

مہرو نے تھوڑا قریب ہو کر سنجیدگی سے کہا۔ ''وسیم! دیر ہو جائے گی۔ آفس دیر سے پہنچنے والے باس کا امیج اچھا نہیں بنتا۔''

میں نے پلٹ کر اُسے ایک اچٹتی ہوئی نظر سے دیکھا اور ڈائننگ ٹیبل کا رُخ کیا۔ بچوں نے مجھے 'گڈ مارننگ' کہا۔ میں نے دبے دبے لفظوں میں احتجاج کیا۔ ''نہیں...... صبح بخیر کہا کرو۔''

دونوں کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

نعیم بولا۔ ''بابا! آپ بولے؟''

علیم کی استعجاب آلود آنکھیں چمکیں۔ ''بابا! آپ نے پہلی مرتبہ ہمیں ٹوکا ہے۔ ٹوکے جانے پر دل پر بوجھ پڑتا ہے مگر نجانے کیوں آپ کا ٹوکنا بہت اچھا لگا۔''

میں نے اُن کے ریمارکس سنے اَن سنے کرتے ہوئے کرسی کھینچی اور سر جھکا کر ناشتا کرنے لگا۔ مہرو نے ٹھیک کہا تھا کہ مجھے وقت پر پہنچ کر اپنے دفتر کی اکلوتی کارکن پر اچھا تاثر چھوڑنا چاہیے تھا جو یقینی طور پر مجھ سے پہلے دفتر پہنچ چکی تھی۔

مہرو نے مارملیڈ کا جار اُٹھانا چاہا۔ ہاتھ چکنے تھے۔ جام پھسل کر چینی کی پلیٹ پر گرا۔ پلیٹ چھناکے سے ٹوٹ گئی۔ سکوت کی من بھاونی سطوت درہم برہم ہو گئی۔ میں نے ایک ذرا ناگواری سے اُسے دیکھا پھر سر جھکا کر بریڈ پیس پر شہد اور مکھن لگانے لگا۔

وہ بولی۔ ''وسیم! میں آج پنڈی جاؤں گی۔ کچھ شاپنگ کرنی ہے۔ سوچ رہی ہوں کہ بچوں کو لورنٹو پہ اسکول میں داخل کرا دوں۔ سنا ہے کہ وہاں داخلہ آسانی سے نہیں ملتا۔ بھائی کا ایک قریبی دوست میری مدد کر سکتا ہے۔ وہ پنڈی میں رہتا ہے۔ اس سے ملوں گی۔''

اس کا انداز اجازت طلب تھا۔ میں نے کندھے اُچکائے اور آنکھوں کے اشارے سے اجازت دے دی حالانکہ اُسے مجھ سے اجازت مانگنے کی احتیاج تھی نہ مجھے کھوکھلا احسان کرنے کی۔ جب میں ٹشو پیپر کھینچ کر ٹیبل چھوڑ رہا تھا، اس نے بتایا کہ وہ دونوں بچوں کو اپنے ساتھ لے جائے گی۔ لنچ تک آ گئی تو ٹھیک ورنہ میں اور مریم اپنا کھانا دفتر میں منگوائیں گے۔

پندرہ برس کا طویل عرصہ میں نے اپنی واجبی شکلوں والی کزنز کے درمیان گزارا تھا۔ انیس بیس کے فرق سے سبھی مہرو جیسی تھیں۔ چاروں جوانی کی موج میں تپ کر خوبصورت لگتی تھیں۔ پھر سب ایک جیسی ہو جایا کرتی تھیں۔ لمبی مدت کا قیدی جیل سے نکلنے کے بعد ہر شے کو اجلی آنکھ سے دیکھتا ہو، شاید میری کیفیت بھی ایسی ہی تھی۔ مریم میری آنکھوں کے سامنے مانیٹر کی اسکرین پر نظریں جمائے مطلوبہ سوفٹ ویئرز انسٹال کرنے میں مگن تھی۔

آدھے گھنٹے بعد اُس نے اپنی پشت کرسی سے ٹکائی اور طویل سانس لے کر بولی۔ ''سر! کمپیوٹر اوکے ہو گیا ہے۔ اب اِس پر میں اپنا کام کر سکتی ہوں۔''

ایسے ہی وقت میں اُسے میرے انہماک کی خبر ہوئی۔ جھینپ سی گئی، دراز کھول کر کچھ تلاش کرنے لگی۔

میں نے اپنی دراز سے فائل نکالی اور کھول کر دیکھنے لگا۔ وہ تجسس کے مارے کرسی چھوڑ کر میز پر جھک گئی۔ مہر النسا کو ہر کام کو دستاویزی شکل دینے میں مہارت حاصل تھی۔ اس نے میگزین کی جملہ تفصیلات ترتیب وار فائل کر رکھی تھیں۔ ایک سو چوالیس صفحات کی ڈمی میری نظروں کے سامنے تھی۔ کچی پنسل سے خالی سرورق پر لکھا تھا۔ 'ایڈیٹر اس ڈمی کے مطابق میگزین کے مضامین کو تقسیم کر سکتا ہے۔'

میں نے مریم کی طرف دیکھا۔ وہ میرا سوال بھانپ کر ایک کاغذ اور قلم اُٹھا لائی۔ میں نے اُسے اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور ڈمی کو میز کے وسط میں رکھ کر اس پر جھک گیا۔ بولا۔ ''مس مریم! ہمارا میگزین خالصتاً ادبی ہے اور شاعری پر مشتمل ہوگا۔ اس کی تقسیم میں میری مدد کرو۔''

وہ بولی۔ ''یس سر! اگر آپ محسوس نہ کریں تو یہ ڈمی مجھے عنایت کر دیں۔ مجھے بھروسا ہے کہ میں آپ کی خواہش کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کام کو بخوبی سرانجام دوں گی۔''

میں نے خوش دلی سے ڈمی اس کی طرف کھسکا دی۔ اس نے لیڈ پنسل اور اریزر بھی اُٹھا لیا۔ اُٹھ کر اپنی نشست پر جانا چاہتی تھی مگر میں نے اُسے وہیں بیٹھ کر کام کرنے کا حکم دیا۔ وہ گڑبڑائی۔ ''سر! میں آپ کے سامنے بیٹھ کر کام نہیں کر سکوں گی۔ وہ کیا ہے کہ میں نروس ہو جاتی ہوں ناں۔ پلیز......''

اس کے ملتجیانہ سوال کو رد کرنا بہت مشکل تھا۔ میں نے سر کے اشارے سے اجازت دی۔ وہ اپنی چیئر پر چلی گئی اور میں فائل میں اُلجھ گیا۔

مجھے یہ تسلیم کرنا پڑا کہ اگر میرے بجائے مہر النسا میگزین کی چیف ایڈیٹر ہوتی تو وہ اپنی محنت اور اعداد و شمار میں غیر معمولی صلاحیت کے بل بوتے پر نہایت مختصر وقت میں ملک کے صفِ اول کے جرائد میں کھڑا کر سکتی تھی۔ میرے سامنے اُس نے اپنے عمل سے چیلنج کی بلند دیوار کھڑی کر دی تھی جسے عبور کرنے میں ہی میرے مقام کی بقا تھی۔

میں اپنے سامنے نصب ٹی وی پر ایک نیوز چینل دیکھنے لگا۔ کہیں ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا جس کے نتیجے میں کئی افراد لقمۂ اجل بن گئے تھے۔ کئی افراد شدید زخمی ہو کر اسپتالوں میں پہنچائے جا رہے تھے۔ ایمبولینس کے ہوٹر اور اینکر پرسن کی ہیجانی آواز مجھے بری لگنے لگی تو میں نے چینل بدل دیا۔ تبھی سمجھ میں آیا کہ میری شاعری پر مریم ماہ وش کی رائے کتنی صادق تھی...... یک بارگی میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ آئندہ میں خوابوں، دنیا کی رنگینیوں اور رومانی مناظر کو اشعار میں ڈھالوں گا۔

میری انگلیاں ایسی ہی کوئی وادی تلاش کرنے کے لیے بار بار چینل بدل رہی تھیں۔ اِس گاؤں میں کیبل کی سہولت موجود نہیں تھی۔ اس لیے مہرو کو سیٹلائٹ ریسیور نصب کروانا پڑا تھا۔ سرکاری چینل پر چولستان کی ثقافت پر مبنی وڈیو کلپ چل رہے تھے جنہوں نے میری توجہ اپنی جانب مبذول کرا لی۔ میں تب چونکا، جب مریم نے ڈمی میرے سامنے میز پر رکھی اور دونوں ہتھیلیاں میز پر ٹکا کر کھڑی ہو گئی۔

میں نے ڈمی دیکھی۔ اس نے پہلے صفحے سے لے کر آخری صفحے تک اپنے طور پر مضامین کی موزوں ترین تقسیم کر رکھی تھی۔ میں صفحہ صفحہ دیکھتا ہوا ایک جگہ پر رُک گیا۔ اس کے لکھے ہوئے لفظ کو پڑھ نہ پایا تو پنسل لفظ پر رکھ کر سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔ وہ تھوڑا جھکی۔ بال کھل کر ڈمی اور میرے ہاتھ پر گر گئے۔ دل میں گدگدی سی ہوئی۔ نرم بالوں سے پھوٹتی ہوئی خوشبو نے میری 'فائل گرے' کا طنطنہ ہوا میں اُڑا دیا۔ میں نے ارادی طور پر پنسل کی نوک ایک بال پر رکھ دی۔ ایسے ہی وقت میں اُس نے بالوں کو بازو پر لے کر اوپر جھٹکا۔ ننھی سی سسکی نکلی۔ بال ٹوٹ کر سفید کاغذ پر زخمی سانپ کی طرح لہرا کر گر گیا۔

اس نے بال کو چٹکی میں پکڑا۔ کھینچ کر کاغذ سے ہٹانا چاہا مگر میں نے پنسل کی نوک پر تھوڑا دباؤ بڑھا دیا۔ نظریں اُٹھائیں تو اُسے اپنی طرف دیکھتا پایا۔ اس کے چہرے پر خفت اور شکایت کا ملا جلا سا تاثر تو اور آنکھوں میں نہ سمجھنے کا تاثر موجزن تھا، بولی۔ ''یہ...... یہ لفظ میں نے کاٹ دیا تھا۔''

میں نے پنسل اُٹھائی۔ ورق پلٹا۔ کہا۔ ''میں یہ بتانا تو بھول ہی گیا تھا کہ اس میں افسانے وغیرہ شامل نہیں ہوں گے۔ صرف شاعری ہوگی۔ شاعروں کی خواب ناک دنیا ہوگی۔''

وہ استعجاب آمیز انداز میں بولی۔ ''بس؟''

میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر سر ہلایا۔ ''یس!''

''یعنی میگزین کے دو حصے بناؤں، غزلیں اور نظمیں۔ بس؟'' اس کی آواز میں لرزش معمول سے کچھ زیادہ شامل تھی۔

میں نے کہا۔ ''نہیں مریم! شعر کا حلقہ بہت بڑا ہے۔ کافی حصے بنیں گے مثلاً انشائیہ، شعرا سے متعلقہ خبریں، نظم، غزل، نثریے، ہائیکو...... ماضی کے ایک شاعر ایک حال کا۔ منتخب کلام، تازہ مجموعوں پر تبصرے، تنقید، تحقیقی مضمون، مراسلہ جات، اردو اور عالمی ادب سے......'' میں نے شعر سے منسلک کئی عنوانات اُسے گنوا دیے اور اس پر باور کرایا کہ میگزین کی اشاعت کا حقیقی محرک میری شاعری تھی۔ اس نے لیڈ پنسل سے تمام موضوعات اپنے رف پیڈ پر لکھ لیے۔

میں بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ تم میرا مطمحِ نظر جان چکی ہو۔''

''یس سر! آپ کے حکم کی تکمیل ہوگی۔'' اس کی نظریں ابھی تک اپنے خاموش سوال کے جواب کی متلاشی تھیں، بولی۔ ''ہمیں پہلے دو تین شماروں کا مواد خود تیار کرنا پڑے گا۔ جب خطوط اور ای میل کا سلسلہ چل نکلے گا، تب انتخاب میں آسانی پیدا ہو جائے گی۔ آپ مجھے بتا دیں کہ میگزین میں کس نوع کی شاعری شامل کی جائے گی، تاکہ میں انٹرنیٹ سے مواد منتخب کر کے ڈاؤن لوڈ کر لوں۔''

میرا مزاج انقلابی تھا۔ سوچ مزدوروں کی آواز رکھتی تھی۔ معاشرتی مسائل پر میں نے بہت کچھ لکھا تھا مگر کچھ گڑبڑ ہو گئی اور میرے لبوں سے بے ساختہ نکلا۔ ''رومانی شاعری...... کچھ حصہ انقلابی سوچ پر مشتمل ہوگا۔''

اسے اچنبھا ہوا۔ ''واقعی سر؟''

میں نے اُسے تائیدی نظر سے دیکھا، پھر اس کا مسرت سے مالا مال چاند سا چہرہ بہ نظرِ شوق دیکھا اور اثبات میں سر ہلایا۔ وہ ڈمی میری میز پر چھوڑ کر اپنی چیئر پر جا بیٹھی۔ سیاہ کی بورڈ پر اس کی مخروطی انگلیاں لرزنے لگیں۔ یوں لگا جیسے اس نے دل کے تاروں پر ہاتھ رکھ دیے ہوں اور کوئی نغمہ چھیڑ دیا ہو۔ اس کی لانبی پلکوں والی آنکھیں اسکرین پر جمی ہوئی تھیں۔ اسکرین سے پھوٹتی ہوئی روشنی آنکھوں سے منعکس ہو رہی تھی۔ حسن توازن کا نام ہے۔ تبھی کاپی پر کھینچی ہوئی سیدھی اور مسلسل لائن بھی نظروں کو بھلی لگتی ہے۔ اس کی آنکھ کا سفید حصہ بے حد سفید تھا، کسی بھی دھبے کے بغیر سیاہ حصہ بے حد چمکدار...... کسی بھی دھند کے بغیر۔ یہی توازن تھا۔ یہی حسن تھا۔

عجیب بات تھی۔ جب مریم سامنے آتی، مہرو کی شبیہ بھی چشمِ تصور میں سج جاتی۔ مہرو اور میری تنہائی میں مریم آن حائل ہوتی تھی۔ میں بے اختیار دونوں میں موازنہ کرنے لگتا۔ مہرو کے سامنے جاتا تو لفظ مجھ سے روٹھ جاتے تھے۔ مریم کی

موجودگی میں خاموشی بری لگنے لگی تھی۔ میں نے گلا کھنکارا، کہا۔ ''کیا تمہارے والدین بالاکوٹ میں رہتے ہیں؟''
وہ ایک دم چونکی، بولی۔ ''نہیں سر! فوت ہو چکے ہیں۔''
''اوہ تو...... مجھے دکھ ہوا یہ سن کر۔ بھائی بہن؟''
''بڑی بہن تھی۔ چھوٹا بھائی تھا۔ وہ بھی ماں باپ کے ساتھ اللہ کے پاس چلے گئے۔ میں اکیلی بچ گئی۔'' اس کے لہجے میں دُکھ کا عنصر تحلیل ہو گیا۔
''کوئی رشتہ دار؟'' مجھے تجسس ہوا۔
''کہا ناں، میں اکیلی بچ گئی۔'' عیاں تھا کہ وہ اس موضوع کو سمیٹ دینا چاہتی تھی۔ ''زلزلہ میرے پورے گاؤں کو چاٹ گیا تھا۔ سوائے ملبے کے کچھ باقی نہیں بچا تھا۔''
مجھے بے اختیار چند سال پہلے آنے والے خوفناک زلزلے کا خیال آ گیا جس نے ہزاروں افراد کو لقمۂ اجل بنا دیا تھا۔ کئی گاؤں صفحۂ ہستی سے نابود کر دیے تھے۔ اس کے چہرے پر رقص کرنے والی غم بار پر چھائیوں نے میرے دل میں تاسف بھر دیا۔ موضوع بدلنے کی خاطر پوچھا۔ ''اخبار کی ملازمت سے پہلے کیا کرتی تھیں؟''
''گاؤں کے اکلوتے اسکول میں پڑھاتی تھی۔''
''سرکاری نوکری تھی؟''
''نہیں سر! وہ نجی اسکول تھا، پرائمری کلاسز کے لیے، جس میں بہت معمولی تنخواہ پر بچوں کو پڑھایا کرتی تھی۔ مجھے پیسے کی ضرورت نہیں تھی، بس خود کو مصروف رکھنا چاہتی تھی۔'' اس نے کی بورڈ سے ہاتھ اُٹھا کر گود میں رکھ لیے۔
''کیا اس علاقے میں لڑکیوں کی تعلیم پر توجہ دی جاتی ہے؟''
اُس نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو 'اگر توجہ نہ دی جاتی تو میں گریجویشن کیسے کر لیتی؟
میں نے جلدی سے کہا۔ ''میرا خیال تھا کہ وہاں کا معاشرہ بہت قدامت پسند ہے۔''
وہ بولی۔ ''ایسا ہی ہے مگر میرے بابا اسکول ٹیچر تھے۔ انہوں نے کوہستانی روایات کے برعکس ہم دونوں بہنوں کو پڑھنے کا بھرپور موقع دیا۔ میری باجی لیکچرر تھی۔ میں ماسٹرز کرنا چاہتی تھی مگر...... ایک لمحے میں ساری دنیا بدل گئی۔ نہیں سر! بدل نہیں گئی، اُجڑ گئی۔''
''اب تم کہاں رہتی ہو؟''
''ویمن ہاسٹل میں...... یہاں سے دس کلومیٹر کے فاصلے پر، پنڈی کے قریب۔'' اس نے کرسی گھمائی۔ اپنا رُخ میری جانب پھیر لیا۔ گہری نظروں سے دیکھنے لگی۔
میں نے پوچھا۔ ''ہاسٹل کی فیس کیا ہے؟''
''میس سمیت بائیس سو روپے۔ میرے ساتھ کمرے میں ایک لڑکی اور بھی رہتی ہے جو ایک بڑے ریستوران کے کچن میں شبانہ ڈیوٹی کرتی ہے۔'' وہ آنکھیں جھپکے بغیر مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''ویگن پر آتی جاتی ہوں۔ دو طرفہ کرایہ سات آٹھ سو روپے بنے گا۔ ماہانہ۔''
''ہوں۔'' میں نے دل ہی دل میں شمار کیا، کہا۔ ''آدھی سے زیادہ تنخواہ رہائش اور ٹرانسپورٹ میں چلی گئی۔ باقی کیا بچا؟''
اس کی بڑی بڑی آنکھوں کے حیرانی آمیز تاثر سے پتا چلا کہ وہ میری گفتگو کا نتیجہ اخذ کرنے میں ناکام رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''میرا کہنے کا مطلب ہے کہ تم نے اتنی کم تنخواہ والی نوکری کیوں قبول کر لی؟''
اس کے لبوں پر ایک معصوم سی مسکراہٹ ابھری۔ بولی۔ ''جب آپ کو اس بات کا احساس ہے تو بیگم صاحبہ سے میری سفارش کر دیں۔ وہ میری تنخواہ میں تھوڑا بہت اضافہ کر دیں گی۔''
مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ اُس کا چیف ایڈیٹر میں تھا، مہرو نہیں مگر اس نے مجھے مہرو کا راستہ کیوں دکھایا تھا؟ میں نے حیرانی سے پوچھا۔ ''تم میری ماتحتی میں کام کر رہی ہو ناں کہ بیگم صاحبہ کی۔ میں اگر چاہوں تو تمہاری تنخواہ میں اضافہ کر سکتا ہوں اور......''
اس نے سوالیہ نظروں سے 'اور' کے آگے چھپے رہ جانے والے سوال کو کریدا۔
میں نے کہا۔ ''اور چاہوں تو نوکری سے فارغ بھی کر سکتا ہوں۔''
''نہیں سر! آپ تنخواہ بڑھا سکتے ہیں مگر مجھے نکال نہیں سکتے... اور نہ تنخواہ میں کمی کر سکتے ہیں۔ بیگم صاحبہ نے مجھے چھ ماہ کی تنخواہ کے چیک دے دیے ہیں۔ میری نوکری کو تحفظ دینے کے لیے۔''
میں دم بخود رہ گیا۔ ایک لمحے کو مہرو پر بے تحاشا غصہ آیا پھر آپوں آپ تحلیل ہو گیا۔
وہ جلدی سے بولی۔ ''وہ کیا ہے کہ بیگم صاحبہ نے میرا انٹرویو لیا تھا ناں...... میں سمجھی شاید وہی ان معاملات کو دیکھیں گی۔ ورنہ تو انہوں نے بھی مجھے بتایا تھا کہ آپ میرے چیف ایڈیٹر ہیں' باس ہیں۔''
میں نے ہنکارا بھرا۔ اس نے ایک بہت بڑا چیلنج میرے سامنے رکھ دیا تھا۔ میں نے فوراً فیصلہ سنایا۔ ''ٹھیک ہے۔ آئندہ تمہارے آنے جانے کا کرایہ میگزین ادا کرے گا۔''

اس نے ممنون نظروں سے مجھے دیکھا اور کہا۔ ”شکریہ سر! میں خود کو اس کا اہل ثابت کروں گی کہ آپ کا فیصلہ میگزین کے لیے مفید ہے۔“

مجھے اُس کے چہرے پر خوشی کی کہکشاں اچھی لگی۔ جی چاہا کہ وہ ایسے ہی میرا شکریہ ادا کرتی رہے، دیکھتی اور مسکراتی رہے۔

بولی۔ ”سر! آپ مجھے اتنے غور سے کیوں دیکھتے ہیں؟“

میرے ذہن میں جھپاکا سا ہوا۔ ایک دم شرمسار ہو کر رُخ بدل گیا۔ بہ دقت کہا۔ ”ویسے ہی...... دراصل دفتر میں کوئی کام بھی تو نہیں ہے۔ اس فراغت میں دیکھا اور بولا ہی تو جاسکتا ہے۔“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے غیر ارادی طور پر اُسے دیکھا۔ وہ خاموش تھی مگر اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں۔ ’سر! آپ کا جواب مجھے مطمئن نہیں کر پایا۔ کوئی اور جھوٹ بولیں۔‘

اس نے رُخ پھیرا، پرنٹر آن کیا، چند پرنٹ نکالے اور پیپر کلپ لگا کر میرے سامنے رکھ دیے، بولی۔ ”سر! میں نے انٹرنیٹ سے کچھ شاعری لی ہے، اس کا مطالعہ کرلیں۔ آپ کی منتخب شاعری ٹائپ کرلوں گی۔“

اس کی لرزتی ہوئی آواز میری سماعت میں اُتر کر معانی بدل گئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اُس نے کہا ہو۔ ”لیں! میں نے آپ کو مصروف کردیا ہے۔ اب مجھے نہ دیکھیے گا۔“

میں نے کاغذوں کا پلندا اُٹھالیا۔ میری انگلیاں کانپ رہی تھیں اور دل ہی دل میں اپنے آپ کو کوس رہا تھا۔ اپنے عامیانہ برتاؤ پر تاؤ آیا اور میں نے سلگتے ہوئے ذہن کو کاغذوں میں رُجھانے کی کوشش کی۔ تبھی میں نے جماہی لی اور کاغذ اُٹھائے ریٹائرنگ روم میں آگیا۔ جوتوں سمیت بیڈ پر دراز ہو گیا۔ آنکھوں پر بانہہ رکھ کر اپنے غیر شائستہ رویے اور مریم ماہ وش کے ردِعمل کے بارے میں سوچنے لگا۔

گھنٹا بھر کے بعد اس نے آہستگی سے دروازہ کھولا، پوچھا۔ ”سر! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟“

میں نے جھٹ سے آنکھیں کھولیں۔ وہ دروازہ تھامے کھڑی تھی۔ میں نے کہا۔ ”ہاں! مگر میں چائے پینا چاہوں گا۔ انٹرکام پر کہہ دو۔“

اس نے ’جی سر!‘ کہا اور پلٹ گئی۔ تھوڑی دیر بعد ٹرے اُٹھائے ریٹائرنگ روم میں آئی جسے اُس نے تپائی پر رکھ دیا اور قالین پر بیٹھ کر چائے تیار کرنے لگی۔ چینی اور دودھ ڈالنے سے پیشتر سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے کہا۔ ”ڈیڑھ چمچ...... دودھ کم ڈالنا۔“

اس نے اپنے لیے بھی چائے تیار کی اور قالین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ چائے کا ننھا سا گھونٹ بھر کر بولی۔ ”سر! آپ ناراض ہیں؟“

میں نے مصنوعی استعجاب چہرے پر ثبت کیا، کہا۔ ”کیوں؟ میں بھلا تم سے کیوں ناراض ہوں گا۔“

اس نے سر جھکا لیا۔ ”یا دل جوں جوں بلند ہوتا جاتا ہے، حساس ہوتا جاتا ہے۔ تھوڑے سے موسمی تغیر پر برسنے لگتا ہے۔“

مجھے اس کی بات نے واقعتاً مزہ دیا۔ اُٹھ بیٹھا۔ چائے کے بھرپور گھونٹ کا حظ کشید کیا، کہا۔ ”مگر میں تو معمولی آدمی ہوں۔“

”نہیں سر! آپ بڑے آدمی ہیں۔“ اس نے تحمل سے جواب دیا۔

میں بھول گیا کہ تھوڑی دیر قبل میں اس کے بارے کیا سوچ رہا تھا اور اپنے تئیں خود کو بے پروا ثابت کرنے کے لیے کیا لائحہ عمل ترتیب دے رہا تھا، بولا۔ ”مریم! میں یہ تو نہیں کہتا کہ میں خاص ہوں مگر میری عادات عام آدمی سے تھوڑی مختلف ہیں اس لیے مجھے عام انداز میں نہ لینا۔“

”کیا آپ کی محبت کا انداز بھی مختلف ہے؟“ اس نے براہِ راست میری آنکھوں میں جھانکا۔

میرے پورے بدن میں عجیب سی سنسنی سرایت کر گئی۔ مجھے اس سوال کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ میں نے کہا۔ ”اس بارے میں میری رائے محفوظ ہے کیونکہ میں زندگی کے اس محل میں داخل نہیں ہوسکا جس کی غلام گردشوں میں محبت کے نغمے یا نوحے بازگشت پیدا کرتے ہیں۔“

اس کے چہرے پر حیرانی رقم ہوگئی، بولی۔ ”میں نے آپ کی بات کا اپنی استعداد کے مطابق یہ مطلب نکالا ہے کہ آپ کو محبت کرنے کا موقع نہیں ملا؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ بے حد معصومیت سے بولی۔ ”کیا میں یقین کرلوں؟“

میں چونکا۔ ”کیوں؟ کیا میں نے اتنی ہی عجیب بات کر دی ہے کہ تمہیں یقین نہیں آرہا؟“

اس نے سر جھکا کر اپنا چہرہ چھپالیا۔ دل کی دنیا کو آشکار ہونے سے بچانے کے لیے یہ ایک بہترین انداز تھا، بولی۔ ”آپ دو بچوں کے باپ ہوتے ہوئے بھی اتنے ہینڈسم ہیں، امیر ہیں...... اور پھر معروف شاعر بھی ہیں...... نہیں سر! میرا دل ہرگز نہیں مانتا کہ آپ کو محبت کرنے کا موقع نہ ملا ہو۔“

چائے پینا مشکل ثابت ہورہی تھی۔ میں نے کپ رکھ دیا۔ اس کے شانوں پر سایہ فگن زلفوں کے پیچ و خم پر نگاہ ڈالی، کچھ سوچا، پھر کہا۔ ”اگر محبت کرنے سے انسان کی قلبی تشفی ہوتی ہو تو انسان موقع تلاش کرلیتا ہے۔ مجھے دراصل محبت کے ہونے کا انتظار تھا...... نہیں ہوئی۔“

”اوہ......“ اس کے لبوں پر ایک زندہ مسکراہٹ تیر گئی، بولی۔ ”اب سمجھی...... آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میں واقعی غلطی پر تھی۔“

میں تمام تر پیش بندیوں سمیت اُسے بہ نظرِ شوق دیکھا رہا۔ وہ مسکرائی۔ ”میں نے یہی پوچھا تھا کہ آپ مجھے اتنے غور سے کیوں دیکھتے ہیں؟ آپ میری بات کا برا مان گئے۔ کیا مجھے یہ سوال نہیں کرنا چاہیے تھا؟“

اس کی آنکھیں زندگی سے بھرپور تاثر لیے ہوئے تھیں جبکہ ہونٹوں پر ایک موہوم سی مسکراہٹ رقصاں تھی۔ وہ ناراض نہیں تھی۔ وہ تو بس ایسے ہی پوچھ رہی تھی۔

میں نے ایک گہری سانس سینے میں اُتاری اور کہا۔ ”ہوں...... میں تمہیں کیوں دیکھتا ہوں؟...... پتا نہیں...... بس تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں، دیکھ لیتا ہوں۔ شاید میں اس سے بہتر جواب نہیں دے سکتا۔“

”بیگم صاحبہ نے مجھے کہا تھا کہ آپ بہت سنجیدہ اور کم گو ہیں۔ ہر سوال کا جواب ’ہوں‘، ’ہاں‘ اور ’نہیں‘ میں دیتے ہیں۔ میں ڈر گئی تھی۔ آپ کو دیکھنے تک میں نے اپنے ذہن میں آپ کی نہایت مشکل امیج بنالی تھی مگر جب آپ سے ملی تو حیرت کی انتہا نہیں رہی۔ آپ تو بہت بولتے ہیں اور بولتے ہوئے اچھے بھی لگتے ہیں۔“

”اور دیکھتے بھی ہیں؟“ میں نے بہ ظاہر سنجیدگی سے کہا مگر میرے اندر شرارت بھری ہوئی تھی۔

”جی سر!“ اس نے فوراً تائید کی۔ ”پھر میں نے سوچا کہ بیگم صاحبہ نے اپنے طور پر مجھے بے حد محتاط رہنے کا مشورہ دیا تھا۔“ اس نے چائے ختم کرلی تھی۔ برتن سمیٹتے ہوئے اس کی نگاہ میرے کپ پر پڑی، بولی۔ ”سر! آپ نے چائے نہیں پی؟“

میں نے غیر ارادی طور پر کپ اُٹھایا اور دو چار بڑے بڑے گھونٹوں میں خالی کرکے ٹرے میں رکھ دیا۔

”سر! بک ریک میں آپ کی پہلی کتاب پڑی ہے۔ سرسری انداز میں دیکھنے پر اچھی لگی ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اُسے اپنے ساتھ لے جاتی ہوں۔ دو تین دنوں بعد لے آؤں گی۔“

اس کتاب میں میرے اُس دور کی شاعری شامل تھی، جس دور میں مجھے محبت کے ہونے کا انتظار تھا۔ اُس کی عمر ایسی ہی شاعری سے بہل سکتی تھی۔ میں نے کہا۔ ”تمہارے مطلب کی ہے، اس لیے پڑھنا چاہتی ہو؟“

اس نے کوئی جواب دیا نہ سر ہلا کر اقرار کیا مگر چہرے کے اُتار چڑھاؤ نے چغلی کرتے ہوئے میرے خیال کی توثیق کردی۔

میں نے کہا۔ ”یہیں پڑھ لیا کرو۔“

”میں اسے رات کو پڑھنا چاہتی ہوں۔“ اس نے جلدی سے کہا۔ میں نے اجازت دے دی۔

یہ خیال بڑا کیف آور تھا کہ میرے اشعار بھی اس کی بانکی رات کی دیوانی بانہوں میں مچلنے والے تھے۔ سوچا، تو آنکھیں یک لخت بند ہوگئیں اور میں نے اتنی زور کی سانس لی کہ سینہ پھٹنے کو آگیا اور میرا جسم اس کی آواز کی طرح ہولے ہولے لرزنے لگا۔

شاید وہ میرے ساتھ بیٹھ کر لنچ نہیں کرنا چاہتی تھی، اس لیے جب ملازمہ نے کھانا سرو کیا، اس نے یہ کہہ کر مجھے لاجواب کردیا۔ ”میں دوپہر میں کھانے کی عادی نہیں ہوں۔“

ابھی مہرالنسا بچوں سمیت لوٹی نہیں تھی، جب مریم نے ڈائری، پرس اور کتاب سنبھالی، کریم کلر کی جگنوؤں جیسے موتیوں سے بھری شال اوڑھی اور مجھ سے اجازت چاہی۔ میرا جی چاہا کہ اُسے گیٹ تک الوداع کہنے جاؤں مگر جھجک آڑے آئی۔ وہ رخصت تو ہوگئی مگر یوں کہ اپنا سراپا دروازے میں آویزاں کرگئی۔

میں چوبیس گھنٹے ایک کمرے میں محبوس رہ کر وقت گزارنے کا عادی تھا مگر آدھے دن میں ہی دل میں حبس پیدا ہونے لگا تھا۔ بے اختیار کمرے سے نکل کر پھولوں بھرے لان میں آگیا جس کے درمیان میں ایک سرخ ٹاپ والی چھتری نصب تھی۔ لان ناہموار مگر گہرے سبز شنیل سے ڈھکا ہوا تھا۔ بنگلے کا اگلا حصہ مختلف رنگوں کی پھولدار بیلوں سے چھپا ہوا تھا۔ یہ تو ان فضا کا اثر تھا، ماحول کی تبدیلی کا یا میرے اندر پیدا ہونے والے تغیر کا، کہ کھلی فضا میں بیٹھنے کی وجہ سے میرے سر میں درد نہیں ہوا ورنہ یہاں آنے سے پہلے میں چند منٹوں سے زیادہ کمرے سے باہر رہتا تھا تو سر درد سے پھٹنے کو آجاتا تھا۔

ایسے ہی وقت میں جب میں ایک ننھے سے پیلے گلاب کی پنکھڑیوں پر نظریں جمائے بیٹھا تھا، اس کی شوخیوں پر مریم ماہ وش کا وجود استعارہ بنا کر اُتار رہا تھا، مین گیٹ مخصوص آواز کے ساتھ کھلا۔ میرا چھوٹا بیٹا دکھائی دیا جو گیٹ

کو دھکیل رہا تھا۔ گیٹ کھلنے پر مہرو کی سفید شیراڈ اندر داخل ہوئی۔ پورچ شیڈ تلے کار کھڑی کرنے کے بعد تینوں میرے قریب آئے۔ بچوں نے سلام کیا، مہرو بولی۔ ”تمھیں یہاں بیٹھا دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہو رہی ہے۔“

بچوں نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں کہ بابا کا یہاں بیٹھنا تو کوئی عجیب بات نہیں ہے، پھر خوشی کاہے کی؟ میرا جواب نہ پا کر مہرو نے انہیں سامان اُٹھا کر اندر جانے کا حکم دیا اور میرے دائیں ہاتھ کرسی پر بیٹھ گئی۔ بچوں کے جانے کے بعد میرا ہاتھ تھام کر سہلانے لگی، پوچھنے لگی۔ ”وہ چلی گئی؟“

فطری طور پر مجھے اس سے پوچھنا چاہیے تھا کہ ’کون چلی گئی؟‘ مگر میں نے جواب دیا۔ ”ہاں!“

ایسے میں مجھے مریم کی بات یاد آ گئی۔ اُسے مہرو نے کہا تھا کہ میں ہاں اور نہیں میں جواب دینے کا عادی ہوں۔ مجھے اپنے اختصار پسند غیر مساویانہ رویے پر ایک ذرا دکھ ہوا۔

وہ بولی۔ ”آج اُس نے کوئی کام کیا؟“

”ہاں!“

”کیا؟“ وہ سراپا سوال بن گئی۔

”مسودے پر کام کرتی رہی۔“

”اس نے کچھ کہا بھی؟“

”ہاں......“ میں نے کچھ تامل سے کہا۔ ”ویگن کے کرایے کا رونا رویا۔“

”پھر؟“ اس کا اشتیاق مجھے بے جا لگا۔

”میں نے اپنے ذمے لے لیا ہے۔“

”اپنے یا میگزین کے؟“ اس نے براہِ راست میری آنکھوں میں جھانکا۔

مجھے گڑبڑ کا احساس ہوا۔ جلدی سے اصلاح کی۔ ”میگزین کے۔“

”یہ اضافی رقم سائز خرچ میں ڈالو گے؟“

اس کے لہجے میں کچھ نیا پن تھا جسے میں کوئی عنوان نہ دے پایا۔

”ایڈجسٹ تو کرنا ہی پڑے گا۔“

”ہاں! کیونکہ میں میگزین کا بجٹ ہرگز نہیں بڑھاؤں گی۔“

”او کے!“ اس کے بے لاگ سوالات نے مجھے بیزار کر دیا۔ میں نے پیشانی سہلائی، کہا۔ ”چائے کا ایک کپ بھجوا دو۔“

”یہیں؟“

”ہاں! میں ابھی کچھ دیر یہیں بیٹھنا چاہوں گا۔“

وہ ہاتھ میں پکڑا ہوا شاپنگ بیگ جھلاتی تھل تھل کرتے وجود کے ساتھ چلتے ہوئے گھر میں داخل ہوئی تو میں نے اطمینان کی سانس لی۔ تھوڑی دیر بعد ملازمہ مجھے چائے کا مگ تھما گئی۔

چائے پینے کے دوران میں اُس ’شام‘ کے بارے میں سوچنے لگا جو یونیورسٹی میں میرے ساتھ پڑھا کرتی تھی اور دن کے کسی بھی وقت میرے کمرے میں وارد ہو جایا کرتی تھی۔ اس کا نام اس کی سانولی رنگت کی ترجمانی کرتا تھا۔ میں نے ایک مرتبہ نہر کے کنارے چلتے ہوئے اُس سے پوچھا تھا۔ ”شام! تمہارا نام تو صبح ہونا چاہیے تھا، پھر نام رکھنے والے نے تمہارے ساتھ یہ زیادتی کیوں کی؟“

وہ تھم گئی۔ میرا بازو تھام کر ہنسی، بولی۔ ”وسیم! جھوٹ مت بولو۔ میں صبح نہیں، شام ہوں۔ شام کا دھندلا منظر ہوں۔ اپنے نام سے مطمئن ہوں کیونکہ یہ نام میرے نانا جان نے رکھا تھا۔“

وہ کنیر کی گیلی ٹہنی کی طرح لچکیلی تھی۔ اپنی موج میں لہراتی تو دیکھنے والے کے بدن میں عجیب سردی لہر دوڑ جاتی تھی۔ دھوپ میں اُس کا چہرہ تمتما کر سرخی مائل ہو جاتا تھا اور تب وہ بہت پیاری لگتی تھی۔ میں نے اُسے ایک مرتبہ کہا تھا۔ ”جی چاہتا ہے کہ تمھیں دھوپ میں سورج کے رُخ بٹھا کر سارا دن دیکھتا رہوں۔“

اس نے جھٹ سے جواب دیا تھا۔ ”تاکہ میں مزید کالی ہو جاؤں اور شادی کا رہا سہا چانس بھی مارا جائے۔ خدا کے لیے ایسا ڈراؤنا رومان اپنے پاس رکھا کرو۔“

وہ بہت تیز طرار لڑکی تھی۔ اس سوسائٹی سے تعلق رکھتی تھی جہاں جذبات ننگے پیر دوڑتے رہتے تھے اور بالائی بدن بانہوں میں تھمے رہتے تھے۔ آنکھیں باؤلی اور لب مخمور...... اُس نے اپنی جوانی کی ایک بھرپور رات میرے لیے نکالی تھی۔ اُس رات کی تنہائی میں اُس نے بہتیرا چاہا کہ میری آنکھوں سے گزر کر دل میں اُتر جائے مگر نہ جانے کیا ہوا کہ میں اُس سے بیزار ہو گیا۔ بہت بدصورت لگنے لگی حالانکہ اُسے خوبصورت سمجھنے والوں کی کمی نہیں تھی۔ اور تب، جب برہنہ پا اکیلے دوڑتے دوڑتے ہانپ گئی، بولی۔ ”تم ڈرپوک ہو...... آئی ہیٹ یو!“

میں نے سر جھکا کر الزام قبول کر لیا تھا۔ کوئی شام ڈھلتی نہیں مگر وہ شام کسی رات کا ہیجان اُتارے بغیر صبح دم واپس چلی گئی۔ چند دن روٹھی رہی پھر از خود مان گئی۔ ایسی غیر فطری رنجش کا انجام ایسا ہی غیر فطری ہوتا ہے۔ پھر بھی کبھی نہر کے کنارے چہل قدمی کرتے ہوئے پوچھا کرتی تھی۔ ”تم نے

اُس رات مجھے مسترد کیوں کر دیا تھا؟ کیا میں ایسی ہوں؟“

میرے پاس اس کے سوال کا جواب نہیں ہوتا تھا، بس ایک شرارتی سا قہقہہ ہوا میں اُچھال دیا کرتا تھا۔ میں یہ کہہ کر کہ ’ہاں! تم مجھے خوب صورت نہیں لگتی ہو‘ اُس کی دل شکنی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اکثر سوچا کرتا تھا کہ میں اس کی دوستی کی چھاؤں میں کیوں رہتا ہوں جب وہ مجھے خوب صورت ہی نہیں لگتی تھی۔ پھر ایک دن جب وہ یونیورسٹی نہیں آئی اور میں نے تمام دن اُس کی آواز نہیں سنی، تب پتا چلا کہ میں اس کی آواز کا دیوانہ تھا۔ وہ بولتے ہوئے بہت اچھی لگتی تھی۔ جب جھکتی تھی، تب اچھی نہیں لگتی تھی۔ ٹہنی پر جھکے ہوئے سر والا گلاب بھی اچھا نہیں لگتا۔

’کیا انسان کی ایک خوبصورتی سے نباہ کرتے ہوئے اس کی دوسری خامیوں پر آنکھ پردہ ڈال سکتی ہے؟‘ میں نے اپنا اندر ٹٹولا۔

جواب میں گہرا اندھیرا ملا۔

دماغ نے ایک اور سوالیہ نشان میری نظروں کے سامنے ایستادہ کر دیا۔ ’کیا تم مہرو کو آج تک صرف اس لیے قبول نہیں کر پائے کہ اس کا رنگ کالا، نقوش بھدے اور جسم فربہ ہے؟‘

☆☆☆

جس دن میگزین کا نام ”بین السطور“ طے پایا، اُس دن ہی مریم نے پہلا شمارہ تیار کر لیا۔ پروف پرنٹ نکال کر میری ٹیبل پر رکھ دیے، بولی۔ ”سر! صفحہ نمبر چار آپ کے اداریے کے لیے خالی ہے جو آپ نے ابھی تک تحریر نہیں کیا۔“

وہ مجھے کئی مرتبہ یاد دلا چکی تھی۔ میں نے فائل ایک جانب رکھ دی۔ لیڈ پنسل تھام لی۔ لکھنے لگا۔ ایک گھنٹے تک لکھتا رہا، مٹاتا رہا پھر مطمئن انداز میں کاغذ اُس کی طرف کھسکا کر بولا۔ ”اس کا پرنٹ نکال کر فائل میں شامل کر دو۔“

اس نے کاغذ کلپ بورڈ پر آویزاں کر دیا۔ انگلیاں تھرکنے لگیں۔ پھر رُک کر مجھے دیکھنے لگی۔ میری آنکھوں کے استفسار پر بولی۔ ”کچھ نہیں سر! میں تھک گئی ہوں۔“

عیاں تھا کہ وہ جھوٹ بول کر ٹال رہی تھی۔ میں نے اصرار نہیں کیا۔ اس نے کلپ بورڈ پر نظریں جمائیں اور اپنی مخصوص لرزتی ہوئی آواز میں گویا ہوئی۔ ”میں پہلے حسن کو دیکھنے والے شخص کے متحیرانہ اظہار کو دنیا کا پہلا شعر قرار دیتا ہوں کیونکہ وہ دل کی بے ساختہ آواز تھی۔“

اس کا جاوداں انداز گویائی میری تحریر کو لازوال حیات عطا کر رہا تھا اور میں دم بخود اُسے دیکھ رہا تھا۔ مہرو کہتی تھی کہ حسن محض توازن کا نام نہیں...... کہیں کہیں نظام کی گڑبڑ ایسے حسن کی داغ بیل رکھ دیتی ہے جس سے نظریں چرانا ممکن نہیں رہتا۔

مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ پڑھتے پڑھتے اچانک رُک گئی تھی اور میری نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے رُخ پھیر چکی تھی۔ بولی۔ ”سر! کیا میں یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوں کہ آپ نے میری رائے پر اپنی شاعری کا رُخ بدل لیا؟“

ایک پُراسرار چھناکا ہوا۔ یوں لگا جیسے میں اچانک خلا میں جا کھڑا ہوا تھا کہ میرا وزن ختم ہو گیا تھا۔ اُس نے اعادہ کیا۔ ”سر! میری وجہ سے ناں؟“

میں نے بہ وقت تمام اپنے آپ پر قابو پایا اور کہا۔ ”تمہاری وجہ سے؟...... نہیں نہیں! ایسا نہیں ہے۔“

”تو پھر کیا ہے؟“ اس کا لہجہ اُمید سے عاری ہو گیا۔

”میں میگزین کو کامیاب کرنا چاہتا ہوں۔“

”یعنی صرف کاروباری ضرورت کے لیے آپ نے اتنی بڑی قربانی دے دی؟“

”ہاں شاید......“ مجھے احساس ہو گیا کہ میری آواز سے اعتماد کا عنصر عنقا ہو گیا تھا۔

اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کشا کیے، پھر تھم گئی اور اپنے کام میں از سرِ نو منہمک ہو گئی۔

میں نے اداریے سمیت تمام مواد پڑھا۔ اسی بہانے پروف ریڈنگ ہو گئی۔ اس نے میری سوچ سے کہیں بہتر انداز میں میرے شوق کی بساط سجا دی تھی۔ میں نے ’او کے‘ کر دیا مگر اگلی صبح مہرو نے اُس میں کئی خامیاں نکال کر رکھ دیں۔ میری موجودگی میں ہی اُس نے مریم ماہ وش کو ہدایات سے نوازا اور مطمئن ہونے کے بعد بولی۔ ”آپ دونوں نے اپنا کام دس دنوں میں ختم کر لیا۔ اگلے بیس دن کیا کریں گے؟“

مریم بولی۔ ”اگلے شمارے کی تیاری کریں گے۔“

وہ نفی میں سر ہلا کر بولی۔ ”نہیں! آئندہ آپ لوگ پہلے کے بجائے دوسرا عشرہ میگزین کی تیاری پر صرف کریں گے۔ پہلے عشرے میں سرکولیشن جبکہ دوسرے میں اشتہارات حاصل کریں گے۔ اس شمارے میں سے بھی کچھ میٹر نکالنا پڑے گا جہاں اشتہارات لگائے جائیں گے۔“

”اشتہارات؟“ مریم چونکی۔ ”بھلا ہمیں کون اشتہار دے گا؟ ہمارا تو میگزین ہی ادبی ہے اور ادبی رسائل کو اشتہارات نہیں ملتے۔“

مہرو بولی۔ ”تمہاری معلومات درست ہیں مگر ادبی

نائن سیکٹر۔"

میں نے شادی سے پہلے اسلام آباد دیکھا تھا۔ اچھا تھا مگر یہ سولہ سترہ سال پرانی بات تھی۔ زمانے نے اس دوران طویل مسافت طے کر لی تھی۔ مجھے نہ تو رستوں کا علم تھا، نہ شہر کا اور نہ کسی ایڈورٹائزنگ ایجنسی کا پتا تھا۔ مریم پچھلی نشست پر میرے بائیں پہلو میں بیٹھی باہر دیکھ رہی تھی۔ ہمارے درمیانی فاصلے کو اس کی کریم کلر کی چادر نے پُر کر رکھا تھا۔ میں بلاوجہ اُس کی چادر پر چمکتے ہوئے ننھے ننھے موتیوں کو دیکھنے لگا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ چادر کے نیچے اُس نے اپنا سامان رکھا ہوا تھا۔ میں نے غیر ارادی طور پر چادر ہٹائی، دیکھا۔ فائل پر اس کا ہینڈ بیگ، ڈائری اور چند پیپرز پڑے تھے۔ میں نے فائل اُٹھا کر اپنی گود میں رکھ لی۔ اس نے چونک کر سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا پھر جواب نہ پا کر شیشے کے پار دیکھنے لگی۔

جب میں نے اس کا پرس کھولا، مجھے پوری طرح احساس تھا کہ یہ غیر اخلاقی حرکت ہے۔ اس دوران اسے کن انکھیوں سے دیکھا۔ وہ الجھے الجھے انداز میں مجھے دیکھ رہی تھی۔ میرے دیکھنے پر پھر رُخ پھیر گئی اور اونچے نیچے سبز ٹیلوں کو دیکھنے لگی۔ اس کے پرس میں چند نوٹ اور اس کے ذاتی استعمال کی اشیا تھیں۔ میں نے اُسے بند کیا اور اس کی چادر کے پھیلے ہوئے دامن پر رکھ دیا۔ پیپرز اوپر نیچے کر کے دیکھے۔ اس نے میگزین کے پیج سائز میں نمونے کے چند اشتہارات ڈیزائن کیے تھے تاکہ اشتہاری ایجنسی کو دکھا کر بات چیت کر سکے۔

میں نے دوسری غیر اخلاقی حرکت کرتے ہوئے اُس کی ڈائری کھول لی۔ ایسے ہی وقت اُس کی برداشت جواب دے گئی اور اس نے احتجاجی انداز میں اپنا ہاتھ ڈائری پر رکھ دیا۔ ملتجیانہ انداز میں بولی۔ "پلیز سر!"

اس نے انہی دو لفظوں میں اپنی استدعا اور مزاحمت سمو دی تھی۔ میں نے ڈائری بند کر دی۔ اسے شکوہ کناں نظروں سے دیکھا۔ وہ ڈائری اپنی گود میں رکھتے ہوئے بولی۔

"آپ نے بُرا تو نہیں مانا سر؟"

میں نے انکار میں سر ہلایا، کہا۔ "میں سمجھا تھا کہ ڈائری میں تم نے میگزین کے متعلقہ نوٹس لکھ رکھے ہوں گے۔"

وہ بہت حساس واقع ہوئی تھی۔ ان الفاظ کو بھی پڑھ لیتی تھی جسے میری زبان کے بجائے آنکھوں نے ادا کیا ہوتا تھا۔ اس نے میری آنکھوں میں ہویدا ہونے والے موہوم سے شکوے کو بھی پڑھ لیا۔ کچھ دیر سوچتی رہی۔ انگلیوں سے

رسائل کو اشتہار نہ ملنے کی وجہ یہ نہیں کہ انہیں کوئی اپنی مصنوعات کی تشہیر دیتا نہیں، بلکہ وہ اشتہارات دینے والے اداروں تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے۔ کیونکہ وہ صرف ادیب ہوتے ہیں، بزنس مین نہیں۔"

"کیا ہمیں مل جائیں گے؟" مریم کی آنکھوں میں بے یقینی رچی ہوئی تھی۔

"وائے ناٹ!" مہرو نے کہا۔ "ملک کے تجارتی مراکز تین بڑے شہر ہیں جن میں کئی تشہیری ایجنسیاں کام کرتی ہیں۔ ہمیں ان سے رابطہ کرنا ہوگا۔ وہیں سے اشتہار ملیں گے۔ میں نے اس پر ہوم ورک کر لیا ہے۔ آؤ، تمہیں سمجھاتی ہوں کیونکہ یہ کام بھی تمہیں ہی کرنا ہے۔"

مہرو نے میری دراز سے ایک مہرنگ کی فائل نکالی جس پر 'شعبہ اشتہارات' لکھا ہوا تھا اور مریم کو لے کر ریٹائرنگ روم میں چلی گئی۔ مجھے شرمندگی ہوئی۔ میں نے اس فائل کو دیکھنے کے باوجود اب تک کھول کر پڑھنے کی زحمت نہیں کی تھی ورنہ اس پر کچھ نہ کچھ کام سرانجام دے چکا ہوتا۔

انہوں نے مجھے سمجھانے میں کافی وقت لیا۔ جب مہرو اُسے پہلو میں چپکائے باہر آئی، میں آنکھیں بند کیے کرسی میں جھول رہا تھا۔ مہرو بولی۔ "ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ آج ہی پنڈی کی ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں کو چیک کیا جائے۔ کیا آپ مریم کے ساتھ جائیں گے؟"

مہرو کے بے تاثر مگر مودبانہ لہجے نے مجھے الجھا دیا۔ خالی نظروں سے اُسے دیکھتا رہا، پھر بولا۔ "کیا تم بھی جاؤ گی؟"

"نہیں...... یہ آپ کا دفتری کام ہے۔"

میں نے کن انکھیوں سے مریم کی طرف دیکھا، کہا۔ "ہاں!"

مہرو نے ایک نظر مریم کو دیکھا، پھر مجھے۔ تب پھر مجھے اُس کی آنکھوں کا غیر معمولی خلا دکھائی دیا۔ ایک دم جھرجھری سی آ گئی۔ میں نے آج تک اتنی خالی آنکھیں کسی بھی چہرے پر نہیں دیکھی تھیں۔ وہ 'بائے' کہہ کر دفتر سے نکل گئی۔ میں اور مریم رہ گئے۔

اس نے پوچھا۔ "کیا ابھی چلنا ہے سر؟"

میں نے ایک طویل سانس پھیپھڑوں میں اُتاری اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ تھوڑی دیر بعد ہم اسلام آباد جانے کے لیے مہرالنسا کی سفید شیراڈ میں بیٹھ چکے تھے۔ عبدالکریم بہ یک وقت ڈرائیور اور گھریلو ملازم کے فرائض سرانجام دیتا تھا۔ مین روڈ پر آتے ہی اُس نے پوچھا۔ "کس طرف چلنا ہے صاحب؟"

میرے بجائے مریم نے بتایا۔ "اسلام آباد...... جی

ڈائری کی چرمی جلد کو ہولے ہولے کھرچتی رہی پھر میری طرف بڑھا کر بولی۔ "دیکھ لیجیے۔"

میں نے ٹھٹک کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ مجھے ڈائری دکھانے کی خواہش اس کے دل میں جاگ اُٹھی تھی۔ پہلا انکار محض میرے تجسس کو ہوا دینے کے لیے تھا۔ میں نے کچھ تامل سے کام لیا تو اس نے 'پلیز سر' کہہ کر ڈائری میری گود میں رکھ کر کھول دی۔ اپنا ہاتھ پھیلا کر دونوں صفحوں پر رکھا، پھر ایک ادا سے اُٹھایا اور فرحت انگیز احساس میرے دل میں جاگزیں کر دیا۔

میری نظر اس کے ننھے منے لفظوں میں الجھنے لگی۔ ابتدائی چند صفحات کو سرسری دیکھنے کے بعد میں ایک صفحے پر ٹھہر گیا۔ اس نے 'عید' کے عنوان سے ایک نثری نظم لکھ رکھی تھی۔ میں نے پوچھا۔ "یہ کس نے لکھی ہے؟"

"یہ...... یہ میں نے لکھی تھی سر!"

"میرا پوچھنے کا مطلب ہے کہ اس نظم کا خالق کون ہے؟"

"میں نے لکھی ہے۔ اسی عید پر۔"

اُسے میری حیرانی نے محظوظ کیا، بولی۔ "میں نے اس نوٹ بک میں بہت کچھ لکھ رکھا ہے جسے پڑھنے والے اچھی شاعری قرار دیتے ہیں مگر وہ کیا ہے کہ میرا دل نہیں مانتا۔"

اس کے جملے نے میرا تجسس مہمیز کر دیا۔ میں نے صفحہ پلٹا۔ آمنے سامنے دو غزلیں رقم تھیں۔ دونوں غزلیں بغور پڑھ لینے کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ یہ اُسی کے اعجازِ قلم کی شہنائیاں تھیں۔ باوجود کہ کلام بے وزن تھا اور عروضی نفاستوں سے پوری طرح آراستہ نہیں تھا، پر خوب تھا۔ وہ ردیف اور قافیے کے قواعد سے آگاہ تھی مگر عروضی دسترس سے محروم تھی۔ میری آنکھوں میں رچی ہوئی بے یقینی نے اُس سے تصدیق چاہی تو وہ بے ساختہ بولی۔ "جی سر! اس میں لکھا ہوا لفظ لفظ میرا اپنا ہے۔"

مجھے احساس تھا کہ وہ اس دوران میرے چہرے کے تاثرات کا بہ نظرِ احتیاط جائزہ لینے میں مصروف تھی اور اپنی تحریروں کی حیثیت اور قدر جان رہی تھی۔

میں نے کہا۔ "تم نے اتنا کچھ کہاں سے سیکھا؟"

وہ بولی۔ "میرا باپ کوہستانی تھا مگر ماں شین تھی۔ گلگت سے سو کلومیٹر کی دوری پر واقع ضلع دیامیر کے گاؤں نیات سے بیاہ کر بالاکوٹ آئی تھی۔ وہ شینا زبان بولتی تھی۔ میرے نانا عبدالغفار شاکر شینا اور فارسی زبانوں کے معروف شاعر تھے۔ ان کی دو کتابیں بھی شائع ہوئی تھیں جن کی ایک ایک کاپی میرے پاس محفوظ ہے۔ ہم لوگ چھٹیوں میں نیات جایا کرتے

تھے جہاں میں اور میری بڑی بہن نانا جی کو اپنی شاعری سنایا کرتی تھیں اور وہ ہماری اصلاح کردیا کرتے تھے۔"

میری حیرت فزوں تر ہوگئی، کہا۔ "تمہاری بہن بھی لکھتی تھی؟"

"جی سر!" وہ ایک سرد آہ بھر کر بولی "وہ نہ صرف بہت خوب صورت لکھتی تھی بلکہ بہت زیادہ خوب صورت بھی تھی مگر موت اندھی ہوتی ہے۔ ہے ناں سر؟"

میں اُسے کوئی جواب نہ دے پایا۔ ایک نظم پڑھنے کے بعد میں نے کہا۔ "تمہارے نانا اگر فارسی کے شاعر تھے تو تمہارا کلام موزوں ہونا چاہیے تھا۔"

"میں اور باجی اپنی اپنی علمی استعداد کے مطابق نانا جی سے سیکھا کرتی تھیں۔ باجی کی غزلوں میں بہت زیادہ روانی اور سلاست ہوا کرتی تھی۔"

"تمہاری بہن کا نام کیا تھا؟"

"راحت دل آویز!" اس کی آواز کی لرزش بتدریج بڑھ رہی تھی۔ زلزلے کی نذر ہونے والے خاندان کا تذکرہ اس کے لیے سوہانِ روح ثابت ہورہا تھا اس لیے میں نے فوراً موضوع بدل دیا، پوچھا۔

"کیا تمہیں کبھی محبت ہوئی؟"

"جی؟" وہ بری طرح چونکی۔ میں نے اپنا سوال دُہرایا تو اُس نے جواب دیے بغیر سر جھکالیا۔ اعتراف کرلیا۔

میں نے کہا۔ "کیا تمہیں اس محبت پر فخر نہیں کہ تمہارا سر نہ صرف جھک گیا بلکہ چہرہ بھی بجھ گیا؟"

اس نے اپنا سر ایک جھٹکے سے اٹھایا۔ مجھے دیکھا۔ آنکھوں میں شکایت اور ہلکی سی برہمی مترشح تھی، بولی۔ "نہیں...... وہ یقیناً اس قابل نہیں تھا کہ اُسے یاد کرتے ہوئے میرا دل شادماں ہوجائے۔"

"اوہ!" میرے لبوں سے بے اختیار نکلا اور دل میں عجیب نوع کا حبس بھر گیا۔ میں نے ایک ذرا سنبھل کر پوچھا۔ "کیا وہ بالاکوٹ میں رہتا تھا؟"

"نہیں...... اُدھر بابوسر میں رہتا تھا۔ دیار اور کائل کے دیس میں۔ وہاں کے درخت سدا بہار ہیں مگر لوگوں کی محبت پائیدار نہیں۔" مجھے اس کا بجھا ہوا لہجہ نامانوس سا لگا۔

"وہ تمہیں کیوں چھوڑ گیا؟"

"وہ نہیں...... میں اُسے چھوڑ آئی تھی۔" اس نے فوراً میری اصلاح کی۔

"کیوں؟"

"کیونکہ وہ اس قابل نہیں تھا۔"

"پہلے اُسے قبولیت کی سند کیونکر عطا ہوئی تھی؟" مجھے احساس ہوا کہ میرے لہجے میں اس حسد کی سڑاند تحلیل ہوگئی تھی جو اچانک میرے رگ و پے میں سرایت کرگیا تھا۔

"وہ باہر سے بہت اجلا تھا اس لیے میری نظریں دھوکا کھا گئیں۔" اس کا لہجہ سپاٹ تھا اور چہرے پر تاسف کی پرچھائیاں لرزنے لگیں۔ ناخنوں سے کھیلتے ہوئے بولی۔ "سر پلیز! وہ اس قابل نہیں تھا کہ ہم اس پر مزید گفتگو کریں۔"

شاید اُس نے درست کہا تھا۔ میں نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا اور ڈائری دیکھنے لگا۔ اس دوران عبدالکریم نے ایک فیول پمپ پر کار روک دی اور نیچے اُتر گیا۔

ایک صفحے پر پھر بے اختیار رُکنا پڑا۔ 'موسم' کے عنوان تلے موجود ایک ادھوری نثر نے میری آنکھیں پکڑلیں۔

میں لفظوں کے زینے پر اوپر اُٹھتا گیا، اچانک رُک گیا۔ سیڑھیاں ایک خلا میں جاکر ختم ہوگئی تھیں۔ میرے خیال میں اُس نے میگزین کے لیے انشائیہ لکھنے کی کوشش کی تھی اور بجا طور پر موتیوں کی خوب صورت مالا پروڈالی تھی۔ میرے استفسار پر اُس نے میرے اندازے کی تائید کی اور کہا۔ "دراصل میں نے سوچا تھا کہ آپ کو کئی مرتبہ یاد دلانے کے بعد مجھے ہی انشائیہ لکھنا پڑے گا اس لیے میں نے لکھنا شروع کیا تھا۔ اس دوران آپ نے لکھ دیا۔ یوں یہ ادھورا رہ گیا۔"

میں نے اُس کا دل رکھنے کے لیے خوش دلی سے کہا۔ "تم اسے کسی وقت مکمل کردینا۔ اگلے شمارے کے لیے۔"

وہ بچوں کی طرح چہکی۔ "سچ؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ پھر بولی۔ "آن میرٹ؟"

"ہاں! بلاشبہ یہ اچھا آغاز ہے۔" میں نے کہا۔

اس دوران کار میں ڈیزل ڈال دیا گیا اور عبدالکریم نے بل کی ادائیگی کے بعد ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ میں نے ڈائری بند کرکے آنکھیں موند لیں مگر اس کی تحریر بند آنکھوں کے اندرونی پردے پر جگمگانے لگی۔ اس نے کمال سادگی سے دنیا کے سب سے طاقت ور جذبے پر قلم اُٹھایا تھا۔

مجھے خود پر اختیار رہا، نہ دل کو ڈرائیور کی موجودگی کی جھجک، میں نے مریم کا ہاتھ تھاما اور وفورِ شوق سے چوم لیا۔ وہ میری اس غیر اضطراری حرکت کو جب تک سمجھتی، تب تک تیر کمان کو چھوڑ چکا تھا۔ شکوہ آمیز نظروں سے دیکھنے لگی۔ میں نے کہا۔ "یہ تمہارے حسن کا نہیں، ہنر کا اعتراف تھا۔ تمہارے اندر چھپی ہوئی بہادر شاعرہ دنیا سے اپنا آپ منوانا چاہتی ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ بہت جلد کامیاب ہوجائے گی۔"

اس نے متذبذب انداز میں میرا شکریہ ادا کیا اور

روٹھے طور سے پہلو بدل کر مجھ سے بہت دور ہوگئی۔ پہلے بوسے نے میرے ہونٹوں پر سنسنی ثبت کردی تھی۔ اس کی مزاحمت کی بدولت میرے دل میں ایک ذرا شرمساری بھی گھر کرگئی تھی۔

ڈرائیور اور مریم نے تھوڑی دیر کے بعد ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی کا دفتر تلاش کرلیا۔ مریم پر اعتماد تھی جبکہ مجھے بے عنوان سی جھجک آڑے آرہی تھی۔ بیسمنٹ کی سیڑھیاں اُتر کر مطلوبہ دفتر پہنچے۔ میں شاید ایجنٹ کے سامنے اپنا مدعا بھی پیش نہ کرپاتا مگر مریم نے اعتماد سے اپنی آمد کی غرض و غایت سے آگاہ کیا۔ ایجنٹ کو میگزین کی اشاعت، سرکولیشن اور اس میں اشتہار دیے جانے کی ممکنہ افادیت پر گفتگو کی۔ وہ کسی منجھے ہوئے سیلز مین کی طرح بریفنگ دے رہی تھی اور میں حیرت بھری آنکھوں سے اُسے دیکھ رہا تھا جو لمحہ لمحہ کمل کر برسوں کی مسافت طے کرتی جاتی تھی۔ اس کی شخصیت کا ظاہری تاثر تھا، گفتگو کا کمال یا ایجنٹ کی ضرورت، اُس نے شیمپو بنانے والی ایک معروف کمپنی کا اشتہار دینے کا فیصلہ کرلیا۔ ڈیلنگ کے بعد دونوں نے پیپرز سائن کیے اور میٹنگ برخاست کردی۔ اس تمام وقت میں، میں نے دونوں کے مابین ہونے والی گفتگو میں بالکل حصہ نہیں لیا تھا۔

پہلی کامیابی کا خمار لیے ہم دفتر سے نکلے۔ گاڑی کے پاس پہنچ کر رُکے، وہ بولی۔ "سر! کچھ بھی نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے، کے فارمولے پر عمل کرتے ہوئے میں نے یہ اگریمنٹ کیا ہے۔ بیگم صاحبہ کا یہی حکم تھا۔ ایجنٹ نے بہت کم نرخ دیا ہے مگر ہمارے لیے یہ خوش آئند بات ہے کہ اس نے کاسمیٹکس کے دو تین اشتہار دینے کا وعدہ کیا ہے۔ اس وعدے کی تکمیل تب ہوگی جب اُسے ہمارا میگزین پسند آئے گا۔"

میں نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

اس کے بعد ہم نے دو گھنٹے کے دورانیے میں تین ایجنٹوں سے ملاقاتیں کیں۔ ایک نے مشروط اعانت کا وعدہ کیا، ایک نے اندرونی صفحات کے لیے تین اشتہارات دیے جبکہ آخری نے پیشہ ورانہ انداز میں نئے چھپنے والے میگزین پر اعتماد نہ کرتے ہوئے ہمیں ٹرخا دیا۔ اس ملاقات کے مایوس کن اختتام پر میں نے ایک دم واپسی کا اعلان کردیا، وہ مسکرائی۔ "سر! آپ کا رویہ کاروباری نہیں ہے۔"

میں نے بیزاری سے کہا۔ "اگر تم چاہو تو مجھے کسی ہوٹل پر اتار کر اپنا کام جاری رکھ سکتی ہو۔ واپسی پر مجھے پک کرلینا۔"

وہ میری اُکتاہٹ سے لطف اندوز ہوئی، بولی۔ "آپ بزنس مین ہیں جبکہ میں تنخواہ دار ملازمہ ہوں۔ سست مدعی کو چست گواہ کے ساتھ چلنا ہوگا۔"

میں نے اُسے مدد طلب نظروں سے دیکھا مگر اس کی ستم ظریفانہ مسکراہٹ مزید گہری ہوگئی۔ میں نے پینترا بدلا اور کچھ دیر ہوٹل میں گزارنے پر مصر ہوگیا تاکہ تازہ دم ہوکر آگے بڑھا جائے۔ اس نے میری بات مان لی اور ہم نے ایک ہوٹل کا رُخ کیا۔ جدید طرز پر تعمیر کیا گیا ہوٹل زیادہ بڑا نہیں تھا۔ کھانے کی طلب نہ ہونے کی وجہ سے ہم نے چائے اور سینڈوچز کا آرڈر دیا اور پرسکون گوشے میں کرسیوں پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ اس نے سینڈوچ کھالیا۔ میں ہاتھ میں پکڑے بیٹھا رہا۔ اُسے دیکھتا رہا۔ اس نے چائے کا کپ لبوں سے لگایا۔ ایسے میں مجھ پر نگاہ پڑی، بولی۔ "سر! لیں ناں!"

میں چونکا۔ اُسے ایک ٹک دیکھے گیا۔ وہ جھینپ سی گئی، بولی۔ "سورج اپنے مقام پر رہے تو اچھا لگتا ہے۔ نیچے اُترنے لگے تو جلانے لگتا ہے۔ جلانے والی چیز ہر کسی کو بری لگتی ہے۔"

میری سماعت میں خنکی اُتر گئی۔ اپنی سطح سے اُترنے کا قلق بے چین کرنے لگا تو میں نے بے اختیار سر جھکالیا اور بے رغبتی سے سینڈوچ کھانے لگا۔ سوچنے لگا کہ میں نہ صرف ایک بیوی کا شوہر ہوں بلکہ دو نوعمر بیٹوں کا باپ بھی ہوں۔ وہ یہ کہنے میں حق بجانب تھی کہ مجھے اپنی سطح سے گرنا نہیں چاہیے ورنہ میرا وجود اس سمیت کئی دوسرے لوگوں کے لیے ضرر رساں بن جائے گا اور ایسے لوگوں کو معاشرہ اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔

یکبارگی میرا جی چاہا کہ میں اسے کہہ دوں کہ میں سورج نہیں ہوں۔ پیاس کا دریا ہوں۔ جی چاہا کہ اُسے چیخ کر کہہ دوں کہ تم اپنی آنکھوں کی مے کا قطرہ قطرہ میرے حلق میں ٹپکا کر مجھے امر کردو۔ نئی زندگی دے دو۔

ہماری میز ہال کے نسبتاً پرسکون گوشے میں تھی۔ ساتھ والی میز پر چہلیں کرتا ہوا یورپین جوڑا بھی اُٹھ گیا۔ اپنے درمیان حائل طویل خاموشی سے گھبراہٹ ہونے لگی تو میں نے اُسے دیکھے بغیر پوچھا۔ "مریم! تم نے اپنے مستقبل کے بارے میں کیا سوچ رکھا ہے؟"

وہ بہ ظاہر بے پروائی سے بولی۔ "میرا حال اور مستقبل ایک سا ہے۔"

"یعنی ملازمت؟"

"جی سر!" اس نے کہا۔ "میں سرکاری نوکری کے

حصول کے لیے ہاتھ پیر مارتی رہتی ہوں۔ کمپیوٹر کا ایک سالہ ڈپلوما بھی کر رکھا ہے۔ امید ہے کہ کہیں نہ کہیں چانس لگ جائے گا۔"

"اور شادی؟" میں نے براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ میری توقع کے برعکس اس کی آنکھوں میں برہمی یا خفگی مترشح نہ ہوئی بلکہ نامانوس سا ٹھہراؤ حائل ہو گیا، بولی۔ "میں شادی نہیں کروں گی۔"

میں چونکا۔ "کیوں؟"

اس نے ٹشو پیپر ہونٹوں پر رگڑ کر پلیٹ میں رکھا اور کندھے اچکا کر بولی۔ "کیونکہ میں ماں نہیں بن سکتی۔"

"پھر؟" میں نے ہونقوں کی طرح اُسے دیکھا۔

وہ بولی۔ "پھر کیا؟...... جب میں ماں نہیں بن سکتی تو مجھے کسی کی بیوی بننے کی کیا ضرورت ہوگی۔ ہمارے معاشرے میں بے ثمر بیوی نوکرانی تو بن سکتی ہے گھر کی مالکن نہیں۔ شوہر کو باپ نہیں بنا پاؤں گی تو وہ مجھے نظر انداز کر کے دوسری عورت سے چپک جائے گا۔ تب مجھے دکھ ہوگا اور میں اُس دکھ کو جھیلنا نہیں چاہتی۔ بس! اتنی سی بات ہے۔"

اس نے عام سے انداز میں بہت بڑی بات کہہ کر مجھے لب بستہ کر دیا۔ دم بخود بیٹھا اُسے کئی لمحوں تک دیکھتا رہا، الفاظ منتخب کرتا رہا، پھر پوچھا۔ "کیا تم میڈیکلی ان فٹ ہو؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور خاموشی اختیار کر لی۔ ناگاہ وہ مجھے جھوٹی دکھائی دی۔ اتنی مکمل تخلیق کے ساتھ فن کار ایسی ناانصافی نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے نفی میں سر ہلایا، کہا۔ "تمہیں شدید قسم کی غلط فہمی ہوگئی ہے یا تم مجھ سے جھوٹ بول رہی ہو۔"

اس کا لہجہ تھوڑا سا گستاخ ہوا۔ "کیا مطلب؟ میں یہ جھوٹ کیوں بولنا چاہوں گی؟"

میں اسے کہنا چاہتا تھا کہ تم یہ جھوٹ بول کر مجھ سے گلو خلاصی کرنا چاہتی ہو مگر اپنی تضحیک نہ کر پایا۔

اس نے ہنکارا بھرا، طنزیہ مسکراہٹ سے لبوں کے گوشے ایک گال میں کھینچے اور میز پر دونوں بانہیں پھیلا کر بولی۔ "بالکل نہیں سر! غلط فہمی یا جھوٹ...... نہیں۔ میں نے سچ کہا ہے۔ میں اسکول میں پڑھاتی تھی۔ اُس دن پرنسپل کی خواہش پر گھر سے جلد نکل کھڑی ہوئی تھی۔ وہ ہفتہ کا دن تھا جس کی صبح زلزلے نے خون سے سرخ کر دی تھی۔ میں پرنسپل کے آفس میں داخل ہونا ہی چاہتی تھی کہ عمارت لرزنے لگی۔ ڈر کر تھم گئی۔ ایسے ہی وقت میں دفتر کا بڑھا ہوا چھجا گر گیا اور اس کا نکلا ہوا سریا میرے پیٹ میں کھب گیا۔

آہ! میں اُس تکلیف کو لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی جس نے اُس وقت مجھے ہوش و خرد سے بیگانہ کر دیا تھا۔"

اس نے اپنا سر ہاتھوں میں بھینچ لیا۔ چند لمبی لمبی سانسیں لینے کے بعد گویا ہوئی۔ "سر! میں بے ہوش ہو گئی تھی۔ جب ہوش آیا تب پتا چلا کہ میرا کوئی سائبان نہیں رہا تھا، گھر اور گھر والے بھی، سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ اور فوجی کیمپ اسپتال میں میرا علاج ہو رہا تھا۔ میرے زخم سلنے کے باوجود خراب ہو گئے تو مجھے پنڈی کے فوجی اسپتال میں منتقل کر دیا گیا۔ مجھے کیمپ اسپتال سے لانے والی ہستی کا نام مسز فردوس تھا۔ وہ ایک سوشل ورکر تھیں۔ این جی او چلاتی تھیں اور انسانی خدمت کا جذبہ لے کر بالاکوٹ پہنچی تھیں۔ انہوں نے میرا بہت علاج کروایا مگر کوئی گڑبڑ ہو گئی تھی جس کے نتیجے میں مجھے لاہور کے میو اسپتال میں ریفر کر دیا گیا۔ مسز فردوس ہی مجھے لاہور لے گئیں۔ وہاں میرا آپریشن کیا گیا۔ اس آپریشن نے مجھے نئی زندگی تو دے دی مگر مجھ سے ماممتا چھین لی۔ سریے کا زخم مجھے کنگال کر گیا۔"

وہ اپنے اس دکھ سے بہت پہلے کہیں مفاہمت کر چکی تھی وگرنہ بیان کرتے ہوئے رُندھ جاتی اور یوں نہایت قنوطانہ سنجیدگی سے خود پر بیتنے والی قیامت کا احوال نہ بتاتی۔ میرا سر جھک گیا۔ ڈھارس کا دامن خالی ہو گیا۔ لفظ روٹھ گئے۔ آہ بھر کر اُسے ہمدردی آمیز نظروں سے دیکھنے لگا۔

وہ تنبیہی انداز میں انگلی تان کر بولی۔ "نہیں سر! مجھے ہمدردی کے جذبے سے شدید نفرت ہے۔"

میں میز پر دونوں ہتھیلیاں ٹکا کر اُٹھا اور اُس کا ہاتھ تھام کر کھڑا ہو گیا۔ "چلیں! دیر ہو رہی ہے۔ مہرو ہمارا انتظار کر رہی ہوگی۔"

ہم ہوٹل سے نکل کر گاڑی میں آ بیٹھے۔ کام کو پھر کسی دن پر ملتوی کر دیا اور ڈرائیور کو گھر چلنے کا حکم دیا۔ میں تمام راستے خواہش کے باوجود اُسے دیکھ سکا، نہ مخاطب کر پایا۔ اس نے بھی کوئی بات نہیں کی۔ پنڈی سے نکلتے ہی اس نے ڈرائیور کو ایک لنک روڈ پکڑنے کا حکم دیا۔ یہ سنگل سڑک ایک اونچے ٹیلے کا گول چکر کاٹ کر اترائی میں واقع سفید رنگ کی بڑی سی دو منزلہ عمارت کے پارکنگ ایریا میں داخل ہو گئی۔ مریم نے بتایا۔ "سر! یہ میرا ہاسٹل ہے۔ میں سیکنڈ فلور پر واقع کمرا نمبر بائیس میں رہتی ہوں۔"

میں نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ وہ گاڑی سے اُتری اور ہاتھ لہرا کر بجری کی روش پر چلنے کے بجائے لان میں داخل ہو گئی۔ ڈرائیور نے شیراڈ موڑی۔ ابھی ہم پارکنگ

ایریا میں ہی تھے کہ ایک چھ سات سال کی خوبصورت بچی، جس نے گلابی اور سفید جالی دار فراک پہن رکھی تھی دور سے چلائی۔ "ماما! اتنی دیر لگا دی آپ نے؟"

وہ ایک کیاری میں اپنی ہم جولیوں کے ساتھ رسی پھلانگ رہی تھی۔ مریم کو دیکھتے ہی اُس نے چھلانگ لگائی اور پودے پھلانگتی ہوئی اس کی طرف بڑھی۔ چند ہی لمحوں میں وہ مریم کی بانہوں میں لاڈ سے جھول رہی تھی۔

میری سانس سینے کی پھانس بن گئی اور میں سرکتی ہوئی گاڑی کے شیشے سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے مریم کی پشت کو گھورنے لگا۔ وہ بچی خاموش ہو گئی تھی مگر مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے سڑک کے دونوں اطراف ایستادہ بلند قامت درخت چلانے لگے ہوں۔ "ماما! اتنی دیر لگا دی آپ نے؟"

ٹیلے کا موڑ مڑتے ہی وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گئی اور میں نے طویل سانس لے کر اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا۔ مجھے اپنی ہتھیلیوں کے گیلا ہونے کا احساس فوری طور پر ہو گیا تھا۔

☆☆☆

مہر النسا کافی بہتر ڈرائیونگ کر لیتی تھی۔ اس لیے اُسے اپنے ساتھ عبدالکریم کو لے کر جانے کی احتیاج نہیں تھی۔ میرے انکار پر وہ مریم کو ساتھ پنڈی لے گئی۔ اس نے میگزین چھپنے کے لیے پریس پر دینا تھا۔ ڈاک خانے جا کر میگزین کی بذریعہ ڈاک ترسیل کا انتظام استوار کرنا تھا۔ یو آر ایل نمبر لینا تھا۔ اور بھی کئی چھوٹے موٹے کام اُس کی ڈائری میں درج تھے۔ ان کے جانے کے بعد میں لان میں سرخ ٹاپ والی چھتری کے نیچے آ کر بیٹھ گیا۔

شب بھر سو نہ پانے کی وجہ سے میں خاصا نڈھال تھا۔ رہ رہ کر مریم کا رویہ اور اس کی مزاحمتی باتیں مضطرب کر رہی تھیں۔ حسن کی ایک کرن ذات کے سبھی اندھیروں کو اجال نہیں سکتی تھی۔ بے حد حسین ہونے کے باوجود اپنی ذات میں پھیلے ہوئے بانجھ پن کے اندھیروں کو ختم نہیں کر سکتی تھی۔ یہ وہ اندھیرا تھا جس کی نشاندہی اس نے بہ زبان خود کی تھی۔ دوسرے اندھیرے کی طرف اُس ننھی سی بچی نے اشارہ کیا تھا جو اُسے 'ماما' کہہ کر اُس کی طرف دوڑی تھی۔ اس نے یا ہو سکے کسی جوان کو دل سے چاہا تھا۔ والہانہ محبت کی تھی۔ مگر اُسے کسی وجہ سے چھوڑ آئی تھی۔ اُس نے چھوڑا تھا، یا اُسے چھوڑا گیا تھا، یہ بحث الگ مگر یہ طے تھا کہ وہ اَن چھوئی نہیں تھی۔ محبت اپنی جگہ پر اس کی انگلی سے اپنی نشانی باندھ کر رخصت ہو گئی تھی۔

ہوا خوشگوار تھی مگر بدن میں سوئیوں کی طرح چبھ رہی تھی۔ میں نے عبدالکریم کو بلایا۔ وہ لان کے پودوں کی گوڈی میں مصروف تھا۔ ہاتھ جھاڑتے ہوئے میرے قریب آ کر مؤدبانہ انداز میں کھڑا ہو گیا۔ میں نے اُسے چائے بنا لانے کا حکم دیا اور کندھوں سے ڈھلکتی ہوئی شال درست کر کے تن آسان بیٹھ رہا۔ ایسے میں آنکھوں کے سامنے ایک سرخ رنگ کا بڑا سا سوالیہ نشان ابھر آیا۔ کیا مریم کے جواں سال تپتے ہوئے بدن پر قناعت سایہ فگن ہو سکے گا؟

غیر ممکن نہیں تھا مگر ممکن بھی کس طرح تھا۔ اپنی جبلت سے ٹکرانا اور پھر جیت بھی جانا بڑا جان جوکھوں کا کام تھا۔ میں بے ساختہ بڑبڑایا۔ "نہیں...... وہ اتنی مضبوط نہیں کہ اپنے آپ کو شکست سے دوچار کرتے ہوئے آسودہ اور مطمئن رہے۔ میں مضبوط مرد ہوتے ہوئے بھی اپنی خواہشوں اور خوابوں کے مقابل میں ٹھہر نہیں پا رہا تھا۔ پندرہ سالہ خود ساختہ قید تنہائی کے بعد بھی مفاہمت نہیں کر پا رہا تھا حالانکہ اتنے لمبے عرصے میں تنہائی اور مفاہمت کی عادات پختہ ہو جاتی ہیں۔ نہیں...... وہ عورت ہے۔ عورت کمزور ہوتی ہے۔ جذبات کی منہ زور طغیانی میں ہار جاتی ہے۔ وہ بھی اپنی جوانی سے ہار جائے گی۔"

اپنے ہی سوال کا جواب تلاش کرتے ہوئے میری سانسیں تیز ہو گئیں۔ یوں لگا جیسے میں کسی بیابان جنگل میں پانی کی تلاش پر برہنہ پا دوڑ رہا ہوں۔

اچانک میرا دل دھک سے رہ گیا۔ ایک خیال برقی کوندے کی طرح ذہن میں لپکا اور بدن کی تمام تر توانائیوں کو آنِ واحد میں خاکستر کر گیا۔ کیا ایسا تو نہیں تھا کہ مریم کو وہ تمام خام لذتیں میسر تھیں جو شادی کی طویل اور بے ثمر ریاضت کا ماحصل ہوتی ہیں؟

میرے مساموں نے پسینا اگلنا شروع کر دیا۔ مریم کا روشن چہرہ چشم تصور میں آن سجا۔ آپوں آپ سر انکار میں ہلنے لگا۔ اس کی رنگت دودھ کی طرح ہر آلائش سے پاک تھی اور چہرہ تقدیس کی قدرتی آماجگاہ۔ ایسے باریک پردے کے پیچھے کوئی سیاہ دھبا چھپا نہیں رہ سکتا۔ کوئی گنہ گار اتنا بے ساختہ اور معصوم بیان نہیں ہو سکتا۔ ایک نئے سوال نے سر اُٹھایا۔ "کیا وہ واقعی معصوم تھی؟"

اگر ایسا تھا تو پھر اس کی گفتگو اتنی چابکدست کیوں تھی؟ وہ ایک نوخیز بچی کی ماں ہوتے ہوئے بھی ماں کیوں دکھائی نہیں دیتی تھی؟ وہ کس طرح کسی بھی تکلیف دہ تجربے کے

بغیر شادی نہ کرنے کا فیصلہ کرسکتی تھی؟

میں نے اپنے طور پر کئی مرتبہ مریم کے خیال دل فگار کو جھٹکنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ مجھ پر یہ ہولناک انکشاف ہوا کہ وہ میری ضرورت بن چکی تھی اور میں اُسے اپنی سوچوں سے الگ کرنے کی قدرت نہیں رکھتا تھا۔ میں نے چائے ختم کی اور ننگے پیروں گیٹ سے نکل آیا۔ میرا رُخ پہاڑی نشیب کی طرف تھا۔ میں چادر جھلاتا ہوا آہل قدمی کے انداز میں چلتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد گھنی جھاڑیوں کی باڑ کو عبور کرکے اس چٹان پر پہنچ گیا جو چھجے کی صورت میں باہر کو نکلی ہوئی تھی۔ میں اس شاخ کے نیچے سے جھک کر گزرا اور چٹان کے آخری سرے پر بیٹھ گیا۔ میں نے اپنے علاقے کے روایتی انداز میں شال کو کمر اور پنڈلیوں کے گرد لپیٹا اور آگے پیچھے جھولنے لگا۔ ننھی ڈبیوں کی طرح بکھرے ہوئے رنگ برنگی چھتوں والے گھروں کا نظارہ مجھے بھلا لگتا تھا۔ دل پھر کچوکے لگانے لگا۔ ”کیا مجھے واقعی محبت ہوگئی ہے؟“

پڑھا سنا تھا کہ محبت جنسی تسکین کا ملفوف عنوان ہے۔ تو پھر مجھے مہرو سے محبت کیوں نہیں تھی؟ مریم ہی کیوں میرے دل میں براجمان ہوئی تھی؟

پڑھا سنا تھا کہ محبت کا جذبہ فراغت میں پلتا ہے۔ تو پھر ایسا کیا تھا کہ مجھے پندرہ سالہ طویل فراغت میں اس جذبے سے روشناسی نہ ہوئی اور ہوئی تو تب جب مجھے اپنی من پسند مصروفیت میسر آ گئی تھی۔

میں نے محبت کے موضوع پر بہت کچھ پڑھ رکھا تھا۔ اپنے خیالات پر وہ سارے قاعدے نافذ کیے مگر سنبھالا نہ ملا۔ کوئی اطمینان بخش دلیل ہاتھ نہ لگی۔ میرے پاس گھڑی نہیں تھی مگر اندازہ تھا کہ چار بجے کا عمل تھا جب میرے تھکے ہوئے ذہن پر سکون آور غنودگی طاری ہونے لگی تھی۔ یہی وقت تھا جب میرے عقب میں قدموں کی چاپ ابھری۔ گردن موڑ کر دیکھا۔ ایک دم ساری تن آسانی کافور ہوگئی۔ مریم پتھروں پر سنبھل کر چلتی ہوئی میری طرف آ رہی تھی۔ میں بے اختیار کھڑا ہوگیا اور میری شال میرے پیروں میں گرگئی۔

وہ قریب آ کر پھولی ہوئی سانسوں میں بولی۔ ”بیگم صاحبہ آپ کے لیے بہت فکرمند ہیں۔ گھر چلیں۔“

مہرو بتا کر گئی تھی کہ دو بجے گھر پہنچ جائے گی۔ گھر پہنچ کر دو گھنٹے کے انتظار کے بعد اس کا فکرمند ہونا قدرتی بات تھی۔ میں نے کہا۔ ”ہاں! مگر ابھی یہیں بیٹھنا چاہتا ہوں۔ تم جا کر بیگم صاحبہ کو بتا دو۔“

اس نے ضد نہیں کی۔ پلٹی اور واپسی کی راہ پر چل دی۔

ایسے میں اچانک رُکی۔ مڑے بغیر بولی۔ ”سردی بڑھ رہی ہے سر! آپ کی صحت خراب ہو جائے گی۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ پلٹ پڑی۔ مجھے جوں کا توں کھڑا دیکھ کر اس کی آنکھوں میں حیرت تیر گئی، بولی۔ ”آپ ایسے ساکت کیوں کھڑے ہیں؟“

میں بے ارادہ بولا۔ ”زندگی کو اتنا قریب آتے اور پھر بے سبب پلٹتے دیکھ کر ڈر گیا ہوں۔“

اس کی آنکھوں میں برہمی کا تاثر مترشح ہوگیا، بولی۔ ”میں آپ کے اس رویے کو کیا نام دوں؟“

میری نظریں اُس کے وجود میں اُلجھی ہوئی تھیں۔ فوراً جھک گئیں۔ رُخ پھیر کر سرخ کنوپی والے ایک گھر کو دیکھنے لگا۔ وہ جواب نہ پاکر میرے عقب میں آگئی، شانے پر ہاتھ رکھ کر قدرے نرمی سے بولی۔ ”سوری سر! اپنے انداز پر نادم ہوں مگر وہ کیا ہے کہ بعض اوقات مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ آپ اچھے آدمی نہیں ہیں۔ شاید آپ مذاق کرتے ہیں جبکہ میرا دل دکھ جاتا ہے۔“

میں اُسے بتا نہیں سکتا تھا کہ اُسے پہلی نظر دیکھنے کے بعد سے اَب تک میں ضبط اور تحمل کے کن عذاب ناک مراحل سے گزرا تھا۔ کم بلند پہاڑی کے پس منظر میں اُڑتے ہوئے بادلوں کے سفید ٹکڑوں سے سرخ شعلے نکلنے لگے اور میں اپنے چہرے پر سختی سے ہاتھ رکھ کر سسکنے لگا۔ وہ دم بخود رہ گئی۔ تیزی سے میرے سامنے آگئی۔ دونوں ہاتھ تھام کر چہرے سے الگ کرنا چاہتی تھی مگر کامیاب نہ ہو پائی۔ یقیناً میری جنونی گرفت نے میرے ہاتھوں کی رگیں تک ابھار دی تھیں۔ وہ روہانسی ہو کر بولی۔ ”سر! یقین کریں۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ پلیز! ایسا نہ کریں، میرا دل بیٹھنے لگا ہے۔“

وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ میری اس غیر متوقع کیفیت پر اس کا ردِعمل کیا ہونا چاہیے تھا، تبھی نروس ہو رہی تھی۔ میرے ہاتھ چھوڑ کر پیچھے ہٹ گئی۔ مجھے دل ہی دل میں اُسے پریشان کرنے پر ملال ہوا۔ پلٹا، رُخ پھیرا، پیروں سے لپٹی ہوئی شال اُٹھائی اور اس کے ایک گوشے سے آنکھیں پونچھنے لگا۔ پھر ایڑیوں پر گھوما اور اُسے ہراساں آنکھیں لیے چٹان پر اجنبی حالت میں پھیلے ہوئے تنے کے پاس کھڑے دیکھا۔ بے بسی سے ہونٹ کاٹ رہی تھی۔

میں نے انگلی اُٹھائی، ٹھہرے ٹھہرے انداز میں کہا۔ ”ہاں! تم نے سچ کہا کہ میں مذاق کرتا ہوں کیونکہ میرا یہ مقام نہیں جہاں کھڑا ہو کر تمہیں دیکھتا ہوں۔ میں بڑا آدمی

ہوں۔ بڑا آدمی ایسی چھوٹی حرکتیں نہیں کرسکتا۔ میں شاعر ہوں۔ شاعر اتنا چھوٹا نہیں ہوتا۔ میرے شانے ننگے ہیں۔ شاعر کے شانوں پر شعور کا جھنڈا بلند ہوتا ہے جس کی آن بچائے رکھنا اس کا فرض ہوتا ہے۔ ہے نا؟...... مگر تم سن لو! یہی میرا جرم ہے۔ پندرہ برس قبل میں نے اپنی بہنوں کی چھلکتی ہوئی آنکھوں پر ترس کھایا تھا۔ بڑی بہن نے کہا تھا کہ بھائی سر کی چادر ہوتا ہے۔ چادر دھوپ اور گرمی سردی سہتی ہے مگر اوڑھنے والے کو بچائے رکھتی ہے۔ تم بھی سختی جھیلو اور ہمیں دکھوں سے بچاؤ۔ چھوٹی بہن نے کہا تھا کہ تم کیسے شاعر ہو کہ تمہیں اپنی بہنوں کی خوشی اور بھائی ذات کی قربانی کا شعور تک نہیں۔ تب میں نے سر جھکا لیا تھا کیونکہ میں قصوروار تھا ناں!“

میری آواز رُندھ گئی۔ ”ہاں! باپ کے سامنے اونچی آواز میں بات کرنا، ماں کی حکم عدولی کرنا، بہنوں کی خوشیوں کا احترام نہ کرنا اور بھائیوں کو انکار کی تذلیل دینا...... یہ سب کچھ ایک شاعر کے شایانِ شان نہیں تھا۔ تبھی میں نے جان دے دی مگر اپنے اِس جھوٹے اعزاز کی آن بچالی۔ آج...... پندرہ سال قید کاٹنے کے بعد بھی وہ سزا درپیش ہے۔ شاعر کو جتایا جا رہا ہے کہ تمہارا دیکھنا معیوب، تمہارا بولنا معتوب اور سوچنا شعور کا متقاضی...... آہ! تم مجھ سے آٹھ سال چھوٹی ہوتے ہوئے بھی تنبیہ کے انداز میں مخاطب ہوتی ہو اور میرے رویے کا عنوان مجھ سے دریافت کرتی ہو...... ہاں...... شاعری جرم ہے، میں مجرم اور سزا کا ہر دروازہ مجھ پر کھلا ہے۔“

میری آواز فرطِ جذبات سے پھٹنے لگی۔ میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اس کے عین سامنے جا ٹھہرا، اس کا چہرہ ہاتھوں میں بھر کر حلق کے بل چیخا۔ ”ہاں! مجھے تمہاری آنکھیں اچھی لگتی ہیں۔ ان آنکھوں سے دنیا کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ یہی جرم ہے۔ تمہارے بھرے بھرے گال مجھے متوجہ کرتے ہیں اور میں ان پر اپنے جذبات کا تاج محل تعمیر کرنا چاہتا ہوں، یہی جرم ہے۔ مجھے گھنیری چھاؤں کی طلب ہے اور تمہاری زلفوں کی چھاؤں میں دو گھڑیاں سونا چاہتا ہوں یہی جرم ہے۔ میں مذاق کرتا ہوں کہ تم سے خوبصورت لڑکی دنیا میں کہیں نہیں ہے۔ مگر...... یہ بھی تو سوچو ناں! میں شاعر ہوں۔ رومان لکھ سکتا ہوں۔ دلوں کے تاروں کو چھیڑنے والے لفظ تراش سکتا ہوں تو محبت کی سلطنت میں قدم کیوں نہیں رکھ سکتا؟ میرا شعور اگر میرے جذبات کو ابھارے تو جرم...... اگر لوگوں کی لغزشوں پر رومان کے دبیز پردے ڈالے تو ہنر...... کیا یہ ناانصافی نہیں ہے؟“

سردی کے باوجود میرا اتمام تر وجود پسینے میں نہا گیا۔ گلا بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں کی حیرانی بتدریج خوف اور وحشت میں تبدیل ہوگئی۔ اس نے پیچھے کی جانب بدن کو جھٹکا دیا۔ میری گرفت سے نکل گئی۔ تنے سے ٹیک لگا کر ہانپنے لگی۔ سراسیمگی میں بولی۔ ”سر پلیز! مجھ سے دور رہیں۔ قریب مت آئیں۔ آپ اِس وقت ہوش میں نہیں ہیں۔“

اس کی تنبیہ میرے بڑھتے ہوئے قدم نہ روک پائی۔ میں نے اُسے شانوں سے پکڑ کر جھنجوڑ دیا۔ کہا۔ ”فکر نہ کرو۔ میں جتنا قریب آ رہا ہوں، اتنا ہی دور ہو جاؤں گا۔ اتنا کہ مٹ جاؤں گا۔ آج دیکھنے دو، کل نہیں دیکھوں گا کیونکہ مجھے اپنے مقام کی طرف لوٹنا ہے۔“

”سر! آپ نارمل نہیں ہیں۔ پلیز! مجھے چھوڑ دیں۔“

اس نے بیزاری آمیز استدعا میرے منہ پر دے ماری۔ میں نے اُسے فوراً چھوڑ دیا اور بے جان انداز میں گھٹنوں کے بل چٹان پر بیٹھ گیا۔ سر جھکا لیا۔ شکست خوردہ انداز میں بولا۔ ”مریم! تم بلاوجہ خوفزدہ ہو رہی ہو۔ میں نارمل نہیں ہوں مگر یقین کرو کہ میں ایب نارمل بھی نہیں ہوں۔ اگر میں پاگل ہوتا تو اپنے آپ کو ہاتھ پاؤں باندھ کر تاریک کمرے میں نہ پھینکتا جہاں مجھے پندرہ سال رہنا پڑا۔ میں ایسا بھی نہیں تھا، جیسا تمہیں نظر آ رہا ہوں۔ میں کسی بھی خوب صورت لڑکی کو دیکھ کر ایسے باؤلا نہیں ہوتا جیسے تمہیں دیکھ کر بے اختیار ہو جاتا ہوں۔ مگر یہ بھی اچھا ہوا کہ تم نے میری پیش رفت کو ہتھیلیوں پر روک دیا ہے۔“

اچانک میرا دل مٹھی میں آگیا۔ تضحیک کا دھواں سینے میں بھر گیا۔ وہ میری پوری بات سنے بغیر تنے کے نیچے سے گزر کر واپس چل دی تھی۔

میں حلق کے بل چیخا۔ ”رکو! میری بات تو سنتی جاؤ۔ پھر جانے لگو گی تو ہرگز نہیں روکوں گا۔“

وہ بولی۔ ”میں یہیں رکوں گی۔ آپ وہیں رہ کر بات کریں گے۔ کہیں!“

فاصلہ زیادہ تھا۔ اس کا چہرہ دکھائی دیتا تھا مگر نقوش اور تاثرات کی دنیا اوجھل تھی۔ ایسے دل کی بات نہیں کی جاسکتی تھی مگر میں چیخنے پر مجبور تھا۔ ”ٹھیک ہے۔ یونہی سہی۔ میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ تم مجھے اچھی لگتی ہو۔ میرا دل ہر بندش کو خاطر میں لائے بغیر تمہیں دیکھنے پر مجبور ہے۔“

وہ بولی۔ ”آپ کی نظر خوب صورت ہے اس لیے آپ کو دنیا بھلی لگتی ہے مگر دنیا آپ کو تب خوب صورت قرار دے

گی جب آپ کی زبان اور رویہ بھلا ہوگا۔"

"میری آنکھ میلی اور زبان کڑوی نہیں ہے۔ پھر ایسا مشورہ کیوں دے رہی ہو؟"

"شاعر عام لوگوں سے ارفع ہوتا ہے مگر مجھے آپ کے دیکھنے سے الجھن ہونے لگتی ہے۔ ہر دل پھینک مرد اتنا ہی ندیدہ ہوتا ہے جتنے آپ ہیں۔"

میری روح تک اس تازیانے کی چبھن اُتر گئی۔ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر مزید جھک گیا اور بے چارگی سے بولا۔ "نہیں نہیں! میں ندیدا نہیں ہوں۔ سچ یہ ہے کہ تمہی زمانے سے مختلف ہو۔"

اس کی طنزیہ ہنسی فضا میں گونجی۔ لرزیدہ آواز میں استہزا کا عنصر شامل ہو گیا۔ "میں لاوارث ہوں۔ آپ مجھے جس نظر سے دیکھیں، کوئی روکنے والا نہیں۔ آزادی کا احساس باعثِ شر ہے۔ میری جگہ پر اگر کوئی اور جوان لڑکی کھڑی ہوتی، آپ یہی جملہ اُس کی طرف اچھال دیتے۔ نجانے آپ نے اظہارِ محبت کرتے ہوئے بیگم صاحبہ کے وجود کو کیوں فراموش کر دیا جو نہ صرف آپ کی شریکِ حیات ہیں بلکہ آپ کے دو بیٹوں کی ماں بھی ہیں۔"

میں تلملایا مگر مجھ سے کوئی جواب نہ بن پایا۔

"سر! مجھے معاف کر دیں۔ آپ کو عیش کے چند لمحات دینے سے میرا کچھ نہیں بگڑے گا، آپ اپنے مقام سے بہت نیچے گر جائیں گے۔ اپنے پیدا کردہ حبس میں مر جائیں گے۔"

میرے کانوں کے پردے پھٹنے کو آ گئے۔ میں نے مٹھیاں بھینچیں اور دانت پیس کر کہا۔ "تم بہت بے رحم ہو۔ میں کوئی عیاشی نہیں کرنا چاہتا۔"

"تو کیا مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں؟" اس کے جملے میں کھلا چیلنج تھا۔

میں 'ہاں' کہتے کہتے رُک گیا۔ سوچ میں پڑ گیا۔ وہ کچھ دیر تک میرے جواب کی منتظر رہی پھر طنزاً بولی۔ "آپ کے پاس کوئی جواب نہیں کیونکہ آپ محض دل بستگی کا سامان ڈھونڈ رہے تھے۔"

میں نے جلدی سے کہا۔ "نہیں..... ایسی بات نہیں۔ میں نے ابھی تک اس موضوع پر سوچا نہیں تھا۔ اب سوچ کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مجھے تم سے شادی کر لینی چاہیے۔"

"کیوں؟ صرف اس لیے کہ میں جوان اور خوب صورت ہوں؟" اس کی لرزیدہ آواز میں نمایاں کاٹ تھی۔

"ہاں! مگر میں نے اس کے علاوہ بھی کچھ دیکھا ہے۔" میرا جنون ختم ہو گیا تھا۔ لہجہ بھی کھوکھلا نہیں رہا تھا، کہا۔ "تھوڑا قریب آجاؤ۔ میں اونچی آواز میں بولتے بولتے تھک گیا ہوں۔"

وہ مان گئی۔ ہولے ہولے چلتی ہوئی تنے تک آئی۔ تنے پر دونوں بانہیں رکھ کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ میں نے کہا۔ "مریم! تم شاعرہ ہو، حساس دل ہو۔ تمہیں سمجھانے کے لیے سنانا ضروری نہیں۔ تم وہ بات سمجھ لیتی ہو جو میری زبان پر آ کر شرما جاتی ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ میں نے شادی سے پہلے جو سہانے خواب دیکھے تھے، تم ان کے ہر چوکھٹے میں فٹ بیٹھتی ہو۔"

اسے میرے لہجے کے تیقن نے ہلا دیا۔ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ ایک ٹک دیکھتی رہی، بولی۔ "سر! زندگی اتنی غیر سنجیدہ اور طفلانہ مزاج کی مالک نہیں ہوتی۔ اسے سچائی کی بنیادوں پر استوار کیا جاتا ہے۔ سچائی یہ ہے کہ ہم دونوں شادی کے لیے موزوں نہیں ہیں۔"

"کیا مطلب؟" میں بری طرح چونکا۔ "تم نے اتنا بڑا فیصلہ کیسے کر لیا؟"

"اگر آپ میری جگہ پر ہوتے تو بالکل ایسے ہی انداز میں سوچتے۔ میں اپنی حیثیت کا تعین کرتی ہوں۔ غور سے سنیں۔" اس نے الفاظ کو ترتیب دینے میں بہت کم وقت لیا، بولی۔ "سر! میں بانجھ ہوں۔ بانجھ زمین میں تخلیق کا کوئی بیج نمو نہیں پاتا۔ میں غریب بھی ہوں۔ غربت بذاتِ خود دھرتی کے بدن کا کوڑھ ہے۔ بیگم صاحبہ کی طرح آپ کی ناز برداریاں نہیں کر سکتی۔ مرد فطرتاً جابر اور تشدد پسند ہوتا ہے۔ اس کا راستہ طاقت اور اختیار روکتا ہے۔ میرے آگے پیچھے کوئی نہیں۔ کوئی میرے دکھ پر تڑپنے والا نہیں ہے۔ یعنی آپ میرے ساتھ کوئی بھی سلوک کریں، آپ کو کوئی روکنے نہیں آئے گا اور میں ہمیشہ عدم تحفظ کا شکار رہوں گی۔ اور ہاں! میرے شانوں پر ایک سات سالہ بچی کا بوجھ بھی لدا ہے جسے دنیا کا کوئی مرد برداشت نہیں کرے گا۔ وہ ایک دم لاوارث اور ناکارہ ہو جائے گی۔ جی! آپ نے سنجیدگی سے میری حیثیت کا جائزہ نہیں لیا ورنہ آپ مجھے پروپوز نہ کرتے۔"

میں حیرت پاش نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ وہ میری توقع سے کہیں زیادہ زود گو اور صاف بیان تھی۔ کچھ دیر کھردرے تنے سے ہاتھ رگڑتی رہی، ہونٹ چبا کر آنسو روکتی رہی، پھر بولی۔ "سر! اب آپ اپنی حیثیت پر نظر ڈالیں۔ آپ ہینڈسم اور جوان ہیں۔ معروف شاعر ہیں۔ لفظ آپ کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے رہتے ہیں مگر یہ ظاہر ہے۔ باطن مختلف ہے۔ آپ کنگال ہیں۔ دو بیویوں کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتے۔ بنگلا، کار، دفتر اور بینک بیلنس..... سب کچھ

تو بیگم صاحبہ کا ہے۔ آپ کا کیا ہے؟...... اگر وہ آپ کو نکال باہر کریں تو؟...... اور یقیناً ایسا ہی ہوگا۔ پھر آپ کا تو کوئی ذریعۂ معاش بھی نہیں کہ دو وقت کی روٹی کھا سکیں۔ بیگم صاحبہ سرکاری عہدے پر فائز تھیں۔ مگر میں تو چند ٹکوں کی ملازمہ ہوں...... سر! بھوک میں عشق نہیں ہوتا اور...... عشق میں بھوک نہیں ہوتی۔"

وہ بولتے بولتے رُک گئی۔ فضا میں اُس کے کڑوے جملوں کی بازگشت اور دبی دبی سسکیاں رہ گئیں۔ وہ تنے پر بازو اور بازوؤں پر پیشانی ٹکائے ہچکیاں لے رہی تھی۔ میں نے اس کے بالوں کو چھوا، بہت نرمی سے اور کہا۔ "مریم! اپنے بے رحم تجربے کے مقابلے میں مجھے صفائی کا موقع دو۔ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

اس نے ایک جھٹکے سے سر اُٹھایا۔ میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ آنسوؤں سے دھلی شفاف آنکھیں سوال کناں تھیں...... چہرے پر پھیلی ہوئی سرخی، آنسوؤں کی چھوڑی ہوئی عارض پر چمکتی ہوئی نمی اور بے تحاشا سرخ متورم ہونٹ دیکھ کر میرے لفظ لب پر دم توڑ گئے۔ میں بولا تو مجھے اپنی آواز بھی اجنبی سی لگی۔ "مریم! میرے اردگرد امارت کے جتنے بھی نقوش اجاگر ہیں، سب مہرو کے ہیں۔ مانتا ہوں...... ہاں! مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں ناکارہ شخص ہوں۔ میں صاحبِ جائداد ہوں۔ صاحبِ ہنر ہوں۔ کما اور کھلا سکتا ہوں۔ اور ہاں! میں نے اُسے پندرہ برس اپنی دنیا میں برداشت کیا ہے، اب اُسے تمہارا وجود برداشت کرنا ہوگا۔"

"اور آپ کے خاندان کا ردِ عمل؟" اس کے ادھورے سوال میں پورے جہاں کا اضطراب شامل تھا۔

"وہ معاملہ پندرہ برس پرانا ہے۔ مٹی میں دب گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میری بغاوت کا ان کی زندگیوں پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔"

وہ یک ٹک مجھے دیکھتی رہی، بولی۔ "کیا آپ کی بغاوت بیگم صاحبہ سے بے وفائی کے زمرے میں نہیں گنی جائے گی؟"

میں نے ایک طویل سانس لی، کہا۔ "مگر میں اس قید سے نکلنا چاہتا ہوں جو مہرو کے وجود نے میری قسمت کر رکھی ہے۔"

"چلیں...... مان لیا۔ مگر آپ میرا کیا کریں گے؟"

"تمہیں اپنی شریکِ سفر بناؤں گا۔" میں نے عزم سے کہا۔ "اپنے من مندر کی رانی!"

"وہ رانی جو ولی عہد کو جنم نہیں دیتی، محل سے ایک دن ارتھی کی صورت اُٹھا دی جاتی ہے۔"

"اگر راجا کو جانشینوں کی طلب نہ ہو یا میسر ہوں تو ایسا نہیں ہوتا۔" میں نے کہا۔ "مجھے اللہ نے دو بیٹوں سے نواز رکھا ہے۔"

"اور میری سدرہ؟"

"وقت بتائے گا کہ اس کے وجود نے میرے اندر موجود بیٹی کے خلا کو پر کردیا ہے۔"

میرا لہجہ پُراعتماد ہو گیا تھا اور مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے میرا ذہن یکسر خالی تھا اور زبان پر آپوں آپ جملے ترتیب پاتے چلے جارہے تھے۔ ایسے ہی وقت میں نے درخت کے تنے پر پھیلے ہوئے اس کے خوش نما بال ہاتھوں میں سمیٹے، بے اختیار لبوں سے لگائے، پھر آنکھوں سے...... کہا۔ "مریم! محبت بھیک میں نہیں ملتی۔ ملے تو لینی نہیں چاہیے۔ یہ دو انسانوں کے درمیان ضرورت کی بنیاد پر طے پانے والا معاہدہ نہیں ہے۔ اگر تم میرے بڑھے ہوئے ہاتھ تھام لو تو یقین دلاتا ہوں کہ کبھی افسردہ نہیں کروں گا۔ کبھی چھوڑوں گا نہیں۔ جھٹک دو تو تمہاری مرضی، دوبارہ عشق کے دسترخوان پر مدعو نہیں کروں گا۔ مجھے بس یہی کہنا تھا۔"

میں نے فیصلہ سنا کر ہاتھ پھیلا دیے۔ اس نے مجھے، پھر میرے ہاتھوں کو دیکھا اور سوچ میں پڑ گئی۔ ایک طویل سانس لے کر بولی۔ "سر! آپ بہت اچھے ہیں۔ شاید میں ہی آپ کو پہچاننے میں غلطی کرتی رہی۔"

میرا دل خوشی سے معمور ہو گیا۔ مگر وہ ایک دم پلٹی اور میرے ہاتھوں کو نظر انداز کرتے ہوئے چل دی۔ چٹان سے اُتر کر دوڑنے لگی۔

☆☆☆

وہ اس لحاظ سے خاصا اہم دن تھا کہ اس دن ہمیں میگزین لینے پنڈی جانا تھا کیونکہ پرنٹر نے میگزین کی طباعت کا کام مکمل ہونے کی اطلاع فون پر دی تھی۔ میں تیار ہو کر دفتر پہنچا تو مریم کو اپنی سیٹ پر موجود نہ پا کر متفکر ہو گیا۔ کچھ دیر انتظار کیا مگر وہ نہ آئی۔ آج اس کا دفتر نہ آنا نہایت غیر متوقع تھا۔ اس نے اب تک ایک بھی چھٹی نہیں کی تھی۔ مجھے وہم ہوا کہ وہ میرے اظہارِ عشق سے خفا نہ ہو گئی ہو۔ وہ مہرو کے کہنے پر مجھے بلانے کے لیے نشیب میں چٹان پر گئی تھی۔ میں نے اُس پر اپنے دل کی دنیا آشکار کرنے کی کوشش کی جسے اُس نے قبول نہیں کیا تھا۔ اُس کی ناراضی بجا تھی مگر اس واقعے کو تین چار روز گزر چکے تھے۔ اس دوران اُس نے ناراضی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اُس نے اپنے بے نیاز رویے سے ظاہر کیا تھا کہ اُس نے میری باتوں کو دل پر نہیں لیا تھا۔ میرے مجنونانہ اظہارِ محبت کو سرے سے اہمیت ہی نہیں دی تھی۔ گویا تسلی تھی کہ وہ ناراض نہیں تھی۔

وہ نہ آئی، مہرو آ گئی۔ اردگرد دیکھتے ہوئے بولی۔ "کیا مریم ابھی تک نہیں آئی؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ رسٹ واچ پر نگاہ ڈال کر پریشانی سے بولی۔ "کیوں نہیں پہنچی؟ شاید بیمار پڑ گئی ہے۔ تم اس کی فائل کھولو۔ اس میں ویمن ہاسٹل کا نمبر لکھا ہے۔ اس پر رابطہ کرو۔"

میں نے کہا۔ "یہ مناسب نہیں ہوگا۔"

"نہیں وسیم! وہ یقیناً بیمار ہے۔ اسے فون پر اپنی آمد کی اطلاع دو۔ تاکہ وہ تمہیں ہاسٹل کے باہر تیار ملے۔ میگزین لانے کے ساتھ ساتھ اُسے کسی اچھے سے ڈاکٹر کے پاس بھی لے جانا۔ ادارے کے ورکرز کا خیال رکھا جائے تو وہ ادارے کے مفادات کا خیال رکھتے ہیں۔"

مجھے دراز کھولتے دیکھ کر مہرو مطمئن ہو گئی۔ چلی گئی۔ مریم کے پاس موبائل فون نہیں تھا۔ فائل میں ہاسٹل کا نمبر درج تھا۔ میں نے فون اپنی جانب کھسکا لیا۔ ہاسٹل کی ریسپشنسٹ نے کسی مسز عطیہ سے میری بات کرادی۔ اس نے بتایا کہ مریم اپنے وقت پر دفتر کے لیے نکل چکی ہے۔ میں جلدی سے بولا۔ "وہ میرے دفتر میں ہی کام کرتی ہے۔ اسے معمول کے مطابق دو گھنٹے قبل یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا مگر وہ ابھی تک نہیں پہنچی جبکہ سفر بمشکل نصف گھنٹے کا ہے۔"

اس نے معذرت خواہانہ انداز اختیار کیا۔ "اس بارے میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ مجھے واچ مین نے بتایا ہے کہ وہ دفتر جبکہ اُس کی بیٹی سدرہ اسکول جا چکی ہے۔ ریسپشنسٹ نے بھی یہی رپورٹ دی ہے۔"

میں رابطہ منقطع کر کے سوچ میں مستغرق ہو گیا۔ مہرو کو بتایا۔ اس کی پیشانی پر سلوٹیں اُبھر آئیں، بولی۔ "یہ بات دل کو نہیں لگتی۔ میں نہیں سمجھتی کہ مریم ایسی غیر ذمے داری کا مظاہرہ کرسکتی ہے۔ اللہ نہ کرے، اُسے کوئی حادثہ پیش نہ آ گیا ہو۔ کیا تم ہاسٹل جا کر پتا نہیں کرو گے؟" اس کے لہجے میں ترغیب تھی۔ "ویگن میں آتی جاتی ہے، کہیں روڈ ایکسیڈنٹ نہ ہو گیا ہو۔"

میں نے اُسے ایک ذرا برہمی سے دیکھا۔ بات کو خواہ مخواہ طول دے کر بتنگڑ بنا رہی تھی۔ وہ مُصر ہو گئی تو مجھے ناچار ہاسٹل جانا پڑا۔ عبدالکریم میرے ساتھ تھا۔ استقبالیہ کاؤنٹر پر ایک جواں سال فربہ بدن لڑکی کمپیوٹر کے سامنے بیٹھی تھی۔

میں نے اپنا تعارف کرایا اور مریم ماہ وش کا پوچھا۔ اُس نے انٹرکام پر کسی سے رابطہ کر کے میری آمد کی اطلاع دی پھر پیشہ ورانہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔ "میڈم اپنے آفس میں آپ کی منتظر ہیں۔ آپ کا فون انہوں نے ہی اٹینڈ کیا تھا۔ اس طرف تشریف لے جائیے۔"

اس نے گیلری میں جس کمرے کی نشاندہی کی تھی، اس کے باہر 'ہاسٹل وارڈن...... مسز عطیہ قدرت' کی نیم پلیٹ آویزاں تھی۔ چند لمحوں بعد میں مسز عطیہ قدرت کے سامنے کرسی پر براجمان تھا۔ وہ دبلے پتلے جسم کی مالک تھی۔ سادہ لباس میں باوقار اور متین دکھائی دے رہی تھی۔ مریم کے لیے متفکر تھی۔ اپنی پیشانی کو ہتھیلی سے رگڑتے ہوئے خود کلامی کرنے لگی۔ "سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کہاں چلی گئی ہے؟"

پھر مجھے مخاطب کر کے بولی۔ "وسیم صاحب! وہ بڑی ذمے دار اور جینئس ہے۔ آج تک اُس نے شکایت کا موقع نہیں دیا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ کسی ضروری اور فوری کام کے سلسلے میں کہیں گئی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مسز فردوس کے ہاں چلی گئی ہو۔"

میری دلچسپی پر اُس نے مجھے بتایا کہ مسز فردوس شہر کی معروف سوشل ورکر تھی۔ ایک فعال این جی او کی چیئرپرسن تھی۔ یہ ہاسٹل اُس نے خواتین کی فلاح کے ارادے سے تعمیر کرایا تھا۔ اس سے پہلے مریم نے مجھے بتایا تھا کہ مسز فردوس نے پنڈی اور لاہور کے اسپتالوں میں اُس کا علاج کروایا تھا۔

میں نے کہا۔ "آپ مسز فردوس سے رابطہ کر کے کنفرم کرسکتی ہیں۔" میں نے زور دیا۔ "اگر علم ہو جائے کہ مریم انہی کے ہاں ہے تو میری پریشانی ختم ہو جائے گی۔"

اس نے انٹرکام پر ریسپشنسٹ سے مسز فردوس کا رابطہ مانگا۔ مجھ سے بولی۔ "یہ ہاسٹل اُنہی کا ہے۔ وہ مریم ماہ وش سے غیر معمولی اُنس رکھتی ہیں اور انہوں نے مریم کو یہاں مفت رہائش دے رکھی ہے۔"

"اوہ!" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ دل میں ایک کانٹا سا چبھا۔ مریم نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا کہ وہ میس سمیت بائیس سو روپے ہاسٹل فیس ادا کرتی تھی۔ میں نے اس موضوع سے پہلوتہی کی، پوچھا۔ "مسز فردوس کہاں رہتی ہیں؟"

"اِدھر اسلام آباد میں......" اس نے پنسل انگلیوں پر گھماتے ہوئے بتایا۔ "وہ ہفتے میں ایک آدھ بار مریم کو اپنے ہاں بلاتی ہیں۔ ان کا ڈرائیور اُسے لینے کے لیے آتا ہے۔ آج ڈرائیور نہیں آیا۔ ممکن ہے کہ ڈرائیور اُسے لینے

کے لیے آیا ہوا اور اس نے ویگن اسٹینڈ پر مریم کو کھڑے دیکھ کر پک کرلیا ہو۔"

انٹرکام پر اُسے بتایا گیا کہ مسز فردوس کا سیل نمبر پاورڈ آف جارہا ہے۔ مجھے پیغام منتقل کرنے کے بعد بولی۔ "آپ بے فکر ہوکر گھر جائیے۔ وہ کل ڈیوٹی پر آجائے گی۔"

میں کھڑا ہوگیا، بولا۔ "عطیہ صاحبہ! آپ مجھے مسز فردوس کے آفس یا گھر کا ایڈریس دے دیجیے۔ میں وہاں جانا چاہوں گا کیونکہ جب تک مجھے مریم کی خیریت کی خبر نہیں مل جائے گی، میں تب تک بے چین رہوں گا۔"

وہ چونکی۔ "مگر کیوں؟"

"میں بے حد حساس واقع ہوا ہوں۔"

"او کے......" اس نے اپنا ہینڈ بیگ کھولا۔ ایک وزیٹنگ کارڈ نکال کر میز پر رکھا، انگلی کی ضرب سے میری جانب دھکیلا، بولی۔ "ایک ورکر کے لیے آپ کا اتنا پریشان ہونا اَن نیچرل ہے۔ بہرحال! ٹیک کیئر!"

میں نے مسز عطیہ قدرت کا شکریہ ادا کیا اور تیز تیز قدموں چلتا ہوا پارکنگ ایریا میں کھڑی اپنی شیراڈ کی طرف بڑھ گیا۔

عبدالکریم مسز فردوس کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ تین چار سال اُس کے ہاں بہ طور ڈرائیور کام کرچکا تھا۔ محتاط انداز میں بتانے لگا۔ "صاحب! وہ بڑی خطرناک عورت ہے۔ اس کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ میری مانیں تو اُس کے پاس ہرگز نہ جائیں۔"

مجھے اچنبھا ہوا۔ اُسے کریدا تو پتا چلا کہ وہ بہ ظاہر سوشل ورکر تھی مگر حقیقت میں بہت پہنچی ہوئی شخصیت تھی۔ چالاک اور موقع پرست تھی۔ ڈرائیور اُس کے ہتھکنڈوں سے پوری طرح آگاہ نہیں تھا مگر اس کے سادہ لوح ذہن میں بس یہی نقش تھا کہ وہ بہت خطرناک اور بہت اثر و رسوخ والی عورت تھی۔ اُس کی باتوں نے مجھے کش مکش میں مبتلا کردیا کیونکہ اس کی رائے کے برعکس مریم اور مسز عطیہ قدرت نے اُسے فرشتہ قرار دیا تھا۔

میں نے پوچھا۔ "تمہیں اندازہ تو ہوگا کہ وہ اس وقت ہمیں کہاں مل سکتی ہے؟"

وہ ذہن پر زور دے کر بولا۔ "اس وقت وہ بہت مصروف ہوگی۔ کسی میٹنگ یا کسی کانفرنس میں۔ البتہ گھنٹا بھر کے بعد دفتر پہنچ جائے گی۔ وہ ہر صبح گیارہ بجے گھر سے نکلتی ہے اور رات ایک ڈیڑھ تک مصروف رہتی ہے۔"

"اس کے دفتر چلو۔ میں وہیں بیٹھ کر اُس کے آنے کا انتظار کروں گا۔"

آدھے گھنٹے بعد ہم ایک ہائی کلاس سوسائٹی کے قلب میں واقع اٹالین طرز پر تعمیر کیے گئے بنگلے کے سامنے پہنچے۔ گیٹ پر پیتل کا وہی مونوگرام آویزاں تھا جو مسز فردوس کے وزٹنگ کارڈ پر چھپا ہوا تھا۔

میں گاڑی سے اُتر کر بنگلے میں داخل ہوگیا۔ پارکنگ میں کئی قیمتی گاڑیاں موجود تھیں۔ این جی او کے مونوگرام والی سفید یونیفارم میں ملبوس دو مرد اور ایک سانولی سی لڑکی استقبالیہ کاؤنٹر پر موجود تھے۔ انہوں نے مجھ سے مطلوبہ معلومات حاصل کیں اور ویٹنگ روم میں بیٹھنے کا مشورہ دیا۔ مسز فردوس خانم مجھ سے آدھا گھنٹا پہلے پہنچ چکی تھی مگر پون گھنٹے کے اعصاب شکن انتظار کے بعد مجھے اذنِ باریابی ملا۔

نہایت آراستہ آفس کی جہازی سائز کی میز کے پیچھے بیٹھی ہوئی خاتون کو دیکھتے ہی عبدالکریم کا کھینچا ہوا خاکہ میری نظروں میں گھوم گیا۔ وہ کم و بیش پچاس کے سن میں تھی۔ اس نے میک اَپ کی دبیز تہوں میں اپنی عمر چھپانے کی بھرپور کوشش کررکھی تھی۔ مجھے دیکھنے کے بعد اس نے میز پر پڑے ہوئے انفارمیشن کارڈ پر نظر ڈالی۔ نخوت سے بولی۔ "اچھا! تو یہ تم ہو...... وسیم بھروانہ...... چیف ایڈیٹر ماہنامہ بین السطور!"

مجھے اُس کا اندازِ تخاطب پسند نہیں آیا مگر میں نے تحمل سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "یس مسز فردوس!"

وہ بولی۔ "میری معلومات کے مطابق تم نہ صرف اعلیٰ پائے کے شاعر ہو۔ دیکھنے میں خاصے وضع دار انسان معلوم ہوتے ہو۔ پھر کیا تمہارے منصب کو یہ زیب دیتا ہے کہ ایک لڑکی کے لیے اتنے تردد کا مظاہرہ کرتے پھرو؟"

میں نے جلدی سے اصلاح کی۔ "دیکھیں مسز فردوس! وہ صرف ایک لڑکی ہی نہیں، میرے میگزین کی ایڈیٹر بھی ہے۔"

اس نے طنزیہ مسکراہٹ اچھالی۔ تنقیدی اور گہری نظروں سے میرا جائزہ لینے لگی۔ مجھے اس سے ناروا اور استہزائیہ رویے کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ چند لمحوں تک انگلیاں چٹخاتا رہا، پھر بولا۔ "مس مریم......"

وہ میری بات کاٹ کر بولی۔ "نو...... مسز مریم!"

اس کا ٹوکنا نہایت تضحیک آمیز تھا۔ میں خون کا گھونٹ پی کر بولا۔ "او کے...... مسز مریم باقاعدگی سے دفتر آتی تھی۔ آج کسی پیشگی اطلاع کے بغیر دفتر نہیں پہنچی تو فکر دامن گیر ہوئی۔ ہاسٹل سے پتا کیا۔ وہ اپنے معمول کے وقت پر وہاں سے دفتر کے لیے نکل چکی تھی۔ اس کی کوئی خبر نہیں کہ وہ کہاں

ہے؟...... اور ایسے حالات میں اپنی ایڈیٹر کے لیے میرا فکرمند ہونا میرے منصب کے خلاف نہیں ہے۔"

"مان لیا۔ مگر یہاں آنے کا مقصد؟"

مجھے اس کی آنکھیں الجھن میں مبتلا کررہی تھیں۔ سوال الگ۔ شاید مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا مگر اَب تو آچکا تھا۔ میں نے کہا۔ "میں صرف یہ کنفرم کرنے کے لیے آیا ہوں کہ وہ آپ کے پاس ہے یا آپ کے علم میں ہے کہ وہ کہاں گئی ہے؟"

اس نے مجھے گھورا۔ "اگر میرا جواب انکار میں ہو تو؟"

میں گڑبڑا گیا۔ "تو کیا؟ میں اُسے تلاش کرنے کی کوشش کروں گا۔"

اُس نے کرسی میری جانب گھمائی۔ چند لمحے تیز نظروں سے دیکھتی رہی پھر بولی۔ "مسٹر وسیم بھروانہ! تمہیں فکرمند نہیں ہونا چاہیے۔ مریم کی سرپرست میں ہوں۔ اُسے تلاش کرنا میرا کام ہے نا کہ تمہارا۔ جاؤ! اپنا کام کرو۔ وہ جہاں بھی گئی ہے، واپس آجائے گی۔"

اس کا دل شکن رویہ برداشت کرنا بہت مشکل کام تھا مگر میں یہ کام کرگزرا۔ دروازے میں رُکا، اُسے شکوہ بار نظروں سے دیکھا اور کہا۔ "خدا کرے کہ وہ بخیریت ہو۔"

وہ میز پر انگلیاں بجاتی رہی اور مجھے بنا کچھ کہے دیکھتی رہی۔ میں گاڑی میں بیٹھنے اور عبدالکریم کو واپس چلنے کا حکم کے بعد اُس غیر مہذب عورت کے بارے میں سوچنے لگا جس نے میری عزتِ نفس مجروح کردی تھی۔ مریم نے اُس کا نقشہ بہت مہربان اور شائستہ خاتون کے طور پر کھینچ کر دکھایا تھا، جھوٹ تھا۔ گھر پہنچ کر میں نے مہرو کو عطیہ قدرت اور فردوس خان کی ملاقاتوں کا احوال شکوہ کناں انداز میں سنایا۔

وہ میری تضحیک کو سرے سے نظرانداز کرکے بولی۔ "مگر تم میگزین کیوں نہیں لائے؟"

"کل لینے جاؤں گا۔"

"آج ہی لے آتے تو اچھا ہوتا۔ ابھی پیکنگ، سیل پوائنٹس تک ترسیل اور پوسٹیج کا کام باقی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ میگزین یکم تاریخ کو ہر اُس جگہ پہنچ جائے، جہاں اُسے پہنچنا چاہیے۔"

میں نے اِس موضوع میں حسبِ معمول دلچسپی نہیں لی تو وہ بھی خاموش ہوگئی۔ اس نے چائے تیار کی۔ پینے کے بعد ملتجیانہ انداز میں بولی۔ "وسیم! میں نشیب کی طرف جانا چاہتی ہوں۔ کافی دنوں سے اس طرف نہیں نکلی۔ کیا تم میرا ساتھ دو گے؟"

میرے انکار پر مائل بہ اصرار ہوگئی۔ ناچار اُس کے ساتھ چہل قدمی کے لیے نکلا مگر بے جان انداز میں یوں جیسے میری کوئی مرضی شاملِ حال نہ ہو۔ اس نے ایک لمبا چکر کاٹا اور چٹان پر آکر بیٹھ گئی۔ مٹاپے کی وجہ سے بری طرح ہانپنے لگی۔ میں دانستہ کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا۔

وہ بولی۔ "وسیم! یہ علاقہ بڑا خوب صورت ہے مگر اپنا وطن یاد آتا ہے۔ کیا تم بھی گھر والوں کو یاد کرتے ہو؟"

میں چونکا۔ "گھر والے؟"

اس نے ملامت بھری نظروں سے مجھے دیکھا مگر خاموش رہی۔ سرد چٹان پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ توقف کے بعد بولی۔ "تم نے کبھی بچوں کے معاملات میں دلچسپی نہیں لی۔ تمہیں اچھا باپ ثابت ہونا چاہیے۔"

میں نے اُسے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے جتانے کی کوشش کی ہو کہ میں نے پہلے کبھی دلچسپی لی تھی جو اب لوں گا۔ وہ لمبی سانس لے کر بولی۔ "لیکن تمہیں اب وہ سب کچھ کرنا ہوگا جو آج تک مجھے کرنا پڑتا رہا کیونکہ گھر کے سربراہ تم ہو میں نہیں۔ میں تھک گئی ہوں۔"

میں پھر بھی خاموش رہا تو اُس نے بیزاری سے کچھ کہنا چاہا۔ "کیا تمہیں مریم کے معاملے میں کسی گڑبڑ کا احساس نہیں ہوتا؟"

"اگر ہو بھی تو میں کیا کرسکتا ہوں۔" میرا لہجہ جذبات سے عاری تھا۔

"کیوں؟" وہ سراپا سوال بن گئی۔ "وہ تمہارے میگزین کی ایڈیٹر ہے۔ شروعات میں ہی اس کا غیاب اچھی بات نہیں ہے۔"

"یہ میرا سبجیکٹ نہیں ہے۔"

"ویسے تو ہماری زندگی میں کسی سبجیکٹ کا عمل دخل نہیں ہے مگر......"

"پلیز! خاموش رہو۔" میں نے اُس کی بات کاٹ دی۔

وہ جلدی سے بولی۔ "کہیں تم نے کسی بات پر اُسے ناراض تو نہیں کردیا؟"

"نہیں۔"

"وہ اپنا ہر مسئلہ مجھ سے شیئر کرتی تھی۔ معمولی بھی، غیر معمولی بھی۔ اگر وہ فون پر اپنے نہ آنے کی اطلاع دے دیتی تو میں اتنی پریشان نہ ہوتی۔"

اچانک ایک سرد سی لہر میرے بدن میں پھر گئی۔ کہیں اس نے اپنا اور میرا وہ تعلق جو ابھی استوار بھی نہیں ہوا تھا، مہرو پر عیاں تو نہیں کردیا تھا؟

"کیا تمہیں اس کی کمی محسوس ہوئی؟"
"نہیں......"

ایسے ہی وقت میں میری نگاہ نالے کے پار سرخ کنوپی والے گھر سے نکلتے ہوئے ایک جوڑے پر پڑی۔ وہ ڈھلان پر سنبھل کر چلتے ہوئے نالے کی طرف جا رہے تھے۔ دیکھنے میں میاں بیوی لگتے تھے۔ ایک دوسرے سے محبت کی ننھی ننھی چھیڑ خانیاں کر رہے تھے۔ ان کی حرکات ان کی اندرونی خوشی اور جذباتی اتار چڑھاؤ کا مظہر تھیں۔ ہم دونوں نے عجیب سی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر اُس نہال جوڑے پر نظریں جما دیں۔ مہرو کی آنکھیں زندگی کے جذبوں سے معمور تھیں۔ یوں محسوس ہوا جیسے وہ اس جوڑے کی جگہ پر مجھے اور اپنے آپ کو فٹ کر کے چشم تصور سے دیکھ رہی تھی۔ میری فراری کیفیت بھانپ کر مہرو نے گھر چلنے کا فیصلہ سنا دیا۔

پانچ بجے تک میری لاتعلقی شکست و ریخت کا شکار ہونے لگی۔ رگ و پے میں بے چینی بھرنے لگی۔ بے بسی کا احساس ہونے لگا تو عبدالکریم کو آواز دی اور گاڑی نکالنے کا حکم دیا۔ گاڑی میں بیٹھ کر مریم کے ویمن ہاسٹل چلنے کا کہا۔ ساڑھے پانچ بجے میں ویمن ہاسٹل کے پرفضا لان میں مسز عطیہ قدرت کے سامنے تھا۔ وہ لان کے نسبتاً پرسکون گوشے میں ایزی چیئر میں بیٹھی جھول رہی تھی اور گود میں رکھے ہوئے فیشن میگزین کا مطالعہ کر رہی تھی۔ اس نے میرے لیے کرسی منگوائی اور کولڈ ڈرنک لانے کا آرڈر دے دیا۔

لان میں مختلف عمروں کی کئی عورتیں چہل قدمی کر رہی تھیں۔ چند تھک کر دائرہ بنائے بیٹھی تھیں۔ بچے کھیل کود رہے تھے۔ سدرہ چند بچوں کے ہمراہ اسپائیڈر پر کھیل رہی تھی۔ خوشی سے چلا رہی تھی، یوں کہ اُسے مریم کے غیاب کی کوئی فکر نہیں تھی۔

مسز عطیہ نے میگزین بند کر دیا، پوچھا۔ "مریم ماوش ابھی تک نہیں آئی؟"

"نہیں۔ کیا آپ نے مسز فردوس سے دریافت کیا تھا؟"

"جی وسیم صاحب! انہوں نے حسب توقع درشتی سے جواب دیا کہ مجھے مریم کے بارے میں متردد ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"یعنی وہ انہی کے پاس ہے؟" میرے لہجے میں امید کا پرتو غالب تھا۔

"میرا خیال یہی ہے مگر انہوں نے مجھے ایسا کچھ کہا نہیں تھا۔" اس نے تذبذب میں کہا۔ "چونکہ مریم ان کے بہت قریب ہے، اس لیے میں اس کے معمولات میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتی۔ یقیناً مجھے اتنی اچھی جاب اور کہیں نہیں ملے گی۔" اس کے جملے نے مریم کی اہمیت آشکار کر دی۔

میں نے اس پر پندرہ بیس منٹ صرف کیے۔ حاصل گفتگو یہی تھا کہ وہ میری طرح لاعلم تھی۔

میں شب بھر سو نہ پایا۔ کبھی کھڑکی میں کھڑا ہو جاتا، کبھی دفتر کی چھت پر نکل آتا تو کبھی مہرو کی طرف پشت کیے آنکھیں کھلی رکھ کر لیٹ جاتا۔ نیند کوسوں دور تھی۔ رہ رہ کر مریم کی طرف دھیان چلا جاتا تھا۔

یہ امید بڑی قوی تھی کہ اگلی صبح جب میں دفتر پہنچوں گا، وہ پہلے کی طرح اپنی سیٹ پر براجمان ہو گی مگر کچھ ایسا تھا کہ یہ امید بھی طبیعت کو سونے پر مائل کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہی تھی۔ مہرو خراٹے نہیں لے رہی تھی۔ یعنی جاگ رہی تھی مگر سونے کی اداکاری کر رہی تھی۔ میں نے یہ جانتے ہوئے بھی اُسے شب بھر مخاطب نہیں کیا۔ اُس نے بھی کوئی بات نہیں کی۔ میری اکثر راتیں ایسے ہی گزرتی تھیں۔

فجر کی اذان سنائی دی۔ وہ انگڑائیاں لیتی اٹھی۔ جماہیاں لیتی میرے پہلو میں آ کر ٹک گئی۔ میرے بالوں میں پیار سے انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔ "وسیم! یہاس اور رت جگا صحت کا ستیاناس کر دیتا ہے۔ سو جاؤ...... میں پنڈی جا کر میگزین لے آؤں گی۔"

میں نے اُسے خالی نظروں سے گھورا۔ اُس نے اپنا ہاتھ میری آنکھوں پر رکھ دیا۔ "نہیں وسیم! کچھ مت سوچو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ سو جاؤ۔ تم نے ساری رات اُٹھتے بیٹھتے گزار دی ہے۔"

میں نے پوچھنا چاہا کہ میں تو رت جگوں کا بیٹا ہوں۔ مگر تمہیں کیا ہوا؟ تم کیوں جاگتی رہیں؟...... خواہش کے باوجود نہ پوچھا اور آنکھیں موند کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔

وہ بولی۔ "اگر مریم آج بھی دفتر نہیں آئی تو میں اُس کا پتا کرنے جاؤں گی۔ مسز فردوس سے ملوں گی اور صورت حال جاننے کی کوشش کروں گی۔"

اس کی آواز میں جذبات کی آمیزش ہرگز نہیں تھی۔ ہولے ہولے کھانسی، بولی۔ "اس نے میگزین پر بڑی محنت کی ہے، اس لیے میں سمجھتی ہوں کہ پہلی کاپی کھول کر دیکھنے کا کریڈٹ اُسے ملنا چاہیے۔ کیا تم میری بات سے متفق ہو؟"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کافی دیر تک میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہی پھر بیڈ روم سے نکل گئی۔ کچن میں جا کر برتن کھنگالنے لگی۔ اس کی گفتگو سے عیاں تھا کہ وہ

میری پریشانی کا تعلق مریم کی عدم موجودگی سے جوڑ چکی تھی۔ سمجھ چکی تھی۔ یہ بات میری ازدواجی زندگی کے لیے نہایت نقصان دہ تھی مگر میرے دل کی فضا میں کوئی بہت بڑا تغیر رونما ہو گیا تھا کہ مجھے اُس کی ناراضی کی پروا نہیں رہی تھی۔ دس بجے اُس نے بیڈ پر ہی ناشتے کے لوازمات سجا دیے۔ چینک کوئی کوزی سے ڈھانپتے ہوئے بولی۔ "مریم نہیں آئی۔ میں پنڈی جا رہی ہوں تاکہ میگزین اور مریم کی خبر لے آؤں۔"

میں نے کہا۔ "میگزین مت لانا۔"

"کیوں؟" وہ چونکی۔

میں نے جواب نہ دیا تو وہ گہری نظروں سے مجھے گھورنے لگی۔ پھر تفہیمی انداز میں سر ہلاتے ہوئے پرس جھلاتی بیڈ روم سے نکل گئی۔ میں بھی ناشتا کرنے کے بعد گھر سے نکل آیا۔ کچھ دیر دفتر میں رہا۔ مریم کی عدم موجودگی دفتر کی تمام تر دلچسپی کو نگل چکی تھی۔ شال اوڑھے نشیب کی طرف نکل گیا۔

تین بجے کے قریب جب میں واپس گھر پہنچا تو مہرو کو کچن میں مصروف پایا۔ مجھے دیکھ کر ایپرن درست کرتے ہوئے برآمدے میں آ گئی، بولی۔ "میں ویمن ہاسٹل کی مسز عطیہ اور مسز فردوس خانم سے مل آئی ہوں۔ دونوں کو اُس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔"

میں نے ہنکارا بھرا، وہ بولی۔ "اور تو اور ویمن ہاسٹل، مسز فردوس کے گھر اور ہمارے دفتر کے بعد...... مریم کے چھپے ٹھکانے کا سراغ لگانے میں ناکام رہی ہوں۔ شاید ہم مریم کو سمجھ ہی نہیں پائے۔ یوں لگتا ہے جیسے کہیں بہت بڑی گڑبڑ موجود ہے کیونکہ سوائے ہمارے، اس کے یوں چلے جانے پر کوئی بھی پریشان نہیں ہے...... اس کی بیٹی بھی۔ یعنی اچانک غائب ہو جانا مریم کے معمول کا حصہ ہے۔"

اس کا تجزیہ بالکل درست تھا۔ میں نے کوشش کی کہ میرا قلبی اضطراب میری آنکھوں تک نہ پہنچ پائے۔

ایسے ہی وقت کچن میں اُس کے فون کی گھنٹی بجی۔ کچن میں گئی۔ چند لمحوں بعد فون اُٹھائے باہر آ گئی۔ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ "مریم کا فون ہے۔"

"تو سن لونا!"

"نہیں...... وہ تم سے بات کرنا چاہتی ہے۔" اس کا لہجہ جذبات سے عاری تھا۔

میں نے فون تھاما۔ کان سے لگا کر 'یس' کہا۔ مریم کی مخصوص بھرائی ہوئی، لرزتی آواز سنائی دی۔ "ہیلو سر! میں مریم بات کر رہی ہوں۔"

"ہاں! سن رہا ہوں۔" میں نے بہ مشکل اپنا غصہ دبایا۔

"وہ سر...... بہت گڑبڑ ہو گئی ہے۔ میں شاید دفتر نہیں آ سکوں گی۔" وہ کچھ جلدی میں تھی۔

"کتنے دن بعد آؤ گی؟" کوشش کے باوجود میرے لہجے میں تلخی گھل گئی۔

"نہیں سر...... میں کبھی نہیں آؤں گی۔ وہ...... دراصل میں...... پلیز سر! ناراض نہ ہوں۔ میں یہ جاب جاری نہیں رکھ سکتی۔ فکر نہ کیجیے گا، میں نے تنخواہ کے پانچ چیک ضائع کر دیے ہیں۔" اس کی آواز زیادہ لرزنے لگی۔

"کیا مطلب؟ اگر تمہیں کوئی شکایت تھی تو بتا دیا ہوتا۔ ایگریمنٹ کے مطابق......"

اس نے میری بات کاٹ دی، کہا۔ "میں معافی چاہتی ہوں کہ میں نے ایگریمنٹ کی خلاف ورزی کی۔ مجھے آپ سے کوئی شکایت ہے اور نہ مجھے کوئی اور نوکری ملی ہے۔"

"تو کیا پرابلم ہے؟" میرا لہجہ سخت ہو گیا۔

"مجھے جو کہنا تھا کہہ دیا۔ آپ متبادل انتظام کر لیجیے گا۔" اس کی آواز واضح طور پر آنسوؤں سے رُندھ گئی اور میرے کچھ کہنے سے قبل رونے لگی۔ میں نے بے جان انداز میں فون مہرو کی طرف بڑھایا اور پلٹ کر تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا بیڈ روم میں آ گیا۔ گزشتہ صبح سے رگ و پے میں پھیلے ہوئے انتظار اور اضطراب کے جذبے کو برہمی کا عنوان مل گیا تھا۔ مجھے مریم پر بے تحاشا غصہ آ رہا تھا مگر میں نہیں چاہتا تھا کہ اپنے غصے کو مہرو کی موجودگی میں ظاہر کر کے اپنی پوزیشن مزید ابتر کر لوں۔ اسی وجہ سے اپنی پسندیدہ خاموشی کی چادر اوڑھ کر بیڈ روم کی بڑی کھڑکی میں آن کھڑا ہوا۔ تھوڑی دیر پہلے میں جس چٹان پر بیٹھا تھا، اُس پر چند لوگ گھوم رہے تھے۔ وہ شاید پکنک منانے کی غرض سے آئے تھے۔

میں بے سبب اُن کی حرکات کا بغور مشاہدہ کرتا رہا۔ چند منٹوں بعد مہرو میرے عقب میں آ گئی، بولی۔ "وسیم! وہ بے چاری نہ آنے پر مجبور اور بہت شرمسار ہے۔"

میں تیزی سے پلٹا۔ غصے میں کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کہہ نہ پایا۔ وہ میرا بازو تھام کر بولی۔ "وسیم! غصے میں نہ آؤ۔ اس بے چاری نے مجبوراً یہ قدم اُٹھایا ہے۔ زار و قطار رو رہی تھی اور بار بار معافی مانگ رہی تھی۔"

"کیا اُس نے بتایا کہ وہ کہاں ہے؟"

"نہیں۔" مہرو نے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا، بولی۔ "میری کوشش کے باوجود اُس نے کچھ نہیں بتایا۔"

میرے اعصاب تن گئے۔ مٹھیاں بھنچ گئیں۔ جی چاہا کہ مہرو پر برس پڑوں۔ ذہنی تناؤ حد سے تجاوز کر گیا تو میں ایڑیوں پر گھوما۔ کھڑکی کے پھول دار شیشے پر زوردار مکا مارا۔ شیشہ ٹوٹ گیا۔ ہاتھ زخمی ہونے سے بچ گیا۔ مہرو نے مجھے بانہوں کے حلقے میں بھر لیا اور کھینچ کر بیڈ تک لائی۔ سمجھاتے ہوئے بولی۔ ”وسیم! خود پر قابو پاؤ۔ مریم محض ادارے کی ملازمہ تھی۔ جیسے میں نے اُسے مقرر کیا تھا، ایسے ہی کسی اور کو چند دنوں میں اُس چیئر پر لا بٹھاؤں گی۔ فکر نہ کرو۔“

”نہیں......“ میں نے پوری سختی سے کہا۔ ”مجھے کسی کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے میگزین بھی شائع نہیں کرنا۔ تم نے یہ سارا گورکھ دھندا فضول میں چھیڑ رکھا ہے۔“

اس کی آنکھوں میں بجائے شکوے یا برہمی کے، ایک ذرا مسرت کی لہر دوڑی۔ جاں گسل انداز میں مسکرائی، بولی۔ ”جب تک مریم یہاں تھی، یہ گورکھ دھندا فضول نہیں تھا۔ اب تمہارے نزدیک فضول ہو گیا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟“

وہ جو کہنا چاہتی تھی، وہ اپنی مسکراہٹ میں کہہ چکی تھی۔ طنز اچھال چکی تھی۔ میں نے اُسے شعلہ بار نظروں سے دیکھا اور بیڈ پر ڈھے گیا، بولا۔ ”مجھے اس موضوع پر کوئی بات نہیں کرنی۔“

وہ بولی۔ ”مگر مجھے بہت کچھ سننا ہے۔“

میرے پاس عافیت کی ایک ہی کھولی بچی تھی جس میں اپنا چہرہ چھپا کر اُس کی شکوہ بار باتوں کے وار سے محفوظ رہ سکتا تھا...... وہ خاموشی کی سلطنت تھی جس میں پناہ گزیں ہونے میں محض ایک یا دو لمحے لگے۔ خاموشی کے جس ریشم کو میں نے پندرہ برسوں میں بُنا تھا، اُسی میں بند ہو گیا۔

رات گھر میں اُتر آئی۔ کھانا کھانے کے بعد وہ چہل قدمی کے لیے نکلنا چاہتی تھی مگر میں نے اُس کا ساتھ نہیں دیا۔ وہ اپنا موبائل فون اُٹھانا بھول گئی اور مجھ پر ایک شکایت بھری نگاہ ڈال کر چلی گئی۔ اس کے جانے کے دس پندرہ منٹ بعد اس کے فون کا بزر بجنے لگا۔ میں نے بے ارادہ فون اُٹھایا۔ اسکرین پر غیر محفوظ شدہ نمبر جگمگا رہا تھا۔ میں نے کبھی مہرو کے لیے آنے والی کال ریسیو نہیں کی تھی۔ آج بھی کوئی ارادہ نہیں تھا مگر جب دوسری مرتبہ بیل بجی تو میں نے کال ریسیو کر لی۔ کانوں میں مریم کی شناسا آواز گونجی۔ ”بیگم صاحبہ! یہ میں ہوں...... مریم ماہ وش......“

میں نے بے دلی سے کہا۔ ”بیگم صاحبہ باہر گئی ہیں۔“

”آپ؟ میں آپ کو ہی فون کرنا چاہ رہی تھی۔ شکر ہوا، آپ مل گئے۔“ اس کی آواز کسی گہرے دکھ کی غمازی تھی۔

”کیوں؟“ میں نے دلچسپی لی۔

”آپ ناراض ہیں ناں؟“

”میری چھوڑو اپنی کہو۔“

”میں سمجھتی ہوں کہ آپ مجھ سے ناراض ہیں کیونکہ میں نے بغیر بتائے آپ کی ملازمت چھوڑ دی اور آپ کو میری وجہ سے بہت پریشانی اُٹھانا پڑ رہی ہے۔“ وہ بولی تو عیاں ہوا کہ اس کا لرزتا ہوا لہجہ نم تھا۔ ”میں آپ کو اپنی پرابلم بتانا چاہتی ہوں تاکہ آپ کا دل میری طرف سے میلا نہ ہو۔“

”مگر اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ”مجھے میگزین سے کوئی دلچسپی نہیں۔“

”میں سمجھتی ہوں سر!“ وہ جلدی سے بولی۔ ”آپ میری بات سن لیں۔ ہو سکتا ہے پھر زندگی بھر مجھے اپنی صفائی میں کچھ کہنے کا موقع نہ ملے۔ مجھے یہ اندازہ بھی ہے کہ آپ کے نزدیک میری وضاحت کی کوئی اہمیت نہیں مگر میں کیا کروں؟ میں آپ کی نظروں میں گرنا نہیں چاہتی۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کوشش میں، میں اپنی نظروں سے بھی گر جاؤں گی۔“

”اچھا۔ ٹھیک ہے، کہو۔“ میں نے کہا۔ میں فون بند کرنا بھی چاہ رہا تھا اور اُسے سننا بھی چاہتا تھا۔ گومگو کی کیفیت سے من میں بیزاری پیدا ہو رہی تھی جو میرے رویے سے بھی عیاں تھی۔

”میں نے آپ کو مسز فردوس کے بارے میں بتایا تھا۔ وہ پہلی مرتبہ مجھے فوجی کیمپ اسپتال میں ملی تھیں۔ سر! آپ میری بات سن رہے ہیں ناں؟“

”سن تو رہا ہوں مگر یہ سمجھ نہیں پا رہا کہ جن باتوں سے میرا تعلق نہیں، وہ سنانے پر تم کیوں بضد ہو؟“

”سر پلیز...... آپ نے میری بہت سی باتیں سنی ہیں۔ ایک یہ بھی سن لیجیے۔ پھر شاید آپ کو کبھی یہ تکلیف نہیں دوں گی۔“ اس نے ملتجیانہ لہجے میں کہا۔ ”سر! میں بتا رہی تھی کہ مسز فردوس مجھے ملیں۔ وہ مجھے اپنے ساتھ پنڈی لے آئیں۔ یہاں علاج معالجہ کرواتی رہیں، پھر لاہور لے گئیں۔ انہوں نے میرے علاج پر بہت پیسا خرچ کیا تھا۔ کوئی بھی شخص بغیر کسی مقصد کے اتنی بڑی قربانی نہیں دیتا۔ جب میں ٹھیک ہو گئی تو انہوں نے اپنے کسی ملنے والے سے میری شادی کا منصوبہ بنایا۔ میرے انکار پر انہوں نے مجھے ایک سال کی مہلت دے دی۔ ایک سال بعد پھر کوئی اور امیدوار میدان میں آ گیا۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتی تھیں۔ میرے پُرزور اصرار پر پھر مہلت دینے پر آمادہ ہو گئیں۔ اب پھر وہی مرحلہ درپیش ہے۔“ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کوئی لکھی ہوئی

تحریر پڑھ رہی تھی۔ ایک ذرا سانس لے کر بولی۔ ”مگر اس مرتبہ وہ میری بات ماننے پر ہرگز آمادہ نہیں ہو رہیں۔ میری پوزیشن کمزور ہے۔ میں انہیں ناراض نہیں کر سکتی۔ انہوں نے ہفتے کے روز شادی کا فیصلہ کرتے ہوئے مجھے اپنی کوٹھی میں محدود کر دیا ہے۔ میں آپ سے معافی چاہتی ہوں کہ آپ کو بروقت مطلع نہ کر سکی۔“

میرا غصہ تحلیل ہو گیا۔ دل مٹھی میں آ گیا۔ سانس لینی محال ہو گئی اور فون میرے ہاتھ میں لرزنے لگا، وہ بولی۔ ”سر! کیا آپ سن رہے ہیں؟“

میں نے جی کڑا کیا، کہا۔ ”بس؟“

وہ بولی۔ ”جی سر!“

”میں نے تمہاری معذرت قبول کر لی۔ کچھ اور؟“

وہ رونے لگی۔ اس کی ہچکیاں ہتھوڑوں کی طرح میرے ذہن میں ضربیں لگانے لگیں۔ میں اُسے دلاسا دینا چاہتا تھا، کچھ کہنا چاہتا تھا مگر زبان گنگ ہو گئی۔ فون بند ہو گیا۔ میں نے بے جان انداز میں فون گود میں رکھ دیا۔ ڈسپلے تاریک ہو گیا۔ یوں لگا جیسے میری زندگی بھی تاریک ہو گئی۔ خیال آیا کہ وہ مسز فردوس کی خوشی پر سر جھکا رہی تھی مگر دل سے افسردہ تھی۔

میں نے کھلے دروازے کی طرف دیکھا۔ مہرو ابھی تک نہیں لوٹی تھی۔ بے اختیار فون سیٹ کو دیکھا۔ دل میں خیال پیدا ہوا کہ اُسے فون کرکے 'بائے' کہہ دوں۔ اسی نمبر پر کال بیک کی۔ اُس نے پہلی ٹون پر ہی کال اٹینڈ کر لی۔ وہ ابھی تک رو رہی تھی۔ پوچھ رہی تھی کہ میں نے اُسے کیوں فون کیا تھا۔ میں جو کہنا تھا، بھول گیا، جو نہیں کہنا چاہتا تھا، کہہ گیا۔ ”مریم! تم نے میرے کام میں حرج پیدا کیا، اس کی معافی مانگ لی۔ مگر تم نے اُس مشغل کو چھیننے پر ندامت کا اظہار نہیں کیا جو تمہارے وجود نے میری اندھیری زندگی میں روشن کی تھی۔ کیوں؟ بھلے تم نے میرا ہاتھ نہیں تھاما تھا، مگر تمہیں علم تو تھا کہ میں کتنی شدت سے تمہیں چاہنے لگا تھا۔ کیا تم اس پر ندامت کے دو چار الفاظ دے کر مجھے تھوڑا سا اعتبار نہیں دے سکتی تھیں؟“

میری آواز میں اتنی تلخی گھل گئی کہ میرا حلق تک کڑوا ہو گیا۔

وہ جلدی سے بولی۔ ”تو کیا آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ میں نوکری چھوٹنے پر رو رہی ہوں؟“

اس نے اتنے بے ساختہ انداز میں کہا تھا کہ میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ میں نے بے اختیار اپنا سینہ مسلا۔ توانائیاں مجتمع کیں، کہا۔ ”مریم! یہ تم نے کیا کہہ دیا۔ کیا واقعی تم مجھے چھوڑنے پر رو رہی ہو؟“

اس کی تاب گویائی ماند پڑ گئی۔ سسکیاں صرف دکھ کا اظہار کرتی رہیں، کوئی دلاسا نہ دے سکیں۔

میں نے کہا۔ ”کیا میں تم سے مل سکتا ہوں؟“

”نہیں سر! مسز فردوس نے مجھے سختی سے منع کر رکھا ہے۔“

”کیا تم اس شادی سے انکار نہیں کر سکتیں؟“

”نہیں سر! میں احسان فراموش نہیں بننا چاہتی۔“

”یہ ظلم ہے جسے برداشت کرنا ازخود ظلم ہے۔“

”نہیں سر...... وہ مجھ پر ظلم نہیں کر سکتیں اور نہ ہی میں انہیں انکار کرکے اپنی ذات کی نفی کر سکتی ہوں۔“

بنا سوچے میرے منہ سے نکلا۔ ”مریم! میرا کیا ہوگا؟ یہ تم نے سوچا تک نہیں۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔“

”سر!“ اس نے بھرپور مزاحمت کرنا چاہی مگر اس کی مزاحمت ایک ہی لفظ پر دم توڑ گئی اور اس نے فون بند کر دیا۔

میں خواہش کے باوجود ری کال نہ کر سکا اور فون ہاتھ میں لیے گم صم بیٹھا رہا۔ مہرو آ گئی۔ مجھے دیکھ کر چونکی۔ فون ہاتھ سے لے کر کال کاؤنٹر چیک کرنے لگی، بولی۔ ”کیا کہا اُس نے؟“

اس نے معاملے کی تہ میں پہنچنے میں بہت کم وقت لیا تھا۔ میں نے اُسے کوئی جواب نہیں دیا تو اُس نے مریم سے پوچھنے کے لیے فون کا سہارا لے لیا۔ کال ریسیو ہونے پر بولی۔ ”مریم ہو ناں؟“

مریم کی آواز سن کر مہرو نے مجھے خالی خالی نظروں سے دیکھا اور بیڈ روم سے نکل کر کچن میں چلی گئی۔ شاید وہ میری موجودگی میں مریم سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد فون اُٹھائے بیڈ روم میں داخل ہوئی۔ اُس کے چہرے پر غصے کے آثار ہویدا تھے۔ بولی۔ ”تم نے اُسے ایسا کیا کہہ دیا کہ وہ روئے جا رہی ہے۔ کچھ بھی بتا نہیں رہی۔“

میں نے کہا۔ ”اس نے معذرت کرنے کے بعد کہا تھا کہ ہم کسی اور کو ملازمت پر رکھ لیں۔“

”تو تم نے کیا جواب دیا؟“

”میں نے اُس کی معذرت قبول کر لی۔“

”اور؟“ اس کی آنکھوں میں تشکیک کی پرچھائیاں لرزیں۔

”کچھ بھی نہیں۔“ میں نے آنکھیں چرا لیں۔

”پھر وہ رو کیوں رہی تھی؟“ ازدواجی زندگی میں پہلی مرتبہ مہرو کا رویہ شک آلود ہوا۔

”کہا تو ہے......“

''مگر بہت کچھ چھپالیا ہے۔ ہے ناں؟''

''میں مزید کچھ نہیں کہنا چاہتا۔'' میں نے فیصلہ کن انداز اختیار کیا اور رُخ پھیرلیا۔

اس نے کئی مرتبہ مریم کو کال کرنے کی کوشش کی مگر ہر مرتبہ بے سود رہی تو فون کو ایک طرف اچھال کر بیڈ پر دراز ہوگئی۔ اس نے اپنا بھاری بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔ یہ اُس کے سوچنے کا مخصوص انداز تھا۔

میں بھی سوچ رہا تھا۔ مریم نے اپنی شادی کی اطلاع دی تھی۔ میرے دل میں حبس کیوں پیدا ہوگیا تھا؟ کیوں سانسوں پر پژمردگی چھاگئی تھی؟ میرا ذہن اذیت میں مبتلا تھا اور مریم کے مقابل میری حیثیت کا تعین کر رہا تھا۔ جب میرے روم روم میں جوانی کی لہریں دوڑتی تھیں، تب میں نے بزدلی کا مظاہرہ کرکے اپنا مستقبل تاریک کرلیا تھا۔ اس شام، جب میں جوانی کی دہلیز سے پندرہ برس آگے بڑھ گیا تھا، میں نے دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی زندگی داؤ پر لگادی۔ ایک دم کھڑا ہوا۔ شال اُٹھائی۔ مہرو نے چونک کر پوچھا۔ ''کہاں جارہے ہو؟''

میں نے کہا۔ ''میں مریم کی طرف جارہا ہوں؟''

''اس وقت؟ مگر کیوں؟'' اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

میں نے اُسے کوئی جواب نہ دیا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا سیڑھیاں اُتر گیا۔ عبدالکریم کو آواز دی۔ چند لمحوں بعد وہ میرے سامنے تھا۔ مہرو میرے عقب میں آن کھڑی ہوئی تھی، بولی۔ ''وسیم! بے وقوفی نہ کرو۔''

میں نے اُس کی تنبیہ پر کان نہیں دھرا۔ عبدالکریم کو مخاطب کیا۔ ''گاڑی نکالو۔''

اس نے مہرو کو اجازت طلب نظروں سے دیکھا۔ میں برہمی سے بولا۔ ''اُدھر کیا دیکھتے ہو؟ گاڑی نکالو۔''

مہرو نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا، نرمی سے بولی۔ ''وسیم پلیز! تم اس وقت مسز فردوس کے بنگلے پر جاکر دانش مندی کا ثبوت نہیں دوگے۔''

عبدالکریم کو جوں کا توں کھڑا دیکھ کر میرا پارہ ایک دم چڑھ گیا۔ ''عبدالکریم! گاڑی نکالو ورنہ بہت بُرا پیش آؤں گا۔''

یہی وہ لمحہ تھا جس نے مجھ سے سوچنے سمجھنے کی طاقت چھین لی تھی۔ اگر پندرہ برس پیشتر یہی لمحہ مجھ پر اُتر آتا تو شاید میں اپنی من چاہی دنیا حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔ میری برہمی کو دیکھتے ہوئے مہرو نے ہتھیار ڈال دیے۔ شکست خوردہ انداز میں بولی۔ ''عبدالکریم! صاحب کا حکم مانو اور ان کے ساتھ اسلام آباد جاؤ۔''

عبدالکریم کے اعضا میں برق دوڑ گئی اور وہ پورچ کی طرف بھاگ گیا۔ میں نے بنگلے سے نکلتے ہوئے پلٹ کر مہرو کی طرف نہیں دیکھا تھا مگر قدموں کی چاپ سے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ سیڑھیاں چڑھ کر بیڈ روم میں چلی گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد شیراڈ کشادہ سڑک پر فراٹے بھر رہی تھی۔

میں بجا طور پر اپنے حواس میں نہیں تھا ورنہ غیر دانشمندانہ انداز اختیار نہ کرتا۔ مسز فردوس کو میرا آنا بجا طور پر اچھا نہیں لگا تھا۔ کچھ دیر تک شعلہ بار نظروں سے گھورتی رہی پھر بولی۔ ''میں یہ تو جانتی ہوں کہ تم مریم کے لیے آئے ہو مگر حیران اس بات پر ہوں کہ تم اُس میں اتنی دلچسپی کیوں لینے لگے ہو؟''

میں نے اس کے لہجے کی غیر معمولی کاٹ کو نظر انداز کیا۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور کہا۔ ''میں اُس سے ملنے کے لیے آیا ہوں۔''

وہ بہت دلیر اور سخت گیر قسم کی عورت تھی۔ میرے سخت لہجے پر نہ تو جز بز ہوئی اور نہ حیران۔ بے خوفی سے بولی۔ ''کیوں؟ کیا تم نے اُسے چپ اور زراہ چلتی لڑکی سمجھ لیا ہے؟''

میرے ہونٹ بھنچ گئے۔ ''اگر ایسا سمجھتا تو دوسری مرتبہ آپ کے پاس نہ آتا۔''

وہ بجائے مزید بھڑنے کے، مسکرانے لگی۔ اس کی مسکراہٹ معنی خیز تھی۔ اپنی کھلی ہتھیلیوں کو ایک ادا سے دیکھتی رہی پھر بولی۔ ''وسیم بھر دانہ! تم شاعر ہو۔ ہماری سوسائٹی میں ایک شاعر کا کیا مقام ہے؟ بخوبی جانتے ہو۔ میں بھی جانتی ہوں کہ جس شخص کی گزر بسر اپنی بیوی کی آمدنی پر ہوتی ہو، اُسے عملی زندگی میں کتنا محتاط رہنا پڑتا ہے۔ میری بات سمجھ رہے ہو ناں؟''

میں نے انکار میں سر ہلایا۔ ''میں صرف مریم سے ملنا چاہتا ہوں۔''

اُسے میری قطعیت ناگوار لگی، بولی۔ ''وہ تم سے نہیں مل سکتی کیونکہ اُس کی شادی طے پاچکی ہے۔ اگر تم یہ سوچ کر آئے ہو کہ اُس سے مل کر اُسے نوکری پر آمادہ کرلو گے تو صاف بتائے دیتی ہوں کہ یہ ناممکن ہے۔''

مجھے اُس کا انداز تخاطب کھل رہا تھا۔ مارے غصے اور بے بسی کے میرا سر درد کرنے لگا تھا۔ میں نے ایک مرتبہ پھر اپنی حیثیت کا جائزہ لیا۔ اپنے آپ کو بے حد کمزور اور بے اختیار پاتے ہوئے اپنے مزاج کو ٹھوکر ماری اور اس بگڑی ہوئی امیر زادی کی منت سماجت کی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ نہ جانے کیا ہوا کہ میں ایک ہی لمحے میں فیصلہ کر گزرا۔

سر اُٹھایا اور پختہ لہجے میں گویا ہوا۔ ''اوکے مسز فردوس! یوں ہی سہی۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ نے اُس کی شادی کا فیصلہ کر لیا ہے مگر میں پھر بھی اُسے پرپوز کرنا چاہتا ہوں۔ آپ مجھ سے تعاون کریں۔''

اس کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔ مجھے خوف محسوس ہوا، کہا۔ ''مجھے توقع ہے کہ مریم میری پیشکش قبول کرلے گی۔ اور اگر ایسا نہ ہوا تو میں واپس چلا جاؤں گا۔''

اس کا ردِعمل غیر فطری سا لگا۔ کسی گہری سوچ میں مستغرق ہوگئی یا اداکاری کرنے لگی۔ کئی لمحوں بعد لمبی سانس لے کر بولی۔ ''تمہاری مالی پوزیشن اس ارادے میں رکاوٹ ثابت نہیں ہوگی؟''

میں نے یقین سے کہا۔ ''نہیں!''

''کیا تمہاری مسز کو اعتراض نہیں ہوگا؟''

''نہیں۔'' میرا لہجہ کھوکھلا نہیں تھا۔

''اوکے...... میں جاکر مریم سے بات کرتی ہوں۔'' وہ اُٹھتے ہوئے بولی۔ مجھ پر ایک کڑی نگاہ ڈال کر اندر چلی گئی۔ اُس کے انداز سے یوں محسوس ہوا جیسے اُس نے مجھے مستقل طور پر بھگانے کا تہیہ کرلیا تھا۔ دس پندرہ منٹ بعد ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو اس کے عقب میں مریم بھی سر جھکائے چلی آرہی تھی۔ میں بے ساختہ کھڑا ہوگیا۔ مسز فردوس نے اُسے میرے سامنے صوفے پر بٹھایا، پلٹی اور ایک ذرا رُک کر بولی۔ ''تم دونوں مل بیٹھ کر کسی فیصلے پر پہنچنا چاہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ میں سونے کے لیے جا رہی ہوں۔ اور وسیم! اگر تم اپنا مقدمہ جیت جاؤ تو مریم مجھے مطلع کردے گی۔ گڈ نائٹ!''

اس کے اعتماد نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ اس کے جانے کے کافی دیر بعد تک ننھی ننھی گھنٹیوں والا شریر پردہ ہلتا رہا، موسیقی پھوٹتی رہی اور میں سر جھکائے بیٹھی مریم کو وارفتہ اور امید بھری نظروں سے دیکھتا رہا۔ وہ قطعی طور پر نارمل اور سنجیدہ تھی۔ فون پر دل فگار انداز میں رونے والی مریم اور میرے سامنے بیٹھی ہوئی میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ میں نے کہا۔ ''مریم! کیا میں واقعی اب نارمل ہوں؟''

اس نے میری طرف دیکھے بغیر نفی میں سر ہلایا۔

''اس کے باوجود تم مجھے چھوڑ آئیں؟''

''ہوں!'' وہ ہولے سے بولی۔

''خیر! جو ہوا، سو ہوا۔ اب میں تمھیں لینے کے لیے یہاں چلا آیا ہوں۔ کیا تم میرے ساتھ چلوگی؟''

اس نے چہرہ اُٹھایا۔ مجھے دیکھا۔ آنکھیں زندگی کے تمام رنگوں سے آراستہ تھیں، بولی۔ ''کس حیثیت سے؟''

''میں اپنی زندگی کے لیے سہارا مانگنے آیا ہوں۔ تم شریکِ حیات بن کر میرے ساتھ چلوگی؟''

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ میرا دیوانگی آمیز دعویٰ سن کر خوش ہوئی تھی یا محظوظ، بولی۔ ''کیا آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں؟''

''نہیں...... مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے۔'' میں نے جلدی سے کہا اور امید بھری نظریں اس کے خوب صورت چہرے پر مرکوز کردیں۔

وہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر بولی۔ ''مگر ہماری شادی نہیں ہوسکتی سر! میں مجبور ہوں۔'' اس کا لہجہ ایک دم بدل گیا۔ ''تاہم مجھے تا عمر فخر رہے گا کہ مجھ بے ثمر کے لیے اتنا بڑا آدمی بے چین اور مضطرب ہوا۔ شادی کا خواہش مند بھی۔ مگر سر! میں نے بتایا تھا ناں کہ میں مسز فردوس کی زیر بار ہوں۔ انہوں نے مجھ پر پانی کی طرح پیسا بہایا تھا۔ کسی رشتے ناتے کے بغیر۔ مجھے فوجی کیمپ سے اُٹھا کر نئی زندگی دی ورنہ تو اس کیمپ اسپتال سے کوئی بچ کر نہیں نکلا تھا۔''

اس نے اپنا سر جھکالیا اور خشک لب گیلے کرلیے، کہا۔ ''سر! میں بھی مرچکی ہوتی اگر وہ مجھے پنڈی نہ لے آئی ہوتیں۔ انہوں نے تیسری مرتبہ میری شادی طے کردی۔ میں نے اپنا دل کھول کر ان کے سامنے رکھ دیا۔ آپ کی محبت کے بارے بتا دیا اور چاہا کہ میں آپ کی شریکِ ذات بن جاؤں مگر انہوں نے ایسی شرط عائد کردی جسے میں پورا نہیں کرسکتی تھی، آپ بھی نہیں، کوئی بھی نہیں۔ اس لیے میں نے اپنی خوابوں بھری آنکھیں بند کرلیں۔''

مجھے احساس ہوا کہ اس کے الفاظ اور لہجہ ہم آہنگ نہ تھے۔ میں نے پوچھا۔ ''وہ شرط کیا تھی؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا، کہا۔ ''کوئی فائدہ نہیں سر! مجھے آپ کی محبت ہمیشہ دلاسا اور تقویت دیتی رہے گی۔ آپ کے لیے دنیا اچھے لوگوں سے بھری پڑی ہے۔ اب آپ جائیں اور مجھے اس غزل کی طرح بھلا دیں جو ذہن کے پردے سے کاغذ تک منتقل نہیں ہوپاتی اور شعور میں ہی تحلیل ہوجاتی ہے۔''

میں اُٹھا۔ اس کے قریب جاکر پہلو میں بیٹھ گیا۔ اس کا سر اُٹھا کر آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ''کیا تمھیں یقین ہے کہ محبت کی روداد میں ایسا ہونا ممکن ہے؟''

اس کی لرزیدہ آواز کانوں پڑی۔ ''سر پلیز!''

میری دہشت آنکھوں میں عود آئی۔ ''نہیں! مجھے وہ

شرط بتاؤ جو مسز فردوس نے تمہیں مجھ سے دور کرنے کے لیے عائد کی تھی؟''

اس نے پیش و پس سے کام لیا مگر میرے دیوانہ وار اصرار پر ہار گئی، بولی۔ ''سر! دنیا اتنی آسان اور مہربان نہیں ہے جتنی دکھائی دیتی ہے۔ یہ آپ نے کہا تھا۔ کہا تھا ناں؟...... یہاں ہر جذبے کی قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔ مسز فردوس نے میرے علاج پر بہت بڑی رقم خرچ کی تھی۔ کوئی بلاوجہ تو اتنی بڑی قربانی نہیں دیتا ناں۔ اب وہ کہتی ہیں کہ اگر تم اپنی مرضی کی شادی رچانا چاہتی ہو تو میری رقم میری ہتھیلی پر رکھ کر میری زندگی سے نکل جاؤ۔'' مریم کی آواز بھرا گئی۔ آواز کی تال پر ہونٹ لرزنے لگے۔ ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا کر سسکتے ہوئے بولی۔ ''سر! میرے پاس پھوٹی کوڑی تک نہیں، انہیں دس لاکھ روپے کہاں سے لا کر دے سکتی ہوں۔''

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ مسز فردوس کا حقیقی رخ میری نظروں میں گھوم گیا۔

''نہیں مریم! یہ انسانوں کی خرید و فروخت کا عہد نہیں ہے۔''

''مگر زندگی کے فیصلے ضرور بکتے ہیں۔''

میں نے اپنا سر تھام لیا۔ وہ مزید بولی۔ ''سر آپ نے شرط دریافت کر کے مجھے ہلکا کر دیا۔ اب آپ جائیں۔ میں ہمیشہ آپ کو یاد رکھوں گی۔'' اس کی آواز میں بلا کا دکھ تھا۔

میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ ایک سوال کا جواب دے دو تاکہ مجھے فیصلہ کرنے میں آسانی رہے۔ کیا تمہارے دل میں میرے لیے تھوڑی سی جگہ ہے؟''

اس کا سر ایک جھٹکے سے اٹھا۔ اس کی آنکھوں کے تاثر نے میرا پورا وجود سن کر دیا، بولی۔ ''سر! آپ یہ جانے بغیر یہاں تک کیوں چلے آئے؟''

''جو پوچھا ہے، اس کا واضح جواب دو۔'' میں نے الجھ کر پوچھا۔

وہ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ''تھوڑی سی جگہ؟ میرے دل میں؟...... نہیں سر! میں نے تو پورا دل، اپنے احساسات سمیت آپ کو دے دیا تھا۔ تب بھی، اب بھی...... پر اپنی قیمت لگتی دیکھ کر ٹوٹ گیا۔ بس! اب آپ جائیں اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔''

میں اٹھا۔ میز کے گرد گھوم کر وال پینٹنگ تک گیا۔ کمر پر ہاتھ باندھ کر سرد لہجے میں بولا۔ ''مجھے مسز فردوس کی شرط منظور ہے۔ اسے جا کر کہہ دو کہ میں دو تین روز تک دس لاکھ روپے لے کر تمہیں لینے پہنچ جاؤں گا۔ مگر یاد رہے کہ یہ تمہارے دل کی قیمت نہیں ہے بلکہ اس لمحے کا خراج ہے جس میں انسان اپنی مرضی کا فیصلہ کرتا ہے۔''

وہ بھی کھڑی ہوگئی۔ حیرت بھری آواز میں بولی۔ ''مگر آپ اتنی بڑی رقم میری خاطر کیوں ضائع کریں گے؟ آپ کو دنیا میں مجھ سے بہتر لڑکی مل سکتی ہے۔''

میں نے جواب نہ دیا۔ چند لمحے یک ٹک اسے دیکھتا رہا پھر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ''میں واپس آنے کے لیے جا رہا ہوں۔ انتظار کرنا۔ مسز فردوس سے کہہ دینا کہ میں دو تین دنوں تک اسے رقم دینے اور تمہیں لے جا کر ہاسٹل چھوڑنے کے لیے آؤں گا۔ وہ تمہاری شادی کا خیال اپنے دل سے نکال دے۔ ہاسٹل پہنچنے کے بعد اگر تم چاہو گی تو میری دنیا میں روشنی کرنے آ جاؤ گی۔ چاہو گی تو میں ہمیشہ کے لیے تمہاری دنیا سے نکل جاؤں گا۔''

اس کی آنکھوں نے مجھے رکنے کی استدعا کی۔ میرے تھمنے پر قریب آئی۔ ہاتھ تھام کر میری آنکھوں میں جھانکنے لگی۔ چند لمحے عشق کی آتش کی حدت کو محسوس کرتی رہی پھر جذبات سے مغلوب لہجے میں بولی۔ ''سر! کیا آپ نے فیصلہ کرنے میں عجلت نہیں کی؟''

''ہاں مگر زندگی کو اس عجلت پر ہمیشہ فخر رہے گا۔'' اس کی گرفت کی طرح میری آواز بھی کپکپا گئی۔ اس کا تنا ہوا بدن ایک دم ڈھیلا ہوا اور میرے سینے میں سما گیا۔ میں نے اس کی دونوں بند آنکھوں کو فوراً اعتماد سے چوما اور اسے خود سے علیحدہ کر دیا۔ اس میں شاید مجھے پھر روک لینے کی سکت نہیں رہی تھی اس لیے ساکت کھڑی دیکھتی رہی اور میں ڈرائنگ روم سے نکل آیا۔ گیٹ دے پر کھڑی شیراڈ میں بیٹھ کر عبدالکریم کی طرف دیکھے بغیر بولا۔ ''گھر چلو۔''

مہرو بیڈروم میں بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر تن گئی، مستفسر ہوئی۔ ''کیا بنا؟''

میں نے کہا۔ ''مسز فردوس نہیں مانی۔''

میرا جواب اس کی توقع کے عین مطابق تھا۔ لمبی سانس لے کر بولی۔ ''کیا کہا اس نے؟''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شال صوفے پر اچھالی اور بیڈ پر گر گیا۔ میری توقع کے مطابق اس نے مجھے کریدنے اور کچھ پوچھنے کی بہت کوشش کی مگر ہمیشہ کی طرح ناکام ہوئی۔ دروازہ اور لائٹ بند کر کے سونے کے لیے لیٹ گئی۔ اس کی سانسوں کی آواز کمرے کے غیر معمولی سکوت میں گونجنے لگی تو میں نے اطمینان کی سانس لی اور دس لاکھ روپوں کے حصول کے بارے سوچنا شروع کر دیا جو

مجھے دو تین دنوں میں مسز فردوس کے ہاتھ پر رکھنے تھے۔

اگلی صبح میرے رسمی طور پر روکنے کے باوجود مہرو میگزین اُٹھانے کے لیے پریس پر چلی گئی تو میں نے اس کی الماری کی تلاشی لی۔ اپنی مطلوبہ فائل نکال کر بیڈ پر رکھ کر کھول دی۔ اس فائل میں اس نے ان تمام رقوم کا حساب لکھ رکھا تھا جو اسے گریجویٹی، جی پی فنڈ اور جائداد بیچنے پر میسر آئی تھی۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس نے تمام جائداد بیچ ڈالی تھی یا کوئی باقی تھی۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرانی آمیز مسرت ہوئی کہ اس نے مجھ سے مختیار نامہ حاصل کر لینے کے باوجود میری جائداد کو فروخت نہیں کیا تھا۔ میرا دس مرلے پر محیط نو تعمیر شدہ گھر بھی محفوظ تھا جو چنیوٹ شہر کے قلب میں واقع تھا۔ میں اگر صرف اسی مکان کو بیچ دیتا تو میرا ٹارگٹ پورا ہو سکتا تھا۔ مکان کی مالیت بجا طور پر دس لاکھ سے اوپر تھی۔ مکان کے علاوہ زرعی زمین بھی محفوظ تھی جو ٹھیکے پر دی جا چکی تھی۔

تجسس کے مارے میں نے مہرو کی ترتیب دی ہوئی فائل پوری پڑھ لی۔ اس نے ہاتھ لگنے والی خطیر رقم خرچ کر دی تھی۔ تفصیل خرچ کے صفحے پر اس نے معمولی رقم کا اندراج بھی تفصیل کے ساتھ کر رکھا تھا مگر آخری خرچ شدہ رقم جو پندرہ لاکھ روپے تھی، کی تفصیل والا خانہ خالی تھا۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے اتنی بڑی رقم سے کیا خریدا تھا؟...... یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اس کی تفصیل لکھنا بھول گئی تھی۔ بجا طور پر اس نے اس خرچ کی نوعیت کو فائل دیکھنے والے سے چھپانا چاہا تھا۔ میں نے کندھے اُچکائے اور فائل کو الماری میں رکھ کر چنیوٹ جا کر مکان بیچنے کا لائحہ عمل تیار کرنے لگا۔

دو بجے کے قریب جب مہرو لوٹی، میں چنیوٹ جانے کی تیاری کر چکا تھا۔ وہ میگزین کی ایک کاپی لہراتے ہوئے بیڈ روم میں آئی۔ خوشی سے بولی۔ ”وسیم! دیکھو تو کتنا خوبصورت ہے یہ!“

مجھ پر نظر پڑتے ہی چونک گئی۔ سرتاپا حیرت سے دیکھ کر ساکت ہو گئی۔ میگزین والا ہاتھ بے جان انداز میں نیچے گر گیا، بولی۔ ”تم کہیں جا رہے ہو؟“

”ہاں! میں چنیوٹ جا رہا ہوں۔“

”مگر کیوں؟“ استعجاب آمیز آنکھوں میں تشویش کی لہر کھل گئی، بولی۔ ”گھر میں سب خیر تو ہے ناں؟“

میں نے آنکھیں چرائیں۔ ”سب خیر ہے۔ میں ضروری کام کے سلسلے میں جا رہا ہوں۔“

”ضروری کام؟“ اس کے لبوں سے کلمۂ تحیر نکلا۔ سوچ میں پڑ گئی۔ میگزین کی خوشی ہوا ہو گئی۔ اوپر تلے کئی سوال کر کے تھک گئی اور سر تھام کر بیڈ پر ٹک بیٹھی۔ شکست خوردہ انداز میں بولی۔ ”مجھے اپنی پریشانی میں شامل نہیں کرتے ناں! نہ سہی۔ میں پہلے بھی کب تمہاری دنیا کا حصہ تھی۔ جاؤ! بصد شوق اپنا ضروری کام سرانجام دو۔“

میں اُسے کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا کیونکہ وہ مسز فردوس کی شرط سن کر چونک جاتی اور خطرے کی بو محسوس کرتے ہی اکڑ جاتی۔ یوں میرا سفر آغاز میں ہی مسدود کر دیا جاتا۔ میں نے بہت سوچ کر فیصلہ کیا تھا کہ جب مریم کو فردوس کی تحویل سے نکال کر کورٹ میرج کر لوں گا، تب مہر النسا کو بتاؤں گا تاکہ وہ میرے راستے میں حائل نہ ہو سکے۔ میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ”عبدالکریم! مجھے پیرودھائی کے بس اسٹینڈ پر ڈراپ کر دو۔“

اس نے بغیر کسی پیش و پس کے گاڑی نکال لی۔ میں چار بجے سرگودھا جانے والی ائرکنڈیشنڈ بس میں سوار ہو چکا تھا۔ سرگودھا سے مجھے بہ آسانی چنیوٹ جانے والی بس یا ویگن مل گئی اور توقع کے مطابق نو بجے گھر پہنچ گیا۔ اماں اور اباجی نے مجھے دیکھا۔ بے پناہ خوش ہوئے۔ اکیلے آنے پر متفکر بھی ہوئے۔ پندرہ سالوں سے ذہن پر مسلط جھجک آڑے آئی اور میں بہت زیادہ باتیں کرنے کی خواہش کے باوجود ’ہاں‘ اور ’ہوں‘ تک محدود رہا۔ میری آمد کی اطلاع آناً فاناً خاندان بھر میں پھیل گئی اور بھائی اور کزنز جمع ہونے لگے۔ انہیں مہرو سے ملنے والی معلومات کی روشنی میں میرے بدلاؤ کی توقع تھی مگر میں نے انہیں دانستہ طور پر مایوس کیا۔

کھانے کے بعد میں نے اباجی سے کہا۔ ”اباجی! میں اپنا مکان بیچنے آیا ہوں۔“

اباجی نے میری ماں کی طرف دیکھا۔ مکان کی فروخت کا دکھ اپنی جگہ، میرے بولنے کی خوشی دونوں کے چہروں پر رقصاں ہو گئی۔ بڑا بھائی بولا۔ ”شکر خدا کا، وسیم کی آواز تو کانوں میں پڑی۔“

چھوٹا بھائی بولا۔ ”میں نہ کہتا تھا کہ باجی مہرو ایک دن وسیم کا دل جیت لے گی۔“

میرے بھائی مہرو کو بھابی کے بجائے ’باجی‘ کہا کرتے تھے۔ بڑی بہن نے پوچھا۔ ”مگر تم اپنا مکان کیوں بیچنا چاہتے ہو؟“

میں نے کہا۔ ”مکان میرا ہے۔“

میں نے دانستہ طور پر ادھورا جواب دے کر سمجھانے کی

کوشش کی تھی کہ مکان میرا ہے اور میں جب چاہوں اُسے بیچ سکتا ہوں، کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے...... اس کے باوجود سبھی نے میرے اقدام کی مخالفت کی۔ باری باری مہر النسا سے فون پر رابطہ کر کے صورتِ حال جاننے کی کوشش کی مگر مہرو کا فون بند تھا۔ یہ خلافِ معمول بات تھی کیونکہ مہرو اپنا فون ہمیشہ آن رکھتی تھی۔ شاید میرے رویے نے اُسے ہرٹ کیا تھا۔

اماں نے میرے بالوں میں انگلیاں پھیریں، پیار کیا اور کہا۔ ”پتر! اگر تمہیں پیسوں کی ضرورت ہے تو مجھے بتاؤ۔ تمہارے بھائی رقم کا بندوبست کر دیں گے۔“

میں نے آہستگی سے کہا۔ ”میں کسی کا احسان نہیں لوں گا۔“

”پتر! میں جانتی ہوں کہ تم آلنا (گھونسلا) چھوڑ چکے ہو۔ کبھی لوٹ کر یہاں رہنے کی نیت سے نہیں آؤ گے۔ یہ مکان تمہارے کام نہیں آئے گا مگر میرا دل نہ دکھاؤ۔ میں اسے تمہاری نشانی سمجھ کر دل سے لگائے بیٹھی ہوں۔ آنکھیں بند کر لوں تو بھلے بیچ دینا۔“ ماں کا دل بھر آیا اور اس نے میرا چہرہ گود میں رکھ کر آنسوؤں سے بھگو دیا۔ میں اُس کا دل دکھانا نہیں چاہتا تھا مگر دکھا رہا تھا اور دل ہی دل میں شرمسار ہو گیا تھا۔ مریم کے حصول کی خاطر اپنی ضد چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا تھا۔

اگلے دن میں نے چنیوٹ شہر کے بڑے پراپرٹی ڈیلرز سے ملاقات کی۔ مکان پر ”برائے فروخت“ کا سائن بورڈ آویزاں کیا۔ کئی لوگوں سے ملا جو پراپرٹی پر انویسٹ منٹ کرنے میں شہرت رکھتے تھے مگر شام تک حوصلہ ہار چکا تھا۔ میرے بھائیوں اور کزنز نے میرے ارادے کے گرد بہت مضبوط حفاظتی دیوار کھینچ ڈالی تھی اور مجھے ناکام کرنے کا ہر حربہ اختیار کر لیا تھا۔ دوسرا دن بھی اکارت گیا تو میں نے شام کو اماں سے کہا۔ ”اماں! مکان نہیں بکا۔ اسے بیچنے میں کم و بیش ایک مہینے کا وقت چاہیے۔ اتنا وقت میرے پاس نہیں ہے۔ میرا یہاں آنے کا، زندہ رہنے کا مقصد ہی فوت ہو گیا ہے۔“

ماں نے دکھ سے مجھے دیکھا، بولی۔ ”کیا بات ہے؟“

”مجھے دس لاکھ روپے چاہئیں۔“

”کیوں؟“

”زندہ رہنے کے لیے۔“ میں نے کہا اور اس کی گود میں سر رکھ دیا۔

”بس پتر!“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اماں کچھ سوچ کر بڑے بھائی کے گھر گئی۔ عشا کے وقت اماں کا صحن بیٹوں سے بھر گیا۔ اماں نے دوٹوک انداز میں حکم دیا کہ سبھی حصہ ملا کر دس لاکھ روپے وسیم کے حوالے کریں۔ پیسے دیتے ہوئے دل پر ہاتھ پڑتا ہے مگر میری ماں کا حکم ٹالنا کسی کو گوارا نہ ہوا۔ مجھے حیرت ہوئی جب سبھی نے مجھ سے مصرف جانے بغیر اگلے دن بارہ بجے تک بینکوں سے رقوم نکلوا کر میرے ہاتھ پر رکھ دیں۔ میرا ٹارگٹ پورا کر دیا۔ اماں خوش ہوئی۔ ”شکر ہے میرے لعل کی نشانی بچ گئی۔“

میرے بھائی اور کزنز متفق تھے کہ حالات درست نہ ہونے کی وجہ سے اتنی بڑی رقم لے کر سفر پر نہیں نکلنا چاہیے۔ اس لیے بڑے بھائی نے رقم اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرائی اور مجھے چیک بنا دیا۔ میں نے چیک جیب میں ڈالا اور اباجی کے ہاتھ چوم کر گھر سے نکل آیا۔ مجھے اپنے خاندان کے بے پایاں تعاون پر فخر و انبساط کا احساس ہوا۔ میں اُڑا جا رہا تھا اور چشمِ تصور میں مریم کا دمکتا ہوا چہرہ دھڑکنوں کو بے اعتدال کر رہا تھا۔ مجھے علم تھا کہ جونہی میرے خاندان کو علم ہو گا کہ میں نے ان سے یہ رقم کیوں حاصل کی تھی تو وہ آسمان سر پر اُٹھا دیں گے مگر مجھے فکر نہیں تھی۔

مجھے فیصل آباد سے اسلام آباد جانے والی کوچ پر سیٹ مل گئی جس نے مجھے دس بجے رات جی ٹائن بس اسٹینڈ پر اُتار دیا۔ میں نے ٹیکسی پکڑی اور مسز فردوس کے بنگلے کا رُخ کیا۔ سفر کی روایتی تھکن پر کامیابی کی مسرت غالب تھی اور مسز فردوس کے ڈرائنگ روم میں قدم رکھنے کا انداز فاتحانہ تھا۔

اس نے زیادہ انتظار نہ کروایا اور دس منٹ بعد سنجیدہ چہرہ لیے میرے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔ میں نے رسماً کچھ کہے بغیر چیک نکال کر میز پر رکھ دیا۔ اس نے چیک کا بہ نظرِ غور جائزہ لیا، بولی۔ ”اسے اکاؤنٹ میں جمع کرانا پڑے گا۔ تین چار دن منی ٹرانسفرنگ میں لگ جائیں گے۔ اس دوران یہ چیک باؤنس بھی ہو سکتا ہے۔ اچھا ہوتا کہ رقم آن لائن کروا دیتے۔“

میں نے کہا۔ ”میرے پاس آپ کا اکاؤنٹ نمبر نہیں تھا تاہم مجھے یقین ہے کہ یہ باؤنس نہیں ہو گا۔ آپ اپنی تسلی کر سکتی ہیں۔“

اس نے چیک ایک ذرا نخوت سے میز پر اُچھال دیا اور مجھے حسبِ عادت گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”شاعر کے پاس اتنی بڑی رقم کی موجودگی میرے لیے حیران کن ہے۔“

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے پوچھا ہو۔ ”کیا

ڈاکا مارا آئے ہو؟"

میں نے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔ وہ کچھ دیر تک پیشانی سہلاتی رہی، سوچتی رہی پھر بولی۔ "ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔ جونہی رقم میرے اکاؤنٹ میں منتقل ہوئی، فون پر مطلع کردوں گی۔ تم آکر مریم کو لے جانا۔"

میری آنکھوں میں تشکیک اور عدم اعتماد کے تاثرات دیکھ کر سخت لہجے میں بولی۔ "وسیم بھروانہ! یہ اتنی بڑی رقم نہیں ہے جس کی خاطر فردوس خانم اپنی زبان سے پھر جائے۔"

میں نے کہا۔ "میرے نزدیک رقم کی نہیں، مریم کی اہمیت ہے۔ اگر آپ نے اپنا وعدہ پورا کیا تو احسان ہوگا ورنہ......"

میں نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

وہ استہزائیہ انداز میں بولی۔ "کیا ورنہ؟"

میں نے صوفہ چھوڑ دیا۔ اس پر ایک شعلہ بار نظر ڈالی اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ ایسے میں پلٹا اور انگلی اُٹھا کر نہایت سرد آواز میں بولا۔ "ورنہ میں آپ کو زندہ نہیں چھوڑوں گا کیونکہ مجھے ہر حال میں مریم کو حاصل کرنا ہے۔"

میری درشت اور سنگدلانہ دھمکی خود میرے لیے بھی باعث استعجاب تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک ذرا خوف کی پرچھائیں لہرائی مگر فوراً سنبھل کر کھڑی ہوئے بغیر بولی۔ "دھمکی مت دو۔ میں جو کہتی ہوں، پورا کرتی ہوں۔"

میں ایک جھٹکے سے پلٹا اور ڈرائنگ روم سے نکل آیا۔

آدھے گھنٹے بعد میں بیڈ روم میں مہرو کی مستفسرانہ نظروں کا سامنا کر رہا تھا۔ وہ ابھی تک سوئی نہیں تھی۔ مجھ سے کچھ پوچھے بغیر کھانا تیار کرنے کے لیے کچن میں گھس گئی۔ میں نے بیڈ کے سرہانے رکھا ہوا موبائل فون اُٹھایا۔ دیکھا۔ ابھی تک بند تھا۔ مجھے اس کے رویے پر کچھ زیادہ حیرت نہیں ہوئی کیونکہ اس کی پریشانی کا سبب میری ذات ہی تھی۔

میگزین کی اشاعت میرا خواب تھا مگر نہ جانے کیوں میں نے تمام دن دفتر کے ریٹائرنگ روم میں گزارنے کے باوجود کارٹن کھول کر میگزین دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے مریم کے بعد یہ سارا گورکھ دھندا بے معانی ہوگیا تھا۔ میری طبیعت میں عود کر آنے والی سرد مہری نے مجھے مہرو سے پھر دور کردیا تھا اور میرے جملوں پر برف ملفوف کردی تھی۔ دو دن گزر گئے مگر مسز فردوس نے فون پر رابطہ نہیں کیا تھا۔ میرا جی چاہا کہ اُس کے نمبر پر رابطہ کروں اور دریافت کروں کہ چیک 'اوکے' ہوگیا ہے یا نہیں مگر ایک عجیب نوع کی جھجک آڑے آئی اور میں اُسے فون نہ کرسکا۔

شام کو جب میں بیڈ روم میں تھا اور مہرو کچن میں مصروف تھی، مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ دبی دبی آواز میں کسی سے باتیں کر رہی ہے۔ دل میں تجسس پیدا ہوا اور میں دبے پاؤں بیڈ روم کے دروازے میں آن کھڑا ہوا۔ وہ میری طرف پیٹھ کیے کھڑی فون پر کہہ رہی تھی۔ "وہ تو ٹھیک ہے مگر یہ دس لاکھ والا معاملہ کہاں سے نکل آیا۔ میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ تمہیں اگر پیسوں کی ضرورت ہے تو مجھ سے لے لو۔ مگر تب تم نے جواب دیا تھا کہ میرے پاس بہت پیسے ہیں۔ اب کیا ہوا، بھوک پڑ گئی؟"

مہرو کے منہ سے 'دس لاکھ' کا تذکرہ سن کر میں بری طرح چونک گیا۔ وہ دوسری طرف سے کہی جانے والی بات سن کر قدرے غصے میں بولنے لگی۔ "نہیں...... یہ فیئر نہیں ہے۔ تم کہتی ہو نا، کہ اس سے کیا نقصان ہوا، میں بتاتی ہوں۔ نقصان یہ ہوا کہ میں جس بات کو اپنے خاندان سے چھپانا چاہتی تھی، وہ اُن پر کھل گئی ہوگی۔ وسیم نے اُن سب کو یا کسی ایک کو ضرور بتا دیا ہوگا۔ ایسے میں انہیں مطمئن کرنا میرے لیے مشکل ثابت ہوجائے گا۔"

میری گردن پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ ذہن بھک سے اُڑ گیا۔ میں نے اپنا سر تھاما مگر مہرو کی باریک آواز کا راستہ روک نہ پایا۔ "ہاں! تم میری بہت اچھی دوست ہو۔ کلاس فیلو بھی ہو۔ میری مدد کرنا چاہتی ہو...... مگر تم نے میرے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ اب بتاؤ، آئندہ کے لیے کیا سوچ رہی ہو؟"

جواب سن کر بولی۔ "نہیں! میں زیادہ انتظار نہیں کر سکتی۔ اگر تمہیں مجھ پر یقین ہے تو ضد چھوڑ دو۔ چیک باؤنس نہیں ہوگا۔ اگر ہوجائے گا تو یہ رقم میں دے دوں گی۔"

اُس کے اگلے جملے نے عیاں کردیا کہ وہ یقین دلانے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ مطمئن ہوکر بولی۔ "ٹھیک ہے۔ کل دوپہر تک اُسے بیاہ دو تاکہ تمہاری جان اُس سے ہمیشہ کے لیے چھوٹ جائے۔ میری پریشانی بھی ختم ہوجائے۔ یقین مانو، میں کئی راتوں سے سو نہیں پائی۔ دو چار دن یہی حالت رہی تو بیمار پڑ جاؤں گی۔"

فون کے اسپیکر سے پھوٹنے والی آواز سننے کے بعد قدرے اطمینان سے بولی۔ "کل ایک بجے...... بالکل ٹھیک ہے۔ میں بھی اس معاملے کو جلد نمٹانا چاہتی ہوں۔"

کال منقطع ہوگئی تھی۔ جونہی اُس نے فون کان سے ہٹایا، میں اُلٹے قدموں چلتا ہوا بیڈ تک آیا اور سر تھامے میٹرس پر گر گیا۔ مہرو کیا کر رہی تھی؟ پوری طرح سمجھ نہیں پایا تھا۔ وہ فون پر کس سے باتیں کر رہی تھی؟ مسز فردوس سے یا مریم

سے یا کسی اور سے؟...... میرا سر دکھنے لگا۔ چکرانے لگا۔ دل میں اندیشہ پیدا ہوگیا کہ وہ میری راہ میں مزاحم ہوچکی تھی۔ بہت چالاک اور زود فہم تھی۔ میرے بڑھتے ہوئے قدموں کو نامراد لوٹانے کے لیے پوری طرح کمربستہ ہوچکی تھی۔

تو کیا میں جیت کر بھی ہار گیا تھا؟ میں نے اُس کی یک طرفہ گفتگو سے اندازہ کیا کہ وہ مسز فردوس سے مخاطب تھی۔ چاہتی تھی کہ وہ مریم کو جلد از جلد شادی کے بندھن میں پرو کر اپنا گھر اُس کے شر سے محفوظ کرلے۔ وہ میرے لیے چائے لائی تو یکبارگی میرا جی چاہا کہ گرم چائے سے بھرا ہوا کپ اُس کے چہرے پر انڈیل دوں۔ اُس کا گلا گھونٹ دوں۔ وہ کل بھی میرے لیے عذاب رساں تھی، آج بھی۔ اُس کے سپاٹ چہرے کو دیکھ کر میرا منہ کڑوا ہوگیا۔ چائے حلق میں اٹکنے لگی اور سر گھومنے لگا۔ میں نے چائے کا کپ رکھا اور جلدی سے اُٹھ کر اپنے دفتر آیا۔ مسز فردوس کا کارڈ نکال کر اُس کا پرسنل نمبر دیکھا۔ رابطہ ہونے پر اُس کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو...... کون صاحب؟"

میں جلدی سے بولا۔ "وسیم بھروانہ بات کر رہا ہوں۔ مجھے پتا چلا ہے کہ آپ کل مریم کی شادی کرنے جارہی ہیں؟"

اس کی طنزیہ ہنسی انگارے کی طرح میرے بدن میں اُتر گئی۔ بولی۔ "تو کیا مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے؟"

میں نے دانت کچکچائے۔ خود پر قابو پانے کی ناکام کوشش کی۔ "مگر میں معاہدے کے مطابق......"

اس کی شوخ ہنسی نے میرے رونگٹے رونگٹے میں آگ بھر دی۔ میں نے اس کے خاموش ہونے کے انتظار میں جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ وہ خاموش ہوئی تو میں نے کہا۔ "میں اس دھوکا دہی پر آپ کو معاف نہیں کروں گا۔ مریم کو کوئی بھی مجھ سے دور نہیں رکھ سکتا۔ آئی ایم جسٹ کمنگ ٹو یو......"

میری آواز مشتعل ناگ کی پھنکار کے مشابہہ تھی مگر اُس نے جواب دینے کے بجائے کال منقطع کردی۔ میں نے غصے میں دو تین مرتبہ کال کی مگر وہ زچ کرنے پر تلی رہی۔ میں نے ریسیور پوری قوت سے میز کے شیشے پر دے مارا۔ شیشہ چٹخ گیا۔ ریسیور ٹوٹ گیا۔ شدید مایوسی کے عالم میں میں نے اس وقت مسز فردوس کے بنگلے پر جانے کا ارادہ ملتوی کیا اور بنگلے سے باہر نکل گیا۔ نشیب کی طرف چل دیا۔ ذہن بری طرح سلگ رہا تھا۔ بے چینی اور اشتعال سنبھالے نہیں سنبھلتا تھا۔ گھنٹا بھر دوڑنے کے انداز میں چلتا رہا، پھر پسینے میں شرابور ہوکر لوٹ آیا اور ہارے ہوئے کھلاڑی کی طرح بیڈ پر گر گیا۔

میری توقع کے عین مطابق میرے برابر لیٹی ہوئی مہر النسا کی تیز سانسوں کی آواز نے خراٹوں کی شکل اختیار کرلی تھی۔ میں نے ایک شعلہ بار نظر اُسے دیکھا اور شال کندھے پر ڈال کر بیڈ روم سے نکل آیا۔ گیلری سے گزر کر بالکونی میں آن کھڑا ہوا۔ میرے سامنے ایک کشادہ گلی تھی جس کا فرش پتھروں سے بنایا گیا تھا۔ گلی کچھ فاصلے پر جاکر ایک درخت میں گم ہوتی نظر آرہی تھی۔

میں اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافی پر کڑھ رہا تھا۔ دھوکا دہی پر کھول رہا تھا۔ مہرو کو اپنی بربادی کا ذمے دار ٹھہرا رہا تھا اور تہہ دل سے اُسے قتل کرنے کا سوچ رہا تھا، تب پہلی بار مجھے میرے ضمیر نے کچوکا دیا اور دل کو ملال ہوا۔ میں نے ایک خوبصورت وجود نہ ملنے پر اپنے بہترین پندرہ برس اذیت میں گزار دیے تھے۔ خود ساختہ قید تنہائی میں زندگی کے قیمتی مرحلے ضائع کردیے تھے۔ نہ صرف اپنے آپ کو، بلکہ بیوی بچوں، والدین اور رشتے داروں کو ایسی اذیت میں مبتلا کیے رکھا تھا جس کا ازالہ بھی ممکن نہیں تھا۔ میں نے تجزیہ کیا، کیا زندگی کی تمام تر خوشیوں کا انحصار خوب صورت عورت کے بدن پر منحصر ہے؟...... کیا میں دنیا بھر کا حسن ایک عورت کے بدن میں سمیٹ کر دیکھنے کی ہوس رکھتا تھا؟...... کیا ایک تاریک عورت کے چہرے کو دیکھنے کے بعد انسانی آنکھ کو کبھی اُجالے کی طلب نہیں رہتی؟...... کیا ایک جواں سالہ حسن خیز لڑکی کو مہر النسا جیسی بیوی پر ترجیح دی جانی چاہیے؟

مسز فردوس کی دھوکا دہی نہ سمجھ میں آنے والا عقدہ نہیں تھا۔ وہ جو کچھ کر رہی تھی، بجا طور پر مہرو کے ایما پر کر رہی تھی۔ یعنی مہرو کے نزدیک میرا وجود بے معانی تھا۔ دماغ چکرایا۔ میں نے ریلنگ تھام لی۔

پندرہ سال کمرے میں قید رہنے کی وجہ سے میری جوانی باسی ہوگئی تھی۔ روپ اجڑ گیا تھا۔ اعضا کی بجلیاں ماند پڑ گئی تھیں۔ کیا میں اپنی عمر کو لوٹا سکتا تھا؟...... نہیں...... گزر جانے والا وقت نہیں لوٹتا مگر آنے والے وقت کو کوئی بھی رنگ دیا جاسکتا ہے۔ جوانی کا، امید کا یا جولانیوں سے لبریز...... میں ریت کی دیوار کی طرح ڈھلکتا ہوا فرش پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ اپنا رخسار یخ بستہ ریلنگ کی سلاخوں سے لگا دیا۔ آنکھیں بند کرلیں۔ جی چاہا کہ جتنے اشعار میری انگلیوں کی زبان سے فضا میں پھیلے تھے، انہیں اپنی زبان دے دوں۔ حلق پھاڑ کر غزلیں سناؤں۔ شادی سے پہلے میرا دل رومانی گیتوں کی تال پر دھڑکتا تھا۔ روٹھ گیا اور انقلاب اور ناامیدی کی قبا اوڑھ کر اپنے عشاق کو رُلانے لگا...... مریم ماہ وش نے کہا تھا

کہ اُسے میری شاعری اچھی نہیں لگتی۔ اُسے سامنے نہ پا کر بھی بتانے کو جی چاہا کہ میں نے وہ شاعری بھی کر رکھی ہے جو شباب گیر دلوں کے تاروں کو چھیڑ کر دیوانہ بنا سکتی ہے۔

ایسے ہی وقت میں کہیں چھنا کا ہوا۔ کوئی شیشہ ٹوٹ گیا، یا شاید دل۔ آہنی سلاخوں پر میرے ہاتھوں کی گرفت جنونی ہوگئی اور بے اختیار میں چیخ اُٹھا۔ ”نہیں...... نہیں...... میں شاعر نہیں ہوں۔ میں پاگل ہوں۔ سودائی ہوں۔ اَبا جی ٹھیک کہتے تھے کہ شاعر پاگل ہوتا ہے، تارکِ دنیا ہوتا ہے...... ہاں! اَبا جی ٹھیک کہتے تھے۔ میں غلط کہتا تھا کہ شاعر نئے فکر اور شعور کی بات کرتا ہے۔ ہاں! میں نے غلط کہا تھا۔ میں نے وہی کچھ کیا جو اَبا جی نے کہا تھا۔ مگر کیوں؟ کیا صرف اس لیے کہ انہوں نے اپنی دو بیٹیوں کی آنکھوں کو مسکراہٹ بخشنے کے لیے میرے تمام تر مناظر قربان کر دیے تھے۔ میں نے بھیانک احتجاج صرف اس لیے کیا کہ مجھ میں قربانی کا حوصلہ نہیں تھا؟ ہائے! میں کتنا بزدل تھا۔ کتنا خودغرض تھا۔“

میں کل بھی بزدل تھا۔ آج بھی ڈرپوک تھا۔ مسز فردوس نے میری آنکھوں میں دھول جھونک دی تھی۔ مہرو نے میرا راستہ کاٹ دیا تھا۔ میں قانون کی مدد لینے جاتا تو قانون خانے میں سب سے پہلے مجھ سے میری حیثیت پوچھی جاتی۔ میں اگر مریم کا مدعی بنتا اور وہ مجھے بیچ عدالت جھٹلا دیتی تو میں کتنا نامعتبر ہو جاتا۔ مسز فردوس مجھ سے کہیں زیادہ مضبوط حیثیت کی مالک تھی۔ بے بسی کے شدید احساس پر میرا دل بھر آیا...... آگ اور پانی مل کر بدن میں جنون بھر دیتے ہیں۔ میرا جنون آنسوؤں میں گھلنے لگا۔ مرد ہوتے ہوئے بھی مجھے عار محسوس نہیں ہوا کہ میں کسی بگڑے ہوئے بچے کی طرح بلند آواز میں رونے لگا تھا۔ میں نے ریلنگ پر دو تین مکے رسید کیے، دو تین ٹکریں ماریں پھر بڑبڑانے لگا۔ ”کہاں گیا شعور کہ میں تو عام سا انسان تھا مگر میں نے مہرو کو ناکردہ جرم کی سزا دی، کتنی؟...... پندرہ سال قید تنہائی...... وہ دلہن بن کر میری زندگی میں آئی تھی مگر میں نے اُسے آج تک چوما، دیکھا، پرکھا نہ سوچا...... صرف اس لیے کہ میرے خاندان نے اُس کی خاطر میرے خواب تہس نہس کر دیے۔ خواب؟ خواب کیا ہوتا ہے؟...... ایک فریب یا شعوری خواہش؟...... اور وہ پاگلوں کی طرح میرے لیے خواب چننے کے لیے بازار میں جا کھڑی ہوئی۔ اس نے اپنی تمام تر جمع پونجی، زندگی بھر کی ریاضت صرف اس لیے بے دریغ خرچ کر دی کہ میرے خواب میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی صورت ایک بار جگمگا جائیں۔ ہائے! میں کتنا ظالم ہوں۔ میں نے اس کے دل میں کتنا بڑا احساسِ کمتری اور احساسِ محرومی بھر دیا ہے کہ وہ پاگلوں کی طرح ننگے پاؤں دوڑتی پھرتی ہے......“

سلاخوں کے بیچ سے آنکھیں کھول کر گلی میں دیکھا۔ سبھی دروازے بند تھے۔ رات دیوانوں کی طرح آنگن آنگن چکراتی پھر رہی تھی کہ اگر کہیں کوئی دیوانہ جاگ رہا ہو تو اُسے سلا دے مگر میں جاگ رہا تھا اور وہ میری طرف نہیں آ رہی تھی۔ شاید روٹھی ہوئی تھی۔ میں نے ریلنگ سے باہیں گزار کر پوری وسعت میں پھیلا دیں۔

ہوا کا شور تھم گیا۔ میرے اندر شور بپا ہو گیا۔ دل چیخ چیخ کر کہنے لگا۔ ”رونے والے کا کوئی ساتھ نہیں دیتا۔ فسو، فساؤ...... زندگی تحریک کا نام ہے جبکہ رُکے ہوئے قافلوں کو موت گھیر لیتی ہے۔“

میں نے کھلی باہوں کو سمیٹ لیا اور ریلنگ کی سلاخوں کو سینے میں اتارنے کے لیے باہوں کا پورا زور صرف کر دیا۔ شاید مجھے سانس کی گھٹن کا شدید تر احساس ہوا تھا یا میں مریم کے غیر مرئی وجود کو باہوں میں کس کر مار ڈالنا چاہتا تھا۔ ایسے ہی وقت مجھے کندھے پر ہاتھ کا لمس محسوس ہوا۔ میں چونک کر پلٹا۔ دیکھا کہ مہرو مجھ پر جھکی ہوئی اندھیرے کا حصہ معلوم ہوتی تھی۔ ڈھارس دیتے ہوئے لہجے میں بولی۔

”چلو وسیم! اندر چلو ورنہ ٹھنڈ لگ جائے گی۔“

میری آنکھوں تک میں جنبش پیدا نہیں ہوئی تو وہ پیروں کے بل بیٹھ گئی اور اس نے مجھے اپنے مخمل مخمل کرتے ہوئے نرم وجود میں چھپا لیا۔ میں اُس سے شدید نفرت کرتا تھا مگر نہ جانے کیا ہوا کہ میں نے کوئی مزاحمت نہیں کی بلکہ رونے لگا۔ کسی ننھے بچے کی طرح مہرو بھی مجھے چھپا کر رونے لگی۔ بارش ہر چھوٹے بڑے پودے پر برستی ہے۔ برابر نہلاتی ہے۔ برابر گرد دھو ڈالتی ہے۔ میں بھی دھل رہا تھا۔ مہرو بھی دُھل رہی تھی۔

اچانک میرے لبوں سے نکلا۔ ”مہرو! تم کب آئی تھیں؟“

”تمہارے پیچھے ہی چلی آئی تھی۔“ اس کے لہجے میں مجھے نادم کرنے والا کوئی عنصر شامل نہیں تھا۔ ”وسیم! آئی لو یو...... آئی کیئر اباوٹ یو...... تم دکھی ہو۔ یہ دیکھ کر میرا دل رو رہا ہے۔ مگر خوشی ہے کہ تم زندگی کی طرف لوٹ آئے ہو۔ زندگی خواہشوں اور خوابوں کا ہی تو نام ہے۔ رونے اور ہنسنے کا ہی تو نام ہے۔ ہے نا؟“

”ہاں مگر تم نے مجھے ایک بار پھر مار ڈالا ہے۔“

”کیا کہا؟“ وہ چونکی۔ اچانک اس کی باہوں کے حلقے میں برق کوند گئی۔ مجھے کس کر جھٹکے دیتے ہوئے بولی۔

”یہ تم نے کیا کہہ دیا وسیم! میں تو تمہاری پہلی موت پر روتے روتے نہیں تھکی۔ ازالہ کرنا چاہتی ہوں مگر قسمت ساتھ نہیں دیتی۔ میں تمہیں دنیا بھر کے انسانوں کی طرح ری ایکٹ کرتے دیکھنا چاہتی ہوں۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ اس نے پوری شدت سے مجھے بھینچ لیا، رُندھ گئی، بولی۔ ”وسیم! صرف ایک دن کی مہلت دے دو۔ صرف ایک دن...... جہاں پندرہ سال تم نے خاموشی سے گزار دیے، وہاں ایک رات اور سہی......“

میں نے ہنکارا بھرا۔ آزردگی سے کہا۔ ”ہاں! تب تک تمہارا کام مکمل ہو جائے گا۔ مگر مہرو...... کیا میں اتنا ہی بُرا ہوں؟...... کیا میں انسان نہیں ہوں؟...... تمہیں اُس کھلنڈرے لڑکے پر ترس نہیں آیا تھا۔ بجا۔ اِس ٹوٹے ہوئے شخص پر بھی رحم نہیں کرتی ہو۔ آہ!“

اس نے جواب میں کچھ نہیں کہا بلکہ میرے بے جان وجود کو سمیٹ کر بیڈروم میں لے آئی۔ مجھے لٹا کر بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ میں بے جان پڑا رہا۔ اس کے ہاتھ تھک گئے۔ آہستگی سے اُٹھ کر بیڈ پر دراز ہو گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں سو گئی۔

میں اُس کا خیال جھٹک کر مریم کے بارے میں سوچنے لگا جو قریب آ کر مچھلی کی طرح پھسل گئی تھی۔ یوں کہ اُس کا یا اُس کی تاما نہاد محسنہ کا کچھ بھی بگاڑا نہیں جا سکتا تھا۔ میں کوئی بھی قدم اُٹھاتا، سوائے اپنی رقم کے، کچھ حاصل نہیں کر سکتا تھا مگر وہ رقم تو میرے لیے بالکل بے معانی تھی۔

اچانک میرا ذہن پندرہ برس پیچھے چلا گیا جب میں ایک کھلنڈرا اور نہایت پُرجوش جوان ہوا کرتا تھا۔ نت نئی شرارتیں، آوارگیاں اور شوخیاں میرے گھر والوں کے لیے پریشانی کا سبب بنتی رہتی تھیں۔ میں گھر میں سب سے چھوٹا تھا۔ مجھ سے بڑے تین بھائی برسرِ روزگار ہو چکے تھے۔ وہ فطرتاً بے حد سنجیدہ مزاج واقع ہوئے تھے۔ مجھ سے نالاں رہتے تھے اور گاہے بگاہے اَبا جی سے میری شکایت کرتے رہتے تھے۔ اَبا جی سخت گیر تھے۔ وہ شروع سے اپنی منوانے کے عادی تھے۔ ہمارے گھر کا ماحول ایسا تھا کہ والدین کے سامنے آنکھ اُٹھا کر بات کرنے کو بے حد معیوب خیال کیا جاتا تھا۔ مجھے بہ کثرت اَبا جی کی کڑوی کسیلی باتیں سننا پڑتی تھیں مگر مجال تھی کہ عقل آتی۔ میں نے کالج میں داخل ہوتے ہی شاعری کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا تھا۔ بڑے بھائیوں کو جب میرے اس شوق کا پتا چلا تو وہ بہت جز بز ہوئے۔ انہوں نے گھر میں ہنگامہ بپا کر دیا۔ اَبا جی بھی میرے شوق کی آبیاری کے حق میں نہیں تھے۔ سبھی گھر والے اس رائے پر متفق تھے کہ شاعر معاشرے کا ناکارہ رکن ہوتا ہے جو صرف خواب دیکھتا ہے اور ناقابلِ تعبیر خوابوں کو اوراق کی زینت بناتا رہتا ہے۔

وہ شاید حق بجانب بھی تھے کیونکہ انہوں نے علاقے بھر میں جتنے بھی شاعروں کو دیکھا تھا، وہ ایسے ہی تھے۔ شراب، سگریٹ، صحت پر عدم توجہی، ابتر حلیہ اور غیر عملی زندگی گزارنے کے عمل نے معاشرے میں ان کی شخصیت کو ناپسندیدہ بنا دیا تھا۔ میں نے ان تمام باتوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے اَبا جی کو سمجھایا کہ یہ لوگ شاعر نہیں ہیں۔ شاعر تو سلجھے ہوئے شخص کو کہا جاتا ہے۔ میری تمام دلیلیں ان کی مضبوط دلیلوں کے سامنے ہار گئیں اور اَبا جی نے فیصلہ صادر کر دیا کہ تم یہ فضول شوق اختیار نہیں کرو گے۔

میں نے بہ ظاہر ان کی بات مان لی مگر حقیقت یہ تھی کہ میں نے کالج کے شعبۂ اُردو کے صدر شکیل ارمانی صاحب کی خدمت میں اپنی ریاضت پیش کر دی۔ انہوں نے نہ صرف میری راہنمائی کا بار اُٹھایا بلکہ کھلے دل سے حوصلہ افزائی بھی کی۔ میں نے اپنے اَبا جی کے خیالات ان پر آشکار کیے تو وہ ہنس کر بولے۔ ”انہوں نے جو کچھ دیکھا، وہی سچ ہے۔ جو تمہارے اندر سچ ہے، وہ ان کی نظروں میں لاؤ گے تو وہ مانیں گے وگرنہ نہیں۔ تم بطور شاعر خود کو اچھا انسان بنا کر پیش کرو۔ ایک دن وہ تمہارے ہم خیال ہو جائیں گے۔“

آرٹس گریجویشن کے لیے پنجاب یونیورسٹی پہنچنے تک میں شکیل ارمانی کی غیر معمولی توجہ کے سبب شاعری میں نمایاں مقام حاصل کر چکا تھا۔ نوجوان نسل میرے اشعار کی دلدادہ ہو گئی تھی۔ چند مقامی گلوکاروں نے میرے لکھے ہوئے گیت گائے۔ قسمت ساتھ دے گئی اور ان گیتوں کو عوامی پذیرائی نے مقبولیت کی سند عطا کر دی۔ پنجاب یونیورسٹی میں منعقد ہونے والے مشاعروں نے نہ صرف میرے ہنر کو مہمیز کیا بلکہ مجھے فرش سے اُٹھا کر شہرت کے عرش پر جاگزیں کر دیا۔

مجھے کالج کے ادبی میگزین کا ایڈیٹر بنا کر گویا میری خداداد صلاحیتوں کا پہلی مرتبہ خراج پیش کیا گیا۔ ایک دوست کے توسط سے مجھ پر پی ٹی وی کا گیٹ کھل گیا۔ میری غیر معمولی وجاہت، گفتگو کی روانی اور خود اعتمادی کی بدولت مجھے کئی پروڈیوسرز نے ڈراموں میں کام کرنے کی پیش کش کی مگر میں صرف شاعری تک محدود رہا۔

جس دن میں گریجویشن کے فائنل اگزامز سے فارغ ہو کر چنیوٹ کے نواح میں واقع اپنی بڑی سی حویلی میں پہنچا، اَبا جی نے کئی دیگیں چڑھائیں۔ اردگرد کے لوگ مجھے دیکھنے کے لیے آئے۔ یار لوگ مجھے اپنے اپنے انداز میں بتاتے رہے کہ مجھے ٹی وی اسکرین پر دیکھ کر ان کے قلبی جذبات کیا تھے؟ تب شاید پہلی مرتبہ میرے خاندان نے میری شاعری کو دل سے قبول کیا تھا۔

میں نہ صرف اپنے بہن بھائیوں بلکہ تمام کزنز پر شکل و صورت میں برتری رکھتا تھا۔ ہروقت مائل بہ شرارت رہنے والے مزاج کی وجہ سے سبھی مجھ سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ شہرت نے میرے اندر مزید رومان اور شوخیاں بھر دیں۔ ہمارے ہاں فیملی جوائنٹ سسٹم تھا۔ اَبا جی کے بڑے بھائی، دو چھوٹے بھائی اور میری بیوہ پھوپی اپنے اہل وعیال سمیت اس بائیس بڑے بڑے دیہاتی کمروں پر مشتمل حویلی میں مقیم تھے جس کی وجہ سے گھر بجائے خود ایک چھوٹا سا گاؤں بنا ہوا تھا جس کی آبادی اٹھائیس نفوس پر مشتمل تھی۔ ہر وقت گہما گہمی لگی رہتی۔ میرے تمام کزنز پڑھے لکھے تھے۔ لڑکیاں بھی پڑھ رہی تھیں یا حصولِ تعلیم سے فارغ ہو کر مختلف نوکریاں کر رہی تھیں۔ زمین کی آمدن کم تھی مگر تنخواہوں کی برسات کی وجہ سے ہماری گزر بسر اچھی ہو جاتی تھی۔

مجھے کوئی معاشی فکر لاحق نہ تھی، پذیرائی میسر تھی، اس لیے میں عمر کے بیسویں سن میں ہی شہرت کی وہ معراج پانے میں کامیاب ہو گیا تھا، جو عمر لفظوں کی بنت میں گزار دینے پر بھی شاعروں کی اکثریت کو نہیں ملتی۔ ان تمام عوامل نے میرے مزاج پر بھی اثر ڈالا اور میں مغرور اور خودسر ہو گیا۔ جاگتی آنکھوں خواب دیکھنے کا عادی اور اونچی اڑانوں کا رسیا بھی تھا۔ میرا رزلٹ آیا۔ میں نے حسبِ توقع فرسٹ ڈویژن حاصل کی تھی۔ مارکس اچھے تھے۔ بہ آسانی اُردو ڈیپارٹمنٹ میں ایڈمیشن مل گیا۔ جس دن میں پھر دو سال کے لیے حویلی سے نکلنے لگا، اُسی دن اَبا جی کے ایک ظالمانہ فیصلے نے میرے پر کتر دیے۔

گزشتہ شام کو اَبا جی اور گھر کے تمام بڑوں نے بند کمرے میں بیٹھ کر میری اور مہرالنسا کی شادی کا فیصلہ کیا تھا جس کا اعلان علی الصباح، عین اُس وقت جب میں بیگ اُٹھائے لاہور جانے کے لیے صحن میں آن کھڑا ہوا تھا، کر کے میرے پیروں تلے سے زمین کھسکا دی۔ میں پھٹی پھٹی نگاہوں سے اپنی اماں کو دیکھنے لگا جس کے چہرے پر حزن و ملال ثبت تھا۔ میں جان گیا کہ اس فیصلے تک پہنچنے کے کسی بھی مرحلے میں میری ماں کی رائے شامل نہیں کی گئی تھی ورنہ وہ میرے حق میں ضرور سینہ سپر ہو جاتی۔

مہرالنسا میرے تایا جی کی بڑی بیٹی تھی۔ اس کی عمر تیس سال تھی۔ اُسے بی کام کے فوراً بعد اکاؤنٹ آفس میں اسسٹنٹ آڈیٹر کی جاب مل گئی تھی۔ اس کا رنگ گہرا سانولا تھا۔ نقوش جاذبِ نظر نہیں تھے البتہ اس کی آواز بڑی باریک اور خوب صورت تھی۔ جب ہم تمام کزنز رات کو صحن میں چارپائیوں پر بیٹھ کر ہلا گلا کرتے، وہ لتا منگیشکر کے گیت گا کر سب کو محظوظ کیا کرتی۔ میری بہنیں، جو اس کی بھابیاں بھی تھیں، ڈھولک اور تھال پر اُس کی مدھر آواز کو موسیقی سے نوازتی تھیں۔

وہ بدصورت ہونے کے ساتھ ساتھ عمر میں مجھ سے دس سال بڑی تھی۔ میں نے اُسے ہمیشہ 'باجی' یا 'بڑی آپی' کہا تھا۔ میں نے اَبا جی کو مخاطب کر کے کہا۔ ”اَبا جی! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ میں بڑی آپی سے کیسے شادی کر سکتا ہوں؟“

وہ بولے۔ ”وسیم! یہ ہمارا مشترکہ فیصلہ ہے جس پر بحث کی کوئی گنجائش نہیں۔“

میں نے باری باری تایا جی اور چچاؤں کو دیکھا۔ کسی چہرے پر میری ہمدردی کا کوئی عکس نہیں تھا۔ کافی دیر تک گُنگ کھڑا رہا پھر بیگ وہیں چھوڑ کر اپنے کمرے میں گھس گیا۔ میرا ذہن بھائیں بھائیں کر رہا تھا اور میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اتنی بڑی ناانصافی پر مجھے کس ردِعمل کا اظہار کرنا چاہیے۔ شام تک اپنے کمرے میں بند رہا۔ ماں اور بہنوں نے بیک وقت میری دلجوئی کی اور مجھے سمجھانے کی کوشش کی کہ اَبا جی نے نہایت موزوں فیصلہ کیا ہے۔ شام تک سبھی کو میرے احتجاج کی خبر ہو گئی۔ چھوٹے چچا نے آ کر سمجھایا۔ ”دیکھ پتر! ہمیں تمہاری زندگی اور مستقبل عزیز ہے۔ بڑوں کو اپنا دوست اور اس فیصلے کو اپنی خوش بختی سمجھو۔“

بڑے چچا نے پچکارا۔ ”وسیم بیٹے! مہرو گھر کی بیٹی ہے۔ اچھی تنخواہ لیتی ہے۔ تمہیں بھی اچھی سی نوکری مل جائے گی اور تمہارے بچوں کو روشن مستقبل مل جائے گا۔“

تایا نے سر پر ہاتھ رکھا، بولا۔ ”یہ نہ صرف میری بلکہ میری دونوں بہوؤں کی خوشی ہے۔ ویسے بھی میں نے اپنی بیٹی پر اتنا خرچ اس لیے نہیں کیا تھا کہ اُٹھا کر کسی ایرے غیرے کے حوالے کر دوں۔ وہ ہزاروں میں تنخواہ لیتی ہے۔ اس نے پرائیویٹ پڑھ کر ماسٹرز بھی کر لیا ہے۔ محکمانہ طور پر بہت جلد ترقی کرے گی اور تم دونوں ٹھاٹ باٹ کی زندگی بسر کرو گے۔“

گیارہ بجے تک گھر کے ہر فرد نے مجھے اپنے اپنے انداز میں بہلایا، سمجھایا اور احتجاج ترک کرنے کا مشورہ دیا۔ میں سب کی سنتا رہا مگر بولنا بھول گیا۔ یوں محسوس ہوا جیسے میرے دل کی تمام تر شوخیاں فیصلے کے لمحے کی نذر ہو گئی تھیں۔ سبھی نے خیال کیا کہ میں چند ہی دنوں میں سنبھل جاؤں گا اور اپنی پرانی ڈگر پر لوٹ آؤں گا۔

رات کے ڈیڑھ یا دو کا عمل تھا جب بند دروازے پر ہلکی سی دستک اُبھری۔ میں جاگ رہا تھا مگر میں نے اُٹھ کر دروازے تک آنے کی زحمت نہیں کی۔ چونکہ دروازہ غیر مقفل تھا اس لیے چاہتا تو دستک دینے والے کو آواز دے کر بلا سکتا تھا مگر چپ رہا۔ دروازہ دو تین بار کھٹکھٹایا گیا، پھر دھکیل کر کھول دیا گیا۔ رات کے اس رازدار پہر میں مہرالنسا کو سر جھکائے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر دھک سے رہ گیا۔ اس کا اِس وقت آنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ منہ سے کچھ بولے بغیر سوالیہ نظروں سے اُسے گھورنے لگا۔

وہ بیڈ کے پاس آ کر رُک گئی۔ گلوگیر آواز میں بولی۔ ”وسیم! میں قسم کھاتی ہوں کہ میں نے یہ سب نہیں چاہا اور نہ کسی سے کہا ہے۔ یہ فیصلہ میری مرضی کے بغیر کیا گیا ہے۔ تم چاہو تو انکار کر دو، مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔“

میرا دل یکبارگی بجھ سا گیا۔ منہ پھیر کر بولا۔ ”بڑی آپی! تمہیں اس وقت میرے کمرے میں نہیں آنا چاہیے تھا۔“

وہ میرے ناراض لہجے پر جانے کے بجائے قریب آ گئی۔ میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر متوجہ کرتے ہوئے بولی۔ ”مجھے تمہارے منہ سے یہی لفظ اچھا لگتا ہے۔ بڑی آپی۔ اس لفظ کی مٹھاس اپنی جگہ مگر آج تمہاری آواز میں غصہ اور ناراضی ہے جو مجھے اچھی نہیں لگ رہی۔ تم مجھ سے کیوں ناراض ہو؟“

میں چشم زدن میں پلٹا۔ اُس کا ہاتھ جھٹک کر برہمی سے بولا۔ ”کہہ تو دیا ہے کہ تم میرے کمرے سے نکل جاؤ۔“ مجھے احساس تک نہ ہوا کہ میری آواز غیر معمولی بلند تھی۔ متصل کمروں میں آواز دیواریں عبور کر کے دوسرے کانوں تک فی الفور پہنچ جاتی ہے۔ ایسا ہی ہوا۔ ابھی وہ ہاتھ جوڑے میرے قریب بیڈ پر بیٹھی ہی تھی کہ دروازہ زوردار آواز کے ساتھ کھلا اور تایا جی دندناتے ہوئے اندر گھس آئے۔ کولہوں پر ہاتھ رکھ کر خشمگیں نظروں سے ہم دونوں کو باری باری گھورتے رہے، پھر بے حد درشتی سے بولے۔ ”مجھے تم سے اس بے غیرتی کی توقع نہیں تھی۔“

انہوں نے بجا طور پر مجھے مخاطب کیا تھا۔ میں نے بے حد تلخی سے جواب دیا۔ ”مجھ سے کسی کو توقع نہیں ہونی چاہیے مگر آپ کو یہ دیکھنا چاہیے کہ بڑی آپی میرے کمرے میں آئی ہے۔ ڈانٹنا ڈپٹنا ہے تو اس کا رُخ کیجیے۔“

تایا جی نے معاملہ فہمی کے بجائے چنگھاڑنے اور اپنا غصہ نکالنے پر سارا زور صرف کر دیا۔ ان کی بپھری ہوئی آواز نے پورے گھر کو جگا دیا۔ میں مجرم نہیں تھا مگر تایا جی کے غیر ذمے دارانہ رویے نے مجھے ہر نظر سے گرا دیا۔ تایا جی نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ میرے اَبا جی کو مخاطب کیا۔ ”دیکھ بھئی اصغر علی! پہلے میرا پروگرام صرف منگنی کا تھا۔ اب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ وسیم دو چار دن لاہور نہیں جائے گا اور اس دوران ان دونوں کا نکاح پڑھا دیا جائے گا۔“

تایا جی گھرانے کے سربراہ تھے۔ ان کے حکم کے مقابلے میں کسی میں تابِ انکار نہیں تھی۔ جملوں، نظروں اور کچوکوں کے تیروں سے سبھی باری باری مجھے زخمی کرتے ہوئے کمرے سے چلے گئے۔ ایک دم کمرے میں میرا دَم گھٹنے لگا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے ردِعمل پر تایا جی نے یہ منصوبہ بنایا تھا اور اپنے منصوبے میں رنگ بھرنے کے لیے انہوں نے مہرالنسا کو میرے کمرے میں بھیج دیا تھا۔ میرے دل میں مہرو اور تایا جی کے لیے نفرت کا ایسا شعلہ جل اُٹھا جسے بجھانا میرے بس سے باہر ہو گیا۔

مجھے گھر سے بھاگ جانا چاہیے تھا۔ دیدہ دلیری سے سب کی نظروں میں نظریں ڈال کر انکار کر دینا چاہیے تھا۔ میں لڑکی نہیں تھا جس کا زبردستی نکاح پڑھایا جا سکتا تھا مگر اگلے تین دن اور راتیں فیصلہ کرنے میں ناکام رہا۔ میں بزدل نہیں تھا کہ میرے ساتھ زبردستی کی جاتی مگر میرے انکار میں حائل ہونے والی میری دو بڑی بہنیں تھیں جو تایا جی کے بیٹوں سے بیاہی گئی تھیں۔ دونوں کے ہاں بچے بھی پیدا ہو چکے تھے۔ تائی نے واشگاف الفاظ میں مجھے باور کرا دیا تھا کہ اگر میں نے مہرو سے شادی نہ کی تو میری دونوں بہنیں کاغذ ہاتھ میں تھامے واپس آ جائیں گی۔ میرے ارمانوں کو بچانے والے ہی ارمان جلانے پر کمربستہ ہو گئے تھے تو میں کیا کر سکتا تھا۔ مجھے تایا جی کے مزاج کا بھی بخوبی علم تھا۔ وہ غصے میں اندھے ہو جایا کرتے تھے اس لیے سبھی اُن کے غصے سے ڈرتے تھے۔

پھر جب مجھے یقین ہو گیا کہ میرا انکار اس بھرے پرے خاندان کی بربادی کا سبب بن جائے گا، میں نے شکست تسلیم کر لی مگر اپنے اندر ہونے والی بے کراں شکست وریخت پر قابو نہ پا سکا۔ میرے نکاح میں میری 'ہاں' شامل

نہ ہو سکی۔ جس طرح کسی شرمیلی دلہن کی جگہ پر اس کی ماں یا باپ اقرار کرتا ہے، اسی طرح میری جگہ پر میری ماں نے نکاح کی اجازت دی۔ رات جب مجھے کزنز نے روایتی انداز میں میرے کمرے میں دھکیلا، مہر النسا سرخ عروسی غرارہ پھیلائے میرے بیڈ پر براجمان تھی۔ اس نے میری بے اعتنائی کو محو کرنے کے لیے پہلی رات بہت سی باتیں کیں۔ مجھ سے بار بار معافی مانگی۔ باور کرانے کی پوری کوشش کی کہ وہ کسی بدنیتی کی بنیاد پر نہیں بلکہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنی صفائی پیش کرنے کی غرض سے میرے کمرے میں آئی تھی۔ میری آواز بلند تھی جسے سن کر اس کا باپ میرے کمرے تک آن پہنچا تھا۔ میں خاموش لیٹا، اس کی سنتا رہا۔ وہ تھک کر رونے لگی۔ میں نے اُسے چپ کرانے کی کوشش نہیں کی اور کروٹ بدل کر سو گیا۔

یہ نہایت عجیب شادی تھی۔ وہ عورت تھی مگر دلہا تھی۔ میں مرد تھا اور دلہن تھا۔ وہ میری ناز برداریاں کرتی تھی۔ روٹھے ہوئے بچے کی طرح سنبھالتی تھی جبکہ میرے لبوں پر خاموشی چپک کر رہ گئی تھی۔ اس نے، پھر میرے والدین نے، پھر تمام گھرانے نے مجھے یونیورسٹی بھیجنے پر ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیا مگر وہ نہ تو میرے لبوں سے انکار سن پائے، نہ اقرار اور نہ میں نے بیگ اُٹھا کر کاندھے پر ڈالا۔ عجیب طرح کی سرد مہری اور بے رخی میرے رگ و پے میں سرایت کر گئی تھی۔

مہینا بھر کی لب بستگی کے بعد میں 'ہوں، ہاں' میں جواب دینے لگا تھا مگر گھر سے نکلنا موقوف رہا۔ مہرو مجھے ناشتا کرانے کے بعد روزانہ ڈیوٹی پر جاتی۔ واپسی پر بقیہ تمام وقت میری دل جوئی میں صرف کر دیتی مگر وہ مجھے شوہر نہ بنا پائی۔ اس کا رونا دھونا، منت سماجت کرنا سب اکارت چلا گیا۔ مہینا بھر کے بعد میرا جمود ٹوٹا مگر میرے معمولات میں کوئی فرق واقع نہ ہوا۔ خاندان والوں نے اپنی سی جحت کر دیکھی، پھر مجھے میرے حال پر چھوڑ کر پرے ہٹ گئے۔

یوں میری زندگی کمرے، قلم اور کاغذ تک محدود ہو کر رہ گئی۔ میرا تعلق معدوم حد تک مہرو سے جبکہ ادھورا مگر مسلسل رابطہ خطوط کی دنیا سے جڑ گیا۔ قلمی رابطوں کو میں نے اپنی بے اعتنائی اور بے رُخی کے ہتھیار سے سرحدوں کے پار محدود رکھا۔ مجھے بہت زیادہ جاننے والے بھی مجھ سے اتنا ہی دور تھے جتنا کہ مہرو۔ بھائیوں کی کوششوں سے میری پانچ چھ جگہوں پر تعیناتی ہوئی۔ اچھی نوکریاں تھیں مگر میں نے گھر سے باہر قدم نہیں رکھا۔ بڑا بھائی کاروبار کی دنیا کو اچھا خیال کرتا تھا۔ اس نے دو چار مرتبہ مجھے اچھے بزنس کی ترغیب دی، معاونت کا وعدہ کیا مگر میں نے اُسے بھی مایوس لوٹا دیا۔ آخر کار مہرو نے سبھی کو یہ کہہ کر مجھ سے مزید بے پروا کر دیا کہ وسیم کو نوکری کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟ میں جو ہوں۔

وہ ہر روز رات کو میرے بکھرے ہوئے کاغذات جمع کرتی۔ میری سرد نظروں سے بچتے ہوئے تمام تر اشعار کو ایک نوٹ بک پر منتقل کرتی۔ خطوط لفافوں میں ڈالتی اور اگلے دن ڈیوٹی پر جاتے ہوئے پوسٹ آفس میں دے آتی۔ گھر کے ایڈریس پر کئی رسائل اور جرائد آتے رہتے تھے جن میں میرا کلام شائع ہوتا تھا۔ مہرو نے ایک طرح سے میری شاعری پر بھی قبضہ کر لیا اور میں بے جان انداز میں اُس پر لد گیا۔ وہ اُٹھاتی، میں اُٹھ جاتا۔ وہ بٹھاتی، میں بیٹھ جاتا۔ وہ کھلاتی، میں کھا لیتا۔ یوں جیسے میری کوئی مرضی ہی نہ ہو...... میرا کوئی وجود ہی نہ ہو۔

شادی کے ڈیڑھ سال بعد جب میرا بیٹا علیم وسیم پیدا ہوا، تب وہ بہت خوش تھی۔ چاہتی تھی کہ میں بھی ہنسوں، خوشی مناؤں اور بیٹے کو اُٹھاؤں مگر میں صوفے پر بیٹھا لفظوں سے کھیلتا رہا۔ سال بھر بعد مہرو نے میرا پہلا مجموعۂ کلام شائع کرایا۔ خوشی خوشی پہلی کاپی گفٹ پیپر میں ملفوف کر کے دینے کے لیے لائی۔ میں کافی دیر تک گلاب کے پھول والے پیکٹ میں چھپے ہوئے مجموعۂ کلام کو جھولی میں رکھ کر بیٹھا رہا پھر بیزاری سے اُسے سائڈ ٹیبل کی طرف اُچھال دیا۔ تب پہلی مرتبہ اس کی آنکھیں کھو کھلی ہوئیں۔ ایک خوفناک خلا دکھائی دیا اور میرے دل کو ایک ذرا اطمینان ملا۔

بے حد سرد لہجے میں بولی۔ ”عجیب شاعر ہو، اپنے پہلے مجموعے کو دیکھنے کا شوق بھی نہیں رکھتے ہو۔“

”ہوں۔“ میں نے سر جھکا لیا۔ وہ سائڈ ٹیبل گھسیٹ کر میرے سامنے بیٹھ گئی۔ تھوڑی پر انگلی رکھ کر، میرا سر اوپر اُٹھا کر بولی۔ ”وسیم! آخر تم چاہتے کیا ہو؟“

میں نے اُسے خالی نظروں سے گھورا اور شادی کے بعد پہلا جملہ بولا۔ ”کچھ بھی نہیں۔“

”زندگی کیسے گزرے گی؟“ اس کی آواز بے حد سرد ہو گئی تھی۔

”خود بخود۔“

”میرا قصور کیا ہے؟“ وہ براہ راست میری آنکھوں میں جھانک رہی تھی، تب نجانے کیا ہوا کہ میرا دل بھر آیا۔ اس کا چہرہ دھندلا گیا اور نہایت خاموشی سے میرے آنسو بہنے لگے۔ وہ ہکا بکا بیٹھی مجھے دیکھتی رہی۔ شاید وہ چاہتی تھی

کہ میرا غم و غصہ آنسوؤں میں پگھل کر نکل جائے اور میں نارمل ہو جاؤں مگر یہ اس کی بھول تھی۔ میں اپنی قسمت پر رو رہا تھا۔ قسمت پر رونے والے کا غبار دل بھی ختم نہیں ہوتا۔

وہ شیشے کی میز پر بیٹھی تھی۔ اُسے پیچھے دھکیل کر میرے پیروں میں بیٹھ گئی۔ دونوں پیر تھام کر گڑگڑائی۔ ”وسیم! میں بہت بُری ہوں۔ بد صورت ہوں۔ کالی ہوں۔ موٹی ہوں۔ عمر میں بڑی ہوں۔ تمہارے ساتھ بیٹھتی ہوں تو بیوی نہیں، ماں لگتی ہوں مگر تمہیں کیوں یقین نہیں آتا کہ میرے سینے میں بھی دل ہے۔ میرے سر پر قرآن رکھ دو، بھلے بیٹے کے سر پر ہاتھ رکھوا لو، سچ کہتی ہوں کہ تمہاری طرح میں بھی اس شادی کو اچھا نہیں سمجھتی ہوں۔ یہ بے جوڑ ہے۔ تم پر ظلم ہے مگر......“

اس کی آواز رُندھ گئی۔ ہچکیاں لیتی رہی، پھر بولی۔ ”ہاں وسیم! تم بہت خوب صورت ہو۔ جانتی ہوں کہ تمہاری شوخ آنکھوں میں کتنے خواب سجے ہوئے تھے۔ چاندی دلہن تمہارے سپنوں کی رانی تھی۔ وہ...... جو شاعری کرتی ہو، سمجھتی ہو۔ تم اُسے جہاں لے کر جاؤ، لوگ اُسے پلٹ پلٹ کر دیکھنے پر مجبور ہو جاتے ہوں۔ ہے ناں؟ پر میں ایسی نہیں ہوں۔“ وہ تھوڑے توقف کے بعد دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے سلسلۂ کلام جوڑنے لگی۔ ”تم چمکتی ہوئی کار اور لزیٹڈ پوسٹ کی آرزو کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے، تم نے کہا تھا کہ کالے رنگ کی ٹنٹڈ گلاس والی نئی کار ہو، تمہاری دلہن نے گہرے نیلے ویلوٹ کا سوٹ پہنا ہو، تم نے سیاہ پینٹ اور سرخ شرٹ...... اور اس شان سے ہنی مون پر جانا چاہتے تھا ناں تم؟...... تاکہ جو بھی تم لوگوں کو دیکھے، دانتوں میں انگلی کاٹ لے اور بے اختیار 'ماشاءاللہ' کہہ کر دل تھام لے...... پھر ایک مرتبہ تم نے سب کزنز کو بتایا تھا کہ تمہاری زندگی کا سب سے بڑا خواب ایک خوبصورت اور بڑی سرکولیشن والے میگزین کی اشاعت ہے۔ کہا تھا ناں؟...... بڑی سی ٹیبل، کارپٹڈ آفس اور ریوالونگ چیئر...... تم چیف ایڈیٹر...... تمہاری ہاتھ لگانے سے میلی ہونے والی بیوی اس میگزین کی ایڈیٹر...... کمپیوٹر پر بیٹھ کر تم سے ڈکٹیشن لیتی ہوئی...... تم ایسے اُس کی کرسی کے عقب میں جا ٹھہرو اور اسے باہوں میں بھر کر ڈانٹو...... اوئے یار! اُردو نہیں آتی کیا؟ اداریے کا کلائمکس ہی برباد کر کے رکھ دیا ہے تم نے...... ہے ناں؟ یہی الفاظ تھے ناں تمہارے؟ یہی خواب تھے ناں تمہارے؟...... ہائے! مجھے علم ہے کہ تمہارے خواب کے کسی کونے کھدرے میں مہرو کا وجود ناقابل برداشت تھا۔ مگر میرا کوئی قصور نہیں...... خدا کی قسم...... پر ٹھیک ہے۔ مجھ سے مت بولا کرو۔ اپنے بیٹے کو تو اُٹھا کر جھولی میں ڈال لو۔ وہ تو تمہاری تخلیق ہے۔“

میری بھیگی آنکھوں میں جب بھی امید کی کوئی رمق پیدا نہیں ہوئی تو وہ اُٹھ کر بیڈ کی طرف چل دی۔ پیڈل مارنے کے سے انداز میں ٹانگیں چلاتے ہوئے علیم پر جھک گئی۔ اس کا فیڈر منہ سے نکل کر گدے پر لڑھک گیا تھا۔ اس کے پاس بیٹھ کر اسی سے باتیں کرنے لگی۔ ”کاکے! تمہارے پاپا کا دل پتھر کا ہے۔ پتھر کے کان، پتھر کی زبان، پتھر کی آنکھیں۔ تبھی وہ کچھ سنتا نہیں، بولتا نہیں، دیکھتا نہیں۔ تم جلدی سے بڑے ہو جاؤ اور اپنے پاپا کے کان کھینچنا۔“

شام کو اُس نے علیم کے ننھے ننھے ہاتھ دعا مانگنے کے انداز میں جوڑ دیے، بولی۔ ”کاکے! پیارے پیارے لبوں سے دعا مانگو، اللہ میاں! میرے پاپا کا دل گلاب کی طرح نرم کر دے۔“

وہ مجھے جذباتی چرکے لگا لگا کر بھی تھک گئی تو ہمارے درمیان ایک بے عنوان مفاہمت پیدا ہو گئی۔ میں اس کے اکثر سوالوں کا جواب ہوں، ہاں یا آنکھ کے بدلے ہوئے تاثر سے دیا کرتا تھا۔ وہ میرے کنایے سمجھنے لگی تھی۔ علیم وسیم کے بعد نعیم وسیم پیدا ہوا۔ دوسرے بچے کی پیدائش میں کوئی پیچیدگی پیدا ہو جانے کی بدولت اُسے اسپتال لے جانا پڑا۔ یہ فریضہ بھی میرے بھائیوں اور تایا جی نے سرانجام دیا۔ نارمل ڈلیوری نہ ہونے کی بدولت اسے بڑے آپریشن کے عذاب سے گزرنا پڑا۔ جب نعیم وسیم اور مہرو کو میرے کمرے میں پہنچایا گیا، تب وہ خاصی لاغر تھی مگر ممتا کی نور سے دمک رہی تھی۔ میں نے حسب عادت اس کی عیادت کی نہ بچے کو دیکھنے میں دلچسپی لی۔ اس نے از خود بچہ میری گود میں رکھا، پھر مایوس ہو کر اُٹھا لیا۔ آپریشن کے بعد آٹھ دس ماہ بیمار رہی۔ علاج کرواتی رہی۔ تب ایک دن بڑے مایوسانہ انداز میں بولی۔ ”وسیم! ڈاکٹرز کہتے ہیں کہ میں آئندہ ماں نہیں بن سکوں گی۔“

میں نے اُسے دیکھے بغیر کہا۔ ”ہوں۔ ٹھیک ہے۔“

وہ کراہی۔ ”کیا ٹھیک ہے؟ یہی ناں کہ میں آئندہ ماں نہیں بن سکوں گی۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے وسیم؟ خدا کے لیے خود کو بدلو۔ زندگی ایک بار ملتی ہے۔ جاؤ، میں اچھی نہیں لگتی، نہ سہی...... دنیا میں اور تو بہت سی لڑکیاں موجود ہیں۔ تمہیں جو پسند آتی ہے، بیاہ لاؤ۔ نہیں...... بلکہ مجھے آ کر بتاؤ۔ میں اُسے اپنے ہاتھوں سے دلہن بنا کر حویلی میں لاؤں گی۔ پھر دیکھوں گی کون میرا راستہ روکتا ہے...... پر خدا کے لیے مجھے

وہ وسیم لوٹا دو جسے میں شادی سے پہلے دیکھا کرتی تھی۔ شوخ، نٹ کھٹ...... ہر وقت بولنے والا، زبردستی شعر سنانے والا...... زبردستی داد وصول کرنے والا۔ ہائے اللہ! مجھے کس گناہ کی سزا مل رہی ہے۔ میں کیا کروں؟"

اس دن وہ اتنے دل دوز انداز میں پھوٹ پھوٹ کر روئی کہ میرا دل بھی بھر آیا مگر میں خواہش کے باوجود اسے کوئی دلاسا دے سکا نہ آنکھوں ہی سے...... امید کی کوئی جوت اس کی گود میں ڈال سکا۔

اَباجی ہر شام کو سونے سے پہلے میری خواب گاہ میں آیا کرتے تھے۔ چند ادھر اُدھر کی باتیں کرتے۔ میری بیزاری پر دل گرفتہ ہو جاتے اور میری پیشانی چوم کر کمرے سے نکل جاتے۔ ماں اور بہنوں نے ابتدا میں تو آسمان سر پر اُٹھایا مگر پھر مجھے نظرانداز کرنا شروع کر دیا۔ پہلے پہل میری خاموشی کی چادر سب کو غیر فطری لگی بعد میں معمول کا حصہ بن گئی۔ حویلی پر عجیب سی سوگواری مسلط رہتی مگر رفتہ رفتہ حویلی کی رونقیں لوٹ آئیں۔ شام کی چاندنی میں صحن میں جمنے والی محفل سے شگوفے پھوٹنے لگے۔ لیکن میرے دل میں کبھی یہ خواہش پیدا نہیں ہوتی تھی کہ میں اُٹھ کر ایک نظر دیکھ ہی لوں۔

ایک ایک دن کر کے دس سال کا طویل عرصہ بیت گیا۔ اس دوران حویلی میں چار شادیاں سرانجام پائیں، دو جنازے اُٹھے مگر میں ذہنی طور پر کسی دکھ سکھ میں شامل نہ ہوا۔ ایک طرف مہرو کی وجہ سے قومی شہرت کے سفر پر گامزن تھا تو دوسری طرف مجھے خاندان بھر نے پاگل اور نفسیاتی مریض قرار دے کر نظرانداز کرنا شروع کر دیا تھا۔

ایک مہرو کا دم تھا جو ابھی تک شکست تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھا۔ وہ ہر صبح میری نظروں کے سامنے تیار ہو کر میری ڈاک اُٹھاتی، آفس جاتی اور واپسی پر بچوں کے امور میں اُلجھ جاتی یا میرے بکھرے ہوئے اوراق سنبھالنے لگتی۔ اس کی اکاؤنٹس کی جاب نے اُسے بڑا پریکٹیکل کر دیا تھا۔ میں شاعری پڑھنے اور اپنے خیالات کو شعروں میں ڈھالنے میں رات گئے تک مصروف رہتا جبکہ وہ اعداد و شمار میں اُلجھی رہتی۔ نہ مجھے اس کے معمولات میں دلچسپی ہوئی، نہ میں نے دریافت کیا۔ جہاں اُسے آڈیٹر کی پوسٹ پر پروموٹ کر دیا گیا وہاں وہ آپریشن کے بعد پہلے سے بھی زیادہ فربہ ہو گئی تھی۔ مٹاپے کی وجہ سے بس کے سفر سے نالاں رہتی تھی۔ تنگ آ کر اس نے ایک سیکنڈ ہینڈ شیراڈ کار خرید لی۔ تھوڑے ہی عرصے میں اس نے ڈرائیونگ پر مہارت حاصل کر لی اور یوں اُسے بس کے تکلیف دہ سفر سے نجات مل گئی۔

چھ ماہ پر محیط ایسا دورانیہ بھی گزرا جس میں میری ماں نے گھر میں ہنگامہ کھڑا کیے رکھا۔ وہ مہرو کے ایما پر میری دوسری شادی کرنا چاہتی تھی۔ اس نے دو چار لڑکیاں بھی دیکھ لیں مگر میری طرف سے 'اوکے' کا سگنل نشر نہ ہو سکا۔ آخر کار دونوں کو ہتھیار ڈالنا پڑے۔

شادی کے بارہویں سال حویلی پر وچھوڑے کا آسیب وارد ہو گیا۔ چند اختلافات اس قدر شدید نوعیت اختیار کر گئے کہ بڑوں نے بیٹھ کر خاندانی بٹوارے کا فیصلہ کر لیا۔ انہوں نے تمام اثاثہ جات اور رقم حصہ وار تقسیم کر دی۔ میرے بڑے بھائی نے پولٹری فیڈز کا کاروبار کر لیا تھا۔ کاروبار خوب چل نکلا۔ تبھی اس نے اچھی خاصی پراپرٹی بنا لی تھی۔ جب خاندانی اثاثے تقسیم کیے گئے، اس نے اپنا حصہ فراخ دلی سے مجھے دے دیا۔ اَباجی نے کسی دور میں اوکاڑہ کے قریب ایک ایکڑ زرعی رقبہ خریدا تھا۔ چونکہ اَباجی سمیت کسی بھی شخص کو اس خطۂ زمین سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، اس لیے جب انہوں نے وہ ایکڑ مہرو کو دینے کا اعلان کیا تو کسی نے بھی اعتراض نہ کیا۔

اَباجی کے بچپن کا ایک دوست اکرم علی اوکاڑہ میں رہتا تھا۔ وہ ایک مرتبہ حالات کی تنگی سے گھبرا کر اَباجی کے پاس آیا اور کچھ رقم اُدھار چاہی۔ اَباجی نے اُسے وہ رقم بلاتامل دے دی۔ وعدے کے مطابق وہ لوٹا نہ سکا تو اَباجی نے استفسار کرنا مناسب نہ سمجھا۔ سال بھر بعد وہ ہمارے گھر آیا۔ اَباجی سے کہنے لگا کہ وہ رقم لوٹانے کے قابل نہیں ہے۔ اس لیے اپنے چھ ایکڑ رقبہ سے ایک ایکڑ اَباجی کو دے کر اپنا حساب بے باق کرنا چاہتا ہے۔ اَباجی نے مناسب نہ سمجھا اور اچھے وقت کا انتظار کرنے کا مشورہ دیا مگر اکرم علی نے اوکاڑہ جاتے ہی اَباجی کے نام ایک ایکڑ رقبہ منتقل کرا دیا۔ اگلی مرتبہ جب وہ ملنے کے لیے آیا تو زمین کے کاغذات بھی ساتھ لایا۔ اَباجی، یا خاندان کا کوئی بھی شخص زندگی بھر اوکاڑہ گیا نہ اپنا رقبہ سنبھالا۔ یوں اُسے بے توقیر جائداد سمجھ کر مہرو کی جھولی میں ڈال دیا گیا۔

چند دنوں میں ہم چنیوٹ شہر میں اپنے گھر میں منتقل ہو گئے۔ مجھے اچانک حویلی کے شور شرابے سے چھٹکارا مل گیا تھا، تبھی مجھے اطمینان اور ایک طرح سے تحفظ کا احساس ملا۔ یوں میں بیٹھے بٹھائے امیر ہو گیا مگر مجھے یہ سب بے معانی لگا۔ تبھی میں نے کسی کا شکریہ ادا کیا نہ خوشی کا اظہار کیا۔

کچھ دنوں بعد مہرو دفتر سے چھٹیاں لے کر علیم کے ساتھ اوکاڑہ گئی۔ کرم علی کے ہاں تین چار دن رہی۔ واپسی پر اس

کا چہرہ خوشی سے جگمگا رہا تھا۔ رات کو برابر میں لیٹ کر بتانے لگی۔ "وسیم! کیا تمہیں اوکاڑہ والی زمین کی مالیت کا علم ہے؟" اس کی آواز میں غیر معمولی ارتعاش شامل تھا۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ جوش سے اُٹھ بیٹھی اور قدرے رازدارانہ انداز میں بولنے لگی۔ "اکرم علی کا رقبہ نئی بننے والی بڑی شاہراہ کے کنارے پر تھا۔ قیمت ایک دم دھند کی طرح اوپر اُٹھ گئی۔ انہوں نے اپنا تمام رقبہ فروخت کر دیا ہے۔ اب وہاں صرف ہمارا رقبہ پڑا ہے۔ نئے بننے والے شہر کا دل، کمرشل ایریا...... دائیں ہاتھ جدید طرز کی ہاؤسنگ سوسائٹی، بائیں ہاتھ ملک پراسیسنگ پلانٹ جبکہ عقب میں پورا شہر......" اس کی آنکھیں پوری وسعت میں پھیلی ہوئی تھیں۔ "اگر ہم وہ رقبہ آنکھیں بند کر کے پھینک بھی دیں، تب بھی کم و بیش ستر اَسی لاکھ دے جائے گا۔"

میں نے ہونٹ سکیڑے، آنکھیں بند کیں اور ہنکارا بھر کر کروٹ بدل گیا۔

حویلی سے نکل کر شہر میں آن بسنے سے میرے مزاج میں کوئی تبدیلی رونما نہ ہوئی تھی اور نہ ہی میں کسی کی کمی کو محسوس کرتا تھا مگر وہ شدید نوعیت کی تنہائی کا شکار ہو گئی۔ اس کی مصروفیات میں اچانک بے تحاشا اضافہ ہو گیا تھا۔ بچے بڑے ہو گئے تھے۔ ان کی تعلیمی مصروفیات بڑھ گئی تھیں۔ چونکہ بچوں نے پیدا ہوتے ہی مجھے خاموش اور تارک دنیا دیکھا تھا، اس لیے وہ میرے بارے میں زیادہ متفکر نہیں ہوتے تھے۔ مہرو نے اپنی سروس کے آخری سال ایل پی آر لے لی۔ ایک شام جب میں چائے پی رہا تھا، وہ میرے پاس آ بیٹھی۔ اس نے استدعا کی کہ میں اپنی پراپرٹی کا مختار نامہ اس کے نام لکھ دوں۔ اُس کی آنکھیں پھیل گئیں جب میں نے نہایت بے رغبتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے 'اچھا' کہہ کر چائے کا کپ لبوں سے لگا لیا۔

وہ بے اختیار بولی۔ "کیا تمہیں اتنی قیمتی جائداد میں بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے؟"

میں نے انکار میں سر ہلایا۔ وہ استعجاب آمیز نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔ پھر میرا ہاتھ تھام کر بولی۔ "کیا تمہیں اس کی پروا بھی نہیں کہ میں تمہاری ساری جائداد بیچ کر ضائع کر دوں؟"

میں نے کپ میز پر رکھتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "نہیں۔"

"میرا غلط اقدام تمہیں قلاش کر سکتا ہے؟" وہ تیکھے لہجے میں گویا ہوئی۔

میں نے اُسے دیکھا۔ گویا بتایا کہ میں تو پہلے ہی قلاش ہوں۔ گھر کے دیوالیہ ہونے کا میری صحت پر کوئی فرق نہیں

پڑے گا۔ وہ شاید میرے دل سے نکلنے والے بے صوتی جملے سمجھ گئی۔ شکوہ بھری نگاہ ڈال کر اُٹھ گئی۔ وہ اُس دن بڑی ملول اور نڈھال دکھائی دے رہی تھی جس دن میں نے اس کے ایک بار کہنے پر ہی بے نیازی سے مختیارنامے کی دستاویز پر دستخط کر دیے اور یہ تک نہ پوچھا کہ وہ کیا کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ مجھے بہت کچھ بتانا چاہتی تھی مگر میری عدم دلچسپی کے سبب شکست خوردہ انداز میں سر جھکا کر خاموش ہو گئی۔

وہ مجھے ماں کی تحویل میں دے کر دونوں بچوں اور اپنے چھوٹے بھائی کو لے کر اوکاڑہ گئی۔ مجھے بتا کر گئی تھی کہ کم و بیش دس دنوں بعد لوٹے گی۔ دس دن تک ماں میرے ساتھ رہی۔ اپنی عادت کے مطابق بولتی رہتی۔ ”تو نے میرا بہت دل دکھایا ہے۔ مجھے جیتے جی درگور کر رکھا ہے۔ ہم سب نے سوچا تھا کہ تو چند دن غصہ کرے گا پھر آپوں آپ مان جائے گا۔ پہلے بھی تو ایسا ہی کرتا تھا ناں تو؟...... کیا ہوا جو مہرو تم سے دس سال بڑی ہے۔ خاندانوں میں ایسی شادیاں ہوتی ہی رہتی ہیں۔ کتنی بڑی دنیا ہے۔ تو کہیں باہر کے ملک چلا جاتا۔ جس میم پر تیرا دل آتا، اس سے شادی کر لیتا۔ مذہب بھی چار شادیوں کی اجازت دیتا ہے۔“

ماں میری نظروں کے کھوکھلے پن سے ڈر گئی۔ میرا سر اپنی گود میں رکھ کر رونے لگی۔ بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے دعائیں مانگنے لگی۔ بتانے لگی۔ ”مہرو دیکھنے میں کوجھی ہے پر دل کی میلی نہیں ہے۔ وہ رات دن تیرے بارے پریشان رہتی ہے۔ چاہتی ہے کہ تیرے ہونٹ جو مسکرانا بھول گئے ہیں، پھر سے جاگ پڑیں۔ تیری آنکھوں کی وحشت ختم ہو جائے۔“

میں نے کروٹ بدل کر چہرہ ماں کی گود میں چھپا لیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری آنکھوں کی نمی اس پر آشکار ہو جائے اور مزید غم بار ہو۔ میرا یکبارگی جی چاہا کہ میں چیخ چیخ کر روؤں اور پوری دنیا کو اپنے اطراف اکٹھا کر لوں۔ سب کو بتاؤں کہ دنیا والو میری اِتر ویپنگ پر مت ہنسو۔ میرے ماں باپ کو دیکھو۔ میرے خونی رشتہ داروں کو دیکھو جنہوں نے مجھے اپنی ضد پر قربان کر دیا۔ مجھ سے میرے سپنے، مسکراہٹ، شوخی، رومان اور مستقبل کی طلب...... سب کچھ چھین لیا۔ آج بھی وہ میرے رویے کو بے جا قرار دیتے ہوئے مجھے ہی بدل جانے کا مشورہ دیتے ہیں۔

بڑے عرصے بعد میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ ماں سے اس کی سرگرمیوں کے بارے میں استفسار کروں۔ پوچھوں کہ مجھے زندہ کرنے کے لیے کیا کرنے کا ارادہ رکھتی ہے مگر خاموش رہنے کی عادت بہت پختہ ہو گئی تھی۔ جبھی تو خاموشی سے آنسو بہاتا رہا۔

بچوں کے ماں کے ساتھ جانے کی وجہ سے گھر کی فضا پہلے سے بھی زیادہ خاموش اور پرسکون ہو گئی اور میں دل ہی دل میں اس کے نہ آنے کی دعائیں مانگتا رہا مگر عین دسویں دن میری دعائیں بے مراد ثابت ہوئیں اور اس کا خوشی سے دمکتا ہوا چہرہ میرے سامنے سج گیا۔ رات کو جب بچے اپنی دادی کے ساتھ سو گئے تو وہ میرے پاس آ بیٹھی، مسرت سے لبریز آواز میں بولی۔ ”وسیم! میں آج بہت خوش ہوں۔ جانتے ہو کیوں؟“

میں نے سپاٹ نگاہوں سے اُسے دیکھا، وہ بولی۔ ”اس لیے کہ میں وہ تمام خواب خریدنے کے قابل ہو گئی ہوں جو تمہاری آنکھوں نے دیکھے تھے۔ مجھے خدا یہ طاقت پہلے دے دیتا یا مجھے باغی بنا دیتا اور میں اپنے والدین کے فیصلے پر بزدلانہ انداز میں سرِ تسلیم خم نہ کرتی۔ مگر خیر! جو ہونا تھا، ہو گیا، اب اس کا کیا تذکرہ؟...... میں نے اوکاڑہ والی زمین بہت اچھے بھاؤ پر فروخت کر دی ہے۔ بہت بڑی رقم لے کر میں ان خوابوں کی تلاش میں نکلی جن کو نہ پا کر تمہاری آنکھیں دیکھنا بھول گئی تھیں۔ میں نے آدھی شاپنگ کر لی۔ آدھی رہ گئی ہے۔ وہ بھی ریٹائرمنٹ تک کر لوں گی۔ جب تمہارے خواب تمہاری مٹھی میں جگنو کی طرح جگمگانے لگیں گے، تب تو مسکراؤ گے ناں؟“

میں اُسے بڑے صبر و تحمل سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے بدنما چہرے پر کئی رنگ جھلملا رہے تھے۔ میں نے جب اُس کی بات کا جواب نہیں دیا تو تضحیک کو جھیلنے کا موہوم سا عکس چہرے کی جھریوں پر ایک ذرا دیر کو لرزا پھر معدوم ہو گیا۔ سر جھکا کر بولی۔ ”وہ لوگ کتنے خوش بخت ہوتے ہیں جو ایک وقت میں بیسیوں آدمیوں کو راضی کر لیتے ہیں۔ شاید میں بدصورت ہونے کے ساتھ ساتھ خاصی بدقسمت بھی ہوں کہ چودہ برس میں ایک شخص کو راضی نہ کر سکی۔ مسکرانے پر مجبور نہ کر سکی۔“ اس کے لبوں سے ایک دکھ بھری آہ خارج ہوئی اور بھیگی بھیگی آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے بیڈ کے دوسرے سرے پر چلی گئی۔

میں اس کی ذہانت کا دل ہی دل میں معترف تھا۔ اس نے کبھی اپنے آفیسرز کو شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔ میری ہزاراں کہی باتیں سن اور سمجھ لی تھیں۔ تبھی میرے دل میں تجسس پیدا ہو گیا تھا کہ اب وہ ایسا کیا کرنے چلی تھی کہ اُسے یقین تھا کہ اپنے خودساختہ خول سے نکلنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔

وہ ریٹائرمنٹ لینے تک چار پانچ مرتبہ میری ماں کو میرے پاس ٹھہرا کر اسلام آباد گئی تھی۔ کبھی دو چار دن تو کبھی دس دنوں تک وہیں مقیم رہی۔ پھر جونہی اسے واجبات ملے، اُس نے ہنگامی طور پر اسلام آباد شفٹ ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کام میں اس کے بڑے بھائی نے معاونت کی اور ہماری مختصر سی فیملی کو اسلام آباد منتقل کر دیا۔

یہاں پہنچنے تک میں خاموش تماشائی بنا رہا مگر جونہی میں نے اپنا بنگلا اور غیر معمولی خوب صورت لوکیشن دیکھی، مجھے خود پر سے ضبط و تحمل کی بھاری سل ہٹتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں نے اپنی خواب گاہ کی عقبی کھڑکی میں کھڑے ہو کر بے اختیار کہا تھا۔ ”واؤ...... کتنا پیارا لینڈ اسکیپ ہے یہ!“

مہرو نے میری بات سن لی تھی۔ خوشی سے جھوم اُٹھی، بولی۔ ”تھینکس گاڈ!“

تب مجھے سمجھ آئی کہ وہ ماحول کی تبدیلی کے ذریعے مجھے بدلنا چاہتی تھی۔ مگر وہ بھول گئی تھی کہ میرا خواب صرف خوب صورت ماحول کا حصول نہیں تھا بلکہ میری ترجیحات مختلف تھیں۔

چند دن وہ بے حد مصروف رہی جبکہ میں علی الصباح گھر سے اترائی کی جانب نکل جاتا۔ گھر سے کچھ فاصلے پر موجود بڑی ہوئی چٹان پر بیٹھ جاتا اور تاحدِ نگاہ پھیلی ہوئی چھوٹی بڑی پہاڑیوں کو دیکھتا رہتا۔ نجانے میری آنکھوں میں کتنی بڑی پیاس کی جھیل ٹھہری ہوئی تھی کہ گھنٹوں دیکھنے پر بھی ان مناظر سے دل اکتاتا نہیں تھا۔ جب وہ بنگلے کی تزئین و آرائش سے فارغ ہو گئی تو اس نے ایک چمکتی صبح میں سرخ رنگ کی فائل میری جھولی میں رکھ دی، بولی۔ ”وسیم! میں نے جو بیچا، جو خریدا، سب تفصیل اس میں درج ہے۔ دیکھ لو۔“

میں نے فائل پر دونوں ہاتھ ایک دوسرے میں پھنسا کر رکھ دیے اور ایک کنال رقبے پر مشتمل رنگا رنگ لان کے ایک شرارتی پودے پر نظریں جما دیں۔ وہ قد میں بڑا تھا۔ دوسروں کی نسبت زیادہ جھوم رہا تھا۔ انسانوں کی طرح کئی پودے بھی بہت شوخ واقع ہوتے ہیں۔

”وسیم! میرا دل رکھنے کو ہی دیکھ لو۔ میں نے بڑی محنت سے یہ گوشوارہ مرتب کیا ہے۔“

میں نے تب بھی فائل نہیں کھولی تو اس کا چہرہ تاریک ہو گیا، بولی۔ ”ٹھیک ہے۔ نہ دیکھو۔ میں بولتی جاتی ہوں۔ بھلے نہ سنو۔ میں نے پچاسی لاکھ میں اوکاڑہ والی زمین بیچی تھی۔ چھ لاکھ میں چنیوٹ والی زمین، سات لاکھ روپے میرے واجبات بنے جبکہ تین لاکھ روپے میں نے دورانِ ملازمت پس انداز کر رکھے تھے۔ یہ کل ملا کر ایک سو ایک لاکھ بنے۔“

اس نے میرے ہاتھوں کے نیچے دبی ہوئی فائل نکال کر کھول لی، بتانے لگی۔ ”میں نے پچپن لاکھ میں یہ بنگلا خریدا، بیس لاکھ کی دو دکانیں، دس لاکھ کا ایک چھوٹا سا پلاٹ جو میں نے ایک فون کمپنی کو لیز پر دیا ہے۔ باقی رقم اپنے اکاؤنٹ میں رکھ چھوڑی ہے۔ وہ بھی جلد خرچ کر دوں گی۔ رہی ماہانہ آمدنی جس پر گھر چلے گا، اس کا بندوبست بھی ہو گیا ہے۔ کرایوں کی مد میں ہمیں تیس ہزار روپے ملا کریں گے اور میری پنشن دس ہزار بنی ہے۔ چالیس ہزار میں ہم بہ آسانی گزر کر سکتے ہیں۔“ اسے احساس تھا کہ میں اس کی باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا، اس کے باوجود وہ بڑے اہتمام سے اپنی کارگزاری سے مطلع کر رہی تھی۔

تبھی مجھے یاد آیا کہ اس نے میرے پانچ مجموعۂ کلام شائع کرائے تھے جنہیں میں نے ایک نظر دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کی تھی۔ یکبارگی میرے دل میں اپنی کتابوں کو دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ چاہا کہ اُسے کہوں، کتابیں لا کر مجھے دکھاؤ، مگر بول نہ سکا۔ میری آنکھیں شاید بول پڑی تھیں، مہرو نے جلدی سے کہا۔ ”ہاں وسیم! میں نے پانچ گفٹ پیک سنبھال رکھے ہیں جو تمہیں پیش کرنے کی آرزو رکھتی ہوں مگر تب، جب تم نارمل ہو جاؤ گے۔“

میں نے ہونٹ بھینچ لیے۔ وہ بہت دیر باتیں کرتی رہی۔ اس کا معمول تھا کہ وہ دن میں جو بھی کرتی، شام کو میرے گوش گزار کرتی۔ اس نے اپنی عادت کے مطابق میگزین کی فائل تیار کی۔ میری شاعری سے کئی نام منتخب کیے اور این او سی کے لیے اپلائی کر دیا۔ اس نے اپنے طور پر میگزین کے اجرا کے لیے معلومات حاصل کر لیں۔ پھر مقامی اخبارات میں ایڈیٹر کی آسامی پُر کرنے کے لیے اشتہار دیا۔ چونکہ اُس کا خیال تھا کہ عورتیں مردوں سے کہیں زیادہ ذمے داری کا مظاہرہ کرتی ہیں، اس لیے اس نے اشتہار میں ’صرف خواتین امیدوار رجوع کریں‘ کا جملہ لکھوا دیا۔

اس دوران مجھ میں یہ تبدیلی رونما ہوئی کہ میں اس کے سوالوں کے جواب کے لیے لفظوں اور موہوم اشاروں کی دنیا سے نکل کر جملوں کا سہارا لینے لگا تھا۔ میں نے دیکھا تھا کہ اس معمولی سے تغیر نے گھر کا ماحول ایک دم بدل دیا۔ میرے کم گو بیٹوں، علیم وسیم اور نعیم وسیم کی زبانیں تیز گام ہو گئیں۔ مہر النسا کی حرکات و سکنات میں برق تعجیل ہو گئی۔ اس کے غیر معمولی فربہ اعضا میں جوانی کی مستعدی کھل گئی اور وہ سولھویں سن میں جا کھڑی ہوئی۔ یہاں پہنچنے کے دسویں دن اُس نے مجھے میرے آراستہ آفس میں لے جا

کر بٹھا دیا تھا جہاں مریم ماہ وش جیسی بجلی میری آنکھوں کو خیرہ کرنے کے لیے منتظر تھی۔

بلاشبہ مہرو بہت مضبوط اعصاب کی مالک تھی۔ اُس نے مجھے موم کرنے کے لیے بہت بڑی پلاننگ کی تھی جو کامیاب بھی رہی تھی مگر اُسے کیا خبر تھی کہ مریم ماہ وش کا وجود فساد کا پیش خیمہ ثابت ہوگا اور اس کی تمام تر محنت ایک دم اکارت چلی جائے گی۔

میرا سر دُکھنے لگا۔ میں بیڈ پر اُٹھ بیٹھا۔ سانسوں کی تال پر اوپر نیچے ہوتی ہوئی مہرو کے بنجر بدن کو بے تاثر آنکھوں سے دیکھا اور آہ بھر کر، سر تھام کر بیٹھ رہا۔ میں زندگی کی طرح عشق کی بازی ہار چکا تھا۔ اپنے خوابوں کی طرح مریم ماہ وش کو کھو چکا تھا۔

میں شال اوڑھے سرد کھڑکی میں آن کھڑا ہوا۔ سردی کا احساس مٹ گیا تھا اور گرمی کی طلب آخری سانسیں لے چکی تھی۔

☆☆☆

مہرو مجھ سے پہلے بیدار ہو چکی تھی۔ جب میں جاگا تو وہ بیڈروم کے اُلٹے ہاتھ واقع کمروں میں چکراتی پھر رہی تھی۔ ان کمروں کو میں نے اَب تک مقفل پایا تھا۔ اس نے ناشتے کے دوران مجھ سے باتیں کرنے کی کوشش کی مگر غیر معمولی سرد مہری اور میرا دل شکن ردِعمل دیکھ کر بجھ کر خاموش ہو گئی۔ ڈائننگ ٹیبل چھوڑتے ہوئے عام سے انداز میں مستفسر ہوئی۔ ”کیا تم پھر 'ہاں' اور 'ہوں' میں جواب دیا کرو گے؟“

میں نے رُخ پھیر لیا۔ اُس پر باور کر دیا کہ اُس کے حصے کے یہ دو لفظ بھی ختم ہو چکے ہیں۔ اس نے ایک سرد آہ بھری اور گراؤنڈ فلور پر چلی گئی۔ گیارہ بجے اُس نے میرا ہاتھ تھاما۔ اپنی سابقہ روش پر چلتے ہوئے باتھ روم میں دھکیلا۔ پھر مجھے ایک نیا لباس پہنایا۔ خود بھی تیار ہوئی۔ پارکنگ میں لائی اور بولی۔ ”ہم اسلام آباد جا رہے ہیں۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو اُس نے کندھے اُچکائے۔ شیراڈ نکالی۔ مجھے بٹھایا۔ عبدالکریم کہیں دکھائی نہیں دیا۔ شاید وہ کسی کام سے گیا ہوا تھا یا پچھلے لان کی صفائی ستھرائی میں مصروف تھا۔ میں تب چونکا جب مجھے محسوس ہوا کہ شیراڈ کا رُخ مسز فردوس کی کوٹھی کی طرف تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ میں نے اُس سے دریافت نہیں کیا تھا۔

ہمیں مسز فردوس کی کوٹھی کے گیٹ پر رُکا نہیں گیا تو بھی میں چونکا۔ تیسرا جھٹکا تب لگا، جب مسز فردوس نے بڑے والہانہ انداز میں مہرو کا استقبال کیا اور مہرو کو گلے لگا کر بولی۔ ”ویلکم میری جان! مہرو...... تم تو وقت کی بڑی پابند نکلی ہو۔“

”مگر تم بہت لالچی......“ مہرو کی بے تکلفی نے مجھے حیران کیا۔

میں سوچ میں مستغرق تھا کہ وہ مجھے یہاں کیوں لائی تھی۔ کیا وہ مجھے مریم کی شادی کا منظر دکھا کر اپنی فتح کا یقین دلانا چاہتی تھی؟

دونوں ایک دوسرے سے چمٹ کر ڈرائنگ روم میں گھس گئیں جبکہ میں گاڑی میں بیٹھا رہا۔ پورچ میں پانچ چھ گاڑیاں دیکھ کر میرے شک کو تقویت ملی کہ کوٹھی میں مریم کی شادی کی تقریب منعقد تھی۔ میرا ہاتھ بے اختیار دل پر جا ٹکا اور لبوں سے دل دوز آہ نکل گئی۔ یکبارگی جی چاہا کہ اندر چلا جاؤں اور مہرو اور مسز فردوس کے گلے گھونٹ دوں، اپنے اندر بھڑکتی ہوئی جان لیوا آگ پر انتقام کا پانی ڈال دوں مگر ہمت نہ ہوئی۔

ایسے ہی وقت میں، جب میں گاڑی سے نکل کر کوٹھی سے باہر نکل جانے کا ارادہ کر رہا تھا، مسز فردوس کسی بات پر ہنستی ہوئی ڈرائنگ روم سے نکلی اور سیدھی میری طرف آئی۔ اس نے شاندار سوٹ زیبِ تن کر رکھا تھا اور اپنے چہرے پر میک اَپ کی دبیز تہ چڑھا رکھی تھی۔ قریب آ کر بولی۔ ”وسیم بھرداننا! تم یہاں کیوں بیٹھے ہو؟ اندر آؤ ناں۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو اُس کے حلق سے قہقہہ ابل پڑا۔ ہنسی کی تال پر بے دم ہو کر جھکی، دروازہ کھولا اور مہرو کے انداز میں مجھے بازو سے پکڑ کر باہر نکال لیا، بولی۔ ”اندر چلو...... مہرو تمہیں بلا رہی ہے۔“ برآمدے کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے رُک کر بولی۔ ”شاید تمہیں علم نہیں کہ مہرو میری بہت پیاری دوست ہے۔ ہم جھنگ کے کامرس کالج میں اکٹھے پڑھتے تھے۔ تب وہ اتنی موٹی اور کالی نہیں ہوا کرتی تھی۔ تم نے اُسے برباد کر کے رکھ دیا ہے۔“

میں گویا اُس کی باتیں سن ہی نہیں رہا تھا۔ رات کو فون پر ہونے والی مہرو کی گفتگو سے میں نے دونوں کے درمیان استوار شدہ گہرا اور پرانا تعلق بھانپ لیا تھا۔ وہ مجھے لیے ہوئے ڈرائنگ روم میں آئی۔ دروازے میں ہی نہ دیکھا جا سکنے والا منظر دکھائی دیا۔ صوفوں پر کم و بیش بیس مرد و خواتین بیٹھے تھے۔ درمیانی صوفے پر دلہن کے روایتی سرخ سوٹ میں مریم بیٹھی تھی جس کے داہنے پہلو میں مہرو بیٹھی محبت پاش نظروں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ اُس کا سرخ غرارہ درست کر رہی تھی۔

مجھ سے اپنے پیروں پر کھڑے ہونا محال ہو گیا تو میں نے دہلیز تھام لی۔ مسز فردوس نے جھٹکا دے کر مجھے آگے بڑھایا اور گھسیٹنے کے انداز میں چلاتی ہوئی، صوفوں کے بیچ سے گزرتی

ہوئی مریم اور مہرو کے پاس پہنچی۔ مجھے مریم کے پہلو میں بٹھا کر بولی۔ ”مہرو! دلہن کے ساتھ ساتھ اس ایب نارمل دُلہا کو بھی سنبھالو۔ مجھے اِس کی 'ورنہ' سے ڈر لگنے لگا ہے۔ اوئے انور! مولوی صاحب کو بلا لاؤ تاکہ نکاح پڑھایا جائے۔“

میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ آراستہ ڈرائنگ روم کا منظر ایک دم دھندلا گیا۔ سبھی خوش کن چہرے گھومنے لگے۔ میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے مہرو کو دیکھا، پھر مریم کو۔ پھر کولھوں پر ہاتھ رکھے سر پر کھڑی مسز فردوس کو...... تب اچانک سبھی عقدے کھل گئے۔ میں سائیں سائیں کرتا دماغ سنبھالنے میں مصروف رہا جبکہ وہاں موجود لوگ اپنی ذمے داریوں سے عہدہ برآ ہونے لگے۔

نکاح سے فارغ ہوتے ہی پرتکلف کھانا پیش کیا گیا مگر مجھ سے ایک لقمہ بھی حلق سے اتارا نہ گیا۔ پھر رخصتی کا فریضہ سرانجام دیتے ہوئے مسز فردوس خانم نے میرے ہاتھ میں مریم کا ہاتھ دیتے ہوئے پیار سے کہا۔ ”وسیم! آئی لَو یو...... میں تمہارے عشق کی طاقت دیکھنے کے لیے تم سے بدسلوکی کرتی تھی۔ تم نے برا مانا۔ معاف کر دو۔ میری مریم کو خوش رکھنا۔ اور ہاں...... مہرو تم سے بہت محبت کرتی ہے۔ وہ صرف اُس وسیم کو دیکھنا چاہتی ہے جو اُس سے پندرہ برس پہلے چھین لیا گیا تھا۔ ناؤ...... یو کین گو وِد یور برائیڈ......“

اُس نے مریم کو چوما، گالوں کو پیار سے چھوا اور پرس کھول لیا۔ ایک چیک نکال کر اُن کے حوالے کیا۔ ”یہ دس لاکھ کا چیک تمہارے دُولہا نے دیا تھا۔ سلامی سمجھو یا زیور...... جو سمجھو تمہاری مرضی۔“

دوسرا چیک میرے ہاتھ میں تھمایا، بولی۔ ”یہ مریم کا جہیز ہے۔ قبول کرو۔ اور ہاں! مریم میری بیٹی ہے۔ مجھے بہت پیاری ہے۔ میرے پیار کو کبھی آزمائش میں مت ڈالنا ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ یہ آج تک 'مس مریم' تھی، آج 'مسز وسیم' بنی ہے۔ سدرہ اس کی بہن نہیں...... میری بیٹی ہے۔ جس طرح مریم میری بیٹی ہے۔ اُسے میں مظفر آباد کے ایک کھنڈر سے اُٹھا لائی تھی۔ مریم نے اُسے پالا ہے۔ تبھی اُسے اپنے ساتھ رکھنے پر بضد ہے۔ میں نے اجازت دے دی۔ تمہارے دل میں گنجائش ہو تو اپنے ساتھ رکھ لینا مگر وہ میری امانت ہوگی...... تم دونوں کے پاس...... جب کہو گے، لینے کے لیے پہنچ جاؤں گی۔“

میں نے بغیر کسی خواہش کے چیک تھاما اور مریم کی طرف بڑھا دیا۔ اُس کے ہاتھوں میں دونوں چیک لرزنے لگے۔ لرزتی ہوئی مگر نہایت دھیمی آواز میں بولی۔ ”میں کالی مہنگی ہوں ناں!“

مسز فردوس نے پیار سے اُس کے گال پر چپت لگائی اور ہم دونوں کو مہرو کے حوالے کر کے مہمانوں کے ساتھ پلٹ گئی۔ میں نے دھڑکتے دل سے مریم کی طرف دیکھا جو نفیس میک اَپ میں قیامت ڈھا رہی تھی۔ میں نے مہرو کی طرف دیکھا جس کا چہرہ سچی خوشیوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ وہ لپک کر ہمارے درمیان آئی۔ دونوں کی کمروں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے پارکنگ میں آئی۔ پلٹ کر برآمدے میں کھڑی مسز فردوس کو 'گڈ بائے' کہہ کر ہاتھ لہرانے لگی۔

میں نے مریم کا ہاتھ تھاما اور شیراڈ کی طرف بڑھا۔ مہرو کی آواز نے تھام لیا۔ ہمیں پارکنگ کے شمالی کونے میں لے گئی جہاں ایک نئی نویلی سیاہ رنگ کی چمکدار کار کھڑی تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر جھٹکا سا لگا کہ اُس کی ڈرائیونگ سیٹ پر عبدالکریم براجمان تھا۔

میں نے مہرو کی طرف دیکھا۔ وہ بہت پرجوش تھی۔ ہمیں گاڑی میں دھکیل کر بولی۔ ”کالے رنگ کی تھنڈ گلاس والی نئی کار ہو، تمہاری دلہن نے گہرے نیلے ویلوٹ کا سوٹ پہنا ہو، تم نے سیاہ پینٹ اور سرخ شرٹ...... اور اس شان سے ہنی مون پر جانا چاہتے تھا ناں تم؟“

مجھے حیران چھوڑ کر اپنی شیراڈ کی طرف بڑھ گئی۔ کاریں آگے پیچھے گیٹ سے نکلیں۔ میرا دماغ میرا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ مہرو اور مسز فردوس نے میرے ساتھ کیوں اتنا بڑا کھیل کھیلا تھا۔ شیراڈ گھر کے مین گیٹ پر رُک گئی جبکہ عبدالکریم نے مین روڈ پر ہی گاڑی روک دی۔ مہرو اُتری اور تیز تیز قدموں سے ہماری جانب آئی۔ گاڑی کے بونٹ پر ہاتھ رکھ کر فرنٹ اسکرین میں سے جھانک کر ہمیں دیکھتی رہی پھر ہاتھ اُٹھا کر کوئی دعا مانگنے لگی۔ یہ آواز بلند 'ماشاءاللہ' کہہ کر عبدالکریم کی طرف آئی، بولی۔ ”تمہیں ہوٹل کا علم ہے ناں، شکریہ۔ کمرا نمبر دو سو بائیس...... تم دس دنوں تک وسیم اور مریم کے ساتھ رہو گے۔“

پھر میری طرف آئی۔ شیشہ اُتارنے کا اشارہ کیا۔ عبدالکریم نے شیشہ اُتارا۔ میرا ہاتھ تھام کر خوشی سے بولی۔ ”تم دونوں دس دن ہنی مون منانے کے لیے مری جا رہے ہو۔ اوکے...... اور دیکھ لینا...... تمہارے سبھی خواب پورے ہو چکے ہیں۔ کالی کار، دنیا کی خوبصورت ترین دلہن جسے میں عروسی غرارے کے نیچے نیلا ویلوٹ کا سوٹ پہنا کر لائی ہوں...... اور وسیم! تم اپنے سوٹ کا بھی جائزہ لے لو...... مہرو پندرہ سالوں میں کچھ بھول گئی ہو تو معاف کر دینا...... گڈ بائے!“

میرے منہ سے نکلا۔ ”گڈ بائے!“

وہ بولی۔ ”وسیم! میری جان! میری جھولی خالی ہے۔ ایک مسکراہٹ ہی دے دو......“

میں اُسے کئی لمحے یک ٹک دیکھتا رہا۔ کوشش کے باوجود مسکرانہ پایا تو پراگندہ ہو گیا۔ شاید میری نہ ہنسنے کی عادت بہت پختہ ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھوں کے چراغ بجھ گئے۔ آنکھوں کی جگہ خلا بھر گیا۔ موت کی سی خشکی دیکھ کر میرے رگ و پے میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ وہ اچانک پلٹی اور تیز تیز قدموں سے گیٹ پر کھڑی شیراڈ کی طرف بڑھ گئی۔ میں نے کن انکھیوں سے اپنا سوٹ دیکھا۔ مریم پر نظر ڈالی جو وارفتہ نظروں سے دور جاتی ہوئی مہرو کو دیکھ رہی تھی۔

عبدالکریم نے جیب سے پرس نکالا۔ دونوں سیٹوں کے درمیان سے میری طرف بڑھایا۔ بولا۔ ”صاحب! یہ بیگم صاحب نے آپ کے لیے دیا ہے۔ اس میں پیسے ہیں۔“

میں نے لرزتے ہاتھوں سے تھام لیا۔ اُس نے گاڑی سیدھ میں بڑھالی۔ مین گیٹ پیچھے رہ گیا۔ مجھے ایک خیال آیا، پوچھا۔ ”عبدالکریم! یہ گاڑی مہر النساء نے خریدی ہے؟“

”جی صاحب! میں اور بیگم صاحبہ اکٹھے گئے تھے شوروم پر۔ پندرہ لاکھ کی آئی تھی۔ ہفتہ بھر شوروم پر ہی کھڑی رہی۔ آج صبح میں نے جا کر وصول کی ہے۔“

”پندرہ لاکھ!“ میرے حلق سے لمبی سانس خارج ہوئی۔ مہرو نے یقینی طور پر اپنی جمع خرچ والی فائل کے آخری خانے میں پندرہ لاکھ کے ہندسوں کے سامنے ’نئی کار‘ کے لفظ لکھ دیے ہوں گے۔ اچانک جیسے کوئی میرے دل میں ہڑبڑا کر بیدار ہو گیا۔ میں نے بے ساختہ عبدالکریم کو رکنے اور گھر چلنے کا حکم دیا۔ وہ مہرو کے حکم کو اوّلیت دیتا تھا۔ میرے حکم پر پلٹنا نہیں چاہتا تھا۔ مریم کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”سر! آپ کیوں واپس جانا چاہتے ہیں؟“

”میں جانے سے پہلے مہرو سے ایک مرتبہ ملنا چاہتا ہوں۔“

مریم نے میری تائید کی۔ ناچار عبدالکریم کو گاڑی موڑنا پڑی۔ اُسے مین گیٹ پر روک کر میں گاڑی سے اُترا اور دوڑتا ہوا بنگلے میں گھس گیا۔ میری توقع کے برعکس مہرو بیڈ پر بیٹھی تھی۔ اُس کی کھلی ہتھیلی پر ایک ننھی سی گولی اور دائیں ہاتھ میں پانی کا گلاس دبا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر گھبرا سی گئی، بولی۔ ”تم؟ تم لوٹ کیوں آئے؟ وہ مریم کہاں ہے؟“

میں نے اس کی پریشانی کو نظر انداز کیا۔ گولی کی طرف اشارہ کیا، بولا۔ ”تم یہ کیا کر رہی ہو؟“

وہ ہنسی۔ گولی پھانک کر، پانی کا گھونٹ بھر کر نگلتے ہوئے بولی۔ ”کافی دنوں سے بھرپور نیند نہیں ملی۔ سوچا، آج جی بھر کر سوتی ہوں۔ ساری تھکاوٹ اُتر جائے گی۔ کل بچوں کو لینے اسکول جاؤں گی۔ سدرہ کو بھی لانا ہے۔ تمہارے آنے تک وہ میرے ساتھ رہیں گے۔“

میں نے دیکھا کہ اس کی آواز اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ آنکھوں کا سوت آگیں خلا دیکھ کر میری رہی سہی تاب بھی دم توڑ گئی۔ میں بے اختیار بیڈ پر گیا۔ اُس کے دونوں ہاتھ تھام کر بولا۔ ”مہرو! مجھے ڈر لگنے لگا ہے، تمہاری خالی آنکھیں دیکھ کر...... مجھے بتاؤ، تمہاری آنکھوں میں خلا کیوں ہے؟“

وہ مسکرائی۔ بارش اور دھوپ کا منظر اُس کے چہرے پر سج گیا، بولی۔ ”نہیں وسیم! میں آج بہت خوش ہوں۔ میں نے تمہارے خواب دنیا کے بازار سے خرید لیے ہیں۔ کیا یہ معمولی خوشی ہے؟“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

”مگر تم بڑے کٹھور ہو۔ اپنے خوابوں کی تکمیل کے بدلے ایک کھوکھلی مسکراہٹ بھی مجھے نہیں دے پائے۔ ہے ناں؟ سبھی مرد ایسے ہی ہوتے ہیں کیا؟“ اس کے لہجے نے مجھے آنِ واحد میں توڑ دیا اور میں اُس کے ہاتھ چوم کر اُس کی گود میں سر ڈال کر سسکنے لگا۔ وہ کہنے لگی۔ ”کیوں رونے لگ گئے؟ ہیں؟...... مسکراؤ ناں میرے وسیم!“

میں نے نفی میں سر ہلایا، وہ بولی۔ ”کچھ کمی رہ گئی؟“

میں نے سر اُٹھایا۔ میری آنسوؤں سے دھلی آنکھوں کو مہرو بڑی خوب صورت لگی۔ میں نے والہانہ انداز میں اُسے چوم لیا اور بانہوں میں بھر کر اُٹھا دیا، کہا۔ ”میرے خواب میں ڈرائیور کا کردار نہیں تھا۔ تم یہ بات بھول گئی تھیں ناں...... چلو ہمارے ساتھ کیونکہ مجھے ڈرائیونگ نہیں آتی۔“

میں نے اُسے کھینچ کر بیڈ سے اُتارا۔ ایسے ہی وقت میں کمرے میں سایہ سا لہرایا۔ پلٹ کر دیکھا۔ مریم دروازے کی دہلیز تھام کر بڑے جاندار انداز میں مسکرا رہی تھی۔ میرے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ تیر گئی جو بتدریج بڑھتی ہوئی قہقہے میں بدل گئی اور میں نے خالی آنکھوں والی مہرو کو بانہوں میں بھر کر بھینچ لیا، اتنی قوت سے کہ اُس کی آنکھوں کا خلا ایک دم ختم ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد سیاہ کار کے بند شیشوں میں ٹیپ پلیئر سے موسیقی پھوٹ رہی تھی جبکہ مہرو کی مدھر آواز سازوں کے ہم آہنگ نغمہ ریز تھی۔ ”ایک احساس ہے یہ، روح سے محسوس کرو...... پیار تو پیار ہے، رہنے دو، کوئی نام نہ دو......“